

Osmania University

Call No. 915000.10

Accession No. 4.5569

Author

Title

This book should be returned on or before the date
last marked below.

جہڑ ڈنبرے ۳۱

دگلزار

اردو کا مشہور ادبی و تاریخی رسالہ

بہ مزنی گری

مولانا مولوی محمد عبد کلیم صاحب شہ

و بہ ہدایت

مولوی محمد صدیق حسن صاحب ایڈیٹر

خاکسار

محمد سراج الحق (حکیم منیر و نیر و پشیر)

—

دگلزار پریس میں چھاپکر لکھنؤ محلہ کٹرہ بن بیگ خان شائع کیا

سین سج! سن سج! سن سج!!

سہا ہی رسلا خوری خٹا نہ ہو سہا ہی ہو چم پ جز ہو ہضامین نظم و نثر دونوں قسم کے ہوں
 میں جھٹھ میں مسلمان فاتحان ہند کی مختصر تاریخ اور چند نظم میں شاعر شعر کی منتخب تحریر
 شہرہ نظیرین - نیکست سالانہ مع حصول لکڑی روٹا سے اہلی قیاضی کے مطابق اور عام غے قطع
 منو کے واسطے اور کے ملک آنا ضروری ہیں۔ دیہات میں روانہ ہوتا۔
 بیوقوف سن سج گڑھ نرن بیگ خان کھنڈ۔

کارخانہ روض الراحین کھنڈ کا اعلیٰ عطر

اب ایک دفعہ آزما کے تو دیکھیں
 عطر کے یہ کھنڈ شہر ہے گرافٹس ہو کر جو عطر ہے وہ باہر والوں کو نہیں ملتا کیونکہ کسین ال کھنڈ کی
 لکھ باقہ ہو اور ان کے دخل اصل کا خیال نہ ان ہی غریبوں کو اٹھانا پڑتا ہو جو باہر سے ملگولے اور بے دیکھے خیر
 جیوت میں اور بعض اشتہار دینے والوں کی یہ حالت ہو کہ وہ بیہ کمال دو کو اور کبھی چار کو بھی جیتے ہیں یہ عام
 دیکھ کر کم نئے مرید ہے کہ باہر کے جو صاحب طلب فرامین ان کے لیے معتبر اور درست کارخانوں کے عطر
 اعلیٰ درجے کے تیل وغیرہ خاص طور پر انتظام کر کے مال کوئی چاہے کے اور بقایات خرید کر کے روانہ کر
 کر میں جس کا بہت اچھا اور قابل اطمینان انتظام کیا گیا ہے۔ عطر کے شایق ایک بار امتحان منگو کر
 کہ پتا سے فیصلہ سے انھیں کیا اچھا عطر اور کین ناموں کو پتا ہے۔

عطر وں کی فہرست حسب ذیل ہے

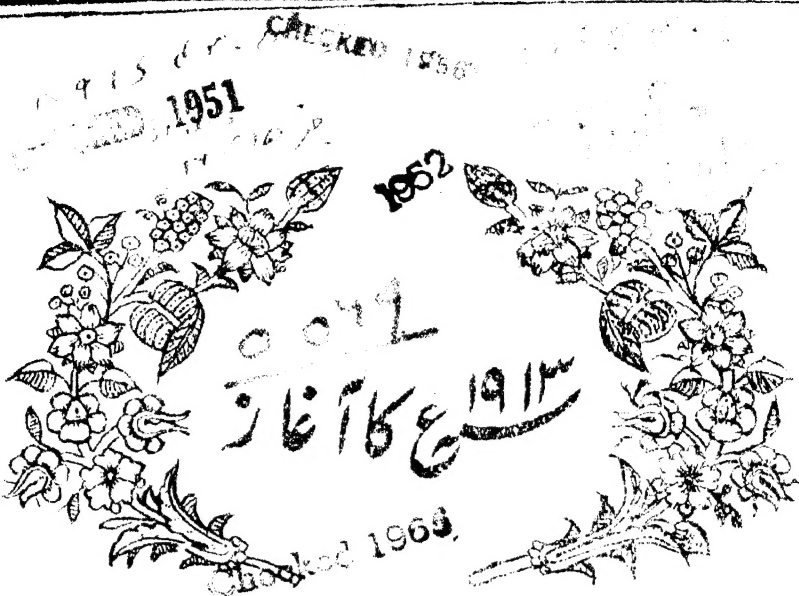
عطر خافقہ مر لبر ہے	عطر باڑی فیتورہ	عطر دوس فیتورہ	عطر ملک بری فیتورہ
موٹا لبر ہے	عطر باد	برگ خا	روح گل اصل
چھلی سے مر لبر ہے	عطر شہ	مجموعہ	حسن اصلی
کوڑھ لبر ہے	احتاج	سہاگ	پانڑی ہے
خس ہے	دھوپ	عطر اگر غنی	عطر ناگہر اصلی
فتنہ ہے	گل باب	اگر زعمہ	خلوہ عنبری
چھپا ہے	شیرینہ	پنہاڑ	صدر برگ
موسری ہے	سینہ	فلوہ اصغیہ	چمک

خوشبودار تیلوں کی فہرست ملاحظہ ہو

روغن جلیب	روغن لہری	روغن لہری	روغن کیوڑھ	روغن خانی
عسل درجے کا خوشبودار	عسل درجے کا خوشبودار	عسل درجے کا خوشبودار	عسل درجے کا خوشبودار	عسل درجے کا خوشبودار
نہ تبا کو شکی	نہ تبا کو شکی	نہ تبا کو شکی	نہ تبا کو شکی	نہ تبا کو شکی
زعفرانی	زعفرانی	زعفرانی	زعفرانی	زعفرانی

نوٹ :- درخواست آتے ہی دیوپی ایسلحہ وانہ ہوگا بار داند صاف ڈاک ذمہ خرمیراد

آپ کا خادم محمد راج الحق مینجر دنگ از کٹھو نرن بیگ خان



دوستو! ۱۹۱۳ء کو گریا اور ہم زندہ ہیں۔ فاروق مرحوم جن کی زندگی سے ہمیں
 کو نہیں دیکھا زکو بڑی بڑی امیدیں تھیں سال مذکور کے ماہ فروری میں دنیا سے
 رخصت ہو گئے مگر ہم ان کی مفارقت کا صدمہ برداشت کرنے کے لیے عالم میں موجود
 ہیں اور اللہ کا خیر مقدم ادا کر رہے ہیں۔ مرزا جینا کوئی غیر معمولی چیز نہیں۔ سب ہی کے
 لیے ہے۔ دنیا کا کارخانہ ہی یہ ہے کہ ہستی کے ساتھ موت، اور موت کے ساتھ ہستی ہے۔
 ”تو تو ایسی ہی تھی۔ تو تو ایسی تھی۔“ گراؤ میں اس بات کا ہے کہ ہم دنیا کی اور
 تمام چیزوں کی طرح نہیں کیوں نہیں ہیں۔ سارا ہم، دلم اسی نظام ص کی وجہ سے ہے۔
 نہ ہمیں رنج و غم کی حس ہوتی نہ خوف و شکایت، زبان پر کہ تانہ چوٹ سے دکھ معلوم ہوتا اور یہ
 لڑا دیتا بانہ ہوتی۔ شجر و حجر اور دنیا کی لاکھوں کمردڑوں چیزیں محض ایک نسیجی کی برکت سے
 اس لطافت و آرام اور کسی بے فکر کی کے ساتھ زندگی بسر کر رہی ہیں یہ بات حقائق و حواشی سے
 یقین بھی سابقہ پڑتا ہے۔ بقا و فنا کے لیے بھی یہ زمانہ انھیں کھاتا اور مٹاتا ہے۔ جلیان ان
 بھی کرتی ہیں۔ پتھر ان پر بھی پڑتے ہیں۔ بادیاں انھیں بھی اٹھا اٹھا کے پھینکتی ہے
 ویریل حوادث انھیں بھی ہمالے جاتی ہے۔ غرض کون قافیت ہے جو ان کے سر پر نہیں
 آتی۔ اور کون سی نصیبیت ہے جس سے انھیں سابقہ نہیں پڑتا مگر بے حسی ایک ایسی
 سے غفلت کی ہے کہ جس کے باعث انھیں خبر بھی نہیں ہوتی کہ دنیا اس کی ہمارا ہے۔

اور کوئی ہمارے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے۔ بیان سے اٹھا کے وہاں پھینک دو انھیں جب نہیں۔ پاؤں سے ٹھوکر مارو انھیں پروا نہیں۔ خدا بھلا کرے جیسی کا کہ یہ تمام آفتیں جھیل جاتی ہیں اور زبان سے آہ نہیں نکلتی۔ اور ایک ہم میں کہ گنجت حس کی بدولت آؤ اونسے چوت پر روتے۔ اور ذرا فراسی نکلیفون پروا دیلاو دامصیبتا کا شور مچا دیتے ہیں۔ خداوند! اگر غم ہی دنیا ہے تو جیس بنا۔ اگر قسمت میں ہی کھ دیا ہے کمرستا۔ جائین تو پتھر کا دل بھی دے جس پر کسی بات کا اثر ہی نہ ہو۔ کیا فائدہ کہ تو نے اپنی کبہ مصلحت سے ہمیں مبتلا کئے آلام کیا اور ہماری زبان سے شکایت نکل گئی۔ ایذا پہ اور ہم صبر نہ کر سکے۔

گر نہیں یہ جس جس کا ہم دکھڑا رہے ہیں بالکل بڑی ہی نہیں۔ دل صد چاک پر جو سخت سے سخت چوٹیں کھائی ہیں ان سے متاثر ہو کے ہم شکایت کرنے لگے ورنہ یہی ایک بڑی بھاری رحمت و نعمت بھی ہے۔ اسی حس سے جس طرح نکلیفون پوختی ہیز اسی طرح اس سے راحت میں مرہ بھی آتا ہے کیسی کیسی لذتوں سے ہم بہرہ یاب ہوتے ہیں اور عالم کی انجیپیون سے کیسے کیسے لطف اٹھاتے ہیں ہانا کہ بعض غم ایسے ہوتے ہیں جو ساری لذتوں اور مسرتوں کو خاک میں ملا دیتے ہیں۔ مگر ان کے مقابل بعض مسرتیں بھی ایسی ہیں جو سارے المون کو ایک دم بھر میں نسیا کر دیا کرتی ہیں بیشک ہم فاروق مسرور کے غم میں مبتلا ہو کے ایسے مغموم ہوئے کہ اپنے فرائض کو بھول گئے۔ بیان تک کہ دگلڈ از کو بھی نہ سنبھال سکے۔ ان کی بیماری و صحت کی فکر اور تک و درد سے جو بظلمی دگلڈ از کی اشاعت میں پیدا ہوئی تھی ان کی وفات سے اور بڑھ گئی۔ چند پرچہ نہایت مژدہ دلی سے ستم زدہ دل کو ابھارا اٹھا کے نکالے بھی تو بے مزہ تھے۔ بیان تک کہ سلسلہ ام کے چھ نمبر نکلنے کے بعد دگلڈ از کی اشاعت کا سلسلہ ایسا رکا کہ زمانے کو خیال ہوا شاید دگلڈ از نے بھی ان مرحوم کا ساتھ دیا۔ اور وہ بھی وہیں گیا جہاں وہ گئے ہیں۔

لیکن نہیں۔ دگلڈ از ان کی زندگی کے ساتھ نہ تھا ہماری زندگی کیساتھ ہے بلکہ امید ہے کہ ہمارے بعد باقی رہے۔ ہماری قسمت میں تھا کہ وہ ہمارے لیے سامان مسرت فراہم کرے۔ اور ان تمام آلام و حوادث اور آفات و مصائب کے بعد اس لیے ان سچے دوستوں

اور عزیز ترین احباب سے دوبارہ ملنے کا ذریعہ بنے جن سے ملنا ہی یہ ہے کہ ہمیں اپنے
 اُس مرحوم تخت جگر کی زندگی سے زیادہ عزیز ہے۔ اور جن سے ہم صحبت ہونے اور بڑی
 تحریر ملاقات کرنے کی مسرت ہماری تمام کلفتوں کو دور کر کے ہمیں بہت ہی سرور کر دیتی
 لہذا اسے ہماری حس۔ اسے اعلیٰ ترین نعمت ربانی۔ ہم بڑے شاکر ہیں۔ بلکہ
 نہایت شکر گزار ہیں۔ بڑی وجہ سے ہمیں کیسے کیسے مزے ملتے ہیں؟ اور کیسی کیسی
 شادامیوں کی دولت نصیب ہوتی ہے؟ تو نہ ہوتی تو یہ پُرانے احباب سے ملنے کی
 مسرت اور سخن سنج قدر دانوں کی عنایتوں سے ہر اندوز ہونے کی نعمت کیونکر حاصل
 ہوتی؟ اور ان رحمتوں سے ہم کیونکر لطف اٹھا سکتے؟ یہ ہماری پیاری اور ہماری
 مایہ زندگی حس ہی کا فیض ہے کہ آج ختم سال پر ہمیں گزشتہ کے غم دالم اور محسوس
 سال ۱۹۱۲ء کے صائب و افکار بھول گئے۔ اُسی سینہ کو جو کل تک آتش الم کا نور بنا ہوا تھا
 آج ٹوٹے ہیں تو حسرت کا کہیں نام و نشان نہیں۔ اور اُن گزشتہ افکار و آلام کی جگہ نئے
 رولے اور حصے آگے بسے ہیں اور امید نے اپنا چراغ روشن کر دیا ہے۔ انھیں مزہ دار اور
 پر لطف امیدوں کے جوم سے جوش میں آگے ہم اپنے تمام احباب تمام قدر دانوں اور
 سارے خریداران دگلڈ از کو سال نو کی مبارکباد دے رہے ہیں اور وہ نہایت ہی
 ذوق و شوق سے ہمارا مبارکباد دیتے ہیں۔ پیاری حس۔ تو نہ ہوتی تو یہ مبارکبادیاں
 ہوتیں؟ اور ان حوصلوں اور ولولوں میں مزہ آتا؟

جن کی زندگی ان عیش و تنعم اور آرزو مندی و بامرادی میں گزرتی ہیں انھیں شک
 انقلاب سال کے موقع پر غم کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ افسوس راحت و آرام کا اکیلا
 گزر گیا اور شادمانی کی زندگی کا ایک برس کم ہوا۔ جن کا شباب جوش جوانی کے مزے
 دکھا رہا ہے انھیں صدمہ ہونا چاہیے کہ جوانی کے محدود ترقی برسوں میں سے ایک
 گیا اور پھر نہ آئے گا۔ جن کی راتیں اس سال کسی و ناکیش ناز آفرین کے پہلو میں جام
 پیئہ گزر رہی وہ غومنازدہ ہو سکتے ہیں کہ دیکھیے آئندہ سال بھی ایسی ہی لطف و مسرت
 کی راتیں نصیب ہوتی ہیں یا نہیں۔

مگر جنھیں سارا برس غم ہی میں گزر گیا۔ جو سال گزشتہ کو اپنی زندگی کا محسوس ترین
 برس خیال کرتے ہوں انھیں غم کس بات کا؟۔ انھیں تو خوش ہونا چاہیے کہ بڑے

سو ذی سے پچھا چھوٹا اور یہ نیا سال شاید ہمارے حق میں مبارک ہو۔ لیکن خیال کیوں
اور کس وجہ سے ہے؟ ہر صحت جس کے صدقے میں۔ جس ہی ہے جس کے آغوش میں
یہ امید آرزو کی خوشنیاں اور حیرت مندی کی مسرتیں ملتی اور نشوونما پاتی ہیں۔

لہذا ناظرین اس امید و ن کی گھڑی اور نئے دور راضی کے آغاز میں ہم اپنے
آنسو پونچھ کے اور غم ایام پر خاک ڈال کے آپ سے خوشی خوشی ملتے ہیں۔ اور آپ کی
محبت و عنایت کے سہارے پر پھر ویسے ہی تازہ دم اور مستعد ہو کے لٹری و پریسیڈنٹ
کا سلسلہ چھیڑتے ہیں تاکہ جوانی و شباب کے دل و دماغ رخصت ہو سکے اور جس قدر
دم باقی تھا اُسے بھی ہجومِ آلام نے مٹا دیا مگر الحمد للہ کہ بہت اب تک جوان ہے۔ اور
آپ کی محبت و عنایت نے ہمارے دل میں کچھ ایسا جوش پیدا کر دیا ہے کہ حسرتیں
آرزو بن گئی ہیں۔ اور مایوسیوں نے امید کی صورت اختیار کر کے پہلو میں گدگدانا
شروع کر دیا ہے۔

بہر حال دلگداز نے بڑی امید و ن اور آرزوؤں کے ساتھ نئے سال کے آغوش
میں قدم رکھا۔ اور آپ کی نظر عنایت کا امیدوار ہے۔ چودھویں جلد کس ہوئی
اور پندرہویں جلد کا آغاز ہوتا ہے۔ پُرانا لٹری و قرض ادا ہو گیا جس کی نراست
سے ہم سر نہ اٹھا سکتے تھے اور ۱۹۱۲ء کے پورے پرچون کے ساتھ یہ جنوری ۱۹۱۳ء
کا پہلا نمبر بھی ہمارے کرم فرماؤں کے ملاحظہ میں پیش ہوتا ہے۔

اب کی سال ہم اُس ناول کو بہت جلد پیش کر دینا گے جو خریداران ۱۹۱۲ء
کی نذر کیا جائے گا۔ لوگ بہت کہا کرتے تھے کہ تاجی نادون کے ساتھ ایسا اخلاقی
ناول بھی لکھے جائیں جو موجودہ زمانہ کی معاشرت سے متاثر رکھتے ہوں۔ اسی قسم
کا ناول "غیب دان دوھن" تھا جو ۱۹۱۲ء کے خریداران دلگداز کے ملاحظہ میں ۱۹۱۳ء
میں پیش کیا گیا تھا اور اسی قسم کا ناول یہ بھی ہے جس میں امید ہے کہ اُس سے زیادہ
نتیجہ خیر اور نفع بخش ہوگا۔

اسکندر اعظم

ہماری یہ کوشش رہی ہے کہ اردو لٹریچر کے نامور دن کے حالات سے جان

ایک بنے اردو دان پہلک کو واقف کرتے ہیں۔ اس قسم کے بہت سے نامور لوگ
کے حالات زندگی دنگلز کے صفحوں پر شائع ہو چکے ہیں مگر ابھی تک سکندر اعظم
کی لائف مستقل طور پر لکھ کے نہیں پیش کی گئی۔ ہمارے مشرقی شعرا میں سے کوئی ننگا
جس نے تشبیہات میں سکندر کے نام سے فائدہ نہ اٹھایا ہو۔ سکندر کا آئینہ کو ایجاد
کرنا۔ خواجہ خضر کے ساتھ آب حیات کی تلاش میں جانا اور نام کام واپس آنا۔ یا جوج
ما جوج کے روکنے کے لیے سکندر کی ہوانا۔ سارے عالم کو فتح کر لینا۔ اور اسی
قسم کی چند اور باتیں اُس کی جانب منسوب ہیں جن کا شعرا کے کلام میں بار بار اعادہ
ہوتا ہے اور ہر موقع پر اُس کا نام لیا جاتا ہے۔

لیکن انیسویں صدی کے سکندر اعظم وہ شخص نہیں ہے جس کی جانب ان میں سے ایک
بات کو بھی منسوب کیا جائے۔ قرآن مجید میں ذوالقرنین نام ایک بادشاہ کا تذکرہ
ہے جس کا ساری دنیا میں گزرا ہوا تھا اور جس نے یا جوج و ما جوج کی روک تھام کے
لیے اتر دھات کی ایک دیوار بنوائی تھی۔ قیاس یہ چاہتا تھا کہ وہ بادشاہ کوئی بین
کا بادشاہ ہو جان کے سلطانین کے نام اکثر ”ذوالک“ لفظ سے شروع ہوا کرتے تھے۔
کسی قدیم زمانے میں یہ بڑے سلطوت و جبروت کے تاجدار تھے اور عربوں کی
قومی رہنمائی میں موجود تھا کہ ان میں سے کسی بادشاہ نے ساری دنیا فتح کر لی تھی۔
لہذا قرآن مجید میں ذوالقرنین سے یقیناً وہی تاجدار میں مراد ہے۔

مگر مقدونیہ کے بادشاہوں کا شمار افسانہ نگاروں کے ہاتھوں میں کیا جاتا ہے جس کی بنا پر تو روم میں
سکندر کی نسبت حضرت دانیال کی پیشین گوئی ”کہ بے“ ہی کے لفظ سے کی گئی تھی۔ اور
چونکہ بکرے کے دو سینک ہو تے ہیں اس لیے بعض مسلمان مورخین کو خیال گزرا کہ
ذوالقرنین سے مراد سکندر بن فیلقوس یونانی ہے۔ یہ خیال اسلامی پہلیک میں مشہور
ہوا۔ شہرت نے اُسے ناموران لڑکچہ میں جگہ دلوائی اور یوں ساری مشرقی دنیا میں
سکندر کا نام اس قدر مشہور ہوا کہ کچھ اُس کے نام سے واقف ہے۔ اور صد ہا
بچوں کے نام اُسی کے نام پر رکھے جاتے ہیں۔ مگر یہ ہے کہ مشرقی دنیا میں
سکندر کو جو شہرت و مقبولیت عامہ حاصل ہو گئی اُس کا اعلیٰ باعث قرآن مجید کی ایک
آیت اور اُس کے متعلق مسلمانوں کی ایک غلط فہمی ہے۔ لیکن سکندر اپنے حالات

ودا تھا اس کے لحاظ سے ایسی شہرت کا مستحق ضرور تھا۔

اُس کا اصلی نام ”الکسانڈر“ یا ”الکندر“ تھا۔ جو انگریزوں میں تو مغربی لب و لہجہ کے اثر سے ”الکزانڈر“ ہو گیا مگر عربوں کو حبشی غلط فہمی اُس کے انتخاب میں ہوئی تھی ویسی ہی اُس کے نام میں بھی ہوئی۔ وہ سمجھے کہ نام کے اول کے ”الف“ لام عربی زبان کے حروف تعریف ہیں۔ اس کے بعد کات کا سین سے پہلے ہونا چونکہ عربوں کی زبان پر ثقیل تھا اس لیے سین کا ف کے قبل کر دیا گیا۔ اس طرح یہ نام عربی میں ”سکندر“ ہو گیا۔ بعض نے سین کو ساکن خیال کر کے اول میں ایک ہمزہ وصل بھی بڑھایا اور اُس کا نام ”اسکندر“ بنا دیا۔

اکثر مشرقی مصنفین اُسے سکندر رومی کہہ دیا کرتے ہیں حالانکہ اُسے روم کے ملک سے کوئی علاقہ نہ تھا۔ اُس کے زمانے تک دنیا میں روم الکبریٰ کی عظمت نہیں مانی گئی تھی۔ اہل روم اپنے وطن میں گرد و نواح کی قوموں سے لڑتے اور گناہی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اور اہل یونان کی مذہب دنیا میں اُن کا شمار اعلیٰ جاہل و جوشی اور غیر متقدم قوموں میں تھا۔ لیکن سکندر کے بہت زمانے کے بعد جب رومیوں کا کوکب اقبال چمکا۔ انگلستان سے عراق تک سارے ممالک ارض اُن کے زیر نگیں ہو گئے اور کچھ روم اُن کی قلم و سکے درمیان میں ایک جھیل بن گیا تو مغربی حصہ ایشیائے کوچک بھی جیسے ترک لوگ اناطولیہ کہتے ہیں ہمدرد رومی خاندانوں کے آہنے کی وجہ سے روم مشہور ہو گیا خصوصاً جب سلطنت روم کی تقسیم ہوئی اور جو قلم و تسلطینیہ کے زیر حکومت تھی مشرقی سلطنت روم کے نام مشہور ہوئی تو یہ ملک ساری دنیا میں روم ہی کے نام سے مشہور ہو گیا۔ لہذا اسی ملک کی نسبت اسے بعد والوں نے سکندر کو رومی مشہور کر دیا ہے۔

اصل میں جزیرہ نما سے بلقان کا درمیانی علاقہ مقدونیہ اُس کا وطن تھا جس صوبے کی وجہ سے آج کل دولت عثمانیہ یہ آفت نازل ہے اور جس کے ریاستہائے بلقان باہم تقسیم کر لینے کی آرزو مند ہیں۔ اسی علاقہ کے شہر پامین تھوٹھہ قبل مسیح میں رومی مقدونیہ میں سکندر اعظم سے پہلے اُس کے نام کے دو اور بادشاہ گزر چکے تھے۔ پہلا سکندر تھوٹھہ قبل مسیح میں مقدونیہ پر حکومت کرتا تھا۔ اور اسی کے زمانے

میں دار اسے عجم کھنسر و نے ملک یونان پر چڑھائی کی تھی۔ وہ مقدونیہ کا آٹھواں تاجدار تھا۔ اُس کے بعد دوسرا سکندر اسی ننگ کا سولھواں سربراہ تھا جس کا زمانہ سکندر قبل مسیح میں تھا۔ لیکن اُس وقت تک تاجداران مقدونیہ کا شمار جوشی حکمرانوں میں تھا اور یونانی اُن کی کچھ وقعت نہیں خیال کرتے تھے۔ تیسرا ہی سکندر ہے جس کے حالات ہم لکھنا چاہتے ہیں اُس کے باپ نے پہلے پہل عروج پکڑا۔ اور چونکہ اب یونانیوں کا زوال شروع ہو چکا تھا لہذا اُس نے سارے یونان کو فتح کر کے اپنے زیر فرمان بنالیا۔ فیلقوس کو اہل مغرباً قلب کہتے ہیں۔ اُس نے قوت حاصل کرتے ہی کوشش کی کہ مقدونیہ شان و شوکت اور علم و فضل تمام باتوں میں امتیاز (اثنین) اور اسپارٹا کا ہم بلہ بنا سکے۔ لیکن اُس کی تمام اقبال مندوں سے یہ خوش نصیبی بدرجہا زیادہ بھی ہوئی تھی کہ وہ سکندر اعظم کا باپ تھا۔ مغربی ایشیا مائنر کے شہر افسوس میں ٹویانا دیوی کا ایک بڑا بھاری مندر تھا جہاں عبادت و زیارت کے لیے نام بت پرستان یونان جلیا کرتے تھے۔ اور سارے یونان والوں کو اس سے بڑی عقیدت تھی۔ جس سال سکندر پیدہ ہوا اُسی سال اتفاقاً ایسی آگ لگی کہ وہ بڑا بخت فائدہ مند ہو گیا۔ اور صورت بھی خاک میں مل گئی۔ جس امر کو اہل مقدونیہ اور سکندر کے مورخوں نے اُس کی بے روک فتوحات اور سرزمین ایشیا پر اُس کے غالب آنے کا ایک قدرتی اشارہ تصور کیا۔ اور شاید مقدونیہ والوں کے دل میں خیال گزرا ہو کہ اس مندر کی برابری سکندر کے لیے ایک شگون نیک ہے۔ اور یہ واقعہ بتاتا ہے کہ اس شاہزادے کی کوئی بڑی شان ہونے والی ہے۔

فیلقوس نے سکندر کی تعلیم و تربیت کے لیے بڑے بڑے اعلیٰ درجہ کے استاد اور فلسفی منتخب کیے۔ پہلے تو اُسے اُس عہد کے مشہور فلسفی لائی ماچوس کے زیر تربیت رکھا پھر چند روز بعد دنیا کے مشہور ترین فیلسوف ارسطو طالیس کو اُس کا استاد اور اتالیق مقرر کیا۔ ارسطو نے سکندر کی تعلیم و تربیت میں بے انتہا کوششیں کیں۔ اور اُس کے اخلاق کے درست کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔ اور لوگوں کا خیال ہے کہ بچپن ہی میں جو حوصلہ مندی کی باتیں سکندر کے طرز عمل سے اکثری پر ہو جایا کرتی تھیں وہ ارسطو ہی کی تعلیم و تربیت کی برکتیں تھیں۔

ایک بار فیلقوس کی ایک فتح کا مژدہ سننے کے بعد حسرت کے لمحے میں بول اٹھا "ابا جان تو کسی ملک کو چھوڑتے ہی نہیں پھر میں کس ہنر زمین کو فتح کروں گا؟" ان دنوں یونان میں اہلپک نیم ہوا کرتے تھے جن میں تمام مشہور سپہ گراور بڑے بڑے بہادر سوار آ کے سپہ گری کے ہنر اور شہسواری کے کرتب دکھا کر لاتے تھے سکندر نے چونکہ ان کھیلوں میں کبھی دیکھی نہیں تھا ہر کی تھی اس لیے ایک دن فیلقوس نے تعجب سے کہا کہ "سکندر ان کھیلوں میں نہیں شریک ہوتا؟" سکندر سننے ہی بیاختہ کہ اٹھا "مجھے مقابلہ کے لیے بادشاہوں کو بتائیے تو اپنا ہنر دکھاؤں۔ ان کھیلوں میں تو مجھے مزہ نہیں آتا۔"

اُس کا گھوڑا "بوتے فائوس" عجیب و غریب گھوڑا تھا۔ ایسا منہ زور اور سرکش تھا کہ کبھی کسی شہسوار کی ران اُس کی پیٹھ پر نہیں جم سکتی تھی جس کسی نے سواری کا ارادہ کیا اُس نے دسے ہٹا۔ اگر سکندر کہیں ہی میں اُسے اپنے قابو میں لے آیا۔ اور اُسے ایسا عزیز ہو گیا تھا کہ دنیا کے تمام سرکون میں وہی اُس کے زیر ران تھا۔

ہو مر شاہی مشہور شہنوی "الیڈ" جو یونانی شاعری کا اعلیٰ ترین نمونہ اور یونانیوں کی مہابھارت تھی سکندر کو یہ انتہا پسند تھی۔ اور جب وہ دل گھیرتا اُسی کو مزہ۔ دیکھ کے پڑھنے لگتا۔ جس کی وجہ سے یونان کے تمام شجاعان سلف کے کارنامے ہر وقت اُس کی پیش نظر رہتے۔ اور یونان کا رستم و شان "ایچلیر" سکندر کی نظر میں بھی عسکری ملک گیری کی ایک ایسی نظر بن گیا جیسے وہ ہر وقت اپنے خیال کے سامنے رکھتا اور گوش کرتا کہ اپنے آپ کو ویسا ہی بنائے۔۔

تیس سال قبل مجرمین جب فیلقوس کسی سفاک کے خنجر غوریز سے مارا گیا اور یہ بھی بت نہ چلا کہ اُس کے قاتل کا اصلی مقصد کیا تھا اسوقت سکندر کی عمر صرف بارہ برس کی تھی۔ لیکن اُس کے ذاتی جوہر کو اس سطح کی تعلیم نے ایسا بنا دیا تھا کہ بڑے بڑے سن رسیدہ لوگوں سے اچھا تھا۔ اور حکمرانی و ملک گیری کے لیے انتہا سے زیادہ موزون تھا۔ چنانچہ سریر شہریاری پر قدم رکھتے ہی اُس نے اپنی فتوحات کا سلسلہ شروع کر دیا جس کی بدولت اُسے دنیا میں ناموری حاصل ہوئی بعد اس میں شک میں کہ فیلقوس نے مرے سے پہلے سارے یونان کو اپنا ملک بنالیا اور باج گزار

بنالیا تھا۔ گروہ لوگ اس اطاعت و فرمان برداری کو دل سے نہیں پسند کرتے تھے۔ اور یونان کی کئی ریاستیں تو آمادہ ہی تھیں کہ جس قدر جلد ممکن ہو مقدونیہ کی غلامی سے نجات حاصل کر لیں۔ اُن کے ان ارادوں کی خبر سننے ہی سکندر جوش و خروش کے ساتھ اُن کے سر پر چا پہنچا اور اُنھیں پورا پورا مطیع و منقاد بنانے کے بعد اُن سے خواہش کی کہ ایک اسپارٹا کو تو چھوڑ دو جہاں کی سپہ گری کا سب لوہا مانتے ہیں باقی ماندہ تمام اضلاع و ریاستہائے یونان کا سپہ سالار اعظم مجھے تسلیم کرو جس طرح کہ میرا والد فیلقوس کو تسلیم کرتے تھے۔ اُن لوگوں نے جب دیکھا کہ نہ لڑتے بنتی ہے اور نہ کسی طرح بھیجا جھوٹا ہے تو اُسے سپہ سالار اعظم یونان تسلیم کر لیا۔ جس کے معنی یہ تھے کہ اُنھوں نے اُس کے آگے سرطاعت جھکا دیا۔ اور ماری مان لی۔

ان لوگوں کو سیدھا کرنے کے بعد اُس نے علاقہ تھریس پر چڑھائی کی۔ اور چند نعتوں کے بعد اسے بھی اپنے قبضہ میں کر لیا۔ تھریس ہی کے انتظام میں لگا ہوا تھا کہ ناگدان خیر آئی قلمرو یونان میں شہر تھیبیا والوں نے علم بغاوت بلند کیا ہے۔ سینٹیہی یونان کی طرف بھاگ پڑا۔ اور بلائے ناگدان کی طرح تھیبیا والوں کے سر پر چا پہنچا اور پہلے ہی دھاوے میں اُسے خنجر کر لیا۔ اُن لوگوں کی بے وقت سرکشی سے کچھ ایسا غصہ میں بھرا ہوا تھا کہ شہر کے بستہ سے لوگوں کو قتل کر ڈالا۔ اور وہاں کی تمام عمارتیں منہدم کرادیں۔ صرف ایک پندار شاعر کا گھر تو چھوڑ دیا باقی سارے شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔

سکندر کی اس سخت گیری نے یونان کے سارے سرکشوں کو دھمکے سے کر دیا۔ تمام ریاستہائے یونان کے ہوش ٹھکانے ہو گئے۔ اور کسی میں بھی اب چون و چرا کی مجال نہیں باقی تھی یہاں تک کہ اچیتھنز میں بھی کوئی دم نہ مارا جہاں کے لوگ سکندر کی مخالفت پر آمادہ ہو چکے تھے اور علم مخالفت بلند کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ اس طریقہ سے اُس نے کل ریاستہائے یونان کو اپنا مطیع و منقاد بنانے کے سارے جنوبی حصہ جزیرہ نما سے ہٹا کر اپنے زیر فرمان کر لیا۔ اور ہر طرف سے پورا پورا اطمینان کر کے مقدونیہ میں آگیا۔ جب یونان خوب نارخ البالی حاصل ہو گئی تو اُس نے ارادہ کیا کہ سرزمین

ایشیا میں گھس کے داراے ایران کو شکست دے جس کی سلطنت سے زیادہ زیر دست بادشاہی ساری دنیا میں نہ تھی۔ دروہ دانیال سے لے کے حدود ہند تک کل ممالک تاجدارانِ عجم کے زیرِ نگین تھے۔ اور کبھی یونانیوں کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں گزری تھی کہ ہم اپنے حدود سے باہر نکل کے شہنشاہِ ایران کے ملک پر حملہ کر سکیں گے۔ اس میں شک نہ تھا کہ جب وہ چالیس ہزار یونانی جو دھوکے دھوکے میں دریا سے فرات کے اس پار آگئے تھے جانوں پر کھیل کے دریا کنارے کینا کر جل کھڑے ہوئے اور صد ہا طرح کی سختیاں اور مصیبتیں پھیل کے اپنے وطن میں پہنچ گئیں تو یونانیوں میں سفر سے گونہ اُٹس پیدا ہو گیا۔ اور اسی سلسلہ میں انھیں اس بات کا بھی تجربہ ہو گیا کہ اگر کوئی لشکر بادی سے لڑے تو ایرانی باوجود اپنی سطوت و جبروت کے اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ انھیں چیزوں نے سکندر کو اس ہم پر آمادہ کیا اور انھیں خیالات کی وجہ سے یونانی سپاہی اُس کا ساتھ دینے کو کو تیار ہو گئے۔

انرض سکندر اپنی عمر کے بائیسویں سال چالیس ہزار جانبازوں کا زبردست لشکر لے کے بسپانٹ (دروہ دانیال) سے اُتر کے ایشیا میں داخل ہوا۔ یہاں آتے ہی اُس نے جو بیلا کام کیا یہ تھا کہ اپنے درست میفا سیطیوں کے ساتھ اُس گاؤں میں گیا جو قدیم شہرِ ژراے کے مقام پر آباد تھا۔ جہاں قدیم یونانی رستم ”ایکلینر“ کی قبر تھی۔ یہی یونان کا دہ مارینچی اور نہ ہی نامور تھا جس کے حالات سکندر ایلید میں بار بار پڑھتا رہا تھا۔ اور جس کے کارناموں کو اُس نے اپنے لیے عمدہ نظیرین قرار دے رکھا تھا۔ یہاں اُس نے ایکلینر کی قبر پر چڑھا دیے چڑھائے۔ اپنی دھال بھی وہاں چڑھا دی۔ وہاں کی ایک دھال جو دیوار پر ادیران تھی اُتار لی اور آگے روانہ ہوا۔

شہرِ عراقون کے میدان میں دارا کے لشکر سے اُس سے پہلی لڑائی ہوئی جس میں اُس نے لشکرِ عجم کو شکست دی اور گرد و نواح کے علاقوں پر قابض و متصرف ہو گیا۔ اسی نواح میں پُرانا شہرِ گورڈیم تھا۔ جو فریجیہ کے علاقہ میں تھا۔ یہاں کے ایک اگلے نامور بادشاہ گوردیوس نے ایک گرہ لگا رکھی تھی جو کسی کے کھوئے

نہ کھلتی۔ اور مشہور ہو رہا تھا کہ جس کسی نے اس گرہ کو کھول لیا اُس نے جانیے کہ ایشیا کو فتح کر لیا۔ سکندر نے یہاں پہونچ کے اس گرہ کو اپنی تلوار سے کاٹ ڈالا۔ گویا یہ بتا دیا کہ میں ایشیا کو یوں فتح کروں گا۔

اب سکندر یہاں سے آگے بڑھ کے شہر قلیقیہ میں پہونچا۔ اور دریا سے قدسوس میں ایسے وقت نہایا جبکہ اُس کا پانی بہت گرم ہو رہا تھا۔ نہاتے ہی بخار چڑھ آیا۔ اور ایسا بیمار ہوا کہ جان کے لالے پڑ گئے۔ حکیم فلپ اُس کا پرانا معالج تھا جو سفر میں ہمراہ رکاب تھا۔ اسی کا علاج شروع ہوا۔ اثنائے علاج میں سکندر کو اپنے ایک معتبر دوست "پارے بنو" کا ایک خط ملا جس میں لکھا تھا کہ "فلپ کا علاج ذرا سوچ سمجھ کے کیجیے گا۔ وہ دشمنوں سے ملا ہوا ہے اور اس بات کی رشوت لے چکا ہے کہ آپ کو زہر دے دیگا۔" سکندر نے اس خط کو پاس رکھ لیا۔ اور جب فلپ ایک قوی الاثر دوا کا جام تیار کر کے لایا تو سکندر نے وہ خط فلپ کے ہاتھ میں دیا کہ اسے پڑھ لیجیے اور دوا کا کٹورہ اُس کے ہاتھ سے اُس کے سینہ سے لگا لیا۔ فلپ نے خط پڑھ کے نظر اٹھائی تو سکندر دوا پی چکا تھا۔ دیکھتے ہی ذنگ رہ گیا۔ اس واقعہ کا حکیم فلپ اور سارے حاضرین کے دل پر بڑا اثر ہوا۔ پھر اُس کے بعد جب سکندر کو صحت حاصل ہوئی تو فلپ کو بہت کچھ انعام دیا اور اُس کی عزت افزائی کی۔

اب دارا سے عجم کا زبردست لشکر قریب آگیا تھا۔ شہر اس سوس کے قریب ۳۳۰ قبل مسیح میں دوسری لڑائی ہوئی دارا کے زیر علم بڑی بڑی زبردست اور بہادر قوموں کے سپاہی تھے مگر اقبال اُس کا ساتھ چھوڑ چکا تھا۔ پھر شکست ہوئی۔ اور ایسی شکست کہ دارا تو اپنی جان بچا کے بیک بینی دود گوش بھاگ گیا مگر اُس کا خزانہ مال و دولت اور ساز و سامان سب یونانی فاتح کے ہاتھ لگا۔ بہت سے ایرانی اسیر ہوئے جن میں دارا سے عجم کی ماں بی بی اور بچے بھی تھے۔ ان شاہی گہرانے کے معزز امیروں کے ساتھ اُس نے ایسا شریفانہ برتاؤ کیا

کہ دارا سے ایمان کی مان کو سکندر کی سعادتمند یوں کے سامنے اپنا پیٹ بھول گیا۔ اور سکندر کو وہ اپنے بیٹے سے زیادہ سمجھنے لگی۔ غرض کہ ان امیروں کے ساتھ اُس کا برتاؤ دنیا میں شریف النفسی، فیاضی اور اخ

کا اعلیٰ ترین نمونہ خیال کیا جاتا ہے۔

اس فتح کے نتیجہ میں ممالک فینقیہ - دمشق اور چند دیگر ممالک اس کے زیر فرمان ہو گئے۔ اب چونکہ دارا کی طرف سے کسی تازہ فوج کے آنے کی امید نہ تھی اس لیے اُس نے شہر طائر یا سور پر حملہ کیا۔ یہ لوگ دنیا کے اول درجہ کے جہازران تھے ساری دنیا کی تجارت اُن کے ہاتھ میں تھی۔ اور اپنی بحری قوت سے دولت عجم کو بہت بڑی مدد دیتے تھے۔ طائر والوں نے مقابلہ سامان کیا۔ اور سکندر نے اُن کے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ جس میں کئی مہینہ لگ گئے۔ یہ چھ مہینہ کی مدت سکندر کی بقیہ اطمینان نے بڑی بیتیابی کے ساتھ برداشت کی۔ اور اُسی کا غصہ تھا کہ فتح کرتے ہی اہل شہر پر اُس نے ایسے وحشیانہ مظالم کیے جو اُس کی شان سے بعید تھے۔ پورے ملک شام پر قابض ہو جانے کے بعد اُس نے ارض یہود اور بیت المقدس کی طرف کوچ کیا جہاں بنی اسرائیل کی پُرانی سلطنت باوجود کمزوری کے تقدس اور دینی اُن بان کے ساتھ قائم تھی۔ یہود کے مقدسے اعظم کو جو اُس زمانے کا نبی تھا الامام ہوا کہ شہر سے نکل کے سکندر کا استقبال کرے۔ چنانچہ سکندر کے قریب آ پونچنے کی خبر سننے ہی وہ اپنا مقدسائی کا لباس پہن کے مذہبی جلوں کے ساتھ باہر نکلا۔ اس مقدس و محترم شخص کی صورت دیکھتے ہی سکندر نہایت بے اختیاری کے ساتھ تعظیم کے لیے جھکا۔ اور اس قدر جھکا کہ اس سے پہلے کبھی کسی کے سامنے نہیں جھکا تھا۔ یہ دیکھ کے اُس کے رفیق سفر باریسے نیو کو حیرت ہو گئی جسے نقش حیرت دیکھ کے سکندر نے کہا "اس ہم پر روانہ ہونے سے پہلے مقدونیہ میں نے اُنھیں بزرگ مقدس کو خواب میں دیکھا تھا جنھوں نے مجھے دعا کے ساتھ بشارت دی تھی کہ میں اپنی تمام مہموں میں کامیاب و فتح مند رہوں گا" سکندر یہ کہہ رہا تھا کہ مقدسے بنی اسرائیل نے تورات کھول کے حضرت دانیال کی پیشین گوئی سنائی کہ ایک یونانی بادشاہ سلطنت عجم کو درہم و برہم کر دے گا۔ ان باتوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ یہود کی حقانیت کا نقش سکندر جم گیا۔ چنانچہ شہر میں اور خاص حرم میں داخل ہو کے اُس نے اپنی طرف کی اور چڑھاوے چڑھائے۔

المقدس سے بڑی بڑی آرزوں اور امیدوں کو دل میں لیے ہوئے وہ

مصر کی طرف روانہ ہوا۔ پوچھتے ہی اُس قدیم سرزمین کو بھی فتح کر کے اپنے زیرِ قلمیں کیا۔ یہاں اُس نے شہر اسکندریہ کو آباد کیا پھر حیو پٹر آمون دیوتا کے مندر سے اپنے حق میں فال طلب کی۔ وہاں کے پوجاری نے اُس کا حوصلہ اور بڑھا دیا۔ یہی نہیں۔ اس نے یہ بھی کہلا بھیجا کہ ”آپ ہمارے دیوتا جو پٹر کے فرزند دلبند ہیں“ جس سے زیادہ خوش نصیبی کی کوئی شے ایک بت پرست بادشاہ کے لیے نہیں ہو سکتی تھی۔

اب دارا نے پھر ایک بڑا بھاری زبردست لشکر جمع کر لیا تھا جسے لے کے مقابلہ پر روانہ ہوا تاکہ اپنی سلطنت کو یونانی فاتح کی دست برد سے بچاے۔ اس کی خبر سننے ہی سکندر مصر سے چلا۔ اور جلد جلد کوچ کرتا ہوا اربیلہ (اردبیل) میں پہنچا۔ یہاں اسکندر قبل مسیح میں وہ دارا سے تیسری لڑائی لڑا دارا نے بہت کچھ ہاتھ پاؤں مارے مگر قسمت سے کون لڑ سکا ہے؟ اب کی بھی شکست ہوئی۔ اور اسی شکست کو ایران کے خاص شہروں اور دارا سلطنتوں شوسا اور پرسی پولی (اصطخر) پر بھی سکندر کا قبضہ ہو گیا۔

اس فتح کے بعد اصطخر کے ایوان شاہی میں وہ خوشی کے جشن منا رہا تھا اور بے تذبذب کے نشہ میں مست تھا کہ اُس نام آئینہ کی ایک پرری جمال رنڈ نے جو یونانی مذاق میں دلبری کے تمام فنون میں کامل اور اسکندر جہ کی مشوقہ تھی۔ اور اس مہم میں سکندر کے ساتھ آئی تھی اُسے ایک ایسے کام پر آمادہ کر دیا جو اسکندر نے نہ کرنے کا تھا۔ یونانیوں کے دلوں میں ایرانیوں کا بغض بھرا ہوا تھا۔ اور اسی قدیم تباہیوں کو یاد کر کے کتب افسوس ملا کرتے تھے۔ اس سنگدل حسینہ نے سکندر کو فتح ہندی کے نشہ کے ساتھ سے ارغوانی کے نشہ میں بھی چور دیکھ کے یونان پر ایرانیوں کی دست درازیاں۔ اور اہل یونان کی تباہیاں یاد دلائیں اور کہا اُس وقت موقع ہے کہ یونانی اپنا بدلہ لیں اور دارا سلطنت جہم بن آگ لگا دی جائے۔ نشہ کے جوش میں سکندر نے اسی بات کا حکم دے دیا۔ اور اصطخر میں ہر طرف آگ لگا دی گئی۔ تمام عمارتوں پر شعلہ بلند ہوئے۔ سارا شہر جل کے خاک سیاہ ہو گیا۔ اور اسی کے ساتھ ایران کا قدیم علمی ذخیرہ اور پارسی لٹریچر بھی خاک میں مل گیا۔

اب دارا سب طرف سے مایوس ہو کے باختہ کی طرف بھاگا اور سکندر اُس کے

تغاب میں آگے بڑھتا چلا جاتا تھا کہ ناگمان خبر آئی دارا کو اُس کے ایک معزز سردار اور معتدلیہ درباری نے جس کا نام بسٹوس ہے دغا بازی کے ساتھ مار ڈالا اور پار تھیا کے دشت میں اُس کی لاش خاک پر چڑی ہوئی ہے۔ یہ سن کے سکندر کو نہایت افسوس اور بڑا صدمہ ہوا۔ نمک حرام اور دغا بازی راہی بسٹوس کو فوراً گرفتار کر کے قتل کر ڈالا اور خود دلا کی لاش پر دوڑا گیا۔ تاجدارِ عجم کی بے کفن لاش کو کمال بیکسی کی حالت میں خاک و خون میں لقمہ ڈالا اور زمین پر پڑا دیکھ کے اُسے نہایت حیرت ہوئی دنیا کی بے ثباتی کی تصویر آنکھوں کے سامنے چھٹتی۔ نوراً اپنی عجا اُتار کے اُس کی لاش پر ڈال دی۔ چند اُتار بہا گئے۔ اور حکم دیا کہ دارا کی لاش منظر میں لیجا نہایت شان و شوکت اور تزک و احتشام کے ساتھ اس کے آبائی وطن میں رکھی جا جس پر پورا پورا عمل کیا گیا۔

اب سکندر کے سامنے فیج کرنے کے لیے کوئی ملک نہیں باقی تھا۔ کیونکہ بیان سے آگے مشرق کی طرف اس زمانے سے پہلے نہ کبھی کسی تاجدارِ عجم نے قدم اٹھایا تھا۔ اور نہ کسی مغربی فرمان روا کو اس کا حوصلہ ہوا تھا مگر اتنی فتون کے حاصل ہونے سے تختہ ی کا شوق سکندر کی طبیعت شائو بن گیا تھا۔ چنانچہ پہلے تو اُس نے تمام اُتار و مالک ایمان کو اپنے زیرِ نگیں کیا۔ اور جب ارد کوئی میدان حوصلہ مندی کا جوش دکھانے کے لیے نہیں باقی رہا تو ہندوستان پر چڑھانی کرنے کی تیاریاں کر دیں۔

مسئلہ قبل مسیح کے آغاز ہی میں وہ دریاے اٹک کے پار اُترا۔ اور خیال کیا جاتا ہے کہ جس مقام پر وہ اس دریا سے پار ہوا ہے وہ موجودہ شہر اٹک کے کمین قریب ہی تھا۔ اٹک کے اس پار آتے ہی وہ اُس مندرجہ ذیل تھا جو فی الحال پنجاب کہلاتی ہے۔ بیان دریاے جہلم کے کنارے اُس سے راجہ پورس سے لڑائی ہوئی جو اُس کے مقابلہ کو بڑا زبردست لشکر لے کے آیا تھا جس میں ہاتھی بھی تھے۔ مگر سکندر کا راز مودہ اور صدمہ میدانوں کا مزہ چکھے ہوئے سپاہیوں سے لڑنا آسان نہ تھا راجہ کو شکست ہوئی جو گرفتار کر کے سکندر کے سامنے لائے کھڑا کر دیا گیا۔ مگر وہ ایسی شجاعت سے لڑا تھا اور لڑائی میں اُس سے ایسے شریفانہ افعال ظاہر ہوئے تھے کہ سکندر اُس کے حال پر مہربان ہو گیا۔ اور اُس سے مل کے بہت

خوش ہوا۔ یا یون کہیے کہ اس ملک میں سکندر کی پالیسی ہی یہ قرار پائی کہ کسی ایک کو اپنا دوست بنائے۔ غرض خلعت و انعام کے ساتھ اُس کا ملک اسے واپس کیا۔ اور کوشش کی کہ اُس کی قلمرو کو وسیع کر دے۔

راجہ پورس سے دوستی کر کے سکندر آگے بڑھا۔ اور دریائے چناب کے کنارے پہونچا۔ اس کے بعد دریائے چناب اور دریائے راوی کے درمیان اُسے ایسا اوسر علاقہ ملا جس کے طے کرنے میں اُسے کسی قدر دشواریاں پیش آئیں۔ میں اُسے ایک قوم سے مقابلہ کرنا پڑا جس کا نام یونانی مورخین "کتھائی" بتاتے ہیں۔ غالباً یہ جاٹ لوگ تھے جن کی اہلیت کا تبت و خطا میں پتہ چلا ہے اور کیا عجب کہ اُس قدیم زمانہ میں اپنے اصلی وطن کی نسبت سے خطائی کہے جاتے ہوں۔ سکندر نے اُنھیں بھی شکست دی۔ اور اُن کا ملک اُن سے چھین کے اپنے دوست راجہ پورس کو دے دیا۔

اس معم کے بعد راوی کے پار اتر کے دریائے ستلج کے کنارے آ پہونچا۔ جہاں سے قدم آگے بڑھاتا تو دادی گنگا کے علاقہ میں داخل ہو جاتا۔ مگر اُس کی فوج متحبا سفر سے تنگ آ گئی تھی جس کے انکار نے سکندر کی اوالو العزمی کی باگ بین پر روک دی۔ مجبوراً واپسی کا ارادہ کر کے اپنی فتوحات کی یادگار میں یہاں اُس نے بارہ برج تعمیر کرائے۔ اور پنجاب کا جتنا ملک فتح کیا تھا سب راجہ پورس کے حوالے کر دیا واپسی کے وقت اُس نے کشتیوں کا ایک بیڑہ بنوایا۔ اور اپنے ایک افسر نیا رچوس کو اپنا امیر البحر مقرر کر کے ان کشتیوں کو اُس کے زیرِ کمان سمندر کی طرف روانہ کیا۔ اور خود بھی جنوب کی راہ لی۔ یہاں راستہ میں اس سے ایک دوسرا ہمار قوم سے مقابلہ ہوا جو "ملی" کے نام سے مشہور تھی۔ ان لوگوں کے شہر کا جو یقیناً مجموعہ ملتان تھا اُس نے محاصرہ کر لیا۔ اور بڑی سختی سے دھاوا کیا۔ یہ لڑائی اُس کی زندگی کی تمام ہمنوں سے سخت تھی جس میں اُس سے شجاعیت بھی ایسی ظاہر ہوئی جیسی کہ بھی نہیں ظاہر ہوئی تھی۔ اور زخمی بھی ایسا ہوا کہ زندگی بھر زمین پر لٹتا۔ پس یہ سب کہ قضا کے چنگل میں جان ہو کے چھوٹا۔ اور موت کے منہ سے بھرا۔ مگر اقبال اب بھی رکاب تھامے ہوئے تھا۔ آخر قی لوگوں کو شکست ہوئی اور وہ ملتان کو فتح کر کے سندھ کے انتہائی حدود پر پہونچا۔

بیان سے اُس نے بیڑے کو تو کنا رے ہی کن رے خلیج فارس کی طرف روانہ کیا۔ اور خود خشکی کے راستہ سے مکران ہوتا ہوا مغرب کی طرف چلا۔ اس بے آب و گیاہ ملک کے سفر میں اُسے ایسی سخت دشواریاں پیش آئیں کہ کبھی نہیں پیش آئی تھیں۔ اکثر منزلوں میں نہ اور اس کا سارا لشکر ایک ایک قطرہ آب کو ترس گیا۔ آخر بھوک پیاس کی تکلیفیں برداشت کرنا خدا کر کے ارض فارس میں پہونچا۔ جہاں ہر قسم کا سامان راحت مہیا تھا۔ دارالسلطنت موسا میں پہونچ گئے اُس نے ایک عظیم الشان دربار کیا جس میں اپنے اہل بیت اور عروج کی آخری تصویر اپنی آنکھوں سے دیکھ لی۔ اور نظر آیا کہ ساری دنیا اُس کے علم اقبال کے آنگے سرینا زنجبکائے ہے۔ اس دربار کے بعد موسا سے روانہ ہو کے بابل میں پہونچا۔ بیان ایک قسم کی سہمی ہوا چلا کرتی تھی جس کے اثر سے لوگ مشکل جانبر ہو سکتے تھے۔ سکندر کو بابل پہونچے چند ہفتہ ہوئے تھے کہ اُس سہمی ہوا کا وہ بھی شکار ہوا۔ شدت سے بخار چڑھ آیا۔ جیسے بخواری کی کثرت نے اور بڑھا دیا۔ اطباء حاذق نے کوئی تدبیر اٹھانہیں رکھی۔ مگر کوئی دوا کارگر نہ ہوئی اور آخر ۳۲۷ قبل مسیح میں یمنی راہی عدم ہوا جب کہ اُس کی عمر ہجرت کی تھی۔ ۲۱ برس کی حکومت میں اُس نے جو کچھ کر دیا بڑی بڑی قوین صدیوں میں نہیں کر سکی ہیں۔ اگر زیادہ جتنا تو خدا جانے کیا کرتا۔

نزع کے عالم میں وصیت کر دی تھی کہ میری لاش میرے بساے ہوئے شہر اسکندریہ میں بچا گئے دفن کی جائے۔ چنانچہ جنازہ بڑے اہتمام کے ساتھ مصر کی طرف روانہ کیا گیا۔ اور اسکندریہ میں پہونچتے ہی بطلمیوس لاغوس نے جو مملکت مصر میں سکندر کی حکومت کا جانشین قرار پایا تھا ایک سوئے کے تابوت میں رکھ کے اُسے آغوشِ لحد کے سپرد کیا۔ ایک مدت کے بعد بطلمیوس کی نسل کے کسی جانشین نے سکندر کی ہڈیاں اُس طلائی تابوت میں سے نکال کے ایک شیشہ کے تابوت میں رکھیں اور وہ طلائی تابوت اپنے قبضہ میں کیا۔

سکندر کی چار بیویاں تھیں۔ اور ان کے ناموں اور حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ چاروں عجیبہ اور ایرانی نژاد تھیں۔ پہلی بار سینا، جو ارطابادیس کی بیٹی تھی اُس کے باپ کا نام بول رہا ہے کہ کوئی ایرانی الاصل رئیس تھا۔ دوسری

رُوشا جو عجیبہ شاہزادی تھی اور اُسی کے بطن سے اُس کا بیٹا سکندر پیدا ہوا تھا۔ جسے سکندر نے جو مقدونیہ یونان میں سکندر کا وارث بنا تھا اس کی مان کے نہایت مہاباری اور کورنکی سے مارا ڈالا۔ تیسری پری ساقیس (دہری زاد) جو ارتا زیرس دارو شیرا کی بیٹی تھی۔ اور جو تھی ستا تیرا جو آخری تاجدارِ ہجرتِ مقدانوس کی بیٹی تھی۔ سکندر کے حالات اور اُس کی اخلاقی حالت کو دیکھیے تو عجب متضاد باتیں نظر آتی ہیں۔ بعض موقعوں پر وہ بڑا رحم دل اور بعض موقعوں پر سخت ظالم ثابت ہوتا ہے۔ آخر میں اُس کی سرشت میں سے یونانی سادگی بالکل جاتی رہی تھی۔ ایرانی دربار اور اس کے عجم کی خوشامد دن نے اُسے باور کرایا کہ میں دنیا کا سب سے بڑا شہنشاہ ہوں۔ یونانیوں نے اُس کے اصرار سے اُس کو دیوتاؤں کی فہرست میں درج کر لیا۔ اور خود اُس کو بھی یقین آگیا کہ میں انسان نہیں دیوتا ہوں۔

شراب بہت کثرت سے پینے لگا تھا۔ اور اکثر پیٹے پیتے اس قدر بدمست ہو جاتا کہ اپنے نیک دہد کی خبر نہ پتی اور نہ اپنے پرانے کا امتیاز باقی رہتا۔ اسی نشہ میں ایک یونانی ریڈی کے کہنے سے اُس نے ایران کے قدیم دارالسلطنت اصطخر میں آگ لگوا دی اور سارا مشرقی لٹریچر فنا کر دیا اور اسی نشہ میں ایک دن اپنے جانی دوست فلیطوس کو خود ہی پھیریاں بھونک بھونک کے مارا ڈالا۔ اور جب ہوش میں آیا تو اپنے کیلے پر بہت کچھ بتایا۔ لیکن اُس کے ساتھ لائق اور کام کے آدمیوں کا بڑا قدردان اور علم و فن کا بڑا مربی تھا۔ ہمیشہ اُس کے دربار اور اُس کی صحبت میں بڑے بڑے عالموں فاضلوں فلسفیوں حکیموں اور خیال آفرین شاعروں کا مجمع رہا۔

یہ تھا وہ سکندر جو ہمارے لٹریچر میں مشہور ہے۔ مگر ہمیں افسوس ہے کہ اپنے شعرا کے خیال کے مطابق نہ ہم اُسے حضرت خضر سے ملا سکے۔ نہ اُس کو چشمہ آبِ حیات کی تلاش میں ارضِ فلکیات میں سرگردان پھرا سکے۔ اور نہ اُس کے ہاتھ سے سد سکندر کی تعمیر کرا سکے۔

عثمانی سطوت کا خاتمہ

سنہ ۱۹۱۳ء کی سب سے بڑی اور کبھی نہ بھولنے والی یادگار یورپ میں سلطنتِ عثمانیہ کا خاتمہ ہے

دنیا میں صرف یہی ایک سلطنت باقی تھی جس کی طرف مسلمانوں کی نظرین اٹھ جایا کرتی تھیں۔ اور جس کے دم سے اُن کی تمام امیدیں وابستہ تھیں۔ افسوس اس سال یورپ نے اُس کا خاتمہ کر دیا۔ اور آل عثمان کا سارا عروج و اقبال ایک خواب و دھن ہو گیا۔

دنیا تغیر پذیر ہے۔ اور ناکام و نامراد اپنی آرزوؤں میں تھک کے اور ہر طرف مایوس ہو کے کہا کرتے ہیں کہ اگر ہم مت گئے ہیں تو ہمارے مٹانے والے بھی ہمیشہ نہ جین گئے۔ ایک دن آنے کا اور ضرور آئے گا جب اُن کی ہستی بھی یونہی مٹ جائے گی۔ مگر ہمیں کیا۔ ہم تو مٹ گئے۔ اور اس کے بعد وہ مٹے تو کیا اور رہے تو کیا۔ بعد از سرمن گن فیکون شد شدہ باشد لیکن افسوس اس بات کا تھا کہ ہم بے ہاتھ یاؤں ہلائے مٹ گئے۔ مسلمان درکنار یورپ کا بھی شاید یہ خیال نہ ہو گا کہ سلطنت عثمانیہ کا خاتمہ ایسی آسانی سے ہو سکے گا۔ لیکن ترکوں نے آخر اپنی زندگی دکھا دی اس عثمانی سلطنت کے عروج کے آغاز میں پہلے عثمان خان کے اُس خواب کو یاد کرو جب اُس نے دیکھا تھا کہ اُس کے جھنڈے کے نیچے ایک طرف وجہ و فرات میں۔ دوسری طرف دریائے نیل ہے۔ اور تیسری طرف دریا و مینویا ہے۔ پھر اس کے بعد اس سلطنت کی تدریجی ترقیوں کو دیکھو۔ اور اُس گھڑی کو یاد کرو جب سلطان محمد ثانی نے قسطنطنیہ کو خشکی میں کشتیاں چلا کے فوج کیا تھا گینٹ سینٹ صوفیا تکیہ کے مرکز سے توحید کا گھبراہ در کلیسا یونان کے معبود سے مسلمانوں کی جامع مسجد بنا تھا۔ اور اُس کے بعد اس سلطنت کے روز افزوں انحطاط کو دیکھو۔ صاف نظر آ جاتا ہے کہ کسی قسم کا عروج کیونکر تنزل کی صورت اختیار کرتا ہے۔

اس سے کسی کو انکار نہ ہو گا کہ ترکی کے زوال کا اصلی باعث یورپ کی جدید تمدن قوموں کی ترقی ہے۔ جن کو گوارا نہ تھا کہ یہ پرانی اسلامی سلطنت دنیا میں باقی رہے۔ سب کے پہلے نویریٹو کی بحری لڑائی میں اس کی ساری بحری قوت فنا کر دی گئی۔ اور ملک یونان کو اس کے قبضہ سے زبردستی نکال کے جنوبی قحان میں ایک نئی آزاد سی ریاست قائم کرائی گئی جس کی پیٹھ پر یورپ کا دست

شفقت تھا۔

اس کے ایک مدت بعد عثمانہ عین روس نے اندرونی ریشہ دو انیان کر کے
 ممالک بلقان میں شورشیں اور بغاوتیں کرائیں۔ اور جب باغیوں کا زور نہ چلا
 تو خود اشتہار جنگ دے کے لڑائی پھیر دی۔ جس کا خاتمہ اس پر ہوا کہ سوآرمینیا
 مقدونیہ اور البانیا کے تمام صوبجات ترکی کی قلمرو سے نکال کے خود سر ریاستیں بنا کر
 لگے۔ اور ان سب کی پشت پناہی یورپ نے اپنے ذمہ لی۔ صوبجات بوسینا اور
 ہرزیگووینا پر اسے نام ترکوں کے مقبوضہ قرار بھی دیے گئے تو ان کا انتظام آسٹریا
 کے سپرد کیا گیا۔ جزیرہ قبرس (سائپرس) کو انگلستان نے اپنے زیر حکومت لے لیا۔
 اس کے چند روز بعد مغربی و جنوبی رومیلیا جو کہستان بلقان کے اس پار تھا
 وہ بلغاریہ کو اور آلبانیا کا ایک ساحلی ٹکڑا زبردستی مانٹنی گرو کو دلوایا گیا۔ پھر
 جزیرہ کریٹ میں جھگڑے پیدا ہوئے۔ اور گریٹھائیونان کو نہیں دیا گیا۔
 اور یورپ نے اپنا مجموعی قبضہ رکھا مگر یہ صرف دکھانے کے لیے ہے اصل میں وہ
 یونان ہی کا ہو گیا۔ اس سے پیشتر مصر پر انگریزوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ اب بلغاریہ
 نے اتنی قوت پکڑ لی کہ حامیان یورپ کے سہارے برٹش کے خلاف ہتھیار اٹھا سکین
 چنانچہ پیشتر سلطان عبدالحمید خان کے عہد میں یونان نے سر اٹھایا مگر عبدالحمید خان کے تدبیر اور ان کی
 بیدار مغزی نے اس کا سر کچل دیا۔ اور ٹرکی کی فوری کامیابی پر یورپ متحہ ہو گیا۔
 لیکن اب یورپ ہی کے بھروسے پر ناتجربہ کار نوجوانان ترکے اپنے بوڑھے
 مدبر سلطنت اور اپنے دانائے عصر تاجدار کو قوت سے اتار کے جمہوری سلطنت
 قائم کی۔ عبدالحمید کا تخت سے علحدہ ہونا گویا آل عثمان کی سلطنت کے زوال
 کا دیرپا چہ تھا۔ شاہی خاندان کا ایک بیٹا محض شخص تخت پر بٹھایا گیا۔ نوجوانوں نے
 جمہوریت کا غل مچانا شروع کیا۔ اور قوم کی آزادی پر خوشیاں منائی جانے لگیں
 یہ نوجوان جوش مسرت میں باہم بغلیں ہو رہے تھے کہ آسٹریا نے بلقان کے صوبجات
 ہرزیگووینا اور بوسینا کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اس پر ترکوں نے لاکھ
 لاکھ مچایا کچھ نہ سہی گئی۔ جمہور انصاف کے بیٹھ رہے۔ لیکن چین سے نہیں بیٹھنے والے
 تھے کہ یکایک اٹلی نے جا کے طرابلس المغرب پر قبضہ کر لیا جو کہ افریقہ میں ٹرکی کا

ایک بڑا بھاری صوبہ تھا۔

ترکوں کے پاس کسی قسم کی بحری قوت نہ تھی۔ طرابلس میں نہ فوج بھیجی جاسکی۔ نہ ان کی کسی قسم کی مدد کی جاسکی۔ وہ ان کے عرب یا دو چار ترکی افسر جو چھپ چھپا کے وہاں پہنچ گئے جو شمشاد و خروش کے ساتھ لڑتے رہے اور ترکوں کی بیجا رگی پر بھی اٹلی سے ملک پر قابض ہونے کی کوئی صورت نہیں بن پڑتی تھی۔ یکایک بلقان کی ریاستوں نے ہتھیار جنگ دے دیا۔ اور ترکوں کو سوار اس کے کہ طرابلس سے دست بردار ہو کے اٹلی سے صلح کر لیں کسی بات میں مفر نہ تھا۔

لیکن اب بلقان میں لڑائی چھڑ چکی تھی۔ ایک طرف سے بلغاریہ دوسری طرف سے سر دیا۔ تیسری طرف سے مانتھی نگر۔ اور چوتھی طرف سے یونان نے اپنی فوجیں بڑھائیں۔ اور ترکوں کے بنائے کچھ نہ بنتی تھی۔ وہ لوگ برابر بلاد مقبوضہ پر قبضہ کرتے جاتے تھے اور یہاں لڑائی کے لیے ابھی تیار نہ تھے۔ کافی فوجیں سرحد پر موجود نہ تھیں۔ غرض روک تھام نہ ہو سکی اور جب تک قسطنطنیہ سے نئی فوجیں روانہ نہیں سارے مقدونیہ اور آلبانیہ اور روسیلیا پر دشمنوں کا قبضہ تھا۔ اب ترکی لشکر اتنا جمع ہو چکا تھا کہ امید تھی وہ سب کو مار کے مٹا دے گا اور پھر اپنے شہر دن پر قبضہ کر لے گا مگر اب یورپ کی دراندازی سے صلح کی گفتگو چھڑ گئی۔ اور جب ترکوں کی جانب سے لڑائی قطعی ناامدی ظاہر کی گئی تو دول یورپ نے یہ دیکھ کے کہ اب لڑائی ہوئی تو ریاست ہائے بلقان کو نقصان پہنچ جائے گا۔ یہ دھکی دی کہ اگر انڈر مین کو کو نہ چھوڑو گے اور ہماری تجویز کے مطابق فیصلہ منظور نہ کرو گے تو تمہاری ایشیائی قلمرو میں بھی ہنگامہ پیدا ہو جائے گا۔ کیونکہ روس اس ملک پر فوج کشی کرنے کے لیے تیار ہو گیا تھا سابق کی ذیل وزارت عثمانی ہر طرح کی ذلت گوارا کرنے کو تیار ہو گئی تھی مگر غیور روم جو انان ترک اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور سر بکھ ہو کے سارے یورپ کے سامنے کھڑے ہو گئے کہ تمہارا جو جی چاہے کر دہم جان دین گے مگر عزت نہ دین گے۔ حال کی گزشتہ لڑائیوں میں ترکوں کو بیشک بری طرح کی شکستیں ہوئیں گو اس کا الزام سابق کے ناپاک و نالائق وزراء پر ہے پھر بھی ایک بڑی حد تک ترکوں کو الزام دیا جاتا ہے۔ اور یورپ خوشیاں منا رہا ہے کہ جس شیر سے ہم ڈر رہے تھے وہ

بوڑھا ہو گیا۔ مگر مسلمانانِ ارض ترکوں کی شکستوں سے بہت ہی متاثر ہو کر انھیں لازمِ تھمہ ہوتا ہے۔

ترک بیشک لازمِ ہین۔ مگر اس الزام کے لازمِ ہین کہ انھوں نے ابھی طرح دشمنوں کا مقابلہ نہیں کیا۔ بلکہ اس الزام کے باوجود دنیا کی حالت دیکھنے اور دوسرے ملکوں کی ترقیوں سے واقف ہونے کے انھوں نے اپنی اور اپنے ملک کی کبھی اصلاح نہیں کی۔ یورپ کو یا کسی کو الزام دینا بیکار ہے۔ دنیا کا کچھ قطعی فیصلہ ہے کہ زبردست کمزور کو کھاجاے گا۔ ہم اسی وقت تک زندہ رہیں اور زندہ رہنے کے مستحق ہیں۔ جب تک اپنی حفاظت کر سکتے ہیں اور جس دن ہم اپنی حفاظت نہ کر سکیں گے اسی روز فنا ہو جائیں گے۔ ترکوں ہی پر منحصر نہیں ساری دنیا کے مسلمانوں میں اس بلا کا جمود ہے اور ترقی سے وہ اس قدر بھاگ رہے ہیں کہ کسی قسم کے فلاح کی امید نہیں کی جا سکتی۔

ان واقعات کو غالباً ترکوں کے پاس یورپ میں صرف مشرقی رومیلیا رہ جائیگا مگر ایشیا میں ابھی بہت بڑا وسیع ملک باقی ہے۔ سارا ایشیائے کوچک شام۔ تین۔ عراق اور عرب انھیں کی فکر میں ہیں۔ مگر کیا صلح اس کی ذمہ دار ہے کہ یورپ کی ہوس ملک گیری موقوف ہوگئی؟ ہرگز نہیں۔ یورپ میں ان پر دست برد چل کر نے کا جوش اب اور بڑھ جائے گا۔ قسطنطنیہ اب ترکوں کے پاس صرف چند روز کا ٹھکانہ ہے۔ اور ان کے قبضہ میں اس کے چھوڑ دینے کے اصلی معنی یہ ہیں کہ ہم تم کو کیارگی جلاوطن کرنا نہیں چاہتے۔ ایشیا کے کسی شہر میں اپنے مکان بناؤ۔ اور نقل مکان کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ کیونکہ وہ وقت آگیا جب سینٹ صوفیا جامع آیا صوفیہ سے پھر کینسہ سینٹ صوفیا بنے گا۔

گھڑی بھر کو ہم نے مان لیا کہ قسطنطنیہ کو بھی یورپ نے چھین لیا اور ترکوں نے اسے ٹھنڈے دل سے قبول کیا۔ کیونکہ ان کو اس سے منفرتین ہو سکتا۔ تو اس کے بعد کیا وہ ایشیائے کوچک میں چین سے بیٹھ سکیں گے؟ ہرگز نہیں۔ اب انھیں ایک گھڑی کے لیے بھی چین نہیں نصیب ہو سکتا۔ بیشک یورپ کا ایٹرن کونسلشن (مشرقی مسئلہ) ختم ہو گیا مگر اب "کونسلشن آف دی دست ایشیا" (مسئلہ)

مغربی ایشیا) پیدا ہوگا۔ اور سارا یورپ جب اور فکرون سے خالی ہوگا اسی امر پر طبع آزمایان کرنے لگے گا کہ ایشیائے کوچک کا کیا انتظام کیا جائے۔ اور ہوتے ہوتے چند روز میں عراق پر برطانیہ عظمیٰ شمالی ایشیائے کوچک ارض روم کرستان اور ارمینیا وغیرہ پر روس اور شام فلسطین پرفرانس اپنے حقوق ثابت کر چکے اور اس کی تقسیم و تجزیہ کی کارروایاں چھڑیں گی۔

یہ سب کیوں ہوا اور ہوگا اس لیے کہ ترکوں نے باوجود موقع پانے کے کبھی اپنی اصلاح نہ کی۔ محمود خان کے زمانے میں باوجود قوی مخالفین کے اتنا بہت ضرور لیا گیا تھا کہ فوجوں کا لباس ان کی ترتیب۔ اور اصول جنگ یورپ کی ترقی یافتہ قوموں کے مطابق ہو گئے۔ اور فوج جرمن افسروں کی زیر تعلیم رکھی گئی۔ اور اسی کی برکت تھی کہ دولت عثمانیہ کی زندگی دوسری اسلامی سلطنتوں سے زیادہ ہوئی۔ اور پامال ہونے میں وہ سب سے پچھلی اسلامی سلطنت ہوگی۔

لیکن فوجی ترقی میں بھی بہت سے فنون اور اصول سائنس کی پیروی لازمی ہو گئی ہے۔ بحری قوت آج کل سلطنت کی نگہداشت کے لیے بہت ہی ضروری ہے۔ یون تو ہر سلطنت اس کی اہمیت کو تسلیم کر رہی ہے اور جس کے پاس جتنے جنگی جہاز ہیں اتنی ہی وہ زیر دست سمجھی جاتی ہے مگر ایک اسلامی سلطنت کے پاس بحری قوت کا نہ ہونا تو اس کی موت کی قطعی علامت تھی۔ مسلمان دنیا کے دور دورہ ممالک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اور سب کی دلی خواہش اور آرزو یہ ہے کہ جہاد کریں اور توحید کی حمایت میں جان و دین مگر بغیر بحری قوت کے ان کی مدد اور ہمدردی سے کس قسم کا فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا۔ اور جو جان ہے وہیں پڑا سر دھنا کر دیا ہے اور کچھ نہیں کر سکتا۔ اگر جنگی جہازوں کے ذریعہ سے ترک فوج کو اپنی قلعہ و سیمک پہنچا سکتے تو ایک مہینہ کے اندر کڑوڑوں مسلمان پوچھ جاتے یا رعب کو ہمارے بلقان کے دامن میں ہوتا۔ اور دوسرے ملکوں کے بھی لاکھوں مسلمان جا پوچھتے ہوتے جو اپنا سامان جنگ اور کھانا پینا بھی اپنے ساتھ لاتے۔ لیکن دریائے کاراستہ بند ہونے کے باعث نہ کسی غیر ملک کا ایک متفنن ان کی مدد کو پہنچ سکتا ہے اور نہ خود اپنے ممالک سے وہ سپاہیوں کو میدان میں پہنچا سکتے ہیں۔

موجودہ زمانے میں تمدن ہی کے لحاظ سے نہیں بلکہ فوجی ضرورتوں اور اپنی حفاظت کے خیال سے بھی ملک میں کثرت کے ساتھ ریلوں کا جاری ہونا لازمی ہے۔ ریلوں کے ذریعہ سے ملک کی آمدنی میں گنتی ہو جاتی ہے۔ تمدن بڑھتا ہے۔ امن و امان قائم ہوتا ہے۔ اور سرحد پر دونوں اور ہفتوں میں لاکھوں فوجیں پہنچا دی جاسکتی ہیں۔ لیکن ترکوں کو باوجودیکہ ان ضرورتوں کو بخوبی سمجھ سکتے تھے اور پڑوس ہی میں یورپ کی ترقیوں سے اصلی اسباب ترقی کا مشاہدہ کر سکتے تھے۔ مگر انھیں اس کی کبھی فکر نہیں ہوئی۔ اُن کا مقتضائے حکومت یہ ہی رہا کہ ملک میں جہاں تک ممکن ہو ملین نہ جاری ہونے پائیں۔ اور تمدن ممالک یورپ کی کمپنیوں کو بعض ریلوں کی اجازت باب عالی سے دی بھی گئی تو نہایت ناگواری کے ساتھ اور سخت مجبور ہو گئے۔

یورپ کی یہ دھمکی کہ ”اگر انڈریا نوئل نہ دو گئے تو ایشیائے کوچک میں ہنگامہ پیلو جائے گا“ اور اُس کے ذمہ دار تم ہو گئے“ ترکوں کے لیے اس قدر خطرناک کیوں ہے؟ اور اس کے خلاف کرنا ترکوں کے حق میں خودکشی کیوں خیال کیا جاتا ہے؟ ذرا ایشیا تک ترک کی کا نقشہ سامنے رکھ کے غور کرو۔ کوہ اراتات وجودی جہاں ترکوں روسیوں اور ایران کی سرحد ملی ہے وہاں سے لے کے ساحل بحر اسود تک ترکوں کا سرحدی صوبہ ارض روم ہے۔ ارض روم سے قسطنطنیہ تقریباً ۵۰۰ میل بلند و تقریباً ۶۵۰ میل دمشق تقریباً ۴۰۰ میل ہے۔ لہذا اگر فوج کی قیادت روسیہ ۲۰۰ میل کی رکھی جائے تو قسطنطنیہ سے پچیس دن میں بغداد سے ساڑھے بارہ دن میں اور دمشق سے ۲۰ دن میں ترکی فوج سرحدی صوبہ میں پہنچ سکتی ہے۔ کیونکہ ریل گئی نہیں ہے۔ جہاں پاس ہیں نہیں اور دو چار ہیں تو حریف کی زبردست بھری قوت کے اندیشہ سے اُن سے کام نہیں لیا جاسکتا۔ اس کے مقابل روسیوں کی ریل سرحد کے قریب تک جاری ہے۔ جو چند ہی روز میں لاکھوں سپاہی پہنچا دے سکتی ہے۔

ترکوں کے صوبجات طرابلس و قسطنطنیہ بحر اسود کے کنارے ہیں جن میں روسی جہاز جو قوت جہاں چاہیں فوج اتار سکتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ جسے تک ترک ان سرحدی اور ساحلی صوبوں میں لشکر پہنچائیں پہنچائیں روس اُن کے ایک بڑے

حصہ پر قبضہ کر چکے گا۔ اور اگر اُس نے چھوڑے حصہ پر بھی قبضہ کر لیا تو دول
یورپ میں ایشیائے کی تقسیم کا مسئلہ چھڑ جائے گا۔ اور ترکوں کو اس کا موقع
بھی نہ مل سکے گا کہ اپنے لشکر سے کام لیں۔ اور جان بازی کا عرصہ بھی نکال سکیں۔
افسوس اب وقت ہاتھ سے نکل گیا۔ اور گزشتہ غفلت کا خمیازہ لازمی چیز
ہے جس سے مفر نہیں ہو سکتا۔

حضرات ناظرین

یہ جنوری ۱۹۱۳ء کا دگلدا زبیر کی خدمت میں پہنچتا ہے۔ فروری کا زیرِ طبع
جو غمگین حاضر ہوگا۔ اور امید ہے کہ مارچ کے دگلدا زبیر سے پہلے یا اُس کے ساتھ ہی ہم وہ نیا ناول
ہریدہ جو خریداران ۱۹۱۳ء کی خدمات میں پیش کش کیا جانے والا ہے حسب معمول ہم پر وی پی
حاضر ہوگا۔ امید ہے کہ آپ اُسے قبول فرمائیں گے۔ اب وقت آگیا ہے کہ آپ مستعدی سے
توجہ فرمائیں۔ اور اپنے خادم دیرین دگلدا زبیر کی اسانت و پیگیری کے لیے تیار ہوں۔

فلور افلورنڈا

اس ناول کا پہلا ایڈیشن مدت ہوئی ختم ہو گیا اور بازار میں جو ایڈیشن ملتا ہے
نہایت ہی ناقص اور خراب ہے۔ مگر ملک نے اس ناول کو اس قدر پسند فرمایا ہے کہ ہمیشہ خطوط آتے
رہتے ہیں کہ اچھا چھپا ہوا نسخہ بھیجا جائے۔ انھیں ضرورتوں سے دگلدا زبیر نے اس کا لائبریری ایڈیشن
تیار کیا ہے جس کی قیمت باوجود سفید چکنے ولایتی کاغذ پر ہونے۔ اور بہت صاف اور واضح چھپنے
کے وہی ڈیڑھ روپیہ (بم) ہے۔ چونکہ دگلدا زبیر کے ذریعہ سے تمام حضرات کو اطلاع دے دی گئی اس لیے
کرکار ڈیڑھ روپیہ کی ضرورت نہیں۔ جنوری ۱۹۱۳ء کے دگلدا زبیر کی اشاعت کے دس بارہ روز بعد
تمام خریداران لائبریری ایڈیشن کی خدمتوں میں ہم پر وی پی روانہ ہوگا۔

خادم قوم فیخرو دگلدا زبیر



قدرت نے باغِ عالم کے میوزیم میں عجیب عجیب نم کی متضاد چیزیں پیدا کر رکھی ہیں مگر موت اسے لذتوں کو چھیننے والی۔ اور سرسبز تون کو خاک میں ملانے والی موت انکیا یہاں کوئی منجھ سے بھی زیادہ عجیب و غریب چیز ہے بہت سے مصیبت زدوں کو تیری آرزو کرتے اور بہت سے حرمان نصیبوں کو تجھ پر مرتے دیکھتے۔ خصوصاً بقرا راں عشق اور شمع رخسار کے پروانوں نے تو تیرے شوق میں بنے انتہا ہائے ہائے بھار رکھی ہے۔ ایک نازک خیال مصیبت کی زندگی ہی کو مرنے کی تمنا ہوتا اور مکتا ہے

نادان ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہیں غائب قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دل اور دوسرا نہایت ہی جوشِ دل سے موت کے استقبال میں صدارے مر جا بلند کرتا ہے۔

ہو چکی شہرِ شہر سوئی اسے مری موت تو بھلی آئی لیکن خورے دیکھو تو یہ مرث زبانی جمع خرچ ہے۔ کون ہے جو موت سے نہیں بھاگتا اور مرنے کے نام سے کس کا دم نہیں ٹکلتا؟ انسان کی عمر جس قدر زیادہ ہوتی جاتی ہے اسی اس کی مسرتیں کم ہوتی جاتی ہیں۔ لیکن باوجود ان نادر ایوان کے اس کے دل میں جینے کی ہوس بونا فیو ما ترقی کرتی رہتی ہے۔

کسی بڑھیا کی حسین و نازنین جوانِ جوان بیٹی جس کا نام "ماہِ رخ" تھا مدت سے بیمار تھی۔ رات دن دعا کیا کرتی کہ یا اللہ اس کی آئی مجھے لگ جائے یا اتنا نا ایک اندھیری

رات کو گھر میں مان بیٹھوں کے سوا کوئی تیسرا نہ تھا۔ مریضہ کمرے میں سو رہی تھی اور ضعیفہ کھلے والان میں۔ دروازہ کھلا رہ گیا تھا۔ پڑوسی کا بیل گھر میں گھس آیا۔ اور سیدھا باورچی خانے میں گیا۔ وہاں چھوٹی دیگ کھلی پڑی تھی۔ اُس میں سر ڈالا کہ کچھ ہو تو کھاؤں۔ سر جانی لگو دیگ میں چلا گیا مگر کانا چاہا تو سینک اڑتے تھے۔ اُس دیگ کو سر پر اٹھا کے کھڑکھڑاتا ہوا بجاتا ہوا گھر اگھر کے ادھر ادھر بھاگنے لگا۔ اور گھر میں قیامت کا ہنگامہ مچا دیا۔ بڑھیا کی جوتھ کھل گئی تو ایک ایسا عجیب خلعت جو ان نظر آیا کہ نہ کبھی دیکھا تھا اور نہ سنا تھا۔ سمجھی کہ ملک الموت ہیں جو میری بیٹی کی روح قبض کرنے کو آئے ہیں۔ اسی خیال میں تھی کہ بیل کمال اضطراب کے ساتھ اس کی طرف دوڑا۔ بڑھیا بدحواس پانگ پرست اُنھ کے بھاگی اور پکار پکار کے کہنے لگی میری طرف کیوں آتے ہو؟ ماہ رخ اُس کمرے میں بیٹھی ہے! آہ! اسے ہادم اللذات موت ایہ تیرا ہی خوف تھا جس نے مان کی مانتا کو بھی بھلا دیا۔ ایک قریب المرگ بڑھیا جو قبر میں پانوں لٹکا ہے اور رات دن بیٹی کی موت کو اپنے سر پر بلایا کرتی ہے تیری صورت دیکھتے ہی اپنی جان بچاتی اور کمال سنگدلی کے ساتھ اپنے پیچھے کے ٹکڑے اور اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک بیٹی کو تیرے سامنے پیش کینے لگتی ہے بڑھیا نے زندگی سے بھی بڑا کوئی عذاب ہو سکتا ہے؟ قوی نے جواب دے دیا۔ حواس مختل ہو گئے۔ دو قدم چلنا کمال ہے۔ خدا ذرا سے کاموں کے لیے دوسروں کے محتاج ہیں۔ اور ہر خواہش میں اور ون کے دست نگر۔ یہی حالت ہے جسے دیکھ کے سکندر نے اپنی زندگی کو خیر باد کہہ دی اور آب حیات نہ پایا۔ صاف کہہ دیا کہ ایسے جینے سے مرنا بہتر ہے۔ مگر یہ سکندر ہی سے ہو سکا جو جان تھا۔ وہ پیر فانی جو بڑھیا کی کٹھن کا نرہ چکھ رہا ہے اُس کی زبان سے یہ کلمہ ہرگز نہ نکلے گا۔ اُسے زندگی کی سب سے زیادہ آرزو ہے۔ وہ معمولی قسم کے خطرے اور خدا ذرا سے اندیشے جنہیں ہم جوانی میں بالکل بوجھ اور بوجھ و بھر خیال کرتے تھے اب بڑھیا نے میں بہن نہایت ہی خطرناک نظر آنے لگے ہیں۔ ہم ہر قسم کی احتیاطیں کرتے ہیں۔ قوی الاثر دواؤں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کے لاتے ہیں۔ جس چیز میں مغز کا کچھ بھی اندیشہ نہ تھے ہیں اُس سے کوسوں بھاگتے ہیں۔ جو ہر نہی نہیں ہو سکا تھا اب ہو جاتا ہے۔ اور پھر اس پر بھی قلی موت کا دھڑکا نہیں جاتا جس سے بچنے اور ملک الموت کا مقابلہ کرنے کی تدبیروں میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتے۔ یہاں تک کہ

زندگی کے جو چند ایام باقی رہ گئے ہیں وہ اسی بے سود و بے نتیجہ کوشش میں صرف ہو جاتے ہیں کہ کسی طرح موت کے چنگل سے بچیں اور دنیا میں ہمیشہ بے رہیں۔

اپنی زندگی کے آئندہ ایام کے متعلق ہمیں کچھ بھی نہیں معلوم۔ نہ یہ جانتے ہیں کہ کتنے دن ہیں نہ یہ معلوم ہے کہ وہ کیسے گزرین گے۔ اور نہ اس کی خبر ہے کہ ان میں کیا ہوگا۔ عمر رفتہ کا میدان البتہ بڑی نظر ہے جسے ہم نے گرائے ہیں۔ جس میں تلخیان بھی تھیں مگر بہت سی دلچسپ باتیں بھی تھیں جو یاد ہیں۔ انھیں کو یاد کر کے ہم اکثر خوش ہو لیا کرتے ہیں۔ اور موجودہ ایام زندگی میں دل ستم زدہ کی تسلی کے لیے ان گزشتہ مسرتوں کی یاد سے بہتر کوئی نسخہ نہیں ملتا ہے۔ لیکن انسو میں عورت کے واقعات کا چراغ آئندہ ایام زندگی میں نہیں روشن ہو سکتا۔ وہ چراغ صرف موجودہ حصہ عمر کے گلبہ افراں تک آتا ہے اس حد سے ذرا بھی آگے بھاٹنے کا قصد کیا اور گل ہوا اس کے ساتھ قیامت یہ کہ زندگی کی دشواریوں۔ طرح طرح کی تکلیفوں اور تجربہ کی وحشت نے دل میں دھڑکا پیدا کر دیا ہے کہ آئندہ زندگی نہایت ہی دشوار اور سخت گزرتی ہوگی۔ مگر زندگی کی حرص بھلا دے میں ڈال کے اور ہمیں بے نتیجہ ہوسوں کی ناپوری ہونے والی آرزوؤں میں مبتلا کر کے ہمارے دل میں ایک ایسی امید مومہوم پیدا کر دیتی ہے جو تمام تجربوں اور کل مسلم واقعات پر غالب آجاتی ہے۔ اور یقین ہو جاتا ہے کہ گزشتہ زندگی کی طرح آئندہ حصہ عمر میں بھی کچھ مسرتیں ضرور ہوں گی۔ اس خیال کے ساتھ ہی جی چاہتی لگتا ہے کہ آئندہ مسرتوں اور خوشیوں کے انتظار میں جہان تک ہوسکے زندہ ہی رہیں۔

اب اس ہوس میں ہماری حالت اُس جوار میں کی سی ہو جاتی ہے جو ہارتا جاتا ہے مگر کیل سے ہاتھ نہیں روکتا۔ ناکامی ہر بار اُس کے دل میں نیاہ انون لگانے کا جوش بڑھاتی ہے اور اُسے ایک دھن سی ہو جاتی ہے کہ جس قدر زیادہ ہارتا ہے اُسی قدر زیادہ کھلتا اور زیادہ بڑھ بڑھ کے دانوں لگاتا ہے۔ اور حسب تک بالکل تباہ نہ ہو جائے نہت نہیں ہارتا۔

آخر یہ ہوس دنیا جو زندگی کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہو روز بروز زیادہ ہی ہوتی جاتی ہے ہم میں کیونکر پیدا ہو گئی ہے اور یہ ہمیشہ جیتے رہنے کی آرزو کیون ہے بہ صاف دیکھ رہے ہیں کہ جتنا دیاں جان ہو گیا ہے نصیبت کے سوا مسرت کا چہرہ دیکھنا کبھی

غصیب نہیں ہوتا۔ لیکن دل بھی چاہتا ہے کہ اور حسین۔ کیا یہ ہماری فطرت کا کرشمہ ہے یا ہمارا مقتضائے طبع ہی ہے؟ لیکن ایسا تھا تو پھر مرتے کیوں؟ اور زندگی ابدی لاکھ پہلوں پر بے مانگے کیوں نمل جاتی؟

دیکھو وہ بوڑھا پیر نانی قبر میں پانوں ٹکائے بیٹھا ہے۔ زندگی اُس کے حق میں بلا سے جاتی ہے؟ اور مصائب نظر آ رہے ہیں کہ اب اس جینے میں مصیبتوں کے سوا کچھ نہیں باقی رہا۔ جن آفتوں اور تباہیوں کو دیکھ کر چاہیے تو یہ تھا کہ اس دباؤ سے کو پہونچنے کے بعد وہ موت سے اتنا نڈر نہ تھا کہ جوانی میں ڈرتا تھا۔ اب تو اُسے مرنے کے لیے تیار ہو جانا چاہیے تھا۔ بلکہ موت نہ بھی آتی تو وہ خود اپنے ہی ہاتھ سے اپنی پُر محن زندگی کا خاتمہ کر کے اس حسرت ماندہ کے کعبین کو موقوف کر دیتا اور اُن حدسوں اور تکلیفوں سے نجات پا جاتا جس میں کہ مبتلا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ مگر چند روزہ اُسے ہمیشہ اور ہر زمانے سے زیادہ عزیز ہے۔ موت جسے چاہیے تھا کہ وہ خود ہی ذوق و شوق سے بلاتا اب اُس کی نظر میں ایک نہایت ہی خوفناک چیز بن گئی ہے۔ اور باقی ماندہ حسرت ناک زندگی اُس کے خیال میں ایک بڑی بھاری مسرت اور محنت غلطی بنی ہوئی ہے۔ حالانکہ غور سے دیکھو تو وہ کچھ بھی نہیں ہے۔

قاعدہ ہے کہ ساتھ کے رفیقان زندگی اور اُس پاس کی تمام چیزوں سے ہمیں اُسی قدر محبت ہو جاتی ہے جس قدر کہ اُن کا ساتھ رہے۔ اور وہ ہماری نظر کے سامنے رہیں۔ ایک جگہ رہتے رہتے ہمیں اُس جگہ سے بھی اُنس ہو جاتا ہے۔ ایک بوسیدہ اور قریب الاہتمام عمارت جسے ہم مدت سے دیکھتے رہے ہوں جب کھدے لگتی ہے تو ہمارا دل دکھتا ہے۔ جانتے ہیں کہ وہ پھر بنانے کے لیے کھود دی جاتی ہے اور اُس کی جگہ بڑی بھاری عظیم الشان عمارت بنانے کے کھڑی کر دی جائے گی۔ مگر دل نہیں بانٹتا اُسے اُس کے کھدے پر رنج ہی ہوتا ہے۔ اسی سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بات ہماری سرشت میں داخل ہے کہ جس چیز کو مدت تک دیکھتے رہتے ہیں اُس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ بس میں سمجھتا ہوں کہ یہی چیز اور ہماری ہی سرشت ہمارے دلوں میں ترقی عمر کے ساتھ دنیا میں رہنے کی ہوس کو روز بروز بڑھاتی جاتی ہے۔ چونکہ زندگی کا ایک بڑا حصہ دنیا میں بسر ہوا ہے اس لیے ہمیں دنیا کی تمام چیزوں سے محبت ہو جاتی ہے۔ اور

جی نہیں چاہتا کہ ان میں سے کسی کو بھی چھوڑیں۔ اس سے بحث نہیں کہ اس طرح اہل رگڑنی اور اس جینے سے بہن کوئی فائدہ بھی ہوگا یا نہیں۔ اور باقی ماندہ حصہ عمر میں بگاڑے کسی قسم کی خوشی بھی ہے یا نہیں۔ بلکہ صرف اس وجہ سے کہ دنیا کی تمام چیزوں کو ایک دم سے دیکھتے چلے آئے ہیں۔ اور ان سے محبت ہو گئی ہے۔

کسی رحم دل بادشاہ نے اپنی تخت نشینی کی خوشی میں حکم دیا کہ قید خانوں میں جتنے قیدی ہوں سب رہا کر دیے جائیں۔ حسب فرمان شاہی سارے قیدی بلا تشا کے سامنے لاکے کھڑے کر دیے گئے کہ اُسے دعائیں دے کے اپنے اپنے گھروں کو جائیں اتنے میں ایک نہایت ہی بوڑھا سن رسیدہ پیر خانی اسیروں کی صفوں میں سے

نکل کے آگے آیا اور بادشاہ کے سامنے زمین بوس ہو کے عرض کرنے لگا "خداوند! میری عمر اس وقت پچاسی برس کی ہے۔ اور بائیس سال کی عمر سے قید ہوں ہیں۔ بالکل بے گناہ اسیر کیا گیا تھا۔ نہ مجھ سے کوئی خطا سرزد ہوئی تھی۔ نہ کسی حرم کا مرتکب ہو ا تھا۔ اور نہ مجھے اپنی حق میں کچھ کہنے اور جواب دہی کرنے کا موقع دیا گیا تھا۔ لیکن

اب یہاں پر پڑے ایک قرن سے زیادہ زمانہ گزر گیا اور ترسٹھ سال اسی قید خانہ کی تاریکی اور تنہائی میں بسر ہو گئے۔ جیل سے نکال کے یہاں تک لائے جاتے ہی میں میری یہ حالت ہو گئی کہ روشنی اور دھوپ کی تیزی سے آنکھیں خیرہ ہو گئیں نہ مجھے کچھ سمجھائی دیتا ہے اور نہ اب کھلی فضا میں چل پھر سکتا ہوں۔ دنیا میں میرا کوئی عزیز آشنا بھی نہیں باقی رہا۔ جو میں سب کچھ بھول گئے ہیں۔ اور میں انھیں بھول گیا۔ اس لیے حضور عالی جگہ تو اجازت ملے کہ اپنی باقی ماندہ زندگی بھی اسی

قید خانے میں کاٹ دوں۔ اور اسی کال کو ٹھہری میں پڑا رہوں جس میں اتنے دنوں رہ چکا ہوں۔ خوبصورت محالیں اور عالی شان ایوانوں سے مجھے اپنی اس تنگ و تاریک ٹھہری کی دیوار میں زیادہ بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ مجھے اب تھوڑے بچا

دونوں اور جیسا ہے اور تمنا ہے کہ باقی زندگی بھی اسی جگہ بسر کر دوں۔ ان میری جوانی اور اتنی عمر گزر چکی ہے۔"

اس بوڑھے پیر خانی کا قید خانے میں پڑے رہنے کی آرزو کرنا ویسا ہی ہے جیسے کہ ہر شخص کو دنیا میں رہنے کی مہوس ہوتی ہے۔ قید خانہ ایسی چیز ہے جسے

کوئی نہیں پسند کرتا۔ ہر فرد بشر اُس کے نام سے کانپتا اور بھاگتا ہے۔ مگر رہتے رہتے انسان اُس کا بھی آرزو مند ہو جاتا ہے اور پسند کرنے لگتا ہے۔ پُرانے قیدی چھوٹے وقت ساتھ دین سے اُسی طرح رخصت ہو کے آتے ہیں جس طرح کوئی حیران نصیب اپنے وطن سے نکلتا ہو۔ اور باہر آتے ہی کوشش کرتے ہیں کہ جس قدر جلد ہو سکے اپنے آپ کو پھر اُس میں پہنچا دیں۔ اسی طرح ہم دنیا میں جس قدر زیادہ رہتے ہیں اُسی قدر زیادہ ہمیں اُس سے محبت ہو جاتی ہے۔ ہمارے پاسے ہوئے جانور۔ ہمارے لگاے ہوئے درخت۔ ہمارے بنائے ہوئے مکان۔ اور اسی قسم کی ہزار ہا چیزیں یوں ہمارے دنیائے واسطہ کرتی جاتی ہیں۔ اور اُن سے چھوٹے کانچن بہت ہی افسوس ہوتا ہے۔ نوجوان کی نظر میں دنیا ایک نئی چیز ہوتی ہے۔ اُس کے لیے اُس زمانہ میں اگرچہ دیکھی و لطف کا بہت کچھ سامان جمع ہوتا ہے مگر وہ اُس کی کچھ زیادہ پروا نہیں کرتا۔ لیکن آخر عمر میں دنیا اُس کی پُرانی رفیق و انیس بن جاتی ہے۔ اور اُس وقت لے دے کے جو کچھ دیکھی باقی رہ جاتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ ہم گزشتہ خوشیوں اور لذتوں کو یاد کر لیا کریں۔ اب کسی نئی چیز سے ہمارا دل خوش نہیں ہوتا۔ کوئی نئی بات ہمیں پسند نہیں آتی مگر ان بے لطفیوں پر بھی ہم دنیا میں رہنا چاہتے ہیں۔ اور اُس سے بے انتہا محبت کرتے ہیں یہاں تک کہ اپنے زوال پذیر خزانے کو بہت ہی کفایت شعاری سے خرچ کرتے ہیں تنگی و ترشی سے بسر کرتے ہیں۔ اور ہر وقت اسی فکر میں رہتے ہیں کہ جو کچھ اندوختہ ہے بہت فائدہ کام آئے۔ اور اس انجام کو کہ ایک دن موت آئے گی اور ہمیں اپنی تمام عزیز چیزوں اور محبوب لوگوں سے چھڑا دے گی ہم بہت ہی درد کے ساتھ یاد کرتے اور نہایت حسرت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

انہار بحر

قدرت نے دنیا میں عجیب و غریب چیزیں پیدا کی ہیں۔ موجودہ زمانہ کی سائنس کی ترقیاں اور بڑی بڑی شاندار تجربات ہر چیز کے وجوہ اور اسباب دریافت کرتے جاتے ہیں مگر اب بھی بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن میں عقل انسانی حیران ہے انہیں میں سے ایک انہار بحر ہیں جن کے متعلق کوئی قطعی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ کیوں

جاری ہیں۔ قرآن مجید میں خداوند جل و علا فرماتا ہے ”مرج البحرین یلتقیان فیما برزخ لا ینبغی
اس کی پوری اور سچی تفسیر سچ پوچھیے تو ان انہار بحر کا پتہ لگنے سے پہلے دنیا میں کسی کو نہیں
معلوم ہو سکتی تھی۔ لیکن اب موجودہ تحقیقوں اور جستجوؤں کے بعد دیکھتے ہیں کہ سمندر ہی کے
اندر کس طرح نہرین جاری ہیں اور کیونکر بغیر کسی حجاب و برزخ کے ایک پانی خاموشی
مترک رہتا ہے اور دوسرا زور و شور سے جاری ہے۔

انہار بحر سمندر کے دریا ہیں۔ بھارے بہت سے ناظرین حیران ہوں گے کہ سمندر
میں دریا کیسے بہے مگر خدا کی قدرت ایسے ہی معجزات دکھائی رہتی ہے۔ جس طرح خشکی
نہاروں و ندیان برہی ہیں بالکل اسی طرح سمندر میں بھی ہیں۔ اس بارے میں کہ
یہ سمندر میں کیونکر جاری ہیں بہت سی رائیں قائم کی گئی ہیں۔ مگر ان میں سے کوئی
توجیہ ایسی نہیں جو دل میں جم کے بیٹھ جائے۔ پہلی وجہ تو یہ بتائی جاتی ہے کہ آفتاب کی تھارے
خط استوا اور اُس کے پاس پاس کا پانی گرم ہو جاتا ہے اور چونکہ عام قاعدہ ہے کہ گرم چیز
پھیلتی ہے اس لیے گرم پانی بھی پھیلتا۔ اپنی سطح سے کسی قدر اونچا ہو کے بتا۔ اور قطبین
کی طرف چلتا ہے جہاں کا پانی ٹھنڈا اور خط استوا کے پانی کی سطح سے کسی قدر نیچا ہو اس
طریقہ سے پانی کا ایک بہاؤ قائم ہو جاتا ہے۔ اور گرمی کے ابھار سے جو برف پیدا ہوتا ہے اُس کی
جگہ بھرنے کے لیے قطبین کے پاس سے سرد پانی بچے ہی پہنچے۔ مگر خط استوا کی طرف اتار دینا
یہی سمندر کی بالائی اور اندر کی نہرین ہیں۔ قطبین کی طرف سے جو نہرین خط استوا کی طرف
آتی ہیں وہ اکثر سطح آب کے نیچے ہوتی ہیں اور دکھائی نہیں دیتیں۔ مگر بعض سطح آب کے
اوپر بھی ہوتی ہیں۔ اگر سطح زمین پر ہر جگہ ایک ہوا گرمائی کا سمندر ہوتا تو اُس کے دور
کی وجہ سے سب جگہ کے پانی کی حرارت ایک ہی درجہ پر رہتی۔ مگر سمندر کی گرمائی کہیں
کم ہے اور کہیں زیادہ۔ کہیں اُس کی سطح کے اوپر زمین بھی نکل آئی ہے لہذا اس
پانی کی رفتار کے خاص خاص راستہ مقرر ہو گئے ہیں جو عظیم نشان نہروں کی طرح
سمندر ہی میں بہتے بہتے قطبین کی طرف جاتے ہیں اور وہاں سے سطح آب کے اندر ہی
اندر خط استوا تک آتے ہیں۔

اس پانی کے دور کے خاص خاص راستہ مقرر ہو جانے کے مختلف وجوہ ہیں۔ ایک تو یہ
وجہ پیش کی جاتی ہے کہ جس طرف سطح آب پر ہوا معمولاً چلتی رہتی ہے اسی طرف ان

نہروں کا بھی رخ ہو جاتا ہے۔ اور بعض زمانہ حال کے جزا فیہ دان اسی کو انہما کے جاری ہو جانے کا اصلی سبب بتاتے ہیں۔ اور اصل بھی یہی ہے کہ سمندر کی سطح پر ہوا بہت بڑا اثر کرتی ہے اور بہت سی سمندر کی چھوٹی چھوٹی نہریں محض ہوا کی رفتار سے پیدا ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ جگر سمندر میں چونکہ ہوا کا رخ موسم کے ساتھ بدلتا رہتا ہے لہذا جس طرف کی ہوا ہوتی ہے اسی طرف ان نہروں کا بھی رخ ہو جاتا ہے۔ لیکن سمندر کے اندرونی یعنی سطح آب کے نیچے کی نہروں کے لیے یہ وجہ نہیں ہو سکتی۔ سمندروں کے بعض حصوں میں ہوا ہمیشہ شمال و مغرب کی طرف پلا کرتی ہے اور بعض مقامات پر جنوب و مغرب کی طرف۔ پس ان حصوں میں سب سے بڑی نہریں ہمیشہ مغرب ہی کی جانب بہتی ہیں۔ بعض مقامات پر نہریں مشرق کی جانب بھی جاری ہیں مگر وہاں ہوا کا رخ بھی مشرق ہی کی طرف ہوتا ہے۔ عام قاعدہ ہے کہ زمین کی گردش کی وجہ سے کوئی چیز اگر کوہ زمین پر حرکت کرتی ہو تو اگر وہ خط استوا سے شمال میں ہو تو دائیں جانب اور اگر جنوب میں ہو تو بائیں جانب کسی قدر ہٹ جائے گی۔ اسی وجہ سے یہ سمندر کی نہریں بھی جو مغرب کی جانب بہتی ہیں کسی قدر اپنے دائیں یا بائیں جانب مڑ جاتی ہیں یہاں تک کہ کوئی زمین کا حصہ ملتا ہے جو روک کے ان کا رخ باطل ملے دیتا ہے۔ اور وہ بجائے مغرب کی طرف جانے کے بالکل مشرق کی طرف منہ کر کے بنے لگتی ہیں بھراٹیلانٹک کی بڑی نہر مغرب کی جانب چلتی ہے یہ اتنی بڑی ہے کہ جوڑائی میں خط استوا کے شمال اور جنوب دو ذون جانب ہوتی ہے جو خط استوا کے شمال میں ہے وہ کسی قدر اپنے دائیں جانب ہٹ جاتی ہے یہاں تک کہ امریکہ کے ساحل سے ٹکرا کے مشرق کی جانب پھر جاتی ہے اور دوسری جو خط استوا کے جنوب میں ہے وہ کسی قدر اپنے بائیں جانب ہٹ جاتی ہے اور وہ بھی ساحل امریکہ سے ٹکرا کے اور دوسری طرف سے مشرق کی طرف واپس ہوتی ہے۔

اگر کوہ زمین پر تمام سمندر ہی سمندر ہوتا تو غالباً ان سب نہروں کا رخ قریب قریب مغرب ہی کی جانب ہوتا۔ لیکن خشکی کے بڑے بڑے حصہ سمندر کی سطح کے اوپر نکلتے ہیں جن میں کی وجہ سے یہ نہریں شمال اور جنوب کی طرف مڑ جاتی ہیں اور اس طرح سے ایک دور قائم رہتا ہے تاکہ قطبین کا سرد پانی ان کے قریب آکر یہاں کے پانی کی حرارت کو کم کرتا رہے اور خط استوا کے پاس کا گرم پانی وہاں جا کے کسی قدر حرارت پیدا کرے۔

بحرالانگلک کی شمالی نرجب ساحل امریکہ سے ٹکرا کے اور خلیج میکسیکو میں سے گھوم کے نکلتی ہے تو انگریزی جغرافیہ دان اسکو گلف اسٹریم یعنی خلیج کی نرکتے ہیں یہی نرکتے بنتے برطانیہ کے جزیر اور شمالی یورپ کے ساحلوں سے گزرتی ہوئی بحر ہند شمالی میں سپورٹ کے غائب ہو جاتی ہے ملک تاروسے کے بندرگاہ اسی کی وجہ سے سال بھر جہازوں کی آمد و رفت کے لیے کھلے رہتے ہیں۔ اگر اس کا گرم پانی وہاں سے نہ گزرتا تو یقیناً سال کے زیادہ حصہ میں وہاں برف ہی برف ہوتی۔ کیونکہ بحیرہ بالٹک کا دہانہ جو اس سے ۱۲۰۰ میل خط استوا کی طرف ہٹا ہوا ہے سال کے زیادہ حصہ میں برف سے بند رہتا ہے۔ اور بحیرہ اسود جو اس سے بھی زیادہ خط استوا کی طرف ہٹا ہوا ہے وہ بھی جہازوں میں اکثر جم جاتا ہے۔ مگر تاروس کے بندرگاہ ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ اور ان کا سمندر کبھی نہیں جمتا۔

اچھا اب اس نرکو دیکھو جو بحر ہند شمال کی طرف سے بہتی ہوئی ملک لیسریڈر کے ساحل کے پاس سے گزرتی ہے۔ لیسریڈر اور انگلستان قریب قریب ایک ہی خط میں واقع ہوئے ہیں یعنی خط استوا سے دونوں کا فاصلہ قریب قریب برابر ہے اور اس لحاظ سے دونوں جگہ سردی اور گرمی برابر ہونی چاہیے تھی۔ مگر انگلستان کے سواحل ہمیشہ برف سے صاف رہتے ہیں اور لیسریڈر کے ساحل سال میں ۵ مہینہ سے زیادہ برف کی وجہ سے بند رہتے ہیں بعض جگہ سمندر میں ٹھنڈی اور گرم نہریں مل جاتی ہیں یہاں اکثر کھڑا پڑا کرتا ہے اور وہاں کے پانی میں تلاطم بھی بہت زیادہ ہوتا ہے۔

عام سمندر کے پانی میں اور ان نہروں کے پانی میں اکثر اختلاف بھی ہوتا ہے۔ اگر نہر خط استوا کی طرف سے آتی ہے تو اس کا پانی سمندر کے پانی سے زیادہ گرم ہو گا اور رنگ میں بھی کسی قدر زیادہ سیاہی مائل ہو گا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جہاز کے ایک طرف تو سمندر کا پانی ہے اور دوسری جانب نہر کا پانی ایک طرف ڈول ڈال کے پانی نکالا جائے گا ٹھنڈا نکلے گا اور دوسری جانب اس سے زیادہ گرم اور زیادہ سیاہی مائل۔ مگر ایسے مقامات سے جہاز کو بہت جلد نکال لے جاتے ہیں کیونکہ وہاں جہاز میں غیر معمولی حرکت ہونے لگتی ہے۔

یہ سمندر کی نہریں جن ملکوں کے پاس سے ہو کر گزرتی ہیں وہاں کی آب و ہوا پر

بھی بہت بڑا اثر ڈالتی ہیں مثلاً انگلستان کے موسم میں اسی گلف اسٹریٹ کی بدولت ایک خوشگوار سی پیدا ہو گئی ہے ورنہ وہاں سردی بہت زیادہ ہوتی۔ تجارت کو بھی ان نہروں سے بڑی فائدہ ملتی ہے۔ ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ بہت سے مقامات کے بندرگاہ محض انہیں کے اثر سے جہازوں کی آمد و رفت کے لیے سال بھر کھلے رہتے ہیں ورنہ برف سے بند رہتے۔ بعض مقامات پر جہازوں کو اپنی رفتار میں ان سے مدد ملتی ہے۔ مثلاً جو جہاز افریقہ کے جنوبی اسی امید کے پاس سے ہو کر گزرتے ہیں اگر وہ انگلستان سے آسٹریلیا کی طرف جاتے ہوئے تو وہ ساحل سے بہت دور ہٹ کے نکل جاتے ہیں تاکہ ان کو اس نہر میں ہونے کے چڑھاؤ نہ کاٹنا پڑے جو وہاں ساحل کے قریب جاری ہے۔ اور جو جہاز انگلستان کی طرف جاتے ہیں وہ ساحل سے قریب قریب جاتے ہیں تاکہ ان کو اپنی رفتار میں اس کے بہاؤ سے مدد ملے۔

یہ نہرین خشکی کی چھوٹی چھوٹی ندیوں کی طرح نہیں ہیں بلکہ بہت لمبی چوڑی ہوتی ہیں گلف اسٹریٹ کی چوڑائی تقریباً ۱۰۰ میل ہے اور ۲۰ فٹ سے زیادہ گہری ہے۔ بعض جگہ اس کی چوڑائی اس سے بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ پانی کے رنگ میں بھی ایک بہت ہی نمایاں اختلاف ہے کیونکہ اس کا پانی گہرے نیلے رنگ کا ہوتا ہے۔

جاپان کے قریب سے جو نہر بہتی ہے اس کا رنگ سیاہ ہے اور اسی وجہ سے وہاں کے لوگ اسے "کوروسیدا" یعنی کالی ندی کہتے ہیں۔ یہ نہر بھی جاپان کو وہی سب فائدہ پہنچاتی ہے جو گلف اسٹریٹ انگلستان اور ناروے کے موسم اور ساحل کو پہنچاتی ہے۔ غرض کہ تمام دنیا کے سمندروں میں اسی طرح کی ہزاروں نہرین جاری ہیں جو ہمیشہ بہتی رہتی ہیں اور تمام جہاز پر اپنا اثر ڈالتی ہیں۔

دنیا کا سب سے بڑا اسٹیمر ٹائٹانک جو سال ڈیڑھ سال قبل تباہ ہو گیا تھا محض انہیں انہار بحر میں سے ایک کی بدولت تباہ ہوا جو برف کا ایک بہت بڑا پھاڑ جو اس بانیس میں لمبا چوڑا تھا قطب شمالی سے بہا کر بحر اٹلانٹک میں لے آئی۔ اور جہاز مذکور اس سے ٹکرائے تباہ و برباد ہو گیا۔

الغرض یہ سمندر کی نہرین عجائبات قدرت میں سے ہیں جن سے دنیا بھر انتہائی فائدہ اٹھاتا ہے۔

دھیائے کاہنہ

یہ ایک عجیب و غریب عورت تھی جو آج سے سارے بارہ سو برس پہلے اپنی نظروں
داناٹی اور اپنی ہوشیاری اور چالاک سے سارے شمالی افریقہ کی ملکہ بن گئی۔
تھی۔ اور قرونِ اولے کے وہ اہل عرب جنہوں نے ایران و ترکستان اور روم و مصر کی
زبردست سلطنتوں کو توہ بالا کر دیا تھا انہیں اسی ہوشیار عورت پر غالب آئیں۔
بڑی بڑی دشواریاں پیش آئیں۔

یہ عورت ثابت بن تیقان نام ایک بڑے رئیس کی بیٹی تھی۔ اور چونکہ اُس کا
شوہر قبائل زناطہ کے ایک مشہور قبیلے جرادہ کا سردار تھا۔ اس لیے وہ کاہنہ ہی نہیں
اپنی قوم اور اپنے وطن کی ملکہ تھی۔ لیکن اس کے ساتھ اُس نے سحر اور نیرنگ کے فنون
میں ایسا کمال حاصل کر لیا تھا کہ لوگ اُسے غیب کی باتوں سے واقف اور بڑی
زبردست شیطانی یا روحانی قوتوں پر حاکم جانتے تھے۔ اور یہی سبب یہ ہے کہ عوام
کی اسی عقیدت نے اُسے ایک مدت تک ملک گیری عجب و غریب طرح سے کا سیا
کوہ اور اس اُس کا ماسن یا دار الحکومت تھا۔ ملتِ یہود کی یا بند تھی۔ اور اس
کی ساری قوم کا مذہب بھی یہی پرانا اسرائیلی دین تھا۔ اور یہ یہودیت ہی کا اثر تھا کہ اُس کا
آپکو روحانی علوم میں کامل اور بڑے شیاطن کو اپنا تابع فرمان بنانا شروع کر دیا۔
اس کے حکمران ہونے سے پہلے علاقہ جبل اور اُس کا فرمان روا کیسل نام ایک شخص
تھا۔ اہل عرب نے جب مصر پر قابض و حکمران ہونے کے بعد مغرب کی طرف آئے قدم
بڑھایا تو انہیں عزائیں اور مراکش وغیرہ میں رومی حکمرانوں کے علاوہ اس بربری
ساحلہ سے بھی سابقہ پڑا۔ جسے شکست دے کے انہوں نے توحید الہی کی تعلیم اس
سرزمین میں پھیلانا شروع کر دی۔ اور کیسل لڑائی میں مارا گیا۔ اُس کے قتل کے ساتھ
تمام بربری اور زناطی قبائل جا کے اُسی دھیائے کے پاس حاضر ہوئے۔ اور اُسے سب سے
زیادہ صاحب عقل اور غیب دان خیالی کر کے اپنی ملکہ بنالیا۔ یوں اس کی وادہاں
اپنا قدم کمانت کے پورے سے اٹھا کے سر پر فرمان روائی پر رکھ دیا۔ اور وہیم شہر
یادری سرپر رکھ کے تاجدار و جہان بیان بن گئی۔

حکومت کے ساتھ چونکہ اُس میں یہ کمال بھی تھا کہ ہونے والی باتیں بتا دیتی اور لوگوں سے پہلے ہی سے کہہ دیا کرتی کہ اس کام کا یہ انجام ہوگا اس لیے بربری ہوئی اور افریقی ابنا سے باوجود یہ فرمان برداری کے علاوہ اُس کے معتقد مُرد بھی بن گئے۔ وہ ہیا کے تین بیٹے بھی تھے جنہیں اُس نے پالا تھا اور جو خاندانی سیادت و سرداری کے وارث ہوئے تھے مگر وہاں کی سرکش طبیعت نے گوارا نہ کیا کہ بیٹوں کی فرمان برداری کے بیٹھے۔ چنانچہ کسید کے مارے جانے اور "اور اس" کی ملکہ بیٹے سے پہلے ہی وہ اپنے بیٹوں بیٹوں کو اپنے اثر اور اپنے جادو کے زور سے مغلوب و مقبور کر چکی تھی۔ اب جو وہ سارے شمالی افریقہ کی ملکہ بن گئی تو عربوں کو اُس کی سرکوبی کی فکر ہوئی۔ خاصہً اس لیے کہ عقبہ بن نافع کا ایسا نامی گرامی سپہ سالار عرب جس نے پورے افریقہ کو مغرب تک فاتحانہ طریقہ سے طے کر کے شہر طنجہ کے پاس گھوڑے کو سمند میں ڈال کے یہ صدا بلند کی تھی کہ "خداوند اگر یہ سمندر ساحلی نہ ہو جاتا تو جہان تک زمین ملتی میں برابر تیری توجہ کے لئے لگتا چلا جاتا" اُسے بظاہر تو کسید نے خود مسلمان بن کے اور مکروہ دغا سے اُسے اُس کے لشکر سے جدا کر کے بربروں کے زعمہ میں گھر لیا تھا اور شہید کیا تھا لیکن تحقیقات کے بعد کھلا کہ اس دغا بازی و مکاری کی اصلی بانی یہی مکار دہیا تھی۔ جس نے پہلے تو سستہ حرمین کسید سے عقبہ بن نافع کو قتل کرایا۔ پھر جب کسید اُس کے انتقام میں زہر بن قیس کے ہاتھ سے مارا گیا۔ تو اسی دہیا نے بربروں اور رومیوں کو ایسا برا بیگینہ کر دیا کہ سب نے یکجا ایک زعمہ کر کے زہر بن قیس کو بھی شہید کر ڈالا اور میدان خالی دیکھتے ہی وہاں افریقہ کی ملکہ بن گئی جس کی سلطنت کسی معمولی ملکہ کی سی نہیں بلکہ ایک سن رسیدہ جادوگرانی کی ایسی تھی۔ جو علامتہ لوگوں سے کتنی کوشاں تھیں بچے ہر بات کی خبر دے جایا کرتے ہیں اور وہی ہر امر میں مسیحا مدد و معاون رہتے ہیں۔

یہ خبریں عبدالملک بن مروان کو پہونچیں تو اُس نے حسان بن نعمان غسانی کو والی افریقہ مقرر کر کے اس کا ہنہ کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ زہر بن قیس کے مارے جانے کے بعد وہاں سارے افریقہ اور یزآن تمام شہروں پر متصرف ہو گئی تھی جنہیں مسلمان اس سے بہت پہلے فتح کر چکے تھے۔ حسان نے قروان اور قرطاجہ پر

پھر قبضہ کر کے علم اسلام قائم کیا۔ اور آگے بڑھے۔ بجایہ سے ایک منزل آگے رود مسکینی کے پاس دہیا کے زبردست لشکر کو مقابلہ ہوا۔ دہیا نے ایسی جوانمردی و دیرری سے اپنی فوج کو لڑایا کہ عربوں کو فاش شکست ہوئی۔ ہزار ہا مسلمانوں نے حجام شہادت پیا۔ اور ان کا ایک بڑا بھاری گروہ دہیا کے ہاتھ میں اسیر ہو گیا۔ دہیا نے اس موقع پر اتنی نیکی نفسی ظاہر کی کہ جتنے مسلمان گرفتار ہوئے تھے سب کو چھوڑ دیا۔ حضرت خالد بن یزید بنیسی نام ایک نہایت خوش رو جوان عرب کو روک لیا۔ اور وہ بھی کسی بڑی نسبت سے تھیں۔ بلکہ تھیں اس لیے کہ میدان جنگ میں خالد کی ہر آرمائی و جان بازی کو دیکھ کے وہ ان کی گرویدہ ہو گئی۔ اور انھیں بیانا کے انی صحبت میں لے گیا۔ حسان شکست کھا کے واپس آئے تو برقہ کے علاقہ میں ٹھہر گئے اور عبدالملک سے دربار میں لکھا کہ اور لشکر بھیجیے۔ اور دہیا کی سرکوبی کے لیے ضرورت ہے کہ عربوں کا منتخب اور اعلیٰ درجہ کا لشکر آئے۔ دمشق سے اس کی تعمیل میں دیر ہوئی۔ اور حسان پانچ سال تک برقہ میں لک کے امیدوار بنے پڑے رہے۔ اتنی مدت گزرنے کے بعد عبدالملک نے ایک بڑا بھاری زبردست لشکر اور بہت کچھ مال و خزانہ بھیجا اور حسان کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ حسان چونکہ ایک دفعہ شکست کھا چکے تھے۔ اس لیے اب کی بار روانہ ہونے سے پہلے اپنا ایک جاسوس نامہ برخالد کے پاس بھیجا۔ اور ان سے دہیا کے لشکر کی کیفیت اور حالت دریافت کی۔ خالد نے مخفی طور پر لکھ بھیجا کہ آپ فوراً حملہ شروع کر دیں۔ اور جس قدر جلد سے یہاں آجھنچیں۔ اس لیے کوئی احوال تمام اہل بربر دہیا سے ناراض اور اس کے مظالم سے براؤ تھہ ہو رہے ہیں۔

کاہنہ میں خدائی یہ تھی کہ باوجود عورت ہونے کے نہایت ہی جابر و ظالم تھی اور ملک کو تباہ کرنے کے سوا کبھی اس کی آبادی کی فکر نہ کرتی تھی۔ رعایا کی فلاح سے اسے سروکار نہ تھا۔ اور انسان کے تباہ و برباد کرنے میں کوئی مضائقہ نہ سمجھتی تھی۔ حضور صاب جو اس نے شناسا کہ عربوں نے پھر حملہ کا ارادہ کیا ہے تو کہنے لگی "عرب لوگ تو شہروں اور سونے چاندی کے خواستگار ہیں۔ اور ہماری خواہش یہ ہے کہ کھیتوں اور چراگاہوں کو بھائیں اور شہروں کو جوان کی طرح نظر میں خودی نہا و برباد کر ڈالیں۔ تاکہ عرب لوگ جب دیکھیں کہ سارے ملک اجڑ گیا تو نادم ہو سکے

وہاں چلے جائیں۔" اپنی یہ پالسی اور اپنا یہ احمقانہ خیال ظاہر کرتے ہی اُس نے اپنے نذرانوں کو روانہ کیا کہ تمام شہروں کو جا کے ویران و برباد کر دیں۔ چنانچہ اس حکم کی تعمیل سختی سے ہو سنے لگی۔ تمام چھوٹے بڑے شہر اجاڑ دیے گئے۔ زبردست اور مضبوط قلعے مسمار و ہمدرد کر ڈالے گئے۔ اور ساری رعایا کے گھر ٹوٹ بیٹے گئے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ حسان نے دو ہی چار کوچ کیے تھے کہ رومی ساکنین افریقہ کے ایک جم غفیر نے اُن کے دوہائی دنیا شروع کی کہ خدا کے لیے بہمن دیسے کا ہنہ کے ظلم سے بچا لے۔ اُن کے بڑھ کے وہ شہر فانیس میں پہنچے تو شہر والوں نے بہت سامان اور دولت لاکھ ساٹھ رکھ دیا اور اطاعت کیا۔ حسان نے خوش ہو کے اُن سے امن و امان کا وعدہ کیا۔ اپنی طرف سے ایک والی و ہان مقرر کیا اور شہر قصبہ میں پہنچے یہاں کے لوگوں نے بھی سر اطاعت جھکایا۔ پھر وہ اور کوچ کر کے شہر قسطلیم میں آئے اور اُس پر بھی قابض ہو گئے۔

اب جو عربوں کی چڑھائی کی خبر دیا کہ پہنچی تو اُس نے اپنے دو بیٹوں اور خالد بن یزید کو اپنے سامنے بلوا کے کہا۔ "مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ میں اب کی لڑائی میں ماری جاؤں گی۔ اس لیے تمہارا سہی میں مناسب یہ ہے کہ خود ہی حسان کے پاس چلے جاؤ۔ اور اپنے لیے امان مانگ لو۔ بلکہ انھیں سے مل جاؤ۔ اب اس کے بعد تمہیں میرا ساتھ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ اُس کے بیٹے اور خالد اُس کی اجازت سے عربی لشکر گاہ میں چلے آئے۔ حسان کی اطاعت قبول کر کے اپنے لیے امان حاصل کی۔ اور عربوں ہی میں رہنے سینے لگے۔ اب حسان اپنے لشکر کے ساتھ اُس کے سر پر رہا پہنچے۔ وہاں اگرچہ اپنے فرزندوں کو بھیج دیا تھا مگر خود اُس نے اطاعت قبول نہیں کی۔ اور دونوں لشکر آئے سامنے صف آرا ہو گئے۔

آخر لڑائی شروع ہو گئی۔ اور بڑی ہی خوریز لڑائی ہوئی۔ اس مرتبہ عربوں کے حوصلہ بڑھے ہوئے تھے۔ اور افریقہ اور بربر والوں کی ہمتیں پست تھیں۔ کیونکہ اب کی خود ہیامین نہ وہ اگلا سا جوش و خروش تھا اور نہ کامیابی و فتح کی امید تھی۔ چنانچہ بربروں کو شکست ہوئی۔ اور عربوں نے کشتوں کے ہتھیاروں سے اس لڑائی کے ہنگامہ میں کسی اسلامی بہادر کی تلوار خود وہاں سے کاہنہ پہنچ گئی۔

جو گرمی اور ٹپ کے اُسی جگہ رہ گئی۔ اُس کے قتل ہوتے ہی برہمنوں نے ہتھیار ڈال پناہ مانگنا شروع کی۔ اور فاتحوں نے اپنی خون آلود تلواریں میان میں کیں۔

نجلہ دیگر عجائبات کے یہ بھی ہے کہ کتنے ہین جس وقت وہاں کا ہنہ ماری گئی ہے اُس کی عمر ۱۲ سال کی تھی۔ اور تختِ جہان بانی پر بیٹھے ہوئے اُسے ۲۵ سال گزر چکے تھے۔ اُس کے مارے جاتے ہی پھر کس میں مخالفت و سرتابی کا حوصلہ تھا ہمارا فریقہ مطیع و منقاد ہو گیا۔ اور عربوں نے افریقہ کی مہم سے فارغ ہوتے ہی اندس کے فتح کرنے کی طوت تو جہ کی۔

افریقہ میں اب اس دامنِ قائم ہو جانے کا اصلی سبب یہ تھا کہ حسان نے دساکا فتنہ دور کرتے ہی ایک نیا فوجی قانون جاری کیا جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اُس کا پہلا موجد فرانس کا سپہ سالار ہند ڈوپلے تھا جس نے ہندوستان میں پہلے پہل یہ تجویز کی کہ ہندوستانیوں کا ایک باضابطہ لشکر فرانسیسیوں کی تائید کے لیے قائم کیا جائے۔ جسے پوری تعلیم اور پورے اسلحہ دیے جائیں۔ اور اس کا اندیشہ نہ کیا جائے کہ یہ کبھی دغا دین گے۔ اس سے پہلے ہندوستان میں فریج گورنمنٹ اور برٹش گورنمنٹ کی جتنی فوجیں ہندوستان میں تھیں سب فرانسیسی اور انگریز سپاہیوں کی تھیں۔ ڈوپلے کی اس تجویز کے بعد سے فرانسیسیوں نے ہندوستانی فوجیں اپنے ایمان مقرر کیں اور انگریزوں نے اپنے ایمان۔ اور جو جوان کی وفاداری کا تجربہ ہوتا گیا اُن کو روز بروز ترقی دی گئی۔

مگر ڈوپلے سے گیارہ بارہ سو برس پہلے ہوا اصول وہاں کا ہنگامہ فرو کرنے کے بعد حسان بن نعان نے افریقہ میں جاری کر دیا تھا۔ اس لیے کہ اُس نے برہمنوں پر یہ لازمی قرار دیا کہ اُن کے اچھے جوانوں کی بارہ ہزار فوج ہمیشہ قائم رہا کرے جس کا کام یہ ہو کہ اگر اہل برہمن سے کوئی بغاوت یا سرکشی کرے تو وہ فوج فوراً اُس کی سرکوبی کے لیے اُٹھ کھڑی ہو۔ جس کا بہت بڑا نمایاں نتیجہ یہ ظاہر ہوا پھر تو ان ملک رعایاے افریقہ مسلمانوں کے خلاف سر نہیں اٹھا سکی۔

وہاں کا ہنہ کا واقعہ طرابلس المغرب کی اُس فتح کے بہت دیر بعد کا ہے جب حضرت عبداللہ بن زبیر نے حاکم قلعہ طرابلس پر جو ہر شجاعت دکھائے گریکوری

کی بنی فلپانا کو اپنی حرمون میں شامل کیا تھا۔ دراصل وہ افریقہ کی پہلی فتح اسلام تھی اور یہ آخری فتح اسلام۔ کیونکہ اس کے بعد پھر مسلمانوں کو دوبارہ فتح کرنے کی ضرورت اگلے دنوں میں پیش آئی تھی۔

گمانت

گمانت کے لغوی معنی خال گوئی کے ہیں۔ اور اسی لیے اُس شخص کو جو غیب کی باتیں بتائے اور اپنے آپ کو مخفی امرا سے واقف ظاہر کرے "کاہن" کہتے ہیں۔ اسلام سے پہلے تمام مذاہب کے حالات پر غور کیجیے تو صاف نظر آتا ہے کہ دینی پیشواؤں اور مقتداؤں کے لیے گمانت لازمی تھی۔

مصریوں کے مقتداؤں نے مذہب کو نامعلوم امرا اور رموز کا خزانہ بنا رکھا تھا۔ تو مکتوبوں۔ مگر مجھوں۔ بلیوں پر دانوں وغیرہ کی پرستش کرتی تھی لیکن الہیات کے مسائل رموز باطنی کی طرح صرف مقتداؤں تک محدود تھے جو آداب مذہبی کی تعلیم کے ساتھ غیب کی باتیں بھی بتا دیا کرتے۔ بابل والوں نے رمل اور نجوم کے فن کو ہندوؤں کی طرح جزو دین بنالیا تھا جس کی مدد سے وہ ہر امر میں آئندہ کی بابت حکم لگایا کرتے۔ اُن کی اسی دینی جستجو نے علم ہیات کو مدون کیا۔ کواکب کے اثرات اور اُن کے افعال و خواص مقرر کیے۔ اجرام فلکی کے نام رکھے۔ ان کی حرکتوں کا

تیا لگایا۔ اور دنیا کو باور کرا دیا کہ نجوم کے ذریعہ سے جو الہیات سے وابستہ تھا انسان غیب کی باتوں کو بتا دیا کرتا ہے۔ ہندوؤں اور بابلیوں کے قدیم مسائل بہت لمبے جلتے ہیں۔ اور نجوم والہیات کے لحاظ سے ضرور ماننا پڑتا ہے کہ یا تو نجوم و ہیات کو بابلیوں نے ہندوؤں سے لیا یا ہندوؤں نے بابلیوں سے حاصل کیا۔ لیکن چونکہ یہ امر تاریخ کا ایک طے شدہ مسئلہ ہو گیا ہے کہ اگر یہ نوگون نے سنگ نوگون (بنی سام) کے بعد ترقی کی اس لیے زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ بابل والوں کے علوم ہیات و نجوم بعد کے زمانہ میں پورے پورے ہندوؤں میں منتقل ہو آئے۔ اور اسی وجہ سے ہندوؤں کی گمانت بھی ایک ہی قسم کی ہے۔ ہندو پنڈت پترا دیکھ کے اور زائچہ دیکھنے کے جس طرح بعد والی باتیں بیان کیا کرتے ہیں اسی طرح بابل کے پوجاری اور مرمض

لوگ بھی بتایا کرتے تھے۔ تمیش پرستون میں بھی کہانت تھی۔ اور غالباً اسی قسم کی ہوگی جیسی کہ اہل بابل میں تھی۔ اگرچہ ان کی کہانت کے زیادہ مشرح حالات ہمیں نہیں معلوم ہو سکتے یونانیوں میں بھی کہانت تھی مگر بابل والوں کی کہانت سے بہت اونچی درجہ کی۔ اگرچہ انھوں نے بھی ہبات و نجوم کو حاصل کر لیا تھا مگر جہاں تک پتہ لگایا جاتا ہے یہ فنون ان کے دین کے اصلی عنصر نہیں بنے پائے گئے تھے۔ ان کے کابین بڑے بڑے مندروں کے پوجاری تھے۔ اور ان کی کاہنہ عورتیں وہ کنواری لڑکیاں تھیں جن کی زندگی بت خاتون اور مندروں کی نذر ہو جاتی۔ اہلوی کے مندروں میں جو قدم یونانیوں کا سب سے بڑا مندر تھا لوس کی ایک تہائی پر یہ لڑکیاں رہنے کے بجائے جاتیں اور نیچے کچھ بخور سلگا دیے جاتے۔ تھوڑی دیر کے بعد اس لڑکی کے دماغ کچھ ایسا اثر پڑتا کہ وہ اس مقل ہونے لگتے۔ اور ہوشی کے عالم میں وہ بکثرت شروع کرتی۔ اس کے الفاظ پر مجذوبوں کی بڑکی طرح غور کیا جاتا۔ ان میں طرح طرح کے معنی پھٹاے جاتے۔ اور انھیں سے اپنی آرزوؤں اور مرادوں کے موافق یا مخالف جواب حاصل کر لیا جاتا۔ یہی یونانیوں کی دو فالین تھیں جن کا اگلی دنوں بڑا شہرہ تھا۔ اور جن کے پرچ ثابت ہونے اور پورے اترنے پر اکثر قدیم مورخین عقیدہ مند تھے حیرت ظاہر کرتے ہیں۔

رومی چونکہ علوم و فنون کی طرح مذہب میں بھی یونانیوں کے پیرو تھے۔ اور اپنے دیوتاؤں کی کہانیوں۔ ان کے حالات و خیالات اور واقعات کو یونانی دیوتاؤں کے موافق ثابت کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے اس لیے ان کی کہانت بھی یونانیوں کی کہانت سے ملتی ہوئی تھی۔ یہ بات لطف سے خالی نہیں ہے کہ مشرق مغرب کی کہانت میں ایک نمایاں فرق تھا۔ مشرق میں بابل والوں اور ایونیوں اور ہندوؤں سب میں کہانت کا دار و راز ایک باضابطہ فن نجوم پر تھا۔ اور کسی برکت و عظمت کے حاصل کرنے یا کسی مصیبت و آفت کے دور کرنے کی تدبیریں بھی یہ مشرقی لوگ انھیں فنون کے اصول کی پابندی میں کیا کرتے تھے۔ بہ خلاف اس کے یونانیوں اور رومیوں کی کہانت کو مجذوب پرستی سے زیادہ وقت نہیں حاصل تھی۔

بنی اسرائیل میں بھی کہانت تھی۔ مگر ان کی کہانت بالکل جدا گانہ تھی۔ ان میں حضرت ابراہیم اور جناب موسیٰ کی تعلیمات نے نبوت کی ایک خاص شان پیدا کر دی

تھی۔ حضرت موسیٰ کے بعد سے اُن میں نبیوں کے پیدا ہونے کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا تھا۔ جو عابد و زاہد نیک نفس و پاک باطن لوگ ہوتے اور ریاضت و اتقا کے ذریعہ سے تزکیہ نفس کیا کرتے۔ ان لوگوں کو مراقبہ میں مکاشفہ ہوتا۔ اور جو باتیں اُن سے پوچھی جاتیں اُن کا جواب گویا وہ خدا سے پوچھ گئے دیا کرتے۔ اور اپنے آپ کو اسرار باطن اور رموز ربانی سے واقف ظاہر کرتے۔ انھیں انبا کا طریقہ اُن کے کاہنوں نے بھی اختیار کیا۔ اور جب انبیاء ہوتے یا بعد کے ایام میں جب نبیوں کے مبعوث ہونے کا سلسلہ موقوف ہو گیا تو ہر جگہ اور ہر زمانہ میں اُن کے مرتاض و نفس کش عقیدہ انھیں بند کر کے عالم ملکوت کی سیر کرتے۔ اور قوم کو اُس کے خیالات و عقائد کے مطابق عجیب قسم کے حکمانہ سلجے اور انوکھے و عجیب الفاظ میں بتا دیا کرتے کہ اس معاملہ میں یہ ہو گا۔ اور میری بات یوں ہونے والی ہے۔

اس قسم کی کمانت دو سہری قدیم قوموں میں بھی تھی۔ بلکہ یون کمانا ہے کہ ساری مشرقی و مغربی قوموں میں اسی قسم کے غیب دان اور اسرار باطنی جاننے والے کاہن ریاضت و مجاہدہ نفس کے ذریعہ سے پیدا ہو ا کرتے تھے۔ ادھر بابلیوں اور ہندوؤں میں بھی جہاں نجومیوں اور اجرام فلکی کے اثر جاننے والے پنڈتوں کا ذور تھا وہاں ایسے مرتاض اور تارک الدنیا اشخاص بھی موجود تھے۔ جن کے لہجے اور طرز گفتگو سے ظاہر ہوتا کہ مبداء فیاض کی طرف سے غیب کی باتیں اور مشکل سے مشکل مسائل کے حل ان کے دلوں پر القا ہو جاتے ہیں۔ اور الہام کے ذریعہ سے اُن کو معلوم ہو جایا کرتا ہے کہ آئندہ یہ ہونے والا ہے اور فلاں شخص کی قسمت میں یہ لکھا ہے۔ اسی ہذا القیاس یونانیوں اور رومیوں میں بھی مندروں کے معمولی پوجاریوں کے علاوہ اس قسم کے رموز باطنی جاننے والے راہبوں اور عزت گزینوں کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن یہ ہے کہ اس قسم کی کمانت کا آغاز تاریخی طور پر بنی اسرائیل کے انبا اور کاہنوں ہی سے شروع ہوا۔ اگرچہ آخر میں یہ معلوم ہو تا ہے کہ بابل کے صابی لوگوں کی کمانت بنی اسرائیل کے خیالات پر غالب آگئی تھی۔ اسی کا ایک کرشمہ یہ تھا کہ سحر بابل کی ساری دنیا میں شہرت ہو گئی۔ اور عیسائی حضرت مسیح کی پیدائش سے پیشتر ہی اُن کی آمد کے منتظر اور انھیں ایک

ستارے کے ذریعہ سے پہچان کے ایمان لانے والا چند بابلی کا ہون ہی کو بتاتے ہیں۔
جیسا کہ اناجیل میں مذکور ہے۔

یہ کہنا نہ کہ یہ زیادہ و مرتاض لوگوں کی کمانت کس قوم سے شروع ہوئی اور اُسے کس ملک نے کس سے لیا فضول ہے۔ اس لیے کہ یہ ایک فطری چیز تھی۔ انسان کی فطری کوشش پرستی اُسے ہر جگہ پیدا کر لیتی تھی۔ یہ بُرا نا خیال کہ روح چونکہ لطیف اور معنی شے ہے اس لیے وہ ہر معنی تر از کا پتا لگا سکتی اور اسرارِ مہدی کے ہر حرم میں پہونچ سکتی ہے بشرطیکہ اُس کا تذکرہ کیا جائے جہاں فی تقاضوں سے مبرا کر لی جائے اور اس میں خلوص پیدا ہو جائے۔ اس کے ساتھ انسان کی فطرت ہے کہ جس جگہ وہ اپنی تدبیروں میں عاجز آتا ہے یا معلوم ذرائع ڈھونڈنے لگتا ہے۔ اور بڑی بے صبری کے ساتھ جو یا ہوتا ہے کہ کوئی اس مشکل کا دفعہ بناوے۔ لہذا ہر وحشی سے وحشی قوم میں نوع انسانی کے اس فطری تقاضے نے کمانت کو کسی نہ کسی عنوان سے ضرور پیدا کر دیا۔

عرب کے بت پرستوں سے جاہلی کون ہو گا جن کی بت پرستی نہایت ہی مزخرف اور بے اصول طریقہ کی تھی۔ مگر اُن میں بھی ہر جگہ کاہن موجود تھے۔ پھر اُس کے بعد جزیرہ نما عرب میں بیرونی مذاہب کا هجوم دروز بروز بڑھ گیا پارسی بھی تھے۔ یہودی بھی تھے۔ عیسائی بھی تھے۔ اور تو اور بابل کے مذہب بت پرست جو اپنے آپ کو سب سے بڑا موجد خیال کرتے ساری دنیا میں فنا کر دیے گئے تھے اور عراق میں اُن کا نام و نشان بھی نہیں باقی رہا تھا مگر ارض حجاز میں وہ بھی موجود تھے۔ اور اُن سب کے کاہن عرب میں ہر جگہ موجود تھے اور کمانت کا کام اختیار کرتے ہی وہ مذہب کی طرف سے کچھ ایسے غیر متعصب ہو جاتے کہ سب تو میں عام اس سے کہ کسی مذہب سے وابستہ ہون بلا لحاظ مذہب اپنی شکل میں لے کے اُن کے سامنے آئیں اور وہ اُن کو ایسے جواب دیتے کہ اُن کی نفسی و تشفی ہو جاتی۔ اور اپنے نزدیک کامیاب اور بامراد ہو کے اپنے گھروں کو واپس جاتیں۔ اُن دنوں عرب کی اصلی حکومت اگر سچ پوچھیے تو انھیں کاہنوں کے ہاتھ میں تھی۔ جن کے سامنے نہ کسی سردار قبیلہ کی جلتی اور نہ کسی تاجدار و فرمان روا کی۔

جاہلیت عرب کے کاہنوں کے احکام و الفاظ اگر ایک جگہ جمع کر دیے جائیں تو

ایک عجیب قسم کا پُر لطف لڑیچ بن جائے گا۔ جن کے الفاظ میں غیر معمولی لطافت۔ معنی خیزی۔ فصاحت و بلاغت خافہ بندی۔ اور پیغمبرانہ حکومت ہوتی۔ اور ایسا معلوم ہوتا کہ جس شخص کی زبان سے وہ الفاظ سُنے جاتے ہیں وہ نہیں بول رہا ہے بلکہ اُس کے جسم کے اندر سے کوئی فرشتہ باتیں کر رہا ہے۔ اس قسم کے صد ہا کاہن اور صد ہا کاہنہ عورتیں ارض عرب کے مشہور مقامات میں پھیلی ہوئی تھیں۔ جن کے پاس دُور دُور سے بڑے بڑے قافلے اپنی اُردوئیں اور نمائیں لے کر آیا کرتے۔ اور شاد کام و مطمئن واپس جاتے۔ جس طرح یونانی مندروں کی فالون کی نسبت بتایا جاتا ہے کہ وہ ہمیشہ پوری اُتریں اُس سے زیادہ حیرت سے ہم دیکھتے ہیں کہ عرب کے کاہنوں اور کاہنہ دُور کے احکام پورے اُتر اُترتے تھے۔ اور بعض متوقون پر تو اُنھوں نے ایسے سچے حکم لگائے اور اس طرح غیب کی باتیں بیان کر دیں کہ اگر اُن واقعات کو سچ تسلیم کر لیا جائے تو اُن غیب کی باتیں بتانے والوں کی غیب دانی کی کوئی توجیہ نہیں ہو سکتی۔

اگلی دنیا چونکہ اُن تمام واقعات کو باہر کرتی تھی لہذا ادنیٰ و اعلیٰ جاہل و عالم سب نے تسلیم کر لیا کہ انسان کسی ذریعہ یا کسی ریاضت سے ایسا کمال حاصل کر لیا کرتا ہے کہ غیب کی باتیں بتا دے۔ اور جب یہ مان لیا گیا تو ہر شخص اپنے مذاق و خیالات کے مطابق اس کی توجہیں بھی کرنے لگا۔

چنانچہ یونانیوں اور رومیوں نے باوجود فلسفہ و منطق میں اعلیٰ نمود حاصل کرنے کے اس امر کو قبول کر لیا کہ انسان غیب کی باتیں بتا سکتا ہے۔ بعض نے اس کی یہ توجیہ کی کہ نفوس انسانی تصفیہ باطن کے ذریعہ سے اسرار فطرت سے واقف و آگاہ ہو جاتے ہیں۔ اور جیسا وہ چاہتے ہیں ویسا ہی ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ اُن کے خیال میں تمام اشیاء کی صورتیں مثل افلاطون کی رُوسے عالم کلی میں موجود تھیں۔ جہاں تک بار پانے کے بعد انسان اُن پر تصرف بھی کر سکتا تھا۔ یہ تو اعلیٰ درجہ کے نازک خیال علما سے روحانی کا خیال تھا مگر بعض نے کہہ دیا کہ روحیں جو جسموں کے قفس سے آزاد ہیں اور نیز اجنبہ اُن کے بس میں ہو کے اُن کے موکل بن جاتے ہیں اور وہی اُنھیں رموز غیب سے آگاہ کر دیتے ہیں۔

عیسائیوں نے جو قرون وسطیٰ میں کمانت کے تماشے اور ولایت کے کرشمے

سب سے زیادہ دکھایا کرتے تھے اپنے کاہنوں کی غیبی انی اور ان کے تصرفات باطنی کا یہ اصول قرار دیا کہ حضرت مسیح خدا ہونے کی وجہ سے غیب کی باتیں جانتے تھے۔ لہذا ان کا نفس ربانی جس پر اثر کرے وہ بھی ان رموز باطنی سے واقف ہو جاتا تھا۔ قطع نظر اس کے مسیحوں میں علم کا دیوتا یا خدا روح القدس ہے۔ اور جسے کچھ بھی معلوم ہو یا کسی قسم کا علم حاصل ہو اس کی نسبت سمجھا جاتا ہے کہ اس پر روح القدس نے اُسے انما کمال دکھایا ہے۔ اور اگلے دنوں چند روز تک ہے اور خالص العقیدہ مسیحوں پر روح القدس کے آنے کی یہی شان رہی جو شان کہ کسی کے سر پر کسی جن یا پریت کے آنے کی ہوتی ہے۔ اس لیے غیب کی باتیں بھی مسیحوں کے خیال کے مطابق روح القدس اُس کے مقدس لوگوں کی زبان سے ظاہر کر دیا کرتا تھا۔ صائبی لوگوں میں غیب دانی و کمانت کی یہ تھیوری تھی کہ اتر یا مسیس اور اوالس اول و دوم جن سے مراد ہمس اور آغا فیون ہیں۔ اصلی دانایان غیب تھے۔ ان کو صائبی لوگ اپنے مذہب کے پیغمبر بتاتے تھے۔ انھیں کی توجہ دبرکت سے اور لوگ بھی غیب کی باتیں جانتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ یہی لوگ ان کے روح القدس تھے جن کا فیض بعد والوں کو بھی غیب دان بنادیا کرتا۔ اس سے ان کو قطعاً انکار تھا کہ اجنہ یا سوکل روحین اُسے انسان کو غیب کی باتیں بتاتی ہیں۔ بلکہ ان کا یہ خیال تھا کہ مذکور پیغمبروں کو مجاہدہ اور تزکیہ باطن کے فداہیہ سے ایسی صفائے قلب حاصل ہو گئی تھی تھی کہ اسرار غیب سے مطلع ہو گئے تھے۔

کمانت کا اسکے قدیم الاہام میں اس قدر بیٹھا ہوا تھا کہ اُس عہد کے فلسفی اور علما سے طبعی بھی کاہنوں کی غیب دانی کے قائل تھے۔ اور اُس کی توجیہ یہ کرتے کہ کمانت ایک لطیف جذبہ انسانی ہے جو صفائی قلب اور نفسانی قوت اور جس کی لطافت سے انسان میں پیدا ہو جاتا ہے۔ بعض نے اُسے علم نجوم اور آثار فلکی سے وابستہ کر کے کہا جو بچہ ایسے طالع میں پیدا ہو کہ عطار د محل شرف پر ہو۔ اور ربانی سیارات ستارے بھی اچھے عقد میں ہوں اور عقد کی سے ایک دوسرے کی طرف ناظر اور متوازی واقع ہوں وہ لڑکا ان ستاروں کے اثر سے لازمی طور پر کاس اور غیب دان ہوتا ہے۔ سب سے زیادہ اس کے طرفدار اور ماننے والے علما نے روحانیین تھے۔ جن کا

بیان تھا کہ نفس ناطقہ انسانی جب قوی اور زبردست ہوتا ہے تو وہ طبیعت کو مغلوب کر کے دبا دیتا ہے۔ اور انسان پر لطیف اور کوآتشکارا کر کے ہرگز معنوی سے واقف کر دیتا ہے یہ کتھے ہیں کہ انسان میں دو چیزیں ہیں۔ روح اور جسم۔ جسم بغیر روح کے کوئی چیز نہیں۔ جب روح نہ ہو تو اس میں نہ قوت ہوتی ہے۔ اور نہ عقل و فہم جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جس وح حرکت اور ادراک و فہم سب چیزیں روح میں ہیں اور روح کی مختلف حالت پر بعض میں جس زیادہ ہوتی ہے۔ بعض میں دانائی زیادہ ہوتی ہے۔ بعض میں جلا اور روشن ضمیری بڑھی ہوتی ہے۔ لہذا جس روح میں روشن ضمیری زیادہ ہو اس پر عجیب عجیب انگشتا فات ہوتے ہیں۔ اور اسرار غیب کو وہ معلوم کر لیتی ہے۔

بہر حال دنیا انھیں خیالات میں بڑی ہوتی تھی۔ اور اس کے ساتھ طرح طرح کے خرافات بڑھتے اور پھیلتے چلے جاتے تھے جن کو انسانی عقل کی کمزوری اور بڑھا رہی تھی۔ اور بجائے اس کے کہ تحقیق و تنقید سے کام لے کے کوئی نتیجہ حاصل کیا جائے لوگ اس کی توجہ نہیں کرتے اور طرح طرح کے معنی پٹھانے کمانت کو اور جھکا تے جاتے تھے۔

بیان تک کہ دنیا میں نور اسلام چمکا۔ اور خدا نے ہر چیز کو ایک نئی روشنی میں دکھا کے تمام اگلی غلط خیالوں کو دور کر دیا۔ اسلام نے صاف کہہ دیا کہ غیب کو سوا خدا کے کوئی نہیں جانتا اور غیب دانی کے جو کچھ دعویٰ کیے جاتے ہیں سب لغو اور تھیل اور بے سرو پا ہیں۔ اس طریق سے اسلام نے اپنے نظریہ کے ساتھ ہی نجوم و کمانت کا چراغ گل کر دیا۔ اور اس قسم کے مدعیان غیب دانی کا زور کلیتہً توڑ دیا گیا۔ یہ اھل لاج سچ یہ ہے کہ اسلام کے اولیات میں سے ہے۔ یعنی ایسے وقت میں جبکہ سارے عالم پر کمانت کی حکومت تھی اور دینی پیشوائی کا لازمی جوہر غیب دانی تھا اور دنیا میں کسی کی نظر اس کے ابطال کی طرف نہیں لگی تھی۔ یک ایک اسلام کی طرف سے اس بات کا ڈھنڈورا پیٹ گیا کہ عالم الغیب سوا خدا کے کوئی نہیں اور جو کوئی اس کا دعویٰ کرے وہ جھوٹا ہے۔

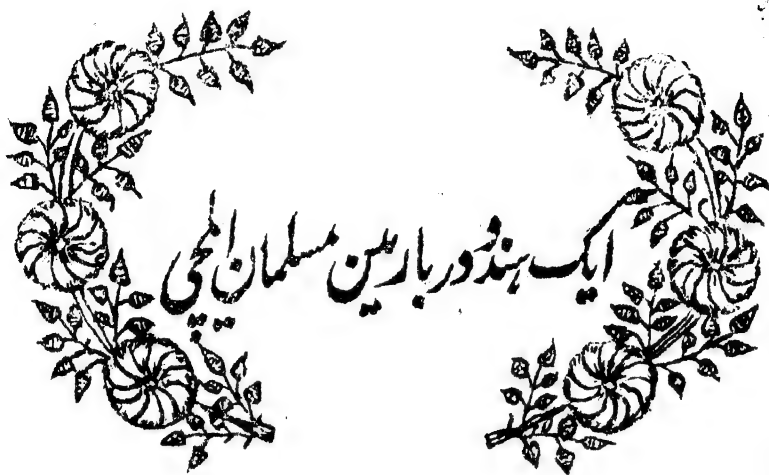
بے شک جناب مہر رکنا ت مسلم نے پیغمبر غیب کی تائید دین یا بعض پیشین گوئیوں فرمائی لیکن انکی نسبت صاف طور پر بتا دیا گیا کہ خدا نے فرشتہ کو بھیج کے اپنے پیغمبروں کی آگاہ کر دیا۔ اصل وہ خدا کی غیب انی کا جلوہ تھا اس حضرت رسالت کی غیب انی ہرگز نہیں کہہ سکتے اور جب حضرت

کی وفات کے بعد جبریل کے اپنے کاسد باب اور سلسلہ نبوت کا اختتام ہو گیا تو پھر کوئی دوسری
 نہیں باقی رہی کہ دنیا میں کوئی شخص اس غیب سے واقف ہوئی اور زندگی باتیں بنا سکا دعویٰ کر سکے
 بہر حال اسلام نے نجوم و کمانت کو بیخ و بنیاد سے اٹھا کر کے پھینک دیا مگر افسوس
 چند ہی روز بعد اسلام کے زہاد و عباد نے اسلامی مذاق کے سادے بے ریا اور غیر مظهر
 زہد و تقویٰ کو چھوڑ کے قدیم مذاق کے مقصوفانہ زہد و عبادت کو اختیار کر لیا۔ ولی اللہ کا
 عام لفظ جو ہر دیندار کے لیے تھا عباد و زہاد کے ایک خاص گروہ کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔
 اور ان میں نیک نفسی واقف اور اعمال و افعال کے بدلے کرامات اور غیب دہانی کے
 کرشمے ڈھونڈھے جانے لگے۔ اور ہندو بون کے الفاظ میں معنی بچھائے جانے لگے تو وہی
 کہانت جس کے استیصال کے لیے اسلام آیا تھا خود اسلام میں پیدا ہو گئی۔ اور جاہل تو
 جاہل اکثر ترے لکھے مسلمان بھی صفوی سالگون اور مجذوبوں کے پاس انہیں
 مقاصد و اغراض کو دل میں لے کے جانے لگے جن کے واسطے انکی توہین اپنے کاہنوں
 بخمبون۔ اور تہانوں کے پوجاریوں کے پاس جایا کرتی تھیں۔
 اصل یہ ہے کہ بعد کی آمیزشوں نے نہ اسلام ہی کو وہ اسلام باقی رکھا جسے
 حضرت رسالت (روحی فداہ) لائے تھے۔ اور نہ اُس کے مقتداؤں ہی کو ویسا
 رہنے دیا جیسے مقتدا کہ اسلام کے لیے ہونے چاہیے تھے۔ افسوس۔

خیالات و واقعات

آنریبل رائے بہادر بابو گنگا پرشاد صاحب ورمانے منشی سجاد حسین صاحب کی مخدومی
 کے زمانے میں انکی اعانت و دستگیری کا بیڑا اٹھایا ہے۔ وہ اس بات کے محرک ہیں کہ پہلک چندے سے
 اتنی اہم پہلک میں جمع کر دی جائے جس سے منشی سجاد حسین صاحب کو پچیس تیس صدیم ماہوار بطور
 وظیفہ کے ملا کر یہ منشی سجاد حسین صاحب بے شک پہلک کی اعانت کی مستحق ہیں انکی حالت غریب و کمزور
 عبرت روزگار ہے انکی زندگی کا آغاز مرنہ الحالی اور امیرانہ زندگی سے ہوا۔ ناز و نعم میں پرورش پائی۔ اور
 گو کہ آبائی جائیداد کو انھوں نے ناعاقبت اندیشی سے تلف کر دیا مگر کچھ بھی اس وقت تک اپنی ضروری
 قابلیت سے معزز زندگی بسر کرتے رہے۔ یورپ میں اس قسم کے لوگوں کی ایسی قدر دانی ہوتی ہے کہ وہ آخر تک
 اپنی زندگی اچھی طرح نباہ سکتے جاتے ہیں مگر ہندوستان کی پہلک نے ابھی تک اس قسم کا کوئی کام نہیں کیا

بابو گنگا پرشاد فی حقی کام کی تحریک کی ہر وہ دراصل نیا ہی گروہی اس کا رخبر کے محرک ہو بھی سکتے تھے
منشی سجاد حسین صاحب ان لوگوں میں جن حضروں نے اول سرکھنگا کے تمام سائل میں جو ہندو مسلم
میں مختلف فیہ ہے ہمیشہ مسلمانوں سے اختلاف کیا سرسید اور تمام مسلمان لیڈروں پر سب سب طعن و تشنیع کرتے
والے وہی تھے۔ کانفرنس اور تمام اسلامی تحریکوں سے ہمیشہ اختلاف رہا اور کانگریس کے اول دور جمع
کے طرفدار تھے کچھ انھیں چیزوں پر منحصر نہیں ہی۔ عموماً جو باتیں مسلمانوں میں مقبول ہوئیں منشی سجاد حسین
صاحب نے انھیں ہوتے ہی ہٹا دیا۔ معاملات درکنار اپنی اس ضد میں وہ ذاتیات پر حملہ کرنے
میں بھی دریغ نہ کرتے تھے۔ نواب حسن الملک اور مولانا حالی کی ذات پر جسے شرمناک حملہ اڑھ پانچ نے
کئے اُنہی کبھی کوئی تشریف شخص خوش نہ ہو سکا۔ اس لحاظ سے یہ کہ بابو گنگا پرشاد ہی اس کا رخبر کی
تحریک کے لیے نہایت موزن شخص تھے مسلمانوں کا فرض ہے کہ ان کا ہاتھ بٹائیں۔ اور انھیں جانیں
جس خاص مذاق کے مسلم الثبوت استاد منشی سجاد حسین تھے اب اس تہذیب کے دور میں جبکہ علم
بہت آگے بڑھ آیا ہے ہرگز نہ پیدا ہو سکیں گے۔ مگر ایسی قابلیت اور ایسی نبوت کے لوگوں کے لیے صرف
پچیس تیس روپیہ کا وظیفہ کم ہے۔ بلکہ کی نیا ضی کا یہ پہلا نمونہ ہندوستان میں قائم ہوتا ہو گا اگر اس
حقیر نہ ہونا چاہیے منشی سجاد حسین کے لیے پچیس تیس روپیہ کا وظیفہ بلکہ سے مانگ کے دنیا دراصل
ان کی قدر دانی نہیں تدلیل ہے۔ میرے نزدیک بابو صاحب کو چاہیے کہ بلکہ کو زیادہ
فناں بنائیں اور کم از کم ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار وظیفہ دلوائیں تاکہ منشی صاحب شریفانہ
زندگی بسر کر سکیں جس کے کہ وہ عادی رہے ہیں اگر زور سے تحریک کی گئی تو ڈیڑھ سو
روپیہ ماہوار کا سر انجام ہونا چندان مشکل نہیں ہے۔



۱۲ شعبان ۱۲۸۵ھ کو مولانا کمال الدین عبدالرزاق ابن حمال
 بزرگ سمرقند میں پیدا ہوئے تھے جن کے والد سلطان شاہ پرخ فرماوا۔
 امام تھے۔ ۱۳۸۵ھ میں پدر بزرگوار نے سفر آخرت کیا تو
 سلطان مذکور نے اپنے آخر عہد یعنی ۱۳۸۵ھ میں
 اپنے اس سفر کا حال مولانا سے مدوح نے
 ذرا تفصیل سے لکھا ہے جس میں بہت سے
 کوسٹراٹیلٹ نے اپنی تاریخ ہند میں
 ہم محقر آؤ لکنڈ از میں شائع کرے
 بھیجے گئے تھے۔ مگر حسن اتفاق
 بجا نگر کی سلطنت
 تھی۔ گلبرگہ کے ہند
 اور ہندوستان کا اس
 جنوبی ہند میں
 نظام شاہیہ
 باہم اتحاد

کھنڈر ان تینوں اتحادیوں کی یادگار میں آج تک عبرت روزگار ہیں۔ لیکن اسی ہندو سلطنت کے عروج کے زمانے میں علامہ عبدالرزاق شاہ رخ مرزا کے سفیرین کے بیجا نگر گئے تھے۔

وہ کہتے ہیں میں ۵۰ رشتوالی کو کرمان سے چلا اور ماہ مذکور کے وسط میں بحر عمان کے کنارے بندرگاہ ہیرمز میں پہنچا جو جہرون بھی کہلاتا ہے۔ وہاں کے والی ملک خزاہ الدین توران شاہ نے میری بڑی خاطر پی۔ ایک کشتی بھیج کے مجھے شہر ہیرمز میں بلوایا۔ رہنے کو مکان دیا۔ اور تمام سامان جو تحفہ نصیحت مہیا کر دیا۔ شہر ہیرمز بے مثل و بے نظیر ساحلی شہر اور تجارت کی عظیم الشان منڈی ہے۔ مقرر۔ شام۔ روم۔ آذربائیجان۔ عراقین۔ فارس۔ خراسان۔ مادراہنہ۔ ترکستان۔ دشت قباچ۔ ملک قفقاز اور نیز تمام مشرقی ممالک چین۔ یاجین۔ اور غنائ بالیق کے سوداگر یہاں جمع رہتے ہیں۔ اور تمام ممالک۔ راندار اور قیمتی مال اپنے ساتھ لاتے اور بیچتے ہیں۔ مال کا بہت اچھا بازار۔ کادوسوان حصہ سرکاری محصول کے طور پر انھیں سلطنت کی

جسے شہر خوب رونق پر ہے اور ہر مذہب کے معتدا اور

الامان مشہور ہو گیا پھر اور باہمی مل جول سے

فروتنی کو ملا کے ایک نیا خوشگوار مزاج پیدا کر دیا

موانع ہو انوکھوں اور سامان کو

ہماز کے چلتے ہی میری یہ حالت ہو گئی کہ

نہ سے معلوم ہوتا تھا کہ میں زندہ

سم آ گیا اور ایسی حالت میں

م سفرون نے دے دلا کے اور

ب اتار لیا۔ اور میں قریب

لا کی گرمی تھی کہ ماہ محرم

ر پڑ گئے۔ دو جاں بید

الدین عبدالنور ہاں

متفرخت کیا، اٹھائے قیام میں سنا کہ شہر قلابات کے سادہ نام ایک مقام کی
آب و ہوا بہت معتدل ہے۔ باوجود ناتوانی کے کشتی پر بیٹھ کے وہاں گیا۔ مگر
جاتے ہی اور زیادہ بیمار ہو گیا۔

آخر بلا انتظار صحت ہندوستان کا سفر کر دیا۔ اور اٹھارہ شانہ روز کی
شناوری کے بعد جبکہ صحت عود کر آئی تھی۔ مین جنوبی ہند کی بندرگاہ کالی کٹ میں
پہونچا۔ کالی کٹ پوری طرح امن و امان کی جگہ ہے۔ اور ہر فرس کی طرح یہاں بھی
ملکوں ملکوں کے تجارت کا مجمع رہتا ہے۔ اور حبشہ سے زیمبابو اور زنجبار وغیرہ کا نہایت
ہی نادر و بیش بہا مال آتا ہے۔ مگر مغلہ اور ارض چائے سے جہازوں کو آنے کا سلسلہ
برابر جاری رہتا ہے۔ یہ کافرون کا شہر ہے۔ لہذا اس کے فتح کرنے کا بہن حتی
حاصل ہے۔ متعدد مسلمان بھی یہاں رہتے ہیں۔ جنہوں نے یہاں دوعالیشان مسجد میں
تعمیر کرنی ہیں جن میں جمعہ کے دن نماز کو جمع ہوا کرتے ہیں۔ ان کا ایک قاضی بھی۔ اور
علی العموم ششما فی مذہب ہیں۔ اس شہر میں حفاظت کا ایسا اچھا انتظام ہے۔ اور ایسی
عدالت جاری ہے کہ دولت مند سوداگر کثرت سے مال تجارت لاسے یہاں انارے
اور سڑکوں اور بازاروں میں لاسے رکھ دیتے ہیں اور بغیر اس کے کہ کسی کے سپرد
کردین چھوڑ کے چلے جاتے اور مدتوں غائب رہتے ہیں مگر ممکن کیا کہ کوئی ادنیٰ
چیز بھی غائب ہو جائے۔ عمدہ داران کرڈر گری اسے اپنی حفاظت میں لے کے
اس پر پھر مقرر کر دیتے ہیں۔ اگر وہ فروخت ہو گیا تو اڑھائی روپیہ فی سیکڑا
کے حساب سے محصول لے لیتے ہیں ورنہ کسی قسم کا قرض نہیں کرتے اور مال کو مال
واسے کے حوالے کر دیتے ہیں۔ دیگر بندرگاہوں میں معمول ہے کہ اگر کوئی اور جہاز
جو وہاں کے لیے نہ آیا ہو تنگ کے یا طوفان کے تھپیڑوں سے بہ سکے وہاں پہونچ
جائے تو لوٹ لیا جاتا ہے۔ لیکن کالی کٹ میں جاسے کوئی جہاز ہو اور کہیں کا ہو
اُسی طرح حفاظت سے رکھا جاتا ہے جس طرح اور جہاز رکھے جاتے ہیں۔

الغرض مین کالی کٹ میں پہونچا تو مجھے یہاں ایک عجیب قسم کی خلقت نظر آئی
انسانوں کی ایسی صورتیں نظر سے گزر رہیں جیسی کہ ان آنکھوں نے کبھی نہیں دیکھی
تھیں۔ عجیب الخلقت لوگ جنہیں نہ انسان کہہ سکتے ہیں نہ دیوتا کہہ سکتے ہیں۔ خواب

میں بھی نظر آئیں تو آدمی چونک پڑے۔ اور برسوں تک دل ہول کھاتا رہا۔ یہی تو ماہ رخ حسینوں کا شیدا ہون کسی کالی عورت پر میرا دل نہیں آ سکتا۔ یہاں کے سیہ قام لوگ تقریباً تنگے سڑکوں پر بارے بارے پھرتے ہیں۔ صحن ایک دھوئی باز صحن پر پڑے ہیں جو ناف سے لے کے گھٹنوں کے اوپر تک رہتی ہے۔ ان کے ایک ہاتھ میں ایک سندھی فنجر (بھجالی) ہوتا ہے اور دوسرے میں بیل کی کھال کی ڈھال۔ راجہ اور فقیر سب کی یہی وضع ہے۔ مگر مسلمان لوگ اہل عرب کے مثل قیمتی کپڑے پہنتے اور مختلف قسم کے تکلفات کا اظہار کرتے ہیں۔

یہاں پہنچتے ہی میں بہت سے ہندو مسلمانوں سے ملا۔ ایک اچھے مکان میں ٹھہرایا گیا۔ اور تیسرے دن لوگ مجھے راجہ کے دربار میں لے گئے۔ دوسرے ہندوؤں کی طرح وہ بھی مجھے شنگا نظر آیا۔ اس مقام کے راجہ کو لوگ "ساموری" کہتے ہیں اور جب وہ مرجاتا ہے تو اس کا جانشین اس کا بھانجا یعنی بہن کا بیٹا ہوتا ہے۔ (بیٹے کو وراثت نہیں ملتا) اسلام کے ذریعہ سے سلطنت حاصل کرنے کی کبھی کوئی کوشش نہیں کرتا۔ بیان کنار کی مختلف ذاتیں اور قومیں ہیں مگر سب بت پرست ہیں اور ہر قوم و ذات کا طہر طریق اور رسم و رواج بھی جہاں ہے۔ انھیں میں ایک قوم ایسی ہے جس میں ایک عورت کے کئی شوہر ہوتے ہیں جو مختلف طبقوں اور جملوں کے لوگ ہوتے ہیں۔ اور عورت کی صحبت کے لیے شب و روز کے گھٹنوں کو ہاتھ لیا کرتے ہیں۔ عورت کے پاس جب تک اس کا ایک شوہر اپنے معینہ و مقرہ وقت میں رہتا ہے دوسرا شوہر نہیں جاسکتا۔ خود ساموری (راجہ) بھی اسی قوم کا ہے۔ (یہ نام قوم کا حال ہے جو در اس سے لے کے انتہائی جڑب ٹک آج بھی کثرت سے موجود ہے۔ اور اس زمانے میں بھی اس قوم کا یہی حال ہے)

اس زمانے میں سلطان شاہ رخ کی شہرت تھی۔ اتفاقاً جو نیور کے سلطان ابراہیم شرقی نے سلطان بنگالہ کی قلمرو میں تاخت و تاراج شروع کر دی سلطان بنگالہ نے اس کی شکایت ایلچی بھیج کے سلطان شاہ رخ کے دربار میں کی۔ سلطان شاہ رخ نے شیخ الاسلام خواجہ کریم الدین ابوالکارم جامی کو ایک خط دے کے جو نیور بھیجا اور لکھا کہ تم بنگالہ کی قلمرو پر تاخت و تاراج کرنے سے باز آؤ ورنہ بڑا ہنگامہ

اور اس کے ذمہ دار تم ہو گے۔ یہ ایسا زبردست حکم تھا کہ سنتے ہی ابراہیم شرتی اپنی دست برد سے باز آ گیا۔ سلطان شاہ رخ کا جو سیف بنگالہ گیا تھا وہ واپسی کے وقت موسم کی مجبوری سے دو چار دن کے لیے کالی کٹ میں ٹھہر گیا جس سے راجہ ساموری کو یہ قصہ اور اس کے ساتھ سلطان شاہ رخ کی عظمت معلوم ہوئی۔ چنانچہ سلطان مذکور کے خوش کرنے کے لیے راجہ کالی کٹ نے ایک قابل و معزز مسلمان کو اپنے دربار کا خاص ایلیچی بنا کے بہت سے نادر ہدیوں اور نذرانوں کے ساتھ سلطانی سفر کے ہمراہی اُنس کے دربار میں بھیجا۔ اُسی سفارت کا جواب دیتے اور معاوضہ کرنے کے لیے سلطان شاہ رخ نے مولانا عبد الرزاق کو کالی کٹ بھیجا تھا۔ چنانچہ انھوں نے راجہ کے دربار میں حاضر ہو کے سلطانی ہدایا جن میں گھوڑے۔ زنانی صدریان اور شلو کے زربفت کے تھان۔ ٹوپیان وغیرہ تحین پیش کر دیے۔ سلطان نے ساموری کو جو خط مولانا کے ہاتھ بھجوا تھا اُس میں یہ لکھا تھا ”تم لکھتے ہو کہ ہماری دانائی اور نصیحت پر عمل کر کے ہماری خوشنودی حاصل کرو گے تو میں نصیحت کرتا ہوں کہ تم دین اسلام قبول کر لو تا کہ تمھارے تاریک دل سے بے دینی کی ظلمت دور ہو جائے۔ اور فوراً ایمان کی شعاعیں تمھارے سینہ میں چمک اٹھیں گی۔“

غالباً اسی خبر پر کی وجہ سے ساموری نے مولانا کی سفارت کی زیادہ قدر نہیں کی اور نہ اُن کی طن جوش سے متوجہ ہوا۔ چنانچہ وہ برخاستہ خاطر ہی کے ساتھ دوبارے واپس آئے۔ اور کہتے ہیں کہ آخر جمادی الآخر سے ابتداء ذی الحجہ تک میں اسی شہر میں مضطرب و پریشان گزارا۔ جو زمانہ کہ ہوم و آلام کا تھا۔ وسط ذی الحجہ میں میں نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ سلطان شاہ رخ آئے ہیں اور کہتے ہیں ”اب زیادہ پریشان نہ ہوا ساتھ ہی آگے کھل گئی۔ اور میں کسی غیر مترقبہ فلاح کا منتظر ہو گیا۔ صبح کو ایک قابل شخص کے پاس گیا کہ اس خواب کی تعبیر پوچھوں بنا گمان ایک شخص نے آگے کہا کہ راجہ بیجا نگر جس کی سلطنت بڑی زبردست اور قلم و نہایت وسیع ہے اپنے قاصد کے ہاتھ ساموری کے پاس ایک خط بھیجا ہے اور خواہش کی ہے کہ تمھارے پاس عاقان سعید شاہ رخ کا جو ایلیچی آیا ہے اُسے فوراً میرے پاس روانہ کرو۔“ ساموری کو کہ راجہ بیجا نگر کا ماتحت نہیں ہے مگر ہمیشہ اُس سے ڈرتا رہتا ہے۔ اس لیے کہ راجہ مذکور

کی قلعہ میں کالی کٹ کی ایسی ایسی تین سو بندرگاہیں ہیں اور اندرونی ملک میں اُس کی قلعہ تین ہینہ کی راہ تک پھیلی ہوئی ہے۔

کالی کٹ سے شہر کا کئی ٹنگ جو کہ سراندریپ کے عین حمادی واقع ہے تمام ساحلی مقامات صوبہ ٹیلہار میں شمار کیے جاتے ہیں۔ یہاں سے جو جہاز مکہ معظمہ کو جایا کرتے ہیں اُن میں عواماً مرج لدی ہوتی ہے۔ اہل کالی کٹ بڑے جہازران ہیں۔ اور انہیں پتہ کے اقتب سے یاد کیے جاتے ہیں۔ اسی لیے دریائی لوٹیرے کالی کٹ کے جہازوں سے کبھی تعرض نہیں کرتے۔ اور کالی کٹ میں ہر چیز دستیاب ہو جاتی ہے۔ سوا اس کے کہ تم یہاں گائے کو نہیں ذبح کر سکتے ہو اور نہ اُس کا گوشت کھا سکتے ہو۔ گائے کی یہ لوگ نہایت تعظیم کرتے ہیں۔ اور اپنی پیشانیوں پر اُس کے گوبر کی رالکھ کاٹھیکا دیتے ہیں۔

یہاں سے علامہ مدوح اپنے سفر بیجا نگر کا حال بیان کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ میں کالی کٹ سے چلا اور بندرگاہ بندانہ کو پہنچ کر شہر منگلور پہنچا جو سمندر کے کنارے اور سلطنت بیجا نگر کی سرحد ہے۔ منگلور میں دو تین دن قیام کر کے میں نے خشکی کا سفر شروع کیا۔ اور منگلور سے تین فرسنگ پر ایک ایسا عالیشان مندر دیکھا جس کی نظیر سے ساری دنیا خالی ہے۔ یہ دس گز لمبا اور دس گز چوڑا اور تقریباً پانچ گز اونچا ہے۔ نیچے سے اوپر سارا شوالہ ایک ڈال پیل کا ہے اور سونے کا ڈالا معلوم ہوتا ہے۔ چار زینے قائم کر کے اُن پر دیوتا کی صورت قائم کی گئی ہے جو پوری سونے کی ہے۔ انسان کی وضع پر بنائی گئی ہے۔ اور آنکھوں کی جگہ دو لعل ایسی خوبی و نزاکت سے جوڑے گئے ہیں کہ ہر شخص کو معلوم ہوتا ہے بھاری ہی طرف دیکھ رہی ہے۔

اس مندر کی زیارت کر کے میں آگے بڑھا۔ ہر روز شام کو کسی شہر یا گاؤں میں منزل کرتا جو خوب آباد نظر آتا۔ اور صبح کو آگے کی راہ لیتا۔ درمیان میں ایک عظیم الشان پہاڑ اور گھٹا جنگل پڑا یہ یقیناً مغربی گھاٹ ہے جس کو قطع کر کے میں شہر بدور (موجودہ بدوڑ) پہنچا جس کے مکانات قصر و ایوان معلوم ہوتے ہیں۔ اور جہاں کی عورتیں حسن و جمال میں گویا جنت کی حوریں ہیں۔ بدوڑ میں ایک عظیم الشان مندر ہے جو اس قدر بلند ہے کہ اُس سے تم کئی فرسنگ کے فاصلہ سے دیکھ سکتے ہو۔ اس مندر کی مختصر کیفیت یہ ہے کہ شہر کے چوں پچ میں دس بلکہ زمین کا ایک سطح تختہ

چھوٹا ہوا ہے۔ جس میں جین بندی ہے۔ اور اس کثرت سے پھول لگے ہیں کہ گویا باغ کھلا ہوا ہے۔ اس جین کے عین وسط میں ایک قد آدم اونچا جو ترہ ہے جو اس خوبی و نفاست سے تعبیر کیا گیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے گویا ایک ڈال پتھر کا ہے۔ اور کمین جو زمین اس جو ترہ کے بیچ میں ایک بلند عمارت ہے جس پر نیلے رنگ کا گنبد ہے اس میں اوپر سے نیچے تک منور تو ن کی تین قطارین پتھر میں کھدی ہوئی ہیں۔ سنگتراشی میں کوئی انسانی کمال نہیں باقی رہنے پایا ہو اور چین و فرنگ کی نقاشی کا کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا گیا ہے۔ اس عمارت میں چار چھتیں ہیں جن کا طول ۲۰ گز ۶۷ میٹر ہے اور بلندی ۵۰ گز کے قریب ہے۔ اس مندر میں شب و روز عبادت کے بعد گانا بجانا اور ناچ ہوتا ہے۔ اور نذر جاری رہتا ہے۔ شہر میں جتنے لوگ رہتے ہیں سب کو اس مندر سے وظیفہ اور روزینہ وغیرہ ملتا ہے اس لیے کہ لوگ یہاں دور دور سے آ کے قیمتی نذرانے چڑھاتے ہیں۔

دو تین روز یہاں قیام کر کے میں آگے بڑھا۔ اور ذی الحجہ کے ختم ہوتے ہوتے بیجا نگر پہنچ گیا۔ میرے آنے کی خبر سننے ہی راجہ نے استقبال کے لیے ایک باڈی گارڈ بھیجا جو لوگ مجھے شان و شوکت اور عزت و احترام کے ساتھ شہر میں لے گئے۔ اور ایک اچھے اور آرام دہ مکان میں ٹھہرایا۔ یہاں میں نے آگے دیکھا تو مجھے نہایت ہی بڑا اور بہت آباد شہر نظر آیا۔ اور میں ایک ایسے راجہ کے دربار میں بار یاب تھا جس کی عظمت و سلطنت دونوں اعلیٰ درجہ کی ہیں۔ اس کی قلمرو سرحدیں سے حدود گلبرگ رنگ اور نیگالہ سے ملیا رتک پھیلی ہوئی ہے۔ جس کی مسافت ایک ہزار فرسنگ سے زیادہ ہے ملک کا زیادہ حصہ متر و عم اور زرخیز ہے۔ اور تقریباً ۲۰ اچھے ساحلی شہر اس کے زیر علم ہیں۔ ایک ہزار سے زیادہ ہاتھی راجہ کے قیل خانے میں ہیں۔ اور گیارہ لاکھ فوج ہے۔ سارے ہندوستان میں کوئی راجہ اس کا ہم پایہ نہیں۔ راجہ کے دربار میں برہمنوں کی سب سے زیادہ قدر و منزلت ہوتی ہے۔ کتاب کلید و منہ جس سے بہتر کوئی کتاب فاسی میں نہیں غالباً اسی سرزمین کے عقلا کی لکھی ہوئی ہے۔

بیجا نگر کا شہر دنیا میں نہ دیکھا گیا ہے اور نہ سنا گیا ہے۔ اس کی سات

شہر پناہین ہیں۔ بیرونی شہر پناہ کے گرد اگر تقریباً ۵۰ گز کا میدان چھوٹا ہوا ہے۔ جس میں قد آدم اونچی اونچی سلین اور چٹانیں ایسی بچدیگی کے ساتھ کھڑی کھڑی اور ایک دوسرے کے متصل قائم کر دی گئی ہیں کہ حریف کے پیدل ہون یا سوار کیسے ہی جاننا زوجری ہون آسانی کے ساتھ دیوار شہر تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس کے بعد مولانا نے بیانگر کوہرات کے مشابہ تبا کے اُس کی ہر شہر پناہ اور اُس کے ہر حصہ کوہرات کی کسی قلعہ بندی یا کسی محلہ سے تشبیہ دی ہے۔ اور کہتے ہیں کہ ساتویں حصہ کے اندر راجہ کا محل ہے۔ بیرونی دیوار کے شمالی بھاگ سے جنوبی بھاگ تک پورے دو فرسنگ (ساتھ سے سات میل) کی مسافت ہے۔ اور اتنی ہی مسافت مشرقی و مغربی بھاگوں کے درمیان ہے۔ پہلے دوسرے درتیرے حصہ ہون کے درمیان مزروعہ کھیت، باغ، اور مکانات ہیں۔ تیسرے حصہ سے ساتویں تک دکانیں بازار اور نہایت کھنی آبادی ہے۔ راجہ کے محل کے قریب چار بازار ہیں جو ایک دوسرے کے مقابل اور محاذی ہیں۔ انہیں میں سے جو بازار شمال کی جانب ہے اُس میں راجہ کا قصر ہے۔ ہر بازار کے سر پر ایک بلند محراب دار دروازہ ہے۔ اور اُس سے مل کے دکانوں کے آگے آگے دونوں جانب عالیشان برآمدہ چلا گیا ہے۔ مگر راجہ کا محل شہر کی تمام غارتوں سے بلند اور زیادہ شاندار ہے۔ شہر کی دیوار میں مربع نہیں بلکہ گول اور دائرے کی وضع میں ہیں۔ جو پتھر اور چونے سے بڑی مضبوطی کے ساتھ تعمیر کی گئی ہیں۔ بازار بہت چوڑے اور لمبے ہیں۔ اُن کی چوڑائی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ پھول والے اپنی دکانوں کے سامنے اونچے اونچے میز رکھ کے پھولوں کا انبار لگائے ہیں۔ مگر باوجود اس کے کہ دونوں جانب اس قسم کی میزیں قائم ہیں۔ بخوبی خرید و فروخت ہوتی ہے اور لوگ آسانی سے گزرتے رہتے ہیں۔ نکلنے والے خوشبودار تازے پھول یہاں ہمیشہ اور ہر وقت کثرت سے مل سکتے ہیں۔ اور ضروریات زندگی کے لیے وہ اس قدر لازمی ہیں کہ گویا بغیر اُن کے جینا دشوار ہے۔ ہر قسم کے مال اور سامان کی دکانیں ایک ہی جگہ اور قریب قریب ہیں۔ اور جو ہری سب طرح کے جواہرات علانیہ دکانوں میں رکھ کے فروخت کرتے ہیں۔ اس دلفریب اور خوشنما حصہ شہر میں جہاں راجہ کا محل ہے بہت سے چشمہ

اور نثرین جاہلی ہیں جو بڑی لطافت و صنایع کے ساتھ پتھروں کی جوڑائی سے اور اُن پر خوب گھٹائی کر کے بنائی گئی ہیں۔ انہی محل کے داہنی جانب "دیوان خانہ" یعنی وزیر کا دفتر ہے۔ جو بہت بڑی عمارت ہے۔ اور ستونوں کی کثرت سے "چھل ستون" کے جانے کے قابل ہے۔ اُس کے آگے ایک بلند پرآمدہ ہے جو ۳ گز لمبا اور ۱۶ گز چوڑا ہے۔ اور اُس کی کرسی قد آدم بلند ہے۔ اس میں محافظ خانہ ہے۔ یعنی دفتر کی غلین جمع ہیں۔ اور محراب بیٹھے کام کر رہے ہیں۔

ان لوگوں میں تحریرین دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک تو ناریل کے پتوں پر جو دو گز لمبے اور دو انگلی چوڑے ہوتے ہیں۔ اور لوہے کی نوکدار سلائی سے اُن پر کھود کے لکھا جاتا ہے۔ روشنائی کی ضرورت نہیں۔ مگر یہ تحریر تھوڑے ہی دنوں میں ضائع ہو جاتی ہے۔ دوسرا انداز تحریر یہ ہے کہ کسی چیز پر کالک پھر کے اُس کی زمین سیاہ کر لی جاتی ہے اور اُس پر پتھر کے قلم سے سفید حرفوں میں لکھتے ہیں یہ طرز کتابت دیر پا بھی ہے اور پسند بھی زیادہ کیا جاتا ہے۔

اُس ستونوں والے دیوان خانے کے درمیان میں ایک بلند چوڑے پر ایک خواجہ ہم بیٹھا رہتا ہے جو "دنانگ" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ تمام نظم و نقش کا افسر اعلیٰ وہی ہے۔ اور اُس کے چوڑے کے نیچے بہت سے گورنر بردار اپنے گزراتے کھڑے رہتے ہیں جو کوئی شخص کسی غرض یا فریاد کے لیے آتا ہے وہ اُن گز زرداروں کی صفوں سے گزرتے کوئی معمولی قسم کا نذرانہ پیش کرتا ہے پھر زمین پر سر رکھ کے ادب پر زمین بوس ہوتا ہے اور اُس کے بعد لکھ کر اپنی غرض بیان کرتا ہے۔ جس پر غور کر کے دنانگ حسب توہین مردہ احکام جاری کرتا ہے۔ اور پھر اُن احکام کے اجرا میں کوئی قوت مزاحم نہیں ہو سکتی۔ دنانگ جب یہاں سے اٹھ کے جاتا ہے تو لوگ اُس کے آگے کئی رنگین چھترے کے چلتے ہیں۔ ترہان پھنکتی ہیں۔ اور بھاٹ لوگ دونوں جانب سے نغمہ دعا سناتے جاتے ہیں۔

دنانگ کو جب راجہ سے ملنا ہوتا ہے تو اُسے قصر شاہی کے سات پھاٹک ملے کرنا ہوتے ہیں جن پر شاہی پہرہ رہتا ہے۔ ہر ہر پھاٹک پر ایک ایک چھتر چھوڑا جاتا ہے یہاں تک کہ جب وہ ساتویں پھاٹک سے آگے بڑھتا ہے تو کوئی چھتر نہیں باقی رہتا۔

دناٹک کا مکان راجہ کے محل کے پچھواڑ سے ہے۔ راجہ کے محل کے بائیں جانب گیسال ہے جہاں بہت سے قسم کے تنوے کے سکے تیار ہوتے ہیں جن میں مناسبت سے کھوٹ ملا جاتا ہے۔ ان سکوں میں سے ایک "وراما" کہلاتا ہے جس کا وزن ایک شقال کا ہے۔ دوسرا "پرتاب" کہلاتا ہے جو قیمت میں آدھے وراما کے برابر ہوتا ہے۔ تیسرا "فنام" کہلاتا ہے جو پرتاب کا دسواں حصہ ہے یعنی دس فناموں کا ایک پرتاب ہوتا ہے۔ فنام کا چلن بہت زیادہ ہے۔ ایک خالص چاندی کا سکہ بھی کرنٹ سے بنتا اور بہت مروجہ "جو" تار "کہلاتا ہے۔" چھ تار "کا ایک فنام ہوتا ہے۔ اس سے کم مانے کا سکہ "جیتل" ہے۔ تین جیتلوں کا ایک تار ہوتا ہے۔

یہاں کا معمول یہ ہے کہ تمام مالکان اراٹھی کا شکار ایک مقررہ وقت پر سرکاری مالگڈاری لاکے یہیں گیسال میں داخل کرتے ہیں۔ اور جس کسی کو سرکار سے کچھ ملنا ہوتا ہے اسے محاسب سے ایک پروانہ گیسال کے نام مل جاتا ہے جہاں سے وہ رقم وصول کر لیتا ہے۔ سپاہیوں کو ہر چھ مہینہ تنخواہ ملتی ہے۔

ملک اس قدر گھنا آباد ہے کہ آبادی کی تعداد کے متعلق کوئی رائے نہیں قائم کی جاسکتی۔ راجہ کے خزانے میں کمرے اور رہنے والے خالص سونے کی سلون سے بھرے ہوئے ہیں۔ اور تمام اہل ملک کیا اعلیٰ اور کیا ادنیٰ حتیٰ کہ معمولی درجہ کے بازاری لوگ بھی جواہرات اور سونے کا زیور کا لون۔ گلی۔ بازون۔ کلائیون اور انگلیون میں پھنر رہتے ہیں۔

دفتر وزارت کے محاذی انیل خانہ ہے۔ ملک میں راجہ کے بہت سے ہاتھی ہیں۔ شہر کے پہلے اور دوسرے حصہ کے فیما بین اور نیز آبادی کے شمال مغربی رخوں پر ہاتھیوں کی تعلیم و پرورش کا محکمہ ہے جہاں ہاتھیوں کو چھوٹے بچے لاکے رکھے اور سدھائے جاتے ہیں۔ راجہ کا ایک مفید ہاتھی ہے جو نہایت ہی بڑا ہے۔ اور اس کی جلد میں جا بجا ۲۰ کے قریب رنگین دھبے ہیں۔ یہ ہاتھی ہر صبح کو راجہ کے سامنے لایا جاتا ہے۔ اس لیے کہ یہاں صبح اُس کو بھینا نہایت ہی مبارک ہے۔ ہاتھیوں کو دن بھر میں دو بار غذا دی جاتی ہے۔ اور بخیر مکانوں میں رہتے ہیں جن کی چھتیں بہت ہی مضبوط ہوتی ہیں۔ جو زنجیریں ان کی گردن اور پیٹ پر ہوتی ہیں وہ چھت کے شہر میں اکاد دی جاتی ہیں۔ اور اگلے دونوں پلوں میں بھی زنجیریں پڑی

رہتی ہیں۔ اگر ایسی بندش نہ کی جاسے تو وہ بھوت جانیں۔
 ہاتھیوں کے بکڑنے کا یہ طریقہ ہے کہ جنگل میں جس راستہ سے جنگلی ہاتھی پانی پینے کو
 جاتے ہیں اُس راستہ میں لوگ گڑھے کھود کے پھوس وغیرہ سے پائے دیتے ہیں۔ جہاں
 کسی ہاتھی کا پاؤں کسی گڑھے سے سرسڑ گیا وہ اُس کے اندر جا پڑتا ہے اور پھر نہیں نکلا پاتا۔
 دو تین دن تک تو کوئی اُس گڑھے کے قریب نہیں جاتا۔ پھر ایک شخص جاکے اُسے خیر سے
 دو چار کو بجھ دیتا اور لاتا ہے ساتھ ہی ایک اور شخص نمودار ہوتا ہے جو اُس پہلے شخص سے نیزہ
 چھین کے پھینک دیتا اور اُسے مار کے بھگا دیتا ہے۔ پھر کھانے کے لیے کوئی تیر بھجوار کے
 ہاتھی کے سامنے ڈال کے چلا آتا ہے۔ یہی کارروائی روز بہ روز ہوتی ہے۔ یعنی پہلے ایک شخص
 آ کے ہاتھی کو مارتا پھر دوسرا اُسے بچاتا اور کھلاتا ہے۔ یہاں تک کہ ہاتھی اُسے اپنا
 بچانے والا اور دوست سمجھ کے اُس سے مانوس ہو جاتا ہے۔ تب وہ قریب جاکے اُسے
 سملاتا پیار کرتا اور اظہار محبت کرتا ہے۔ اور آخر پوری طرح مانوس بنا لینے کے بعد اُسے
 زنجیریں بچھاتا اور گڑھے میں سے نکال لاتا ہے۔

ہندوستان کے راجہ ہاتھیوں کے شکار کے شوق میں دو ایک مہینہ جاکے جنگل میں
 رہتے ہیں۔ اور جب کچھ ہاتھی ہمد آ جاتے ہیں تو بڑی خوشیاں مناتے ہیں۔ بعض
 اوقات ہاتھیوں سے یہ کام بھی لیا جاتا ہے کہ مجرم اُن کے ذریعہ سے قتل کرائے جاتے ہیں۔
 سرانڈیپ سے اکثر سوداگر ہاتھیوں کو دور دور کے ملکوں میں لجا کے اُن کی بلندی
 کے مطابق زیادہ قیمت پر فروخت کرتے ہیں۔

ہنگامی کے مقابل کوئٹہ والی شہر کا دفتر ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ اس کے متعلق بارہ ہزار پولیس کے
 جوان ہیں جن کی تنخواہ کا حساب بارہ ہزار تمام یومیہ پڑتا ہے یہ رقم شہر کے چکاون اور پینشنوں کے
 ٹیکس سے پوری کی جاتی ہے۔ اس موقع پر مولانا عبدالرزاق کہتے ہیں کہ ان بازاری خوروں
 کے مکانون کی شان و شوکت اور ان دلبازانہ بیخون کا حسن و جمال۔ اُن کے ناز و
 انداز اور اُن کی دلبری کی چالیں دیکھنے ہی سے تعلق رکھتی ہیں بیان نہیں ہو سکتا۔
 اور بہتر یہ ہے کہ اس بارے میں خوشی اختیار کر لی جائے۔

لیکن اس بجائے پر بھی مولانا سے رہا نہ گیا اور فرماتے ہیں "تاہم انما بیان کر دینا
 ضروری ہے کہ ہنگامی کے عقب میں ایک قسم کا بازار ہے۔ جو ۳۰ گز لمبا اور ۲۰ گز چڑھا ہے۔"

دولون جانب مکانات ہیں اور ان مکانون کے آگے جو زمین چھوٹی ہے اُس میں کرسٹون یا پنچون کے عومن پتھر کے خوشنما چبوترے بنے ہیں۔ دولون جانب کے مکانون کے رگدکار پر شیرون چیتون اور دیگر حیوانوں کی تصویریں بنی رہتی ہیں۔ ظہر کے بعد ان مکانون میں سے ہر ایک دروازے پر جو خوب ہی آراستہ ہوتے ہیں کرسیاں بچھادی جاتی ہیں۔ اور ان پر بازاری حسین عورتیں آگے ناز و انداز سے بیٹھ جاتی ہیں۔ ان کا لباس بہت بھاری اور قیمتی ہوتا ہے۔ موتوں اور جواہرات کا زور پور بیٹھ ہوتی ہیں۔ اور ہر ایک کے سامنے دو یا ایک لونڈیاں بھی کھڑی رہتی ہیں۔ جو لوگوں کو عیش و عشرت اور لطف و مسرت کے لیے اپنی طرٹ بلاتی ہیں۔ راہگیر ان کو دیکھتے ہوئے گزرتے ہیں اور جسے پسند کرتے ہیں اُس کے پاس جاتے ہیں اب وہ بازاری عورتیں تو اُس شخص کی دلدار بنیں۔ معروہ ہوجاتی ہیں اور ان کے لوگوں کا یہ کام ہوتا ہے کہ یہاں جو کچھ مال و اسباب ہے اُس کی حفاظت کریں۔ اگر کوئی چیز بھی گئی تو برطرف کر دیے جاتے ہیں۔

شہر کی ساتون شہرناہوں کے اندر ایسی بہت سی رنڈیاں ہیں جن کے محصول شہر پولیس کی تنخواہ دی جاتی ہے۔ پولیس والوں کا یہ کام ہے کہ ساتون حصاروں کے اندر جو چیزیں اقامت پیش آئیں یا جو حادثے ہوں ان سے بخوبی آگاہ رہیں۔ جو چیز کھو جائے یا چوری جائے اُسے ڈھونڈ دے برآمد کریں اور اگر برآمد نہ کر سکے تو ان پر جرمانہ کیا جاتا ہے۔ میرے ایک رفیق نے کئی غلام بیان مول لیے تھے وہ بھاگ گئے۔ جب اس کی رپورٹ کو تو ال شہر کی گئی تو اُس نے اُس حلقہ کے محافظوں کو جان نہایت غریب و محتاج لوگ رہتے تھے بلا کہ حکم دیا کہ ان غلاموں کی قیمت ادا کرو چنانچہ تحقیق کے بعد ان غلاموں کی جو قیمت ثابت ہوئی ان سے وصول کر کے میرے رفیق کو دے دی گئی۔

حسن کی کرشمہ سازیاں

سٹ الیک ملکہ مصر

مصر میں جب خلفاء باطنیہ ائمہ اسماعیلیہ کے سرپرستوں نے روانی پرالحکام بامراد کا ایسا عجیب و غریب مختلف الادھان اور متلون المزاج خلیفہ حکومت کر رہا تھا اُس کے شہر کے دور کرنے کے لیے خدا نے اس حسین و نازنین اور سراپا حکمت و فراست ملکہ کو ظاہر کیا۔

جو اگر حرم خلافت سے نکل کے رعایا کی خبر نہ لیتی تو الحاکم نے خدا جانے کیا قیامت پیدا کر دی ہوتی۔

سنت الملک حاکم بامر آئمہ کی بہن اور اُس سے پہلے فاطمی خلیفہ العزیز بائندزاد کی ناز پروردہ بیٹی تھی۔ حسن و جمال میں ثانی نہ رکھتی تھی۔ اور ہوشیار سی۔ دانائی۔ استقلال۔ حکمرانی۔ اور سیاسی قابلیت میں اُس کا کوئی نظیر نہیں ملتا تھا۔ مسیحی نہیں تھا۔ ان دنوں ساری دنیا میں کوئی عورت اُس کی سی لیاقت اور مردانہ ہمت نہ رکھتی ہوگی۔ حاکم بامر آئمہ کو گیارہ ہی برس کی عمر میں آبائی حکومت مل گئی تھی۔ اور حکومت بھی کون جو صرف و نیوی شہر یاری نہیں بلکہ دینی امامت اور حضرت رسالت کی جانشینی بھی تھی۔ تاج و تخت پاتے ہی اُسے نظر آیا کہ ساری دنیا میری تابع فرمان ہے۔ میں دنیا ہی نہیں دین کا بھی بادشاہ ہوں۔ اور دین و دنیا میں جیسے احکام چاہوں جاری کر سکتا ہوں۔ اس خیال کے آتے ہی پہلے تو اُس نے امامت کو منظر امت آبائی یا ہندوؤں کی اصطلاح کے مطابق اوتار قرار دے کے اپنے آپ کو منجلی انسان سے بڑھا کے امام اور امامت سے بھی آگے بڑھا کے خدا بنا لیا۔ چنانچہ اسی کی یادگار میں آج تک دُرور کا فرقہ شام میں موجود ہے جو لوگ حاکم بامر آئمہ کے سوا خدا کو بھی نہیں مانتے۔ ان لوگوں کے عقیدے میں ایمان حاکم بامر آئمہ پر ایمان لانا ہے۔ اور چند خطوط جو حاکم کی امامت کی تبلیغ میں لکھے گئے تھے اُن کا مجموعہ اُن کا قرآن ہے۔ گو وہ مسلمانوں میں شمار کیے جاتے ہیں مگر رسول مقبول صلعم کو مانتے ہیں اور نہ قرآن مجید کو۔ نہ نماز پڑھتے ہیں نہ روزہ رکھتے ہیں اور نہ مسلمانوں کا سا اور کتنی کام کرتے ہیں۔ اُن کے خیال میں نبی کا مذہب صرف الحاکم کو منظر امت ہی نہیں تھا۔ غنائ حکومت ہاتھ میں لینے کے بعد حاکم نے جیسے جیسے مخالفانہ متقاوا احکام جاری کرنا شروع کر دیے تاریخ میں یاد گار ہیں۔ ۵۹۰ھ میں حکم قطعی جاری کیا کہ صحابہ کرام کو خلافت کا لیان دی جائے۔ ہزاروں شاہراہوں مسجدوں اور تمام عام گزراگاہوں میں ہزاروں کھجور کے دیواروں پر لگا دیا گیا۔ اور یہی حکم تمام دیوان ملک کو لکھ بھیجا کہ اپنے مفوضہ علاقوں میں جاری کریں۔ ایک زمانے تک یہ حکم جاری رہا تھا کہ ہر بار خلافت سے حکم ہو نہا کہ تہرا اکبیتہ موقوف۔ صحابہ کی شان میں جو شخص کوئی بُرا کلمہ کہے یا اُن کا ذکر بُرائی سے کرے اُسے سخت سزا دی جائے۔ اب اُن لوگوں کو جو تو ہیں صحابہ کے

عادی کر دیے گئے تھے مزارعین ملے لگے۔ شہر میں حکم جاری کیا کہ رمضان میں نماز تراویح کلاہتہ موقوف۔ جامع عتیق کے امام نے اس حکم کی پروا نہ کی اور مسلمانوں کو جمع کر کے تراویح پڑھنی دوسری دن وہ پکڑ کے قتل کر ڈالا گیا۔ اس کے بعد شہر میں حکم جاری ہوا کہ تمام مسجدوں میں نماز تراویح لازمی طور پر پڑھنی چاہیے۔ مسلمانوں سے زیادہ سختیاں بیرونیوں پر لگائی گئیں۔ اس محفل فاطمی خلیفہ کے تلون سے برداشت کرنا پڑا۔ کبھی حکم ہوتا کہ سب مجبور کر کے مسلمان بنائے جائیں۔ کبھی ان کو ذلیل قسم کا لباس پہنے اور ذلت سے رہنے کی تاکید ہوتی اور کبھی ہوش و خروش سے ان کی استقامت اور طرفداری کی جاتی۔ کبھی ان کے معبد اور گھرنے کھودے جاتے اور کبھی تعمیر کر دیے جاتے۔ عورتوں کی نسبت حکم ہوا کہ کوئی عورت گھر سے نہ نکلے۔ اور جب شکایت ہوتی کہ جن عورتوں کا کوئی والی وارث نہ ہو وہ کیا کریں۔ تو فرمان جاری ہوا کہ ان کو ہر قسم کا مال سے کے زانی ڈیوڑھیوں پر جھانکنا اور لمبے دستے کی کوئی ایسی چیز اپنے پاس رکھیں جس میں رکھ کے ہر چیز دروازے کے اندر بڑھا دیا کریں۔ تاکہ بغیر صورت و چہرے کی آڑ سے خرید و فروخت نہ ہو جاسکے۔ ان باتوں نے تمام اہل مشرکوں کو اس قدر ناراض کر دیا کہ حاکم کے پاس روزگمار رقعہ اور خطوط پہنچتے جن میں اسے گالیوں دی جاتیں۔ اور برا بھلا کہا جاتا۔ حاکم کو بچا اس کے کہ ان باتوں سے متنبہ ہو اور بگڑتا۔ اور ضد میں آئے کے زیادہ ظلم کرتا آخر ایک دن مشرکے بعض نکلے لوگوں نے یہ کارروائی کی کہ کاغذ کی ایک عورت بنا کے حاکم کی گزرگاہ میں ایک جگہ کھڑی کر دی اور اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ سے ویلا یہ پتلا اس قدر مکمل اور ایسی صناعت سے بنایا گیا تھا کہ حاکم اُدھر سے گزرتا تو بالکل نہ پہچان سکا اور سمجھا کہ سچ کوئی عورت ہے جو فریاد کرنے کو آئی ہے۔ غلاموں کو بھیج کے اُس کے ہاتھ سے عرضی ملے۔ سو سمجھا تو اُس میں صد ہا گالیاں لکھی ہوئی تھیں۔ اور اُس کی اسی طرح کی توہین اٹھائیں رکھی گئی تھی۔ لپک کے عورت کو پکڑا تو کاغذ اور بالوں کا بچھا نچھ تھا۔

اس کارروائی سے حاکم ایسا برا لگنے لگا کہ حکم دیا مشرک کی آبادی میں آگ لگادی جائے۔ اور فوج واسطے شہر کو لوٹ لیں۔ مردوں کا قتل عام ہو۔ اور عورتیں اور بچے پکڑ کر کے ٹوٹی غلام بنائے جائیں۔ فوراً اس نادری حکم کی تعمیل شروع ہوئی۔

ہو گئی۔ اور شہر تباہ ہونے لگا۔ مکانوں پر شعلہ بلند تھے۔ شرفاء و امرا بجا استغناء و قتل ہوتے
 آتے۔ اور معززین و شرفاء کی عورتیں اور بچے کھینچ کھینچ کے گھردن سے نکالے اور بوندی
 علام بنائے جاتے تھے۔ جب مسلسل دو دن تک قتل و غارت کا بازار گرم رہا تو لوگوں
 نے عفو و تقیر کے لیے التجا کی مگر نہ سنی گئی۔ آخر رعایا نے مجبور ہو کے بہت سے ترکوں اور
 عوام و عرب کے لوگوں کو اپنے ساتھ شریک کر لیا اور بغاوت کی دھمکی دی۔ یہ رنگ دیکھ کے
 حاکم نے ظلم سے ہاتھ روکا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ شرارت کی کہ حکم دیا کہ امراء معززین کی
 عورتیں گرفتار ہوئی ہیں وہ بے عزت کر کے بچ ڈالی جائیں۔ اور ان کے بچہ بھی زور و خست
 کر ڈالے جائیں۔ یہ ایسے بے رحمی کے شرمناک مظالم تھے کہ ستر کا ہر شخص حاکم کا دشمن اور
 اس کے خون کا پیاسا ہو گیا۔

ست الملک بھائی کی ان حرکتوں پر دل ہی دل میں کڑھتی اسے سمجھاتی اور حتی الامکان
 لوگوں کو اس کی طرف سے صاف کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ مگر حاکم بجائے ہٹکے کہ اس کا شکر گزار ہو
 اور اس کے عاقلانہ مشورہ پر عمل کرے اُس نے اس سے ناراض ہو گیا۔ یہاں تک کہ آخر کار
 اس کو ہم ہو اگر ست الملک میرے خلاف امر اس شہر سے سازش کرتی اور انھیں میری مخالفت پر کھاتی
 ست الملک سے پہلے حاکم ہمارا د کو بڑی محنت تھی۔ اور چونکہ اس کی دانائی اور عقلندی کا
 قائل تھا اس لیے ہر ملکی معاملے اور اپنے ہر حکم کے جاری کرنے میں اس سے ضرور مشورہ
 کر لیا کرتا۔ یہ ست الملک کی خوش نصیبی یا نیک نفسی تھی کہ جو امر اس کے مشورہ سے
 کیا جاتا اس میں ہمیشہ کامیابی ہوتی اور رعایا خوش رہتی۔ اصل حقیقت یہ تھی کہ ست الملک
 اس کے مجبورانہ احکام سے ہمیشہ اُسے روکا کرتی۔ لیکن جب اُس نے ست الملک کی رائے
 کے خلاف کارروایاں شروع کیں اور لوگ برہم ہونے لگے تو اُسے اپنی بے وقوفی سے
 اس امر پر تعجب ہونے لگا کہ جو کام میں اپنی تجویز سے کرتا ہوں اس سے لوگ ناراض ہوتے
 ہیں اور جس کام کو ست الملک سے پوچھ کے کرتا ہوں اس کی کوئی شکایت نہیں کرتا۔ آخر اس
 تعجب و حیرت نے اُسے بہن سے بدگمان کر دیا اور جوش میں آ کے زیادہ خود راہی کرنے
 لگا۔ نتیجہ یہ کہ رعایا بھی زیادہ برہم ہونے لگی جسے اُس نے بہن کی سازش پر محمول کیا۔
 آخر بے اختیار کھل کھلا اور ست الملک کو لکھ بھیجا "تم لوگوں سے سازشیں کرتی ہو
 اور تمھارا چال چلن نہیں اچھا ہے۔ اکثر نامحرم مرد تمھارے محل میں آیا جایا کرتے ہیں اس

اور بدکاری سے باز آؤرنے قتل کر ڈالوں گا۔ اس پاکہ اسن شاہزادی کی عفت و محنت پر
 آنکھ تک کسی نے حملہ نہیں کیا تھا۔ نشتہ ہی آپ سے باہر ہو گئی۔ اور اس فکر میں ہوئی کہ
 ایسے ظالم اور بے شرم و بجا بھائی سے اب جس طرح بنے چھا چھڑانا چاہیے۔

اب جو بڑا نام گزرتا تھا بن بھائی کے تعلقات نازک بننے لگے تھے۔ حاکم کی
 بدگمانیوں جو بچہ عین تو اس نے سمجھ لیا کہ یہ بچے گالیوں کے خطرات میرے پاس آ رہے ہیں
 اور اس کا غم کی بجائی ہوئی عورت کے ہاتھ سے گالیوں کا جو خط بچے ملا تھا سب اسی
 ست الملک کی کارروایاں ہیں۔ آخر ست الملک نے حاکم کو عدتے گزرتے دیکھ کے
 دل میں کہا اچھا ٹھہر جاؤ۔ اب تک تو میں نے تمہارے خلاف کوئی سازش نہیں کی تھی مگر اب

کرتی ہوں۔ " اُن دنوں قاہرہ میں ابن داؤس نام ایک معزز شخص تھا جو ایک حصہ فوج کا
 افسر اعلیٰ تھا اور حاکم کو اس پر بھی طرح طرح کی بدگمانیاں تھیں۔ ست الملک نے
 اسی ابن داؤس کے پاس کہلا بھیجا کہ "میں تم سے تنہائی میں ملنا چاہتی ہوں۔" اس نے

عرض کیا کہ حضور کی خدمت میرے لیے مایہ ناز ہوگی۔ اس جواب سے اسے اپنے موافق
 خیال کر کے ست الملک نے برقع پہن لیا۔ سب لوگوں کی آنکھ بچا کے اس کے گھر پہنچی۔
 اور کہا تو جانے ہو کہ تمہاری نسبت بھائی کے کیا خیالات ہیں؟ اس نے عرض کیا بچی

ہاں جانتا ہوں کہ وہ میرے دشمن اور میری جان لینے کے درپے ہیں۔ ست الملک نے کہا
 "اور ایسی ہی دشمنی اُسے میرے ساتھ بھی ہے۔ اور اس کا مزاج ایسا ہے کہ جس دن
 دل میں لگتی ہے بابت کو خیال نہ کرے گا اور بلا تامل ہم دونوں کو قتل کر ڈالے گا۔" ابن

داؤس نے کہا "خداوند بجا فرماتی ہیں۔" اب موقع دیکھ کے ست الملک نے کنا شروع کیا کہ
 اس نسبت کے باعث میں نے مسلمانوں پر ظلم ہو رہا ہے۔ دین الگ خطرے میں ہے۔
 عقائد اس نے بجا رہی دیے۔ مسلمانوں کی عزت و آبرو بھی اس نے نہ چھوڑی۔ معزز
 اور پاکہ اسن بی بیوں کو اس نے بے حرمت کر لیا۔ شریفیوں کے بچے اس کے ہاتھوں
 بازار میں گئے۔ اور یہ حالت ہو رہی۔ کہ اس کے اندیشہ سے کوئی شخص گھر میں چین

نہیں سکتا۔ پھر یہ دیکھو کہ ملک کا بچہ بچہ اس کی صورت سے ہزار ہوں ہا ہے
 اور ساری رعایا کے دل و جان میں بغاوت کا جوش پیدا ہوتا جاتا ہے۔ اگر سب لوگ
 بگڑ گھرے ہوں اور ہمارے اسی اسی بغاوت کے نتائج و سخت کو اٹھ دیا تو کچھ

نہیں پاہون گی اور نہ تم بچو گے۔ اور مصر میں قیامت برپا ہوا ہو جائے گی۔ ابن داؤس نے ست الملک کی یہ پڑاؤ تقریر سن کے کہا "آپ جو فرما رہے ہیں مجھے اُس کی تعمیل میں ہند نہ ہو گا۔ ست الملک بونی" میرے نزدیک تو مناسب یہ ہے کہ قبل اس کے کہ الحاکم کے دست ستم سے ہماری امامت کو صدمہ پہنچے ہم اُسی کی زندگی کا چراغ گل کر دیں۔ ابن داؤس نے کہا "مجھے اس میں کوئی عذر نہیں۔ لہذا آپ اس کی جو تدبیر بتائیں گی جائے۔ ست الملک نے کہا "کل میرا بجائی الحاکم حسب معمول شہر سے نکل کے کوہستان کی طرف جائے گا۔ اور عادات کے مطابق اُس کے ہمراہ کوئی نہ ہو گا۔ تم ایسے درشتوں کو روانہ کرو جو وہیں اُس کا کام تمام کر دیں۔ اور پھر اسے گھرا کر آنا نصیب ہو۔ ابن داؤس نے اس کا وعدہ کیا۔ جس سے خوب مطمئن ہوئے ست الملک نے وعدہ کیا کہ اگر یہ کارروائی خوبی کے ساتھ انجام پائے گی تو میں تمہاری موجودہ جاگیر میں ایک لاکھ دینار سالانہ کی جاگیر اور بڑھادوں گی۔ اور سلطنت کا سارا نظم و نسق تمہارے ہی ہاتھ میں ہو گا۔ کیونکہ تمہارے سوا اور کوئی وزیر اعظم اور مدارالہام سلطنت نہیں ہو سکتا۔ ان وعدوں نے ابن داؤس کو اُس کے ارادے میں اور مضبوط کر دیا۔ جس کے بعد ست الملک اپنی محلہ میں واپس گئی الحاکم مقررہ اوقات میں تنہا پہاڑوں پر جایا کرتا تھا۔ چونکہ امامت اور نظم و انضباط کا دعویٰ ہوئے کا مدعی تھا اس لیے اُس کی عیبت میں وہی نشان ہوا کرتی جو حضرت موسیٰ کے کوہ طور پر جانے اور خدا کے احکام لانے کی تھی۔ اسی معمول کے مطابق ست الملک اور ابن داؤس کی سازش کے دوسرے دن ۲۷ شوال ۴۸۸ھ کو وہ محل سے نکل کے پہاڑوں پر گیا۔ پہاڑ کے قریب پہونچ کے ساتھ واؤن کو وہیں چھوڑا اور ایک عمر لڑکے کو ساتھ لیے ہوئے کھاٹوں میں گھسارنا گمان کوہستان کے سنائے میں دو مسلح آدمی نمودار ہوئے جنہوں نے سامنے آتے ہی حملہ کر کے اُسے اور اُس کے ہمراہی لڑکے کو مار ڈالا۔ اور دونوں کی لاشیں غائب کر دیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان دونوں سپاہیوں کو ابن داؤس نے ست الملک کی خواہش کے مطابق بیان بٹھایا۔ اور اُس کے قتل پر مامور کیا تھا۔ الحاکم کے واپس آنے میں جب حد سے زیادہ دیر ہوئی تو اُس کے خیر خواہوں اور سرداروں نے تلاش کرنا شروع کیا۔ پہاڑوں کے

تمام پہلو اور ساری گھاٹیاں ڈھونڈ ماریں مگر کہیں سراغ نہ لگا ایک مقام پر جا کر
گھوڑا اور اس سے آگے بڑھ کے اس کے کپڑے مل گئے۔ مگر ان میں بھی خون کا کوئی
دھبہ نہ تھا۔ لاشیں کہیں نہ ملیں۔

آخر سب جھک گئے اور عاجز اس کے قہر میں واپس آئے اور ست الملک کی
ڈیوٹی سچی پر جا کے عرض کر آیا کہ امیر المومنین غائب ہیں۔ ہم نے سارا کوہستان چھان مارا
کہیں پتہ نہیں۔ اب آپ کیا حکم فرماتی ہیں؟ ست الملک نے ان کے پاس کھدایا
"میرے پاس ان کی تحریر آئی ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ میں پرسون واپس
آؤں گا۔" امراء ارکان دولت اس جواب سے مطمئن ہو گئے اپنے گھروں کو گئے۔ اور
ست الملک نے خود اپنے پر قبضہ کر کے بہت سارے پیراہن داؤس کے پاس بھیجا کہ سرداران
فوج میں تقسیم کر دے۔ ان میں طریقہ سے مسلسل سات دن تک وہ لوگوں سے الحاکم کے
ظہور کا وعدہ کرتی رہی۔ اب ساتویں دن ظہور حاکم کا انتظار تھا۔ ساری فوج
قصر خلافت کے دروازے پر صفیں باندھ کھڑی تھی کہ امام زمانہ امیر المومنین الحاکم کے
دیدار سے بہرہ یاب ہوں بہت الملک نے الحاکم کے بیٹے ابوالحسن علی کو جو ابھی ایک
نصف سال کا خوب دلہن کا تھا لباس شاہانہ پنچا کے باہر نکالا۔ وزیر سلطنت اس کے
آگے آگے تھا جس نے تمام حاضرین دربار اور اہل فوج کی طرف خطاب کر کے کہا
وہاں غلامان دولت ہمارے ملکہ ست الملک فرماتی ہیں کہ اب تمہارے آقا امام
امیر المومنین ہی ہیں۔ یہ سنتے ہی ابن داؤس جو سب کے آگے تھا فوراً جھک کے
زمین بوس ہوا۔ اور ساتھ ہی وہ تمام امراء سرداران فوج مجتہدین ابن داؤس کی
معرفت روپیہ دیا گیا تھا زمین بوس ہو ہو کے آداب بجالائے گئے۔ جب مغرب کا
ایک بڑا گروہ بے عذر زمین بوس ہو چکا تو باقی لوگوں نے بھی ان کی پیروی کی۔
اور کوئی نہ تھا جس نے ذرا بھی تامل کیا ہو اب خوب و شاہزادہ علی نے شہر کی گلیوں
سوار ہو کے شہر کا ایک جگہ لگا دیا اور کل امراء دولت ہر ادب و کباب اور اس کی چیلو میں تھے
وقت وہ قصر خلافت میں واپس آئے کھڑے ہوئے اور کل اہل دربار کو دوسرے دن حاضر ہونے کا حکم
دیا۔ دوسرے دن علی الصبح تمام مائید شہر اور جمالیہ اہل سیف و قلم در دولت پر حاضر ہوئے تو
وہی شاہزادہ ابوالحسن علی پھر برآمد ہوا۔ آج کے دربار میں ست الملک نے اسے

"الظاہر لا عزاز دین اللہ" کے لقب سے لقب کر کے سر پر خلافت پر بٹھایا اور سب نے
 بلا عذر اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ الغرض بغیر اس کے کہ کسی انتم کا فساد اور جھگڑا
 الظاہر کی تحت نشینی کا سنا نہ خوش اسلوبی سے بچے ہو گیا۔ ساتھ ہی ست الملک نے ایک
 فرمان روا کے ذریعہ سے الظاہر کی خلافت کا اعلان کیا اور اطاعت و جوانب میں تمام وہاں
 ملک اور عطا ان بلاد کے نام اس فرمان کی تقلید میں حکم کے ساتھ بھیجیں کہ کل مایا سے نظام کی بیعت میں
 اس کے بعد ست الملک نے ایک بڑا بھاری ہیرا بار کیا جس میں تمام مغربی
 ان کے درجوں اور رتبوں کے مطابق بٹھایا۔ سب کو خلعت و انعام سے سرفراز
 کیا۔ عزت افزایاں کیں۔ پھر انتظام مملکت کے متعلق نہایت ہی عمدہ احکام جاری
 کیے اور کل امور کا فہم دار اور امیر علی ابن داؤس کو قرار دیا۔ اور کمال ہرانی
 کے ساتھ اس سے کہا "ہم سارا نظم و نسق تمہارے ہاتھ میں دیتے ہیں۔ مگر کوئی
 مقررہ جو جس روز تم کو خلعت و زرات کے ساتھ ایک لاکھ سالانہ کی تریا یہ جا کر عطا
 کی جائے یہ شیخ ہی ابن داؤس کر کے زمین بوس ہو۔ اور ہاتھ جوڑ کے عرض کرے
 "مقررہ جس روز حکم دین غلام حاضر ہو" ست الملک بولی "اچھا میں ہر دن کوئی دن
 مقرر کر کے تمہیں بلواؤں گی" اب سارے قاہرہ میں مشہور ہو گیا کہ زرات اور جملہ
 اختیارات ابن داؤس کو ملنے والے ہیں۔

دو ہی چار روز بعد ست الملک کا چہ دار ابن داؤس کی طلبی میں اس کے
 دروازے پر پہنچا اور وہ خوش خوش قہر خلافت میں حاضر ہوا۔ پہرہ پہنتے ہی
 ایک اندرونی کمرے میں بلوایا گیا۔ جہاں تمام سرداران و بی دست بستہ کھڑے
 تھے۔ اب قہر کے تمام دروازے بند کروائے مقل کر دیے گئے۔ اور ایک ایک
 ست الملک کا ایک خاص ملازم شمشیر برہنہ ہاتھ میں لے ہو پے نمودار ہوا جس نے
 آتے ہی ابن داؤس کی طرٹ مخاطب ہو کے نہایت ہی بے وفائی کے ساتھ کہا
 "تو ہی ہمارے امام الحاکم کا قاتل ہے" اور یہ کہ ایک ہی دین اس کا کام تمام
 کر دیا۔ یہ تدبیر کچھ ایسی خوبی کے ساتھ بنی کہ کسی کو بھی مخالفت کی جرأت
 نہ ہوئی۔ اور سب ابن داؤس کے قتل کو خاموشی سے دیکھ کے رہ گئے۔
 اگرچہ ابن داؤس کے ساتھ نہایت ہی بے رحمی اور سخت بد عہدی کی گئی مگر

ست الملک کے دل سے بغیر اُس کے قتل کے اس کاٹے کی کھٹک نکل ہی نہ سکتی تھی کہ جس شخص نے
 لالچ و خود غرضی کے جوش میں اپنے ایک امام اور آقا کو بے وفائی کے ساتھ قتل کر ڈالا ممکن ہے کہ
 وہ ایسی ہی کسی سازش سے متاثر ہو کے دوسرے کو بھی قتل کر ڈالے۔ بہر تقدیر اس طریقہ سے
 ابن اُوس کو قتل کر کے ست الملک نے نابالغ خلیفہ کے نام پر غمان حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ اور
 نہایت ہی مستعدی و بیدار مغزی کو ساتھ قرآن روائی کرنے لگی۔ رعایا اُس سے پہلے ہی خوش تھی۔ اور
 اُس کی طرف داری میں لوگ الحاکم کے دشمن ہو رہے تھے۔ اب جو اُس نے عدالت
 گسٹری اور رعایا کو آزمی کے جوہر دکھانا شروع کیے تو ہر ادنیٰ و اعلیٰ اُس کا کلمہ
 پڑھنے اور اس کا دم بھرنے لگا۔ وہ مظلوموں کی فریادیں کرتی۔ مقدمات کا بلا
 و رعایت فیصلہ کرتی۔ اور اُس کے ساتھ ہی خوش تدبیری سے اپنا ایسا رعب بٹھا
 لیا تھا کہ تمام سرکش اور فتنہ انگیز لوگ اُس کے نام سے کانپتے تھے۔
 محال نہ تھی کہ ایک لمحہ کے لیے بھی اُس کے حکم کی تعمیل میں کوئی تباہی کرے۔
 الظاہر کی عمر سترہ سال کی تھی۔ عنفوان شباب کا زمانہ تھا۔ اور دل پر جوش کے
 جذبات سے بھر ہوا تھا مگر اُس نے کبھی کسی بدمعاش بھو بھی کے احکام سے سر تابی نہیں کی۔
 وہ ہر امر میں بھونچے کے حکم پر چلتا۔ اور جانتا تھا کہ میری اور سارے ملک کی
 سلامتی اسی میں ہے کہ ست الملک کے انتظامات اور احکام میں دخل نہ دیا جائے۔
 مگر اُسوس اُسے ست الملک کی خوش تدبیری اور تدبیرِ قابلیت سے فائدہ اٹھانے کا
 زیادہ موقع نہیں ملا اس لیے کہ اس کی تخت نشینی کو چارہ ہی سال ہوئے تھے کہ سترہ
 میں ست الملک نے سفر آخرت کیا اور اظہار کو نظر آیا کہ میں اپنے باپ الحاکم
 کے مرنے پر یتیم بن گیا ہوا تھا بلکہ اب یتیم ہوا ہوں۔ دراصل ست الملک کے مرنے
 کی تاریخ تمام اہل مصر کے لیے بڑے رنج و الم کا دن تھی۔ جبکہ بادشاہ اور خلیفہ
 ہی کو نہیں بلکہ رعایا میں سے ہر ایک کو یہی نظر آتا تھا کہ ہم آج یتیم ہو گئے۔

خیالات و واقعات

ترکوں کا موجودہ تنزلِ عبرت ناک ہے۔ مگر اس سے زیادہ عبرت ناک اُن مسلمانوں
 کی حالت ہے جو کل تک تو ترکوں کی حمایت میں اپنے نیک و بد بھی اذیتیں سمجھتے تھے

اور گویا بھول گئے تھے کہ ہم ایک یورپین دولت اور سچی سلطنت کی رعایا ہیں یا انج
ایڈریانو پیل کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد وہ ہمدردی و کناہ ترکوں کی مخالفت پر
تیار ہیں۔ اور انھیں طرح طرح کے الزام دے رہے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ ترک حاکمات شروع ہیں۔ ڈاڑھیان منڈاتے ہیں۔ مذہب سے
بے پرواہ ہیں۔ شرابیں پیتے ہیں۔ اور نعرانی معاشرت کے دلدادہ۔ مگر یہ سب باتیں
تو ان میں جب بھی تحقیق جب ہمارے یہ مقدس و محترم دوست ان کی حمایت میں
جان فدا کرنے کو تیار تھے اور ان کی اعانت کو عین اعانت دین بتاتے تھے۔

مقدانیاں وین کے بعض حلقوں سے یہ آواز بھی سنی گئی کہ اصل ہمدردی ہمیں
عربوں سے کرنی چاہیے جن کی محبت بمثلہ شعائر اسلام ہے۔ یورپ والوں کا معمول
ہے کہ غیر مسیحی مردہ قوموں کی قبروں پر چراغ جلاتے ہیں اور زندہ قوموں کی
نسبت دیا جاتے ہیں کہ دنیا سے فنا کر دین تاکہ ان کی قبروں پر بھی چراغ جلائے کا
موقع ملے۔ آری یہ قوم بہت اچھی تھی اس لیے کہ فضا ہو چکی مگر مینی باوجود اسی قدامت
کے متادینے کے قابل ہیں۔ عرب بہت اچھے تھے اس لیے کہ ان کی خلافت سٹ گئی۔ مگر یہ
بہت ہی بڑے ہیں اس لیے کہ ابھی ان میں سانس باقی ہے۔ ہمیں اس کی جستجو کر
انگریزی دان و جوائن نے تو انگریزوں کی طرف معاشرت اختیار کی ہے۔ لیکن ہمارے
مقدانوں نے اور تمام چیزوں سے تبرہ کر کے نفاذ اسے مغرب سے صرف ہی ایک
سبق حاصل کیا ہے۔ خیر وہ دوست عثمانیہ کو مٹی دینے میں دول یورپ کے ساتھ
شریک ہوں مگر اپنا عامہ سمجھائے رہیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ بھی اسی قبر میں گرے دن ہو جائے

مگر یہ ہے کہ ہندوستانی الوالغی کی نسبت پرانی مثل چلی آتی ہے کہ ”لڑنے
والوں کے پیچھے اور بھاگنے والوں کے آگے“ اس کی پوری پوری تصدیق ہمیں
ان ہندوستانی ہمدردان اسلام کے طرز عمل سے ہو رہی ہے جن کا جوش و خروش
لڑائی کے وقت تو ایسا تھا کہ معلوم ہوتا ترکوں میں بھی اتنی حمیت دینی نہ ہوگی

جتنی ان میں ہے۔ لیکن اب شکست کے وقت یہ سب سے پہلے بھاگ کے الگ جا گئے۔
ہوئے۔ اور ایک ٹیک نام ہاتھی کی طرح خود اپنی فوج کو پامال کر رہے ہیں۔

خیر بون بھی کی ہمدردی سی۔ خدا تو نہیں دے۔ مگر پہلے عربوں سے یہ تو سیکھ
لیجئے کہ ہمدردی کسے کہتے ہیں۔ عربوں کی وضع ہے کہ جس کا ساتھ دیا دیا۔ پھر مرتے
دم تک اُسے نہیں چھوڑتے۔ جاہلیت میں بھی حلیف (مہم قسم) قبائل تسلط بعد تسلط
روستوں کی حمایت میں جانیں دیا کرتے تھے اور آج بھی عربوں کا معمول ہے کہ
جس کے ہوئے زندگی بھر کے لیے اُسی کے ہو گئے۔ ایسا نہ ہو کہ جیسی پر جوش ہمدردی
آپ نے ترکون کے ساتھ کی ہے ویسی ہی عربوں کے ساتھ بھی کیجئے۔ وقت بڑے
مسل بھاگیے۔ اور عرب کے بدوی غل مجاہدین "ہندی بٹال" "ہندی بٹال"!

خیر اہل عرب تو ایک پرانی شہریت قوم ہیں ہمارے ہندوستانی شرفاء بھی
وضع یہ تھی کہ مظلوم و شکستہ حال کے ساتھ نہ دیا دیا ہمدردی کرتے اور ہمدردی کا
وقت وہی سمجھا جاتا جب کسی پر اپنے اور وہ کسی مصیبت میں مبتلا ہو۔ ترکون نے
جان بوجھ کے اور بغیر مجبور و ناچار ہوئے اپنا ملک نہیں دیا۔ وہ ہمدردی سے لڑے
شکست سے جان بچانے کے مذاق پر۔ فتح شکست تقدیر یا مصالحت ہیں۔ اُحد میں
خود رسول خدا صلعم کو شکست ہو گئی تھی۔ ایسی حالت میں یہ کون سی شرافت ہے
شکست کی خبر سنتے ہی کوئی صاحب ترکون سے بدظن ہو جائیں۔

اگر یہ ہم مان بھی لیں کہ ترکون میں انتظامی قابلیت نہیں تو موجودہ شکستوں اور
نا کامیوں پر ترکون کو الزام نہیں دے سکتے۔ بیرونی سازشوں نے کامل پاشا کے
ہاتھ سے دولت عثمانیہ کا خاتمہ کرا دیا۔ سارے یورپ کے اتحاد نے اُن کو پیچھے نہ دیا۔
اور گو انھیں اتحاد و ترقی والوں سے قومی بے عزتی سے تنگ آئے اور جان پر نہیں کے
وزارت کی بساط الٹ دی مگر اس کو کیا کرتے کہ سابقہ وزارت سلطنت کا کام تمام
کر چکی تھی۔ اور علیحدہ اُس وقت شروع ہوا جب دغض لامل علاج ہو چکا تھا۔

لیکن اب بھی اگر حرم کعبہ کی حفاظت اور تربت رسول کی نہایت منظور ہو تو ترکوں
 ہی کی مدد کیجیے۔ اور انھیں کو سپر ناسیٹ۔ دنیا بھر کے مسلمانوں میں سے اگر کسی میں بھلائی
 کی کچھ طاقت ہے تو وہ ترک ہیں۔ مگر مسلمانوں سے آج تک عثمانی قرض کی رقم تو پوری
 ہی نہ ہو سکی آئندہ کیا کرین گے؟

ہمارے دوست البشیر مسلم گزٹ اور السلال سے تاراغی ہیں کہ وہ علیگڑھ کالج پر
 حملہ کر کے ایک قومی ڈھچھ مچوایا چکا ہے بگاری دیتی ہیں۔ اور اب اس بات پر آمادہ ہوئے
 ہیں کہ معتز فقیہ کو جواب دین۔ مگر اب دیتے سے اچھا ہوگا کہ وہ علیگڑھ کالج ہی کی اصلیت
 کریں۔ کالج کی حالت جہاں تک ہیں معلوم ہوئی ہے نہایت ہی خراب ہے اور کالج
 کلاس کے لڑکوں کی حالت دم کے قابل ہے اور ان سے زیادہ اس قومی سرساز کی
 حالت جو وہ دہلی کا شوق رکھنے والوں کے ہاتھ میں رہے ہوگا ہے۔ قوم میں کالج کی
 جو بے اعتباری ہوتی جاتی ہے وہ جواب دین سے نہیں بدور ہو سکتی۔ اگر یہی بل و شمار ہیں
 تو پورے کی ماں کب تک بیزمناسے گی؟

میلو

مصطفیٰ

یہ ایک چھوٹی انٹیلیجنٹ اور ۲۵ سالہ کا رسالہ ہے جس میں مولوی
 محمد اسماعیل خان صاحب نظامی مقیم "انکسٹا پور" نے حضرت سرور کائنات محمد مصطفیٰ
 صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی کے حالات تحریر فرمائے ہیں۔ یہیں پوری کتاب
 کے پڑھنے کا تو موقع نہیں ملا لیکن فہرست اور بابی کے مضامین دیکھنے سے آٹھ سو روپے
 معذوم ہوتا ہے کہ حضرت نظامی نے عام مولد خزانوں کے مذاق کے خلاف فی الجملہ تحقیق
 اور احتیاط سے کام لیا ہے۔ بہر حال یہ کتاب اس قابل ہے کہ اردو اور ان مسلمان جناب
 مصنف سے منگوا کے اول سے آخر تک پڑھیں اور اپنے پیغمبر علیہ التقیۃ والثناء کے حالات
 سے واقف ہو جائیں۔ قیمت فی جلد ۵ روپے۔

خیالات عزیز یہ ۱۰ + ۲۲ جہان کا ایک ۲۵ سالہ کا رسالہ ہے جس میں منشی

دیاز ان صاحبِ کلمہ کی اسے ایڈیٹر زمانہ نے مولوی محمد عزیز مرزا صاحب مرحوم کے
 ۲۲ مقتضائے دلچسپ مضامین جمع کر دیے ہیں۔ اول میں مولوی عزیز مرزا صاحب کی تصویر
 ہے اور اس کے بعد نواب وقار الملک بہادر کا لکھا ہوا ۳۱ صفحہ کا دیباچہ ہے جس میں
 مولوی عزیز مرزا صاحب کے حالات زندگی ہیں۔ چھپائی اور کاغذ عمدہ ہیں۔ مولوی عزیز
 مرزا صاحب اور ان کی اعلیٰ قابلیت سے مسلمانان ہند بخوبی واقف ہیں۔ تقریب کی
 ضرورت نہیں۔ تاہم میں اتنا ضرور کہوں گا کہ مولوی عزیز مرزا صاحب کا لٹریچر اردو میں
 ایک بڑا پایہ رکھتا ہے جس سے ہر قسم کا علمی و ادبی فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے محبتِ صرفِ عمر
تختہ سرور یہ منشی درگاہ سائے سرور جہان آبادی کی نظروں کا مجموعہ ہے اول میں حضرت سید
 کی تصویر۔ اس کے بعد صفحہ ۱۱ کی مختصر سوانح عمری ایڈیٹر صاحب زمانہ کا نپو سے طلب کیا جا
دی تاج پیر اہل انگلش ٹریڈنگ کمپنی دہلی کے میٹنگ برورسٹر مسٹر ایم آرزو ہندوستان کے
 ان چند منتخب لوگوں میں ہیں جو صحیح معنوں میں "آپ ٹو ڈیٹ" کہے جاسکتے ہیں۔ آپ کا ادبی
 مذاق بہت ہی سسترا اور پاکیزہ ہے اور اس کے ساتھ ہی آپ کو صنعت و حرفت اور
 تجارت کے فنون میں خاص کمال حاصل ہے۔ اسی شوقِ مین آپ نے جاپان میں جا
 تعلیم پائی۔ اور مشرق کی ظلمت دور کرنے کے لیے اپنا چراغ مشرق ہی کے آفتاب سے
 روشن کیا۔ فی الحال ہمارے دوست نے اپنے جدید ایجاد کیے ہوئے تاج اہل (جو
 سر میں لگانے کے خوشبودار اعلیٰ ترین تیل ہیں) ریولیو کی غرض سے ہمارے پاس بھیجے
 ہیں۔ یہ تین قسم کے تیل ہیں۔ اول تاج اہل (اردن زیتون) ہے۔ دوسرا تاج اہل (اردن
 بادام) ہے۔ تیسرا تاج اہل (آئل و کان سڈ) (اردن آئل و تخم کتان) ہے۔ اول کی
 قیمت فی شیشی ۱۰ روپے، دوسری کی فی شیشی ۱۰ روپے اور تیسری کی فی شیشی ۱۰ روپے شیشیوں میں تقسیم
 آدھ پاؤنڈ ہوتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک تیل میں نفاست کے ساتھ مشرقی مذاق کے پھولوں کی خوشبو
 پیدا ہوئی ہے جو نہایت مفرح شیرین اور مستقل ہے۔ کئی دن تک تم رہتی ہو ہماری یہاں سب لوگوں نے
 اور نیز ہمارے اکثر بھروسہ مند مزارع احباب نے ان تیلوں کو بہت پسند کیا۔ ہم امید کرتے ہیں کہ
 ملک سر آرم کی ایجاد کی پوری قدر کرے گا۔ اور ایسے وقت میں جبکہ ملکی تجارت کو ترقی
 دینے کا خیال لوگوں میں پیدا ہو چلا ہے ان تیلوں کی طرف عام مبالغہ جو شوقِ قدر دانی
 سے تو جہاں کی سوغاتیں تاجر انگلش ٹریڈنگ کمپنی موری درازہ۔ دہلی کے پتہ پر بھیجی جائیں



برنارڈ کے بعد ۲۵ سال تک کسی ایسے مغربی یا مسیحی سیاح کے حالات ہمیں نہیں معلوم ہو سکے جس نے سفر نامہ لکھا ہو۔ اتے زمانہ میں، ارض مقدس کی سلطنت میں بڑے انقلابات ہو گئے تھے۔ خلافت عباسیہ کمزور ہو گئی اور اُس کی کمزوری کے زمانہ میں ایک نئی رقیب خلافت مغربی افریقہ میں پیدا ہو گئی۔ جو خلافت بنی فاطمہ کے نام سے موسوم ہے۔ اس خلافت نے تھوڑے ہی زمانہ میں ترقی کر کے مصر پر قبضہ کر لیا۔ اور پچاسے شہر فسطاط کے قریب شہر قاہرہ کو آباد کر کے اپنا دار السلطنت قرار دیا۔ تیسرے میں اس فاطمی خلافت نے ارض شام اور حرمین پر بھی قبضہ کر لیا۔ اور مرکز اسلام میں عباسی خلیفوں کے خطبہ کے عوض فاطمیوں کا خطبہ اور اُس کے ساتھ ہی اندھ سبب اجماع جاری ہوا۔

اس کے دس برس بعد ۱۰۹۷ء میں پوپ سلوٹر ارض مقدس کی زیارت کو آیا۔ یہاں اُسے عیسائیوں پر ایسے مظالم ہوتے نظر آئے کہ یورپ میں واپس جاسکے مظالم کی صدا بلند کی۔ اور اپنے پیروں کو ابھارنا شروع کیا کہ مسلمانوں سے اپنے مظالم عیسائیوں کا انتقام لیں۔ اور حضرت مسیح کے وطن کو دشمنوں کے ہاتھ سے نجات دلائیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرانس اور اٹلی کے اکثر ہتھیار بند گروہ زیارت کے جہان سے آ کر مکہ سویل

شام پر تاخت و تاراج کرنے لگے۔ لیکن اس سے بجائے اس کے کہ انھیں کوئی فائدہ حاصل ہوا، ارض شام فلسطین میں عیسائیوں پر اور زیادہ تشدد ہونے لگا۔ یہاں تک کہ عیسوی مورخوں کے بیان کے مطابق وہ اپنے مذہب کی پیروی سے بھی روکے جانے لگے۔ اور تمام اگرچہ ان کے ہاتھ سے چھین لیے گئے۔ اور آخر ستمبر ۶ء میں ہولی سبیلہ (گلاب مقدس) اور دوسری تمام زیارت گاہیں فاطمی خلیفہ الحاکم بامر اللہ کے حکم سے کھودتے زمین کے برابر کر دی گئیں۔

یہ قیامت خیز خبر یورپ میں اس اضافہ کے ساتھ پہنچی کہ اس کا ردائی کے محرک یہود ہوئے ہیں۔ اور جوش انتقام سے سارے یورپ میں یہودیوں پر طرح طرح کے ظلم و جور ہونے لگے۔ قتل کیے گئے۔ بوٹے گئے۔ جلاوطن کیے گئے۔ سمندر میں ڈبوئے گئے۔ غرض کوئی بات نہیں اٹھ رہی۔

لیکن خنداکو عیسائیوں کے آنسو پونچھنا تھے۔ چالیس برس بعد جب الحاکم کا پوتا المستنصر باندہ سربراہ کے خلافت ہوا تو اس نے عیسائیوں کی حالت پر ترس کھا کے ستمبر میں کینسہ ہولی سبیلہ کو بھر تعمیر کروایا۔ اور پہلے سے زیادہ اہتمام اور شان و شوکت کے ساتھ بنوایا۔ جس کا سبب بعض تو یہ بتاتے ہیں کہ قسطنطینہ کے یونانی شاہنشاہ اور المستنصر میں کوئی معاہدہ ہوا تھا جس کی وجہ سے المستنصر نے اسے بنوایا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ خلیفہ مذکور کی ماں ماریہ نام ایک خوش عقیدہ مسیحی تھی لہذا جیسے پہلی مرتبہ اس زیارت گاہ کو قسطنطین اعظم کی ماں ملہانہ تعمیر کرایا تھا ویسے ہی اب مستنصر کی ماں ماریہ نے بنوایا۔

جس طرح اس مقدس مقام کے کھودنے کی خبر سے یورپ میں سخت برہمی پیدا ہوئی تھی اسی طرح اب اس کے از سر نو بن جانے کے مرثدہ نے ساری مسیحی دنیا میں شوق زیارت، بڑھادیا۔ خصوصاً اس لیے کہ اس نئی تعمیر کے ساتھ طرح طرح کے معجزات و خوارق عادات بھی بیان کیے جاتے تھے۔

لیکن بدقسمتی سے اب یہ خلافت بنی فاطمہ بھی کمزور ہو گئی تھی۔ اور دنیا اسلام میں ترکان آل سلجوق کا دور دورہ تھا۔ چنانچہ ستمبر ۶ء میں ان کے سپہ سالار القسمر غورازی نے یورش کر کے بیت المقدس پر قبضہ کر لیا۔ اور بجائے فاطمی خلیفہ کے مسیحی اقصیٰ میں قائم بامر اللہ عباسی کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔ جس طرح عباسیوں کے دیکھتے فاطمیوں کا

عہد انسانی قوت سے باہر نڈیسی ہی / فاطمیوں کے دیکھتے اب سلجوقیوں کا زمانہ بہت
زیادہ باسیہ کچھ کر سکی۔ نہ سلجوقی عہد میں معابد نصاریٰ مسلمانین کیے گئے۔ مگر سچ یہ ہے کہ
ترکوں کی سلطنت قائم ہو گئی وہ لوٹ مار چا دی۔ جس میں کہا جاتا ہے کہ مسلم دومی دونوں
زیادہ تیار پہلا بادشاہ منتخب چونکہ ان دونوں یورپ کے زائرین کثرت سے آرہے
تھے اس لیے اس آئندہ کوئی جز نہایت تیزی کے ساتھ ہر طرف پھیلی۔ اور اُس کے
پھیلنے ہی ہر جگہ آہ و وادیا کی صدا بلند ہو گئی۔

اسی زمانہ میں بطرس الراہب (پڑوسی ہرٹ) زیارت بیت المقدس کو آیا۔ اور
بیان سے مسیحیوں کی مظلومی پر اس قدر متاثر ہوئے کہ کیا کہ جاتے ہی یورپ میں پھیل
ڈال دی۔ پوپ کو اپنے موافق بنایا۔ اُس سے تمام حکمرانوں اور سرداروں کے
نام خطوط جاری کرائے اور ۹۵ء میں خود ایک گدھے پر سوار ہو کر فرانس و
جرمنی کے شہروں اور گاؤں میں مار مارا پھرا۔ صلیب ایک علم کی طرح کندھے پر تھی۔ گلی
کو چون میں فریاد کی صدا مین بلند کرتا۔ ڈارھین مار مار کے روتا۔ اور جہاد کے نعرے
لگاتا تھا۔ اُس کی اس کوشش نے بلا کا اثر کیا۔ ساری مسیحی دنیا میں ایک تلاطم
شروع ہو گیا۔ اور جو جہان تھا اُٹھ کھڑا ہوا کہ ارض فلسطین میں جا کے بیت المقدس
کو مسلمانوں کے قبضہ سے چھین لے۔

اُدھر یورپ میں تو یہ جوش و خروش تھا مگر اُس کے مقابل بیان ارض مشرق میں
حالت تھی کہ مسلمانوں میں ایک قسم کی طوائف الملکی ہو رہی تھی۔ خلافت عباسیہ میں کوئی
دم باقی نہیں رہا تھا۔ خلافت فاطمیہ مصر کے دارشان تاج و وہیم علیش پرست اور کاہل
ہو گئے تھے۔ ترقی و عظمت کا دار و مدار زرا اور سپہ سالاروں کی بیعت و شجاعت پر
تھا۔ اور سلجوقی جو موصل سے اناطولیہ تک پھیلے ہوئے تھے ایک دوسرے کے
مخالف تھے۔ اور ہر شہر آپ ہی اپنا مالک تھا۔ جو باہم لڑتے رہتے۔ اور جب چار پانچ
شہروں کے حاکم باہم مل جاتے تو ایک چھوٹی سی متحدہ قوت پیدا ہو جاتی جو قرب و جوار
کی حکومتوں پر غالب ہوتی۔ چنانچہ ایشیائے کوچک کے انتہائی مغربی علاقہ میں قزل
ارسلان ایک زبردست ترک فرمان روا تھا جس نے ان صلیبیوں کے پہلے لشکر کو جو چھ
لاکھ آدمیوں کا تھا ایسی زبردست شکست دی کہ تین لاکھ قتل ہو گئے اور باقی اپنی

جان لے کے بھاگے۔ اتنے میں یورپ سے آئے کے لیے سخت تھکاؤ
 روکنا دشوار تھا جو مسلمانوں سے لڑتا تھا۔ اگرچہ اس
 اور اس کا محاصرہ کر لیا۔ یہ شہر شانہ شاہانہ تھا۔ اگرچہ اس
 فتح کرنا دشوار تھا مگر ایک بزرگ نے یہاں ہمیشہ سے زیا
 دت مسرت سے زخمی کیے تھے اور اُس سے بڑے بڑے
 مسلمانوں کو شکست ہو گئی۔ اور مسیحی انطاکیہ پر قبضہ کر کے آگے بڑھے۔

جس وقت بطرس راہب یورپ میں روتا اور مسیح کی دوبائی دیتا پھرتا تھا
 ارض فلسطین میں ترکوں کو کمزور دیکھ کے فاطمی خلافت نے کوشش کی کہ اُسے پھر
 اپنے قبضہ میں کر لے۔ ان دنوں بیت المقدس تاج الدولہ بن تنش کے قبضہ میں تھا اور
 اُس نے اس محترم شہر کو امیر سقان بن ارتقی ترکمانی کے حوالہ کر دیا تھا۔ جب صلیبوں کا
 یورش سے ترک لوگ اُدھر متوجہ ہوئے تو مصر کے خلیفہ فاطمی متعلیٰ کی جانب سے قسطن
 بن بدر جمالی نے بیت المقدس پر چڑھائی کر دی۔ سختی سے محاصرہ کر لیا۔ کچھ اور چالیس
 دن تک شہر نہاہ پر زبردست سختی پتھر برساتی رہی۔ جن کی وجہ سے جا بجا سے
 شہر نہاہ شکستہ اور کمزور ہو گئی۔ آخر عاجز آ کے اہل شہر نے امان مانگی اور شعبان ۵۸۹ھ
 (سنہ ۱۱۹۴ء) کو پھر بیت المقدس فاطمیوں کے قبضہ میں آگیا۔ اور افتخار الدولہ نام ایک
 شخص والی شہر مقرر ہوا۔

شاید اس زمانہ میں عیسائی زائرین پر زیادہ سختیاں نہ ہوتیں مگر اب زائرین
 یورپ بجائے فقیرانہ وضع سے آنے کے سپاہی اور مجاہدین کے آنے کی دھن میں تھے
 چنانچہ اس قبضہ کے تین ہی برس بعد صلیبوں نے آ کے بیت المقدس کا محاصرہ کر لیا۔ مصر
 سے کوئی مدد نہ آ سکی۔ اور ۲۳ شعبان ۵۹۰ھ (سنہ ۱۱۹۵ء) کو مسیحیوں نے بڑے
 جوش و خروش کے ساتھ یورش کر کے بیت المقدس پر قبضہ کر لیا۔ تمام مسلمان مارے گئے۔
 عرفیہ مسجد اقصیٰ کے اندر ستر ہزار مسلمان کمال بے رحمی سے شہید کیے گئے جن میں بڑے
 بڑے عباد و زہاد اور ائمہ دین تھے۔

یورپ میں صلیبی جہاد کی ایسی زبردست تحریک ہوئی تھی کہ فتح ہونے پر بھی
 وہاں سے برابر فوجیں چلی آتی تھیں۔ اور انسانوں کا ایک سیلاب عظیم تھا جس کا روکنا

انسانی قوت سے باہر نظر آتا تھا۔ چنانچہ نہ کچھ مشرکے فاطمیوں کے بنائے گئے۔ نہ خلافت عباسیہ کچھ کر سکی۔ نہ سلجوقیوں کا کچھ زور چلا۔ اور ارض فلسطین میں مغربی عیسائیوں کی ایک سلطنت قائم ہو گئی جو مشرقی لاطینی سلطنت کے نام سے مشہور ہوئی۔ اور گاؤں فرے پہلا بادشاہ منتخب ہوا جیسے عربی مورخین گندفرے کہتے ہیں۔

اب اس سچی دور میں مسیحی زائرین نہایت کثرت سے آ رہے تھے اور بڑی عقیدت و سحرگرمی کے ساتھ آنے لگے۔ چنانچہ مسیحیوں کے قبضہ کے تیسرے ہی سال سیولف نام ایک انگلہ زیارت کو آیا جس نے سالانہ اور سالیانہ میں سفر کر کے اپنا سفر نامہ زمانہ میں کسی ایسے سیاح کی ضرورت تھی جو تفصیل سے

ہونے سے بیت المقدس اور ارض یرودا

سیولف نے سوا اپنی مذہبی زائر

اپنے ورود کے وقت

تھے کہ ناگہان مسلمان

تھے جو قاہرہ

لشکر کو ساتھ

میں سے

او

غنی

جمع کر

کیتا رہ

اٹھا

اٹھا

سیا

میں یا نہ سے جہاز پر سوار ہوا۔ مگر چونکہ مسلمانوں کے بیڑے کا دھڑکا لگا ہوا تھا اس لیے ہمارا جہاز سمندر میں آگے نہ بڑھ سکا۔ اور ہمیں اسی راستہ سے جس سے کہ آئے تھے واپس جانے کی جرأت نہیں ہوئی۔ بلکہ ہم نے کنارے ہی کنارے سفر شروع کیا جبکہ عرچند ساحلی شہروں پر تو فرانسیسیوں کا قبضہ ہو گیا ہے باقی سب مسلمانوں ہی کے قبضہ میں ہیں۔“

سب سے زیادہ تعجب کی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اگرچہ صلیبیوں نے ارض تہذیب کو لے کر ہاتھ شہر مسلمانوں سے خالی ہو گئے۔ اور یہاں لاطینی حکومت کہ باہر پاڑوں اور ریگزاروں میں اب تک مسلمان ست پریشان کرتے تھے۔ چنانچہ سیولف کتا ہے۔

اکی راہ لی۔ یہ دونوں کا سفر ہے۔

بھی ہے۔ اس لیے کہ مسلمان

تہیں کہ مسیحی لوگ

گزر رہے ہوں۔ یا

اس کے سات برس بعد سیگورڈ صلیبی آیا۔ جس کے واقعات ایک کہانی کے طریقے سے یورپ میں مشہور تھے۔ سیگورڈ ناروے کا بادشاہ تھا۔ جو ابتدا میں اور ضرورت کے وقت تو صلیبیوں کا ساتھ نہ دے سکا۔ مگر اپنا ۶۰ ہزار لون کا بیڑہ لے کے بعد روانہ ہوا۔ اور بیت المقدس پر مسیحیوں کے قابض ہو جانے کے گیارہ برس بعد پہنچا۔ اُس کے داستان گوئے اُسے ایک رستم یا اسفندیار بنا دیا ہے۔ جو ہفتخوان کی سی منزلیں طے کرتا ہوا یہاں تک آیا۔ پہلے اسپین کے مسلمانوں سے لڑا۔ اُس کے بڑھکے اور مسلمانوں سے مقابلہ کیا۔ پھر لبنان میں مسلمانوں سے لڑا۔ اُس کے بعد بحر روم میں اکثر مقامات میں مسلمانوں سے لڑائیاں ہوئیں اور سب معرکوں میں فتحیاب ہوتا اور مسلمانوں کو بھگاتا ہوا ارض فلسطین میں پہنچا۔ یہاں شاہ بالڈون نے بڑے تکلف سے اُس کی دعوت کی۔ بہت سے تبرکات اُسے دیے۔ اصلی صلیب کی لکڑی کا ایک ٹکڑا اُسے دیا جس پر دو لون بادشاہوں نے قسمیں کھائیں کہ یہ لکڑی اصلی صلیب کی ہے۔ پھر سیگورڈ نے عہد کیا کہ ناروے میں جہاں کے دین عیسوی کو ترقی و دن کا۔ اس کے بعد وہ بالڈون کے ساتھ جاکے مسلمانوں سے لڑا اور ایک اور شہر فتح کر کے اُس کی قلمرو میں بڑھایا اور خشکی کے راستے سے قسطنطنیہ ہوتا ہوا اپنے وطن ناروے میں واپس گیا۔

اور سیگورڈ کی مہم کے واقعات ایک نظم میں بیان کیے گئے ہیں جو گیتوں کی طرح غنیمت جاتی تھی اور عنوان بیان تاریخ کانہیں بلکہ قصہ کا معلوم ہوتا ہے۔ بعد کے جمع کریں مورخین نے اگرچہ ان شہروں کا پتہ لگانا چاہا ہے جن کے نام اُس کے سفر نامہ پر لکھے ہیں۔ لیکن اصل یہ ہے کہ اُس کے سفر نامہ کا بہت ہی کم حصہ اس قابل ہے کہ اس کا اعتبار کیا جائے۔ یا اُسے قصہ سے زیادہ وقعت دی جائے۔

مسجد اقصیٰ

اٹھارہ بیت المقدس کی مسجد اقصیٰ جسے عیسائی مورخین "مسجد عمر" کہا کرتے ہیں دراصل پُرانا خانہ خدا ہے جس کی تعمیر کی حضرت داؤد نے آرزو کی تھی اور حضرت سلیمان کے عمارک ہاتھوں نے اپنے پدر گوار کی اُس دلی آرزو کو پورا کیا تھا۔ یہ خانہ خدمت بائیں

در از تک بیود کا قبلہ رہا تھا۔ مگر انقلابات زمانہ کی جیسی مار اس مقدس خانہ خدا نے کھائی شاید دنیا کے اور کسی معبد نے نہ کھائی ہوگی۔

حضرت سلیمان کی قدیم عمارت کو بخت نصر نے تباہ و ویران کیا۔ جس کے بعد ایک مدت دراز تک یہ معبد ہی نہیں بلکہ سارا شہر بیت المقدس منہدم و ویران پڑا رہا۔ اس کے بعد حضرت عزرا و بنی نے اسیری بابل سے واپس آگے از سر نو تعمیر کیا۔ اور پھر پُرانی توحید اور پُرانی شریعت الہی زور و شور سے جاری ہوئی۔ اس عمارت میں ولادت مسیح کے زمانہ میں ہروڈ بادشاہ بنی اسرائیل نے اور اضافہ کیا۔ لیکن اسے ایک صدی نہیں گزرنے پائی تھی کہ رمی سپہ سالار طیطوس (ٹائیٹس) نے پھر تباہ و برباد کر دیا۔ بیت المقدس کا خزانہ لوٹ لیا۔ سونے چاندی کے ظروف اور تمام قیمتی آلات عبادت اور وہ سونا چو رو دیوار پر چڑھا ہوا تھا کھرج کھرج کے اپنے قبضہ میں کیا۔ خانہ خدا میں آگ لگادی اور پھیل سلیمانی کی جگہ خاک کے انبار چھوڑ کے واپس گیا۔

چند روز بعد رومی عیسائی ہو گئے۔ اور انبیاء کے سلف کی شریعت پر ایمان لانے کی وجہ سے چاہے تھا کہ ان کی سرگرمی سے یہ معبد الہی ہمیشہ سے زیادہ شان و شو کا نمونہ بن جاتا۔ لیکن خرابی یہ ہوئی کہ ارض یہودا کے سچے مسیحی جن پر حضرت مسیح کی سچی تعلیمات کا اثر تھا انھیں خدا نے قوت و استطاعت نہیں دی۔ اور جس مسیحیت نے رومیوں اور یونانیوں میں نشو و نما پایا وہ بت پرستی سے مفلوج تھی۔ اور گونہ مان تورا کو ماننا تھی مگر اصل میں وہ انبیاء کے سلف اور ان کی شریعت کی سخت دشمن تھی لہذا رومہ الکبرنی اور قسطنطنیہ کی مسیحیت نے بیت المقدس میں سیکڑوں نئی زیارت گاہیں پیدا کر لیں۔ اور بمیونیون عالیشان کینسہ جناب مسیح کی یادگار بنیں تعمیر کر دیں۔ مگر پُرانے حرم ربانی اور معبد الہی کے وہ ویسے ہی دشمن تھے جیسے کہ بخت نصر یا آگے بت پرست رومی تھے۔

آخر اس محترم شہر پر حضرت فاروق اعظم کا قبضہ ہوا۔ جب شرائط معاہدہ طے ہو گئے اور بیت المقدس کے پچھا تک کھل گئے تو حضرت عمر نے عیسائیوں کے مقتدا کے اعظم سے فرمایا ”مجھے اب مسجد داؤد (مسجد اقصیٰ) میں لے چلو“ اُس نے

کہا "چلیے" اور آپ چار ہزار مسلمانوں کے ساتھ شہر کے اندر داخل ہوئے۔ وہ پہلے آپ کو کینسہ اقامت میں لے گیا جو فلسطین کے زمانہ میں فرضی مقدس مسیح پر تعمیر ہوا تھا۔ اور اُس کی طرف اشارہ کر کے کہا "وہ مسجد داؤد جسے آپ پوچھتے تھے یہی ہے" آپ نے اُس کی عمارت دیکھ کر کہا "تم جھوٹے ہو۔ یہ وہ مسجد ہرگز نہیں ہے" یہ کہہ کر آپ نے واپس جانے کا ارادہ کیا مگر اب نماز کا وقت آگیا تھا۔ آپ اور اُسے فریضہ صلوٰۃ کے لیے رُکے تو سفرونیوس (مقتدائے نصاریٰ) نے عرض کیا "آپ یہیں نماز پڑھیے" مگر آپ نے اس میں تامل کیا۔ تب وہ آپ کو فلسطین کے گرجہ میں لے گیا اور آپ کے لیے وہاں با نماز بچا دی گئی۔ لیکن آپ نے یہاں نماز پڑھنے سے بھی انکار کیا۔ اور اُس کینسہ کے باہر آکے چٹانک کی سیڑھیوں پر نماز پڑھی۔ سفرونیوس نے اس کا سبب پوچھا تو آپ نے فرمایا "میں کینسہ کے اندر نماز پڑھنے سے محروم کر دیا گیا۔ اس لیے کہ ممکن ہے کہ میرے نماز پڑھنے کو نظیر قرار دے کے مسلمان تمہارے گرجہ پر قبضہ کر لیں۔ اور اسے اپنی مسجد بنالیں" لیکن اتنا فرمادینے پر بھی آپ کو اطمینان نہیں ہوا۔ اور قلم و دات منگو اسکے آپ نے ایک تحریر لکھ کر سفرونیوس کو دے دی جس کا مضمون یہ تھا کہ "خبردار مسلمان لوگ اس کینسہ کی ان سیڑھیوں پر بھی نماز نہ پڑھیں۔ یہ اور بات ہے نہ کوئی ایک مسلمان کسی خاص وقت پر اور کسی مجبوری سے یہاں نماز ادا کرے۔ لیکن خبردار یہاں نہ اذان دی جائے اور نہ اس مقام کو مسلمانوں کی مسجد قرار دیا جائے۔ یہ نشان بھی عداوت فاروقی کی جس نے دنیا آج تک حیرت کر رہی ہے اور جس کی نظیر سے سچ یہ سچا کہ دنیا کے تمام فاتحوں کی تاریخ خالی ہے۔

اس کے بعد سفرونیوس آپ کو فلسطین کے اُس گرجہ میں لے گیا جو صیہون کے نام سے مشہور ہے۔ اور اُس کی طرف اشارہ کر کے کہا "یہی عبادت گاہ ہے" آپ نے اس کی بھی تکذیب کی۔ اس کے بعد اتفاقاً آپ کا گرجہ عبادت گاہ کی طرف سے ہوا۔ اور آپ خود ہی اُس کے اُس دروازے پر ٹھہر گئے جو "باب محمد" کہلاتا ہے۔ اس قدیم خانہ خدا کے ساتھ مسیحا یون کو جو ہمیشہ آپ کی اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ دروازے کے زینوں پر چو پاؤں کی لید کا اس قدر انبار لگا ہوا تھا کہ زینوں پر سے گر کر کے سڑک پر بھی پھیل گئی تھی۔ اور دروازے کے اندر تو اتنا دھیر لگا ہوا تھا کہ چھت سے جا لگا تھا۔ حضرت عیسیٰ نے اُدھر مارچ کیا تو سفرونیوس

بولا "اس میں جانے کے لیے تو ہمیں ہاتھ اور گھٹنے ٹیک کے جانوروں کی طرح چلنا ہو گا۔" حضرت عمرؓ نے فرمایا "ہاں ہم ہاتھوں اور گھٹنوں کے ہی بل جائیں گے" مجبوراً سفر و نبوس جس طرح بنا کر تپڑتا اور گھٹنوں گھٹنوں چل کے اندر لے گیا۔ حرم کے صحن میں پہنچ کے حضرت فاروقؓ ٹھہرے۔ چاروں طرف نظر دوڑائی۔ خوب غور کر کے دیکھا۔ اور یکایک آپ کی زبان مبارک سے نکلا "اُس خدا کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے مسجد اودودی ہے۔ جہاں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی پر تشریف لے گئے تھے۔ جناب رسالت نے اس مقام کی جو جو علامتیں بتائی تھیں صاف نظر آرہی ہیں یہاں تک کہ آپ کے ارشاد کے مطابق صحفرہ پر وہ گوبر بھی موجود ہے جو عیسائیوں نے یہود کے عقائد میں پھینکا ہے۔ یہ کہتے ہی آپ جھٹکے اور خود اپنی آستینوں سے صحفرہ سے گوبر کو بھاڑنے لگے۔ آپ کو دیکھ کر تمام مسلمان جو ہر اور کاب تھے اس کام میں مصروف ہو گئے۔ اور دم بھر میں صحفرہ کو گوبر اور لید سے بھاڑ کے صاف کر دیا۔ اس کے بعد فرمایا جب یہاں مینہ کے تین چھینے پڑیں تو اس میں نماز پڑھنا۔

ایک روایت میں یون ہے کہ بیت المقدس کے فتح ہونے کے بعد حضرت عمرؓ نے کعب احبار کو بلوایا جو حضرت رسالت کے ہاتھ پر دین یہود چھوڑ کر مسلمان ہو سکے تھے۔ اور پوچھا "تھیں معلوم ہے کہ صحفرہ کہاں پر ہے؟" انھوں نے عرض کیا "جی ہاں معلوم ہے۔ وہ دیوار جو وادی جہنم کے سامنے متوازی چلی گئی ہے اُس سے اتنے بالشت فاصلہ پر ہے۔ اور فی الحال اُس جگہ پر لید ڈالی جاتی ہے۔" ان کے کہنے کے مطابق زمین کھودی گئی تو صحفرہ برآمد ہوا۔ تب حضرت عمرؓ نے اُن سے کہا "اچھا بتاؤ مسجد کہاں پر تعمیر کی جائے؟" کعب نے کہا "میری تو یہ رائے ہے کہ مسجد صحفرہ کے عقب میں تعمیر ہو تاکہ مسلمان جب نماز کو کھڑے ہوں تو وہ دونوں قبلہ سامنے رہیں۔ کعبہ بھی اور بیت المقدس بھی۔" حضرت عمرؓ نے فرمایا "خوب۔ اب تک تم میں یہودیت کی محبت باقی ہے۔ میرے نزدیک مسجد کے لیے سب سے زیادہ مناسب یہ ہو گا کہ صحفرہ کے روبرو رہے۔ بلا لحاظ اس کے کہ نماز کے وقت وہ سامنے رہے یا پیچھے۔" ان فرض آپ کے حکم سے ایک سیدھی سادھی مضبوط و مستحکم مسجد تعمیر کر دی گئی۔ جس میں نہ زیبائش کا خیال تھا اور نہ آرائشی و شاندار سی ڈھانچہ۔ اور اُس کی وسعت اتنی تھی کہ تین ہزار آدمی اُس میں نماز ادا کر سکیں۔ اس کے بعد سے ۸۴ سال تک بیت المقدس کی تاریخ کے متعلق کچھ نہیں معلوم ہوتا۔

اس میں شک نہیں کہ مسلمان اس پرانے حرم ربانی کا ادب اور اُس کی تعظیم کرتے تھے مگر مسلمانوں کی جیسی توجہ مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ کی زیارت کی جانب تھی بیت المقدس کی طرف نہ تھی جب خلافت اسلامی بنی امیہ کے ہاتھ میں گئی اور آل مروان کی حکومت کا آغاز ہوا تو عرب میں عبداللہ بن زبیر نے خلافت کا دعویٰ کیا۔ مکہ معظمہ کو اپنا دار الخلافہ قرار دیا اور سارا جزیرہ نمائے عرب اُن کے زیر فرمان ہو گیا تو عبدالملک بن مروان کو جو دمشق میں علم خلافت بلند کیے ہوئے تھا یہ بات اپنے مقاصد کے بالکل خلاف نظر آئی کہ حرمین مکہ و مدینہ جو مرکز اسلام اور ساری دنیا کے مسلمانوں کے مرجع بنے ہوئے ہیں ابن زبیر کی قلمرو میں ہیں۔ کل ممالک کے مسلمان حج کو مکہ میں جاتے اور عبداللہ بن زبیر کے ہاتھ پر بیعت کر لیتے۔ اور اُس کے بنائے کچھ بھی نہ بن پڑتی۔

آخر اُس کے ذہن میں یہ بات آئی کہ مسلمانوں کو بیت المقدس کی طرف متوجہ کیا جائے تاکہ ایک بڑی زیارت گاہ اور پُرانا حرم میرے قبضہ میں بھی ہو جائے جس میں سیکڑوں انبیائے سلف کے مزار پُرانوار ہیں۔ مسجد اقصیٰ کا قرآن پاک میں ذکر ہے۔ اور جناب سرور کائنات شب معراج میں یہیں سے آسمان پر تشریف لے گئے تھے۔ عبدالملک نے جیسے ہی یہ خیال ظاہر کیا مسلمانوں کو بہت پسند آیا۔ اور سب لوگ نہایت سرگرمی سے اس جانب متوجہ ہو گئے۔ لوگوں کو مستعد پانے کے عبدالملک نے اس مضمون کا ایک اطلاعی خط شایع کیا کہ "عبدالملک چاہتا ہے کہ حضور مبارک پر ایک گنبد تعمیر کرے۔ تاکہ مسلمان لوگ جو بیت المقدس میں ہیں موسمی تکلیفوں سے بچیں۔ اور نیز یہ چاہتا ہے کہ مسجد اقصیٰ کو بھی از سر نو بنائے کھڑا کر دے۔ مگر وہ نہیں پسند کرتا کہ بغیر مسلمانوں کی رضامندی کے کوئی کام کرے۔ لہذا تمام ملل اسلام سے درخواست کی جاتی ہے کہ اس کار خیر میں اُس کا ساتھ دیں۔"

اس کے جواب میں ہر طرف سے آمادگی اور جوش و خروش کے خط آنے لگے۔ اور عبدالملک نے احکام جاری کر کے مختلف بلاد و امصار سے بڑے بڑے ہوشیار کارکنر بلوائے۔ اور مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ کی تعمیر کا کام چھڑا دیا۔ جس میں ملک مصر کا سات برس کا خراج پورا پورا خرچ کر دیا گیا۔ اس دولت کے جمع کرنے اور خزانہ کے رکھنے کے لیے اُس نے پہلے ایک اور گنبد تعمیر کرایا جو قبۃ الصخرہ کے مشرق جانب آج تک موجود ہے اور "قبۃ السلسلہ" کہلاتا ہے۔ اس چھوٹے گنبد کو اُس نے خود اپنی بجزیرہ سے بنوایا۔ اور

معماروں کو بتادیا کہ ایسا ہو۔ جب یہ بن کے تیار ہو گیا تو ایسا خوشنما تھا اور تمام لوگوں کو اس قدر پسند آیا کہ اُس نے معماروں کو حکم دیا کہ اسی نمونہ پر قبتہ الصخرہ بھی تعمیر کیا جائے۔ قبتہ السلسلہ کے بن چکنے کے بعد عبدالملک نے رجا بن جیو ڈالکندی کو کار تعمیر کا ستم مقرر کیا۔ اور خاص بیت المقدس کے ایک مسلمان یزید بن سلام کو اس کا مددگار قرار دیا۔ ان دونوں کو کل رقم کے خرچ کرنے اور جن جن سامانوں کی ضرورت ہو ان کے فراہم کرنے کی آزادی دی گئی۔ انھوں نے پہلے قبتہ الصخرہ کی تعمیر شروع کی جس کا افتتاح مشرق کی جانب سے کیا۔ اور مغرب کی طرف ختم کیا۔ اور جب بن چکا تو اس قدر مکمل تھا اور ایسی اعلیٰ عمارت تھی کہ کوئی یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ اس بات کی کمی رہ گئی۔ یا یون ہونا چاہیے تھا۔ یہ طریقہ مسجد اقصیٰ کا رد کار بنانے میں ملحوظ رکھا گیا جو کہ قبتہ الصخرہ کے جنوب جانب ہے۔ اُسے بھی مشرق سے شروع کر کے مغرب میں مکمل کیا۔ سب سے پہلے وہ دیوار تعمیر کی گئی جو مسجد اقصیٰ حضرت مسیح کا گوارہ (کلماتی ہے) اور خاتمہ اس مقام پر ہوا جو اب ”جامع المغارب“ کے نام سے مشہور ہے۔

عمارت کے مکمل ہو جانے کے بعد رجا اور یزید نے عبدالملک کو کھانا ”حسب العجم امیر المومنین قبتہ الصخرہ اور مسجد اقصیٰ کی عمارتیں ایسی مکمل ہو گئیں کہ اب ان پر کسی اضافہ کی گنجائش نہیں ہے۔ جو رقم اس کام کے لیے عطا کی گئی تھی اُس میں سے ایک لاکھ دینار ربح رہے ہیں۔ لہذا اس باقی ماندہ رقم کی بابت امیر المومنین جو علم دین اُس پر عمل کیا جائے۔“ عبدالملک نے اس کے جواب میں لکھا ”تم دونوں کے خدمات اور نگرانی مصارف کے مسئلہ میں اس باقی ماندہ رقم کی نسبت تمہیں آزادی دی جاتی ہے کہ اُسے اپنے صرف میں لاؤ۔ اور اپنا انعام سمجھو۔“ ان دیانت داروں نے اُس رقم کا لینا جو ایسے دینی کام کے لیے مخصوص ہو نہیں پسند کیا۔ اور عرض کیا کہ ”اس رقم کو حضور امیر المومنین جس کام میں چاہیں صرف کریں ہم نہیں لے سکتے۔“ اور اُس کے ساتھ اپنی بی بی دین کا زیور بھی اتار کے پیش کر دیا کہ یہ بھی اسی کار خیر میں صرف کر دیا جائے اس جو اب پر خوش ہو کے عبدالملک نے حکم دیا کہ ”اچھا اُن دیناروں (اشرافیوں) اور زیور کو گلا کے قبتہ الصخرہ کی چھت اور دیواروں پر سونا چڑھا دیا جائے۔ چنانچہ جیسے حضرت سلیمان کے عہد میں اس معبد اُسی کے در دیوار پر سونا چڑھایا گیا تھا

اب بھی چڑھا دیا گیا۔ اور یہ عایشان عمارت سونے کا ڈالا معلوم ہونے لگی۔ کہتے ہیں کہ گنبد پر سونا اس قدر بھرا گیا تھا کہ اُس پر لوگوں کی نگاہ نہ ٹھہرتی تھی۔ اس کے بعد نرم کتبہ کی طرح اس نرم کتبہ کے لیے بھی ایک غلاف تیار کیا گیا جو چمڑے کا تھا تاکہ گرد اور اور مینے سے محفوظ رہے۔ اس کے بعد جہاد اور یزید نے قبتہ الصخرہ کے گرد سیاہ آبنوس کے جھنڈی دار اوٹ قائم کیے۔ اور ستونوں کے درمیان میں طلا کار کا رچو بی پردہ لکھائے۔ کہتے ہیں کہ عبدالملک کے زمانہ میں قبتہ الصخرہ کے اندر ایک پیش بہا موتی - سمرقہ ابراہیم کے سینڈھ سے کاسینک اور خضر دان چم کا تاج چون پچ میں ایک نہ خیر میں بندھے ہوئے لٹک رہے تھے اس کے بعد جب خلافت خاندان بنی ہاشم میں گئی تو یہ چیزیں یہاں سے نکال کے کعبہ میں پہنچا دی گئیں۔

یہ مسجد اقصیٰ جب مکمل ہو کے کھولی گئی تو اُس کی عظمت و حرمت بڑھانے اور لوگوں کو اُس کی طرف متوجہ کرنے کی تدبیر بن میں کوئی بات نہیں اٹھار کھی گئی۔ بہت سے خادموں اس خدمت پر مامور تھے کہ ہر روز صبح کو زعفران پس کے ایک معطر عرق تیار کرتے جو ساری مسجد میں چھڑکا جاتا۔ اور انگلیچوں میں عود و بوان سلگاتے۔ اس کے متعلق جو "حمام سلیمان" تھا اُس کے ہر روز خوب اچھی طرح صاف کرنے کی خدمت پر بھی بہت خدام مامور تھے۔ جن کا یہ کام بھی تھا کہ ہر روز سب سے پہلے کھلف اور بھاری۔ اور پختی کپڑے پہنتے۔ مرصع پٹکے کروں میں باندھتے۔ اور غلٹی لے جا کے ہمان تک ہاتھ پہنچتا صخرے میں لگاتے۔ اور جب ہاتھ نہ پہنچتا تو پاؤں دھو کے خود صخرے پر چڑھ جاتے اور جبکہ خلق تیار ہو تا سب اُس میں لگا دیتے۔ تب سونے چاندی کی انگلیچیاں لگاتے جن میں قیمتی مسالے سلگتے ہوتے۔ اُن سے صخرہ اور سارے قبتہ کی تخریر کرتے۔ اُس دھوئی کے وقت پردے چھوڑ دیے جاتے تاکہ ساری عمارت خوشبو سے خوب بس جائے۔ اور خوب اچھی طرح دھوئی دے چکنے کے بعد جب پردے باندھتے جاتے۔ تو ساری عمارت خوشبو سے مہک اٹھتی۔ اور جو کوئی سڑکوں پر گزرتا اُس کا دماغ بھی معطر ہو جاتا۔ اور اسی خوشبو سے معلوم ہو جاتا۔ کہ اب قبتہ الصخرہ کے اندر عبادت کرنے کا وقت آگیا۔ جس کے لیے اس خوش و خروش سے لوگ دوڑتے کہ آئے والوں کو عہ خلق ایک صندل یا لسی ہوئی ہندی کی صورت کی مرکب خوشبو تھی جو عربوں میں رواج تھی۔

اس میں دو رکعتیں ادا کرنے کا بھی بڑی مشکون سے موقع ملتا۔ اور چند ہی لوگوں کو اس عبادت کے ادا کر سکنے کا شرف حاصل ہو سکتا۔

یہاں خوشبو کے مہکنے کی یہ حالت تھی کہ جو کوئی اندر ہوتا جہاں جاتا اپنے پنڈے کی خوشبو سے پہچان لیا جاتا کہ قبة الصخرہ میں ہو کے آیا ہے۔ لوگوں کا بھی یہاں اس قدر ہجوم تھا کہ کسی کو پوری طرح اطمینان سے وضو کرنے کا بھی موقع نہ مل سکتا۔ بلکہ پاؤں کی ایڑیاں جھگو کے ایک خاص قسم کی جھاڑی کی ٹہنیوں سے سارے پاؤں کو تر کرتے اور پھر جب سے رومال نکال کے خشک کر لیتے۔

تمام دروازوں میں قفل پڑے رہتے۔ اور ہر ہر دروازہ پر دس دس خادم موجود رہتے۔ اور مسجد کا دروازہ ہفتہ میں صرف دو بار یعنی ہر جمعہ اور دو شنبہ کو کھولا جاتا۔ ان دونوں کے علاوہ دیگر ایام میں سوا خدام مسجد کے کسی کو اندر جانے کی اجازت نہ تھی۔ علامہ ابن عساکر حنفیوں نے چھٹی صدی کے آغاز میں بیت المقدس کی زیارت کی تھی بیان کرتے ہیں کہ مسجد کی چھت اور دیگر مقامات میں ۶۰۰ لکڑی کے تختہ لگے ہوئے تھے۔ اور لکڑی کے ستون ان کے علاوہ تھے۔ مسجد کے پچاس دروازے تھے۔ جن میں مندرجہ ذیل دروازے بھی ہیں۔ باب القریٰ - باب داؤد - باب سلیمان - باب محمد - باب حطہ - باب النوبہ - باب الرحمہ - چھ دروازے ابواب الاسباط کہلاتے تھے۔ ایک اب باب الولید تھا۔ ایک باب المائمی تھا۔ ایک باب النضر تھا۔ اور ایک باب السکینہ تھا۔ اس میں ۱۰۰ سنگ میسر کے ستون تھے۔ سات محرابیں تھیں۔ ۳۸۵ زبیر بن عدی بن ابی سفیان اور جھارٹسکانے کی تھیں۔ جن میں سے ۲۳ مسجد میں تھیں۔ اور مابقی قبة الصخرہ میں۔ ان سب زبیروں کو اگر ایک میں جوڑ دیا جاتا تو ان کا طول ۳۴۰ فٹ کا ہوتا اور ان کا وزن ۳۳۰۰ رطل (پونڈ) تھا۔ پانچ ہزار قدیلین تھیں اور ہر جمعہ رجب شعبان اور رمضان کی ۱۵۔ اور عیدین کو جو ۱۰۰۰ مومیں تھیں روشن کی جاتیں وہ ان کے علاوہ تھیں۔ صخرے کے گنبد کے علاوہ مسجد میں ۱۵ گنبد تھے اور مسجد کی چھت پر سیسے کے ۷۷۰ پتھر چڑے ہوئے تھے جن کا وزن ۷۰ رطل تھا۔ اور جو سیسے کے پتھر قبة الصخرہ کے گنبد پر چڑھے ہوئے تھے وہ ان کے علاوہ تھے۔ مسجد کے اندر ۴۴ بڑے بڑے عہد باب حملہ میں اشارہ قرآن کے لفظ حط کی حرف ہے جس کو بنی اسرائیل نے شرارت سے بدلنے کے خیال

حوض تھے۔ اور اُس کی عمارت میں چار مینار تھیں۔ تین مغرب کی جانب ایک ہی قطار میں تھے اور ایک باب الاسباط کے قریب تھا۔ یہ تمام چیزیں عبدالملک بن مروان کے عہد کی بنی ہوئی تھیں۔ اُس خلیفہ نے اس مسجد اقصیٰ کے تعمیر کرنے کے بعد اُس کی خدمت کے لیے ۲۰ مستقل خدام مقرر کیے تھے جو زرخیز غلام تھے۔ جب اُن میں سے کوئی مر جاتا تو اُس کی جگہ اُس کا بیٹا پوتا یا کوئی اور عزیز مقرر کر دیا جاتا۔ اور یہ خدمات آخر تک خاندان ہی میں رہتے۔ ہاں اگر کوئی خاندان ہی مر جاتا تو اور بات تھی۔ مسجد میں یہودی غلام بھی تھے جن کا یہ کام تھا کہ مسجد میں روزانہ جھاڑو دیا کریں۔ اُس کے متعلق پانچ ماہ صاف کیا کریں۔ اور اپنے ان خدمات کے صلہ میں وہ جزیہ سے مستثنیٰ کر دیے گئے تھے۔ ۱۰ یہودی غلاموں کی تعداد ابتداءً تو دس ہی تھی مگر آخر میں بڑھ کے ۲۰ ہو گئی تھی۔ ان کے علاوہ عیسائی خدام بھی تھے۔ جو مستقل طور پر مامور تھے۔ اور یہ خدمت برابر اُن کی کونسلوں میں برقرار رہتی تھی۔ اُن کے ذمہ یہ خدمت تھی کہ فرش اور چٹائیوں کو صاف کریں۔ اور حوضوں کو صاف کر کے اُن کا پانی بدلا کریں۔ چند یہودی خداموں کا یہ کام بھی تھا کہ شیشہ کی قندیلیں اور جھاڑ درست کیا کریں۔ اور مسجد اور صحنہ میں روشنی کریں۔ اور ان سب یہودیوں اور عیسائیوں اور نیز اُن کے قرابت داروں سے جزیہ معاف کر دیا گیا تھا۔ ابن عساکر کے بیان کے مطابق مسجد اقصیٰ کا طول ۵۵ باغ تھا اور عرض ۵۴ باغ تھا اس پیمائش میں مسجد سے مراد وہ تمام حصہ ہے جو حرم کے اندر داخل ہے۔ نہ صرف مسجد اقصیٰ۔ اس عمارت کی تعمیر کا حال بتانے کے لیے فقہ الصخرہ کے اندر کوئی خط میں یہ عبارت لکھی ہوئی ہے۔ ”بسم الرحمن الرحیم۔ لا الہ الا اللہ۔ لا شریک لہ دار الملک۔ والہ الحمد۔ یحییٰ ویت بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ“ اس کے بناء جو عبارت ہے اُس کا ترجمہ یہ ہے خادم خدا عبد اللہ امام مامونؑ امیر المومنین نے اس فتنہ کو شکستہ زمین تعمیر کیا۔ خدا اُس سے اُس کے عیسائی مامون کے زمانہ میں مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ کی ایسی اعلیٰ درجہ کی مرمت ہوئی تھی کہ گویا وہ بنائے بنا کر دیا گیا۔ چنانچہ موجودہ عمارت کو مامون کی عمارت کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اُس کے زمانہ کے کاریگروں اور مستعملین نے عبدالملک کا نام ملا کے مامون کا نام لکھ دیا۔ مگر حقیقت یہ کہ تعمیر کی تاریخ نہ دہی رہنے دی ہو عبدالملک کے عہد کی تھی۔ جو ایک عجیب و غریب فتنہ کو شکستہ تھا اور ان کے فضول کرب کی مشہور

ہاتھ سے قبول کرے اور اُس سے راضی ہو۔ آمین۔ تعمیر مکمل ہو گئی اس لیے خدا کی حمد کرنی چاہیے۔ اس کے بعد پھر آیات قرآنی کا سلسلہ پلا گیا ہے جن میں مکرر سورہ کریم اللہ الرحمن الرحیم اور کلمہ توحید کا اعادہ ہے جن میں یہ بھی ہے کہ مسیح بن مریم خدا کے پیغمبر اور اُس کا کلمہ تھے جسے اُس نے مریم میں ڈال دیا۔ اور اُس کی روح نکلتے۔ لہذا خدا اور اُس کے پیغمبروں پر ایمان لاؤ۔ اور یہ نہ کہو کہ خدا تین ہیں خدا ایک ہے اور اُس کی شان سے بغید ہے کہ اُس کے بتا ہو۔ مسیح کو خدا کا خادم ہونے میں کوئی عذر نہیں اور آخر میں لکھا ہے کہ خدا کے نزدیک اسلام ہی دین برحق ہے۔ اور اُس خدا کی حمد کرو چنانچہ کسی کو اپنا بیٹا بنانا ہے اور نہ اپنا شریک۔

عبدالملک کے بعد ولید کے عہد میں مسجد کا مشرقی حصہ منہدم ہو گیا۔ مگر ولید نے بجائے اس کے کہ سلطنت کے محاصل سے روپیہ دے دے یا اس سے چندہ وصول کر کے اُس کی مرمت کرائی۔ دوسرے عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور کے زمانہ میں ایک ایسا سخت زلزلہ آیا کہ حرم کے جنوبی حصہ کو سخت نقصان پہنچ گیا۔ منصور تمام خلفائین نجیل مشہور ہے۔ اگرچہ بغداد کے تعمیر کرنے میں اُس نے اپنی ہمت سے زیادہ عرصہ دکھا دیا۔ مگر بیت المقدس کی مرمت کے لیے روپیہ دینے کی ہمت نہ ہوئی۔ حکم دیا کہ قبة الصخرہ اور مسجد اقصیٰ میں جو سونا عمارت میں لگا ہوا ہے چھڑا لیا جائے اور اُسی سے مرمت ہو۔ گو منصور نے اس عمارت کو بنوادیگر سے یہ کہہ کر اُس کی اصلی رونق اور شاندار رہی جو سونے کے کام کی وجہ سے تھی جاتی رہی۔ خلیفہ المہدی کے زمانہ میں بھی تعمیر ہوئی۔ مگر اُس میں یہ چالاک کی گئی کہ مسجد کا طول گٹھا کے اُسی کے سامان سے عرض میں اضافہ کر دیا گیا۔

امون کے عہد میں مسجد اقصیٰ کی حالت ایسی ابتر ہو گئی تھی کہ اگر فوری مرمت نہ کی جاتی تو پھر شاید وہ مرمت کے قابل بھی نہ رہتی۔ لیکن مامون نے پوری توجہ سے مرمت کرائی۔ اور ایسے اہتمام کے ساتھ کہ موجودہ عمارت کو مامون رشید کی عمارت کہا جائے تو قریب قریب صحیح ہو گا۔ اور اُس کی یادگار برقرار رکھنے کے لیے جہان پُر اُنے کتبہ میں عبدالملک کا نام مٹا کے مامون کا نام درج کیا گیا وہاں ایک اور کتبہ بھی تھا بنے کی لوح پر کندہ کر کے قبة الصخرہ کے دروازہ پر لگا دیا گیا جس کے الفاظ یہ ہیں۔ ”تعمیر کیا گیا بحکم خادم خدا عبداللہ المامون۔ میرا مومنین اطال اللہ عمرہ بزمانہ ولایت برادر امیر المومنین الرشید

حضرت اللہ - بہ اہتمام صالح بن یحییٰ جو کہ منجملہ غلامان امیر المومنین کے ہے۔۔ بہ ماہ ربیع الآخر ۱۲۸۱ھ نام کے رو بدل میں جو شرمناک دیر کی گئی ہے یہ غالباً اسی صالح بن یحییٰ کا فعل ہے۔

یا آصف الدولہ ولی

لکھنؤ کے اکثر دکاندار صبح کو بوہنی کرتے وقت یا آصف الدولہ ولی کہہ کے نواب آصف الدولہ مرحوم کا نام لیا کرتے ہیں۔ لیکن یہ کسی کی سمجھ میں نہ آیا ہو گا کہ آصف الدولہ کی ولایت کیونکر اور کس سے ملی تھی۔ نواب مرحوم نے اپنی یادگار کے طور پر امام باڑہ کی ایک ایسی لا جواب عمارت چھوڑی ہے جو دنیا کی بہت ہی منتخب عمارت اور عجوبہ روزگار ہے۔ اُس کی تعمیر قلعہ کے زمانہ میں صرف عایا پردہ کی لیے ہوئی تھی اور محض اس خیال سے کہ شریف محتاجوں کو بھی قلعہ اٹھانے کا موقع ملے راتوں کو بھی عمارت کا کام جاری رکھا جاتا تھا۔ لیکن ولی بننے کے لیے اتنا ہی کافی نہیں ہے۔ خصوصاً جب ہم دیکھتے ہیں کہ نواب آصف الدولہ مرحوم نے اپنے ۲۳ سال کے زمانہ حکمرانی میں اپنی ماں بہو بیگم صاحبہ کو جن میں واقعی دیون کے سے صفات موجود تھے بہت ستایا۔ اور ہمیشہ آزدہ رکھا۔ ایسے رذیل لوگوں سے صحبت تھی اور ایسے شرمناک افعال تھے کہ ادنیٰ طبقہ کے لوگوں کو بھی سن کے حیرت ہو جاتی تھی۔ ایسے شخص کا عوام کے معتقدات میں ولی بن جانا تعجب سے خالی نہیں ہے۔ مگر مسٹر ولیم ہولی کی کتاب "ہائیرز آف دلی اینڈ فیض آباد" کو پڑھو گے جو کہ تاریخ "فرخ بخش" کا ترجمہ ہے ہمیں آصف الدولہ کی ولایت کی اصلی بنیاد معلوم ہو گئی۔ یہ ہم جانتے ہیں کہ اسی باتوں کو آج کل کے لوگ تسلیم نہ کریں گے مگر سن رکھنا دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔

آصف الدولہ کی ولایت کا حال لوگوں کو ان کی وفات کے وقت معلوم ہوا کیونکہ ایک برس پہلے سے اُنھیں اپنی موت کا یقین ہو گیا تھا۔ حتیٰ کہ شاہ ایران زمان شاہ کی نسبت افواہ اڑی کہ ہندوستان پر چڑھائی کرنے والا ہے تو آصف الدولہ نے صاف کہہ دیا کہ اُس کو ملک کے تمام لوگ دیکھیں گے مگر میں نہ دیکھوں گا۔ میں اُس وقت زندہ ہی نہ رہوں گا۔ یہ راز کہ آصف الدولہ کو اپنی موت کا وقت کیونکر معلوم ہو گیا تھا مندرجہ ذیل قصہ سے کھلے گا۔

"ہمارے میں ایک برہمن تھا جو نہایت ہی فلاحیت و غربت میں مبتلا تھا۔ اور اس پر قیامت یہ کہ دو کنواری بیٹیاں بیاہنے کو بیٹھی ہوئی تھیں۔ چنانچہ اُس نے ہر ہندو مسلمان کے سامنے جا کے دست سوال پھیلایا۔ اور شہر کے تاجروں اور مہاجنوں سے بھیک مانگتا پھرتا مگر کسی نے اُس پر ترس نہ کھایا اور کچھ کفالت نہ کی۔ آخر ماہوس ہو کے اُس نے جنگلوں اور پہاڑوں کی راہ لی۔ پھرتے پھرتے بٹول کی پہاڑیوں کے اُس پار چلا گیا اور شکستہ حالی کے ساتھ مارا مارا پھرنے لگا۔ یہاں وہ ایک ایسے مقام پر پہونچا جہاں بڑے بڑے سایہ دار درختوں کا گھٹنا جنگل تھا۔ اور کئی منزلوں تک آسمان بھی نہ دکھائی دیا۔ اس تاریک جنگل کے عین درمیان میں اُسے ایک پختہ عمارت نظر آئی جسے دیکھ کے وہ متحیر ہوا اور گرد و جگر لگانے لگا۔ آخر ایک کمر کی ملی جسے اُس نے بڑی مشکوک سے کھولا۔ اور اُس عمارت کے اندر داخل ہوا۔ وہاں چاروں کونوں پر اُسے چار ایسے شخص نظر آئے جو مراقبہ میں تھے۔ اور خدا کے وہ بیان میں غرق معلوم ہوتے تھے۔ اور دنیا و مافیہا سے بیخبر۔ آخروہ تھک کے ایک جانب بیٹھ گیا۔ جب رات ہوئی تو اُن چاروں نے مراقبہ سے سر اٹھائے۔ اور قوت لایوت بہم پہونچانے کے لیے اُٹھے۔ حسب معمول رسوئی میں کھانا تیار کیا۔ اور جب کھانے کا وقت آیا تو سب نے پانچواں حصہ نکال کے اُس تازہ وارد مہمان کو دے دیا۔ کھانے سے فارغ ہو کے اُنھوں نے ہاتھوں کے اشارے سے اُس کی کیفیت دریافت کی۔ اور اُس نے اپنی ساری مصیبت اور مرگشت بیان کر دی۔ یہ سن کر اُن چاروں میں سے ایک نے ایک بھوج پتر کا ٹکڑا لے کے اُس پر حنظل الفاظ لکھ دیے جو نہ ہندی تھے نہ فارسی تھے نہ عربی تھے۔ پھر وہ ٹکڑا اُس کے ہاتھ میں دے کے کہا "تم اسے لکھو میں لیجاؤ۔ اور آصف الدولہ جب ہوا کھانے کو باہر آئیں تم اُنھیں دُور سے یہ رقعہ دکھا دینا۔ وہ فوراً تم سے ہاتھ بڑھا کے لے لیں گے اور ایک ہزار روپیہ تمہارے حوالہ کریں گے" پھر سمجھانے کے طریق پر کہا "جب تم نواب کے قریب جانا اور اُن سے باتیں ہونے لگیں تو تم مرعوب نہ ہونا بلکہ یہ کہہ دینا کہ اس رقعہ کے لکھنے والوں نے آپ کو پیام دیا ہے کہ آپ کی یہ دنیوی زندگی ختم ہونے کو آئی لہذا جلد ہی آئیے۔"

اس کے بعد وہ شخص اُسی مکان سے نکلا۔ اور جنگل سے باہر نکل کے پیدل سفر کرتا ہوا لکھنؤ میں آیا۔ آصف الدولہ ایک دن ہوا دار پر سوار جا رہا تھا کہ اُس نے

دور سے وہ بھوج پتر کا رقعہ اٹھین دکھا دیا۔ دیکھتے ہی انھوں نے ہوا دار کو رونا پر طلاق
اور اُس برہمن کو پکار کے قریب بلایا۔ رقعہ اُس کے ہاتھ سے لے کے اپنی جیب میں
لے کر لیا۔ اور راجہ جھاؤ لال کو حکم دیا کہ اس شخص کو فوراً ایک ہزار روپیہ دے دو۔ اور
جب تک لکھنؤ میں رہے اس کو اچھی طرح رکھو اور کھلاؤ پلاؤ۔ جب وہ برہمن
نواب کے قریب گیا تو وہ زبانی پیام بھی پہنچا دیا۔ جسے سن کے نواب نے کہا ہاں
”مجھے معلوم ہے۔“

راجہ جھاؤ لال اُس برہمن کو اپنے گھر لے گئے اور اُس کی زبان سے پورا قصہ سُنا
مگر متحیر تھے کہ یہ کیا راز ہے۔ اُس کے بعد جب وہ نواب صاحب سے ملے تو ارادہ کیا کہ خود
ان سے اس راز کو دریافت کریں۔ قبل اس کے کہ اُن کی زبان سے کوئی لفظ بھی نکلے پائے
نواب چہرے سے تار گئے اور کہا ”دیکھو خبردار۔“ اُس برہمن کے متعلق کوئی سوال نہ کرنا میں
اُس بار سے میں کچھ نہ کون گا۔“ اس کے بعد پھر بھی راجہ نے دو ایک سالات اس واقعہ
کے متعلق کیے۔ مگر ہمیشہ رو کر دیے گئے۔ اور کچھ حال نہ کھلا۔ اس کے چھ مہینے کے بعد ایک
دن راجہ جھاؤ لال اور نواب صاحب تنہا تھے۔ راجہ نے جرات کر کے عرض کیا ”حضور
جب سے وہ برہمن آیا ہے میں اُس کے راز سے سخت حیرت میں پڑا ہوا ہوں۔“ نواب
آصف الدولہ نے جواب میں صرف اتنا کہا ”وہ لوگ میرے بھائی ہیں۔ اور اُس شخص کو
میرے پاس بھیج کے انھوں نے مجھے بلا بھیجا ہے۔“ اس کے سوا اور کچھ نہیں کھا۔ اور نواب
سے اس سے زیادہ تصریح کرانے کی بھلا کسے جرات ہو سکتی تھی؟

اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ نواب آصف الدولہ کو اس سبب خزانہ کیونکر معلوم
ہو گیا تھا۔ اور انھیں ہندو مڑ تاض پیشیوں کے ساتھ ایسے تعلقات تھے جو اُس عہد
کے مذاق میں سو کسی دلی کے اور کسی کو نہیں ہو سکتے تھے۔ چنانچہ اسی چیز نے گو کہ وہ ایک
ڑی حد تک راز پرستہ رہی نواب آصف الدولہ کو باوجود طرح طرح کی بدکاریوں کے دلی کمال بنادیا۔

حسن کی کرشمہ سازیاں

ہلینا۔ (قسطین اعظم کی مان)

اُس کی ابتدائی زندگی بالکل تاریکی میں ہے۔ کسی کو یہ بھی نہیں معلوم کہ اُس کے

”وہ تھے اور کس درجہ کے لوگ تھے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ نہایت ہی حسین و نازنین پری جمال و مہ طلعت تھی۔ اور ایسی حسینہ تھی کہ جس کی نظر پڑ جاتی فریفتہ ہو جاتا۔ ایشیائے کوچک کے شہر بٹینہ میں جسے اہل عرب شہر ”ربا“ کہتے ہیں ۳۳۷ء کے قریب پیدا ہوئی۔

یہ وہ زمانہ تھا جبکہ قیصر روم عیسائیوں پر ظلم کرتے کرتے تھک گئے تھے اور نظر آتا تھا کہ اس نئے دین کی جس قدر روک کی جاتی ہے اُسی قدر بڑھتا جاتا ہے۔ اگر غرابا حضرت مسیح پر ایمان لاتے جاتے تھے۔ اور اندر ہی اندر ان کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ اس کے ساتھ مسیحیوں میں جوش بھی پیدا ہوا اور بلا کا تھا۔ جن کے مقابل تمام پڑانے بت پرستان روم کا جوش پھیکا پڑ گیا تھا۔ وہی رومیوں کی تعداد بڑھ رہی تھی اُس نے اس حسین لڑکی کو بھی مسیحیت کا شیعہ بنا دیا۔ اور بٹینہ کے اُسقف کے پاس جا کے اُس کے ہاتھ پر ایمان لائی۔ اور مذہبی کتابوں کی تعلیم پائے ایک تعلیم یافتہ لڑکی بن گئی۔ قسطنطین کلروس جو قیصر و قسطنطینوس کا معتقد علیہ افسر تھا حملہ آوری کے سلسلہ میں اومرا آیا۔ اتفاقاً اُس کی نظر ہلینا پر پڑ گئی۔ اور دیکھتے ہی سو جان سے عاشق ہو گیا۔ فارح کو ایک مفتوح شہر کی لڑکی بردہ چاہے کیسی ہی حسینہ ہو دسترس پانا کون مشکل تھا اُسے ساتھ لے کے بزنطین امو جو وہ قسطنطینیا میں گیا۔ اور اپنی ناز آفرین محبوبہ بنا کے رکھنے لگا۔ ہلینا مسیحی ہو چکی تھی مگر اُس کے رومی نژاد شوہر کا مذہب وہی پُرانا شرک کا مذہب بت پرستی تھا۔ وہاں اُس کے بطن سے ایک بچہ پیدا ہوا جس کی ولادت کے ساتھ نجومیون نے قسطنطینوس قیصر سے کہا کہ ”یہ لڑکا عنقریب سارے روم کا مالک ہو جائے گا اور اہل روم کے مذہب کو بھی بدل دے گا۔“ یہ سنتے ہی قسطنطینوس اُس کے خون کا پیسا سا ہو گیا۔ باپ سے سوا اس کے اور کچھ نہ بنی پڑا کہ بی بی کو بیچ کے اُس کے بچے میں نہ بھی دیا۔ ہلینا اگرچہ اپنے مذہب پر متشبث تھی مگر اس کی جرات اُسے مشکل سے ہو سکتی تھی کہ بیٹے کو بھی اپنے مذہب کی تعلیم دے۔ مگر بچہ کو باپ سے جدا اور ان کے وطن میں رہنے سے اور کچھ نہیں تو اشنا فائدہ ضرور ہوا کہ اُس کے دل میں اگر مسیحیت نہیں تو مسیحیوں کی ایک گونہ محبت ضرور پیدا ہو گئی۔ چند روز بعد جب قسطنطینوس قیصر مر گیا تو اقبال مند قیسا باپ کے پاس جا کے رہا۔

قسطنطین کلورس نے ہیلانہ کو یا تو اس کی مسیحیت کی وجہ سے یا اور کسی بنا پر طلاق دے دی اور قسطنطینوس ہرقل کی بیٹی سے عقد کر لیا جس سے ہیلانہ مصیبت اور تنہائی میں پڑ گئی۔ مگر اپنے بچہ کی امید پر مصیبت کے ایام صبر و سکون سے کاٹتی رہی۔ اب یہ لڑکا رومی رواج کے مطابق اپنے باپ کے نام قسطنطین کا وارث ہوا۔ اور اس نے کارناموں اور اپنی بے نظیر کامیابیوں اور اقبال مندوں کی بدولت قسطنطین اعظم کے لقب سے مشہور ہوا۔ اُس کا باپ آخر زمانہ میں مغربی قلمرو دم کا حاکم تھا۔ اور اُس کے مرنے پر وہی اُس کی حکومت کا جانشین ہوا۔

ان دنوں روم میں ایک ہی زمانہ میں دو شہنشاہ رہا کرتے تھے۔ چنانچہ مغربی قلمرو دم کا حاکم قسطنطین تھا۔ جو علاقہ گایا (فرانس و جرمنی) میں رہتا۔ اور دوسرا فرمان روا مقسطنطیوس تھا جو خاص رومہ الکبریٰ میں تھا۔ دونوں میں رقابت و عداوت بڑھتی گئی اور قسطنطین اپنے لشکر کو بروز زیادہ زبردست اور مضبوط بناتا رہا لیکن جس طرح غلامت عباسیہ میں امین اور مامون کے جھگڑوں میں عرب اور بنی عباس امین کے طرفدار تھے اور نجی مامون کو چاہتے تھے اور اُسے اپنا بھانجا کہتے تھے کیونکہ اُس کی ماں مہاجل عجمیہ تھی اُسی طرح یہاں روم میں رومی بت پرست مقسطنطیوس کے طرفدار تھے اور مسیحی لوگوں کو قسطنطین سے زیادہ محبت تھی جسے وہ اپنا بھانجا بنائے کیونکہ مسیحی عورت کا لڑکا تھا۔ قسطنطین نے دیکھا کہ جیسا سچا جوش اور جیسی مستعدی و جانبازی آج کل عیسائیوں میں ہے بت پرستوں میں نہیں مسیحیوں کی استقامت شروع کی۔ اور آسمان پر ایک نورانی صلیب دیکھ کے صلیب جھنڈا بنایا جس کے آگے مسیحی دوڑ دوڑ کے سر جھکا دیتے تھے۔ اس سے پیشتر مسیحیوں نے صلیب کو اپنا دینی شعار نہیں قرار دیا تھا۔ مگر قسطنطین کی روحانی آنکھوں نے رو میں ہی کے مذاق کا ایک بت آسمان پر دیکھ کے عیسائیوں کو دکھایا انھیں دیکھتے ہی حضرت مسیح کی شہادت و مصاوبہ یاد آ گئی اور دوڑ دوڑ کے اُس کے آگے جوش و خروش سے سر جھکانے لگے۔ یہ سلسلہ ۳۱۳ء کا واقعہ ہے۔

آخر قسطنطین صلیبی علم اور جانبازی مسیحیوں کا زبردست لشکر لیے ہوئے رومہ الکبریٰ پر چڑھ آیا۔ حرائین کو شکست دے کے قتل کیا۔ اور لڑے بھڑکے رومہ الکبریٰ میں داخل ہوا۔ مگر یہاں کے لوگوں نے جو اپنے قدیم مذہب کے دلدادہ تھے اس کا استقبال

نہایت سرد مزاجی سے کیا۔ اور اُن سے وہ گرجو شہی نہیں ظاہر ہوئی جس کو قسطنطین چاہتا تھا۔ یہ دیکھ کے اُسے رومتہ الکبریٰ سے نفرت ہو گئی۔ اور مشرق کا سفر کر کے پُرانے شہر نیرظیم میں آیا۔ اور اُسے خوب آباد کرنا شروع کیا۔ جس کا نام اُس کی یادگار میں قسطنطینیہ قرار پایا۔

اب قسطنطین ساری مملکت روم کا شہنشاہ تھا اور کسی کی مجال نہ تھی کہ اُس کی برابری کا دعویٰ کر سکے۔ اُس کی مان جو باپ کے زمانہ سے نکالی ہوئی تھی قصر شہنشاہ میں آکے "والدہ سلطانہ" بنی جس کا قسطنطین نہایت ہی ادب و لحاظ کرتا تھا۔ اور قسطنطینیہ میں آج تک جو یہ طریقہ جاری ہے کہ شہنشاہ کی مان اصلی مالک سلطنت اور ملک بھر میں سب سے زیادہ واجب التحظیم تسلیم کی جاتی ہے غالباً یہ پلینا ہی کے زمانہ کی سنت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ دین اسلام کے رومے بھی مان کی ویسی ہی تعظیم ہوئی چاہیے جیسی کہ قسطنطینیہ میں کی جاتی ہے لیکن کسی اور اسلامی سلطنت و مملکت میں بادشاہ کی ماؤں کو ویسا امتیاز نہیں حاصل ہوتا جیسا کہ وہاں دیکھا جاتا ہے۔

اب تخت و تاج حاصل کرنے کے بعد قسطنطین کو اپنا سب سے بڑا فرض یہ نظر آتا تھا کہ عیسائیوں کے احسان کا معاوضہ کرے جن کی جان بازی سے اُسے سلطنت ملی تھی اس بارے میں اُس کی مشیر اُس کی مان پلینا ہی تھی جو کھلی مسیحیہ تھی۔

قسطنطین اعظم کی نسبت بعض لوگوں نے لکھ دیا ہے کہ وہ عیسائی ہو گیا تھا۔ مگر اس کا کوئی ثبوت نہیں موجود ہے۔ بے شک اُس نے عیسائیوں کی بحدہ فداوری کی۔ بیت المقدس میں جگہ جگہ اُن کے لیے کینہ اور عبادت خانہ تعمیر کرائے۔ سلطنت روم کے قوانین میں عیسائیوں کے متعلق جو سختیاں تھیں دور کر دیں۔ اس سے بھی بڑھ کے یہ کیا کہ عیسائیوں کی حالت اس وقت تک بالکل غیر منظم تھی۔ ان کے عقائد و مسائل میں باہم سخت اختلافات پڑ گئے تھے۔ قسطنطین نے یقیناً عیسائیوں کی سب سے پہلی دینی کونسل منعقد کی جس میں تمام ملکوں کے اہل حق اندہ پوپ شریک ہوئے اور قرار دیا گیا کہ ایک سچے مسیحی کے کیا عقائد ہونے چاہیے۔ اور تثلیث کا مسئلہ اسی کونسل نے طے کیا۔ اور جو اسقف متحد تھے اور تثلیث کے مخالف تھے ملحد و بے دین قرار دیے گئے۔ اس کونسل میں قسطنطین خود بھی شریک ہوا مگر اُسی طرح جیسے محمد بن ابیو کبشسل کا نفرنس میں کبھی لفٹنٹ گورنر ہوا اور آجائے میں

باوجود عیسائیوں کی ایسی طرفداری کے اُس نے رومیوں سے اپنے تعلقات منقطع نہیں کیے تھے۔ سنیت صوفیا جو آج کل مسجد ہے اور اس سے پہلے کنیسہ تھی اسی قسطنطین کی بنائی ہوئی ہے جسے اُس نے مسیحوں کے لیے نہیں بلکہ علم کی دیوی کے مندر کی حیثیت سے تعمیر کرایا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عیسائیوں نے تو قسطنطین کا نام اپنے سینوں (دیون) کی فہرست میں درج کر لیا۔ اور بت پرستوں نے اُسے خوشی سے اپنا ایک دیوتا تسلیم کر لیا۔ بیت المقدس اور ارض فلسطین میں مسیحوں کے خوش کرنے کے لیے اُس نے جو کچھ کیا اپنی مان ہلینا کے ذریعہ سے کیا۔ وہ ایک عقیدت کیش زائرہ کی وضع سے ادب و تعظیم کے ساتھ یہاں آئی۔ جہاں جہاں حضرت مسیح کے تشریف لیجانے کا حال سنا یا جن جن مقامات سے آپ کا کچھ بھی تعلق ثابت ہوا وہاں خود گئی۔ اور مناسب مقامات پر گرجے بنوائے۔ بیت اللحم میں آپ کے مولد پر۔ کالوری کی پہاڑی پر یعنی آپ کے مقتل پر۔ نیز اُس مقام پر جسے عیسائی آپ کا دفن بتاتے تھے بڑی بڑی عمارتیں بنوائیں۔ اور جس قدر ان نئی زیارت گاہوں کی طرف اُس نے توجہ کی اسی قدر اصلی حرم یعنی مسجد اقصیٰ کی جانب سے بے پروائی کی گئی۔ اس لیے کہ ارض یہودا کے اصلی عیسائی جو اُس کی قدر کرتے تھے فلاکت زدہ تھے۔ اور رومی دیوتا نے عیسائیوں کو اُس سے سخت عداوت تھی۔ کیونکہ جیسی آزاد می وہ چاہتے تھے وہ اُس وقت تک نصیب ہی نہ ہو سکتی تھی جب تک کہ یہود کی پرانی شریعت اور قدیم چیزوں کو کلیتہً ترک نہ کر دیا جاتا۔

ہلینا یہاں بڑی خوش اعتقادی کے ساتھ آئی تھی۔ عا جبرادہ نے آسمان پر نورانی صلیب دیکھی تھی اب والدہ محترمہ نے یہاں پہنچ کے خواب میں زمین کے نیچے وہ اصلی صلیب دیکھی جس پر حضرت مسیح مصلوب کیے گئے تھے۔ چنانچہ اُس کے اشارہ سے کالوری کی پہاڑی پر کھودا گیا تو زمین کے اندر سے تین صلیبیں برآمد ہوئیں حضرت مسیح کے ساتھ دو ڈاکو بھی مصلوب کیے گئے تھے۔ لہذا اس بات کا تو یقین ہو گیا کہ یہ وہی تین صلیبیں ہیں مگر اس امر کا فیصلہ کرنا باقی تھا کہ ان میں سے کون صلیب حضرت عیسیٰ والی ہے اور کون ڈاکو کی والی ہیں۔ آخر خوش اعتقادی نے اس کا بھی قصہ کر دیا۔ ان تینوں صلیبوں میں سے ہر صلیب پر ماری ایک مریض کے سر جانے لگئی گئی۔ اور جس صلیب کی باری میں وہ مریض اچھا

ہو گیا سمجھ لیا گیا کہ وہ اصلی صلیب جس پر حضرت مسیح لٹکائے گئے تھے یہی ہے۔ یورپ میں اس صلیب کی بڑی شہرت ہوئی۔ اور اس کے لیے بڑی بڑی خوزریاں ہوئیں۔ اس کے ٹکڑے کاٹ کاٹ کے بعض مغز زائمرین کو دیے جاتے جو یورپ کے اکثر گرجوں میں اصلی صلیب کے نام سے قائم کیے جاتے اور ان کے سامنے لوگ جا جا کے سجدہ کرتے۔ آخر یورپ میں اتنی صلیبیں بن گئیں کہ اگر وہ ایک جگہ جمع کی جاتیں تو پورے جنگل کی لکڑیوں سے بھی ان کی تعداد زیادہ ہوتی۔

الغرض یہ ہلینا ہی کے حسن کا کرشمہ تھا جس نے قلمرو روم میں مسیحیوں کو امن و امان دلوائی۔ اور چند روز بعد دولت روم کو مسیحی دولت بنا دیا۔ بیت المقدس میں صد ہا عالیشان گرجے تعمیر کرائے۔ اور آخر یورپ سے پڑانے دین کو باطل مٹا دیا۔ وہ جیسا ہم بیان کر چکے ہیں ۳۱۳ء کے قریب پیدا ہوئی تھی۔ ۳۲۵ء میں جبکہ اس کی عمر ۱۲ برس کی تھی اس کے بطن سے قسطنطین اعظم پیدا ہوا۔ ۳۲۵ء میں جبکہ اس کی عمر ۶۵ سال کی تھی قسطنطین تخت و تاج روم کا مالک ہوا۔ ۳۲۵ء میں جبکہ وہ ۷۴ برس کی تھی بیت المقدس کی زیارت کو آئی۔ اور میانکے گرجے بنوائے۔ اور ۳۳۷ء میں ۸۰ برس کی ہو کے دنیا سے رخصت ہو گئی۔ وہ عیسائیوں کی ملکہ استیر تھی جس طرح یہود کو ایک یہودیہ لڑکی کے ملکہ بن جانے سے اسیر میمن عروج حاصل ہو گیا تھا ویسے ہی ہلینا کے ملکہ بن جانے سے مسیحیت کے دن چہرے دن ہی نہیں پھرے بلکہ عقی بھی درست ہوئی۔ کیونکہ عیسائیوں کے مذاق کی اصلی مسیحیت وہی ہے جو نقیہ کی کونسل میں اصلی مسیحیت اور ذریعہ نجات قرار پائی۔ اور ظاہر ہے کہ اگر ہلینا نہ ہوتی تو وہ کونسل بھی نہ ہوتی اور وہ کونسل نہ ہوتی تو شاید عیسائیوں کو اس کے تسلیم کرنے میں غدر نہ ہو گا کہ سچا دین اور سچی صراط مستقیم فنا ہو گئی تھی۔ لیکن ہمیں انہوں سے کہہ سکتے ہیں کہ مسیحی اسی کونسل اور اسی ملکہ کی وجہ سے سچی توحید کی برکتوں سے محروم ہو گئے۔

نئے خریداران دولت از کو مر وہ

جو حضرات اب جنوری ۱۹۱۲ء سے دولت از کے خریدار ہوں گے ان کے ساتھ یہ رعایت کی جاتی ہے کہ انہیں ناول نڈوال بغداد بجائے سو روپیہ کے صرف (۵۰) ایک روپیہ پرویا جائے گا۔ اور بشمول مصارف و دوا دو روپیہ تین آنہ پڑوال بغداد اور دولت از کے ۱۹۱۲ء کے شایع شدہ پرچہ دیا جائے گا۔

ابوالاسود دؤلی قسماً در آید و در آید و در آید

و در آید و در آید و در آید



ابوالاسود دؤلی

(نمبر ۲)

ان سب فریون کے ساتھ ابوالاسود کا بخل نہایت مشہور ہو گیا تھا۔ عرب کی سوسائٹی میں بخوسی اور بزدلی سے بڑے کوئی عیب نہ تھے۔ لیکن ابوالاسود کو بخل کہنا ظلم ہے۔ اس لیے کہ وہ بخل نہیں منتظم اور کفایت شعار تھے۔ اور غیر مستحق کو کچھ دینا ہرگز جائز نہ رکھتے تھے جو صفت کہ موجودہ عہد میں سب سے بڑا انسانی جوہر ہے۔ لیکن اُس دور کے لوگوں نے قدر جاننا اور گناہ انھیں ملزم قرار دے دیا۔ یوں تو عرب میں بہت سے بخل گزرے ہیں مگر چار بخیلوں کی بڑی شہرت تھی۔ خطیبہ تمیمہ کہ خط ابوالاسود دؤلی۔ اور خالد بن صفوان۔ ابوالاسود کا نام اس فرست میں صرف اس بنیاد پر لکھ لیا گیا کہ کسی سائل کو خیرات میں ایک چھوہارا دیا اور کہا "خدا مجھے جنت میں بھی اتنا ہی دے" اکثر کہا کرتے "اگر ہم محتاجوں کی آرزو کے موافق اپنے بروہ کو صرف کر ڈالا کریں تو ہماری حالت اُن سے بھی بدتر ہو جائے" دوسروں کو نصیحت کرتے ہیں "جو کچھ تمھارے ہاتھ میں ہے اُس کا روکنا بمقابل اس کے اچھا ہے کہ تم بیرون کے آگے ہاتھ پھیلاتے پھر وہ خود اپنی نسبت فرماتے ہیں

یا مومن فی البخل جبلاً و ضللاً و للخبْلِ خیر من سوالِ بخل
(لوگ جمالت و گمراہی سے مجھے بخل پرست کرتے ہیں حالانکہ بخل کے آگے ہاتھ پھیلاتے بخل پرست ہیں)

کہتے ہیں "نیا مٹی کرنے میں خدا کی مرضی کے خلاف نہ چلا کر دو۔ وہ چاہے تو سب کو مٹی بنا دے
سکتا ہے۔ لیکن جانتا ہے کہ بعض لوگوں کے حق میں محتاج رہنا ہی بہتر ہے اور بعض کے حق میں
دولت مند رہنا۔ تم اس قدر انہی کو بدل نہیں سکتے۔"

بچے کو نصیحت کرتے ہیں "مسکینوں کو فریب میں نہ آؤ۔ یہ جب تک تمہیں بھی اپنا
زبان لیں گے جین نہ لیں گے۔ تم ان کی محتاجی دور کرنے میں اپنا نقصان کرو گے تو سوکھ
سوکھ کے مر جاؤ گے۔"

کوئی فقیر صدا لگا رہا تھا کہ "کون مجھ کے کو کھلاے گا؟" فوراً اُسے بلوائے
پریشہ بھر کھانا کھلایا۔ جب وہ کھاپی کے چلا تو کہا "چلے کہاں؟" بولا "اپنے گھر"
فرمایا "خوب۔ میں نے اس لیے تھوڑے ہی کھلایا ہے کہ تم مسلمانوں کو جا کے ستاؤ" یہ
کہتے ہی اُس کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دیں اور رات بھر قید رکھ کے صبح کو چھوڑا۔

ایک بار چند دوستوں کے ساتھ شکار پر گئے۔ صحرائ میں ایک بدوی فقیر ملا جس نے
سامنے آ کے کہا "السلام علیکم" بولے "یہ کوئی نئی بات نہیں ہے اپنا مطلب کہو؟" اُس نے کہا

"میں آؤں؟" بولے "نہیں۔" تجھے پلٹ جاؤ۔ زمین وسیع ہے۔" اُس نے کہا "مجھے تو
سنگرزوں سے میرے پاؤں مجلس لگے ہیں۔" کہا "تو ان پر موت کے انھیں ٹھنڈا کر دو۔"

اُس نے کہا "کچھ کھلاؤ گے بھی؟" بولے "ہم اپنے اہل و عیال کو کھلاتے ہیں۔ اگر ان
سے کچھ بچے گا تو بیشک کتے کے مقابلہ میں تمہارا استحقاق زیادہ ہے۔" اُس نے

برافروختہ ہو کے کہا "تم سے زیادہ ناپاک آدمی میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ بولے دیکھا تو
ہے مگر تھیں یا نہ تھیں۔ وہ خود تم ہو جس سے زیادہ ناپاک کوئی نہیں ہو سکتا۔"

ایک دن اپنے دروازے پر بیٹھے تھے اور سامنے ٹوٹری میں بھرے خرنے رکھے تھے
ایک بدوی نے آ کے سوال کیا۔ "انھوں نے کہا "آگے بڑھو" اُس نے کہا "میرا نام بھی

جانتے ہو؟ میں ابوالکلام (کبوتری کا باب) ہوں۔" انھوں نے کہا "تم ابوالکلام
(مورنی کے باب) بنو مگر چلے جاؤ۔" اُس نے کہا "میں خدا کا واسطہ دلا کے کہتا ہوں کہ

دیکھا رہے ہو اُس میں سے مجھے بھی کھلاؤ۔" خدا جانتے اُس کے اس سوال پر کیوں
ترس آگیا کہ تین ٹھرنے نکال کے اُس کی طرف پھینکے۔ اتفاقاً ایک زمین پر جا گرا۔ اور وہ
اُسے اٹھا کے اپنے کپڑے سے پونچھنے لگا۔ ابوالکلام نے کہا "بھیکو بھی جس کپڑے سے

پونچھ رہے ہو و وخرے سے زیادہ ناپاک ہے۔ بدوی نے کہا "مجھے یہ نہیں پسند ہے کہ
چھوڑ جاؤں اور شیطان اٹھا کے کھا جائے۔" بولے "تو ہرگز نہ چھوڑنا۔ شیطان کیا معنی
جبریل و میکائیل کے لیے بھی نہ رہنے دینا۔"

ایک دن کسی غیرے سے سوال کیا۔ انھوں نے حسب عادت جواب خشک دیا۔
میس نے کہا "افسوس تم میں وہ اسی بھی حالت میں ہے۔" بولے "کیون نہ ہوئی؟" پچھ میں تو
پوری حالت میں ہے۔ پھر اُسے حاتم طائی کا ایک شعر سنایا جس میں اُس نے اپنی
فیاض بیٹی مادیہ کو ناعاقبت اندیشی کی فیاضی سے روکا تھا۔

ایک بار ان کے قبیلہ کے لوگوں یعنی بنی دیل اور بنی لیث میں لڑائی ہوئی۔
بنی دیل نے اپنے حریفوں کے ایک شخص کو مار ڈالا۔ پھر اس اقرار پر صلح ہو گئی کہ
بنی دیل بنی لیث کو مقتولی کی خون بہا داکرین۔ بنی دیل نے روپیہ فراہم کرنے کی
بہت کوشش کی مگر نہ جمع کر سکے۔ آخر ابو الاسود کے پاس آئے۔ اُس نے یہ کہہ
قبیلہ کی ناک اور دولت مند تھے۔ کسی دہلی نو جوان نے نہایت فصاحت و بلاغت

سے اور بڑے جوش کے ساتھ ان کو آمادہ کرنا چاہا کہ یہ روپیہ دے دین۔ ابوالاسود
بھلا گب دینے والے تھے کہا "تم نے اصرار و الحاح میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔
لیکن میری بھی تو سنو۔ انسان تین موقعوں پر روپیہ دیا کرتا ہے۔ یا تو اس وقت
جب اسے امید ہو کہ جسے دیتا ہوں وہ مجھے ادا کر دے گا۔ یا اُس وقت جبکہ جان
جانے کا اندیشہ ہو اور روپیہ صرف کرنے میں جان بچتی ہو۔ اور یا اُس وقت

جبکہ ثواب آخرت کی امید ہو۔ یہاں اُن میں سے کوئی صورت نہیں ہے۔ اب یہی بات
بات کہ کوئی فریب دے کے اور باتوں میں پھسلا کے مجھ سے کچھ رقم وصول کر لے تو
تھار اچھا (میں) ایسا بے وقوف نہیں ہے کہ دم میں آجائے۔ غرض انھوں نے کچھ
نہ دیا۔ اور وہ لوگ ناکام و نامراد واپس گئے۔

۴
۵
۶
۷
۸
۹
۱۰
۱۱
۱۲
۱۳
۱۴
۱۵
۱۶
۱۷
۱۸
۱۹
۲۰
۲۱
۲۲
۲۳
۲۴
۲۵
۲۶
۲۷
۲۸
۲۹
۳۰
۳۱
۳۲
۳۳
۳۴
۳۵
۳۶
۳۷
۳۸
۳۹
۴۰
۴۱
۴۲
۴۳
۴۴
۴۵
۴۶
۴۷
۴۸
۴۹
۵۰
۵۱
۵۲
۵۳
۵۴
۵۵
۵۶
۵۷
۵۸
۵۹
۶۰
۶۱
۶۲
۶۳
۶۴
۶۵
۶۶
۶۷
۶۸
۶۹
۷۰
۷۱
۷۲
۷۳
۷۴
۷۵
۷۶
۷۷
۷۸
۷۹
۸۰
۸۱
۸۲
۸۳
۸۴
۸۵
۸۶
۸۷
۸۸
۸۹
۹۰
۹۱
۹۲
۹۳
۹۴
۹۵
۹۶
۹۷
۹۸
۹۹
۱۰۰
۱۰۱
۱۰۲
۱۰۳
۱۰۴
۱۰۵
۱۰۶
۱۰۷
۱۰۸
۱۰۹
۱۱۰
۱۱۱
۱۱۲
۱۱۳
۱۱۴
۱۱۵
۱۱۶
۱۱۷
۱۱۸
۱۱۹
۱۲۰
۱۲۱
۱۲۲
۱۲۳
۱۲۴
۱۲۵
۱۲۶
۱۲۷
۱۲۸
۱۲۹
۱۳۰
۱۳۱
۱۳۲
۱۳۳
۱۳۴
۱۳۵
۱۳۶
۱۳۷
۱۳۸
۱۳۹
۱۴۰
۱۴۱
۱۴۲
۱۴۳
۱۴۴
۱۴۵
۱۴۶
۱۴۷
۱۴۸
۱۴۹
۱۵۰
۱۵۱
۱۵۲
۱۵۳
۱۵۴
۱۵۵
۱۵۶
۱۵۷
۱۵۸
۱۵۹
۱۶۰
۱۶۱
۱۶۲
۱۶۳
۱۶۴
۱۶۵
۱۶۶
۱۶۷
۱۶۸
۱۶۹
۱۷۰
۱۷۱
۱۷۲
۱۷۳
۱۷۴
۱۷۵
۱۷۶
۱۷۷
۱۷۸
۱۷۹
۱۸۰
۱۸۱
۱۸۲
۱۸۳
۱۸۴
۱۸۵
۱۸۶
۱۸۷
۱۸۸
۱۸۹
۱۹۰
۱۹۱
۱۹۲
۱۹۳
۱۹۴
۱۹۵
۱۹۶
۱۹۷
۱۹۸
۱۹۹
۲۰۰
۲۰۱
۲۰۲
۲۰۳
۲۰۴
۲۰۵
۲۰۶
۲۰۷
۲۰۸
۲۰۹
۲۱۰
۲۱۱
۲۱۲
۲۱۳
۲۱۴
۲۱۵
۲۱۶
۲۱۷
۲۱۸
۲۱۹
۲۲۰
۲۲۱
۲۲۲
۲۲۳
۲۲۴
۲۲۵
۲۲۶
۲۲۷
۲۲۸
۲۲۹
۲۳۰
۲۳۱
۲۳۲
۲۳۳
۲۳۴
۲۳۵
۲۳۶
۲۳۷
۲۳۸
۲۳۹
۲۴۰
۲۴۱
۲۴۲
۲۴۳
۲۴۴
۲۴۵
۲۴۶
۲۴۷
۲۴۸
۲۴۹
۲۵۰
۲۵۱
۲۵۲
۲۵۳
۲۵۴
۲۵۵
۲۵۶
۲۵۷
۲۵۸
۲۵۹
۲۶۰
۲۶۱
۲۶۲
۲۶۳
۲۶۴
۲۶۵
۲۶۶
۲۶۷
۲۶۸
۲۶۹
۲۷۰
۲۷۱
۲۷۲
۲۷۳
۲۷۴
۲۷۵
۲۷۶
۲۷۷
۲۷۸
۲۷۹
۲۸۰
۲۸۱
۲۸۲
۲۸۳
۲۸۴
۲۸۵
۲۸۶
۲۸۷
۲۸۸
۲۸۹
۲۹۰
۲۹۱
۲۹۲
۲۹۳
۲۹۴
۲۹۵
۲۹۶
۲۹۷
۲۹۸
۲۹۹
۳۰۰
۳۰۱
۳۰۲
۳۰۳
۳۰۴
۳۰۵
۳۰۶
۳۰۷
۳۰۸
۳۰۹
۳۱۰
۳۱۱
۳۱۲
۳۱۳
۳۱۴
۳۱۵
۳۱۶
۳۱۷
۳۱۸
۳۱۹
۳۲۰
۳۲۱
۳۲۲
۳۲۳
۳۲۴
۳۲۵
۳۲۶
۳۲۷
۳۲۸
۳۲۹
۳۳۰
۳۳۱
۳۳۲
۳۳۳
۳۳۴
۳۳۵
۳۳۶
۳۳۷
۳۳۸
۳۳۹
۳۴۰
۳۴۱
۳۴۲
۳۴۳
۳۴۴
۳۴۵
۳۴۶
۳۴۷
۳۴۸
۳۴۹
۳۵۰
۳۵۱
۳۵۲
۳۵۳
۳۵۴
۳۵۵
۳۵۶
۳۵۷
۳۵۸
۳۵۹
۳۶۰
۳۶۱
۳۶۲
۳۶۳
۳۶۴
۳۶۵
۳۶۶
۳۶۷
۳۶۸
۳۶۹
۳۷۰
۳۷۱
۳۷۲
۳۷۳
۳۷۴
۳۷۵
۳۷۶
۳۷۷
۳۷۸
۳۷۹
۳۸۰
۳۸۱
۳۸۲
۳۸۳
۳۸۴
۳۸۵
۳۸۶
۳۸۷
۳۸۸
۳۸۹
۳۹۰
۳۹۱
۳۹۲
۳۹۳
۳۹۴
۳۹۵
۳۹۶
۳۹۷
۳۹۸
۳۹۹
۴۰۰
۴۰۱
۴۰۲
۴۰۳
۴۰۴
۴۰۵
۴۰۶
۴۰۷
۴۰۸
۴۰۹
۴۱۰
۴۱۱
۴۱۲
۴۱۳
۴۱۴
۴۱۵
۴۱۶
۴۱۷
۴۱۸
۴۱۹
۴۲۰
۴۲۱
۴۲۲
۴۲۳
۴۲۴
۴۲۵
۴۲۶
۴۲۷
۴۲۸
۴۲۹
۴۳۰
۴۳۱
۴۳۲
۴۳۳
۴۳۴
۴۳۵
۴۳۶
۴۳۷
۴۳۸
۴۳۹
۴۴۰
۴۴۱
۴۴۲
۴۴۳
۴۴۴
۴۴۵
۴۴۶
۴۴۷
۴۴۸
۴۴۹
۴۵۰
۴۵۱
۴۵۲
۴۵۳
۴۵۴
۴۵۵
۴۵۶
۴۵۷
۴۵۸
۴۵۹
۴۶۰
۴۶۱
۴۶۲
۴۶۳
۴۶۴
۴۶۵
۴۶۶
۴۶۷
۴۶۸
۴۶۹
۴۷۰
۴۷۱
۴۷۲
۴۷۳
۴۷۴
۴۷۵
۴۷۶
۴۷۷
۴۷۸
۴۷۹
۴۸۰
۴۸۱
۴۸۲
۴۸۳
۴۸۴
۴۸۵
۴۸۶
۴۸۷
۴۸۸
۴۸۹
۴۹۰
۴۹۱
۴۹۲
۴۹۳
۴۹۴
۴۹۵
۴۹۶
۴۹۷
۴۹۸
۴۹۹
۵۰۰
۵۰۱
۵۰۲
۵۰۳
۵۰۴
۵۰۵
۵۰۶
۵۰۷
۵۰۸
۵۰۹
۵۱۰
۵۱۱
۵۱۲
۵۱۳
۵۱۴
۵۱۵
۵۱۶
۵۱۷
۵۱۸
۵۱۹
۵۲۰
۵۲۱
۵۲۲
۵۲۳
۵۲۴
۵۲۵
۵۲۶
۵۲۷
۵۲۸
۵۲۹
۵۳۰
۵۳۱
۵۳۲
۵۳۳
۵۳۴
۵۳۵
۵۳۶
۵۳۷
۵۳۸
۵۳۹
۵۴۰
۵۴۱
۵۴۲
۵۴۳
۵۴۴
۵۴۵
۵۴۶
۵۴۷
۵۴۸
۵۴۹
۵۵۰
۵۵۱
۵۵۲
۵۵۳
۵۵۴
۵۵۵
۵۵۶
۵۵۷
۵۵۸
۵۵۹
۵۶۰
۵۶۱
۵۶۲
۵۶۳
۵۶۴
۵۶۵
۵۶۶
۵۶۷
۵۶۸
۵۶۹
۵۷۰
۵۷۱
۵۷۲
۵۷۳
۵۷۴
۵۷۵
۵۷۶
۵۷۷
۵۷۸
۵۷۹
۵۸۰
۵۸۱
۵۸۲
۵۸۳
۵۸۴
۵۸۵
۵۸۶
۵۸۷
۵۸۸
۵۸۹
۵۹۰
۵۹۱
۵۹۲
۵۹۳
۵۹۴
۵۹۵
۵۹۶
۵۹۷
۵۹۸
۵۹۹
۶۰۰
۶۰۱
۶۰۲
۶۰۳
۶۰۴
۶۰۵
۶۰۶
۶۰۷
۶۰۸
۶۰۹
۶۱۰
۶۱۱
۶۱۲
۶۱۳
۶۱۴
۶۱۵
۶۱۶
۶۱۷
۶۱۸
۶۱۹
۶۲۰
۶۲۱
۶۲۲
۶۲۳
۶۲۴
۶۲۵
۶۲۶
۶۲۷
۶۲۸
۶۲۹
۶۳۰
۶۳۱
۶۳۲
۶۳۳
۶۳۴
۶۳۵
۶۳۶
۶۳۷
۶۳۸
۶۳۹
۶۴۰
۶۴۱
۶۴۲
۶۴۳
۶۴۴
۶۴۵
۶۴۶
۶۴۷
۶۴۸
۶۴۹
۶۵۰
۶۵۱
۶۵۲
۶۵۳
۶۵۴
۶۵۵
۶۵۶
۶۵۷
۶۵۸
۶۵۹
۶۶۰
۶۶۱
۶۶۲
۶۶۳
۶۶۴
۶۶۵
۶۶۶
۶۶۷
۶۶۸
۶۶۹
۶۷۰
۶۷۱
۶۷۲
۶۷۳
۶۷۴
۶۷۵
۶۷۶
۶۷۷
۶۷۸
۶۷۹
۶۸۰
۶۸۱
۶۸۲
۶۸۳
۶۸۴
۶۸۵
۶۸۶
۶۸۷
۶۸۸
۶۸۹
۶۹۰
۶۹۱
۶۹۲
۶۹۳
۶۹۴
۶۹۵
۶۹۶
۶۹۷
۶۹۸
۶۹۹
۷۰۰
۷۰۱
۷۰۲
۷۰۳
۷۰۴
۷۰۵
۷۰۶
۷۰۷
۷۰۸
۷۰۹
۷۱۰
۷۱۱
۷۱۲
۷۱۳
۷۱۴
۷۱۵
۷۱۶
۷۱۷
۷۱۸
۷۱۹
۷۲۰
۷۲۱
۷۲۲
۷۲۳
۷۲۴
۷۲۵
۷۲۶
۷۲۷
۷۲۸
۷۲۹
۷۳۰
۷۳۱
۷۳۲
۷۳۳
۷۳۴
۷۳۵
۷۳۶
۷۳۷
۷۳۸
۷۳۹
۷۴۰
۷۴۱
۷۴۲
۷۴۳
۷۴۴
۷۴۵
۷۴۶
۷۴۷
۷۴۸
۷۴۹
۷۵۰
۷۵۱
۷۵۲
۷۵۳
۷۵۴
۷۵۵
۷۵۶
۷۵۷
۷۵۸
۷۵۹
۷۶۰
۷۶۱
۷۶۲
۷۶۳
۷۶۴
۷۶۵
۷۶۶
۷۶۷
۷۶۸
۷۶۹
۷۷۰
۷۷۱
۷۷۲
۷۷۳
۷۷۴
۷۷۵
۷۷۶
۷۷۷
۷۷۸
۷۷۹
۷۸۰
۷۸۱
۷۸۲
۷۸۳
۷۸۴
۷۸۵
۷۸۶
۷۸۷
۷۸۸
۷۸۹
۷۹۰
۷۹۱
۷۹۲
۷۹۳
۷۹۴
۷۹۵
۷۹۶
۷۹۷
۷۹۸
۷۹۹
۸۰۰
۸۰۱
۸۰۲
۸۰۳
۸۰۴
۸۰۵
۸۰۶
۸۰۷
۸۰۸
۸۰۹
۸۱۰
۸۱۱
۸۱۲
۸۱۳
۸۱۴
۸۱۵
۸۱۶
۸۱۷
۸۱۸
۸۱۹
۸۲۰
۸۲۱
۸۲۲
۸۲۳
۸۲۴
۸۲۵
۸۲۶
۸۲۷
۸۲۸
۸۲۹
۸۳۰
۸۳۱
۸۳۲
۸۳۳
۸۳۴
۸۳۵
۸۳۶
۸۳۷
۸۳۸
۸۳۹
۸۴۰
۸۴۱
۸۴۲
۸۴۳
۸۴۴
۸۴۵
۸۴۶
۸۴۷
۸۴۸
۸۴۹
۸۵۰
۸۵۱
۸۵۲
۸۵۳
۸۵۴
۸۵۵
۸۵۶
۸۵۷
۸۵۸
۸۵۹
۸۶۰
۸۶۱
۸۶۲
۸۶۳
۸۶۴
۸۶۵
۸۶۶
۸۶۷
۸۶۸
۸۶۹
۸۷۰
۸۷۱
۸۷۲
۸۷۳
۸۷۴
۸۷۵
۸۷۶
۸۷۷
۸۷۸
۸۷۹
۸۸۰
۸۸۱
۸۸۲
۸۸۳
۸۸۴
۸۸۵
۸۸۶
۸۸۷
۸۸۸
۸۸۹
۸۹۰
۸۹۱
۸۹۲
۸۹۳
۸۹۴
۸۹۵
۸۹۶
۸۹۷
۸۹۸
۸۹۹
۹۰۰
۹۰۱
۹۰۲
۹۰۳
۹۰۴
۹۰۵
۹۰۶
۹۰۷
۹۰۸
۹۰۹
۹۱۰
۹۱۱
۹۱۲
۹۱۳
۹۱۴
۹۱۵
۹۱۶
۹۱۷
۹۱۸
۹۱۹
۹۲۰
۹۲۱
۹۲۲
۹۲۳
۹۲۴
۹۲۵
۹۲۶
۹۲۷
۹۲۸
۹۲۹
۹۳۰
۹۳۱
۹۳۲
۹۳۳
۹۳۴
۹۳۵
۹۳۶
۹۳۷
۹۳۸
۹۳۹
۹۴۰
۹۴۱
۹۴۲
۹۴۳
۹۴۴
۹۴۵
۹۴۶
۹۴۷
۹۴۸
۹۴۹
۹۵۰
۹۵۱
۹۵۲
۹۵۳
۹۵۴
۹۵۵
۹۵۶
۹۵۷
۹۵۸
۹۵۹
۹۶۰
۹۶۱
۹۶۲
۹۶۳
۹۶۴
۹۶۵
۹۶۶
۹۶۷
۹۶۸
۹۶۹
۹۷۰
۹۷۱
۹۷۲
۹۷۳
۹۷۴
۹۷۵
۹۷۶
۹۷۷
۹۷۸
۹۷۹
۹۸۰
۹۸۱
۹۸۲
۹۸۳
۹۸۴
۹۸۵
۹۸۶
۹۸۷
۹۸۸
۹۸۹
۹۹۰
۹۹۱
۹۹۲
۹۹۳
۹۹۴
۹۹۵
۹۹۶
۹۹۷
۹۹۸
۹۹۹
۱۰۰۰

چلے جاتے۔ بعض کبھی آنے کا قصد کرتے مگر جب دیکھتے کہ جگہ تو یہی نہیں کوئی بیٹھے تو کمان نام ہو کے چلے جاتے۔ ایک شعل گھوڑے پر سوار جا رہا تھا۔ آپ نے کھانے کی صلاح کی۔ اُس نے غالباً ان کے شانے کے لیے ارادہ کیا کہ گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے کھائے۔ گھوڑے کو چوڑے سے ملا کے کھڑا کیا۔ اور کھانے لگا۔ ابوالاسود اُس کے اس فعل کو ناگوار ہی کے ساتھ دیکھ رہے تھے کہ گھوڑا بھڑکا اور وہ اُس کی پیٹھ پر سے اُٹھنے کے اس زور سے سر کے بل گر کر گردن ٹوٹ گئی۔

مگر ایک نوجوان شخص نے جو پیدل جا رہا تھا بڑی دلگی کی۔ جیسے ہی ابوالاسود نے کھانے کی صلاح کی اُس نے اُسے اُس کا قصد کیا اور جب دیکھا کہ چوڑے پر جگہ ہی نہیں ہے تو بے تکلف سارے خوان کو چوڑے پر سے اُٹھائے نیچے سڑک پر رکھ لیا۔ اور کھانے لگا۔ ابوالاسود چڑبڑتے اور حیران ہو ہو کے اُسے دیکھ رہے تھے کہ اُس نے کہا ”آپ دیکھتے کیا ہیں؟ کھانا ہو تو نیچے اُتر آئیے۔“ آخر یہ بڑی مذمت سے اُتر کے بیٹھ گئے اور اُس سے کہا ”صاحبزادے! تمہارا نام کیا ہے؟“ اُس نے سسکا کر کہا ”نعمان خلیفہ“ جواب دیا ”بیشک تمہارے بزرگوں نے نہایت ہی مناسب نام رکھا ہے“ ایک اعرابی نے بڑی دلگی کی۔ ابوالاسود اپنے دروازے کے چوڑے پر کھانا کھا رہے تھے کہ اُس نے اُس کے سلام کیا۔ اور بے پوچھے اوپر اُس کے کھڑے ہی کھڑے کھانے لگا۔ اور یہ ہاتھ روک کے اُس کی بے باک یوں کو دیکھنے لگے۔ اس نے کھاتے میں کہا ”میں آپ کے گھر ہی کی طرف سے آ رہا ہوں“ یہ تھے تو اپنے ہی گھر پر مذاق! کہا ”ہاں تمہارا گھر اُسی طرف ہو گا؟“ بولا ”جی ہاں۔“ بلکہ آپ کی جو روحانہ تھنین

اُنھوں نے کہا ”ہاں میں اُنھیں حاملہ ہی چھوڑ آیا تھا“ بولا ”تو وضع حمل ہو چکا؟“ کہا ”ہونا ہی چاہیے تھا“ بولا ”اور دو بچے ہوئے؟“ ہاں مان کی حالت سب سے پہلی ہی ظاہر ہوتا تھا ”بولا“ دونوں بچوں میں سے ایک مر گیا“ کہا ”افسوس۔“ دودو کو دودھ نہ ملا سکی ہو گی“ بولا ”پھر وہ دوسرا بچہ بھی مر گیا؟“ کہا ”بھائی کے مرنے کے بعد بھلا کیا جینا؟“ بولا ”اور مان بھی مر گئی؟“ کہا ”دودو بچوں کا قصہ یہ کہیے نہ رہ جاتی؟“ جب ان سب باتوں کا ابوالاسود پر کوئی اثر نہ ہوا اور جیسے بیٹھ تھے ویسے ہی بیٹھے رہے تو اپنی خمرات سے تنگ اُس کے کہنے لگا ”مگر آپ کا کھانا بہت ہی لذیذ ہے“ اُنھوں نے ہنسنے کے کہا ”اسی لیے تم اکیلے کھا گئے مجھے تو

خدا کی قسم چکینے کی بھی زبست نہیں آئی۔ آخر وہ تمام برتنوں کو صاف کر کے چلایا اور یہ بچہ کے پیٹھے رہ گئے۔

ان کی ایک لونڈی تھی لطیفہ۔ اور اُس لونڈی کا بھی ایک غلام تھا جو علم کے نام سے مشہور تھا اور تجارت وغیرہ کی وجہ سے دولت مند ہو گیا تھا۔ لطیفہ نے اپنے اس غلام کو دولت مند دیکھ کے اُس کے لیے ایک لونڈی خریدی اور اُس کے ساتھ اُس کا عقد نکاح کر دیا۔ اُن دونوں سے ایک بچہ ہوا جس کا نام زید رکھا گیا۔ اس بچہ کو لطیفہ بہت ہی عزیز رکھتی تھی۔ اور جب وہ بڑا ہوا تو اُسی کو اپنی ساری جائیداد کا مختار اور منظم مقرر کر دیا۔ چند روز کے بعد لطیفہ بیمار ہو کے مر گئی۔ اُس کے مرنے ہی ابوالاسود نے ساری جائیداد پر قبضہ کر لیا مزید سے حساب طلب کر کے جو کچھ وہ بچہ اُس کے پاس تھا سب چھین لیا۔ اور اُسے ایسا محتاج اور فقیر کر دیا کہ بصرے کی گلیوں میں ٹھوکرین کھاتا پھرتا تھا اور انھیں ترس نہ آتا تھا۔

اسی بخل اور کج روی بن بنام ہونے کا یہ نتیجہ تھا کہ اکثر پڑوسیوں سے بگاڑ رہتا۔ اور پاس پڑوس دانے ستانے۔ ان کا مکان بنی دہل مینی انھیں کے اہل قبیلہ میں تھا۔ اور پچھوڑ سے ایک اور شخص کا مکان تھا جس کا دروازہ دوسرے قبیلہ والوں کے محل میں تھا۔ درمیان کی دیوار میں دروازہ لگا تھا جس سے ان کو اور اُس کو دونوں کی آسانی تھی۔ انھیں پشت کی طرف جانا ہوتا تو اُس کے مکان میں سے ہو کے نکل جاتے اور اُسے اس محل کی طرف آنا ہوتا تو ان کے گھر میں سے ہو کے چلا جاتا۔ مگر چونکہ ایک شہریر آدمی تھا اور ابوالاسود کی مخالفت پر آمادہ تھا ارادہ کیا کہ بیچ کا دروازہ چھوپ دیا جائے۔ اہل محلہ نے سمجھایا کہ اس میں تمہارا کوئی فائدہ نہیں بلکہ دروازہ بند ہو جانے سے تمہیں اور ابوالاسود دونوں کو تکلیف ہوگی۔ مگر اُس نے ایک نہ مانی۔ اور دروازہ بند کر ہی کے چھوڑا۔ چند روز میں اُسے تکلیف ہونے لگی۔ اور اب آرزو مند ہوا کہ اب پھر وہ دروازہ کھلے مگر ابوالاسود نے نہ مانا۔ اور گو کہ اُس نے اس غرض کے لیے بڑی بڑی سفارشیں اٹھوایں مگر ابوالاسود نے کسی کی نہ سنی۔ اس کے بعد ان کا ایک ہم قبیلہ یعنی دہلی شخص جو پڑوس ہی میں رہتا تھا دہلی پر آمادہ ہو گیا۔ راتوں کو ان کے گھر میں دھپیلے پھینکا کہ تمام ابوالاسود کے قبیلہ والے

شکایت کی۔ جس پر معزین قبیلہ نے ہمارے اُسے لعنت ملاست کی اور کہا "ابوالاسود
 ہمارے قبیلہ کے عزیز اور بزرگ ہیں تم جو ان کے گھر میں پتھر پھینکتے ہو اس سے کیا
 مل جائے گا؟" اُس نے کہا "میں نہیں خود خدا انھیں سنگسار کر رہا ہے۔ اس لیے کہ وہ
 عزیزوں سے بے پروا اور بخیل ہیں۔" یہ جواب سن کے لوگ مجبور ہو گئے۔ ابوالاسود کو
 جب اس کا حال معلوم ہوا تو انھوں نے محلہ اور قبیلہ ہی کو خبر باد کہہ دی۔ اپنا وہ
 مکان بیچ ڈالا۔ اور بنی ہذیل کے محلہ میں دوسرا مکان مول لیا۔ اس کے بعد کسی نے
 پوچھا "آپ نے اپنا مکان بیچ ڈالا؟" جواب دیا "میں نے مکان کو نہیں بلکہ پڑوس کو
 بیچ ڈالا۔" ان کا یہ جملہ اس قدر پسند کیا گیا کہ عربی میں ضرب المثل ہو گیا۔
 ابوالاسود کو شادی کا زیادہ شوق تھا۔ عرب کی سوسائٹی میں یہ کوئی معیوب
 بات نہ تھی۔ صوفیوں کی وضع کا اتفاق مسلمانوں میں بعد آیا ہے۔ اُس وقت تمام معزین
 اسلام مرد ہوں یا عورت۔ خاندان نبوت سے ہوں یا کبار صحابہ سے یا دوسرے
 ائمہ دین ہوں سب کا طرز عمل یہ تھا کہ جائز طریقہ سے نکاح کرنے حسین عورتوں کو
 پیام دینے اور خوبصورت لڑکیاں رکھنے میں کسی قسم کا عیب نہیں خیال کرتے تھے۔
 یہی عرب کی سادی زندگی تھی۔ اور وہ یہی زندگی تھی جس نے عربوں میں الواعظی پیدا کی۔
 ابوالاسود کی اہلی بی بی ام مکت تھیں جو بنی قشیر کی بی بی تھیں۔ اور بی بی کے
 تعلقات کی وجہ سے انھیں بعض اوقات بنی قشیر میں رہنا بھی پڑا۔ مگر خدائی پیغمبر
 ابوالاسود مخصوص و ممتاز شیعیان علی میں تھے اور بنی قشیر کا سارا قبیلہ مہاجر کا
 طرفدار شیعہ عثمانی تھا۔ اور خود ان کی بی بی بھی شیعہ عثمانی تھیں۔ ان کا
 ان لوگوں میں جاکے رہنا قیامت تھا۔ روز کجٹ ہوتی۔ اور ہر وقت ایک جھگڑا
 رہا کرتا۔ وہ لوگ ان کے ستانے کے بے ان کے سامنے حضرت علی کو برا کہتے۔ آپ پر
 حملہ کرتے۔ انھیں گھڑی گھڑی غصہ دلاتے۔ اور راتوں کو ان کے مکان پر
 ڈھیلے برسایا کرتے۔ صبح کو جب یہ پوچھتے کہ یہ ڈھیلے کون پھینکا کرتا ہے تو جواب
 دیتے کہ ہم میں تو کسی نے ڈھیلے نہیں پھینکے۔ غالباً تمہاری بد عقیدگی اور لامذہبی کی
 وجہ سے خدا ہی انھیں سنگسار کر رہا ہے۔ اس پر ہم ہو کے انھوں نے چند شعر کہے جن میں
 پہلا شعر تو یہ ہے۔

یقول الازدنون بنو قشیر
(ذیل بنی قشیر کہتے ہیں کہ تو کبھی علی کو نہیں بھوتا)

پھر درمیان کا ایک شعر ہے۔

فلان یک چشم رُشد اُصیبہ دست بختی ان کان غیا

اگر ان کی (اہل بیت کی) محبت کوئی خوبی ہے تو وہ مجھے حاصل ہوگی۔ اور اگر وہ غلطی بھی ہو تو میں خطا وار نہیں ہو سکتا۔

اُن کے اس شعر پر بنی قشیر نے اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ خود معویہ نے اعتراض کیا کہ "اس سے تو معلوم ہوا کہ تمہیں محبت اہل بیت کی خوبی میں شبہ ہے" بھلا ابوالاسود کا عالم زبان ایسے اعتراض کے جواب میں خاموش رہ سکتا تھا؟ جواب دیا کیا تمہیں قرآن بھی یاد نہیں رہا؟ اللہ جل شانہ فرماتا ہے "و انا دآناکم علی ہدی اونی ضلالتا میں" (ہم اور تم دونوں یا تو ہدایت پر ہیں اور یا گمراہی میں مبتلا ہیں)

چند روز بعد فاطمہ بنت عمی نام قبیلہ بنی عبد العقیس کی ایک لڑکی سے نکاح کیا۔ جو نہایت ہی حسین و خوب رو اور صاحب جمال تھی۔ آخر عمر میں جب پرہیزگاری ہو گئے اُس وقت پہلی بی بی ام عورت نے تو پوری طرح نہا ہی اور بڑھاپے میں خوب افات کی مگر فاطمہ قنسیہ جو جوان و خوب رو تھی صبر نہ کر سکی اُس نے ان کا ناک میں دم کر دیا۔ اور شب و روز پریشان کیا کرتی۔ جس طرح اُس کو جوانی میں پرہیزگاری شہر کی وجہ سے تکلیف تھی ویسی ہی تکلیف اُس نے ان کو دی اور ان کی دنیا عذاب کر دی۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بھی مرتے دم تک اُس کی جان نہ چھوڑی۔ پریشان ہوتے۔ اور اُس کی شکایت میں اشعار کہتے۔ مگر طلاق نہ دینا تھی نہ وہی۔

بفرس میں جس جگہ ان کی نشست رہا کرتی وہاں سانسے ہی ایک حسین و پرہیزگاری جمال عورت کا مکان تھا۔ اُس نے ان کی عزت و حرمت دیکھ کے خود ہی انھیں شادی کا پیام دیا۔ اور کہا "میں دست کار ہوں۔ خوش انتظام ہوں۔ اور تھوڑے قناعت کر لیتی ہوں۔ تمہیں منظور رہو تو میرا تمہارا نکاح ہو جائے گا" انھوں نے منظور کیا اور فوراً شادی ہو گئی۔ عقد کے بعد وہ ان کے گھر آئی تو بالکل

اپنے بیان کے خلات ثابت ہوئی۔ روپیہ چرا کے غائب کر دیا کرتی اور ان کے اکثر مخفی راز عالم آشکارا کر دیتی۔ آخر مجبور ہو کے انھوں نے اُس کے اُن تمام اغوا کو جو شادی کے دن آئے تھے جمع کیا۔ اور نظم میں اُن سے پوچھا ”جو شخص فریب دے کے کوئی معاہدہ کرالے پھر نقصان پہونچائے۔ اور سمجھانے پر بھی اپنی حرکتوں سے نہ باز آئے اُس کی نسبت تم کیا کہتے ہو؟“ نسب نے کہا ”اُس طرح جو معاہدہ کرایا گیا ہو صحیح نہیں قابلِ فسخ ہے۔“ یہ جواب پا کے بولے ”اس طرح کا معاہدہ کرانے والی تمھاری قوم کی یہ عورت جس سے میں نے عقد کیا ہے۔ لہذا اب میں اُسے تمھارے سامنے طلاق دیتا ہوں۔“ یہ کہہ کے طلاق دے دی۔ اور وہ عزیز دن کے ساتھ اپنے قبیلہ میں لٹی۔

قبیلہ عبدالہقیس کی ایک اور عورت کو بھی اُنھوں نے پیامِ نکاح دیا تھا۔ اس عورت کا نام اسماء بنت زیاد تھا۔ اور اُس کی بہت سی دولت بعض معززین قبیلہ کی امانت میں تھی۔ جس سے ابوالاسود کو بڑی رقم ہاتھ آنے کی امید تھی۔ اسی خیال سے اس تحریک کو راز رکھا۔ مگر اپنے ایک دلی دوست ہنیم سے تذکرہ کر دیا۔ ہنیم ایسا پیٹ کا ہلکا تھا کہ ایک اور نوجوان سے ذکر کر دیا۔ یہ بھی اتفاق کی بات تھی کہ اُسی نوجوان کے ساتھ اسماء کی منگنی ہو چکی تھی۔ خود اسماء ابوالاسود ہنیم کی گھر میں آنا پسند کرتی تھی لیکن قبیلہ کے دباؤ سے جاہلی تھی کہ اُن کے پیام کا واقعہ راز میں رہے اور جب اچھی طرح بحث و پز ہو جائے۔ اور قبیلہ کے معزز لوگ راضی کر دیے جائیں تب نکاح ہو۔ اُس کے پہلے منگیتہ کو جیسے ہی خبر پہونچی قبیلہ کے معزز لوگوں کے پاس دوڑا گیا۔ اور کہا کہ ”اسماء خود دوسری سے ابوالاسود کے ساتھ نکاح کرنے والی ہے۔ جس طرح بنے اُسے روکیے۔ ورنہ آپ کے اختیار سے باطل باہر ہو جائے گی۔ اور ابوالاسود سارا روپیہ آپ سے چھین کے اپنے قبیلہ میں کر لیں گے۔ یہ سنتے ہی سب نے اسماء پر دباؤ ڈالا کہ ابوالاسود کو جواب صاف دے اور اُن کے ساتھ نکاح ہونے کے خیال سے دست بردار ہو۔ ساتھ ہی سب نے زبردستی اُس کا نکاح اُس نوجوان کے ساتھ کر دیا اور ابوالاسود منہ دیکھ کے رہ گئے۔“

اس پر جو اشعار اُنھوں نے کہے ہیں اُن میں ہنیم کی راز افاش کر دینے کی شکایت کی ہے

اسی طرح ایک بار آپ بنی حنیفہ کی ایک حسین عورت پر فریفتہ ہوئے۔ اور بڑے ذوق و شوق سے جا کے اُسے پیام دیا۔ اُس نے ان کی درخواست قبول کر لی۔ سب باتیں طے کر کے باہر نکلے تو اُس کے ایک ابن عم نے گھر سے نکلے دیکھ لیا۔ پوچھا "حضرت یہاں کہاں؟" کُنا تھا اسی منٹ عم کو نکاح کا پیام دینے آیا تھا۔ اور اچھر مُدّ کہ اُس نے میری درخواست قبول کر لی۔ اس شخص کا چھوٹا بھائی اُس لڑکی پر عاشق اور اسکی آرزو میں نیجان ہو رہا تھا۔ جیسے ہی یہ خبر سنی بنی حنیفہ میں دوڑا گیا۔ اور سارے قبیلہ والوں کو خبر کر دی۔ انھوں نے کُنا پر ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ابوالاسود ہمارے قبیلہ کی لڑکی کو بیجا ملین۔ چنانچہ انھوں نے ایک شخص کو خاص اس کام پر مامور کیا کہ ابوالاسود جب کبھی بنی حنیفہ کی کسی صحبت میں آئیں انھیں چھڑے ستاے اور ذلیل کرے۔ اس کے ساتھ انھیں طرح طرح کی دھمکیاں بھی دینا شروع کیں۔ خلاصہ یہ کہ بچا رس کو اس حسد کی آرزو سے بھی دست بردار ہونا پڑا۔

انھوں نے ایک لونڈی خریدی جو شکل صورت میں تو بہت اچھی تھی لیکن آنکھوں میں ذرا کجی تھی جسے لوگ ہنکھی کہتے۔ یہ اُس پر غصہ نہ آیا۔ وہ فریفتہ تھی۔ لوگوں نے نام رکھنا شروع کیا کہ آپ ایک ہنکھی لونڈی کے عاشق ہیں۔ اس الزام کا جواب انھوں نے اشعار میں دیا ہے جن میں کہتے ہیں کہ آنکھوں میں ایسا خیف عیب ہونے سے حسن تھوڑے ہی جا تا رہتا ہے؟

ایک بار آپ نے سنا کہ بازار میں کوئی لونڈی بکنے کو آئی ہے جو نہایت ہی حسین و نازنین ہے۔ خود وڑے گئے۔ دیکھا۔ پسند کیا۔ اور گھر آ کے اپنے غلام نافع کو جس کی گینت ابوالصباح تھی روپیہ دے کے بھیجا کہ اس لونڈی کو میرے لیے خرید لاؤ۔ وہ گیا۔ قیمت طے کی۔ اور ممول بھی لے لیا۔ مگر ان کے لیے نہیں بلکہ خود اپنے لیے۔ جب یہ حال سنا تو ہاتھ مل کے رہ گئے۔ غلام بہت غصا ہوا۔ بگڑے۔ اور اُس کی خدمت میں شعر کہے۔ مگر لونڈی جس کی خدمت میں تھی اُس کی ہو گئی۔ ان کو نہ ملی۔

ایک مرتبہ آپ نے ایک لونڈی خدمت کے لیے لی۔ وہ چاہتی تھی کہ بہتری کی عزت حاصل کرے اور انھیں یہ منظور نہ تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ وہ اکثر انھیں

چھڑتی۔ بار بار اُن کا دامن پکڑ لیتی اور اُن کے دل میں جگہ پیدا کرنے کی کوشش کرتی۔ آخر ہنجملا کے انھوں نے اُس کی مذمت میں بھی اشعار کہے۔ اور اُس سے صاف کہہ دیا کہ میں نے تجھے خدمت گزاری اور گھر کے کام کاج کے لیے لیا ہے ایسی شرارتوں سے باز آ۔

حکومت عزت شرافت اور علم و فضل نے اُن کے بہت سے دوست پیدا کر دیے تھے لیکن اکثر دوستوں نے انجام میں ایسی بے وفائیاں کیں کہ انھیں اکثر دوستوں سے شکایت رہی۔ سب سے بڑا دوست ابوالجبار دوسلم بن سلمہ ندوی تھا۔ وہ اپنے شعرا انھیں سناتا۔ یہ اپنے اشعار اُسے سناتے۔ اور روز ٹھٹھوں صحبت رہتی۔ اتفاقاً ابوالجبار دوسلمین کا والی مقرر ہو گیا۔ وہاں جا کے انھیں ایسا بھول گیا کہ نہ کبھی کوئی خط بھیجنا نہ قاصد۔ اور انھوں نے جو خط بھیجے تو ان کا جواب بھی نہ دیا۔ ابوالاسود نے اُس کی بے وفائی کو اشعار میں ظاہر کیا ہے۔

اسی طرح کا ایک دوست معاویہ بن صعصعہ تھا۔ جو پہلے دوست صادق تھا پھر ان کی مخالفت کرنے لگا۔ انھوں نے اس کی بے وفائی کا تذکرہ کیا تو اُس نے انکار کیا۔ پھر انھیں اُس کی مخالفت کا حال معلوم ہوا۔ اور پھر اُس نے معذرت کی۔ کئی دفعہ ایسا ہی ہوا۔ اور وہ اس وضع سے باز نہ آتا کہ بیٹھ پیچھے تو برائی کرتا اور سامنے معذرت آخر اُس کی بھی اشعار میں جبری۔

ایک دوست نسیب بن حمید سلمی تھا۔ جو اکثر گھر میں آتا۔ مسجد میں پاس کے بیٹھتا اور قسمیں کھا کھا کے کہتا کہ دنیا بھر میں تم سے بڑھ کے میرا کوئی دوست نہیں ہے۔ ایک دن وہ ایک پوستین بیچنے کے لیے گھر سے لایا۔ انھوں نے پوچھا اس کو کیا کر دے گا بولا "بیچون گا" کہا تو ایک کام کرو۔ بازار میں دکھاؤ۔ جو دام ملے گا مجھ سے لے لو۔ اس لیے کہ مجھے ایک پوستین کی ضرورت ہے۔ اُس نے کہا آپ کو ضرورت ہے تو آپ کی نذر ہے۔ بھلا میں آپ کے ہاتھ بیچون گا؟ لا حول ولا قوۃ انھوں نے کہا "یون تو میں نہ لون گا" اُس نے نہرا نہ اصرار کیا۔ انھوں نے قبول نہ کیا۔ آخر انھوں نے اپنے آدمی کے ہاتھ اس پوستین کو بازار میں دکھایا تو دوسو درہم دام لے۔ انھوں نے پوستین رکھ لی۔ اور دوسو درہم اُس کے پاس

بھیج دیے۔ اُس نے روپیہ واپس کر دیا اور کہلا بھیجا کہ میں تو اڑھائی سو درہم سے کم پر نہ دون گاڑ یہ سن کے انھیں بڑا تعجب ہوا کہ یا تو معفت نذر کر رہے تھے۔ اور یا یہ کج ادائی کہ اڑھائی سو سے کم پر نہ ہوگی۔ چنانچہ اشعار کے ذریعہ سے اُس کی بھی خبر لی۔ مگر یہ نہیں معلوم کہ پوستین لی یا نہیں۔ غالباً نہ لی ہوگی۔ کیونکہ روپیہ کے صرف کرنے میں نہایت ہی محتاط تھے۔

گو کہ زیادہ محتاج نہ تھے لیکن اکثر لوگوں کی مدد اور کفالت کو خوشی سے قبول کرتے بلکہ بعض سے امید و اراعات بھی ہوا کرتے۔ عبدالرحمن بن ابی بکرہ نے ایک بار انھیں شکستہ حال اور کم حشیت کپڑے پہنے دیکھ کے پوچھا "اس خجہ کو آپ کب تک پہنے رہیں گے؟" بولے "اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی چیز سے اکتا تو جاتا ہے مگر مجبور یاں علیحدہ نہیں کرنے دیتیں۔" اس جواب نے ابو بکرہ پر ایسا اثر کیا کہ گھر جانے کچھ نقد اور کپڑوں کے ساتھ ان کے ساتھ بھیجا کہ ان سے اپنا کام چلا لیں۔ انھوں نے نہایت شکر گزار سی کے ساتھ قبول کیا۔ اور ان کی مدد میں شعر خوانی کی۔

حفص بن ابی العجیر عمری اور نعیم بن مسعود ہنسی کی حکومت زیادہ کے زمانے میں مختلف مقامات کے حاکم تھے۔ ابوالاسود سے جو نگر دونوں سے تعلقات تھے لہذا ان دونوں کے پاس آدمی بھیج کے مدد اور کفالت کی خواہش کی۔ نعیم نے تو ان کی آرزو کے مطابق خدمت کی۔ اور ایسا کچھ دیا کہ یہ خوش ہو گئے۔ مگر حفص نے براہِ خود ہو کے ان کا خط پچھے پھینک دیا۔ جو کہ اہل عرب میں سخت تحقیر کرنے کی علامت تھی۔ آدمی نے واپس آ کے جب یہ حال بیان کیا تو ابوالاسود نے حفص کی جو میں چند اشعار کہے جو ان کی زبان سے نکلتے ہی عوام میں مشہور ہو گئے حفص نے جب ان شعروں کو سنا تو نہایت برہم ہوا۔ اور انھیں بڑا بھلا کہا۔ ان کو جب یہ حال معلوم ہوا تو انھوں نے اشعار سے اُس کی اور زیادہ خدمت کی جس نظم نے اُسے بہت ہی بدنام اور ذلیل کر دیا۔

اس سے بڑھ کے اور کیا ہو گا کہ اس کے مددوں بعد اسی حفص کے پوتے عبداللہ قاضی بصرہ تھے۔ کسی شخص نے اُن کے اجلاس میں اپنا دعویٰ پیش کیا۔ دورانِ عقد میں کسی موقع پر سبیل مثیل قاضی عبید اللہ نے ایک شعر پڑھا مدعی نے فوراً بڑھ کے کہا میں

پر شیدہ طور پر عرض کرنا چاہوں۔ "قاضی صاحب نے کان قریب کر کے کہا "فرمائیے" کہا "اس شعر کا چھانا سب سے زیادہ آپ ہی کا کام ہے۔ یہ اُن اشعار میں ہے جو ابوالاسود دؤلی نے آپ کے دادا حصین کی جو مین کے تھے۔" یہ سن کے قاضی عبید اللہ نے۔ اس کا شکریہ ادا کیا۔ پھر دعویٰ جو بالکل بے بنیاد تھا خارج کر دیا۔ اور رقم مستعدیہ اس احسان کے معائنہ میں مدعی کو اپنے پاس سے دلا دی۔

دو صد کا بڑا شوق تھا اور دو ایک دو صد دینے والی اونٹیاں ضرور رہا کرتیں۔ ایک صاحب کو ان کی ایک اونٹنی اتفاقاً پسند آگئی۔ اور اس فکر میں ہوئے کہ کسی طرح اسے ستے داموں ابوالاسود سے لے لیں۔ ایک دن ملنے کو آئے اور اُس اونٹنی کے عیب بیان کرنا شروع کیے کہ اس میں یہ عیب ہے اور یہ خرابی ہے لیکن اگر آپ اسے اپنے پوسلے نکال ڈالیں تو میں اس خیال پر خرید لوں گا کہ آپ بالکل کھائے میں نہ رہیں۔ یہ اُن سے یہی بڑے استاد تھے۔ چنانچہ اُن کی کوئی بات پیش نہ گئی۔ اور ہر بات میں انھیں قائل کر دیا۔ آخر وہ مجبور ہو گئے واپس گئے اور انھوں نے اُن کی ہجو میں بھی چند اشعار کہہ ڈالے۔

شاعری کا بہت زیادہ شوق تھا۔ اور پورا دیوان موجود ہے۔ مگر فارسی اور اردو شعر کا سا دیوان نہیں جس میں مختلف طرح کے بے ضرورت طبع آزمائی کی جاتی ہے۔ اُن کے تمام اشعار و اقوال سچے جذبات اور دلی جوش سے لبریز ہیں جب کوئی واقعہ پیش آتا یا کسی بات کا جوش دل میں پیدا ہوتا اسے اشعار کے ذریعہ سے ظاہر کر ڈالتے۔ اسی وجہ سے اُن کا دیوان ایسا ہے جس سے اُن کے پوری سوانح عمری کا پتہ لگا کے اُن کی لائف مرتب کر لی جاسکتی ہے۔ بخلاف اس کے ہمارے شعر انظم کے حلومار جمع کر دیتے ہیں جن میں اُن کی زندگی اور اُن کے حالات کو کوئی علاقہ نہیں ہوتا۔ اور اگر سچ پوچھیے تو زندہ اور مردہ شاعری میں یہی فرق ہے۔

روزانہ چارستانہ اور باہر کی سہرے درزش کا فائدہ اٹھانے کی برکت تھی کہ بہت بڑی عمر پائی۔ اور آخر عمر تک ان کے حوصلہ ان میں کسی قسم کا فرق نہیں آنے پایا تھا۔ ضیف الہری میں کسی ضرورت سے ملک فارس کے سفر پر آمادہ ہو گئے۔ یہی ہے کہ "باداجان۔ اب آپ کے قوی دیے نہیں رہے۔ یہ چلتے کا جاڑا اور آپس کو چلے

ہیں۔ جاڑوں کی شدت ذرا کم ہوئے اور قافلوں کی آمد و رفت جاری ہو جائے تب چلے جائیے گا۔ آج کل سفر میں کچھ ڈر لگتا ہے کہ آپ کے دشمنوں کو کوئی صدمہ نہ پہنچ جائے اس کے جواب میں انھوں نے اپنے چند شعر پڑھے جن میں ظاہر کیا ہے کہ موت کا وقت مقرر ہے انسان کو راضی بہ رضا رہ کے صبر و تحمل سے کام لینا چاہیے۔ الغرض بیٹی کا کسنا نہ مانا اور کوچ کی تیاریاں کر دیں۔

وہاں سے واپس آنے کے بعد فوج گرا۔ جس نے بہت کچھ معذور کر دیا۔ مگر پھر بھی روٹا باہر کی ہوا کھاتے۔ اور جس طرح بننا شہر کا ایک چکر مزدور لگا بیٹے۔

اُن کی اولاد کے متعلق صرف اس قدر پتہ لگ سکا کہ ایک بیٹا تھا اور ایک بیٹی۔ بیٹے کا نام نوابو حرب تھا۔ مگر بیٹی کا نام نہیں معلوم۔ غالباً یہی بیٹی تھی جس کی زبان کی غلطی دیکھ کے حضرت علیؑ کے پاس دوڑے گئے۔ اور علمِ نحو کے اتھرائی اصول حاصل کیے تھے۔ اور اُسی نے آخر عمر میں سفر فارس سے روکا تھا۔

خود ابوالاسود کی قناعت و خانہ نشینی کا اُن کے بیٹے ابوالحرب پر بھی اثر پڑ گیا۔ چنانچہ انھوں نے بھی باپ کی طرح دنیا طلبی اور کسبِ معیشت میں غفلت کرنا شروع کی۔ یہاں تک کہ اُن کا ہاتھ پر ہاتھ رکھ کے بیٹھ رہنا ابوالاسود کو ناگوار گزرنے لگا۔ ابو حرب نہ کہیں نوکری کرتے۔ نہ کسی قسم کی تجارت کرتے۔ اور نہ کوئی ذریعہ تحصیلِ زر کا رکھتا۔ اس پر ابوالاسود نے انھیں سرزنش کی تو کہا "میری قسمت میں جو ہے ہو گا۔ اور جو کچھ ملے والا ہے ہر طرح مل جائے گا۔ اس کے جواب میں ابوالاسود نے یہ دو شعر کہے۔

وَمَا تَلْبُ الْعَيْشَةَ بِالْمَتَى وَلَكِنْ الْفَقْرَ دَوَّلُكَ فِي الدَّلَامِ
معاش کو تلاش کرنا کسی چیز کو زبردستی چاہنا نہیں ہے بلکہ لوگوں کے دُولوں کو دیکھ کر
تم بھی اپنا دُول ڈال دو۔

جنگ بلبلیا یوما ویوما جنگ بجاۃ وقلیل ما
ایک دن تو وہ پانی سے بھرا ہوا آئے گا اور ایک دن اُس میں زیادہ کالی مٹی
اور تھوڑا سا پانی ہو گا۔

آخر ۵۸ برس کے ہو کے ۶۰ سالہ میں مرضِ موت میں مبتلا ہوئے مرنے وقت لوگوں نے کہا "آپ کو ہم مغفرت اور نجات کی خوشخبری دیتے ہیں" ٹھنڈی سانس سانس

جواب دیا "افسوس۔ ایسی زندگی کہاں سے لاؤں جس سے مغفرت کی امید ہو۔" عام
 راسے یہ ہے کہ طاعون جارف میں جہان اور بہت سی خلقت نذر اجل ہوئی انھوں
 نے بھی سفر آخرت کیا مگر بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس سے پہلے ہی انتقال کر چکے تھے۔
 اس لیے کہ مختار کے عہد میں اُن کا کہیں ذکر نہیں آیا ہے۔ بہر تقدیر ایک عولانی نذر
 بستر کر کے اور حضرت علی جن کی محبت کا مرتے وقت تک دم بھرتے رہے تھے اُن پر اور ان
 محترم خاندان پر طرح طرح کے مظالم اپنی آنکھوں سے دیکھ کے دنیا سے رخصت ہو گئے۔
 اناشد وانا لہ راجعون۔

ماہ اپریل کا موسم کشتیہ

بارخ عالم کی ہر روش پر کھڑے ہو کر ذرا نعتی نظریے دیکھو کہ بیان کے تغیرات انقلاب
 میں کیسے کیسے عبرت خیز حالات مضر ہیں۔ رات کے اختتام پر دن کا جلوہ افروز ہونا اور
 شب و روز اوقات کا بدلتا رہنا دیر پر وہ ثابت کر رہا ہے کہ یہ گردش دہلائی کسی نہایت ہی
 تیز رفتار مشین سے وابستہ ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ دن جو ہم سے رخصت ہو گیا کل
 کے نام سے موسوم ہو کر ہماری ہزار ہا آرزوؤں کو دوسری آنے والی "کل" کے آغوش میں
 چھوڑ جاتا ہے۔ اور ہم پورے تعلق خاطر کے ساتھ اس امید بھری "فردا" کے منتظر ہو جاتے
 ہیں۔ آخر مالوں کے جھرمٹ میں اور تئناؤں کے پریشان جلوس کے ساتھ وہ کل "آج کا کابلی
 ہن کے سامنے آتی ہے اور ہم جی بھر کے اُس کا کردار دیکھنے بھی نہیں پاتے کہ سارے کام
 ادا ہوئے اور ساری آرزو میں نام چھوڑ کے نظر سے غائب اور اُس نقطہ موسوم سے جا ملتی ہے
 سچ جو دراصل معدومیت کا نشان ہے۔ اسی کل دلی "کل" پر منحصر نہیں اس عالم ناپائدار
 کی ہر رات ہر دن۔ ہر ماہ۔ ہر سال بلکہ سارے عالم ہستی کی انتہائی نقطہ موسوم ہے۔
 مگر اس نقطہ موسوم پر پہنچنے سے پہلے ساری آئندہ حسرتیں آج کے شہ نشین پر
 آکے عجیب عجیب جلوے اور بڑی بڑی پُر لطف کیفیتیں دکھایا کرتی ہیں جن میں سے
 بعض تو ایسی ہوتی ہیں کہ کسی طرح بھولنے ہی کو نہیں آتیں۔ چنانچہ دیکھیں ان کے آگے
 سلسلہ میں ہر سال موسم کا دور بھی ایک وقت معین پر اپنا دیکھتے خواب دکھاتا ہے
 لیکن نگاہ پُرشور اُس سیر سے سیر نہیں ہونے پاتی کہ موسم ہمارا کسی بے در دہمان

شب کی طرح دامن ہاتھ سے چھڑا کے نکل جاتا ہے اور وہ ناتمام سیر ایک خواب پریشان بن کے یاد رہ جاتی ہے۔

انھیں موسمی و پھپھوین میں سب سے زیادہ پُر لطف ہر سال ماہ اپریل میں وادی کشمیر کی ارض مقدس کا سامان ہوتا ہے۔ جہاں زمین غلہ بہشت ہیں کے آسمان پر خشک زلن ہوتی ہے۔ ہر پہاڑ طور سینا بن جاتا ہے۔ سیاحوں اور جمال قدرت کے شہیدانوں سے ”ارنی“ کے نعرے بلند ہوتے ہیں اور اُدھر ہر قلعے سے بعد تکنت آواز آتی ہے کہ ”لن ترانی“ زمین عروسی لباس ہیں کے خاکساری بھول جاتی ہے اور آسمان کی طرف خطاب کر کے کہتی ہے ”تیری پیشانی پر اگر تارے جگمگا رہے ہیں تو میرے دامن کا ہریل بوٹہ اور میرے آنکھوں کی ہر ہر کلی تیری آب و تاب کو ماند کر رہی ہے۔ تیرے سر پر اگر کمکشان کی موتیوں بھری بانگ ہے تو میرے دامن میں لہر لہرا کے بننے والے دریائے جھیل کا لہریا نکلا ہو اسے۔ تیری شفق اگر یلا شب کے رخ زیا پر سرخ فائزہ ملتی ہے تو میرے جن زاروں میں ہر پہاڑ پھوون کا کبریت احمد کھاد کھا کے آخر تک بد بیضا کا معجزہ ظاہر کرتا رہتا ہے۔ مشاطہ قدرت نے اگر تجھے مہر و ماہ کا زیور پہنایا ہے تو تجھے سر سے پاؤں تک ایسے ایسے سیکڑوں جو اہرات سے آراستہ کر کے معشوقہ عالم بنا دیا ہے۔ مانا کہ اُس حضرت رب العزت نے سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ”لولاک لما خلقت الافلاک“ فرما کے تجھ میں ایک کی جگہ چار چاند لگا دیے۔ اور آپ کی سیر سموات دنیا کی اعلیٰ ترین معراج تھی مگر کیا تجھے یہ نہیں یاد رہا کہ جس فخری آدم کی شان میں ارشاد ہوا ہے اُن کے قدموں ساری فضیلت زمین ہی کو حاصل تھی۔ مانا کہ تیری حورین حسن و جمال میں اپنا نظیر نہیں دیکھتے مگر سچ بتا دلکشی اور دلربائی کے جیسے کرشمے کشمیر جنت نظیر کے موشون اور عینو سواد سوز زمین کی پیاری صورتوں نے دکھائے ہیں کبھی کسی عروس فلک کو کبھی یہ نہیں ہوئے تھے؟ تیرے ہاروت و ماروت آج تک دنیا میں اسیر ہیں اور دنیوی دلرباؤں کی کشش حسن کا ثبوت دے رہے ہیں بھلا تیرے بالا خانے پر بھی کوئی ایسا دلدادہ ارض ہے جسے کسی حور نے اپنے کندگیو میں اکجھا کے اوپر پہنچ لیا ہو؟ افسوس تاروں کی آنکھیں دن کو نہیں کھلتیں ورنہ دیکھتے کہ مشاطہ قدرت پیری عروس مبارک کی زرب و زمیت کے لیے کیسے کیسے سامان کر رہی ہے؟ کالی گھٹائیں اس اہر عساکر کا کل

پہچان میں جنھوں نے اپنی لمبی اور نہ سلجھنے والی کندھیں اسیر کر کے ایک عالم کو پریشان کر رکھا ہے۔ وہ اس لباس کو اس دربار نامین کا چہرہ زیبایاں جو صد ہا رنگ کے زیور مرصع سے آراستہ ہے۔ اور اس معشوقہ ماہ طلعت پر بچاؤ کرنے کے لیے موتی برسا رہا ہے۔ جنھیں مشاطہ ہمارے جمع کر کے اس کے نازک اعضا پر آراستہ کرتا اور اس کے ہشتی محلون میں نالگتی جاتی ہے۔ اس خطبے نظیر کی ساری زمین پر عروس ہمار کی سیر و تفریح کے لیے سبز سے اپنا قلمیں فرش بچھا دیا ہے۔ جو ہر جگہ ایک نئی شان اور نئی آن بان سے رنگ بدلتا اور صناعان قدرت کی جدت طرازیوں کا ثبوت دیتا ہے۔ اگر سرسوں کے کھیتوں میں یہ فرش بستی ہو گیا ہے تو اسی کے کھیتوں میں رنگاری ہے۔ کشت زعفران میں سونا برس رہا ہے تو اس کے قریب ہے کسی تختے میں سفید بھونکی اٹلی چادر بچھ گئی ہے۔ پھر ان رنگ رنگ کی زمینوں پر صد ہا رنگ کے پھولوں سے بیل بونے بنائے ہیں جن میں سے ہر ہر پھول اور ہر ہر گلی اپنے حسن پر نازان ہے۔ پھر ان رنگ برنگ زمینوں اور گونا گوں گل آرائیوں پر شبنم کے موتیوں کی سجاوٹ معلوم ہوتا ہے کہ عروس کشمیر کو مشاطہ ہمار نے سر سے پاؤں تک موتیوں سے آراستہ کر دیا ہے ہلکی ہلکی پھو ہار اس معشوقہ کے کپڑوں میں روز موتیوں کی نئی جھالیں ٹانگے یا کرتی ہے درختوں کو دیکھے تو ہر شجر فونہال چمن بنا ہوا ہے۔ دامن کسار میں نمرین و سمن کے گلبن کا اجلا پن ایک نہایت ہی مناسب ترتیب سے اپنے سکون و سکوت کی شان دکھانے کے ناظرین کو محو حیرت بنائے ہوئے ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ گلبن نہیں جلیات ربانی کے مظاہر ہیں۔ اس رنگینی عالم کے زمانے میں جن درختوں میں شکوے نہیں ان کا بھی یہ حال ہے کہ صالحین جنت کا لباس سبز پہن لیا ہے۔ مست خرام ہوا جھونکوں سے خوش ہو ہو کے اپنی برگ و نو اسے حمد باری کا قلمہ گاتے۔ اور بخودی کے ساتھ سروں کو مسجد میں جھکا جھکا کے اٹھاتے ہیں۔ اور اس سے بھی سیر می نہیں ہوتی جھک جھک کے شوقان چمن کا منہ چومتے۔ پھر خوشہ ہاس انگور کے لب میگوں سے لب بلب ہو کے مے ہوشی رہا ہے سیراب ہو کے اس طرح معروہ رقص ہو جاتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے صوفیان پاک باطن پر حال کا عالم طاری ہے۔

آہ اسے فلک ناپا نادر دیکر رنگ سبب کے درختوں کو دیکھنا شگفتہ کلیان ہیں کہ کسی

ماشت کش حسینہ ماہ طلعت کی گوری انگلیاں جن کی نوکین ماشت کے خون میں ڈوب کے باقوت احرار بن گئی ہیں۔ شگفتہ پھول شباب میں ڈوبی ہوئی شہ رخ ادا اور باہمین ہیں۔ اور جو پھول نسیم کی سرد مہری سے زمین پر گر گئے ہیں وہ بھی نازک دل بلبل کے زخم پر ٹپک پاشی کر رہے ہیں۔

زمین اپنی اس خوش نصیبی پر نازان اور آسمان پر طعنہ زنی کر رہی تھی کہ یکایک جن زمین سوسن نے بھد زبان گلاب اور سارے پھولوں کے کان میں کوئی ایسی بات کہہ دی کہ سب کے چہرے اتر گئے۔ مست حسن مردشان جن کے چہروں پر ہوا بیاں چھوٹنے لگیں۔ زرگس کی چشم مخمور میں آنسو بھر آئے۔ سب پھول ہرجا ہرجا کے گلبن سے گرنے لگے اور گلزار کی حالت ہی دگرگون ہو گئی۔ یہ حالت دیکھتے ہی زمین کو اپنے تمام دعوے بھول گئے۔ گجرا گجرا کے ہر شاہد جن سے پریشانی کا سبب ہو چکے تھے۔ آخر کھلا کر سوسن نے آمد خزان کا پیغام سنا کے سارے حسینان جن کو پریشان کر دیا۔ جسے سنتے ہی نونالان جن کا نشہ ہرن ہو گیا۔ اور جسے دیکھتے اس کا چہرہ زرد تھا۔

آہ ایہ ساری بہار اتنی ہی دیر کے لیے تھی۔ ۲۲ روزے گل سیر نہ دیدیم وہاں آخر شد اور کل والی کل نے آج کی صورت اختیار کر کے جو لطف دکھایا تھا ایک چشم زدن بن گیا۔ اسی نقطہ موہوم سے جا ملا جو ہمیشہ مزہ کر کر کر دیا کرتا ہے۔ جانتے ہیں کہ یہ خزان بھی نہ رہے گا۔ چنانچہ نماند خبین نیز ہم خواہر ماند۔ لیکن اس وقت تو سارا مزہ جاتا رہا۔ کیسے عیش و طرب میں مصروف تھے۔ کس طرح شاید آرزو سے ہم آغوش تھے۔ اور کس لطف کے ساتھ تمناؤں اور ارمانوں کی خوش جال پر یوں کوسینے سے پٹاے ہوئے تھے۔ آہ ادم میں کچھ بھی نہ رہا۔ کیا تھا اور کیا ہو گیا ہے

پہلے یہ ہے کہ ان آزار دہ تغیرات و انقلابات سے کوئی نہیں بچا۔ اور مواہدہ ثلثہ میں سے کوئی بھی نہیں جو زمانے کی اس بے رحمی سے محفوظ رہتا ہو۔ یا ان جانگزا اصدات کے اثر سے رنج نہ پاتا ہو۔ یہی انقلاب بتا رہے ہیں اور اسی رد و بدل سے پایا جاتا ہے کہ اس گردش دولائی کا اثرات دن سال و ماہ سب ہی پر پڑتا ہے۔ اور عالم تخلیق میں ہماری نظر کے سامنے تو کوئی ایسا نہیں جسے مصیبت نہ ستاتی ہو۔ ہاں اس کون و فساد اس رد و بدل اور اس حدوث و انقلاب سے اگر کوئی بچا ہے تو وہ کار ساز مطلق جو اس دولائی مشین کو

چلار ہا ہے اور جس کی سرمدی ذات ہمیشہ اپنے اعلیٰ کمالات کے ساتھ یکسان عظمت و جلال سے قائم رہی اور ہمیشہ قائم رہے گی۔ لہذا اسے سرگشتگان وادی حیرت اور اسے دست بڑوسے پناہ مانگنے والو اگر اس پر دو بدل اور ان انقلابات سے بچنا چاہتے ہو تو تم بھی اُسی ذات سرمدی اور اسی ایک حال پر قائم رہتے اور فنا و بقا کی کشمکش سے مبرا و منفرد ہونے والے صنائع مطلق سے قرب حاصل کر دنا کہ تم بھی بہار و خزان کے انقلابات سے مصنون و مامون رہو۔ کیونکہ ہمیں اُس سے جس قدر قرب ہوتی جاسے گی اُسی قدر حدوث و تکوین کی تکلیفوں سے آزاد ہوتے جاؤ گے۔

راقم راجہ شیرعلی خان جاگیردار بھی پورہ۔ راجپورہ

ایک ہندو دربار میں مسلمان امیچی (نمبر ۲)

مولانا گال مدین عبد الزاق فرماتے ہیں "میں آخر ذی الحجہ میں وارد ہجائنگر ہوا تھا۔ ایک بلند عالی شان مکان میں ٹھہرا گیا جان پہچانتے ہی مجھے ایسا آرام ملا کہ سفر کی تھکن سے نہات پائی۔ اور کئی دن تک سستا رہا۔ یہاں تک کہ ماہ محرم کی پہلی تاریخ ہوئی اور میں ایک پُر لطف شہر کی سیر کر رہا تھا اور ایک نہایت ہی عیش و آرام کے گھر میں مقیم تھا۔

یہ ایک ایک دن راجہ کا چر بدار آیا اور بتایا کہ مجھے حضور راجہ صاحب نے یاد فرمایا ہے۔ قحام کے قریب محل میں گیا۔ اور حاضر دربار ہوتے ہی میں نے پانچ خوبصورت کھوڑے اور دو کشتیاں جن میں سے ہر ایک میں نو نو تھان دیباے و مٹھی کے تھے نذر میں۔ اسی وقت راجہ صاحب اپنے چمیل ستون کے دیوانخانے میں بڑی شان و شوکت سے رونق افروز تھے۔ اور اُن کے دونوں جانب برہمنوں اور دیگر معززین دربار کا مجمع کثیر تھا۔ زیرتونی رنگ کے اٹلس کا لباس تھا اور گلے میں سوتیوں کا ایک مالا تھا جس میں ایسے اعلیٰ درجہ کے اور بڑے بڑے موتی تھے کہ جو ہر می بڑی دشواری سے اُن کی قیمت کا اندازہ کر سکتے۔ رنگت گندم گون تھی اور کشیدہ قامت تھے۔ عمر کے لحاظ سے ابھی عنفوان شباب تھا اس لیے کہ وہ مہرہ آغا نہ تھے اور تھوڑی پر ابھی نیک بال نہیں نکلے تھے۔ بہر حال اُن کی

صورت اور وضع قطع میں کوئی ایسی بات تھی کہ حاضرین پر رعب پڑتا تھا۔
 میں نذرانہ پیشکش کرنے کے بعد سر جھکا کے آداب بجالایا۔ جس پر خوش ہو کے
 انھوں نے مجھے اپنے قریب بٹھایا اور جو خط میں نے اپنے بادشاہ کی جانب سے پیش کیا
 تھا اسے اپنے ہاتھ سے لے کے ترجمان دربار کے حوالے کیا۔ پھر مجھ سے کہا "اس بات پر
 میرا دل بہت ہی خوش ہے کہ سلطان اعظم نے اپنا ایک سفیر میرے پاس بھیجا۔ اس
 میں کچھ تو ہوا بند ہونے کی وجہ سے اور کچھ اپنے کپڑوں کے بوجھ سے پریشان اور پسینے
 پسینے ہو رہا تھا۔ میری اس حالت پر ترس لکھا کے راجہ صاحب نے ایک خطائی پٹکھا جو ان کے
 ہاتھ میں تھا میرے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد لوگ ایک کشتی لائے جس میں رکھ کے مجھے
 پانوں کی دو دھولیاں، ۲۰ مثقال کا فور اور دیگر اشیاء وی گئیں جنھیں سے کے
 راجہ سے رخصت ہو کے میں اپنی فرودگاہ پر آیا۔ کھانے کے عوض سید صاحب نے کئی
 چیزیں میرے لیے راجہ صاحب کے وہاں سے روزانہ آتی تھیں جن میں درہندہ،
 ۵۰ مرغان، ۵۰ بن چاول دس سے مراد غالباً اس زمانے کا کوئی چھوٹا وزن ہے،
 ایک سن عی - ایک من شکر اور دو اشرفیان ہوتی تھیں۔ ہفتہ میں دوبار شام کے
 قریب میں راجہ کی باریابی سے سرفراز ہوتا تھا۔ اس موقع پر راجہ صاحب مجھے کسی ناواقف
 سعید شاہر خ ہزاد کے حالات دریافت کیا کرتے۔ اور ہر ضروری میں مجھے پان
 ان کا سال اور کا فور ملا کرتا۔ ترجمان کے ذریعہ سے راجہ صاحب نے مجھ سے فرمایا
 "تمہارے بادشاہ سفیرون کو ساتھ لکھاتے اور ان کے ساتھ کھانا چوسانے تھیں لیکن
 یہاں یہ غیر ممکن ہے۔ اس لیے کہ میں اور تم ساتھ نہیں کھا سکتے۔"
 اس موقع پر قابل مصنف نے ہندوستان کے پان کا تذکرہ کیا ہے اس کے کھانے
 کی ترکیب بتائی ہے۔ اس کے فوائد اور لذت بتائی ہے۔ اور لکھا ہے کہ علاوہ دیگر
 منافع کے پان مقوی بھی بہت زیادہ ہے اور غالباً یہی سبب ہے کہ راجہ کے رولاس میں
 سات سو کے قریب رانیاں اور حریمین ہیں۔ کوئی لڑکا جس کی عمر دس سال سے زیادہ
 ہو محل کے اندر نہیں جانے پاتا۔ اور ہر رانی اور حرم کے متعلق ماناؤں کا ریون
 و فیرو کا خاص ملکہ ہے۔ محل میں دو رانیاں ایک مکان میں نہیں رہ سکتیں۔ بلکہ ہر ایک کا
 مکان اور اس کے ساتھ پکانے والیاں لکھاریاں اور چھوکر یاں سب جدا مقرر ہیں۔

مگر وہیں جب کوئی حسین و پریمی بھال لڑکی نظر آتی ہے تو مان باپ کو راضی کر کے خرید لی جاتی ہے۔ جس کے بعد وہ بڑے نرک و احتشام سے حرم میں لاکے داخل کی جاتی ہے۔ پھر اُسے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ اور اُس کا بہت خیال رکھا جاتا ہے۔

یہاں آنے سے پہلے حبیبین کالی کٹ مین پڑا ہوا تھا جیٹنگر مین ایک عجیب و افسانہ پیش آیا۔ مہاراجہ صاحب کے بھائی نے ایک نیا محل تعمیر کرایا تھا۔ جب وہ تیار ہو گیا تو مہاراجہ اُس کے وزیروں درباریوں۔ اور معززین شہر کی دعوت بڑی دھوم و دھام سے کی۔ سارے شہر کے نقارے بجا رہے تھے اور ٹرہیاں بجانے والے جمع کیے کہ جب کوئی مہمان کھانے کے کمرے میں داخل ہو زور و شور سے بجایا کریں۔ سارے امراء شہر اور کل ارکان دولت اور جاگیردار ایک بڑے ہال میں جمع تھے مگر چونکہ ہندوؤں میں لوگ ایک ساتھ بیٹھ کے نہیں کھا سکتے اس لیے ہر امیر علیحدہ علیحدہ اُٹھا کے اندر چوکے میں لے جایا جاتا اور جیسے ہی وہ اندر قدم رکھتا وہ شخص اُس کے اُسے تلواروں سے کاٹ ڈالتے۔ اور باجوں کے شور و ہنگام میں کسی کی چیخ پکار کی آواز بھی نہ سنی جاتی۔ اس طرح سارے درباری اکثر معزین شہر اور تمام افسران فوج ایک ایک کر کے قتل ہو گئے۔ اور کسی کو خبر نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ سب کے بعد بے مہر بھائی خود مہاراجہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ "اب حضور غریب خانے پر رونق افروز ہو کے ہماری عزت افزائی فرمائیں" چونکہ راجہ کی زندگی تھی اور خدا کو اُس کی جان بچانا تھی اس لیے کہنے لگا "اس وقت میری طبیعت نہیں اچھی ہے۔ میں نہیں آ سکتا۔ تم اور سب لوگوں کو کھلا دو" بھائی کے اصرار پر جب راجہ نے کسی طرح زبول کیا تو وہ خنجر نکال کے جسے جھپٹ لے گیا تھا جھپٹ پڑا اور راجہ پر کئی حربے کر کے اُسے اس طرح ڈھکیلا کہ وہ بے دم ہو کر تخت کے نیچے جا گرا۔ راجہ کو گرتے دیکھ کے دغا باز بھائی سمجھا کہ وہ مر گیا لیکن اس پر بھی اپنے ایک سازشی کو اُدھر بھیجا کہ اُس کی لاش کو کاٹ کے قیمتی قیرہ کر دے اور اُس کا سر کاٹ لائے۔ یوں اپنا پورا اطمینان کر کے وہ محل کے دروازے پر آیا۔ اور تمام لوگوں سے پکار کے کہا "میں نے راجہ اُس کے بھائیوں۔ امیروں۔ وزیروں اور سارے فوجی افسران کو قتل کر ڈالا اور اب تمہارا بادشاہ میں ہوں!"

اُدھر وہ شخص جو راجہ کا سر کاٹنے کو گیا تھا جب تخت کے پیچھے اُس کے قریب گیا

راجہ جو دراصل مراد تھا بلکہ بے دم ہو کے گر پڑا تھا سنبھل بیٹھا اور اپنی تلوار سے اُس پر ایک ایسا بھرپور ہاتھ مارا کہ اُسی جگہ دمیر ہو گیا۔ اتنے میں۔ احمد کا ایک جان نثار دوست بھی آگیا جس نے اپنی تلوار سے اُس کا کام باطل تمام کر دیا اور راجہ اور وہ دونوں زنانے محل میں سے ہو کے باہر نکل گئے۔

اب راجہ کا غاصب اور غدار بھائی ہر طرف سے مطمئن ہو کے عدالت میں اجلاس کر رہا تھا اور لوگوں سے اپنی بادشاہی کا عندے رہا تھا کہ یکایک راجہ نمودار ہوا۔ جس نے مجمع میں آتے ہی باوازد بلند کہا "دیکھو میں زندہ موجود ہوں۔ اس قاتل بد معاش کو فوراً گرفتار کرو" اس آواز کے ساتھ ہی تمام حاضرین دربار غدار مدعی سلطنت پر چھپ پڑے اور دم بھر میں کاٹ کے ڈال دیا۔ اب دریافت کیا گیا تو عام ہوا کہ سارے اعزاء شاہی تمام اخوان سلطنت اور محل و زرا و امرا قتل ہو چکے تھے۔ سواراجہ کے دنالک کے جو اتفاق سے سیلان میں گیا ہوا تھا۔ وہ فوراً آدمی بھیج کے بلوایا گیا اور جتنے لوگ اس سازش میں شریک تھے طرح طرح کے عذابوں سے قتل کیے گئے اور اس آفت سواراجہ کے زندہ بچ جانے پر مہانومی کی تقریب بڑی دھوم دھام سے منائی گئی۔

اس تقریب کے موقع پر مولانا عبدالرزاق بجا نگر میں موجود تھے۔ کہتے ہیں کہ تمام اعیان سلطنت امراء شاہی اور رؤساء اضلاع کو راجہ کی طرف سے حکم گیا کہ مہانومی کے دن رجب کی ۱۴ (ستمبر ۱۹۱۳ء) کو سب لوگ درویشوں حاضر ہوں۔ بڑے بڑے زمیندار اور حکام ساری قلمرو سے جو میں مسینہ کی مسافت تک پھیلی ہوئی تھی بڑے بڑے لشکروں اور ہزاروں ہاتھیوں کے ساتھ نوبت نقارے بجاتے ہوئے آ کے بجا نگر میں جمع ہوئے۔ ان ہاتھیوں پیچھون پر خوبصورت ہوئے تھے جن میں روغن نفت کی پھاریاں مارنے اور آگ برسانے والے سورما بیٹھے ہوئے تھے۔ اور ان ہاتھیوں کو سترندوں سکون اور کانوں غیب غیب قسم کے رنگ برنگ نقش و نگار بنائے گئے تھے۔ اس تاریخ بجا نگر میں اتنا کثیر لشکر اور اتنے ایک ہاتھی جمع ہوئے تھے کہ عرصہ حشر کا سامان بدھ لیا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ بجا نگر کا راجہ کیسی عظمت و جبروت کا راجہ ہو۔

خاص سہانوی کے دن ایک خوبصورت میدان میں غنشنا اور نظر فریب کوشلیں یا برج قائم کیے گئے تھے جو زمین سے دو یا تین زینے بلند تھے جن پر جونی سے نیچے تک انسانوں اور ہر قسم کے جانوروں کی تصویریں نہایت ہی لطافت و نزاکت سے بنائی گئی تھیں۔ ان میں سے بعض برج کی تعمیر میں یہ صنعت رکھی گئی تھی کہ چکر کھاتے تھے۔ اور ان کی گردش سے ہر وقت نظر کے سامنے تصویروں کا ایک نیا نقشہ ہو جایا کرتا تھا۔ میدان کے سامنے ایک بہت ہی بڑی عالیشان اور نوسنری عمارت تھی جس میں ہر طرف ستون تھے اور جو نہایت ہی اہتمام اور کمال نزاکت کے ساتھ آراستہ کی گئی تھی۔ اس کے سب سے اونچے اور نوین درجے پر راجہ کا تخت تھا۔ اس عمارت کے ساتویں درجہ پر کمال رقت سے کچھ جگہ دی گئی جہاں میرے اور میرے ہمراہیوں کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ اس شاہی ایوان اور ان کوشکوں کے درمیان کا حصہ زمین خوب سطح کر کے نہایت ہی خوبی کے ساتھ سجا اور آراستہ کیا گیا تھا۔ یہاں ہر وقت اربابِ افشا کا مجمع رہتا حسین و نازنین اور جوش شباب میں ڈوبی ہوئی دلرباؤں کے طائفے تجربے کو حاضر تھے یہ سب راجہ کے سامنے ایک پردے کے پیچھے تھیں۔ یکایک دونوں جانب سے پردہ اٹھ گیا اور ان نازنینوں نے عجب دل ربائی و ناز آفرینی کی حرکات سے نزاکت کے ساتھ قدم اٹھا اٹھا کے ناچنا شروع کیا اور تمام حاضرین بیخود ہو گئے۔

اس موقع پر نٹوں اور مدار یون نے اپنے کرب دکھا سے جن میں یہ امور قابلِ تہمت تھے سوئی موٹی کڑیوں اور دھنیوں کو جوڑ کے ایک نمبر سا بنایا گیا جس کا ہر درجہ ایک کڑ کا تھا اور مجموعی بلندی دس بارہ گز کے قریب تھی۔ اس نمبر پر ایک بڑا ہاتھی چڑھایا گیا دھنیوں کا عرض ہاتھی کے پاؤں سے کم تھا مگر وہ ہوشیار می کے ساتھ اوپر تک چڑھ گیا۔ اور وہاں پہونچ کے گانے والیوں کی لے پر ناچنے اور گت پر سونڈ ہلانے لگا۔ اسی طرح بڑی بھاری ترازو بنائی گئی جس میں ایک جانب پلٹے پر ایک ہاتھی کھڑا کیا گیا اور دوسرے پلٹے پر اتنے ایک پتھر رکھے گئے کہ ہاتھی والا پلٹرا اٹھ کے بہت بلندی پر پہونچ گیا۔ اور وہاں اسی پلٹے پر سے گت پر ناچنے کو دے اور سونڈ ہلانے لگا۔ اور کچھ دیر تک ہاتھی والا پلٹرا اونچا نیچا ہوتا رہا۔ اسی طرح کے اور کرب دکھا سے گئے۔ اور تین دن تک یہ جشن طرب قائم رہا۔

صبح سے شام تک روزا ایسے ہی لطف اور تماشے نظر آتے۔ اور قصرِ مہر کی محفل گرم رہتی۔ راجہ نے تمام رباب نشاط اور بازگردن کو انعام و اکرام اور جوڑے عطا فرمائے۔ تیسرے دن جب کہ برخواست کا وقت قریب تھا مجھے باریابی کا موقع دیا گیا۔ میں تخت کے سامنے مودب کمر اہو گی تخت شاہی بہت بڑا اور سونے کا تھا جس میں جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ اور اُس کی تیاری میں نہایت نزاکت اور اعلیٰ درجہ کی صفت دکھائی گئی تھی۔ دیکھتے ہی دل کو یقین ہو جاتا کہ ایسا کام سوہندوستان کے اور کسی ملک میں نہ بن سکے گا۔ تخت کے آگے ایک زمینی رنگ کے اطلس کا کاؤ تکیہ تھا جس کے گرد بے ہامو تون کی چار زریاں لگی ہوئی تھیں۔ اس جشن میں تین دن تک اسی تخت پر گاؤستے لگا بیٹھا رہا۔ اور جب مہمانوں کی تقریب اختتام کو پہنچی تو اُس نے تیسرے دن مغرب کے وقت اپنے اس ادنیٰ خادم کو (مجھے) باریابی کی عزت دی۔ میں جب تھکا ہوا ہوتا تو دیکھتا تھا کہ تقریباً اُس گز کا اونچا ایک ربڑ چبوترہ ہے جس پر چار زینے چڑھ کے جاتے ہیں۔ جس گزہ میں یہ چبوترہ ہے اُس کی بھت اور در دیوار میں سونے کے پردوں سے نقش و نگار بنائے گئے ہیں۔ جن میں چھوٹوں کی جگہ جواہرات جڑے ہیں۔ اور پترائے گندہ اور سونے میں عقیقی تلواریں لٹکتی ہیں۔ دل ہوتا تھا۔ جو گل بوٹوں کی وضع میں کات کے سونے کی نیچوں سے در دیوار اور تخت میں جڑے گئے ہیں۔ جن میں چھوٹوں کی جگہ جواہرات جڑے ہیں اور اُس پر راجہ شاہانہ وقار سے رونق افروز تھا۔ اس موقع پر اُس نے مجھ سے سلطان شاہ رخ مرزا اُس کے امرا اہل دربار کے حالات اُس کے لشکر اور اُس کے گھوڑوں کی تعداد دریافت کی۔ سمعہ نقد ہرات اولہ شیراز کے عجائبات پوچھتا رہا۔ میرے حال پر نہایت ہی مہربانی کی۔ اور کہا "میں مغرب چند ہاتھی کچھ خواجہ سرا اور بیان کے بہت سے نادر ہرے ایک ہوشیار ایلچی کی سرفرت تمھارے سلطان کے پاس بھیجے والا ہوں۔"

اسی صحبت میں حاضرین دربار میں سے کسی نے سترجم کے ذریعہ سے پوچھا "یہ چار نفیس سوزن کار قالمین جو کچھ ہوتے ہیں تمھارے وہاں بھی تیار ہو سکتے ہیں؟" میں نے کہا "مکن ہے کہ ایسے ہی اچھے وہاں بھی بن سکیں مگر ایسی چیزوں کے بننے کا ہمارے بیان و دان نہیں ہے۔" راجہ نے میرے اس جواب کو نہایت ہی پسند کیا اور مجھے کچھ نقد انعام بیان اور راجہ کے خاصہ کے کچھ میو جات عطا ہوئے۔

اسی زمانے میں راجہ بجا نگر اور سلطان گلبرگ علاء الدین احمد شاہ بہمنی سے لڑائی چھوڑ گئی۔

مکمل

بیک کی دکان
بیک کے مکمل
نور خیز
از بین
بیک کی دکان
لکھنؤ
اور بھی
عمر ۶۰
وزمانہ
بیک کی دکان
ت کو دکان
ن ہو دکان
نرمائیں
دونوں
ن کی
بیک کی دکان

سلطان مذکور نے جب یہ خبر سنی کہ راجہ کے بھائی نے دغا بازی کر کے تمام وزیروں اور سرداران فوج کو قتل کر ڈالا تو بہت خوش ہوا اور یہ خیال کر کے کہ آج کل راجہ بھائی کزور اور بے دست و پا ہو رہا ہے ایک سفیر بھیج کے راجہ سے سات لاکھ اشرفیان طلب کیں۔ راجہ اس پر بہت برہم ہوا۔ اور کہا "چند آدمیوں کے مار ڈالے جائے۔ میں کزور نہیں ہو سکتا۔ پھر یہ روپیہ کیوں دینا؟ اس کے ساتھ ہی دونوں طرف سے فوج کشی ہو گئی۔ راجہ نے اپنے قابل وزیر دناٹک کو سپہ سالار بنانے کے ساتھ جنگ میں جوقھار ہو کے گلبرگی قلمرو میں تاخت و تاراج کر کے اور اپنے ساتھ بہت سے اسلحہ قلمرو کے امیروں کو لے کے واپس آیا۔ دناٹک کی غیبت میں راجہ نے چند روز کے لیے "ہمایون نیر" نام ایک اور شخص کو وزیر کا قائم مقام مقرر کر دیا تھا۔ یہ نہایت ہی نالائق اور معزور و شکستہ شخص تھا۔ مجھے جو بوسہ خوراک ملا کرتی تھی اُس نے با اختیار ہونے ہی موقوف کر دی۔ مگر جب دناٹک فتح کر کے واپس آیا اور انتظام سلطنت اپنے ہاتھ میں لیا تو میری خوراک بند کرنے پر اُس نے "ہمایون نیر" کو بہت سزا سنائی کی۔ اور اُس کے عوض خزانے کے نام سات ہزار قدام کا ایک چک میرے پاس بھیج دیا۔

انھیں دنوں شہنشاہ دہلی کے پاس سے خواجہ جمال الدین نام ایک بزرگ ایلچی بن کے آئے تھے۔ میری نسبت ہندو گاہ ہرز کے رہنے والے بعض حاسدوں نے مشہور کر دیا کہ میں سلطان شاہ رخ مرزا کا بھجوا ہوا نہیں ہوں بلکہ آپ ہی آپ اُن کا سفیر بن گیا ہوں۔ یہ بات راجہ کے کان تک بھی پہنچی اور نتیجہ ہوا کہ راجہ کا ارادہ تھا کہ مجھے کو اپنی سفارت کے خلعت سے سرفراز کر کے مرزا شاہ رخ کے دربار میں روانہ کرے۔ چنانچہ مجھے رخصت کرتے وقت اُس نے مجھ سے کہا "لوگ کہتے ہیں کہ تم سلطان شاہ رخ مرزا کے سفیر نہیں ہو اگر یہ شبہ نہ پڑ گیا ہوتا تو میں تمھاری بڑی عزت کرتا۔ لیکن اگر کبھی دوبارہ تمھارا بیان آتا ہوا اور مجھے اس بات کا یقین بھی ہو گا تو خاص سلطان کے بھیجے ہوئے ہو تو بیان تمھاری ویسی ہی قدر و منزلت کی جائے گی جیسی کہ میری سلطنت اور میرے رستے کے شایان ہے۔"

اس کے بعد میں رخصت ہو کے واپس روانہ ہوا۔ اور میرا یہ سفر ختم ہوا۔



یہ سن کے اکثر لوگوں کو تعجب ہوگا مگر محققین کا قول ہے کہ ہم کو بر نسبت خود اپنی
جڑے آفتاب کی جو کمال زیادہ معلوم ہے البتہ اگر اس کا تقفیف آسانی سے ہو سے کہ فرض
آفتاب کی قلمرو کمان تک ہے اور اس کا جو کمان سے شروع ہوتا ہے۔ جو شمس میں ہمیشہ
مختلف گاسون کا ایک عظیم الشان تلاطم اور توج رہتا ہے جس کا صرف ہم مشاہدہ ہی نہیں
کر کے بلکہ اس کا رقبہ اور سرعت رفتار تک آسانی سے بتلا سکے ہیں اور کچھ زمانہ سے گاسون
کی نوعیت اور ان کا تناسب بھی ہم پر منکشف ہو گیا ہے۔

شعاع شمسیہ کی تحلیل اسپیکٹر اسکوپ کے ذریعہ سے ہوتی ہے جو علم طبیعیات (فزکس) کا
ایک بہت مشہور اور متداول آلہ ہے جس کے تجارب سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر آفتاب بعض
ایک ذریعہ نور ہی ہوتا۔ اور اس کے چاروں طرف گاسون کا کوئی حلقہ نہ ہوتا جیسا کہ ہمارے
زمین کے چاروں طرف ہے تو ہم کو وہ شعاع آلہ مذکور کے اندر سے دوس قریح کے مختلف
رنگوں کی ایک ہوا پٹی کے مانند نظر آتی مگر دراصل سیانہ میں ہے مختلف الوان قوسی کے
علاوہ کچھ سیاہ دھاری دار خطوط بھی جا بجا اسی روشنی میں ملتے نظر آتے ہیں جس سے صاف
نیچہ نکلتا ہے کہ کچھ اور اشیا بھی بطور حجاب کے ہمارے اود آفتاب کے درمیان حائل ہیں۔ اب اگر
ہم بعض دیگر اشیا کی روشنی بھی اسی آلہ کے ذریعہ سے دیکھیں تو ان میں بھی جگہ جگہ ایسی

خطوط ہم کو نظر آتی ہیں جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ گاسین جو آفتاب کے گرد حائل ہیں اور یہ چیزیں دونوں ایک ہیں۔ اسی آکر "اسپیکٹر اسکوپ" کے ذریعہ سوئم ان گاسین کا درجہ حرارت اور وزن بھی بخوبی دریافت کر سکتے ہیں۔

مذکورہ بالا تجربے کے علاوہ جدید طرق عکاسی کے ذریعے سے آفتاب کی مختلف تصویریں مختلف قسم کی مختلف روشنیوں میں لی گئی ہیں جس سے عجیب عجیب انکشاف ہوئے ہیں۔ آفتاب کی شعاعوں میں ایک خاص قسم کی روشنی شامل ہے جس کو "کیلشیم" کی روشنی کہتے ہیں۔ پس فرض کرو کہ ایک فوٹو گراف کی پلیٹ پر سوئے "کیلشیم" کے اور کسی قسم کی روشنی دوڑا لی جائے اور اس شیشہ سے آفتاب کا فوٹو لیا جائے تو یہ فوٹو خالص "کیلشیم" کی شعاعوں کا لکھا جائے گا۔ اسی اصول پر پروفیسر ہیل نے جو رصد گاہ شمس واقع ماؤنٹ ولسن امیریکا کے ایک مشہور استاد علم ہیئت ہیں ایک آلہ ایجاد کیا ہے جس کا نام "اسپیکٹر وریٹیو گراف" رکھا ہے۔ جس کے ذریعے سے آفتاب کی تصویریں جدید طرق عکاسی کے بموجب صرف ایک ہی روشنی مثلاً "کیلشیم" یا ہائیڈروجن یا کوئلہ وغیرہ کی روشنی میں لی جاسکتی ہیں جن کے ذریعے سے آفتاب کے چاروں طرف خاص خاص رنگ کے حلقے نظر آتے ہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ زمین کی جگہ کا حال بہ نسبت آفتاب کی جو کہ ہم کو بہت کم معلوم ہے۔ گو ہوا کے دو مشہور اخبار یعنی "ٹیمپسٹون" اور "ناٹور" جن ایک مدت دراز سے معلوم ٹھکر یہ کس کو یقین ہو سکتا ہے کہ ایک تیسری چیز یعنی "آرگن" جس کی مقدار ہوا میں انجبرہ ماہیہ سے کسی طرح کم نہیں ابھی پورے بیس سال کا بھی زمانہ نہیں ہوا کہ مشاہدے میں آئی جس کے کاشف مشہور سائنس دان لارڈ ریلے اور سر ولیم ریے ہیں یہی حال گا س "ہلیوم" کا بھی ہے جو اس کے بھی بعد دریافت ہوئی مگر اس کا وجود آفتاب میں بہت پیشتر سے معلوم تھا۔ ہلیوم کے بعد کثرت سے نئی نئی گاسین دریافت ہوئیں مثلاً (۱) نیون (۲) اسکلف پر و فیسر ریے) جس کا نقل مابین ہلیوم اور آرگن کے ہے یعنی ہلیوم سے زیادہ بھاری اور آرگن سے زیادہ ہلکی (۲) "کریپٹن" (۳) "زمین" اگر آرگن بوجھ کی مقدار یعنی سو حصوں میں صرف ایک حصہ ہونے کے اب تک ناپید رہی تو نمبر (۲) و (۳) سبب انتہائی لطافت و رقت کے پردہ راز میں مخفی تھیں۔ نمبر (۲) ہوا کے دس لاکھ حصوں میں ایک حصہ اور نمبر (۳) اس سے بھی بیس گنی زیادہ لطیف و رقیق یعنی ہوا کے دو کروڑ

حصوں میں صرف ایک حصہ ہے۔

ہوا کی بلندی سمندر کی سطح سے ۱۰۰ میل تسلیم کی گئی ہے یعنی اتنے فاصلہ تک ایسے مناظر نظر آتے ہیں جن کے واسطے ہوا کی موجودگی کی ضرورت ہے مثلاً قطب شمالی کا وہ عجیب منظر جو 'آرورا بورلیس' (شفق شمالی) کے نام سے مشہور ہے اور مالک قطب شمالی میں اکثر رات کے وقت نظر آتا ہے۔ حالانکہ اس کا سبب موجات برقیہ کو بتلاتے ہیں۔ اس منظر کی حالت یہ ہے کہ مالک مذکور میں افق شمالی سے روشنی کی دھاریاں سمت الراس تک گھٹتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ لاکھوں شہاب ثاقب لوٹ رہے ہیں۔ بعض اوقات یہ عجیب روشنی بصورت قوسی شرف سے مغرب تک اور بعض اوقات لہر دار شعاعوں میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ اس کا رنگ نارنجی سے لیکر گہرا سرخ ہوتا ہے۔ جب یہی مناظر مالک قطب جنوبی میں نظر آتے ہیں تو شفق جنوبی (آرورا سٹریلیس) کہلاتے ہیں۔ شہاب ثاقب جن کا سبب بعض اجزائے مادی کا ہوا کے ساتھ تصادم ہے ۱۲۵ میل سے زیادہ ارتفاع پر نظر نہیں آتے مگر خواہ عمق ۱۰۰ میل ہو یا ۱۲۵ میل یہ امر کسی طرح متحقق نہیں ہو سکتا کہ اوپر کے طبقوں میں ہوا کی ترکیب اور استخراج کس قسم کا ہے۔ ابر کی انتہائی بلندی صرف ۱۰ میل ہے اور گوبارے ۱۰ میل سے زیادہ بلند یعنی ۱۹ میل تک جاسکتے ہیں مگر ان کی اوسط پرواز ۷ میل سے زیادہ نہیں پس اس سے زیادہ بلندی پر مشاہدہ اور تجربہ کا کچھ دسترس نہیں چل سکتا اور ہمارے معلومات وہاں کی نسبت اگر کچھ ہیں تو زیادہ سے زیادہ دقیق قیاسات کہے جاسکتے ہیں۔ ۷ میل بلندی کے تجارب سے جو دو امر یقینی طور پر کہے جاسکتے ہیں۔ وہ یہ ہیں کہ بخارات مائید وہاں کا لعدم ہیں اور درجہ حرارت جو زمین کی دوری سے تدریجاً کم ہوتا جاتا ہے وہاں پہنچ کے تقریباً قائم ہو جاتا ہے یا ایک معتدبہ فاصلہ تک برابر قائم رہتا ہے۔ درجہ حرارت مقامات مذکور میں نقطہ انجماد (مقیاس سنٹیگرید) سے ۵۵ درجہ پیچے ہے۔

مقامات مذکور تک ہوا میں سبب حرارت آفتاب اور نیز سبب زمین کی حرکت دوری کے برابر توجہ اور تلامر رہتا ہے جس کی وجہ سے نفاثت گاسوں کی ترکیب و استخراج میں کوئی فرق نہیں پڑتا وہ آپس میں خلی خلی رہتی ہیں۔ مگر اس سے زیادہ بلندی پر کی حرارت یا شدت برودت کی وجہ سے ان بالائی اور زیرین موجات کا مین پتہ نہیں چلتا جو

نیچے کی ہوا میں استرجاع کے باعث ہوتے ہیں لہذا حکما کا قیاس ہے کہ زیادہ بلندی پر ہوا استرجاع
ایسا نہیں ہے جیسا سطح کے قریب بلکہ وہاں مختلف گاسین محض اپنے نقل متناسب کے اعتبار سے
تہ بہ تہ قائم ہیں جیسا کہ ہم ایک طرف میں تیل پانی اور پارہ ملا کر اور خوب ہلا کر چھوڑ دین تو
تھوڑی دیر میں یہ تینوں بالکل قائم ہو جائیں گے۔ پس ہماری اس جگہ کے اعلیٰ طبقوں میں
ایک خاص تہ ہائیڈروجن کی ہے جس کے اوپر ہلیوم ہے۔ گزشتہ سال پروفیسر ویکسٹر نے طبقہ
ہائیڈروجن کی موجودگی کی نسبت بہت معقول ثبوت پیش کیے تھے اور فاصلہ کی نسبت قیاساً
کہا تھا کہ ۷ میل پر ہے۔ یہ بھی کہا تھا کہ زبردست قرائن سے کہا جا سکتا ہے کہ بہت بلند طبقوں
میں ایک اور گیس بھی ہے جو اب تک دریافت نہیں ہوئی اور ہائیڈروجن سے بہت زیادہ
ہلکی ہے جس کا نام وہ جیو کاربائیڈ کہلاتے ہیں یعنی زمین کی 'کاربائیڈ' بقابلہ اس گیس کے
جو مثل ہلیوم کے آفتاب میں موجود ہے مگر اب تک زمین پر دریافت نہیں ہوئی البتہ پروفیسر
ٹانسنیٹی کا خیال ہے کہ ان سے اور اس سائنس کی ہوائی پری سے کسی آتش فشان بہانہ
ایک مرتبہ ملاقات ہوئی تھی۔ مگر یہ لطیف و نازک اندام پری عام آنکھوں سے اب تک
غائب اور عام مس سے اب تک دور ہی دور رہتی ہے۔

کہو ارض اور آفتاب کی جو بین ایک بڑا فرق یہ ہے کہ گو ہماری معلومات بعض
اور بین آخر الذکر کی نسبت زیادہ وسیع ہیں مگر اس کی وسعت کا حال ہمیں معلوم نہیں ہم ہلکے
نہیں جانتے اور نہ موجودہ آلات کی مدد سے جان سکتے ہیں کہ قرص کمان تک ہے اور جو
کمان سے شروع ہوتا ہے بلکہ اگر حکم آغستہ منظر کا قول مانا جائے تو قرص کوئی تھے
ہی نہیں محض ایک مرنی دھوکا ہے مگر ہمارا ایشیائی فلسفی و شاعر اس نکتہ کو پہلے ہی لکھ
ہیں ستارے کچھ نظر آتے ہیں کچھ دیتے ہیں دھوکا یہ بازیگر کھلا
مرزا محمد عسکری۔ بی۔ ۱۔

ایک شخص ہم اپنے عزیز و فاضل دوست مرزا محمد عسکری صاحب بی۔ ۱۔ کے نہایت ہی
شکر گزار ہیں جن کی غیبت سے دلگداز کو اس گران بہا مضمون کو شایع کرنے کا موقع ملا۔
اس قسم کے حقائق مضامین کی ہندوستان کو بحد ضرورت ہے۔ ہم نہایت ہی خوش ہوں گے اگر
علم ہیات کے متعلق ہمارے کرم فرما مضامین کا ایک سلسلہ جاری کریں جس کے ذریعہ سے فن
مذکور مکمل طریقہ سے سمجھ میں آسکے امدان لوگوں کی شہادت اور ہمیں جان تک جو کچھ ارضی کو نہیں لکھ

ابن المعتمر

دنیا میں عبرت و نادر آدمی کی جتنی مثالیں دوئمند دین اور ملوک و سلاطین میں ملتی ہیں اور کسی طبقہ کے لوگوں میں نہیں مل سکتیں۔ مانا کہ بادشاہوں کے اونے اونے حالات لوح زمانہ پر ثبت اور اوراق تاریخ میں درج ہو جاتے ہیں اور دوسروں کے حالات کی کسی کو خبر نہیں ہوتی۔ کوئی یہ بھی نہیں جانتا کہ دنیا میں کب اُسے کیونکر چھے۔ اور کب رخصت ہو گئے۔ لیکن پھر بھی اس میں شک نہیں کہ جو لوگ جتنے زیادہ مغرور و سر بہ آؤدہ ہوتے ہیں اُسی قدر زیادہ آماج گاہ حوادث بنتے ہیں، اور مصداق "نزدیکان را بیش بود حیرانی" سب سے زیادہ مصیبت اکثر بڑے لوگوں اور بادشاہوں کو چھیلنا پڑتی ہے۔

"ابن المعتمر" جس کے محترم نام کو ہم نے زیب عنوان بنایا ہے پچ پوچھے تو برا سے نام ہی صاحب دولت و حکومت تھا اُس کا شمار دراصل جادو و بیانون اعلیٰ درجہ کے ادیبوں اور مشہور و مقبول علماء و فضلا میں ہے۔ اُس کی شاعری نے زبان عرب میں نئی جان ڈالی تھی اور اُس کی عمر کا سارا حصہ علمی مشاغل اور اہل علم و فضل کی صحبت میں بسر ہوا تھا۔ صرف ہم ہنگشوں کے لیے تاج و تخت کا گنگار تھا جس کا ایسا سخت خیازہ برداشت کرنا پڑا کہ اُس کی حالت بہت بڑے نامور اداں سلطنت سے بھی زیادہ عبرت ناک ہے۔ اُسے تخت و تاج کا کچھ زیادہ شوق بھی نہ تھا۔ مذاق میں تکنت و خودداری اور حُب جاہ و ہوس سستی کے عوض نیک فطرتی و رحم دلی کا عنصر اس قدر غالب تھا کہ جب اراکین دولت اور عاملہ بغداد نے حاضر ہو کے تاج شہزادری پیش کیا تو کمال بے پروائی سے بولا "میں ایسے تخت و تاج سے باز آیا جو خون ریزی اور قتل و غارت سے ملتا ہو۔ اگر اس کا اطمینان دلایا جائے کہ میری تخت نشینی میں کسی ایک متنفس کا بھی خون نہ بے گاتو بے شک قبول کروں گا ورنہ مجھے خون کا بھرا تخت شاہی نہیں چاہیے۔ حاضرین نے زمین بوس ہو کے عرض کیا کہ "حضور کی مرضی کے موافق ہی ہو گا۔ اور ہم وعدہ کرتے ہیں کہ امیر المؤمنین کی مسند نشینی کے لیے کسی کی کسر تک نہ چھوٹے گی" بے شک یہ وعدہ پورا ہوا۔ اور بغیر اس کے کہ کسی مخالف یا حریف سلطنت کی جان لی جائے وہ سر پر خلافت پر جلوہ افروز ہو گیا۔ لوگوں نے جوش و خروش کے ساتھ اُس کے ہاتھ پر بیعت کی۔ لیکن اس بیعت کو جو بیسی ہی گھنٹے گزرنے پاسے گئے کہ

کسی بدخواہ سلطنت یا باغی خلافت کے عوض خود اُس کی قربانی تخت و تاج پر چڑھا دی گئی۔
بے شرم ترکی ہزاران فوج کے بے رحم ہاتھوں نے اُس کو سرِ شامِ شاہی سے کچلنے کے پیچھے گرا دیا اور
طرح طرح کے عذابوں سے اُس کی جان لی۔

اُس کا پورا نام و نسب عبداللہ بن محمد المعز بن المتوکل بن المعقّم ابن ہرون الرشید
باپ دادا پردادا لکڑوا دادا اور اُن کے بعد دیگر اجداد بڑے بڑے تاجدار اور آل عباس کے
نامور خلیفہ ہوتے آئے تھے۔ پردادا یعنی المعقّم باللہ نے جو عباسیوں کا آٹھواں خلیفہ تھا
عربوں کو بے عیش و طرب میں سرشار و مجبور دیکھ کے نوجوان ترکی و تاتاری غلاموں کی
ایک نئی فوج بھرتی کی۔ اور بغداد کے قریب ہی "سُرمین رُئی" نام ایک نیا شہر بسا کے
اُس میں اُن کا کیسپ قائم کیا۔ ان نئے سپاہیوں کی اطاعت اور خلیفہ کی شفقت و رحمت سے
اس فوج اور اس کے سرداروں کا زور و زبر و بڑھتا گیا یہاں تک کہ شرفاے عرب
خاندان نشین تھے اور حکومت کے تمام اعلیٰ عہدے اسی فوج کے ترکی و تاتاری افسروں کے ہاتھ
میں تھے۔ اور چند روز کے بعد خود خلافت و سلطنت انھیں لوگوں کے قبضہ میں تھی۔ جسے چاہتے
تھے خلافت سے اُتار دیتے اور جس کو چاہتے خلیفہ بنا لیتے۔

بعینہ یہی حال دولت عثمانیہ کا ہوا۔ جہاں اُس خاندان کے دوسرے تاجدار سلطان اور خا
نے سترہ سو عین نو عمر مسیحی اسیروں اور غلاموں کی ایک فوج مرتب کی جن کو اسلامی
عقائد و عثمانی معاشرت کے ساتھ اعلیٰ درجہ کی فوجی تعلیم دی جاتی اور انھیں باور کرا دیا
جاتا کہ سلطان کے سوا دنیا میں نہ اُن کا کوئی عزیز و قریب ہے اور نہ کوئی دوست آشنا۔ اور
اُن کے دیبا میں رہنے کی غرض صرف دشمنانِ خلافت و دین سے لڑنا ہے۔ اُس عہد کے مشہور
ولی اللہ حاجی بکناش نے ان نئے کسں سپاہیوں کو "نئی چری" (نئے سپاہی) کے نام سے نامزد
کر دیا۔ جو لفظ یورپ میں بگڑ کے "جان نزاری" بن گیا۔ اس نئی فوج نے بعد کے زمانے میں
بڑے بڑے کمالات دکھائے۔ اور دولت عثمانیہ کے ابتدائی عروج و اقبال میں سب سے زیادہ
دخل اسی فوج کو تھا۔ لیکن انجام میں ان لوگوں کا زہد اس قدر بڑھا کہ سلطنت اُن کی لوندی تھی
جسے چاہتے بادشاہ بناتے اور جسے چاہتے تخت سے اُتار دیتے۔ مگر دولت عثمانیہ میں آج سے
تقریباً ایک صدی پیشتر سلطان محمود خان نے اس فوج کا استیصال کر دیا۔ اور تخت و
تاج کو ہمیشہ کے لیے اُن سرکش سپاہیوں کے شر سے امن مل گیا۔ مگر دولت عباسیہ میں

کوئی محمود خان نہیں پیدا ہو سکا جو خلافت کو ترکوں کی فتنہ انگیزوں سے مصون و امن کر دیتا۔ چنانچہ ان سانپ کے بچوں (ترکی سپاہیوں) نے اسی مقصد کے لئے جس نے انھیں آستین میں رکھ کے پالا تھا، دوسرے بیٹے المتوکل علی اللہ کو جو عباسیوں کا دوسرا تاجدار تھا کاٹا اور اسے ششماہی میں نہایت ہی بُری طرح تخت و تاج سے جدا کر کے مارا۔ اس ایک ہی واقعہ نے ان میں محسن کشی کا جوش اس قدر بڑھا دیا کہ المتوکل کے بیٹے المنصور کو تخت نشین کر کے چھ ہی مہینہ بعد تخت و تاج سے جدا کر دیا۔ اور اُس کی اولاد کو محروم کر کے اُس کے چچا المستعین باللہ ابن مقصد کو تخت پر بٹھایا جو کہ عباسیوں کا بارہواں خلیفہ تھا۔ مگر ترکوں کا تلون و ترویج و فساد تو ترقی ہی کرتا جاتا تھا المستعین باللہ کو جو کہ صاحب علم اور ذی ہوش و فراست خلیفہ تھا تین ہی سال حکومت کرنا ہی ہوا تھا کہ ترکی سرداران فوج خلافت ہو گئے۔ اور جب دیکھا کہ وہ چار ہی اطاعت نہیں کرتا تو اُسے گرفتار کر کے قید خانے میں بند کر دیا اور اُس کی جگہ متوکل کے دوسرے بیٹے محمد کو وارث سریر جہان بانی بنایا۔ جس نے تخت عباسی پر قدیم رکھتے ہی اپنا لقب المعز باللہ اختیار کیا۔ المعز نہایت ہی حسین و خوب و شخص تھا اور تخت نشینی کے وقت اُس کی عمر ۲۴ سال کی تھی۔ اور یہی اُس شاعر خلیفہ کا باپ ہے جس کے حالات کھنے کے لیے ہم نے قدم اٹھایا ہے۔ اس کی ماں ایک ترک تھی جو حسن و جمال میں فرید زمانہ اور نہایت ہی ممتاز تھی اور اس کے ساتھ نہایت ہی دولت مند تھی۔ مگر خلیفہ مالدار تھی اتنی ہی بیل بھی واقع ہوئی تھی۔ اُس کے بیٹے المعز باللہ نے جب عثمان حکومت ہائے مین کی تو خزانہ خالی تھا۔ اور فوج خواہ مانگ رہی تھی۔ معز نے ماں سے کچھ روپیہ مانگا اُس نے دینے سے قطعی انکار کیا نتیجہ یہ ہوا کہ وہی سرداران ترک جنھوں نے اُسے تخت پر بٹھایا تھا روپیہ کا تقاضا کرتے کرتے براہِ دفعہ ہو گئے اور خلافت میں محسوس ہونے لگی اور المعز کی تخت نشینی کو ساڑھے تین ہی برس ہوئے تھے کہ اُسے پاؤں پکڑ کے سرِ خلافت سے کھینچ لاسے۔ اور باہر دھوپ میں ڈال دیا۔ گرمیوں کا موسم اور دھوپ کی تپش۔ المعز نے پانی مانگا۔ مگر کسی نے نہ دیا۔ اور آخر دھوپ میں مجلس بھلس کے وہ بھوکا پیاسا مر گیا۔ یہ انجام تھا عباسیوں کے تیرھویں خلیفہ کا۔ اب ترکوں نے ۱۵۲۳ء میں واثق باللہ کے بیٹے محمد کو خلیفہ بنایا جس نے المہدی باللہ اپنا لقب اختیار کیا۔

اور سلسلہ خلافت میں چودھوان عباسی خلیفہ ہے۔ اس غریب کو تخت پر بیٹھے پورا سال بھی نہیں ہوا تھا کہ سرداران ترک نے اُس کے تخت سے اُتارنے پر بھی اتفاق کیا اور قصر خلافت پر چڑھ گئے۔ ہندی بہادر آدمی تھا تو اُسے کے باہر نکل آیا اور اُن سے لڑنے لگا مگر کب تک اور کتنوں سے لڑتا۔ آخر ترکوں نے ہاتھ پکڑ کے اُسے گرایا اور اس شدت سے پکچلا اور اُس کا پیٹ دبایا کہ روح پرواز کر گئی۔ ہندی کے بعد ۲۵ھ میں متوکل کا بیٹا علی خلیفہ ہوا جس کا لقب محمد علی اللہ تھا۔ وہ ۲۳ سال تک حکومت کر کے اپنی موت سے مرا۔ یہ پندرھوان عباسی خلیفہ تھا۔ اُس کے بعد ۲۶ھ میں اُس کا بھتیجا احمد بن طلحہ بن متوکل سلطوان وراثت خلافت قرار پایا جس نے اپنا لقب المعتض باللہ قرار دیا۔ اُس کے بعد یکے بعد دیگرے معتض کے دو بیٹے خلیفہ ہوئے جن میں پہلا علی اور دوسرا جعفر تھا۔ علی نے ۲۸ھ میں خلیفہ ہو کے المکتفی باللہ اپنا لقب اختیار کیا۔ اور اُس کے مرنے پر اُس کے بھائی جعفر نے ۲۹ھ میں دارث خلافت قرار پا کے اپنا لقب المعتز باللہ قرار دیا۔ سریرانی کے وقت اُس کی عمر صرف ۱۳ سال کی تھی۔ بنی عباس میں یہ عجیب متلون قسمت خلیفہ تھا۔ تین بار تخت پر بیٹھا اور تینوں بار سلطنت سے محروم کیا گیا جن میں سے کبھی مرتبہ نہایت ہی دولت اور حد درجے کی بے رحمی و بے شرمی کے ساتھ ترک عسکریوں نے ہاتھ سے مارا کیا۔ پہلی تخت نشینی کے ایک ہی سال بعد جبکہ وہ کمسن تھا ترکوں نے اُسے تاج و تخت سے محروم کر کے تیرھویں عباسی خلیفہ المعتز باللہ کے بیٹے عبداللہ بن المعتز کو ۲۹ھ میں تخت نشین کیا۔ جو کہ سلسلہ خلافت میں بنی عباس کا اُنیسواں خلیفہ ہے اور اُسی کے حالات ہم اس وقت بیان کرنا چاہتے ہیں۔

اس کا باپ المعتز جب ترکوں کے ہاتھ سے بھوکا پیاسا مارا گیا ہے اُس وقت اُس کی عمر پانچ چھ سال تھی یا وہ نہ تھی۔ کیونکہ وہ ۳۰ھ یا ۳۱ھ میں پیدا ہوا تھا۔ اور اُس کا باپ المعتز ۳۲ھ میں مارا گیا۔ بچپن ہی میں اُسے زمانے کے ہاتھ سے ایسا عبرت ناک سبق ملا تھا اور یہی نے کسی ہی میں ایسا ہوشیار کر دیا تھا کہ اگرچہ خلافت کے اغوش میں پرورش پائی تھی اور اب ان شہنشاہی میں اُس کا نشوونما ہوا تھا مگر حکومت و امارت سے دل کھٹا ہو گیا۔ علم و ادب کی دنیا میں قدم رکھ کے اُس نے بعض سریر جہان بانی کے اپنے لیے علم و فضل کا اعلیٰ تخت و صونڈھنا شروع کیا جس کے ساتھ اُسے طبی مناسبت تھی۔ اور چند ہی روز کے اندر

علمی دنیا میں اُس کا ایسا سکھ بیٹھ گیا کہ حاکمانِ علم نے سب سے بڑا ادیب اور سب سے بڑا شاعر تسلیم کر لیا۔ اُس کا کلام سہل متع ہو تا۔ الفاظ مانوس اور پیش پا اُنادہ ہوتے۔ بندش کی جتنی اور تشبیہات و استعارات کی جدت ہر شخص کو اُس کا معترف بنا دیتی۔ اس دنیا کی وجہ سے اُس نے عباسی شاہزادوں اور امیروں کی صحبت چھوڑ دی اور شبِ روز علم و فضل اور دنیا کے مشہور و معروف ادیبوں اور شاعروں سے صحبت رہتی۔ اور ان صحبت میں اُسے کچھ ایسا مزہ ملنے لگا کہ امارت و حکومت کی طرف سے باطل بے پروا ہو گیا۔

مگر اس کو کیا کرتا کہ خاندانِ شاہی سے تھا۔ اور آباد اجداد سب جہان بانی کر چکے تھے۔ جب نئے خلیفہ کے انتخاب کا وقت آتا تو لوگوں کی نظر خواہ مخواہ اُس پر پڑ جاتی اس کے ساتھ بد نصیبی یہ کہ ترکی فوج کے صاحب اثر سرداروں نے خلافت کو اپنے ہاتھ کا کھلونا بنالیا تھا۔ اُسے دن بعدِ دین ہی انقلاب نظر آتے کہ ایک خلیفہ تخت سے اتارا اور کمال بے حیاتی کے ساتھ قتل کیا گیا اور دوسرا اُس کی جگہ بٹھا دیا۔ اہل کفری بائبر کے مرنے کے بعد جب خلیفہ کے انتخاب کا وقت آیا تو اکثر امرا و سردار عبد اللہ بن معتر ہی کے طرفدار تھے۔ اور اُس کی علمی فضیلت اور مقبولیت عامہ کی وجہ سے چاہتے تھے کہ اُسے خلیفہ بنائیں۔ مگر بعض صاحب اثر امراء نے ضد کی کہ کفری کا سینہ وہ سالہ نابالغ بھائی ہی تخت نشین کیا جائے۔ چنانچہ اُن کی ضد پوری ہو گئی اور اہل مقتدر خلیفہ ہو گیا۔ لیکن اُس کے حکم ان ہو جانے کے بعد لوگوں میں اختلاف پڑا کہ ایسے کس بجے اور امراء کے ہاتھ کو کھلونے سے انتظامات مملکت کیونکر چلیں گے تو سارے عوام سلطنت اور کل ارکانِ شاہی اس بات پر متفق ہو گئے کہ مقتدر کو تخت سے اتار کے عبد اللہ بن معتر کو خلیفہ بنائیں۔ اور اُن کے وکلاء عبد اللہ کو ر کے سامنے آئے عرض کرنے لگے سارے مسلمانوں کی آرزو ہے کہ آپ کو خلیفہ اسلام قرار دے کے آپ کے ہاتھ پر بیعت کریں ابن معتر۔ جسے علمی مشاغل سے فرصت نہ تھی اُن کی یہ درخواست سُن کے بولا "اگر سب لوگ پسند کرتے ہیں تو مجھے عذر نہیں ہے مگر شرط یہ ہے کہ میری تخت نشینی کی وجہ سے کسی خون نہ بہایا جائے۔ اگر تم لوگوں نے کسی کے قتل کا ارادہ کیا تو میں حکومت سے باز آیا" سب نے اطمینان دلایا کہ آپ کی تخت نشینی کا آغاز خونریزی سے نہ ہو گا۔ اور اس قرار داد کے۔ نہ ہی سب نے اُس کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ تاج شہریاری سر پر کھتے ہی ابن معتر

اپنا لقب المرتضیٰ باشد قرار دیا۔ مگر بعض راویان تاریخ اُس کے دوسرے القاب بتاتے ہیں۔ کوئی النصف باشد کہتا ہے کوئی الغالب باشد بتاتا ہے کوئی کہتا ہے کہ الرضیٰ باشد لقب تھا لیکن غالب گردہ پہلے ہی لقب کو صحیح خیال کرتا ہے۔ الغرض اُس نے تخت خلافت پر قدم رکھ کے محمد بن داؤد بن الجراح کو وزیر اعظم اور علی بن عیسیٰ کو دیوانہ مقرر کیا۔ اور اسی وقت تمام ممالک میں "امیر المومنین المرتضیٰ باشد ابو العباس عبد اللہ بن المعتز" کا نام پھیرا جانے لگا۔ اس سے پیشتر یہ ہوتا آیا تھا کہ جو خلیفہ تخت سے اتارا جاتا قتل کر ڈالا جاتا۔ اور سلطنت کے ساتھ اُس کی زندگی کا بھی خاتمہ ہو جاتا۔ مگر ابن المعتز خوزیری کا دشمن تھا اور اعیان سلطنت سے مدد لے چکا تھا کہ اُس کی تخت نشینی کے لیے کسی کی جان نہ لی جاے اسی اقرار کے مطابق بعض اس کے کہ مقتدر کے قتل کی کوشش کی جاے اُس کے نام ابن المعتز کی طرف سے اس مضمون کا حکم پہنچا کہ "ایوان خلافت اور حرم مرا سے شاہی کو خالی کر دو آپ ابن طاہر کے مکان میں آٹھ آئین تاکر میں قمر شاہی میں سکونت پذیر ہوں جس مکان میں ابن معتز رہتا تھا وہ ابن طاہر ہی کے نام سے مشہور رہتا تھا۔ اُس نے کوشش کی کہ اپنے مکان میں خلیفہ معزول کو رکھے اور خود قمر خلافت میں آکر جاے۔ مقتدر نے اگرچہ کچھ تھا نہایت ستات کے ساتھ جواب میں کہلا کر جواب دیا "میں تمہیں اس کے لیے ہر چیز حاضر ہوں مگر اتنا جانتا ہوں کہ مجھے آج کی رات مہلت دی جائے یا اب نہ رہے گی اور صبح کو جب مقتدر نے محل کے خالی کرنے کا ارادہ کیا تو اُس کے ہمراہیوں میں سے بعض نے کہا ہمیں بغیر ہاتھ پاؤں ہلاے سلطنت نہ چھوڑ دینی چاہیے۔ لوگ اسی سوچ میں تھے کہ المعتز کے لوگوں نے پہنچ کے محل خالی کرنے کا تقاضا شروع کیا۔ اور جب تقاضے میں سختی ہوئی تو مقتدر کے غلام شاہی محل سے اور بالا خانوں کے پرودوں کی آڑ سے مقابلہ کرنے لگے۔ اس مقابلہ میں کسی قسم کی خوزیری نہیں ہونے پائی۔ المعتز کی طرف سے کوشش تھی کہ بغیر خون ہونے قمر برقبہ کیا جاے اور مقتدر کے لوگ اڑے ہوئے تھے کہ جان دے دیں گے مگر محل نہ چھوڑ دیں گے۔

چھوڑ دی دیر کے بعد مقتدر کے لوگوں نے ارادہ کیا کہ جلد میں کشتیوں پر سوار ہونے کے چڑھاؤ کا ستے ہوئے جائیں اور ابن طاہر دالے محل پر جس میں ابن معتز تھا حملہ کریں۔ جیکے ہی چپکے آنکھوں نے صد ہا کشتیان جمع کر لیں اور انھیں لکھتے اور لکھتے

ہوے جاہلوں کے۔ المعتز کے ہمراہیوں نے ان لوگوں کی کثرت دیکھی تو قبل اس کے کہ
المعتز کو لوگ پہنچیں دور ہی سے دیکھ کے بھاگ کھڑے ہوئے۔ المعتز کو اس کا سب
سے بڑا حامی حسین بن حمدان تھا سب سے پہلے وہ بھاگا اور اُسے دیکھ کے اور وں نے بھی
راہ فرار اختیار کی۔ اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ المعتز کا شہر مل گیا تھا اور
پہلے ہی سے طے ہو گیا تھا کہ وہ بھاگ کھڑا ہوگا۔

بہر تقدیر جب سب لوگ بھاگ کھڑے ہوئے تو مجبوراً عبداللہ بن المعتز گھوڑے پر
سوار ہو کے قصر خلافت سے باہر نکلا۔ اس کا وزیر محمد بن داؤد ہمراہ رکاب تھا۔ اور
آگے آگے ایک غلام بچہ تھا جاتا تھا کہ "عوام الناس اپنے سنی اور برہماری خلیفہ کو
دعائے دلت دو۔ برہماری کہنے کی یہ وجہ تھی کہ ان دنوں عوام بغداد اور قاضیہ خلیفہ
سر غنا قائم بن عبید اللہ برہماری تھا اور سارے شہر کا اُس پر اثر پڑا ہوا تھا۔ ابن المعتز
برہماری ظاہر کرنے کی یہ وجہ تھی کہ بغداد کے عام لوگ اس کے طرفدار ہو جائیں۔
اور غالباً ابن المعتز ان لوگوں کا ہم خیال وہم عقیدہ بھی تھا۔ لیکن وہ غلام ہزار پکا تھا
اور غل میا تار ہا مگر کسی نے بھی ابن المعتز کی طرف رخ نہیں کیا۔

اس کے بعد ابن المعتز نے آبادی سے نکل کے صحرا کی راہ لی تاکہ فوج والے جو اُس کے
ہاتھ پر بیعت کر چکے ہیں شہر چھوڑ کے باہر نکل آئیں اور اُس کے جھنڈے کی نیچے جی ہون کر
ایک شخص بھی نہ آیا۔ اب مجبور ہو کے اُس نے ارادہ کیا کہ اگر کچھ فوجی لوگ مل جائیں تو
اُن کے ساتھ سرمن رائی مین چلا جاے جو سب سے بڑا فوجی مرکز تھا اور فوج سے
مدد ملنے کی قومی امید تھی کیونکہ سب نے بالاتفاق اور بغیر کسی اختلاف کے اُسے خلیفہ
بنایا تھا۔ مگر کسی سپاہی نے ساتھ نہ دیا۔ آخر مجبور ہو کے خلیفہ اور وزیر دونوں
روپوش ہونے کا ارادہ کیا۔ محمد بن داؤد وزیر تو اپنے گھر میں جا کے چھپ رہا مگر
غریب ابن المعتز کے لیے کوئی گھر بھی نہ تھا گھوڑے سے اتر کے اپنے غلام "مین" کے
ساتھ چلا کہ کوئی پناہ کی جگہ ڈھونڈ نکالے۔ اتفاقاً جواہرات کے تاجر ابو عبد اللہ
جصاص کا مکان سامنے نظر آیا اور وہیں جا کے آقا اور غلام روپوش ہو گئے۔
اب اس وقت ابن المعتز اور اُس کا وزیر ہی نہیں بلکہ اُس کے تمام طرفدار چھپتے
پھرتے تھے۔ اکثر اپنے ہی گھر دین مین کنڈیان بند کر کے بیٹھ رہے اور بعض نے

دوسروں کے گھروں میں پناہ لی۔ اور سارے بغداد میں لوٹ مار ہونے لگی۔ دکانیں اور مکان ٹپنے لگے۔ راگمیں پر حملے ہونے لگے۔ اور ہر طرف قتل و غارت کا بازار گرم تھا۔ موقع دیکھ کے عیاروں نے الگ سر اٹھایا۔ ادنیٰ طبقہ کے اردوئی شرفاء عزیزین پر چیرہ دستی کرنے لگے۔ کو تو ال ابن عروہ نے معتز کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور اسی کے لوگوں میں مشہور تھا مگر اس وقت اُس نے یہ حرکت کی کہ اپنے بھٹے اور بیڑے کے جو انون کو جمع کر کے بجائے المعتز کے المقدر کے نام کے غصے بلند کرنے لگا۔ عوام اُس کی یہ حرکت دیکھی تو بکڑے اور اُسے ریا کار اور جھوٹا کہہ کر کے سب طرف سے اُس پر ٹوٹ پڑے۔ شہر کا یہ رنگ دیکھ کر ابن عروہ بھاگ کھڑا ہوا۔ المقدر نے فوراً اپنے ایک معتد مخصوص فرکی سردار سولس خازن کو کو تو ال کا خلعت دیا اور ساتھ ہی المقدر اپنے لشکر کو ساتھ لے کر قصر شاہی سے نکلا اور المعتز کے طرفداروں کو گرفتار کرنے لگا۔ وصیف بن ہموار تگین کو پکڑ کے قتل کر ڈالا۔ قاضی ابو عمر و علی ابن عیسیٰ قاضی محمد بن خلف کو پیلے تو اسیر کر لیا پھر قصور معاف کر کے جان بخشی کی۔ پھر قاضی منی احمد بن یعقوب کو قتل کر لیا اس لیے کہ انھوں نے المقدر کی نسبت کہا تھا کہ ”ہم ایک نونڈے کے ہاتھ پر بیعت نہیں کر سکتے“

یہ دھڑ بکڑ ہو ہی رہی تھی کہ ”سوسن“ نام ابن جصاص کے ایک غلام نے معتز کے ایک سردار فوج صانی حرمی کو خبر دی کہ میرے مالک کے گھر میں ابن المعتز اور اُن کے بہت سے رفقا چھپے ہوئے ہیں۔ فوراً ابن جصاص کا مکان گھیر لیا گیا۔ اور چند ہی منٹ کے اندر سپاہیوں نے اندر گھس کر ابن المعتز کو پکڑ لیا۔ رات تک گرفتار رکھا۔ اور رات کے اندھیرے میں اُسے کلا گھونٹ کے مار ڈالا۔ یہ سزا اُس شخص کو دی گئی جو سب سے بڑا ادیب اور علم و فضل میں مقبول انام تھا۔ مرے کے بعد اُس کی لاش پکڑے میں لپیٹ کے اُس کے گھر بھیج دی گئی۔ عزیزوں نے اپنے مکان کے سامنے ہی ایک گھورے میں دفن کر دیا۔ اور یوں ابن المعتز کی ۲۴ گھنٹہ کی خلافت کا خاتمہ ہو گیا۔

مورخین کا خیال ہے کہ ابن المعتز کے واقعے نے بغداد میں دو عجیب قسم کی متضاد باتیں ظاہر کیں۔ اول تو یہ کہ جس وقت لوگوں نے ابن المعتز کے ہاتھ پر بیعت کی

اُس وقت معلوم ہوتا تھا کہ جیسے سارے بغداد میں کوئی اُس کے مخالف نہیں اور کل معززین عراق نے بالاتفاق اُسے خلیفہ بنایا ہے۔ لیکن چند ہی گھنٹوں کے بعد جب اُس کی حالت بگڑی تو معلوم ہوتا تھا کہ جیسے دنیا میں کوئی اُس کا دوست نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ ابن المعتز نہایت ہی متعصب سنی تھا۔ یہاں تک کہ اُس کے عقائد میں ناہبیت پائی جاتی تھی اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سوزن رکھتا تھا اور اکثر آپ پر زبان طعن و تشنیع دراز کرتا مگر ابن حمدان نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ اُس کے ہاتھ پر بیت کی جو نہایت ہی سخت اور متعصب شیعہ تھا۔

ابن المعتز کے قتل کے بعد بھی اُس کے طرفداروں پر ظلم و ستم ہوتا رہا۔ ابن الجہل سے جس مکان میں وہ ردپوش ہوا تھا بہت سارے وہ جبر مانہ بن و طہول کہا گیا۔ محمد بن داؤد جیسے ابن المعتز نے خلعت وزارت دیا تھا گرفتار کر کے قتل کیا گیا۔ علی بن عیسیٰ جلا وطنی کر کے شہر موصل میں بھیج دیا گیا جہاں سے چند روز بعد مقتدر کے وزیر ابن فرات سے سفارش اٹھوا کے بھرے اور وہاں سے مکہ معظمہ میں جاسکے سکونت پذیر ہو گیا۔ قاضی ابو عمر پر ایک لاکھ اشرفی جرمانہ ہوا۔

اب ابن المعتز کے معزز طرفداروں میں سے حسین بن حمدان باقی تھا اُس کی گرفتاری کے لیے موصل اور دیگر بلاد میں فوج بھیجی گئی مگر پتہ نہ لگا۔ تب وزیر مقتدر نے حسین مذکور کے بھائی ابو الہیاء کو لکھا جو حاکم موصل تھا کہ جس طرح ہے اپنے بھائی کو جان بچا کر اس حکم کے مطابق وہ اُس کی تلاش میں روانہ ہوا۔ اور حسین نے شہر سنجان میں پہونچ کے سنا کہ میرا بھائی میرے تعاقب میں ہے۔ گھرا کے وہاں کے صحرا یعنی دشت سنجان میں چلا گیا۔ ابو الہیاء بھی ارادے کا ایسا پکا تھا کہ وہ دشت کی خاک چھاننے لگا اور دس روز کی دشت نوردی کے بعد اُس کے سر پر جا پہونچا۔ دونوں بھائیوں کے لشکروں میں لڑائی ہوئی۔ جس میں ابو الہیاء فقیہاں ہوا۔ اور حسین کے چند سپاہی اُس کے ہاتھ میں اسیر ہوئے ابو الہیاء بھی تعاقب کرتے کرتے عاجز آگیا تھا اُس دس ہزار دینار جرمانہ وصول کر کے موصل میں واپس چلا آیا۔ اس کے بعد وہ بغداد میں آ رہا تھا کہ راستہ میں تکریت کے قریب پھر حسین سے مدد بھیڑ ہو گئی۔ ابو الہیاء اب کی بھی غالب رہا۔ بھائی کے بہت سے

ہمراہوں کو قتل کیا۔ اور خود اُسے اسیر کر کے ابن الفرات وزیر کے پاس بھیجا کہ امیر المومنین کی خدمت میں سفارش کر کے اُن کا قصور معاف کرا دیجے۔ اسی موقع پر ادر بھی بہت سے لوگوں کے قصور معاف کیے گئے جن میں پُرانا کو تو ال ابن عمرو یہ بھی تھا۔ قصور معاف ہونے کے بعد حسین بن حمدان بغداد ہی میں رہا یہاں تک کہ علاقہ قہر کا دلی بنا کے بھیجا گیا۔ اپنے مستقر کی طرف روانہ ہوتے وقت اُس نے وہ فرست دریا سے جہل میں غرق کر دی جس میں اُن لوگوں کے نام درج تھے جنھوں نے مقتدر کے خلاف اُس کا ساتھ دیا تھا۔ ابن معزز کے باپ کا شمار تو خاندان عباسیہ کے خوبرویوں میں تھا ہی وہ بھی بڑا خوش جمال تھا۔ رنگت ٹھلٹی ہوئی گندم گون تھی۔ بال جلد ہی سفید ہو گئے تھے چنانچہ چالیس برس کی عمر میں جب وہ تخت خلافت پر بٹھا کے قتل کیا گیا ہے خضاب لگاتا تھا۔ علم ادب میں اس کا پایہ اس قدر بلند ہے کہ اُس کے اقوال حجت اور سند کے طریقہ سے پیش کیے جاتے ہیں۔ کہا کرتا کہ شعرا عرب میں سے چار ایسے ہیں کہ اُن کی نسبت اُن کے اقوال کی بنا پر جو کچھ شہرت ہے وہ واقعات اور اُن کے افعال کے بالکل خلاف ہے یعنی اُن کے اقوال اُن کے افعال کے مخالف ہیں۔ پہلا ابو الغنایہ جس کے اشعار سے تو معلوم ہوتا ہے کہ بہت ہی بڑا عابد و زاہد اور سخی و پرہیزگار تھا لیکن اصل میں محدود بے دین تھا۔ دوسرا ابو نواس اشعار دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں سب سے بڑا امر دہشت منعم ہے حالانکہ حد درجہ کازانی تھا اور غلام سے اُسے کچھ بھی سروکار نہ تھا۔ تیسرا ابو حلیکہ کا تب اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ نہایت ہی پاکدامن ہو گا مگر حقیقت پوچھیے تو کمر سے بھی زیادہ پُر شہوت تھا۔ چوتھا محمد بن حازم اشعار دیکھ کے خیال گزرتا ہے کہ بڑا ہی قانع اور بے پروا شخص ہو گا لیکن واقعہ یہ ہے کہ کتے سے بھی زیادہ حریص تھا۔ مگر مورخین ابن حازم کا ایک ایسا واقعہ بیان کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑا ہی بے پروا اور قانع شخص تھا بغیر چاہے جو کچھ ہو مگر ابن معزز کا یہ قول علمی دنیا میں نہایت مشہور ہوا۔ اور جن لوگوں کی نسبت اُس نے جو کچھ کہہ دیا ہے نہ بھی تھا تو اُن پر تھپ گیا۔

عبداللہ بن المعتز نے دنیا میں بہت سے قصائیف بھی چھوڑے۔ اُس کا دیوان مقبولیت عامہ کی وجہ سے چھپ گیا اور اہل ادب کے ہاتھوں میں موجود ہے۔

دیگر تصانیف کی نسبت نہیں معلوم کہ ہیں یا نہیں۔ مگر ان کی فہرست جو ابن خالکان نے دی ہے حسب ذیل ہے۔

(۱) کتاب الزہر والریاض (پھولوں اور باغ کی کتاب) (۲) کتاب البدیع (فن بدیع میں) (۳) کتاب مکاتبات الاخوان بالشر (اشعار میں بھائیوں کی مراسلت کی کتاب) (۴) کتاب الجوارح والصدید (شکاری جانوروں کی کتاب) (۵) کتاب السرقات (سرقتوں کی کتاب) (۶) کتاب اشعار الملوک (بادشاہوں کے اشعار کی کتاب) (۷) کتاب الاداب (۸) کتاب اعلیٰ الاخبار (۹) کتاب طبقات الشعرا (۱۰) کتاب الجامع فی الغناء (علم موسیقی میں ایک حاوی کتاب) (۱۱) ارجوزۃ فی ذم الصبح (مختصر رسالہ شراب صبحی کی مذمت میں)

چند اگلی تمنائیں

اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ دعا قبول ہونے اور آرزو برآنے کو وقت اور جگہ سے تعلق ہے۔ کسی کی آرزو برآتی ہے تو زبان سے نکل جاتا ہے کہ کس گھر میں دعا مانگی تھی کہ پوری ہی ہو گئی رہی یا فلاں ممبرک مقام میں دعا مانگی تھی کیونکہ پوری ہوتی ہے دعاؤں کا بر لانے والا وہ قادر مطلق ہے جو ہر ایک کی سن لیتا ہے اور ہر جگہ سن سکتا ہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ بعض اوقات اور بعض جگہ انجام کرنے سے کچھ ایسی خوبی کے ساتھ انسان کی مژدہ برآتی ہے کہ پھر وہ ہمیشہ دعا کے لیے مناسب وقت اور موزون مقام کا بویا ہو جاتا ہے۔ جن دنوں جناب معویہ بلا شرکت غیرے خلیفہ اور مالک اسلام کے سیاہ و سفید کے مالک تھے اُن دنوں مکہ معظمہ کا واقعہ ہے کہ ایک دن بیت اللہ شریف میں رسول اللہ کے چھوٹے زاد بھائی زبیر بن عوام کے تین بیٹے عبداللہ عودہ مصعب اور مردان بن حکم کا بیٹا عبداللہ ایک صحبت میں بیٹھے بائیں کر رہے تھے۔ ان چاروں کا شمار معزز نوجوانان فریش اور صاحبزادگان امت میں تھا۔ عبداللہ بن زبیر سب میں بڑے تھے اور صحابیت کا فخر رکھتے تھے۔ لیکن صحابہ میں بھی انھیں یہ خصوصیت تھی اور یہ امتیاز حاصل تھا کہ اُم المومنین عائشہ صدیقہ سے بھانجے ہونے کی وجہ سے اُن کا نشوونما آغوش نبوت و رسالت میں اور جناب سرور کائنات صلعم کے گھر میں ہوا

تھا۔ چونکہ ہجرت کے بعد سال بھر تک مسلمان اولاد سے محروم رہے تھے۔ اور بڑی آہناؤں کے بعد سب سے پہلے مسلمانوں میں جو بچہ پیدا ہوا وہ عبداللہ بن زبیر تھے اس لیے اُن کی ولادت پر مسلمانوں نے بڑی خوشیاں منائی تھیں اور سارا مدینہ تکبیر کے نعرون سے گونج اٹھا تھا۔ اس کے علاوہ اُن کے ذریعہ سے علوم نبوت کا ایک معتد بہ حصہ بعد والوں کو ملتا تھا بہر تقدیر وہ مغربین صحابہ میں تھے۔

عروہ بن زبیر اُن کے سگے بھائی تھے۔ انھیں صحابیت کی عزت تو نہیں حاصل ہوئی مگر اتنے بڑے صاحبِ علم و فضل اس پاس کے نفعیہ و محدث اور ایسے عابد و زاہد اور متقی و پرہیزگار تھے کہ کبار تابعین میں شمار کیے جاتے تھے اور علوم دین حاصل کرنے کے لیے لوگ دور دور کا سفر کر کے اُن کے پاس آتے اور اُن کے چشمہ علم سے بہرہ یاب ہوتے۔

مصعب بن زبیر بھی اُن کے بھائی تھے اور گو حضرت صدیقہ کے بھانجے نہ تھے مگر ایک جلیل القدر صحابی اور قریش کے شریف گھرانے کے فرزند ہونے کے باعث مغرب و محترم مانے جاتے۔ اور اُن کے مزاج میں نفاست اور شجاعت کی دایسے جوہر تھے جو انھیں قرآن و اشغال سے ممتاز ثابت کر رہے تھے۔

چوتھا شخص عبدالملک حضرت عثمان کے سائے کا بیٹا اور روم حکومت خاندان بنی امیہ کا ایک بلند حوصلہ رکن تھا جو بعد کے زمانے میں دنیا کا سب سے بڑا شہنشاہ اور بنی امیہ کا سب سے زیادہ زبردست خلیفہ ثابت ہوا۔

مگر اس وقت ان میں سے کسی کو بھی اپنی آئندہ زندگی کی مطلق خبر نہ تھی۔ اور نہ یہ جانتے تھے کہ ہم چاروں میں بعد کو کیسے واقعات پیش آنے والے ہیں اور کس سخت غور و زریاں ہونے والی ہیں۔ ان دنوں یہ چاروں نوجوان سیدھے سادے نوجوانان قریش تھے۔ لطف و محبت سے باہم ملتے جلتے تھے۔ اور ایک دوسرے کی صحبت سے لطف اٹھاتے تھے۔ باتوں باتوں میں کسی نے کہا ”اچھا آؤ۔ ہم سب اپنی اپنی تمنائیں بیان کریں۔ دیکھیں کون کیا چاہتا ہے۔ اور کس کی مراد برآتی ہے۔“ یہ سن کر عبداللہ بن زبیر بولے ”بھئی میں تو یہ چاہتا ہوں کہ حرمین (مکہ و مدینہ) کے

حاکم ہوں اور عثمان خلافت میرے ہاتھ میں ہو۔ ان کے سوتیلے بھائی مصعب بن زہیر نے کہا "اور میری تمنا یہ ہے کہ عراقین (عراق عرب و عراق عجم) حاکم ہوں۔ اور قریش کی دونوں معزز خاتونیں سکینہ بنت حسین اور عائشہ بنت طلحہ میری بی بیان ہوں۔" عبدالملک بن مروان بولا "میری آرزو تم دونوں سے بڑھی ہوئی ہے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ ساری دنیا کا بادشاہ ہو جاؤں۔ اور معاویہ کا جانشین ہوں۔" ان تینوں کی آرزو میں سن کے عروہ بن زہیر بولے "میرے دل میں تم لوگوں کی سی دنیوی ہوسیں نہیں۔ میں تو بس اتنا چاہتا ہوں کہ دنیا میں زہد و تقویٰ کے زیور سے آراستہ رہوں۔ عقیقہ میں جنت نصیب ہو۔ اور ان لوگوں میں شمار کیا جاؤں جن سے علوم دینیہ کی اشاعت ہو۔"

چاروں نے اپنی اپنی آرزو میں خدا جانے کس مقبولیت کی گھڑی میں ظاہر کی تھیں کہ محروم کوئی نہیں رہا۔ جو جس چیز کو چاہتا تھا اُسے ضرور حاصل ہوئی۔ یزید بن معاویہ کے بعد عبداللہ بن زہیر مدت تک حرمین کے حاکم رہے۔ خلافت کا دعویٰ کیا۔ اور مسلمانان عرب نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ مصعب بن زہیر اپنی آرزو کے مطابق بھائی کی طرف سے عراقین کے حاکم اور والی ہو گئے۔ اور دولت مذمتی کے زمانے میں جناب سکینہ بنت حسین اور عائشہ بنت طلحہ دونوں ان کے عقد نکاح میں آئیں۔ عبدالملک کی مراد بھی خدا نے پوری کر دی۔ یزید کے بعد دمشق میں مروان بن حلیف بن ہشام اور اُس کے بعد عبدالملک بن مروان کو خلافت ملی جس نے عبداللہ بن زہیر کو شہر کے ایسے زور و شور سے خلافت کی کہ چین سے اندس تک اُسی کا حکم چل رہا تھا اور جو حصہ ارض اُس کی قلمرو سے باہر تھا وہاں کے سلاطین بھی اُس سے ایسے خائف و ترسان تھے کہ غالباً یہ کنایہ مجاہد ہو گا کہ وہ ساری دنیا کا بادشاہ تھا۔ رہے عروہ بن زہیر انھوں نے بعد کے جھگڑوں میں ذرا بھی دخل نہیں دیا۔ دین کی پیروی کرتے تھے اور دین کی تعلیم دیتے تھے۔ صحابہ کی بتائی ہوئی حدیثوں اور علوم رسالت کو والدوں میں پوری امانت داری کے ساتھ پہنچاتے تھے۔ انھیں نہ بھائی سے سروکار تھا اور نہ عبدالملک سے۔ نہ عبداللہ بن زہیر کے ساتھ تھے اور نہ عبدالملک کے مخالف جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کے بھائیوں کا قاتل اور تمام اکابر صحابہ کا دشمن عبدالملک اکثر

کہا کرتا "جو کوئی چاہتا ہو کہ کسی جنتی شخص کو دیکھے تو وہ جا کے ثروۃ بن زبیر کا چہرہ دیکھ
سے۔ ثروۃ بن زبیر کے سکے بھائی تھے اس نے غیر ممکن ہے کہ عبد الملک ان سے
کھٹکتا نہ ہو۔ مگر ان کی بے نفسی و پرہیزگاری کا وہ بھی معترف تھا۔ سچ کہتے ہیں کہ
"الفضل ما شہدت بہ الا عدائاً" (حقیقی فضیلت وہی ہے جس کے دشمن بھی معترف ہوں)

توحید

اس موقع پر نہ ہم نے اپنے کرم فرما مولانا حسن نظامی کے اخبار توحید پر ریویو
لکھنے کے لیے قلم اٹھا یا ہے اور نہ وحدت باری تعالیٰ کی تعلیم و تلقین کے لیے۔ بلکہ ہم
اس وقت مسئلہ توحید کی تاریخ کے متعلق اپنے چند خیالات ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔
خدا کے ایک جاننے اور ایک ہی خدا ماننے کو توحید کہتے ہیں۔ ظاہر میں دیکھیے تو
کس قدر سادہ اور کتنی سیدھی بات ہے کہ ہمارا اور سارے عالم کا پیدا کرنے والا
ایک ہی خدا ہے۔ اُس کا کوئی شریک و ہمتا نہیں۔ کل موجودات اُسی کے بنائے ہوئے
اور اُسی کے تابع فرمان ہیں۔ مگر پھر بھی اس سیدھے سادے مسئلہ میں انسانی جہالت
نے (جسے وہ حماقت سے عقل آرائی خیال کرتا ہے) ایسے الجھاؤ ڈال دیے ہیں کہ اگر
مذہب اور مقتدیایان مذہب کے دعووں کو دیکھیے تو سب موجد ہیں اور ساری دنیا
میں کوئی مشرک نہیں۔ لیکن اگر اُن کی حالت کو دیکھیے تو ایک بھی موجد نہیں نظر آتا۔
اس میں شک نہیں کہ توحید کوئی ایسی اچھی چیز ہے کہ جی سب کا یہی چاہتا ہے کہ ہم موجد
ہوں اور ہمارا خدا ایک ہو۔ فطرت انسانی کی کمزوریوں نے سیکڑوں ہزاروں باطنی
قومی اور روحانی پہلوان تسلیم کر لیے۔ انسان جس سے مغلوب ہوا۔ جس سے دبا جس
ڈرا۔ یا جس کا معترف ہوا اُس کے آگے سر جھکا کے کھڑا ہو گیا۔ اُس نے سنسان
بیابانون۔ خاموش جنگلون۔ سراپا عظمت پہاڑوں۔ خوفناک گھاٹیوں نا پیداکنار
سمندروں۔ اور ہمیشہ پیسنے والی ندیوں میں مرعوبیت کی آنکھوں سے دیو اور دیوتا
دیکھے۔ پر یان اور دیویان دیکھیں۔ جسمانی عالم میں اپنے خیال کی مدد سے اُن کے
شخصیات پیدا کر لیے۔ اور اُن کے آگے سجدے کرنے لگا۔ یہ سب ہے لیکن زبان
یہی کہے جاتا ہے کہ "ہم موجد ہیں" اور "ہمارا خالق ایک ہی ہے۔"

باوجود ان مشرکانہ حرکات کے وہ مانتا ہے کہ خدا کو ایسا ہونا چاہیے کہ کوئی چیز اور
 کوئی طاقت اُس کی قوت و حکومت سے باہر نہ ہو۔ کوئی طاقت اُس کی فراہم نہ ہو سکے۔ اور
 جب یہ یساعدا ہو گا تو لازم ہے کہ کوئی دوسرا خدا نہ ہو کیونکہ دوسرا ہوا تو اگر وہ پہلے کی قدرت و
 حکومت سے باہر ہو تو پہلے خدا کی جدائی میں فرق آجاسے گا اور وہ پورا خدا ہی نہ باقی
 رہے گا۔ اور اگر وہ پہلے خدا کا تابع فرمان اور مخلوق ہو گا تو وہ دوسرا خدا نہ باقی
 رہے گا کہنے کو تو کہہ دیا جاسکتا ہے کہ دونوں کی قلم و جہا ہوگی۔ ان کے حدود و
 اختصارات معرور معین ہوں گے اور اپنی اپنی قلم و پر دونوں پوری قوت کے ساتھ
 قابض و متصرف ہوں گے لیکن اس کا کیا علاج ہے کہ اس طرح دونوں خدا خدا
 باقی نہ رہیں گے۔ اس لیے کہ پہلے خدا کی حکومت سے دوسرے کی قلم و باہر ہوگی اور
 دوسرے کی حکومت سے پہلے کی قلم و۔ اور جس کی حکومت سے کوئی چیز باہر ہو وہ خدا نہیں
 اسی ضرورت اور اسی شبہ کی وجہ سے دنیا میں شاذ و نادر ہی کوئی ایسا شخص
 ملے گا جو وہ خداؤں کو اپنی زبان سے تسلیم کرتا ہو۔ ایسے لوگ مل جائیں گے جو خدا
 کے منکر ہوں اور محبت و اتفاق کو اپنا خالق بنائے کسی قادر و توانا خدا کے ماننے ہی
 سے انکار کر دیں۔ لیکن ایسے لوگ چراغ لے کے ڈھونڈیے تو بھی نہ ملیں گے جو
 دو برابر کے خدا مانتے ہوں۔ یا تو حید کے ماننے میں ترو و اور پس و پیش کرتے ہوں
 تاریخ پر نظر ڈالیے تو ہر قوم اپنے آغاز میں بت پرست نظر آئے گی۔ لیکن ان
 دونوں کے حالات اس قدر کم معلوم ہیں کہ ہم ہر پرانی قوم کے اصلی عقائد سے واقف نہیں
 اس بات کو ہم مانتے ہیں کہ انسان نے جب حیوانیت چھوڑ کے انسانیت کا جامہ پہنا تو
 اپنی عقل کی کزوری سے ہر اُس چیز کو جو مہیب یا با عظمت نظر آئی اُس کے آگے سر
 جھکانے اور اُس کی پرستش کرنے کو تیار ہو گیا۔ لیکن اُس کی اس ضعیف الاعتقادی
 سے ہم یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ کبھی وہ ایک سے زیادہ خداؤں کا بھی قائل تھا۔
 اگلی دنیا کے بعض بادشاہوں نے بھی خدا بننے کی کوشش کی۔ جیسا کہ نرود و فرعون
 کے طرز عمل سے ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن یہ ہے کہ وہ پورے شکل خدا تھے۔ دل میں اپنی
 مجبوریوں اور کمزوریوں کے معترف تھے مگر اپنی رعایا کے مطیع فرمان رکھنے کے لیے چاہتے
 تھے کہ خدا نہیں بلکہ ہم اپنی قوم کے معبود بن جائیں۔ تاریخ ہی بتا رہی ہے کہ ایسے

دنبروی خدا جہان خدائی کا دعویٰ کرتے تھے وہاں بت خانوں میں جا کے بتوں کی پرستش بھی کیا کرتے تھے۔

تاریخ کی جستجو میں اگر ذرا سوچ لی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان نے پہلے اُن چیزوں کی پرستش کی جن سے خائف و مرعوب ہوا۔ پھر اُن لوگوں کی جو قوت میں سب پر غالب تھے۔ اور اسی سلسلہ میں اپنے بزرگوں مورثوں اور عزیز نامور لوگوں کو پوجنے لگا۔ لہذا جیسے معبود وہ بزرگ معزز اور نامور لوگ تھے ویسے ہی معبود بادشاہ بھی بن جایا کرتے تھے۔ مگر اس معبودیت کے ساتھ قومی دیوتاؤں کے آگے بادشاہ اور رعایا۔ راجہ اور پرجا سب سجد کیا کرتے تھے۔

یہودی تاریخ بہت پُرانی ہے۔ اُن کی تاریخ سے بابل و نینوا اور مصر میں کی تاریخوں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو موحد اور مابقی تمام اقوام عالم کو بت پرست بتاتے ہیں۔ مصر میں بڑے بڑے دیوتا تھے۔ بابل میں ہر جگہ بت تھے۔ یہود کے قریب ہی فینیقیوں اور کنعانیوں میں دیوتاؤں کی پرستش ہوتی تھی۔ اور اسرائیلی اُن سب کو بت پرست اور اپنے آپ کو موحد و حق پرست بتاتے تھے لیکن جس طرح اُن قوموں کی بت پرستی کے پردے میں توحید تھی ویسے ہی اسرائیلیوں کی توحید بھی عین منقوش نظر آتی ہے۔ اس لیے کہ اسرائیلیوں کا خدا ”یہوا“ اُن کے بیان سے خدا نہیں بلکہ اُن کا قومی دیوتا نظر آتا ہے۔ جو اور قوموں کا نہیں صرف اُن کا خدا تھا۔ جو اوروں کے خداؤں پر غالب تھا۔ اور اُن سے وعدہ کرتا تھا کہ میں تمہیں سب قوموں پر غالب اور سب سے برگزیدہ بنا دوں گا۔

اس کے بعد یونانیوں اور رومیوں کا زمانہ ہے۔ یونانی بھی توحید کے قائل تھے اگرچہ اُن کا خدا صرف علتِ تخلیق تھا اور جملہ صنات سے معرا تھا۔ اور رومیوں کا خدا بھی ویسا ہی تھا۔ دونوں گز نزدیک عالمِ تخلیق میں دیوتاؤں اور دیویوں کی حکومت تھی۔ نامور انسان زبردست سپاہی اور بلند حوصلہ بادشاہ بھی دیوتا بن جاتے۔ اور اپنے روحانی اقتدارات سے دنیا پر اپنے اپنے علاقوں میں حکومت کرتے۔ اور دنیا و لوگوں کو بد دیتے۔

مسیحیت نے دنیا میں اُس کے ابتداء بڑے زور و شور سے توحید کا نعرہ بلند کیا۔ اور

تمام مروجہ معاصر مذہبون کو مشرک بتایا۔ مگر سچ یہ ہے کہ یونانی ہون یا رومی اُن کے افعال مشرکانہ تھے عقیدہ مشرکانہ نہ تھا اس لیے کہ وحدت باری تعالیٰ میں انھیں ہرگز شک نہ تھا۔

سب سے بڑا الزام شرک کا مجوس کو دیا گیا جن کا مذہب ہزار سال سے فارس اور خراسان وغیرہ میں جاری تھا۔ لیکن اس الزام دینے میں زیادہ دخل مسیحیوں کی تحقیق کو نہیں بلکہ تعصب کو تھا۔ مسلمانوں میں بھی آتش پرستی کو شیخی المذہب یا دودھاؤن کا ماننے والا مذہب کہا جاتا ہے خود زرتشتی اپنے آپ کو اس الزام سے بری بتاتے ہیں۔ اور اگر غور سے دیکھیے تو جیسا الزام ان کو دیا گیا ہے۔ حقیقت میں وہ ویسے ملزم نہیں ہیں۔ اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ دنیا میں نیکی بدی دو متضاد چیزیں ہیں جن کو انھوں نے نور و ظلمت سے تعبیر کیا۔ خدا تعالیٰ چونکہ صرف صفات حسنہ سے مصطف ہے اس لیے نور کو انھوں نے اُس کا جلوہ بتایا۔ اور شیطان چونکہ ضلالت و بدی کا مجبو عم لہذا اُس کا مظہر ظلمت کو قرار دیا۔ یہ وہ مانتے ہیں کہ خدا سب پر غالب ہے اور شیطان و ظلمت پر بھی وہ غالب آئے گا۔ فی الحال خدا کی مرضی کے خلاف ظلمت موجود ہے اور شیطان لوگوں کو گمراہ کرتا رہتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ شیطان ظلمت اُس کی حکومت و قدرت سے باہر ہوں مگر ہاں نافرمان اور اُس کے حکم سے باہر ضرور ہیں۔ ایک دن آنے والا ہے جب شیطان پکڑ کے مارا جائے گا اور ظلمت دور ہوگی۔ اگر غور سے دیکھیے تو اس سلسلہ میں حقیقت کا دعویٰ کرنے والے دیگر مذہب سے وہ اچھے ہی ہیں لیکن اسکا کیا علاج کہ اُن کو الزام دے کے دودھاؤن کا ماننے والا اور مشرک بتا دیا گیا۔

فرق اتنا ہے کہ عیسائیوں اور مسلمانوں میں شیطان کی تخلیق کا ایک واقعہ بیان کر دیا گیا ہے اور زرتشتیوں میں کوئی ایسا قصہ نہیں جس سے پتہ چلتا ہو کہ اہرم (اُن کے شیطان) کو یزدان (اُن کے خدا) نے پیدا کیا تھا۔ اُن کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا سے اہرم اسی شان میں چلا آتا ہے ہاں آخر میں البتہ مفتوح ہو کے مارا جائے گا۔ لیکن جب وہ اُسے فانی مان رہے ہیں تو اُس کے آغاز کا پتہ نہ لگنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اُن کے نزدیک وہ ازلی وابدی خدا ہے۔

اس میں شک نہیں کیا جاسکتا کہ ابتداءً مسیحیت کی توحید غیر معشوش اور مکمل تھی۔ لیکن چند ہی روز میں نظر آگیا کہ بعض اس کے کہ وہ اپنی توحید کا اثر دوسروں پر ڈالے خود ہی دوسروں کے شرک سے متاثر ہو کے معشوش ہو گئی۔ ایک ہی صدی گزری تھی کہ اُس کی توحید میں تلیث کا جوڑ لگ گیا۔ اور زرتشتیوں کو یہ کہنے کا موقع مل گیا کہ خیر ہم تو مشنری (دو خداؤں والے) تھے مگر تم تلیث والے ہو۔ اب پھر ساری دنیا میں توحید پر اسے نام تھی اور ظاہری صورت میں جسے دیکھے مشرک تھا۔

عرب کے جہلا علم و فضل سے محروم اور متہدن و مذہب قوموں سے دور ہونے کے باعث اب تک پرانے مذاق کی بت پرستی میں مبتلا تھے۔ اُن میں درخت جاناور اور بت سب ہی طرح کے عبود تھے۔ ظاہر میں معلوم ہوتا ہے کہ وہ پورے پورے مشرک ہونے لگے لیکن قرآن مجید جو اُن کے مذہب کے امتیصال کے لیے آیا تھا وہی بتا رہا ہے کہ ایک سے زیادہ خداؤں کے وہ قائل نہ تھے۔ اور اگر اُن سے پوچھا جاتا کہ تمہارا خالق کون ہے تو جواب دیتے کہ خدا ہے وحدہ لا شریک "اس کے بعد جب الزام دیا جاتا کہ "پھر تم ان مورتوں کو کیوں پوجتے ہو؟" تو کہتے "اس لیے کہ یہ بت خدا کی درگاہ میں ہماری شفاعت کریں گے"۔

اس بیان سے یہ تو ثابت ہو گیا کہ اسلام سے پیشتر کے تمام مذاہب بت پرست ہوں یا خدا پرست توحید کے سب قائل تھے۔ شرک صرف عبادت اور پرستش میں تھا عقائد میں نہیں۔ یہ بھی نظر آگیا کہ پرانے مذاہب حقہ بھی مشرکوں کے اثر سے متاثر ہونے لگے اپنی اصلی توحید کو بھول بیٹھے تھے۔ عقائد میں اکثر شرک تھا بھی تو اُسے وہ ایک متشابہ عقیدہ خال کرتے مثلاً عیسائیوں نے تلیث کو مانا بھی تو توحید کے لفظ کو نہ چھوڑا۔ اور تلیث کے ساتھ ہی یہ بھی کہتے رہے کہ ہم ایک خدا کو مانتے ہیں۔ اور جب تثلیث و توحید کے باہم تضاد ہونے کی نسبت سوال کیا گیا تو تسنیت کر سٹین نے کہہ دیا کہ "یہ مسئلہ اس لیے ہے کہ دنیا میں مانا جاسے اور آخرت میں جا کے سمجھا جائے"۔ اسی طرح زرتشتیوں کو ساری دنیا مشنری المذہب کہتی تھی۔ وہ خود بھی اہرمز (شیطان) کو اتنی وقعت و عظمت دیتے اور اُس سے اس قدر ڈرتے تھے کہ اُن کے طرز عمل سے دھوکا ہوتا کہ شاید یہ اہرمز کو خدا ہی کے برابر کی قوت مانتے ہیں لیکن اگر اُن سے

پوچھا جاتا تو یہی جواب دیتے کہ ہمارا خدا ایک ہے۔ اور اہرمن تو ایک دشمن حق برائی ہے جو فانی ہے۔

الغرض عقیدۂ خدا کے ایک ماننے میں سب متحد ہیں۔ شرک کا جو کچھ اظہار ہوتا ہے عبادات اور طرز عمل سے۔ اس راز تک سب سے پہلے بنی اسرائیل پہنچے جو قدیم الانبیاء میں بت پرستی کے سب سے بڑے دشمن تھے۔ مگر یہ ہے کہ یہ توحید کی اصلی نشان گاہ مکمل طریقہ سے پہلے پہل اسلام نے سمجھا۔ اور اُس نے بتایا کہ زبان اور عقیدے سے ہم چاہتے ہیں کہ ہی خدا کو واحد کے قائل ہوں ہمارا طرز عمل ہمارا طریقہ عبادت اور ہماری معاشرت مشرکانہ نہ ہو تو توحید باطل ہو جاتی ہے۔ اور ہم اس قابل نہیں رہتے کہ اپنے آپ کو متحد کہیں۔

اسلام نے کسی مافوق قوت یا کسی اپنے سے بالا دست شخص کے ماننے میں غفلت و غبار کے درجے قائم کیے۔ اُس نے حکم دے دیا کہ "اَعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اَكْرُمُوا اَخْلَامَہُ" اپنے خدا کی عبادت کرو اور اپنے بھائی کی تعظیم کرو پھر اس کے بعد عبادت و تعظیم کا فرق بتایا۔ نماز اور حج میں جن طریقوں سے خدا کی عظمت ماننے کا اظہار کیا جاتا ہے اُن کو عبادت قرار دیا۔ اور اُن کے سوا اور جتنے طریقے عظمت ماننے کے ہوں اُن کو تعظیم بتایا۔ ہم کسی بزرگ یا معزز شخص کو دیکھ کے کھڑے ہو جائیں تو یہ تعظیم ہے لیکن اگر اُس کے آگے سجدہ یا رکوع کریں تو شرک ہے۔

ایک یہ پُرانا خیال بھی تھا کہ خداوند جل و علا چہرہ نہ معلوم الگ نہ ہو چہرہ نہ معلوم بیچگون اور ہماری سمجھ سے بالا ہے اس لیے اس کی ذات سمجھ ہمارا خیال نہیں پہنچ سکتا۔ مگر عبادت کے لیے اُس کا خیال کرنے اور اُس کا دھیان رکھنے کی ضرورت ہے۔ اس دشواری کو قدیم مذاہب نے اپنے اپنے مذاق کے موافق حل کیا اس کو تو سب نے تسلیم کر لیا کہ اُس کی طرف دھیان لیجانے کا ذریعہ اُس کی قدرت کاملہ کے کسی مکمل نمونے کو یا کسی ایسی چیز کو جو اُس کی کسی اعلیٰ صنعت کو ظاہر کرتی ہو قرار دے لیا جائے۔ لیکن انتخاب میں اختلاف پڑا۔ کسی نے کسی حسینہ کی تصویر کو کسی نے کسی توی ہیکل انسان کی صورت کو۔ کسی نے کسی زبروت جانور کو۔ کسی نے کسی بڑے بھاری درخت کو۔ کسی نے فور و تار کو زبان حق

قرار دے کے عبادت الہی کے واسطے قبلہ بنایا۔

اسلام نے ایسے تمام قبلوں کو قبلہ ہاے باطل بنایا۔ اس لیے کہ چند ہی روز میں لوگ خود اُن قبلوں میں کسی کرشمہ یا کسی قدرت کو ماننے لگے اور بجائے اُسکے وہ انسان خیال کو خدا کی طرف ایمان خود ہی معبود بن گئے۔ اُن کی تقدیس و تسبیح کی جانے لگی اور معتقد لوگ خود اُن کی طرف مخاطب ہو ہو کر دعا مانگنے لگے اور مرد و عورت لگے۔ ان مشرکانہ نتائج سے بچانے کے لیے اسلام نے ان تمام قبلوں کی تو تکذ کر دی مگر اس اصول کو نہیں چھوڑا کہ خدا سے بیچون کی عبادت کے لیے کسی اور قبلہ کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اسلام نے ایک مکان کو قبلہ قرار دیا جو مودود سب سے پُرانا عبادت خانہ تھا۔ اور اُسے بھی اس قید کے ساتھ کہ اگر کوئی یہ خیال کرے کہ میں اسے سجدہ کرتا ہوں یا نماز میں اُس کی طرف خطاب کرے تو وہ مشرک ہے۔ اس اصول کی سچائی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ تمام دیگر مذاہب میں چیزیں سمت عبادت اور قبلہ بتائی گئی تھیں وہ چند ہی روز میں معبود بن گئیں اور انھیں کی پرستش ہونے لگی۔ بخلاف مسلمانوں کے قبلہ خانہ کعبہ کے جو گزشتہ تیرہ برس میں قبلہ کی حد سے تجاوز کر کے معبود نہیں بن سکا۔ سچ یہ ہے کہ مسلمانوں میں ہر روز ایام کے ساتھ شرک پیدا ہوا اور مشرکانہ رسوم ترقی کرتے رہے۔ ہزار ہا بیچ گئیں۔ ہزاروں چلوں جھنڈوں اور فرضی تربتوں کے آگے سجدے ہونے لگے۔ خانہ کعبہ کی جو حیثیت آنحضرت صلعم کے زمانے میں تھی آج تک قائم ہے اُس میں بھی تغیر نہیں ہوا۔

مذکورہ بالا بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام نے جیسی خاص توحید بتائی کبھی نہ بتائی گئی تھی۔ اور اگر اس کی تعلیمات پر پورا پورا عمل کیا جاتا تو یقیناً دنیا میں ایک سچی قوم موجود ہوتی۔ مگر افسوس کہ مسلمانوں میں بھی نماز و زکوة کے ساتھ مشرکانہ رسوم پیدا ہو گئے اور اُن کا انجام بھی یہی ہوا کہ توحید کے مدعی تو سب ہیں مگر معنوں پر دیکھے تو اُن میں بھی شاذ و نادر ہی کوئی موحّد نظر آئے گا۔



دریائے نیل کا منبع

یعنی وہ مقام جہاں سے دریائے نیل نکلا ہے۔ آج کل جغرافیہ دان اکثر نیل کے سرچشمہ کو
نہیں پہنچ سکے مگر پھر بھی جانتے ہیں کہ افریقہ کی اُس مشہور اور سب سے بڑی جھیل سے نکلتا
ہے جسے سو جوہ جغرافیہ دانان انگلستان "وکتوریہ لیک" (وکتوریہ جھیل) کہتے ہیں۔ جہاں سے
چار ہزار میل کی مسافت طے کرنے کے بعد دریائے نیل بہت سے دھاروں پر ٹپ کے شمالی
سواحل مصر پر بحیرہ روم میں گرا ہے۔

اگلے زمانے میں دریائے نیل کے منبع اور اصلی سرچشمہ کی اکثر لوگوں کو جستجو تھی۔ اور چونکہ
اُن دنوں ارض حبشہ کے نام پر کتنا روشنی میں گھسنے کی کسی کوجرات نہ ہوتی تھی اس لیے
کسی جغرافیہ نویس کو اس دریا کے اصلی سرچشمہ کا پتہ نہ لگ سکا۔ بلکہ علمی اور ناواقفیت ہمیشہ
طرح طرح کے خیالات پیدا کیا کرتی ہے۔ چنانچہ دریائے نیل کے متعلق بھی بہت سی لائینی باہین
مشہور ہو گئیں۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ نہروں اور ندیوں سے چونکہ زمین شاداب اور زرخیز ہوتی
ہے روئیدگی کی برکت سے قسم قسم کے پھول کھلے طرح طرح کے پھل لگتے۔ اور دنیا میں جنت کی سی
نزدہت و دلکشی پیدا ہو جاتی ہے اس لیے احادیث میں بعض دریاؤں کی نسبت کہہ دیا کہ وہ
جنت سے آئے ہیں۔ اور حقیقت میں وہ جنت ہی کی سی برکتیں ہیں۔ مگر نیل کے اصل مرکز کے
نہ معلوم ہونے اور اُس کے جنت کی ندی ہونے کے خیالات نے اس لائینی کے پردے میں
عجب کر سہ پیدا کر دیے۔

قرآن مجید اور سچی حدیثوں میں بہت کم ایسے واقعات ہیں جو عقل سے باہر اور بے مروت ہوں۔ مگر جب مسلمانوں میں احادیث کے نسخے اور دینی روایات کی جستجو کا شوق پیدا ہوا تو بہت سے راویوں نے اُن واقعات کی طرح جو عجیب و غریب کُتھے سُنا سننے کے سامعین کو متحیر و محظوظ کیا کرتے ہیں ایسی روایتیں تصنیف کرنا یا ڈھونڈ ڈھونڈ کے نکالنا شروع کر دیں جو سامعین کی سمجھ سے بالا ہوں اور اُن پر حجرات اور خوارقِ عادت کا اثر ڈالیں۔

تصنیف کی بھی زیادہ ضرورت نہ تھی۔ اس لیے کہ یہودی تورات کے علاوہ ایسے بے سرو پارہ آیات کا ایک بڑا بھاری ذخیرہ موجود تھا۔ اور چونکہ صحابہ میں سے کئی بزرگ یہودی الاصل اور روایات یہود سے واقف تھے اس لیے انھیں کے زمانے سے یہودی روایات کا بیان کیا جانا شروع ہو گیا "جو اسرائیلیات" کہلاتی تھیں۔ چونکہ یہ عام خیال پیدا ہو گیا تھا کہ قرآن مجید کے محلِ قصص انہما کی تفصیل تورات اور یہود کی دوسری کتابوں میں موجود ہے اس لیے قرآن مجید کی تفسیر و تشریح کی حیثیت سے اس قسم کی روایتیں پیش کی جانے لگیں اور لوگ اُن کو دلچسپی سے سننے لگے۔

یہ یہ ہے کہ اس بے احتیاطی کی نقالی نے تفسیر و حدیث کے فنون کو بڑا نقصان پہنچا دیا۔ حدیث میں جرح و تعدیل کے قوانین نے اگرچہ بہت کچھ روک تھام کی مگر چونکہ صحابہ ہی کے عہد سے روایات یہودہ اخذ کرنے کا طریقہ جاری ہو گیا تھا اس لیے شک نہیں کہ صحیح الہدایت احادیث میں بھی ایک مستند حد اسرائیلیات کا موجود ہے جو اگر ان ائمہ دین کی جانب منسوب نہ ہو مگر ان سے سنا گیا ہے تو ہرگز قابلِ اعتبار نہ ہوتا۔ لیکن اس پر بھی ہم یقین سے کہ اصول حدیث کے مطابق اگر پوری طرح تصدیق کی جائے تو مصلح دلائلی اسرائیلیات کا بہت ہی کم حصہ باقی رہ جائے گا۔

انہیں مغزوں روایات میں سے ایک روایت دریا سے نیل کے سرچشے اور اصلی منبع کی تحقیق میں ہے جو اصول روایت سے جاسے جس قدر ساقط الاعتبار ہے مگر غرضتہ بارہ صدیوں میں اکثر علماء اور ائمہ دین کے نزدیک مسلمانوں کا جزو دین بنی رہی ہے یہ ہم ماننے لگے ہیں کہ محققین نے ایسی مضر و روایت کو کبھی نہیں مانا لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ غلبہ اس کے ماننے والوں ہی کو حاصل رہا۔

ابو صالح عبداللہ بن صالح بن محمد کاتب بشتابن سعد کہتے ہیں مجھے روایت پہنچی ہے کہ عیسیٰ بن اسحق بن ابراہیم کی نسل میں سے ایک شخص تھا جو حامد کے نام سے مشہور تھا اور ابو شالوم بن عیسیٰ بن اسحق کا بیٹا تھا۔ کسی بادشاہ کے خون سے وہ اپنے وطن سے بھاگ کے ارض مصر میں پہنچا۔ اور سالہا سال وہاں مقیم رہا۔ یہاں دریائے نیل کی عجیب عجیب باتیں دیکھ کے اُس نے قسم کھائی اور عہد کر لیا کہ نیل کے سرچشے کا پتہ لگانے کے لیے جہاں تک زمین ملے گی میں اُس کے کنارے ہی کنارے چلا جاؤں گا چاہے اس کو شش مہینہ مر ہی کیوں نہ جاؤں۔ اپنے اس عہد کے مطابق وہ نیل کے کنارے کنارے روانہ ہوا۔ بعض کہتے ہیں کہ تیس سال تک اور بعض کہتے ہیں کہ پندرہ سال تک برابر چلا گیا۔ یہاں تک کہ بحر اظفر (دریائے سبز) کے کنارے پہنچا اور کیا دیکھتا ہے کہ دریا سے نیل اُس مندر کے پانی کو کاٹ کے برابر بہتا چلا آتا ہے۔ اب وہ اُس سمندر پر چلا۔ وہاں کیا دیکھتا ہے کہ سیب کے ایک درخت نے ساہی بن ایک شخص کھڑا ہوا تھا۔ پیرکھ رہا ہے (شاید اس سمندر میں کوئی جزیرہ ہوگا) اُس شخص نے ایک اجنبی کو دیکھ کر سلام کیا۔ اور پوچھا "آپ کون ہیں؟" انھوں نے کہا "حامد بن ابی شالوم بن عیسیٰ بن اسحق بن ابراہیم اور آپ فرمائیے کہ آپ کون ہیں؟" اُس نے کہا "میں عمران بن عیسیٰ بن اسحق (تھوڑا بچا) ہوں مگر یہ بتاؤ کہ تمھارا بیان آنا کیونکر اور کس لیے ہوا؟" کہا میں تو دریائے نیل کا سراؤ دھونڈھنے کو آیا ہوں مگر تمھارا آنا کیونکر ہوا؟" جواب دیا کہ "جس لیے تم آئے ہو اسی لیے میں بھی آیا ہوں۔ مگر جب یہاں پہنچا تو خداؤں جل و علا نے وحی بھیجی کہ جب تک میں علم نہ دوں یہیں ٹھہرے رہو۔" اب حامد نے کہا اچھا آپ کو نیل کے جو کچھ حالات معلوم ہوئے ہوں تجھے سنائیے۔ اور بھلا کتا بون میں آپ نے کہیں دیکھا ہے کہ نسل آدم میں سے کوئی شخص دریائے نیل کے سرچشے تک پہنچ سکے گا یا نہیں؟" عمران نے کہا "ہاں۔" مجھے معلوم ہوا ہے کہ عیسیٰ بن اسحق کی نسل کا ایک شخص پہنچ سکے گا۔ اور اسے حامد میرے خیال میں وہ تھا جسے سو کوئی دوسرا نہیں جانتا۔ یہ سن کے حامد نے خوش ہو کے کہا "ایسا ہے تو پھر مجھے وہاں کاراستہ بتائیے؟" عمران بولا بتا دوں گا مگر پہلے تمھیں مجھ سے ایک شرط گونا گونی؟ حامد نے کہا آپ کی جو شرط ہو فرمائیے؟" کہا "جب تم دریائے نیل کے منبع اور سرچشے کو دیکھو گے تو پس

تو اگر میں زندہ ہوں تو اُس وقت تک میرے ہی پاس ٹھہرے رہو جب تک کہ حضرت
باری تعالیٰ مجھے وحی کے ذریعے کوئی حکم دے۔ یا مجھے اپنے پاس بلا لے۔ آخر انوکھ
صورت میں مجھے دفن کر کے چلے جانا۔ اور اگر واپس آ کے تم مجھے زندہ پاؤ تو مجھ نے کی غور سے
نہیں مجھے آغوشِ محبت کی سیر کرنا اور اپنی راہ لینا حائد نے کہا "اس شرط کو بسر و چشم
بجلاؤں گا۔" یہ اطمینان بخش جواب سن کے عمران نے کہا "تو جس طرح اس سمندر کو طے
کرتے ہوئے آئے ہو آگے چلے جاؤ۔ آگے بڑھ کے تمہیں ایک جانور ملے گا جس کا پچھلا حصہ
تو دکھائی دیتا ہو گا مگر اگلا حصہ نہ نظر آئے گا۔ تم اُس سے خوف نہ کھانا بلکہ دیکھتے ہی
اُس کی پیٹھ پر سوار ہو جانا۔ یہ جانور آفتاب سے دشمنی رکھتا ہے۔ جہاں آفتاب نے
طلوع کیا ہے اُسے وہاں تک کہ آفتاب اُترے زمین آجاتا ہے
اور اُسے ٹھہر جانا پڑتا ہے۔ پھر جب آفتاب کو غروب ہوتے ہوئے دیکھتا ہے تو پھر سمندر
کے اندر گھسٹتا ہے کہ وہاں کے نکل لے۔ غرض وہ تمہیں سمندر کے اُس پار پہنچا دے گا
تم خشکی پر قدم رکھ کے پھر آگے کی راہ لینا۔ اب نیل کے کنارے کنارے کوچ کر کے تم
ایک ایسی زمین پر پہنچو گے جو فولاد کی ہوگی۔ اُس کے پہاڑ جنگل اور بیابان
سب فولاد کے ہوں گے۔ اس سرزمین سے گزر کے تم تانبے کی سرزمین پر پہنچو گے
جہاں پہاڑ جنگل بیابان سب تانبے کے ہوں گے۔ اگر اس سرزمین سے بھی گزر گئے تو
چاندی کی سرزمین میں پہنچو گے جہاں کے پہاڑ جنگل بیابان سب چاندی کے ہوں گے
اس سے بھی تم گزر گئے تو سونے کی سرزمین میں پہنچو گے جہاں پہاڑ جنگل بیابان سب
سونے کے ہوں گے۔ بس اسی مقام تک تمہیں نیل کا حال معلوم ہو سکے گا۔ آگے نہ بڑھ سکو گے
عمران کی ان ہدایتوں کو بازو زمین باندھ کے حائد روانہ ہوا۔ اور تمام مراحل طے کر کے
سونے کی سرزمین میں پہنچ گیا۔ وہاں کیا دیکھتا ہے کہ خالص سونے کی ایک عظیم الشان
دیوار ہے اور اُس کی نیچے ادھر سونے کا ایک برج ہے جس پر طلائی گنبد ہے۔ اس گنبد کے
چاروں طرف سونے کے چار دروازے ہیں۔ دریا سے نیل کا پانی اُس دیوار کے اوپر سے
زور و شور کے ساتھ گرنے لگا اُس برج میں چلا آتا ہے۔ پھر اُس برج کے چاروں
دروازوں سے اُس کے چار دروازے گزرتے ہیں۔ اُن میں سے تین تو زمین کے اندر
غائب ہو جاتے ہیں اور ایک اوپر ہوتا ہوا آگے بڑھتا ہے جو کہ دریا سے نیل ہے۔

حاند نے بیان بیٹھ کے پانی پیا اور ارادہ کیا کہ اُس دیوار پر چڑھ جائے جہاں سے نیل کا اصلی بانی آتا ہے فوراً ایک فرشتہ نے نمودار ہو کے روکا اور کہا "حاند - بس - آگے بڑھو کا قصد نہ کرو - دریا سے نیل کا جس قدر علم تمھیں حاصل ہونا تھا ہو چکا - اب اس کے بعد جنت ہے - اور دریا سے نیل وہیں سے آ رہا ہے - " حاند نے کہا "میں جنت کی بھی سیر کرنا چاہتا ہوں - " جواب ملا "یہ اس زندگی میں غیر ممکن ہے -"

اب حاند نے پوچھا "تو یہ چیز جسے میں سانسے دیکھ رہا ہوں کیا ہے؟" فرشتہ نے کہا "یہ وہ آسمان ہے جس میں آفتاب اور مانتاب چکر لگاتے رہتے ہیں - یہ چلی کے مانند ہے" حاند بولا "میراجی چاہتا ہے کہ اس چرخ پو بجے میں بیٹھ کے ایک چکر میں بھی لگاؤں" اس کے بعد سے علما میں اختلاف ہے - بعض کہتے ہیں کہ "حاند اُس پر چڑھ گیا اور دنیا کے گرد چکر لگایا اور بعض کہتے ہیں کہ نہیں اس کی نوبت نہیں آئی -

اس کے بعد فرشتہ نے کہا "حاند اب تمھیں جنت سے رزق ملے گا - جو تمھاری زندگی کے لیے کافی ہو گا - اور اس کے سانسے تمھیں دنیا کی کوئی چیز مزہ نہ دے گی - یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ انگور کے تین خوشے اوپر سے اتر کے حاند کے ہاتھ میں آ گئے - یہ تین رنگ کے تھے - ایک زمر و سبز کا معلوم ہوتا تھا - دوسرا باقوت سرخ کا - اور تیسرا سفید موتیوں کا - فرشتہ نے دیکھتے ہی کہا "یہ جنت کی تاک کے انگور ہیں - مگر وہاں کے اصلی اور منتخب انگور دن میں سے نہیں ہیں - اب تم واپس جاؤ - اور نیل کا جس قدر حال تمھیں معلوم ہونا تھا معلوم ہو چکا -"

حاند نے پوچھا "مجھے یہ تو بتاؤ کہ یہ تین دھارے جو زمین میں غائب ہو جاتے ہیں یہ کہاں جاتے ہیں؟" فرشتہ نے کہا "ان میں سے ایک فزات ہے دوسرا جلد ہے اور تیسرا جیجوں ہے -"

اب حاند فرشتہ سے رخصت ہو کے واپس چلا - پہلے کی طرح دشمن آفتاب جلا نور کی مدد سے سمندر کے اُس پار آیا - اور اُس مقام پر پہنچا جہاں عمران سے ملاقات ہوئی تھی دیکھا تو اُسی دن اُس کا انتقال ہو گیا تھا - حسب وصیت اُسے سلاؤ و سلام کے اور گفتگو کے دفن کیا اور تین دن تک اُس کی قبر پر ٹھہرا رہا - جو تھے دن رات اُنکی کارواہ کیا تو ناگهان ایک چرم و نمودار ہوا جس کی پیشانی پر سجدے کا نشان تھا - اُس نے اُسے ہی

سلام کیا اور کہا "اے حامد۔ دریاے نیل کے کیا حالات تم کو معلوم ہوئے؟" انھوں نے
 جو کچھ دیکھا تھا بیان کر دیا جسے سن کے وہ کہنے لگا "ہاں یہی حالات ہم نے کتا بون میں
 دیکھے تھے۔ اس کے بعد اُس پیر مرد نے حامد کو سیب کا ایک درخت دکھایا۔ جس پر
 سیب لگے تھے اور کہا "اُمیرے ساتھ اس کے سیب تم بھی کھاؤ۔" حامد نے کہا میرے
 پاس جنت کے میوے موجود ہیں اور مجھے ممانعت ہے کہ اُن کے کھانے کے بعد دنیا
 کی کوئی عسڈانہ کھاؤں۔" پیر مرد نے کہا "سچ کہتے ہو۔ جو کوئی جنت کی میوے
 کھاتا ہو اُسے اور کوئی چیز نہ کھانی چاہیے۔ مگر بھلا کبھی تم نے ایسے سیب دنیا میں بھی
 کھاتے تھے؟ یہ درخت بھی جنت ہی سے آیا ہے۔ دنیا کا نہیں ہے۔ خدا نے عمران کو لے
 اس درخت کو یہاں اُگادیا تھا کہ وہ اس کے پھل کھایا کرے۔ اور تمھارے ہی لئے
 وہ مرحوم اُسے چھوڑ گئے ہیں۔ اور اگر تم نہ آتے تو یہ پھر آسمان پر چلا جاتا۔" اس کے بعد
 وہ پیر مرد برابر اس سیب کا شوق رکھتا رہا۔ یہاں تک کہ حامد کو بھلا معلوم ہونے لگا
 اور دل میں اس قدر شوق برپا ہوا کہ اُس میں سے ایک سیب توڑ کے منہ میں رکھا مگر
 جیسے ہی اس پر دانت مارے خور اپنا ہاتھ کاٹ لیا۔ اس پر سحر تھا کہ پیر مرد نے کہا
 "یہی وہ پھل ہے جس نے تمھیں جنت سے نکالا۔ ضرورت تھی کہ تم اس پھل کو کھاؤ تا کہ
 تم میں اور دنیا کے جو لوگ تمھارے جنت کے انگور دن کو کھائیں اس سیب کو کھانے کا ذمہ
 میں رہنے کے قابل رہیں۔"

اس کے بعد حامد ارمن صومین واپس آیا۔ لوگوں کو اپنے سفر کے واقعات بتائے۔

اور وہیں پیوند زمین ہوا۔

محمود و ایاز

محمود غزنوی اور اُس کے غلام ایاز کی محبت کے واقعات بہت مشہور ہیں۔
 جنھیں محمود نامہ نے خاص شہرت دے دی ہے۔ اس لیے کہ چند ہی روز پیشتر
 محمود نامہ خانہ سی کی ایک عام پسند ورسی کتاب مانا تھا محمود کو ایاز سے بیشک
 محبت تھی۔ اور ایسی محبت کہ محمود اُس کا عاشق مشہور ہو گیا۔ لیکن اس کی اصلیت
 اسی قدر ہے کہ ایاز کی تہذیب و شائستگی تمیز واری اور بلیغ شاعری نے محمود کو

اس کا ایسا گرویدہ بنا دیا تھا کہ لوگ اسے ایسا کا عاشق جاننا نہ کہنے لگے۔ مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ مجھ و غزنوی کا دل عشق کی گرمی سے خالی تھا یا قوت و طاقت۔ تاخت و تاراج - اور قتل و غارت نے اس کے دل کو اس قاب میں نہ رکھا تھا کہ آتش حسن کی گرمی پا کے پھلے اور کسی پری جمال کا شیفہ و شیداء ہو جائے۔ یقیناً اس کے دل میں عشق کی ایک جگہ گرمی تھی جس نے ایک زمانے تک بیقرار رکھا۔ مگر یہ عشق ایاز کے ساتھ نہیں بلکہ ایاز کی حسین و نازنین نازک اندام و گلابی ہونٹوں کے ساتھ تھا۔

محمد غوفی نے اپنی دلچسپ کتاب "جامع الحکایات" میں جس کے انتخاب کا ترجمہ مسٹر ایلکس نے اپنی تاریخ ہند میں دیا ہے اس عشق کا حال غفر اسیان کیا ہے جو ناظرین و نگاروں کے لیے غالباً لطیف سے خالی نہ ہو گا۔ مصنف مدد کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بیباک جوش عشق کو مجھ و غزنوی ایک مدت دراز تک نہایت ضبط و تحمل کے ساتھ اس طرح دل میں چھپائے رہا کہ کسی پر ظاہر نہ ہو سکا۔ دواں میں خیال کرتا تھا کہ اپنے ایک غلام کی بہن پر عاشق ہونا میری شان و فرمان روائی اور میری وضع عدالت گزری کے خلاف ہے۔ اور اگر یہ ذرا بھی ظاہر ہو گیا تو میں عام لوگوں کی نظر میں ذلیل و خوار ہو جاؤں گا۔

مگر عشق وہ خود مختار بادشاہ ہے جس کے دربار میں شاہ و گدا کا رتبہ ایک ہے اور جس کا شعلہ کسی نہ کسی دل بھڑک بی اٹھتا ہے۔ آخر کار دل میں تجارات و دانی کے سب سے ناقابل برداشت اس پیدا ہوئی۔ اور مجھ و کے ایسے ضابطہ و مہر میں بادشاہ کی یہ حالت ہوئی کہ صبر و تحمل نے قوایں سے دیا۔ اور ایک رات کو یہ واقعہ پیش آیا کہ جب ندیاں صحبت اور شیراز دولت رخصت ہو ہو کے اپنے اپنے گھروں کو جانے لگی تو مجھ و نے اپنا پادشاہ ابو نصر شکانی کی طرف منہ کیا۔ مطلب یہ تھا کہ پادشاہ کے پاس سے کچھ بھی ذرا اٹھو۔ ابو نصر مذکور کو مجھ و غزنوی کے مزاج میں تمام امرا سے دولت سے زیادہ خصوصیت حاصل تھی۔ اور وہی بادشاہ کا سب سے بڑا امرا و جوان تھا دل میں یہ سمجھ گیا کہ آج قبلہ عالم اپنا کوئی اہم راز ظاہر فرمانا چاہتے ہیں۔ اور اسے اپنا خیر سچا بادشاہ کا پادشاہ دیکھنے لگا۔

جب تھوڑی دیر تک وہ برابر جی کرتا رہا اور بالکل تھکائی ہو گئی تو سلطان نے کہا "ابو نصر حکیمون کا قول ہے کہ تین شخصوں سے اپنا راز نہ چھپانا چاہیے اول تو طبیب حاذق سے۔ دوسرے مہربان مقتدا سے دین سے۔ اور تیسرے عقلمند نوکر سے" ابو نصر نے ادب کے ساتھ عرض کیا "غلام کو تو ان میں سے کوئی عزت بھی نہیں نصیب ہے۔ لیکن اگر قبلہ عالم سرفرازی عطا فرمائیں گے تو غلام سے جہاں تک بنے گا اپنی حالت و یاقوت کے مطابق بجا آوری خدمت میں کوتاہی نہ کرے گا۔ اور اپنے آقا کو ان کے نیک و بد سے مطلع کر دے گا" محمود نے کہا "یہی میں چاہتا ہوں۔ خیر اب سنو۔ مدت دراز سے ایک خیال میرے دل میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا ہے۔ اور ہزار کوشش کرتا ہوں یہ پھانس کلیجے سے نہیں نکلتی۔ میں ایاز کی بہن کی صورت زیبا پر فریفتہ ہوں۔ اُس کے حسن و جمال نے مجھے بیتاب کر رکھا ہے۔ اور کسی طرح دل کو قرار نہیں آتا۔ اُسکی ولستان اداؤں۔ اُس کی ناز آفرینی کی حرکتوں نے مجھے دیوانہ کر دیا ہے۔ اگر اس شوق سے باز آجاؤں تو دل نہیں مانتا۔ اور اگر اُسے اپنی محبوبہ خاص اور اپنا شریک زندگی بناؤں تو ڈرتا ہوں کہ قرب و جوار کے سلاطین سُن کے کیا گھین گے؟ اور میری رعایا اس کا کیا اثر پڑے گا۔ مجھے ایسا نظر آتا ہے کہ یہ راز ذرا ہی غاش ہوا تو میں تم سب لوگوں میں یہاں تک کہ خدا اپنے نوکروں اور غلاموں کی نظر میں بھی حقیر و ذلیل ہو جاؤ گا ان سب پہلوؤں کا خیال کر کے بتاؤ کہ اس بارے میں تمھاری کیا رائے ہے؟ تاریخ پر تمھاری نظر بہت وسیع ہے۔ بھلا تم نے کسی تاریخ میں دیکھا یا سنا ہے کہ کسی بادشاہ نے اپنی کسی کنیز کے ساتھ شادی کی ہو؟"

محمود غزنوی اپنے آپ کو قدیم خسروانِ عجم اور سلاطین آل ساسان کی نسل سے خیال کرتا تھا۔ اُس کے اسی میلانِ جمیع کے سبب سے شعراے دربار نے تاریخِ عجم پر ایسی طبع آزمائیاں کیں جو قیامت تک یادگار رہیں گی۔ فردوسی طوسی نے شاہنامہ لکھا۔ حکیم آمد طوسی نے کر شاہ سب نامہ لکھا۔ چنانچہ ابو نصر مشکافی نے بھی اس موقع پر فرمانِ روایانِ اسلام کی ایک آدھ نظیر پیش کرنے کے بعد مناسب سمجھا کہ تاریخِ عجم میں سے ایسے شواہد پیش کرے جو بادشاہ کے دل پر پورا اثر کریں۔ اور اس کی فکر میں دُور کر دیں۔

چنانچہ زمین بوس ہوئے عرض کرنے لگا "قبلہ عالم یہ کوئی نئی بات نہیں۔ دنیا میں بارہا ایسے واقعات گزر چکے ہیں۔ سلاطین آل ساسان میں بہون نے اپنی بوندیوں سے شادیان گئیں۔ آل ساسان ہی وہ مسلمان تاجدار تھے جنھوں نے خاندان طاہریہ کے بہد خراسان و زابلستان میں آزادی کا جھنڈا بلند کیا تھا۔ اور انھیں سے بغاوت کر کے اُن کا غلام اپنلکین بادشاہ بنا تھا جو محمود کے باپ سبکتگین کا آقا تھا۔ اس بعد ابو نصر نے کہا "خداوند یہ کوئی ایسا معاملہ نہیں جو حضور پر گران گزرے یا جس کی وجہ سے دنیا میں کسی کی سبکی اور حقارت ہوتی ہو۔ غالباً حضور نے سنا ہو کہ دارا سے ایران آباد جب ترکستان میں گیا ہے تو وہاں کے کسی کسان کی بیٹی سے اُس نے شادی کی تھی جس کے بطن سے نوشیروان عادل کا ایسا عدالت گستر تاجدار پیدا ہوا۔ اس کے علاوہ میں نے تاریخ مج مین ہرام گور اور ایک کھلی دالے کی بیٹی کا واقعہ دیکھا ہے جو نہایت ہی دلچسپ ہے اور اُسے سن کے حضور پر روشن ہو جائے گا کہ ایسے واقعات سے سلاطین عالم کی عزت و وقار پر حریف نہیں آتا۔ محمود نے مشتاق ہو کے کہا وہ واقعہ کیا ہے اور ابو نصر مشکافی نے یوں بیان کرنا شروع کیا۔

"قبلہ عالم۔ ہرام گور ایک دن شکار کو گیا تھا۔ جنگل میں کسی ہرن کے پیچھے گھڑا والا تو اپنے لشکر سے کوسوں دور نکل گیا۔ آخر ہرن تو نظر سے غائب ہو گیا۔ اور بادشاہ پیاس سے متاثر تھا۔ پانی کی تلاش میں سرگردان تھا کہ ایک گاؤں میں گزر ہوا۔ جہاں ایک کھلی والا تالاب کے کنارے بیٹھا کپڑے دھو رہا تھا۔ تھوڑے فاصلے پر اُس کی بیوی اور اُس کی نازک اندام و گل پیر بہن بیٹھی تھیں اور اُن کے آگے کپڑوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ ہرام قریب گیا اور کہا "سیان کھلی دالے! مجھے تھوڑا سا پانی پلا دینا۔ کھلی والا صورت دیکھتے ہی پہچان گیا کہ حضور ظل اللہ علیہ وسلم کی تعظیم کے لیے اٹھا۔ اور بی بی سے پکار کے کہا "خداوند عالم کے لیے پانی لاؤ۔ اُس کی جو روئے اُٹھ کے کٹورہ خوب ماریج کے کئی بار دھویا۔ اور اُسے اپنی پری بنال بیٹی کے ہاتھ میں دے کے کہا "بی بی۔ مجھے مزہ لگا ہوا تھا۔ اس لیے میں اس قابل نہیں کہ بادشاہ لوگ میرے ہاتھ کا پانی پئیں۔ تو کنواری ہے اور نیرا پنڈا ابھی کورا ہے۔ اس لیے تو ہی پانی لائے اپنے نازک اور اچھے پرتے ہاتھ سے بادشاہ کے سامنے

پیش کرے۔ لڑکی ایک جست میچالاک کرنی کی طرح دوڑ کے پانی لائی۔ اور ایک معشوقانہ
اداسے شہرما کے بادشاہ کے سامنے پیش کیا۔ بہرام نے دلدادگی کے ساتھ اُس کی
ادائوں پر نظر ڈالی۔ کتورائے کے پانی پیا۔ اور اب سیراب ہو کے اُس کی صورت
زیادہ بھی تو

موس جانا رہا نگاہ کے ساتھ صبر رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ
اُس کے حسن و جمال اُس کی ناز آفرینی دو لڑائی۔ اور ان چیزوں کے ساتھ اُس کے
ادب اور سلیقے نے بہرام کے دل پر ایسا قبضہ کر لیا کہ بجائے ہر نی کا شکار کرنے کے
خود ایک زیا شامل غزال۔ عناق کا شکار ہو گیا۔ دل میں سوچنے لگا کہ اس معشوقہ
ناز آفرین کو کیونکر اپنا بناؤں۔ اور جب اُس محبوبہ و شیرہ کے بارغ حسن سے گلے میں
کی کوئی تدبیر نہ بن پڑی تو بھلی واسے سے کہا "میراجی چاہتا ہے کہ آج تمہارا ہی مہمان
رہوں۔ تمہیں اس میں کوئی عذر تو نہیں ہے؟" اُس نے زمین بوس ہو کے عرض
کیا "قبلہ عالم حقیر کی نان خشک اور غریب کا کھانا کھانے میں حضور مہمان فقہ نہ تھیں
تو ہم لوگ اسے اپنی خوش نصیبی تھیں گے۔"

یہ کہہ کے بھلی واسے ایک اعلیٰ چاندنی لاکے ایک درخت کے سائے میں بچھا دی
اور عرض کیا کہ "حضور رونق افروز ہوں۔" پھر بادشاہ کے گھوڑے کو لے جا کے ایک
درخت میں باندھ دیا۔ اور ناز آفرین بیتی کے ہاتھ میں ایک صاف اور پاکیزہ کپڑا اُسے
کے کما کر تو بادشاہ کے قریب کھڑی ہو کے گس رانی کر لڑکی باپ کے حکم سے اپنا
فرق ادا کرنے لگی۔ اور وہ خود گاؤں میں دوڑا گیا اور دم بھر میں لپک کے روتی۔
گوشت۔ شراب وغیرہ ضروری سامان ضیافت لے آیا۔ واپس آئے ہی اُس نے
جام و عراجی لڑکی کے ہاتھ میں دیے اور کہا "تو ہی بادشاہ کی ساقیہ بن لڑکی نے
سلیقہ اور نفاست کے ساتھ جام کو دھوا بج کے صاف کیا اور اُسے سئے ارفوانی سے
لبریز کر کے ایک ایسی اداس بادشاہ کے سامنے پیش کیا کہ بہرام گورنے جو اُس کے حسن کا
دیوانہ اور جوش عشق سے تیار ہو رہا تھا بعوض اس کے کہ جام کو اُس کے ہاتھ سے لے
خود اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ بادشاہ کی اس بے اعتدالی پر ناز آفرین لڑکی نے یہ حرکت
کی کہ بھک کے اس کے دونوں ہاتھ چوم لیے اور پیچھے سٹ کے ادب سے کھڑی ہو گئی۔

بادشاہ اس ادا سے اور متیاب ہو گیا اور کمال از خود بخشی کے ساتھ بولا "در بانازنین۔
 بوسہ لینے کی جگہ ہاتھ نہیں ہونٹھ ہیں۔" شوخ انداز کی نے مسکرا کے کہا "لیکن ابھی
 اس کا وقت نہیں آیا۔" اس فقرے نے بہرام کو اور مار ڈالا۔ حسن و جمال پر فریفتہ تو پہلے ہی
 سے ہو رہا تھا اب اُس کی یہ باتیں سنیں اور انداز گفتار کے ساتھ اُس کے اعجاز فصاحت
 کو دیکھا تو بالکل دل ہاتھ سے کھو بیٹھا۔

اتنے میں بہرام کا لشکر اور اُس کا جلوس سامنے سے نمودار ہوا۔ اس لیے کہ اُس
 سلطنت اور سرداران فرج اُسے دھونڈتے تھے ہوئے یہاں آپہنچے تھے۔ چونکہ پچھلی
 واسے کی لڑکی اُس کے دل میں جگہ پا چکی تھی اس لیے یہ گوارا نہ ہوا کہ اُس کے رخ
 زیبا پر کسی اور کی بھی نظر پڑے۔ تاجدار عجم اس بار میں نہایت ہی سخت تھے۔
 یہاں تک کہ اُن کے حرم کی کسی خاتون پر کسی غیر کی نظر پڑ جاتی تو وہ واجباً قتل
 قرار پا جاتا۔ اس جذبے سے متاثر ہو کر بہرام نے بے اختیار اُس نازنین لڑکی
 سے کہا "تم اپنا منہ چھپا لو۔" یہ گویا اشرا رہ تھا کہ "اب یہ لڑکی ایک غریب چھپی والی
 نہیں بلکہ تاجدار عجم کی دلدار ملکہ اور اُس کے دل و جان کی مالک ہے۔" بادشاہ کا
 اشارہ پاتے ہی لڑکی نے منہ پر نقاب ڈال لی۔ اس کے بعد فوج نے سامنے صفت بانڈا
 کے سلامی لی۔ اور محسنو صلین بارگاہ قریب آ کے زمین بوس ہوئے۔

اب بہرام گورمین صبری طاقت نہ تھی۔ اُسی وقت پچھلی واسے کو راضی کر کے
 اُس کی مہوش اور گل اندام بیٹی سے رواج رسوم کے مطابق عقد نکاح کیا اور ایک
 گھڑی نہیں گزری تھی کہ وہ ماہ طلعت پچھلی والی شاہانہ لباس پہنا کے ہاتھی کے
 عماری زندگاری میں بٹھائی گئی اور چتر شاہی اُس کے سر پر سایہ افکن ہوا۔ اُس کے
 مان باپ کو بھی دوسرے ہاتھیوں پر جگہ دی گئی۔ اور شاہانہ کروفر اور پورے
 تزک و احتشام کے ساتھ اُس نازنین کی سواری دار السلطنت عجم میں داخل ہوئی
 اس قصہ نے محمود غزنوی کے دل پر بے انتہا اثر ڈالا۔ دل میں کہنے لگا
 "صد شکر کہ میری معشرہ اُس پچھلی واسے سے بدرجہا زیادہ معزز و محترم ہے۔" پھر
 ابو نصر شکانی سے کہا "تم نے میری بڑی فکر و زور دی۔" اور اُسے بہت کچھ انعام و اکرام
 کے ساتھ رخصت کیا۔

اس واقعہ کو وہی دن گزرے تھے کہ ایاز کی پری جمال بہن کی شادی سلطان محمود کے ساتھ ہو گئی۔ جو کہ اب ایک غلام کی بہن اور - فونڈی ہونے کے بجائے غنی سے لے کے مشرق میں بنگالہ اور مغرب میں فارس و دہلی تک تمام ممالک کی پرسیوں و جوتوں کی

ندوۃ العلماء اور لانا شیلی

اس امر پر ہماری ساتھ ہندوستان کے بہت سے مسلمان متاسف ہوئے کہ مولانا شیلی ندوۃ العلماء سے علیحدہ ہو گئے۔ ہم بہت سی باتوں میں مولانا شیلی کے خلاف ہیں جیسا کہ اکثر ہماری تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن باوجود اس کے ہم ان لوگوں میں ہیں جن کی رائے ہے کہ پیر مولانا شیلی کے ندوہ چلی ہی نہیں سکتا۔ اور پھر ابھی تو وہ ندوہ نہ ہوا جس کی مسلمانوں کو ضرورت ہے۔ یا تو ہم کہہ سکتے ہیں۔

ہم ابتدا سے مولانا شیلی سے واقف ہیں۔ اور بجائے خود عقیدہ رکھتے ہیں کہ مولانا ندوہ کی بیاہتوں کا بلیو اور نیز ان کی کمزوریوں اور نرسوں سے جتنے ہم واقف ہیں دوسرا کم ہو گا۔ اور ان کی زندگی کے روشن و تاریک دونوں رخوں پر غور کرنے کے بعد ہم یہی رائے قائم کر سکتے ہیں کہ کم از کم جب تک مولانا شیلی زندہ ہیں ندوہ کو انھیں کی پاسی پر چلنا چاہیے۔

بدقسمتی سے مولوی عبدالعزیز صاحب کا ایک انفرس نامک واقعہ پیش آیا جس میں اگر کوئی بے ضابطگی یا کمزوری مولانا شیلی سے ظاہر بھی ہو گئی تو وہ ایسی نہیں ہو سکتی کہ اس کی بنا پر مولوی شیلی کی تمام خوبیوں سے قطع نظر کر لیا جائے اور اس معاملے میں بھی اس بات کے ماننے میں کسی کو حائل نہ ہو گا کہ جو احتیاط مولانا نے برتنی وہ ندوہ اور مسلمانان ہند کی فلاح و خیر خواہی ہی پر مبنی تھی۔ اگر اس کو غلطی ہی مانا جائے تو اس سے کسی کو اتکار نہیں ہو سکتا کہ یہ اجتہادی غلطی تھی جو ہمیشہ اور ہر قوم میں قابل معافی خیال کی گئی ہے۔

اب مولانا کا استعفا منظور ہو جانے کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ ان پر سخت ناپاک اتہامات لگائے جانے لگے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ بعض بات کی رقمین جو انھیں ندوہ کے لیے دی گئی تھیں انھوں نے داخل نہیں لیکن اور ان پر ذاتی سرواے کی طرح تصرف کیا

مولوی شبلی کی شان ایسی بددیانتوں سے بہت ارفع ہے۔ ہمارے سامنے ایسے
مسیحین واقعات گزر رہے ہیں کہ بعض لوگوں نے جو وہ مولانا شبلی کی نذر کیا تھا انھوں
نے اُس کے لینے سے قطعی انکار کیا اور صرف اس شرط پر قبول کیا کہ بجائے اُن کی عزت کے
ندوہ کو دیا جائے۔ بعض محال اگر ندوہ کی کوئی رقم مولوی شبلی سے صرف بھی ہو گئی
ہے تو یقین رکھنا چاہیے کہ ندوہ ہی کی ضرورت میں صرف ہوئی ہوگی اور وہ اُن بھاری
رقم کا سواں حصہ بھی نہ ہوگی جو مولوی شبلی کے لینے سے ندوہ کو وصول ہوئی ہیں۔
مولوی شبلی کبھی اُن نفس پرست سرگروہاں امت میں نہ تھے جو قومی جلسہ ندوہ اور قومی
سفروں کے دیو سے اپنی جھولی بھرا کرتے ہیں۔ اور قوم کی خدمت کا نام لے کے ذاتی فائدے حاصل
کرنا چاہتے ہیں۔ اُن کو زر طلبی کا الزام دینا ایسا ہی ہے جیسے سرسید یا نواب محسن الملک
کو غبن اور تصرف ناجائز کا الزام دیا جائے۔ اُن بزرگوں کے زمانے میں بھی کالج کے
روپیہ میں کئی بار غبن ہو گیا۔ لیکن سوا اس کے کہ لاعلمی اور حسابات کی غلطی نہ ہو نہ غبن
کا الزام ان مروجین کو دیا جائے کبھی کسی کو یہ جرات نہیں ہوئی کہ انھیں بدیہی یا غلبہ
صرف کا الزام دے۔ مگر قوم کی بدقسمتی سے مولوی شبلی کو ایسے ہی معاملات میں
بددیانتی کا الزام دیا جاتا ہے۔

پتہ یہ ہے کہ مولوی شبلی کی زیادہ تر بے طبع و بے حوص عالم ہندوستان میں چراغ
لے کے دھونڈ رہے تو کبھی نہ ملے گا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ سلسلہ درس اور علمائے
مدرسین کے طریقہ تعلیم میں اکثر دخل دے دیا کرتے ہیں مگر ہر وہ شخص جو بچوں کی نگرانی کا
ذمہ دار بنا ہو اُس کا فرض ہے کہ ان امور میں پوری نگرانی کرے۔ گورنمنٹ کے
سرشتہ تعلیم کے انسپکٹر وقتاً فوقتاً جیسا سخت امتحان معلوم اور مدرسوں کا لیا کرتے ہیں
اُس کی ادھی سختی بھی کبھی مولوی شبلی نے نہیں برتی۔ لیکن بدیہی سے ہمارے ملا اس کے
ذرا بھی تحمل نہیں ہو سکتے کہ کوئی اُن کے طرز تعلیم کی نگرانی کرے۔ اور اگر اُن کی مرضی
کے خلاف کوئی افسر اس بارے میں اپنے مخالف کے بجا لانے پر آمادہ ہو جاتا ہے تو وہ
اُس کے خلاف سازشیں شروع کرتے ہیں۔ اور آخر ایک غوغا اور ہنگامہ مچا کے اُسے
ہٹا دینا چاہتے ہیں۔ مگر مولوی شبلی حسابات کی تفریح میں جاسے کہ وہ ہیں مگر عقلی تشخیص
مداہنت کو ایک گھڑی کے لیے بھول جاتے ہیں۔ لہذا اُن کا ایسی سازشوں کا

شکار ہونا ضروری تھا۔

مذہ کے ارکان میں مولوی شبلی کے خلاف مدت سے ایک خطرناک قوت قائم تھی۔ اُن میں ایک گروہ اُن پر اُسے مذاق کے علما کا ہے جو ضروریات زمانہ سے نا آشنا بخت میں اپنی تنگ خیالی سے معاملات پر اجتہادی نظر نہیں ڈال سکتے۔ اپنی ضد پر قائم ہیں اور بافضل نہیں پسند کرتے کہ سلسلہ تعلیم میں کسی قسم کا تغیر و تبدل کیا جائے۔ یا انکی رائے سے کسی کو اختلاف ہو۔ ایک دوسرا گروہ اُن بزرگوں کا ہے جو بجائے خود نہ عالم ہیں نہ فاضل۔ بلکہ یہ چاہتے ہیں کہ ہم علما کے علم برادر بن کے اُنکے جلیں۔ اور نوکل حکام اور گورنمنٹ کی نظر میں یہ دکھائیں کہ قوم کے اصلی لیڈر ہم ہیں۔ اور علما ہمارے پیرو۔ اُن کا اصلی منشا یہ ہے کہ بہت سی فضیلت کی پگڑیاں اپنے پیچھے دکھا کے خیر خواہی سرکار کی پگڑی اپنے سر پر بندھوا لیں۔

مولوی شبلی نے دونوں گروہوں کو دبا رکھا تھا۔ اُنھوں نے علما کے عام مذاق کے نصاب تعلیم اور طرز تعلیم میں اصلاحیں کیں۔ اور اُن علمبرداروں سے جھنڈا چھین کے اس بات کا دعویٰ کیا کہ علما کے لیے وسائل و ذرائع کی ضرورت نہیں بلکہ خود علما کو چاہیے کہ حکام سے ملیں اور اپنے اور اُن کے مقاصد پر غور کر کے اپنے لیے سلامت ردی کار راستہ بنائیں۔ اس کوشش میں وہ کامیاب ہوئے۔ اور یہ ہے کہ اسی اصول کو برت کر مذہ کے اکثر مقاصد کو اُنھوں نے نہایت ہی آسانی اور صفائی کے ساتھ حاصل کر لیا۔

نصاب تعلیم کی اصلاح۔ گورنمنٹ سے نہایت ہی مناسب موقع پر زمین کا ملنا۔ ایک نہایت ہی عالی شان عمارت کی بنیاد ڈالنا اور اُسے تکمیل کے قریب تک پہنچا دینا۔ ان ضرورتوں کے لیے کافی سرمایہ فراہم کر لینا اور گورنمنٹ سے بغیر کسی بشرط کے مدد کامل جانا یہ سب وہ کام ہیں جو مولانا شبلی کے ہاتھ سے تکمیل کو پہنچے اور کسی اور کے ہاتھ سے بمشکل انجام پاسکتے تھے۔

ان کاموں کے لیے سب سے زیادہ ضرورت روپے کی ہے۔ روپیہ جس قدر فراہم ہوا ہے اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اُس کا غالب حصہ مولوی شبلی ہی کی کوششوں کی برکت ہے۔ اگر آپ غور سے دیکھیں گے تو مذہ کے دارالعلوم میں نوکل سرمایہ

بست ہی کم لگا ہے۔ اور باہر سے جس قدر روپیہ آیا ہے وہ صرف مولوی شبلی کے اعتبار پر ہے۔
 ہندوستان کے علما میں اکیلے مولوی شبلی ہی ہیں جن کو ملک کا بچہ سمجھا جاتا ہے۔ انکی
 بے نظیر اور مقبول عام تصانیف نے انھیں ہمارے اس کاروبار تک اور دنیا کا ہر
 اقصا نشان تک ہر شخص کے دل میں محبوب بنا دیا ہے۔ مگر اور بڑی مین بھی انھوں نے
 نامور سی حاصل کر لی ہے۔ اور وہ جدھر کا رخ کرتے ہیں ان سے پہلے ان کا ہر دوریز نام
 پہنچا ہوا ہوتا ہے۔ ایسے شخص کو چند مجہول الحال اور محدود و غریب کے لوگوں کا علم نہ
 کر دینا سوا اس کے کہ کسی سازش پر محمول کیا جائے اور کیا خیال جاسکتا ہے جس
 نگاہ سے قوم مولوی شبلی کو دیکھ رہی ہے اگر ارکانِ ندوہ بھی اسی نظر سے دیکھتے تو
 بجائے ان کے علم نہ کرنے کے انھیں انکھوں پر بٹھاتے۔ مگر جن لوگوں کو اپنی قدر
 بڑھانے کی ضرورت ہے وہ ایسے شخص کو موصوفیٰ نگاہ سے دیکھنے کے قدر و منزلت
 کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتے۔

ہم دنگداز کے صفحوں پر کبھی کبھی مولانا شبلی کو چھڑا کرتے تھے جس سے ہمارا
 مقصد یہ تھا کہ نکتہ چینی کا سلسلہ منقطع نہ ہونے پائے اور مولانا کی عمر شریف کو عالم
 آشکارا کر کے انھیں قنبہ و ہوشیار کرتے رہیں اور ان کا مزاج جاوہرِ اعتدال سے
 نہ ہٹے۔ پاس۔ یہی نتیجہ ہم مسلم گزٹ کی نکتہ چینیوں کا بھی تصور کرتے تھے۔ مگر یہ نہیں سمجھتے
 تھے کہ ان آشوب زامین سے ان لوگوں کو فائدہ اٹھانے کا موقع مل جائے گا
 جو مولانا شبلی کو اپنے مقاصد و اغراض کے خلاف خیال کرتے تھے۔ مگر نہیں ہماری امید
 کے خلاف یہ نتیجہ نکلا کہ مولانا ندوہ سے علیحدہ ہو گئے جس سے مولوی شبلی کو تو کسی
 قسم کا ضرر نہیں پہنچ سکتا ہاں ندوہ البتہ مت گیا۔

مولوی شبلی کی علیحدگی کے بعد ندوہ ہندوستان میں اپنا اگلا اعتبار ہرگز نہیں قائم
 رکھ سکتا۔ بلا و دور دور از کے لوگ جو ندوہ کو مولانا کے ذریعہ سے جانتے اور اس کے
 حامی و مددگار تھے سب علیحدہ ہو جائیں گے۔ یہ ہم نے مانا کہ پڑانے حاسد اپنے گھروں
 کے اندر آتشِ حسد کے شعلوں پر ایک مزہ دار ہانڈی پکالین کے لیکن اس کا کیا
 علاج کہ سارا ہندوستان اپنا منہ بد مزہ پائے گا۔

ہندوستان میں جہاں قابل اور بچے خیر اندیشان ملت کی بست کی ہے اور جہاں

بے غرض خیر خواہ قوم دھونڈنے نہیں ملتا ہر کام اُسی وقت چل سکتا ہے جب کوئی سچا
اخبار نفس کرنے والا مل جائے۔ اور اُسی وقت تک چل سکتا ہے جب تک کہ وہ اُسی کے ہاتھ
میں رکھا جائے۔ ہندوستان میں اور وہ بھی مسلمانوں میں اس بات کی سید کرنا کہ ہم جس
کسی کو منتخب کر دیں گے وہ کام کو چلا لے جائے گا تا عاقبت اندیشی اور نادانی ہے۔
یہ یورپ بھر کا انگلستان کے لیے ہے کہ جس کام کے لیے جو مقرر کر دیا جاتا ہے وہ اُسے
غرض اسلوبی سے چلانے لگتا ہے۔ ہندوستان میں آج تک جو کچھ ہوا ہے شخصی کوششوں
سے ہوا ہے۔ اور جس شخص نے آغاز کیا آخر تک وہ کام اُسی کی ذات سے وابستہ رہا۔
علیگڑھ کالج کو سرسید نے قائم کیا۔ دیوبند کے مدرسہ کو مولوی محمد قاسم صاحب نے
جاری کیا۔ اور اسی طرح کے سب کام ہیں۔ لیکن سب کا انتظام اُسی وقت تک درست
رہا جب تک وہ اپنے پہلے مانی کے ہاتھ میں رہے۔ اور اسی وجہ سے کامیاب ہو سکے کہ
اپنے بانیوں کی زندگی بھر انھیں کے ہاتھوں میں رہے تھے۔

اسی طرح یہ بھی خوب سمجھ لو کہ زندہ بھی اُسی وقت تک چلے گا جب تک وہ اُس کے
ہاتھ میں ہے جس نے اُسے اس درجہ کمال تک پہنچایا ہے۔ مولوی شبلی کے بزرگ زندہ
بعض لوگوں کے لیے سرخروئی کا اور بعض کے واسطے گورنمنٹ سے خطاب ملنے کا
ذریعہ تو ابھی ہونے کا مگر نہ وہ نہیں باقی رہ سکتا۔

جمن پتین ہے اور یقین کے ساتھ افسوس ہے کہ ہندوستان میں جہاں جہاں
خیر پسند نے گئی کہ زندہ کو اب مولوی شبلی سے تعلق نہیں ہے وہاں زندہ کا اعتبار جاتا
رہے گا۔ زندہ نے اپنی طاقت سے کسی معمولی شخص کو نہیں کھویا۔ اُس نے اسے
شخص کو کھویا ہے جو دراصل زندہ کا روح رواں تھا۔ اور جس کے ہتھے ہی اُس کے
اعتبار کا است زیادہ حصہ قوم کے دلوں سے اٹھ گیا۔

اقم جعفر

یہ محترم خاتون عبداللہ بن عرفہ کی بیٹی تھیں۔ مدینہ طیبہ کے شریفہ اور عزیز مستند
خاندانوں میں سے تھیں۔ اور بے نظیر حسن و جمال کے ساتھ دانائی و فراست اور قابلیت
عفتہ میں بھی مشہور تھیں۔ اسلام کا ابتدائی زمانہ اور تابعین کا دور تھا۔ جب شرعاً

عرب کا معمول تھا کہ ہمارے شاعر دن کی طرح عام حسن کے ولدادہ یا کسی غیر متعین مشوق کے شدید انہیں ہو کر لڑتے۔ بلکہ اُن کا معمول تھا کہ کسی خاص حسینہ کو اپنی عاشقی اور خیال کے لیے منتخب کر لیا کرتے اور اُس کا نام لڑے کے اظہار عشق کرتے اور مجنونانہ تعریف خانی کرتے پھرتے۔ پہلے یہ ہے کہ شریف زاد یوں کے لیے یہ زمانہ نہایت ہی خطرناک تھا۔ اور پھر اسکے ساتھ عربوں کا یہ اصول معاشرت کہ جس عورت کے ساتھ کسی کو شادی سے پہلے عشق ہو جائے اُس کے ساتھ نکاح کرنا نہایت ہی معیوب اور موجب بدنامی و رسوائی خیال کیا جاتا۔

غرض ایسا نازک زمانہ تھا کہ اُمراء شہزادے عرب کی محفلوں میں اُم جعفر کے حسن و جمال اور اُس کی نازنینی و دلبری کی شہرت ہوئی۔ اور جن لوگوں کو کبھی اسکے رخ زیبائی کی زیارت نہیں نصیب ہوئی تھی ”مصدق ۲“ بسا کین دولت از گفتار خیزد“ اُس کی نزاکت و رعنائی کی یاد میں سر دھننے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُس عہد کا مشہور شاعر احوص اُم جعفر کا عاشق ولدادہ بن گیا۔ اپنے اشعار میں علانیہ اُس کا نام لیتا ایک ایک کے سامنے اُس کے رخ زیبائی کو یاد کر کے روتا۔ اور اپنے کلام میں بے تکلف ظاہر کرتا کہ میں اکثر جا کے اُم جعفر سے ملتا ہوں اور اُس سے یوں راز و نیاز کی باتیں ہوتی ہیں۔ فلان مقام پر اُس نے مجھ سے یہ کہا اور میں نے اُس سے یہ جواب دیا اور فلان موقع پر مجھے اُس کی یہ در باری کی ادا نظر آئی اور میں یوں کلیجہ تھام کر کہتا۔ جب یہ اشعار مشہور ہوئے اور احوص کے کلام کی عام مقبولیت کے باعث تھام لوگوں کی زبانوں پر اُم جعفر کا نام جاری ہو گیا تو اُس پاکدامن خاتون کو کل شرفاء معززین بدگانی کی نظر سے دیکھنے لگے۔ یہاں تک کہ اُم جعفر کے عزیز و قرب تاجران کی عصمت و ناموس پر حرج آنے کے خیال سے پریشان اور شرمندہ ہوئے لگے۔ اور سب نے اُم جعفر کو دانشا اور سخت دست کننا شروع کیا۔ غریب معصومہ نے قسم کھائی کہ میں نے تو سمجھا اس ظالم احوص کی صورت بھی نہیں دیکھی۔ جانتی ہی نہیں وہ کون ہے اور کیسا ہے۔ اور میں تو جانتی ہوں کہ اُس نے بھی مجھے کبھی نہیں دیکھا ہے۔ یہ فقط اُس کی شرارت و بھیمائی ہے جو مجھے مفت اور بے وجہ بدنام کر رہا ہے۔ اور اُم جعفر اپنی پاکدامنی و عفت کی تمہین کھا رہی تھی اور اُمراء احوص عام مجبور میں

غل بچاتا پھرتا تھا کہ ام جعفر کی نگاہ نازیرون میرے کلیجے میں اتر گئی۔ اور یوں نلانی مقام پر وہ اپنے تمام عزیزوں سے چھپ کے مجھ سے ملی اور مجھے دیوانہ بنا کے چلی گئی۔ آخر ام جعفر کے بھائی امین کو غصہ آگیا۔ اور طیش میں آئے احوص کے پاس کھڑا بھیجا کہ اپنی ان حرکتوں سے باز آؤ ورنہ بُرا ہوگا۔ تم ایک شریف زادہ کی کوہنوت بدنام کر رہے ہو۔ جس سے اُس کے دامن نفعت میں وحسبہ لگا جاتا ہے۔ اگر پھر بھی تم نے اس بارے میں کوئی کلمہ منہ سے نکالا تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔ مگر احوص اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا۔ اور امین قطعی طور پر آمادہ ہو گیا کہ کسی دن اُس سے دو دہا پتھر ہو جائیں۔ جب یہ خبر مشہور ہوئی تو حاکم مدینہ نے اس اندیشہ سے کہ ان دونوں کی عداوت سے کہیں امن عامہ میں خلل نہ پڑ جائے دونوں کو پکڑ لایا۔ پھر دونوں کے پاؤں ایک رسی میں بندھوا کے کوڑے دونوں کے ہاتھوں میں دیے اور کہا "اب دونوں لڑو۔ دیکھو کون زیادہ مار لکھاتا ہے؟" اس لیے کہ رسی میں بندھے ہونے کی وجہ سے کوئی بھاگ نہ سکتا تھا۔ کمزور اور مغلوب سو اس کے کہ کھڑے کھڑے مار لکھائے اور کچھ نہ کر سکے گا۔

اب دونوں زور و شور سے کوڑے بازی کر رہے تھے۔ مگر امین کے دل میں شریفانہ غیرت و محبت کا سچا جوش تھا۔ اور احوص میں علاوہ اس کے کہ شہر اکثر بزدل ہوتے ہیں کھڑبدا فقر کی کمزوری تھی۔ چند ہی کوڑے کھائے تھے کہ کمال بہ حواسی کے ساتھ جان چھڑانے کے لیے رسیاں ترانے لگا۔ اور آخر اپنے آپ کو چھڑا کے نوک دم بھاگا۔ امین پیچھے دوڑا۔ اور دوڑتے کوڑے مارتا چلا گیا یہاں تک کہ احوص کسی گلی میں بھاگ کے غائب ہو گیا۔

اس طریقہ سے امین نے پنجویں سزا دے لی۔ اور بہت کچھ مل کی بھڑاس بھی نکال لی۔ مگر جو اصلی مقصد تھا نہیں حاصل ہوا۔ اس لیے کہ احوص باوجود بھاگتے پھرنے کے اب بھی اُسی قسم کے اشعار کہتا۔ اور ام جعفر کو اور زیادہ بدنام کرتا پھرتا۔ اب امین کے خیال میں سو اس کے کوئی تدبیر نہ تھی کہ احوص کو جو چھپتا پھرتا تھا کہیں دھونڈ لے سکے۔ اور جہاں لے لے تا مل مار ڈالے۔

اسی اثنا میں ایک دن احوص اپنے احباب کے ایک بڑے مجمع میں بیٹھا ہوا غزلی خوانی

کر رہا تھا۔ اور توک اُس کی نازک خیامیوں کی داد دے رہے تھے۔ انھیں اشعار میں اُس نے اپنے وہ اشعار بھی سنائے جو اُم جعفر کے حسن کی تعریف میں تھے اور جن میں اُس سے ملنے اور وصل کا وعدہ لینے کا تذکرہ تھا۔ ناگمان ایک بُرقع پوش عورت آئی اور خضام کے لہجے میں احوں سے کہنے لگی "آپ نے مجھ سے وہ بھڑی لی تھی مگر اُس کے دام آج تک نہیں دیے۔ اب میں نہایت پریشان و تنگ دست ہوں۔ لہذا اُس کو دام دے دیجیے۔ احوں نے کہا "میں نے کبھی تم سے کوئی بکری نہیں لی۔ عورت بولی "مجھے مجلس و نادار اور بے کس و بے بس دیکھ کے تم نے انکار کر دیا! مگر میں بے پیہ نہ رہوں گی۔ یہ کہہ کر اُس نے ایک کاغذ نکال کے نڈیان صحبت کے ہاتھ میں دیا۔ اور رو رو کے کہنے لگی "دیکھیے اس کاغذ پر انھوں نے مجھے لکھ بھی دیا تھا اور آج کس طرح صفائی کے سامنے کرے جاتے ہیں۔ زمانے کا یہی حال ہے تو کوئی کیونکر جیسے گا؟" لوگوں نے وہ کاغذ احوں کو دیا جسے وہ مجھ کے اُس نے کہا "یہ میرے ہاتھ کا لکھا ہی نہیں ہے۔ یہ کوئی سکار اور جلد ساز عورت ہے جو خواہ مخواہ مجھ سے کچھ روپیہ لے کر ناجائز ہے۔ اس کا جواب سن کے عورت نے رون پٹیا اور آہ و وادیا کرنا شروع کیا۔ اور اُسے بہا بہا کے کہنے لگی "لوگو خدا کے لیے نصیحت میری مدد کرو۔ میں قانون مر رہی ہوں۔ مفلسی نے نام شہید تک کو محتاج کر دیا ہے۔ بڑا سہارا ان روپیوں کا تھا جو اس ظالم کے ذمے ہیں۔ انیسویں یہ بھی مکر گیا۔ ہاے میں تو مر جاؤں گی۔ عورت کچھ ایسی بے کسی سے پھوٹ پھوٹ کے روئی کہ حاضرین کو اُس کی حالت پر ترس آگیا۔ اور سب نے احوں سے کہا "تم کو ایسی بے رحمی نہ کرنی چاہیے۔ اس کا جو کچھ باقی ہو اسی وقت دے دو۔ احوں نے کہا "آپ کیا کہہ رہے ہیں! میں خدا کی قسم اُس سے واہٹ ہی نہیں ہوں۔ جانتا بھی نہیں کہ کون ہے اور کہاں رہتی ہے۔"

یہ سن کے عورت بولی "اچھا ظالم رہ۔ تو نے میرے روپیوں سے انکار کیا۔ اپنی تحریر سے انکار کیا۔ کیا اب میری صورت سے بھی انکار کر جائے گا؟ مگر میں یہ جبر سے کو گھر تک پہنچائے نہ رہوں گی۔ اور اپنا روپیہ لے کے جاؤں گی۔ یہ کہتے ہی عورت نے چہرے پر سے نقاب جو اٹھی تو معلوم ہوا کہ ابرہین سے چودھویں رات کا چاند نکل آیا۔ حاضرین کی آنکھیں چکا چودھ ہو گئیں۔ اور سب بھو بھوکا رہ گئے۔ ایسا

عالم آشوب چہرہ دکھائے عورت نے کہا "اب تو پہچانا یا اب بھی انکار کی جرات کرے گا؟" احوص نے کہا "یہ صورت زیبا بھی آج ہی دیکھی ہے" سنے ہی عورت نے اس طرح غل جھاکے رونہ پینٹنا شروع کیا کہ بہت سے راہگیر کھڑے ہو گئے۔ اور سیکڑوں آدمیوں کا مجمع ہو گیا جن کے سامنے احوص انکار کیے جاتا تھا کہ "میں نے اس نازنین کو کبھی نہیں دیکھا ہے" عورت نے کہا "اچھا یوں ہی سہی۔ تو قرآن اٹھائے کہ آج سے پہلے کبھی تو نے میری صورت نہیں دیکھی ہے۔ میری جان کو صبر کر کے میں اپنا رویہ چھوڑ دوں گی؟ احوص بولا "مجھے منظور ہے" اور قرآن ہاتھ میں لے کے کہہ دیا کہ "میں نے کبھی اس عورت کی صورت نہیں دیکھی ہے" احوص نے حلف اٹھائی ہی تھی کہ عورت نے نہایت ہی جوش طیش کے ساتھ بڑھ کے احوص کے منہ پر شوک دیا۔ اور ساتھ ہی اپنے ماہ و شہر کے نقاب میں چھپا کے بولی "لوگو! تم سب کے سامنے یہ حلف اٹھا چکا ہے کہ اس نے آج سے پہلے کبھی مجھے نہیں دیکھا تھا۔ سنو۔ میں ام جعفر بنت عبد اللہ ہوں جس کے عشق کا یہ دم بھرتا ہے۔ اور اپنے اشارے کے ذریعے سے کتنا پھرٹا ہے کہ میں اس سے فلان مقام پر ملی۔ اور اس طرح اس سے ملنے کے وعدے کیے! یہ سچ ہے کہ اس نے مجھ سے کوئی بھڑیا بکری نہیں خریدی۔ اور نہ اس کے ذمے میرا کچھ باقی ہے۔ مگر اس کے انکار اور حلف اٹھانے سے آپ سب کو معلوم ہو گیا کہ یہ کتنا بڑا بیجا اور جھوٹا ہے۔ شریف زاد یوں کو مفت بدنام کرتا ہے۔ اور اپنے کذب و افترا پر نادم ہونے کے عوض اور زیادہ اکر تا اور نخر کرتا ہے۔ بھائی امین کے ہاتھ سے سزا پانے پر بھی اپنی حرکتوں سے باز نہیں آیا۔ مگر میں نے آج ایسی سزا دی ہے کہ غیرت دار ہے تو پھر کبھی میرا نام زبان پر نہ لائے گا۔ اور آپ سب صاحبوں کو چاہیے کہ ایسے بد معاش اور جھوٹے لو ایک گھڑی بھر کر لیے بھی پانے یا پس نہ بیٹھنے دیں" یہ کہہ کے ام جعفر سب لوگوں کو اس حال میں چھوڑ کے چلی گئی کہ ہر شخص دم بخود تھا۔ کسی کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلتا تھا۔ اور احوص کی یہ حالت تھی کہ سر جو جھکایا تو کسی طرح اوپر اٹھانے کی جرات نہیں ہوتی تھی۔ اور کسی سے چار آنکھیں کرنے کے قابل نہ تھا۔

غرض اس واقعہ نے احوص کی زبان ہمیشہ کے لیے بند کر دی ام جعفر کا خوبصورت چہرہ جیسا روشن صاف اور اجلا تھا ویسا ہی اس کا دامن عصمت و عفت بھی قیامت

کے لیے داغ اور پاک وصاف ہو گیا۔ اور احوص ابد الابد تک کے لیے ایسا بنام اور ذیل ہو کر پھر کبھی کسی پار سا خاتون کی آبرو پر حملہ کرنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ اور اس قابل ہی نہیں رہا تھا کہ امین کا ایسا شریفانہ جو انداز و عجب اپنی تلوار کو اُس کے خون سے ذیل و ناپاک کرتا۔

ریویو

معارف النغمات ہندوستان کے فن موسیقی کے بیان میں محمد نواب علیخان صاحب تقلق دار اکبر پور ضلع سیتاپور نے یہ ایک ایسی اعلیٰ درجہ کی کتاب لکھی ہے جس کے فضل شاید کوئی دوسری کتاب نہ نظر آ سکے گی۔ موسیقی بھی اُن فنون میں ہے جنہیں باوجود حرمت کے فتوؤں کے مسلمانوں نے کچھ ایسے ذوق و شوق سے حاصل کیا کہ اپنا کر لیا۔ عباسیوں کے زمانے میں موسیقی کو بے شک نمایاں ترقی ہوئی تھی اور اسٹی موسیقی وغیرہ نے عربی موسیقی کو جس کے ماخذ ایران و روم کے فنون موسیقی تھے اعلیٰ کمال پر پہنچا دیا تھا۔ ہندوستان کی موسیقی کو بغداد کی اُس موسیقی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہندوستان میں آ کے مسلمانوں نے جب دیکھا کہ ہندوؤں کا موسیقی ایک بہت ہی بڑا اعلیٰ درجہ کا بضابطہ فن ہے اور بغداد کی موسیقی سے بدرجہا زیادہ وقعت رکھتا ہے تو اُس کی طرف خاص توجہ کی۔ اور چند ہی روز کے اندر مسلمانوں میں اُس کے ایسے باکمال پیدا ہو گئے کہ معلوم ہوتا تھا سنسکرت موسیقی کے اصلی کمال دماہری ہیں۔ نواب علیخان صاحب نے اس فن کو شوقیہ حاصل کیا اور اُس میں جو پایہ اُنچیں حاصل ہو گیا اس کتاب کے دیکھنے سے نظر آ سکتا ہے۔ تقریباً پچیس تیس سال ہوئے ہوں گے کہ ہم نے ہندی موسیقی میں "اصول النغمات الاصفیہ" نام ایک کتاب دیکھی تھی جو نواب آصف الدولہ مرحوم کے عہد میں تصنیف ہوئی تھی۔ وہ اگرچہ اس کتاب سے نسبتہ چھوٹی اور مختصر تھی مگر بہت ہی جامع اور بے نظیر کتاب ہے اور افسوس کہ اس کتاب کی تصنیف کے وقت محمد نواب علیخان صاحب کی نظر سے نہیں گزری اگر مل جاتی تو شاید معزز مصنف کو زیادہ ملتی۔ بہر حال مصنف صاحب نے کوشش کی ہے کہ ان کی اس تصنیف کی مدد سے ہر شخص موسیقی کو سمجھ سکے۔ اول میں ۲۴ صفحوں کا ایک مختصراً دیباچہ ہے اُس کے بعد پورا فن موسیقی

تین حصوں یا تین قنون پر تقسیم کروا گیا ہے اول ستر اوصیا ہے دوسرا اگ اوصیا ہے تیسرا مال اوصیا ہے۔ پہلا حصہ ۷ صفحوں پر دوسرا ۷۰ صفحوں پر اور تیسرا ۳۶ صفحوں پر ہے۔ لہذا پوری کتاب فہرست کے ۱۰۳ صفحوں پر ختم ہو گئی ہے۔ چھپائی لکھائی اور کاغذ اعلیٰ درجہ کا ہے۔ قیمت کچھ نہیں۔ جناب مصنف سے خط و کتابت کر کے حاصل ہو سکتی ہے۔

قدیم ہندوستان کی روحانی تعلیم ۲۲ x ۱۸ چھپانے کے ۱۴۴ صفحوں کا ایک رسالہ ہے جس میں شیخ محمد یوسف صاحب و دو اہل اندیز ترقی و ترقی و ترقی کی شان سے اس بات کو دیکھا گیا ہے کہ ہندوؤں کے چاروں ویدوں کی تعلیمیں خدا شناسی کے لحاظ سے بالکل ناقص ہیں۔ ہم قدیم الفہرستی کی وجہ سے صرف ۱۸ صفحوں تک اس رسالہ کو پڑھ سکے۔ اور جو اسے تمام کر سکے وہ مصنف صاحب کے موافق نہیں ہے۔ ابتدا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف صاحب نے اہل حدیث کی نگاہوں سے ویدوں کو ملاحظہ فرمایا ہے اور وہی اعتراضات کیے ہیں جو شخصی خدا کے ماننے والے تصوف کے خدا پر جو ایک مفہوم مشترک برتا رہتے ہیں۔ مگر تھوڑی دور آگے بڑھ کے وہ اہل حدیث کے اصول سے بھی ہٹ گئے ہیں اور معترض ہیں کہ ویدوں میں خدا کے ساتھ بازو آئین اور پانچوں بتائے گئے ہیں۔ لیکن اس کو نہیں دیکھتے کہ خود قرآن مجید میں خدا کے چہرے ہاتھ وغیرہ بتائے گئے ہیں جن کی متاخرین خفیہ تاویل کرتے ہیں اور ائمہ سلف اور اہل حدیث ان کو مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم ان کی مابیت سے واقف نہیں۔ بہر حال اس رسالہ میں وید پر جو اعتراضات کیے گئے ہیں بالکل سچی ہیں۔ محققین ان کو مشکل سے مانیں گے۔ اس رسالہ کی قیمت ۸ روپے۔ جناب مصنف سے طلب کیا جاسے۔

رموز الاطباء لاہور کے قابل طبیب حکیم فیروز الدین صاحب ایڈیٹر رفیق الاطباء نے کئی سال سے یہ مہتمم بالشان اور معرکہ آرا کتاب شائع کر رکھی ہے جس کا اب دوسرا ایڈیشن شائع ہوا ہے۔ یہ کتاب ۲۲ x ۱۸ چھپانے کے ۸۰ صفحوں اور فرست وغیرہ ملا کے ۹۰ صفحوں سے زائد پر ختم ہوئی ہے جس میں ہندوستان کے ڈیڑھ سو سے زیادہ زندہ اور موجود یونانی طبیبوں اور ویدوں کے حالات زندگی مع ان کے مجرب نسخوں کے مدج ہیں۔ اس میں مشاہیر اطباء اور ویدوں کی ۱۹ باتوں تصویریں بھی ہیں جن سے کتاب کی رونق اور دلچسپی اور ترقی کر گئی۔

مجلد اور بہت ہی خوبصورت ہے۔ کئی سال سے یہ کتاب چھ روپیہ (سے) فی جلد قیمت پر فروخت ہوتی رہی۔ مگر اب مصنف صاحب نے ہندوستانی اہل شوق کی بے مائی کا خیال کر کے اس کی قیمت سو اٹھ روپے (سے) فی جلد کر دی ہے جو بمقابلہ سابق اور نیز کتاب کی ضمانت قیمت سے بہت ہی کم ہے۔ جو صاحب غیر مجلد کتاب چاہیں ان کے لیے ۸ روپے اور چھ روپے دیے جائیں گے اور پونے تین روپے (بہار) ہی کو یہ تاریخی و طبی ذخیرہ اور تجربات حذاق کا مفید مجموعہ ہاتھ آسکتا ہے۔ درخواستیں حکیم فیروز الدین صاحب مدوح کی خدمت میں بھیجی جائیں۔

چند خیالات

اس میں فراشک نہیں کہ مسلمانوں میں فی الحال ایک جینی پیدا ہو گئی ہے جو ان میں پرمیشکل بیماری کو روز بروز بڑھاتی جاتی ہے۔ اور آخر کار ان پور کی مسجد کے معاملہ نے ہر جگہ کے مسلمانوں کو جنگاہی نہیں بلکہ اٹھا کے بٹھا دیا۔ اس شور و شکر کا دبانہ گورنمنٹ کے اختیار میں ہے۔ مگر دبانے والی پالیسی پر صحیح عمل اس وقت تک دشوار ہے جب تک کہ فیصلہ کرنے کے لیے دوسری گورنمنٹوں سے غیر متعلق حکام نہ بلائے جائیں۔

یہ امر ہماری سمجھت بالاسہ کہ مسجد کے ایک عہد کے متعلق جو ٹرک کے لیے کان پور کی مینو سنسٹی کو مطلوب تھا گورنمنٹ کو اس قدر ضد اور اصرار کیوں تھا کہ سارے ہندوستان کے مسلمان غل بچارے ہیں۔ ہندوستان کے ہر شہر میں دو ہائیڈرو جبار ہیں کہ یہ ہماری مذہبی حرمت و آزادی کا بگاڑنا ہے اور گورنمنٹ لحاظ نہیں کرتی۔ یہ نہ کوئی ملک گیری تھی نہ کسی باغی و سرکش قوم کا دبانہ تھا پھر اس سے بڑے اس قدر ہٹ کیوں بہ مانا کہ ہمارے لٹنٹ گورنر بہادر کو "مسجد شکنی" کا خطاب جو بعض لوگوں نے دیا ہے نہ ملتا لیکن ایسے خطاب کے نہ ملنے سے ان کا کیا بگڑتا تھا؟

مسلمانوں نے ان دنوں یونیورسٹی کے معاملہ میں بھی بڑی کامیابی حاصل کی۔ اور جو لوگ حکام کے اشاری پر چلتے اور ہر معاملہ کو ان کی مرضی کے مطابق عام مسلمانوں کے طے کرادیا کرتے تھے جنھوں نے قومی آزادی کو پاؤں سر و منڈر اٹھا اور مسلمانوں کے عام خیال کی ذرا بھی پروا نہیں کیا کرتے تھے

انہیں آخر کار قوم کی آزاد پارٹی نے ایسی فاش شکست دی کہ اُن کا سب کیا دھڑا خال میں مل گیا۔ اور جمہوریت نے شخصی ڈسپائٹزم کو دودھ کی کھس کی طرح نکال کے پھینک دیا۔ اب جو ڈیوٹیشن جاس گاوہ میجھ معنون میں قوم کا وکیل ہوگا۔ اُس کا حرف اتنا کام ہوگا کہ ہماری خواہشات کو گورنمنٹ پر ظاہر کرے اور گورنمنٹ کے غشے کو ہمارے سامنے بلا کم وکاست بیان کر دے اس کے سوا اور کسی قسم کے اختیارات ان بزرگوں کو نہ ہوں

آزاد پارٹی کی اصلی فتح تو جب ہے جب علیگڑھ کالج کو ہندوستانی دیوتاؤں اور اسلامی اصطلاح کے "ارباب امن و امن اللہ" یعنی ٹرینیوں کے پنجے سے آزادی مل جائے۔ عمارت کو حساباً جن پر گمان ہیں اور عام حسابات جو ہلکے سے مخفی رکھے جاتے ہیں جن کے مسلمانوں کی عام نگاہوں کے ساتھ لے جائیں۔ گزشتہ کی حساب نامی ہو اور آئندہ کا انتظام۔ موجودہ حالت میں کالج کلاس کے طلبہ ہمارے ہندوستان کے طلبہ سے زیادہ بے نصیب ہیں۔ اُن کی کیرئیر کی نگرانی اُس طرح کی جاتی ہے جس طرح پولیس ڈپلٹو (جاسوس) کسی سرکش اور باغی گزروہ کی نگرانی کرتے ہوں۔ اُن کو ساتھ لے جلتے اور انھیں راہ پر لانے کے عوض وہ آزاد چھوڑ دیے گئے ہیں اور اُن کی فعل بردگانی کی جاتی ہے اگلے دن فرسٹی اور بائیاں رسر کالج کے لڑکوں سے لے جلتے تھے اُن کی دعوتیں کرتے تھے اور پروفیسروں کا فرض تھا کہ اُن کے ہر کام میں شرکت ہوں۔ اور ہر حکم میں اُن کی رہبری کریں۔ اب یہ طریقہ ہے کہ ٹرینی ملار اعلیٰ کے رہنے والے ہیں۔ جو طلبہ کے عالم اسفلی میں آنا اپنی توہین خیال کرتے ہیں۔ پروفیسر اُن سے اس طرح ملتے ہیں جس طرح صاحب کلکڑ اپنے دفتر کسی کلرک یا کسی امیدوار سے ملتے ہوں۔ طلبہ کا مجمع ایک ہوتا ہے جس سے خود مظان کالج ڈرتے ہیں اور اُن سے زیادہ گورنمنٹ ڈرتی ہے۔ کالج کا بورڈنگ کا ہے کہ کسی مشرقی شہنشاہ کی حرم سرا ہے جس میں سیکڑوں دل خون شدہ عورتیں بھری ہوئی ہیں وہ اپنے قید کردہ والوں کو کوستی گالیاں دیتی اور اُن کی مغلوب کرنے کے لیے سازشیں کرتی ہیں۔ اور خود شہنشاہ صاحب اُن سے اس قدر مخالف ہیں کہ گھر میں قدم رکھتے کا پتہ نہیں۔ یہ ہے حالت موجودہ علیگڑھ کالج کی۔ مجھ سے بہت سے طلبہ نے خود ہی کہا کہ یہ حالت رہ نہیں سکتی یا ہم نہ ہو گے یا کالج نہ ہوگا۔ ایسی حالت میں جب تک آزاد پارٹی رٹینوں پر فتح نہ حاصل کرے گی کالج اس قابل ہی نہیں ہے کہ لوگ اپنے بچوں کو اُس میں بھیجیں تاکہ دنیا میں قدم رکھنے سے پہلے ہی وہ باغی کا خطاب حاصل کر کے گھر میں آئیں۔

ایک پاکدہن کھترانی

نواب سعادت علی خان فرمان رواے اودھ کے زمانے میں ہر نام سنگ نام ایک سرتوتی برہمن نے جو پنجاب کے رہنے والے تھے اور کھنڈ کے دربار میں خصوصیت رکھتے تھے "سعادت جاوید" نام ایک تاریخ نگار ہے جس کا بہت کچھ دھچپ حصہ سٹریلیٹ نے اپنی تاریخ میں اخذ کر لیا ہے۔ اسی ماخذ حصے میں ایک یہ دھچپ واقعہ بھی ہے جس کو پڑھ کے اسلامی حکومت ہند کے آخری حالات - ہندو مسلمانوں کے باہمی اختلافات و کشاکشات - اور ان کے ساتھ ہی ان کی کیرنگی اور کجی کا عجیب مجموعہ نظر کے سامنے ہو جاتا ہے - قابلِ مصنف صاحب ہندو ہیں - اور ہندوؤں میں بھی برہمن - گرو یا بچے میں خدا سے واحد و الجلال اور پیغمبر آخر الزمان علیہ السلام کی حمد و نعت بڑے زور و شور سے بلکہ جوش عقیدت کے ساتھ تحریر فرماتے ہیں -

لیکن وہ واقعہ جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا یہ ہے کہ پنجاب میں کھنڈ کا عہد شروع ہونے سے پہلے چند سال تک لاہور کے صوبہ دار زکریا خان رہے تھے - جو بڑے ہی شریف النفس عدل گستر اور اہل لاہور میں نہایت ہر دل عزیز تھے - ان کے زمانے میں مسلمان مولویوں نے ہندوؤں سے مذہبی مباحثہ چھیڑ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان ہندوؤں پر جبر و تشدد اور زیادتیان کرنے لگے - مگر زکریا خان کے انصاف نے ہمیشہ مسلمانوں کو ملزم ٹھہرایا اور

یہ جھگڑے ہو ہی رہے تھے کہ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ ایک آغا صاحب کسی ہندو کھتری کی جوڑو پر فریفتہ ہو کے اُس کے بکانے اور پھسلانے کی کوششیں کرنے لگے۔ مگر عورت نہایت ہی پاکدامن اور عفت شعار تھی کسی طرح راضی نہیں ہوئی اور اُن کے فقرے میں نہ آئی۔ آخر ایک دن رات کو آغا صاحب نے مشہور کیا کہ آج اس عورت کے ساتھ میرا نکاح ہوگا۔ چنانچہ ہزاروں مسلمانوں کے مجمع میں عورت مسلمان دولہنوں کی وضو میں لائی گئی۔ قاضی صاحب نے نکاح پڑھا۔ خرے اور نقل لٹائے گئے۔ ہزاروں آدمیوں نے دعوت و لیمہ کھائی۔ اور دوسرے دن آغا صاحب چند بد معاش اور شورہ بشت دھڑوں کے ساتھ اُس کھتری کے دروازے پر پہنچے اور کہا ”اپنی جوڑو کو سوار کرا۔ اب وہ تیری نہیں بلکہ میری جوڑو ہے۔ تجھ سے اور تیرے دین سے اُسے نفرت ہو گئی۔ کل رات کو وہ خود اپنی خوشی سے میرے گھر میں آئی۔ میرے ہاتھ پر کفر سے توبہ کر کے دین اسلام قبول کیا۔ مسلمان ہوئی۔ اور میرے ساتھ نکاح کر لیا۔“ غریب کھتری اُس کے تمام اعزاء و اقارب خود اُس عورت کے میکے والے سب کی یہ حالت تھی کہ آغا صاحب کے یہ الفاظ سُن کے دریائے ندامت میں غرق تھے۔ چاہتے تھے کہ زمین پھٹے اور ہم سما جائیں۔ کسی کو سُرٹھانے اور چار آنکھیں کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ آخر شوہر اور دوسرے عزیز خدائے نازین عورت کے پاس گئے اور پوچھا ”تم اس مسلمان کے گھر میں گئی تھیں؟ اور جو کچھ یہ کہہ رہا ہے۔ سچ ہے؟“ غریب بے زبان عورت اس اتہام سے مارے شرم کے زمین میں گڑی جاتی تھی۔ مگر بے بولے بھی نہ رہا جاتا تھا۔ بے شرمی اختیار کر کے بولی ”میں اُن آغا صاحب کو جانتی ہی نہیں کہ کون ہیں۔ اُن کے وہاں جانا کیسا میں نے کبھی بات تک تو اُن سے کی نہیں اور نہ کبھی اُنھیں نظر بھر کے دیکھا ہے۔ لیکن میں گواہ کہان سے لاؤں؟ اور کوئی میری کیوں سننے لگا تھا؟“

عورت کو انکار کرتے دیکھ کے عزیزوں اور اُس کے شوہر کا حوصلہ بڑھا اور باہر آئے کہا ”عورت کو اس سے بالکل انکار ہے۔ اور کہتی ہے کہ میں نے اپنے گھر سے قدم ہی باہر نہیں نکالا۔ اُن کے گھر کیسے پہنچ گئی؟“ آغا صاحب نے کہا ”اچھا ایک کام کرو۔ یہ نازنین جب میرے بیان سے واپس آئی ہے تو مسلمان دولہنوں کا سالباں عروسی پہن کے آئی تھی جن کپڑوں پر نکاح ہوا تھا گھر میں ڈھونڈو۔ اگر وہ کپڑے نہ ملیں تو

جانو وہ سچی ہے اور میں جھوٹا اور جو وہ کپڑے مل جائیں تو اُسے جھوٹا اور مجھے سچا خیال کر کے اُسے میرے ساتھ سوار کرا دوں گا۔ آغا صاحب کے بیان کے مطابق عزیزوں نے گھر میں جا کے دیکھا تو واقعی مسلمان دولہنوں کا لباس عروسی نکل آیا۔ جسے دیکھتے ہی سب سناٹے مین آگئے۔ اور اب کسی سے کوئی جواب نہ بن پڑتا تھا۔ تاہم ہندوؤں کی غیرت متقاضی نہ ہوئی کہ عورت کو بغیر اُس کی مرضی کے زبردستی سوار کرا دیں۔

آخر مقدمہ لاہور کے قاضی صاحب کے سامنے پیش ہوا۔ وہ پُرانے خیال کے خالص مسلمان تھا۔ فتویٰ دیا کہ ”جو عورت مسلمان ہوئی۔ ایک مسلمان سے نکاح کیا۔ وہ مجبوراً مسلمان شوہر کے سپرد کی جائے۔ اور ہرگز اُسے اس کا موقع نہ دیا جائے کہ پھر مرتد ہو جائے۔ جب یہ فتویٰ تعمیل کے لیے زکریا خان کے سامنے پیش ہوا تو وہ ایک چکم من پڑ گیا۔ نہ کوئی بات سمجھ میں آتی تھی اور نہ کچھ کرتے دھرتے بنتا تھا۔ آخر حکم دیا کہ کل تک مقدمہ ملتوی رکھا جائے۔ میں سوچ سمجھ کے حکم دوں گا۔“

رات کو زکریا خان نے سب سے چھپ کے فقیروں کا بھیس کیا۔ اور سیدھا اُس کھتری عورت کے محلے میں پہنچا۔ پھرتے پھرتے ایک ایسے مقام پر گزر رہا جہاں چند فقیر ایک کونے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ باتوں باتوں میں ایک فقیر بولا ”سنئے ہو؟ اس کھترانی کو ہم ایک زمانے سے دیکھ رہے ہیں۔ اور اس کے طور و طریق میں سوا پا کہ مہنی اور نیک چلنی کے کبھی کوئی بات نہیں دیکھی۔ بھلا کیسے ممکن ہے کہ ایسی پارسا عورت اُس محل کے دیوان گئی ہو اور نکاح کر لیا ہو؟ خدا جانے اس میں کیا فریب ہے؟“ یہ سن کے زکریا خان اُن آغا صاحب کے محلے میں گیا۔ یہاں آتے ہی کسی شخص کو یہ کہتے سنا۔ ”یہ منگتری جھوٹا اور مکار ہے۔ ہم نے اُس کھتری عورت کو کبھی اس کے یہاں آتے نہیں دیکھا۔ پھر نکاح کیسے ہو گیا؟“

ان باتوں کو سن کے زکریا خان کو اُس شریف کھترانی کا چال چلن بھی معلوم ہو گیا اور اُن آغا صاحب کا بھی۔ مگر قاضی صاحب کے فتویٰ کے مسترد کرنے کے لیے کوئی بنیاد اور کافی شہادت نہیں ملتی تھی۔ یہ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ مسلمان لڑکیوں کا لباس عروسی اُس کھتری کے گھر میں کیسے پہنچ گیا۔ کپڑوں سے اُس کا خیال دعو بن کی طرف گیا۔ اور اُس دعو بن کو پکڑا بلایا جو اُس کھترانی کے گھر میں کپڑے دھوتی تھی۔ پہلے تو اُس نے انکار کیا۔ مگر جب سختی کی گئی تو بولی کہ ہاں آغا صاحب کے لالچ دلائے اور بہت کچھ دینے کی وجہ سے میں نے یہ کیا کہ اُس کھترانی

کے کپڑے پہن کے اور اُسی کی ہی وضع بنا کے رات کو اُن کے یہاں آئی۔ پھر اُن کا دیا ہوا لباس عروسی پہن کے اُسی کے نام سے اُن کے ساتھ نکاح پڑھوایا۔ اور دوسرے دن آغا صاحب کی ہدایت سے وہ شادی والے کپڑے اُس عورت کے گھر میں لیجا کے ڈال آئی۔ زکریا خان نے اس بیان کے مطابق دیگر ثبوت حاصل کر کے اور اپنا پورا اطمینان کر کے دوسرے دن اُن آغا صاحب اور اُس دھوبن کو قتل کی سزا دی۔ اور اُس پاکدامن کھتری کو عصمت و عفت کی سند دے کے اُس کے ناموس کو ہمیشہ کے لیے بدنامی سے بچا لیا۔

لاہور میں زکریا خان کے معتمد علیہ دو کھتری تھے جن میں سے ایک کا نام لالہ لکھپت راہ اور دوسرے کا لالہ چسپت راہ تھا۔ یہ بڑے دولت مند اور معزز لوگ تھے۔ اور زکریا خان کو ہر کام میں اُن پر پورا بھروسہ تھا۔ دونوں کو راجہ کا خطاب حاصل تھا۔ مگر وہ اپنے آقا زکریا خان کے سامنے اپنے آپ کو راجہ نہیں کہلاتے تھے۔ اور نہ کبھی آپ کو اس خطاب سے شہرت دی۔ جب نادر شاہ دہلی کو لوٹ کے واپس جاتے وقت لاہور میں پہونچا تو حکم دے دیا کہ سارے باشندگان لاہور کو پکڑ کے اسیران جنگ کی حیثیت سے ساتھ لے چلو۔ اس موقع پر لالہ لکھپت راہ نے تین لاکھ روپیہ نقد اُس کی نذر کر کے تقریباً پانچ لاکھ ہندو مسلمانوں کو جن میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی تھیں نادر شاہ کے دستِ ستم سے آزادی دلائی۔

میر علی شیر

علم و فضل جب دل پر سچا اثر ڈالتے ہیں تو انسان میں جاہل پندری عیشِ طلبی اور دولتِ حکومت کی ہوس بالکل نہیں باقی رہتی۔ لیکن اس قسم کے اعلیٰ کمال کے نمونے اکثر اُسی قوم میں نظر آیا کرتے ہیں جو دنیا میں عزم و وقار اور شرافت و سخاوت کے لحاظ سے نہایت ممتاز ہو جاتی ہے۔ مسلمانوں کا بھی کبھی ایسا زمانہ تھا کہ اُن میں علم و فضل کا ایسا ہی سچا ذوق رکھنے والے کثرت سے پیدا ہوا کرتے تھے۔ ہم میں یہ بات ابھی تھوڑے ہی دنوں پیشہ تک موجود تھی کہ ہمارے شرفا و اکابر اور ہمارے اصحابِ علم شرافت نفس اور اپنے سچے ذوقِ علم کے سامنے نہ سلطنت کی پروا کرتے تھے اور نہ عیش و راحت کی۔ مگر ہمارا وہ زمانہ گزر گیا۔ اب ہم میں کا شرفِ شخصِ دولت اور پیسے کی ہوس میں تمام کمالات انسانی کو بھول گیا ہے۔ مال و دولت کے آگے کسی انسانی کمال کی قدر نہیں باقی

رہی ہے۔ اور اگر متع دنیوی کی امید ہو تو ہر شخص ہر قسم کا ذلیل سے ذلیل اور بیہودہ سے بیہودہ کام کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔

انگلی شریف النفس بالکمالان اسلام میں ایک ہی میر علی شیر تھا جس کا نام اس مضمون کا ازیب عنوان ہے۔ گو اُس کے نام کے ساتھ ”میر“ کا لفظ لگا ہوا ہے مگر اصل میں وہ تاتاری الاصل تھا اور چغتائی قبیلے کے ایک معزز و محترم خاندان سے تھا۔ تھلکہ م (مطابق تھلکہ ۴۱) میں پیدا ہوا اور اپنے صاحب علم باپ کے آغوش میں پرورش پانے لگا میر علی شیر کے پدر بزرگوار اگرچہ ایک سپہ گراور صاحب سیف گروہ کی یادگار تھے اور غالب کا یہ شعر اُن کے حسب حال تھا کہ مصرع ”سو نشت سے ہے پٹے آبا سپہ گری“ مگر انھوں نے ذاتی طور پر علم و فن میں ایسی اعلیٰ بصیرت حاصل کر لی تھی کہ علم کے شوق میں سارے مشاغل چھوٹ گئے تھے۔ اور سوا عالمانہ صحبتوں کے انھیں کسی بات میں مزہ نہ آتا تھا۔ چنانچہ اپنے بچوں کو بھی انھوں نے بجائے تیراگنی و شمشیر زنی اور نیزہ بازی و شہسواری کے پڑھنے لکھنے کی تعلیم خاص توجہ سے اور بڑے انماک و اہتمام کے ساتھ دلوائی۔ سلطان ابوالقاسم بابر ابن تیمور کے عہد میں سلطنت کا ایک بڑا اور معزز حکم اُن کے سپرد تھا۔ اسی وجہ میر علی شیر کو تعلیم و تربیت ہی کے زمانے سے دربار شاہی میں جگہ مل گئی۔ اور خاص شاہزادہ ولی عہد کے ساتھ ہم سبق و ہم کتب ہو جانے سے اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اس کا نشو و نما قصر سلطانی میں بلکہ خاص بادشاہ زمانہ کے آغوش میں ہوا۔ اور سلطان بابر کو اُس سے ایسا تعلق خاطر ہو گیا تھا کہ اُسے اپنا بیٹا اور فرزند کہا کرتا۔ اور اُس کے بعد جو اُس کا علمی ذوق و شوق بڑھ گیا اور اُس کے اشتیاق مضبوط و خلاق ہوتے گئے بادشاہ کی نظر میں اُس کی عزت و وقعت بھی ترقی کرتی گئی۔

اسی اثنا میں علی شیر کو ایک ناگہانی صدمہ پہنچا۔ وہ یہ کہ بادشاہ نے جو اُس کا مربی اور اُس کے حال پر حد سے زیادہ حریان تھا سفر آخرت کیا۔ اور وہ دنیا سے کچھ ایسا برخاستہ خاطر ہوا کہ اپنے ہم سبق ولی عہد سلطنت کی بھی پروانہ کی۔ اور دربار شاہی اور ایوان خسروی کو چھوڑ کے فقیر و نادر آداب مشرب صاحبان علم کی طرح مشہد مقدس میں جا بیٹھا۔ چند روز بعد مشہد کے قیام سے بھی دل اکٹا یا تو سمرقند کی راہ لی۔ جو شہر کہ اُن دنوں علم و فضل کا ایک بڑا بھاری مرکز تھا۔ اس دارالعلم میں پہنچ کے اُس نے علوم عالیہ کی طرف توجہ کی اور چند روز میں ایک فاضل گران پایہ بن گیا۔

تھوڑے دنوں بعد اُس کا ہم سبق اور بچپن کا رفیق سلطان حسین بہادر خان خراسان کا فرمان روا ہوا۔ اُس نے میر علی شیر کے ساتھ تعلیم پائی تھی۔ ہم سبق وہم مکتب رہا تھا اور اُس کے ساتھ بچپن میں جو بچتیں اور ہم مذاقی رہی تھی اُسے یاد کر کے اکثر مزے لیا کرتا تھا۔ تخت پر بیٹھے ہی میر علی شیر کو خط لکھ کے سمرقند سے بلوایا۔ اور جیسے ہی وہ حاضر ہو کے آستان بوس دولت ہوا اُسے خلعت سے سرفراز کر کے اپنا وزیر اعظم اور کل ہمت سلطنت کا ذمہ دار بنا دیا۔ اگلی محبت اور بادشاہ کی صحبتوں کو یاد کر کے وہ چلا تو آیا۔ مگر جس کے لمبن علم کا ذوق پیدا ہو گیا اُسے دنیاوی جھگڑوں میں کیا لطف آسکتا تھا؟ تھوڑے ہی دنوں بعد وزارت سے استعفا دے دیا۔ اور کہا ”حکومت وجاہ آپ کو سہار رک۔ مجھے تو اپنے علمی مشاغل کے لیے ایک گوشہ عزلت چاہیے جہاں تک حکمرانی و جہان بانی کے جھگڑے نہ پہنچتے ہوں“ مگر سلطان حسین کو اُس سے کچھ ایسی محبت تھی کہ کسی طرح استعفا نہ قبول کرتا تھا۔ اور آخر کہہ سُن کے اور تجھاجھکا کے اُسے اس پر راضی کیا کہ اگر وزارت نہیں پسند ہے تو صوبہ استرآباد کی گورنری قبول کرے۔ اور پان اطمینان سے بیٹھ کے علمی مشاغل اختیار کرے۔ جبراً و قراً علی شیر نے بادشاہ کی اس عنایت کو قبول کر لیا۔ مگر جب استرآباد کی عنان حکومت ہاتھ میں لی تو وہاں بھی ویسے ہی جھگڑے نظر آئے۔ اور اپنے مذاق کی باتوں اور علمی مشاغل کے لیے مطلقاً فرصت نہ ملتی۔ آخر اس حکومت سے بھی استعفا دیا اور اپنا ملک معاملات کو ہمیشہ نہ کر۔ یہ خیر باد کہہ کے تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گیا۔ اور سی مشغول میں اپنی پوری زندگی صرف کر دی۔ اُس کے تصانیف فارسی اور ترکی زبانوں میں ہیں۔ جن کا شمار اکیس۔ سے کم نہیں بتایا جاتا ہے۔

اگر صاحبانِ علم میں اُسرا اور دوسرے زیادہ سخت پیدا ہو جاتی ہے اور علما کا تجربہ اور ان کی ریاکارانہ خود داری عوام میں مشہور ہے۔ وہ اپنے سامنے کسی کی ہمتی نہیں سمجھتے اور اپنے کلام کے مقابل میں سب کے کلام کو لغو اور بے مزہ خیال کرنے لگتے ہیں۔ لیکن اس کے خلاف میر علی شیر میں یہ کمال تھا کہ غور و نام کو بھی نہ تھا اپنے کلام اور اپنے تصانیف سے زیادہ قدر معاصر علما و شعرا کے علمی کارناموں کی کرتا۔ چونکہ ایک معزز و دولت مند خاندان سے تھا اس لیے وہ اب بجائے ملک پر حکومت کرنے کے اہل علم کے دلوں پر تصرف تھا۔ اور علما و فضلا اور شعرا و ادبا کا بڑا بھاری مرتبی بن گیا تھا۔

دولت شاہ سمرقندی نے جس کا تذکرہ اس قدر مشہور ہے کہ یورپ میں بڑے اہتمام سے چھاپا گیا ہے۔ اور ابدی زندگی پانے والے نامور مورخین میرخوند اور خوند میر نے اُسی کی مربی گری سے شہرت دوام حاصل کی اور اپنے تصانیف کو اُسی کے نام سے معنون کیا ہے۔ جن مشہور شعرا کے گران پایہ نے اُس کی فیاضی و حوصلہ افزائی سے وقت حاصل کیا اُن میں سب سے زیادہ معزز و مقبول عام نام مولانا جاحی کا ہے جو اُسی سے وابستہ تھے۔ اور اُسی کی قدردانی سے طبع آزمائی و خیال آرائی کا جو ہر دکھا رہے تھے۔ علم و فضل کے علاوہ میر علی شیر کو عمارت کا بھی بڑا شوق تھا۔ چنانچہ خاص اپنے روپیہ سے بڑی بڑی عالیشان عمارتیں مدرسے اور پل مسجدین اور خانقاہیں تعمیر کرائیں۔ ماسوا اس کے اُسے علم موسیقی کا بھی بڑا شوق تھا۔ شوق ہی نہیں اس لطیف فن میں اُسے اچھی اور مستند دستگاہ حاصل تھی۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ آج تک اُس کی ایجاد کی ہوئی مختلف دھنیں ایران و ترکستان میں عروج اور پسندیدہ ہیں۔ اور اہل فن اُن کے بڑے معرف و متراح ہیں۔

چغتائی یعنی خالص ترکی زبان میں اُس کے نغمات کا مجموعہ اس وقت تک موجود ہے۔ اُس میں اُس نے اپنا تخلص ”نوائی“ قرار دیا ہے۔ دس ہزار سے زیادہ شعر اُس میں ہیں۔ اور خمسہ نظامی کو جس خوبی سے اُس نے ترکی زبان میں نقل کیا ہے اُسی کا کام تھا اور اُسے ترکی شاعری کے عام ماہرین آج تک نہایت ہی قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ ترکی زبان کی بے مثل و بے نظیر نظم تصور کی جاتی ہے۔ اُس میں غالباً تیس ہزار اشعار ہیں۔

فارسی زبان میں میر علی شیر ”فتائی“ تخلص کرتے تھے اُس میں بھی اُن کے اشعار کا مجموعہ موجود ہے۔ حاجی لطف علی نے اپنے تذکرہ ”آتشکدہ“ میں اُن کے فارسی کے یہ اشعار نقل کیے ہیں۔

اے شبِ غم چند دوا ز رو گیارم میکشی زندہ میدارم ترا ہر چہ کارم نے کشی
ان دنوں مسلمانان اہل سنت میں یہ مسئلہ مختلف فیہ تھا کہ یزید بن معاویہ پر لعنت بھیجنا جائز ہے یا نہیں اس مسئلہ میں وہ اپنا عقیدہ اس قطعہ میں بڑے لطف کے ساتھ ظاہر فرماتے ہیں۔

اے کہ گفتی بریزید و آل او سنت کمں
زانکہ شاید حق تعالیٰ کردہ باشد حشش
آنچه با آل بنی او کرد اگر بخشد خدا
ہم بخشاید خدا اگر کردہ باشد حشش
۱۲۹۶ (سنہ ۶۲۰) میں میر علی شیر نے سفر آخرت کیا۔ بہت سے علماء و شعرا اور مصنفین و اہل علم اُن کی وفات سے پریشان حال ہو گئے۔ اور دنیاوی علوم نے اُن کی موت کو بڑی ہمتی کے ساتھ برداشت کیا۔ اور میر خود نے الفاظ بنور رحمت سے اُنکی وفات کی تاریخ نکالی۔

محمود غزنوی کی حرص و طمع

محمود غزنوی کی زندگی کے واقعات پر غور کرو تو معلوم ہوتا ہے کہ شعرا اور اہل علم کو ہمیشہ انعام و اکرام سے سرفراز کرتا رہتا تھا۔ اور اُس کی فیاضیوں ہی کی برکت تھی کہ کبھی کسی مشرقی دربارین دیمیری مراد مشرق سے بغداد و عراق کے اس طرف کے مالک ہین) اتنے علماء و فضلا اور ابدی ناموری حاصل کرنے والے شعرا نہیں جمع ہو سکے تھے جتنے کہ محمود کے دار السلطنت غزنین اور اُس کے دربار کمر بارین جمع ہو گئے تھے۔ اور اُس کی فیاضی ہی تھی جس نے فارسی شاعری کو زندہ ہی نہیں کیا بلکہ ترقی دیتے دیتے آسمان پر پہنچا کے ایسا بنا دیا کہ سنسکرت اور یونانی شاعری کا مقابلہ کر دینا کسی زبان کی شاعری کر سکتی ہے تو وہ فارسی کی شاعری ہے۔ شاعری ہی نہیں سخن ایران کی تاریخ کو بھی اپنی قدردانی سے زندہ کر دیا۔

مگر باوجود ان فیاضیوں کے محمود غزنوی بخل و حرص مشہور ہے۔ اُس کے بخل کی زیادہ شہرت فردوسی طوسی اور شاہ نامہ کی تصنیف کے واقعے سے ہوئی۔ محمود کے کہنے سے فردوسی نے شاہنامہ تصنیف کیا۔ اور محمود نے وعدہ کیا تھا کہ ہر شعر پر ایک اشرفی انعام دون گا۔ جب وہ مکمل ہو کے دربار میں پیش ہوا تو محمود کو موعودہ رقم بہت زیادہ معلوم ہوئی۔ اور اُس نے بجائے اشرفیوں کے فی شعریک روپیہ (نقرہ سکہ) دینا تجویز کیا جس پر گریٹ کے فردوسی چلا گیا۔ محمود کی جو کھی اور اپنے وطن طوس میں جا بیٹھ رہا۔ بعد کو محمود کچھ بتایا اور حکم دیا کہ جتنے شعر میں اتنی ہی اشرفیاں بھیج دی جائیں۔ یہ رقم جس وقت طوس میں پہنچی ہے سلطانی سفیر نے دیکھا کہ لوگ فردوسی کا جنازہ لینے آتے

ہیں۔ کہتے افسوس لے لگا۔ اور ارادہ کیا کہ وہ رقم فردوسی کی ایکلی وارث اُس کی بیٹی کے حوالے کر دے۔ مگر اس دھن کی پتی اور وضع کی سچی لوکی نے اپنے سے انکار کیا اور کہا جس رقم کی حسرت میں میرے والد مر گئے اُسے میں نہ لوں گی۔ آخر اس رقم سے طوس میں ایک پل بنوا دیا گیا۔

لیکن اس واقعے سے محمود کو بخل کا الزام دینا غلطی ہے۔ محمود نے شاید دل میں اُس رقم کو زیادہ تصور کیا ہو لیکن وہ فردوسی کے جو خلاف ہوا اُس کے اسباب اور تھے جو تاریخ پر غور کرنے سے صاف نظر آ جاتے ہیں۔ محمود اپنے مذہب کا سختی سے پابند تھا۔ اور اسماعیلی شیعوں کا وہ جانی دشمن تھا۔ ابن سینا کے ساتھ بھی اُسے اسی بنا پر سخت دشمنی تھی اور چاہتا تھا کہ کسی طرح ہاتھ آ جائے تو کپڑے قتل کر ڈالوں۔ شیعہ ہی نہیں اگر اسی عقیدہ ہونے کے باعث وہ اشاعرہ اہل سنت کا بھی بڑا دشمن تھا۔ فردوسی سے بعض بار سوخ درباری جلتے تھے اور اُنھوں نے محمود کے کان تک پہنچا دیا کہ وہ شیعہ اسماعیلی ہے۔ یہ سننے ہی وہ آمادہ ہو گیا کہ انعام کا نہ دینا درکنار فردوسی کا لام ہی تمام کر دے فردوسی کو اس کی خبر ہو گئی جان لے کے بھاگا۔ اور جو کہی جس میں محمود کے نسب پر حلا کرنے کے ساتھ اپنے عقائد پر فخر بھی کرتا ہے۔ اور قبول کرتا ہے کہ اُس کی محمود کے دربار کی ساری زندگی قیہ کی تھی۔ غرض بخل نہیں یہ اختلاف مذہب تھا جس نے محمود کو اُس کے ساتھ دشمنی ہی نہیں اُس کی جان لینے پر آمادہ کر دیا۔ لیکن چند روز بعد جب محمود کا غصہ فرو ہوا اور محمود کے طرفداروں نے سمجھایا کہ فردوسی اس دربار سے دل شکستہ گیا ہے اور ایک ایسا شاعر ہے کہ اُس کے ساتھ بدسلوکی کرنے سے حضور کا نام بدلا با د تک بدنام ہو گا تو اُس کا تصور عاف کیا۔ اور ساتھ ہی وہ موجودہ رقم بھی ا دی۔ اگر محمود نے بخل اور دولت کی حرص سے یہ کام کیا ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ کسی کے کہنے سننے سے اُس رقم کے دینے پر آمادہ ہو جاتا جو اُسے حد سے زیادہ عزیز تھی۔

اور دو ایک واقعات بھی محمود کی حرص و طمع کے ثبوت میں پیش کیے جاتے ہیں۔ مگر اُن سے بھی دراصل سوا مذہبی تعصب کے ہوس زہنیں ثابت ہوتی۔ مغل اُن کے ایک یہ واقعہ ہے کہ لوگوں نے ایک بار محمود کو اطلاع دی کہ نیشاپور میں ایک شخص رہتا ہے جو بہت ہی دولت مند ہے۔ اور قارون کا سا خزانہ اُس نے جمع کر رکھا ہے۔ محمود نے

یہ سن کے اُسے عزیزین میں بلوایا اور جیسے ہی اُس کا سامنا ہوا کہا ”میں سنتا ہوں کہ تم
 ملاحظہ باطنیین میں سے ہو؟“ اس شخص نے یہ ادب عرض کیا ”جی نہیں۔ میں باطنی نہیں ہوں۔
 یاں خدا نے اپنے فضل و کرم سے مجھے صاحب دولت بنایا ہے۔ مگر اُس سبب دولت
 کا نذر سلطانی کر دینا گوارا ہے اور یہ نہیں منظور کہ میں ایسے ناپاک مذہب اور ایسی
 بے دینی کا ملزم ٹھہرایا جاؤں۔“ محمود نے کہا ”بہتر۔ اگر تم اپنی ساری دولت خزانہ سلطانی
 میں جمع کر دو تو پھر یقیناً بد دینی کا الزام نہ دیا جائے گا۔“ اس پر وہ فوراً راضی ہو گیا۔ اپنی
 ساری دولت بادشاہ کی نذر کر دی اور دربار سلطانی سے خوش عقیدگی کا ایک سرفیلکٹ
 لے کے خوش خوش اپنے گھر چلا گیا جس کا مضمون یہ تھا کہ ”تصدیق کی جاتی ہے یہ شخص پکا
 مسلمان اور سچا خوش عقیدہ سنی ہے۔“

اس واقعہ سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ محمود نے اُس کی دولت لے لی۔ لیکن
 ضمناً یہ بھی نکل آیا کہ اُس سے اصلی غنا داس کے عقائد کی وجہ سے تھا۔ اور کیا عجب کہ محمود
 نے اس میں خیال کیا ہو کہ یہ شخص میرے سامنے جو اپنے آپ کو اہل سنت میں سے بتاتا
 ہے تفتیہ کی راہ سے ہے۔ اس کا اعتبار نہ کرنا چاہیے۔ اور سزا دہی کے طریقے پر
 اُس کی دولت لے لی ہو۔ ہمیں یقین ہے کہ محمود اگر اسے حقیقت میں اپنا ہم مذہب
 وہم عقیدہ خیال کرتا تو اُس کے روپیہ پیسہ پر ہرگز قبضہ نہ کرتا۔

ایک یہ واقعہ بھی بیان کیا جاتا ہے جو نہایت ہی لطیف اور مزے کا ہے۔ ہم نے
 ایک مرتبہ لکھنؤ کے ایک مجتہد صاحب کا واقعہ سنا تھا جو کسی بیرونی شہر میں وارد تھے۔
 کوئی شخص نکاح پڑ جانے کے بہانے انہیں اپنے گھر بلا لے گیا۔ اور وہاں یہ ظاہر کر کے کہ
 نکاح میں ابھی تھوڑی دیر ہے چند لوگ باہم چوس کر کھیلنے لگے۔ چونکہ اور کوئی مشغول نہ
 تھا قبلہ و کعبہ بھی اتفاقاً کھیل میں دیکھی لینے لگے۔ کھیل جہ جہ کے ہو رہا تھا۔ اور اس شخص
 نے جو جناب مولانا کی طرف بیٹھا تھا کہا ”اب کی تو میں جناب قبلہ و کعبہ کے نام سے واؤن
 لگاتا ہوں۔“ اس واؤن میں وہ جیت گیا۔ اور جیتی ہوئی رقم میں سے آدمی قبلہ و کعبہ کے
 سامنے رکھ دی۔ اور آپ نے نہیں نہیں کر کے بھی قبول کر لی۔ اب وہ کئی بار پھر نہیں قبلہ
 و کعبہ کے نام سے کھیلا اور جیتا۔ اور جیت کی ادھی رقم دیتا رہا۔ آخر میں ایک بڑی بھاری
 رقم پر واؤن لگا دیا۔ اُس کے حریف مقابل نے کہا ”تمہارے پاس اتنی رقم کہاں ہے

کوئی ضمانت دو تو کھیلو۔ اُس نے کہا میری ضمانت قبلہ و کعبہ کر لیں گے ہ۔ اُن لوگوں نے مولانا سے پوچھا مفت کی رقموں نے آپ میں اتنی مروت پیدا کر دی تھی کہ ضمانت کے ساتھ فرمایا جی ہاں کھیلے۔ دیکھا جائے گا۔ اب کی کھیل میں وہ ہار گیا۔ اور ہارتے ہی دامن جھاڑ کے اُٹھ کھڑا ہوا۔ لوگوں نے اُسے بکڑا اور جب اُس کے پاس پوری رقم نہ نکلی تو قبلہ و کعبہ سے خواستگار ہو گئے۔ آپ استغفر اللہ کہہ کہہ کے لاکھ انکار کرتے رہے انھوں نے ایک نہ سنی۔ تین سو روپیہ کا دو شالہ اور دو سو روپیہ کی گھڑی چھین لی اور انھیں جس بنیں پر لائے تھے اسی پر بیٹھا کے گھر پہنچا دیا۔ اور مطلق پتہ نہ لگا کہ وہ کون لوگ تھے اور کہاں رہتے تھے۔ اس لیے کہ پانکی اور کمار دن کو وہی لوگ لائے تھے۔

ہم خیال کرتے تھے کہ ایسے واقعات ہم سبہ کاروں ہی کے زمانے کے ساتھ مخصوص ہوں گے۔ مگر نہیں ایک اسی قسم کا مگر اس سے زیادہ مہذب و دلچسپ واقعہ محمود غزنوی کے زمانے میں خاص غزنین میں گزرا تھا جو محمود کی دنیا طلبی کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے۔ سلطان محمود ایک دن اپنے مالیشان قصر کے کونٹے پر بیٹھا باہر کی سیر کر رہا تھا کہ دیکھا نیچے ایک شکستہ حال شخص دو مرغیان ہاتھ میں لیے کھڑا ہے۔ سلطان اُسے کوئی غریب دی یا محتاج تصور کر کے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اُس نے کچھ اشارہ کیا۔ محمود نے اُس کا کچھ خیال نہ کیا اور دل میں کہا اس اشارے سے اس کا کیا مطلب ہے ہ۔ یہ سوچ کے اُس کی طرف دیکھا تو پھر اُس نے وہی اشارہ کیا۔ سلطان نے پھر نظر ہٹائی۔ مگر دل میں ایک خیال پیدا ہو گیا کہ کیا معاملہ ہے اور پھر اُس پر نظر جا پڑی اور پھر اُس نے وہی اشارہ کیا۔ اب کی محمود نے چوہا دون کو بھیج کے اُسے اپنی حضوری میں بلوایا۔ تو وہ وہی دو مرغیان لیے ہوئے سامنے آ کے کھڑا ہو گیا۔ پوچھا تم ان مرغیوں کو کس لیے لائے ہو؟ اور کیا چاہتے ہو؟ اس نے عرض کیا میں ایک جواہری ہوں۔ اور جو کھیلنا ہی میرا پیشہ ہے آج میں اپنے اور سلطان کے نام پر دو اُون لگایا تھا جس میں چار مرغیان جیتیں۔ لہذا ان دو مرغیوں کو لایا ہوں کہ سلطان کا حصہ سلطان کی تذکرہ دون سلطان نے دل میں کہا کہ جواہری کس قدر دیانت دار ہوتے ہیں اور حکم دیا کہ دون مرغیان اُس سے

لے کے باورچی خانے میں پونچا دی جائیں۔ دوسرے دن اسی طرح وہ دوا درمغیان لاکے سلطان کی نذر کر گیا۔ اور یونہی تیسرے روز بھی دوا درمغیان لایا۔ مگر جو تھے روزِ خالی ہاتھ اور نہایت ہی پریشان صورت بنائے ہوئے سلطان کے بالا خانے کی کھڑکی کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ صورت دیکھ کے سلطان سمجھ گیا کہ معلوم ہوتا ہے آج میرا شریک کسی آفت میں پھنس گیا۔ اور بوا کے پریشانی کا سبب پوچھا ہاتھ جوڑ کے عرض کیا میں حضور کے نام سے کھیل کھیل کے جیتنے سے ایسا جری اور بے باک ہو گیا تھا کہ آج ایک ہزار درم کی بازی لگا دی۔ مگر قسمت سے ہار گیا۔ یہ سن کے سلطان محمود ہنسنا۔ اور خود کچی کو حکم دیا کہ اچھا میرے حصے کے پانسو درہم خزانے سے اسے دلو اور پھر اس سے کہا ”مگر آئندہ اس کا خیال رکھنا کہ جب تک میں خود موجود نہ ہوں بازی میں مجھے اپنا شریک نہ بنانا۔“

اس قصے سے محمود کے بخل کا نتیجہ نکالنا بے عقلی و نا انصافی ہے۔ یہ ایک دہلی کا واقعہ تھا جس میں محمود کی اتنی کمزوری بیشک ثابت ہوتی ہے کہ اُس نے پہلے برابر تین روز تک بے پیمائش درمغیان لے لیں۔ لیکن آخری دن جس موقع پر اُس نے پانسو روپیہ دیے ہیں اُس کے سوا اور کوئی ہوتا تو ایک پیسہ نہ دیتا۔ وہی تھا جس نے گزشتہ تین دن کی مروت سے مجبور ہو کر پانچ سو روپیہ دلوادے۔

اگر کسی قدر محمود کی ہوس و دولت کا خیال قائم کیا جاسکتا ہے تو اس سے کہ اُسے جواہرات سے زیادہ اُنس تھا۔ اور یہ بھی اس لیے کہ اُس عہد کے دیگر سلاطین کی طرح وہ جواہرات کی کثرت کو عظمت و شوکت کی دلیل اور فتح مذی و ملک گیری کا ثبوت خیال کرتا تھا۔ اُس سے پیشتر کے ہر عظمت فرمان روا سے مشرق سلاطین آل سامان تھے۔ لیکن محمود نے ابوطاہر سامانی سے پوچھا ”تھیں معلوم ہے سلاطین آل سامان نے اپنے خزانے میں کتنے جواہرات جمع کیے تھے؟“ ابوطاہر نے عرض کیا کہ ”امیر فوج بن منصور سامانی کے پاس سات رطل دسارے تین سیر جواہرات کا ذخیرہ تھا۔ یہ جواب سننے ہی سلطان محمود سجدے میں گر پڑا۔ زمین پر دیر تک سر رگڑتا رہا۔ اور پھر سر اٹھا کے کہا ”خدا کا شکر ہے کہ اُس نے مجھے سو رطل (ایک من دس سیر) سے زیادہ کے جواہرات عطا کیے ہیں۔“

مگر اُس کی حرص و ہوس کا سب سے بڑا واقعہ اُس کی وفات کے زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ مسلسل دو سال سے اُس کی طبیعت نامسا ز تھی۔ مرض کی نسبت بعض کہتے ہیں کہ سہل تھا بعض ضعف معدہ بتاتے ہیں۔ اور بعض کے خیال میں بحیثیت قحی - بہر تقدیر شکایت دو سال تک رہی۔ اطباء نے چلنے پھرنے اور گھوڑے پر سوار ہونے سے منع کیا تھا مگر اُس سے ان چیزوں کا پرہیز نہ ہو سکا۔ اور گو ضعف پڑھتا جاتا تھا مگر اُس کی اولو المعزم اور چھلہ مند طبیعت پاؤں توڑ کے بیٹھنے کو گوارا نہیں کر سکتی تھی۔

آخر قوت نے بالکل جواب دے دیا اور اُسے یقین آ گیا کہ اب میں دو ہی تین دن کا حمان ہوں۔ اس وقت اُس نے حکم دیا کہ جواہرات اشترنیاں اور روپیوں کے قوت اور تمام قیمتی سامان جو خزانے میں ہو اُس کے سامنے پیش کیا جائے۔ ساری دولت و حشمت کا قصر شاہی کے صحن میں جمع کر دی گئی۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ دوزیک سونے چاندی کا باغ لگا ہے۔ اور اُس میں جواہرات کے رنگ رنگ کے پھول کھلے ہوئے ہیں۔ ان سب چیزوں کو اُس نے حسرت کی نگاہ سے دیکھا۔ ایک آہ سرد بھری۔ اور زار و قطار رونے لگا۔ تھوڑی دیر آنسو بہانے کے بعد حکم دیا کہ یہ سب چیزیں پھر خزانے میں پونجا دی جائیں۔

اس کے بعد وہ ایک پاکی میں بیٹھا اور لوگ اُسے اٹھا کے باہر میدان میں لے گئے۔ بیان پھر پھر کے اُس نے اپنے تمام غلاموں کو دیکھا جو مغرق کپڑے پہنے صفین بازو کھڑے تھے۔ پھر اپنے عربی گھوڑوں - اونٹوں - ہاتھیوں - گائے بیلوں اور تمام مویشیوں کو دیکھا۔ ان سب کو دیکھ کے بھی وہ زار و قطار رو یا۔ اور آہیں بھرتا ہوا گھر میں واپس آیا۔ اور اسی واقعہ کے دور و ز بعد دنیا سے رخصت ہو گیا۔

اصلی واقعہ جو اُس کی حرص و ہوس کو ظاہر کرتا ہے یہ ہے۔ مگر اس میں بھی میرے خیال میں سوا اس کے کہ اُس کا اپنی فانی زندگی کے ختم ہونے اور دنیوی شان و شوکت کے چھوٹنے پر افسوس کرنا ظاہر ہو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اسے روپے سے بید حسرت تھی یا کسی کو دیتا نہ تھا۔ یہ ہندوؤں کا خیال ہے کہ انسان کو مرتے وقت دان پڑنا چاہیے۔ اسلام کی رُوسے اُس وقت کی فیاضی کوئی خاص وقعت نہیں رکھتی۔ اصلی فیاضی اور خیرات وہ ہے جو اپنی زندگی و صحت کے زمانے میں انسان مستحقین

کے استحقاق کا خیال کر کے کرے۔ غریبوں - محتاجوں - یتیموں - بیوؤں کی خبر گیری اُن کی ضرورت و احتیاج کے وقت کرے۔ مرتے وقت تو انسان کو خیال کر لینا چاہیے کہ اب جو کچھ ہے میرا نہیں دُرنا کا ہے۔ اور وہی اُس کے پانے کے مستحق ہیں۔ لہذا اُن کو محروم کر کے کسی اور کو دے دینا بے انصافی اور ظلم ہے۔ محمود سچا مسلمان تھا۔ اور کوئی وجہ نہ تھی کہ مرتے وقت اس اصول کو ہاتھ سے چھوڑ دیتا۔

اس میں شک نہیں کہ محمود کے حکم سے جب روپے اشرفیان اور جواہرات سامنے لاکے ڈھیر کر دیے گئے تو اُس وقت بعض حریصوں نے بھی کھڑے تھے جن کے منہوں میں پانی بھر آیا۔ وہ دل میں سمجھنے لگے کہ بادشاہ نے ان چیزوں کو منگوایا ہے تو ہمیں دے گا۔ لیکن جب اُس نے اُن سب چیزوں کو خزانے میں واپس بھیجا تو انکی آتش حرص ایسی بجڑک اُٹھی کہ اُس کی مذمت کرنے لگے۔ اور مشہور کر دیا کہ محمود غزنوی بڑا کجخوس ہے۔ لیکن یہ محمود کی حرص و طمع نہیں خود اُن لوگوں کی ہوس پرستی تھی جس نے اُہ بے نام کیا۔

بلکہ بعض حیثیتوں سے دیکھا جائے تو محمود دل کا بڑا مضبوط تھا اور موت کی نازک گھڑی میں بھی صبر و تحمل کی باگ اُس کے ہاتھ سے نہیں چھوٹی۔ اُس نے ترسٹھ سال کی عمر میں جمعرات کے روز ۲۳ - ربیع الآخر ۵۸۵ھ کو سفر آخرت کیا۔ مگر اُسی حالت میں جبکہ موت کا یقین ہو چکا تھا اُس نے تخت شاہی پر بیٹھ کے دربار کیا۔ اُمراء و وزراء - اراکین دولت - علماء و شعراء دربار اپنے غلاموں اور نوکروں سے نہایت ہی ضبط اور لطیفان کے ساتھ رخصت ہوا۔ اور جس طرح لوگوں سے رخصت ہوا اُسی طرح مال و دولت اشرفیوں اور جواہرات کو بھی سامنے منگوا کے رخصت کیا۔ اسوقت انسانی فطری کمزوری سے اگر اُس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے تو اُسے اس کی ہوس و حرص پر محمول کرنا بڑی نا انصافی ہے۔

کسی کی یاد

دُنیا کے جھگڑاؤں کے لیے ذرا چین سے بیٹھنے دو۔ جس قدر ہم تم سے بھاگتے

ہیں اُسی قدر تم نے قسم کھائی ہے کہ جان نہ چھوڑو گے۔ تمنا رہ گئی کہ کوئی اطمینان کی گھڑی نصیب ہوتی۔ اور ہم خاموشی و سکون کے ساتھ ایک حالت پر قرار لیتے۔ جو چاہتے کرتے۔ جس سے چاہتے ملتے۔ جس پر چاہتے جان فدا کرتے۔ جسے چاہتے یاد کرتے۔ جس کے خیال میں چاہتے محو ہو جاتے۔ اور بقول غالب مہر وہ یہ تمنا برائی کا جی چاہتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیلئے ہوئے

مگر ہمارے کیا کہیں؟ اور کس کے آگے روئیں؟ تمھاری یورش اور تمھارے حلوں نے کوئی بھی آرزو نہ پوری ہونے دی۔ سچ یہ ہے کہ تم نے کسی کام کا نہ رکھا۔ فکرِ معاش و عشقِ تہان۔ یادِ فنکان۔ اتنی سی عمر میں کوئی کیا کیا کرے؟ تم نے کسی کام کی فرصت نہ دی۔ افسوس! تم ہمیں کبھی اپنے شوق اور اپنی مرضی کا کوئی کام نہیں کرنے دیتے۔

اے افکارِ عمر! مانا کہ تمھیں ہم سے دشمنی ہے۔ عداوت ہے۔ تم ہمیں خوش و خرم نہیں دیکھ سکتے۔ ہماری مسرت تمھارے سینے میں کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے۔ ہرگز نہیں چاہتے کہ ہماری کوئی آرزو بر آئے۔ یہ نہیں گوارا کہ ہم معشوقہ آرزو سے ہم کنار ہوں۔ اور کسی کے اخلاقِ عالیہ کے موردِ عنایت نہیں مگر ہمیں رونے تو دو۔ آہ! تم تو رونے بھی نہیں دیتے۔

اے تردداتِ زندگی! تمھارے اس نرغے میں بھی کیا کہیں کہ اس وقت کون یا داگیا؟ اور کس نے ہمیں ہمیشہ کے لیے بزمِ ماقم میں بٹھا دیا۔ مگر اس پر بھی تمھارا حملہ نہیں رکتا۔ تم اپنی بے رحمیوں سے نہیں باز آتے۔ یہ بھی نہیں دیکھتے کہ اس وقت ہجومِ آلام سے ہمیں تمھارے جھگڑے و نین پڑنے کی فرصت ہی نہیں ہے؟ یوں تو ہمیں کچھ پڑے ہوؤں کی یاد نے ہمیشہ تیار و بمقرا رکھا۔ یہ زندگی روزِ روز کی ناکامیوں اور نامرادیوں کے علاوہ صدمہ ہرخصت ہو جانے والے احباب اور دل میں اپنا نقش بٹھا دینے والی محبتوں ہی کے غم میں روتے گزری۔ اس عہد کو روتے ہی کٹی اور کٹے گی۔ مگر آہ! اس پیارے دلدارِ نازِ آفرین اور اُس دل میں جم جانے والی صورتِ زیبا کی جدائی تو کسی طرح گوارا نہیں ہو سکتی جس کی یاد سب پر غالب ہے۔ اس دل

خون کروینے والی یاد نے اس ستم زدہ دل پر جو تھاری بدولت ہمیشہ جو لاگاہ
حوادث اور مرکز ہوم و غوم بنارہا ایسا قبضہ کر لیا ہے کہ اب اس کے غم کے آگے
کسی بات کا ہوش نہیں۔

امید تھی کہ اُس چھوڑ جانے والے دلدار ناز آفرین کی محبت بھری باتیں ساری
تکمرین دور کر دیں گی۔ کیونکہ اُس کی جبین ناز ہمارے کو کب آرزو کا مطلع تھی۔ اُسکی
اشوخی آنکھیں اپنی چمک دمک سے افکار و ہوم کی تاریکی کو دل سے مٹا دیتی تھیں
اُس کے بھرے بھرے رخسارے ہماری جنت آرزو کے لذیذ تر میوے تھے۔
اس کا خندہ ناز تمنا و امید کے راستے کی مشعل تھا۔ اور اُس کی زلف شگون
وہ کند آرزو تھی جس سے ہم ہر تمنا کو اپنے پاس کھینچ لاتے اور ہر حوصلے کو طائر
خسکا رہنا لیتے۔ آہ! سمجھے تھے کہ اُس مت دل دار کی مدد سے عمر کی گزشتہ ناکامیوں
کا معاوضہ مل جائے گا۔ اور چند روز عیش میں گزر رہے گے۔ ارادہ تھا کہ
از زلف دراز تو کندے فلکینم برگردن عمر رفتہ تا باز آید
مگر عمر! بد نصیب عمر! تیری وہ کند نوٹ گئی اور جس کے عالیشان ایوان کے
سنازل عالیہ تک اب وہ تیری شکستہ کندہیں پہنچ سکتی۔ بس ہو چکا۔ قسمت پر تیرا
کوئی زور نہیں چل سکتا۔ اور جس طرح تیرا زور نہیں چلتا اسی طرح تو بھی قابو سے باہر
ہے۔ کون ہے جو اس عالم یا س میں تجھے روکے؟ اور کس کی مجال ہے کہ تجھے
تھامے؟

خیر اے عمر! یہ بھی مانا کہ تیرا روکنا دشوار ہے۔ مگر اے دنیا کے جھگڑے
تم تو نہ سناؤ۔ کیا ضرور ہے کہ ہجوم آلام کے ساتھ تمہارا بھی ہجوم ہو؟ اگر ہم عمر
ناپائیدار کو نہیں روک سکتے تو اتنا موقع تو دو کہ اس کے جتنے دن باقی ہیں اس
دلربا بچھڑنے والی کو یاد کرتے۔ اور اُس کی یاد میں روتے اور سر دھستے گور
جائیں۔

اے یاد رکھنا! تیری سیر گاہ میں ہم نے بڑے بڑے تماشے دیکھے ہیں۔
اُن تماشوں کو جانے دو جو اگلے تذکرہ اور تاریخ وسیع کے واقعات سے ماخوذ ہیں۔
یا جنہیں افسانہ خزان ایام کی سامعہ نوازی نے قانون کے ذریعے سے حافظے

کے خزانے میں لالا کے جمع کیا ہے۔ بے شک اُن میں نہایت ہی دلچسپ روایات اور دونوں پر لڑنے والے واقعات ہیں۔ لیکن اسے بے پروا حوادثِ روزگار اُنھیں بار بار یاد کرنا چونکہ تمھاری مرضی کے خلاف معلوم ہوتا ہے اس لیے ہم اُن کی طرف سے بھی اپنا خیال ہٹائے لیتے ہیں۔ ہم سے قسم لے لو کہ سلف کے گزرے انسانوں کو جو کبھی زبان پر بھی لائیں۔ یا ان سے ذرا بھی متاثر نہ ہوں۔ لیکن جب ہم تمھارا اتنا لحاظ کرتے ہیں تو تم میں بھی اتنی مروت ہونی چاہیے کہ ہمیں اُن باتوں کو تو یاد کر کے رو لینے دو جو آنکھوں کی دیکھی ہوئی ہیں۔ اور ابھی کل کی باتیں ہیں۔

عرب کا مخبر بیان شاعر اُم القیس عجب بہادری و مردانگی سے حوادثِ روزگار اور کمزوریاں زمانہ پر فحیح حاصل کر کے گزری باتوں کو یاد کرتا اور یاد رفتگان کے شرخاموشان میں اپنا چراغ روشن کرتا ہے۔ خدا جانے کس جہم پر اور کسی شدید ضرورت سے جا رہا تھا کہ ایک پُر نضا وادی کو دیکھ کے معشوقہٴ حنین اور اُس کے ساتھ اپنا اگلا عیش و مفیکری کا زمانہ یاد آ گیا۔ جب اُس سے صحبتیں رہتی تھیں۔ طرح طرح کی باتیں ہوتی تھیں۔ روز ملتے تھے۔ اور نوعمری کی سادگی کے ساتھ شوق کی بیخودی میں خدا جانے کیا کیا بے تکلیفان کر گزرتے تھے شب و روز نمازِ آفرینی و نمازِ برداری اور نمازِ دنیا زمین گزر جاتے تھے نہ کسی چیز کا غم تھا۔ نہ کسی بات کا کھٹکا تھا۔ گرو و پیش کی زمین کا کوئی چرہ نہ تھا۔ جان معشوقہٴ بجان فواز سے صحبت نہ رہی ہو اور وہ اُس کی کسی نہ کسی ادا سے دلکش کو نہ یاد دلاتا ہو کوئی درخت نہ تھا جس کے سایے میں بیٹھ کے اس کچھڑی ہوئی حسنیہ سے ہم کنار رہا ہو اور کوئی چشمہ نہ تھا جس کے پانی میں اُتر کے شوخ ادائی کے ساتھ دونوں باہم نہائے اور کھیلے نہ ہوں۔ بہر تقدیر اس بے پروا شاعر نے ساری فکروں کو الگ پھینک کے یاد جانان کا مزہ اُٹھا لیا۔

مگر اسے آفاتِ زندگی! ہمیں تم اتنی مہلت نہیں دیتے کہ کچھڑی ہوئی معشوقہٴ حنین کی یاد نے ہمارے ظلمتکدہٴ دل میں جو اُس کی قبر بنا دی ہے اُس پر ایک حسرت بھری شمعِ روشن کر دیں! خیر تم ہمیں نہیں چھوڑتے تو ہم ہی تمھیں چھوڑے دیتے ہیں۔

اب ہمیں کچھ پروا نہیں۔ تم کو اختیار ہے۔ جتنا سنا تا ہوتا ہو۔ اور جس قدر حیران کرنا ہو کر لو۔ ہماری زبان سے اُت نہ سُنو گے۔ ہم نے اب تمہاری بے رحمیوں کی طرف سے آنکھ پھیر لی۔ اور قسم لے لو جو کبھی آنکھ اٹھا کے بھی دیکھیں۔

اب ہمیں اپنی زہرہ جبین کے سوا کوئی یاد نہیں۔ اُس کو یاد کریں گے۔ اور چاہے جو ہو جائے اُسی کو یاد کریں گے۔ اب اس خون شدہ دل میں اُس کے خیال کے سوا کوئی نہ ہوگا۔ افسوس! اُسکی محبت بھری صورت خواب و خیال ہو گئی۔ اور جس طرح آفتاب کے غروب ہو جانے کے بعد اُس کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھرتی ہے اُسی طرح اُسکے چلے جانے کے بعد اُس کا خیال اکثر اس تیار و بقرار دل میں آ جاتا ہے۔ کاش ہم ایک بالکل حُر تراض ہوتے کہ خیال سے اصلیت لطف اٹھا لیتے۔ یا ایک روشن ضمیر صوفی صافی ہوتے کہ اُس کے خیال کو شوق کے تحت روان پر چٹھا کے اپنے گھر میں بلاتے اور دل کی مسہری میں اس طرح سُلا دیتے کہ پھر نہ جاسکتے۔ اور ہمیشہ دل ہی میں ہی رہتے۔ مقتدایانِ دین اور محققانِ روحانیت یہ وعدہ کرنے ہیں کہ فردا سے قیامت کو ضرور وصال ہوگا۔ یہ مانا کہ دریا با ماہِ طلعتوں کے وعدوں کی فردا ہمیشہ سے فردا سے قیامت ہوتی آئی ہے۔ مگر جو ستم زدہ سرمان نصیبِ فراق و ہجران کی ایک رات کے برداشت کرنے کی بھی تاب نہ لاسکتا ہو اس سے بھلا فردا سے قیامت کا انتظار کیسے ہو سکے گا؟

غرض جدھر دیکھیے ایو سی ہی مایو سی ہے۔ شوق بھری آنکھیں ہر طرف دھونڈھتی پھرتی ہیں اور اُسے کہیں نہیں پاتیں۔ دنیا کا ایک ایک کونا دھونڈھ آئے مگر وہیری جمال کہیں نہ ملی۔ حسینانِ جہان کے آتشین رخسار اور لبِ لعلیں دیکھ کے بار اُٹس کا دھوکا ہوا۔ اور شوق کے جوش میں دوڑے گئے۔ لیکن غریب جا کے دیکھا تو اُن میں اپنی ناز آفرین کی کوئی بات نہ نظر آئی۔ نونالانِ جہنم میں سے کون ہے جس پر اس کا دھوکا نہیں ہوا؟ مگر افسوس دھوکا ہی دھوکا تھا۔ سرو کے قامتِ زیبا کو دیکھ کے بے اختیار دوڑے کہ شاید ہماری سرو قامتِ سیرِ باغ کو آئی ہے مگر جا کے دیکھا تو وہ نہ تھی۔ نرگس شہلا کو دیکھ کے دھوکا ہوا کہ غالباً یہ ہماری جادو نگاہ کی مست و محمور آنکھیں ہیں۔ مگر آہ

وہ پیاری اور سلی آنکھیں کہاں؟ گلاب کی تازگی اور رعنائی دیکھ کے سمجھ کر یہ اُس گلزار کے رخسار سے ہیں۔ اور بڑے شوق سے دوشے مگر انہیں وہ ہماری سچیں کا رخ زیبائیں سراب تھا۔ مایوسی بڑھی تو جوش وحشت صحرائیں نکال لے گیا۔ ہر جگہ پر دھوکا ہوا کہ اسی پردے میں ہماری لیلہ کی محل ہوگی مگر خاک کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔ ہر ایک رو اور چالاک ہرن کو دیکھ کے شبہ ہوا کہ ہماری مشوقہ طناز ہے مگر وہ ایک ہوا کے جھونکے کی طرح نظر سے غائب ہو گیا اور ہاتھ مل کے رہ گئے۔

خلاصہ یہ کہ ساری زمین چھان ڈالی اور اُس جمال جہان آرا کا کہیں پتہ نہ لگا۔ سارے پُر فضا مقامات۔ تمام روح افزا باغ۔ وہ ہماری امید بھری کوئی جہان وہ محبت عیش کا مکان سب اُس کے بغیر سونے پڑے ہیں۔ وہ اُس کا خاص عشرت کدہ جس میں اُس کی صورت زیب نظر آیا کرتی۔ اور وہ ہمارا عالم حسن و عشق جس میں ہر صبح اُس کے جبین ناز کا آفتاب طلوع کیا کرتا۔ ہر شب کو اس کی جادو بھری آنکھیں سحر سامری کو جگایا کرتیں۔ اور اُس کے گورے گال چاند کے دو جد اجدا ٹکڑوں کی طرح چمک کے شق القمر کا معجزہ دکھا دیتے۔ اُس کی زلفوں کے کھرتے ہی رات ہو جاتی۔ اور اُس کے عارض تائبان کے نمودار ہوتے ہی دن ہو جاتا۔ کامل پیچان کی بدلیان آتیں۔ اور رخسار تائبان کا چہرہ بدلی میں چھپ چھپ کے اور دامن ابر سے نکل نکل کے بار بار شب فراق و صبح وصال کے کرشمے دکھاتا۔ اُس کی نگاہ گرم کی بجلیاں حکیمتیں اور ہماری چشم اشکبار کا مینہ برسا۔ آہ! کیا عالم تھا! کیا سماں تھا! مگر اب کچھ بھی نہیں ایک اُس ماہ طلعت کے نہ ہونے سے وہ عالم ہی اُجڑ گیا۔ اور ہر طرف ستا ہوا پڑا ہے۔

آخروہ کہاں گئی؟ کیا اپنی آسمانی غویوں کے تقاضے اور اپنے زور انی حسن کے میلان سے آسمان پر چلی گئی؟ ایسا ہے تو کاش کوئی وہاں جاتا اور اُس سے اتنا پوچھ آتا کہ ع ”اے رہ نور و عالم بالا چکو نہ؟“ اُس حسن آباد ملکوت کی بڑی تعریفیں سُنی ہیں۔ سنتے ہیں کہ وہاں بد صورت کوئی نہیں۔ اور اُس عالم قدس میں

اچھی صورتوں والے ہی رہتے ہیں۔ فرشتوں کے حسن کا تذکرہ کس نے نہیں سنا؟ اور حوروں کی تعریف تو ہو ہی نہیں سکتی۔ اس سے بڑھ کے کیا ہوگا کہ حضرت شیخ اور جناب زاہد کے ایسے خشک مزاج بزرگ بھی اُن کے دام گیسو کے اسیر اور اُن کے عالم آشوب چہروں کے دیوانے ہو رہے ہیں۔ اور جب ایسے ایسے نیک نفس بزرگوں کی یہ حالت ہے تو اُن کے رُخِ زیبا کی زیارت کر کے ہم سے آشفۃ مزاجوں کی کیا حالت ہوگی؟ مگر ہمیں ہمیں نہ فرشتوں سے مطلب ہے نہ حوروں سے سروکار۔ ہمیں تو اپنی ماطلت دلربا چاہیے اور خدا جانے اس اعلیٰ نالیش گاہِ حسن میں ہماری وہ مخبینِ نازنین کیسی رہی؟ یہ تو یقینی ہے کہ اس کا حسن وہاں بھی سب پر بالا رہے گا۔ فرشتے ہوں یا حوریں اُس کے حسن کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔ مگر اندیشہ ہے تو یہ کہ وہاں بھی ہمارے رقیب نہ پیدا ہو جائیں۔ اور فرشتوں ہی میں سے چند نئے ماروت و ماروت نہ نکل پڑیں۔ یہ بھی سہی۔ اور اُن ہم اندر عاشقی بالائے نعم ہاے دگر“ مگر سوچنا یہ ہے کہ عاشقانِ عالم سرودشِ دالوں کے ساتھ ہماری ناز آفرین کا سلوک کیا ہے؟ یہ کہنے کی کوئی کیسے جرات کرے۔

در گلزارِ دہرِ نظیرے نہ داشتی در حوریان آئینہ سیما چگونہ

ان سب جھگڑوں اور اندیشوں کو بھی الگ کرو۔ مگر یہ بتا دو کہ عالم بالا میں اُسے کیونکر ڈھونڈ سکیں؟ اور کہاں ڈھونڈ سکیں؟ جس کسی کو اپنا پیا سہر بنا کے وہاں بھیج دین گے اُس سے پھر واپس آنے کی امید رکھنا جنوں ہے۔ جو جائے گا اور اُس کے جلوہ گاہِ حسن تک باریاب ہو سکے گا وہ پھر کیوں واپس آنے لگا تھا؟ خود ہمیں اپنے اوپر اعتبار نہیں ہے۔ جب اور کوئی اُسے چھوڑ کے نہ واپس آئے گا تو پھر ہم کیوں آنے لگے تھے؟ ہم بھی اُسی عالم سرودش کے ہو جائیں گے اور کبھی واپس نہ آئیں گے۔ کوئی ایسی تدبیر ہوتی کہ اُسے یہیں بلاتے۔ اور اس انقلاب پذیر عالم کے لیل و نہار کا سماں ایک ساتھ میٹھ کے اور کچھ دنوں دیکھتے۔

اچھا تو ہم ہمیں سے بیٹھ کے اپنی دلربا نازنین کو عالم بالا اور شاہانِ فلک

مین ڈھونڈتے ہیں کیونکہ وہ اس تیرہ خاکہ ان ارضی مین نہیں ہے تو فورانی اجرام فلک مین ضرور ہوگی۔ مگر جستجو کی خاطر نظر کو وہاں بھی اُس کی صورت زیبا نہیں نظر آتی۔ روشن آفتاب سے شعلے نکلتے دیکھ کے خیال ہوتا ہے کہ یہی ہماری ہر روش ہے اسلئے کہ اُس کے گورے گالوں سے بھی لوہین نکلتی تھیں۔ مگر آفتاب کی گرم مزاجی نے امید کی شمع گل کر دی۔ اور معلوم ہوا کہ یہ ہماری شمع رخسار مین کوئی اور ہے۔ وہ ہوتی تو اُس کے حسن کی شعا مین ہمارے سینے کی آگ کو گلزار ابراہیم بنا دیتیں۔ چاند کا روشن چہرہ دیکھ کے یقین ہو گیا کہ ہونہ ہو یہی ہے۔ اُس کی ٹھنڈی روشنی ہمارے کلبہ احزان کو اُسی طرح روشن کر رہی ہے جس طرح وہ اُس ماہ رخ کے آنے سے روشن ہو جایا کرتا تھا۔ مگر نہیں۔ اس مین بھی وہ بات نہیں۔ اُس کے چہرے کی روشنی دل کے اندر بھی اُجا لا کر دیا کرتی تھی جان تک چاند کی روشنی مین پہنچ سکتی۔ مگر یقین ہے کہ وہ ان ہزار ہا روشن تاروں ہی مین ہوگی۔ سب مین اُس کی سی چمک دمک ہے سب مین اُس کی نازنینی و ناز آفرینی ہے۔ سب نظروں کو اپنے حسن کی طرف کھینچتے اور دیکھنے والوں کو اپنا شیدا بناتے ہیں۔ برج سنبلہ مین ایک حسین دوشیزہ کھڑی ہے وہی تو نہیں؟ عروس جوزا کا ہیکہ آسمان والوں نے کھول کے اُسی کی نازک کمر مین تو نہیں باندھ دیا؟ مشتری کی جگہ پر اُس کی مین لے کے وہی تو آسمان پر نہیں بٹھ گئی؟ اور زہرہ کے پچھونڈ پر آسمان پر وہی تو جلوہ فرما نہیں؟ ہر طرف خیال جاتا ہے۔ اور آسمان کی ہر صورت زیبا پر اُس کا دھوکا ہوتا ہے مگر افسوس کسی مین بھی وہ بات نہیں نظر آتی جو ہماری نازنین مین تھی۔

افسوس تو کمین نہیں ملتی۔ اور کمین تیرا پتہ نہیں۔ آہ! پھر بھی نا امیدی مین ہمارا جوش دل ہماری رہبری کرتا ہے اور ہر حسن اور ہر خوبی کے دامن مین پھنسی ہوئی ہمیں تو ہی نظر آتی ہے۔ یہ فقط کہنے کی بات مین کہ تو نہیں ہے۔ نہیں تو ہر جگہ ہے۔ تو ان آنکھوں کے سامنے سے نہیں ہٹی۔ وہ دقت جب تیرا جمال جان آرا پہلے پہل نظر آیا تھا اور اُس کے بعد وہ نازک گھڑی جب تو ان مشتاق آنکھوں کے سامنے سے غائب ہوئی ہے دونوں نظر کے سامنے ہیں۔ بلکہ اب ہمیں تجھ مین اُس وقت سے زیادہ خوبیاں زیادہ دلکیشان زیادہ ناز و انداز اور زیادہ لطف نظر آتے ہیں۔

تیرے خوبصورت اور شباب کے آغوش میں کھیلنے والے چہرے کے گرد
 عصمت و عفت کا ہالہ اور پاکدامنی کے نور کا حلقہ نظر آ رہا ہے۔ اور تیرے حسن
 میں لپٹی ہوئی کچھ ایسی ابدی و سرمدی نورانیت دکھائی دے رہی ہے کہ تیرے دلدادہ
 ہونے کی وجہ سے ہمیں خود اپنی سرمدیت اور اپنی غیر فانی زندگی کا یقین ہوا جاتا ہے۔
 دُنیا کا ہر بچھول اور آسمان کا ہر تارہ تیرے چہرے کی نقاب بن گیا ہے جس کے اندر
 سے ہمیں تیرا خوبصورت چہرہ کچھ پوشیدہ اور کچھ نمایان اُسی طرح نظر آ رہا ہے جس
 طرح کہ تو ہماری صحبتوں میں "دیدار سے نمائی و پرہیز سے کسائی" کی شان ظاہر کیا کرتی تھی
 سورج کی کرنوں۔ چاند کی شعاعوں۔ تاروں کی جھللاہٹ۔ اور شمع کی روشنی میں
 ہمیں ہر وقت تیرا پیارا چہرہ دکھائی دیتا ہے۔ اب اُس کی رونق اور تازگی کو جنت
 کا قیام و استقلال حاصل ہو گیا ہے۔ اس لیے کہ اب تو مرد و رایام اور انقضاے عمر کی دست
 برد سے باہر ہے۔ اور اپنے پائدار اور سدابہا رُسن کا جام حیات پلا کے تو ہماری محبت
 میں بھی ابدیت و سرمدیت کا سرور و اطمینان پیدا کر رہی ہے۔ بہر حال اسے ابدیت
 جھوٹے میں جھوٹے والی نازنین۔ شہرون میں۔ صحراؤں میں۔ جنگوں میں۔ پہاڑوں میں۔
 ہر طرف ہمیں تیری ہی مومنی صورت نظر آتی ہے۔ سمندر کی لہروں میں۔ اور نسیم کے
 جھونکوں میں۔ تیرا ابدیت کا تخت پر یوں کے تختوں کی طرح اُڑتا نظر آتا ہے۔ اور رات
 کی اندھیری اور سنسان مقامات کی خاموشی میں یا تو میں خود تیری آواز سنتا ہوں۔
 اور یا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے رحمت کا فرشتہ چپکے چپکے کانوں میں کہہ رہا ہے کہ اب
 تاریکی کی نقاب میں تیرا ہی چہرہ ہو۔ اور اس سنائے کے گریو فون میں تیری ہی نغمہ خیز
 آواز آ رہی ہے۔

ایسے دل و دماغ میں بسے ہوئے حُسن کی یاد کو کون بھلا سکتا ہے ؟ اور
 کس کی مجال ہے کہ اُس جمال جہان آرا کے اور ہماری آنکھوں کے درمیان میں
 پردہ ڈالے ؟ اے حادثہ روزگار ! اور اے انکار زمانہ ! تم ہمیں جتنا جاہلو
 ستا لو مگر یہ تمہاری قوت سے باہر ہے کہ اُس نازنین کو ہمارے دل میں آنے اور
 ہماری آنکھوں کے سامنے پھرنے سے روکو۔ ہم نے تمہیں دکھا دیا کہ تمہارے هجوم اور تمہاری
 اس سخت روک تھام پر بھی ہم اُس نازنین کی یاد کو نہ بھولے۔ اور آخر تمہارا مقابلے میں ہم ہی

فتیاب ہوئے۔

چند خیالات و واقعات

اب کی سال مسلمانوں میں بعض اسباب سے جوش بہت بڑھ گیا ہے۔ جوش قیمتی چیز ہے اور دنیا کی ساری ترقیان بنی نوع انسان کے جوش ہی کا نتیجہ ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ یہ اصول بھی ہر مسلمان کے پیش نظر رہنا چاہیے کہ جوش میں آ کے کوئی سبب اور ناشائستہ حرکت کر بیٹھنے کے مقابل جوش کو روکنا اور ضبط و صبر سے کام لینا زیادہ بہادری کا کام ہے۔

برٹش گورنمنٹ ایک کانسٹیٹیوشنل (آئینی) سلطنت ہے۔ اور اس کی کیتون سے وہی لوگ زیادہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو جوش کو آئین کے تابع رکھ کر اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے قاعدے اور تہذیب کی لڑائی لڑیں۔ خوب یاد رکھنا چاہیے کہ ہندوستان کے لوگ اپنے جوش و خروش کو جس قدر زیادہ باقاعدہ بنا کے قانون سے ہم آہنگ کرتے جائیں گے اسی قدر زیادہ کامیاب ہوں گے۔

کانپور کا افسوس ناک واقعہ مذہب اور شائستہ مسلمانوں کا فعل نہ تھا۔ وہ چند مشتعل جملہ کے جوش کا اظہار تھا جس میں کوئی صاحب علم اور تعلیم یافتہ مسلمان ہرگز شریک نہ تھا۔ عام مسلمانوں نے نہ ان کے اس فعل کو پسند کیا۔ اور نہ یہ سمجھا گیا کہ گورنمنٹ سے مقابلہ کرنے میں وہ چند لوگ سارے مسلمانوں کی خواہش پوری کر رہے تھے۔ مسلمانوں نے اس مسئلہ میں وہی باقاعدہ طریقہ اختیار کیا جیسا کہ مذہب گورنمنٹ اور مذہب رعایا میں ہونا چاہیے۔ یعنی ہر آئین کے پاس ممو ریل کھینچو۔ اور ڈپوٹیشن کے ذریعے سے عرضداشت پیش کرنی چاہی

مگر ہمیں ہر آئین سے تعجب ہے کہ ایڈریس کے جواب میں انھوں نے ظاہر فرمایا کہ محض ہنگامہ کانپور کی بنا پر انھوں نے اپنا ارادہ اور اپنی پالیسی بدل دی۔ اور گویا کانپور کے ہنگامہ

کافہ دار سارے مسلمانوں کو قرار دے دیا۔ میں امید کرتا ہوں کہ وہ بہت جلد اپنی اس راے کو تبدیل فرمائیں گے۔ کیونکہ اگر یہ صحیح ہے تو پھر سارے مسلمان ملزم ہیں اور اس کا مل نہیں کہ گورنمنٹ ان پر بھروسہ کرے۔

ریویو

حکیم مولوی محمد عبدالعزیز صاحب کمال اڈیشہ اخبار "حکمت" تین کتابیں بغرض ریویو ہماری پاس بھیجی ہیں۔ جو فن طب کے متعلق ہیں۔ ہم طبیب نہیں کہ انکے مضامین کی تنقید کر سکیں۔ بادی النظر میں اچھی اور بہت مفید کتابیں معلوم ہوتی ہیں۔ اور اردو خوان پبلک کو اپنی گھریلو زندگی میں امید کر ان سے خوب سونے گی۔ قدردان حکیم صاحب موصوف سے منگوئیں اس لیے کہ آجکل یہ تینوں کتابیں نصف قیمت پر دی جاتی ہیں۔ کتب مذکورہ حسب ذیل ہیں:-

کاشف الرموز کیمیا۔ نہایت اعلیٰ درجے کے قدیم فن کو توضیح سے بیان کیا گیا ہے۔ گزرا نام رکھنے میں حکیم کسی عربی دان سے مشورہ لے لیتے تو مناسب ہوتا۔ یا تو "کاشف رموز کیمیا" یا صرف "کاشف الرموز" یا فارسی ترکیب اختیار کر کے "کاشف رموز کیمیا" نام رکھتے۔ مگر کاشف الرموز کیمیا نام رکھنا حکیم صاحب کی بڑی ہی چغلی کھا رہا ہے۔ فن کیمیا کی تاریخ میں بھی بازاری اور سطحی باتیں ہیں۔ تاہم کتاب اچھی ہے۔ اور ۳۴ صفحوں پر ختم ہوئی ہے۔ قیمت فی جلد للعر

جرئی بوٹی مع خواص۔ ۱۹۲ صفحوں پر بہت بجا آمد رسالہ ہے ان دونوں کے مصنف خود حکیم صاحب موصوف ہیں۔ قیمت بھر رہنما صحت اس کا بھی نام عجیب ہے۔ کتاب کا تو یہ کام ہے کہ مریضوں کو صحت کا راستہ بتائے مگر نام کتاب کی وہ صحت کو راستہ بتاتی ہے۔ اس کے مصنف حکیم منشی محمد عبدالصمد صاحب ناگپوری ہیں امید ہے کہ عمدہ کتاب ہوگی۔ ۲۱۶ صفحوں پر پوری ہوئی ہے۔ قیمت عام

حضرات

مراسلت میں لازمی طور پر اپنے پرچے کے نمبر بتایا کیجیے۔ اور نمبر ۱۰ اور ہوتا نام اور پتہ پورا اور صاف حرفوں میں تحریر فرمایا کریں۔ بعض حضرات دستخط بنا دیتے ہیں بعض نہیں لکھتے۔ ایسی صورت میں نہ جواب دیا جاسکتا ہے اور نہ تعمیل ہو سکتی ہے۔ نمبر دکنڈان



موسیقی اُن فنون لطیفہ میں سے ہے جن سے انسانی طبائع پر اثر ڈالنے کے لیے ہمیشہ اور ہر ملک میں کام لیا گیا ہے۔ اس کے موجب فطرت انسانی کے ایسے سامنے کے جذبات ہیں کہ اُس کے پہلے بانی کو کسی ترقی یافتہ ملک یا مستند قوم میں دُعاؤں دینا نادانی ہے۔ یہ ہے کہ اس کی موجد ہر قوم اور ہر سرزمین ہے جس نے آغاز ہی میں اسے ایجاد کر لیا۔ ہر وحشی سے وحشی قوم نے اپنا موسیقی آپا ایجاد کیا۔ مثل مشہور ہے کہ گانا اور رونا سب کو آتا ہے جس پر رز کوئی پہلا وحشی انسان کسی بات پر خوش ہو کر اُچھلا کودا اور گایا ناچا۔ اور جس دن تخلیق عالم کے آغاز ہی میں کوئی جاہل عورت کسی عزیز کی موت پر بکائی کے ساتھ سر پیٹ کے روتی اور بکین کرنے لگی اسی دن جانیے کہ موسیقی کا فن ایجاد ہو گیا۔ اور غالباً اسی کا اظہار قدیم مذاہب نے اس عنوان سے کیا ہے کہ اس فن لطیف کا موجد بچا ہے انسان کے دیوتاؤں کو بتا دیا۔ جو تخلیق عالم کے آغاز میں انسانوں کے بڑے دوست تھے۔ اُن سے ملتے جلتے تھے اور کبھی کبھی انھیں اپنی صحبتوں میں شریک کر لیا کرتے تھے

ہندو کہتے ہیں کہ موسیقی کے پہلے موجد ہمارے دیو جی تھے جو سب دیوتاؤں سے بڑے اور پہلے تھے۔ اور مختلف راگینان اپنے حالات و جذبات کے مناسب شکل و شمائل اور وضع و لباس پہننے انکی بیبیاں بتائی جاتی ہیں۔ مصر والے جو قدامت میں سب سے پہلے مشہور ہیں۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ موسیقی اور آلات موسیقی یعنی مختلف باجون کو اُن کے اعلیٰ ترین دیوتاؤں۔ اُسامرس۔ آئی س۔ اور دوس۔ اور ہر س نے

ایجاد کیا۔ یونانیوں کا خیال تھا کہ اُن کے اعلیٰ درجے کے دیوتا زیوس کی نوبیتان جو "میوزس" کہلاتی تھیں وہی تمام علوم و فنون کی بانی تھیں اور انھیں سے موسیقی کا فن ایجاد ہوا۔ اُن میوزس (دیویوں) کے نام یہ ہیں (۱) کالیوپہ۔ مثنویوں اور افسانہ خوانی کی شاعری کی بانیہ (۲) کلئو۔ تاریخ کی موجدہ۔ (۳) ارآتو۔ شفا شاعری کی بانیہ۔ (۴) یوتیرپہ۔ نغمہ خوانی کی شاعری کی بانیہ (۵) ملیومنہ۔ مرثیہ خوانی اور جہتِ غم کو اُبھارنے والی شاعری کی بانیہ۔ (۶) پولیہم۔ نغمہ خوانی اور فصاحت و بلاغت کی دیوی۔ (۷) ترپسی۔ شورش۔ ناچنے کی موجدہ۔ (۸) تھالیہ۔ جذبات مسرت کو اُبھارنے والی شاعری کی بانیہ۔ (۹) ارآتہ۔ علم ہیئت کی موجدہ۔ اسی قسم کے خیالات فن موسیقی کی ایجاد کے متعلق چینون۔ فارسیوں۔ اور بابل و ولون میں بھی ہوں گے۔ لیکن افسوس کہ ہم اُن سے ناواقف ہیں۔ مشرق کے متاخر محققوں نے موسیقی کی ایجاد اور اُس کی وجہ تسمیہ کے بارے میں عجب عجب خیال آفرینیاں کی ہیں۔ مگر اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ جڑیوں میں نغمہ سنجی کا قدرتی جوہر دیکھ کے موسیقار نام ایک طائر ٹھونڈھ کے نکالا جائے موسیقی کے ایجاد کی کلفتی اُس کے سر میں لگائی جائے اور اُس کی نسبت سے موسیقی کا نام موسیقی بتایا جائے۔ نام کی اصلیت یہ ہے کہ یہ فن علوم کی یونانی دیویوں میوز کی جانب منسوب ہے۔ اور میوز کا تلفظ یونانی میں یقیناً موس تھا۔ عربی و فارسی میں اور ہماری زبان میں جس طرح نسبت کے لیے لفظ کے آخرین یاے محروف لگائی جاتی ہے اسی طرح لاطینی اور یونانی میں "ق" لگایا جاتا تھا۔ اسی قاعدے کے مطابق وہ موسیقی کو "موسیق" (انگریزی میں میوزک) کہتے تھے۔ عربی کی غلطی تھی کہ اس کا خیال نہ کیا کہ موسیق میں خود ہی حرف نسبت موجود ہے اور اُس پر اپنے یہاں کی یاے نسبت بھی اضافہ کر دی۔ اور اس فن کا نام ساری مشرقی دنیا میں بجائے "موسی" کے "موسیقی" ہو گیا۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ اس فن کو کون کون قوموں نے کہاں تک ترقی دی۔ اور کس قوم کی موسیقی کس پائے پر تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ قدما سے یونان میں "موسیقی" کا مفہوم بمقابل آج کل کے زیادہ وسیع تھا۔ اُن لوگوں میں گانا ناچنا اور تپانا ہی نہیں بلکہ شاعری بھی اُس میں شامل تھی۔ اصل یہ ہے کہ اُن کے خیال میں جسے فنون میوزس

دیویون کی تعلیم سے حاصل ہوئے تھے سب اُن کی موسیقی میں شامل تھے۔
 کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے موسیقی کو اہل مصر نے ترقی دی۔ اور معلوم ہوتا ہے
 کہ اُن کی موسیقی اعلیٰ درجہ ترقی کو پہنچ گئی تھی۔ مگر اس عام تحقیق کے خلاف
 یونانی مورخ ڈیوڈ وروس سقولوس یقینی طور پر بیان کرتا ہے کہ مصر میں قدیم لایا
 میں موسیقی کی تعلیم و علم اور اُس سے حظ اٹھانے کی ممانعت تھی۔ اس لیے کہ اُس کے
 شوق میں مبتلا ہو کر آدمی عیش پرست ہو جاتے ہیں۔ اور جان انسان کو اس کا
 شوق ہوا بالکل گیا گزرا ہوتا ہے۔ مگر افلاطون اور ہرودوٹس دجیونامیون
 ہی کا نہیں ساری دنیا کا سب سے پہلا مورخ ہے (دونوں نے مصر کا سفر کیا
 تھا اور دونوں یقین دلاتے ہیں کہ بخلاف ممانعت اور روک کے مصر میں
 علم موسیقی کو ہر طرح سے ترقی تھی۔ سلطنت اُسے روز افزون ترقی دے
 رہی تھی۔ اور نو عمروں کو کسینی ہی میں اُس کی تعلیم دی جاتی تھی۔ خود ڈیوڈ وروس
 جو مصر میں اُس کے منوع ہونے کا راوی ہے دوسرے مقام پر کہتا ہے کہ موسیقی
 اور اُس کے تمام سازوں کے موجد مصر کے دیوتا تھے۔ اور یہ امر پوری طرح
 پائیدار ثبوت کو پہنچ گیا ہے کہ اہل مصر کے پاس ایسے ایسے باجے اور آلات
 طرب موجود تھے جن سے ہر قسم کے جذبات میں تحریک پیدا کرنے والے
 مختلف نغمے ادا ہوتے تھے۔

اہل بابل و نینوا میں بھی موسیقی کا بڑا رواج تھا۔ اُن کے وقت کی بنی ہوئی
 تصویریں بتا رہی ہیں کہ بادشاہوں کے ساتھ ساتھ اور فتحیاب فوجوں کے آگے
 آگے چنگ و رباب بجانے والے مفتی چلا کرتے تھے۔ یہ بھی ثابت ہے کہ اُن
 کے وہاں موسیقی عبادت میں داخل تھی۔ اور بڑے بڑے مندروں اور تہ خانوں
 میں ارباب نشاط اور مغنیوں کی چوکیاں مقرر تھیں جن کے نغمے پراکثر نوجوانوں
 کو حال آیا کرتا۔ مگر چونکہ ان کے پاس سوا پتھرون اور تصردایوان کی دیواروں
 پر کندہ کر دینے کے اور کوئی ذریعہ اپنے علوم و فنون کو بعد والوں کے لیے
 محفوظ کر دینے کا نہ تھا اس لیے اُن کے حملہ علوم کی طرح انکی موسیقی بھی انھیں
 ساتھ مٹ گئی۔ اگر یونانیوں کی طرح پاپئرس وغیرہ کی قسم کا سامان تصنیف و تدوین

اہل بابل و نینوا کے پاس بھی موجود ہوتا تو آج ہم اُن کے علوم سے اس قدر ناواقف نہ ہوتے۔ اور بخوبی معلوم ہوتا کہ انکی موسیقی کے کیا اصول تھے۔ اور کیسی تھی۔

نبی اسرائیل کو بھی موسیقی کا کم شوق نہ تھا۔ توراۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ سارے آلات طرب خصوصاً چنگ و ارغنون کا موجد جوہل تھا جو حضرت آدم کی نسل میں ساتویں پشت پر تھا۔ اُس کے ارغنون سے مراد غالباً وہ پُرانے زمانے کا ساز ہے جس میں کئی ایک بانسریاں ایک میں جوڑ دی جاتی تھیں۔ اس سے صفا ظاہر ہوتا ہے کہ موسیقی کی ایجاد جوہل سے پہلے ہی ہو چکی ہوگی۔ اور اگر پہلے نہ بھی ہوئی ہو تو اُس کے زمانے میں تو شک ہی نہیں کہ یہ فن موجود تھا جس کی تاکید و تقویت کے لیے آلات طرب ایجاد کیے گئے۔ مگر نبی اسرائیل کی موسیقی کے اصلی عروج کا زمانہ حضرت داؤد کا زمانہ ہے۔ مزامیر مشہور ہیں۔ قدیم مورخ اسیسوس کا بیان ہے کہ حضرت داؤد جہاں جاتے اپنا چنگ ضرور ساتھ لیجاتے اُنھوں نے مذہبی رسوم و عبادات کے لیے اہل موسیقی کی چرکیاں اور باجکے بنیڈ مقرر کیے تھے۔ اور ثابت ہوتا ہے کہ عبادت کرتے وقت وہ خود خدا کے واحد ذوالجلال کے سامنے گاتے بجاتے اور ناچتے تھے۔ جبکہ آلات طرب سے کام لینے والوں کا حاکمہ چنگ۔ رباب۔ طنبورہ۔ جھانجھ۔ قرنا اور ترہیاں بجاتا تھا۔ اور وہ اپنی سناجات کے نغمے کی صدا بلند کرتے۔ ان چیزوں کو اُن کے بعد حضرت سلیمان نے اور زیادہ ترقی دی جبکہ معبد الہی اور حرم ربانی میں بہت سے گانے بجانے والے مقرر تھے۔ یہ زمانہ نبی اسرائیل کی موسیقی کے شباب کا تھا۔ مگر اسیری بابل نے جو ۶۳ سال تک قائم رہی یہود کے موسیقی اور اُن کے آلات طرب دونوں کو خاک میں ملا دیا۔ اُس لمبی قید سے چھوٹنے کے بعد وہ پینے پینے پائے تھے کہ ارض یہود کا وہ پُر فتن زمانہ شروع ہو گیا جبکہ اُن پر ہر طرف سے حملے ہو رہے تھے۔ اور مصریوں، فلسطینیوں اور رومیوں سب نے یکے بعد دیگرے اُنھیں مغلوب و مقہور کیا۔ اور کبھی اتنی حملت نہ دی کہ اطمینان سے بیٹھ کے اپنے قدیم موسیقی کو تازہ اور پُرانے آلات طرب

کو بچہ زندہ کرتے۔ ان تباہیوں نے موسیقی کو ان میں سے فنا کر دیا۔ اور اب ان کے جادات اور رسوم مذہبی کو گانے بجانے اور آلات طرب سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ساری دنیا کے معابد یہود سے موسیقی کا فن قطعاً علیحدہ ہو گیا۔ اور جرمن کے یہود کا مدتوں سے یہ عقیدہ ہے کہ مسیحا کے ظہور سے پہلے گانا بجانا اور خوشیاں سنانا غیر مناسب اور حرام ہے۔

مگر افسوس اہل مغرب نے ہندوستان کی موسیقی کی طرف کبھی توجہ نہیں کی۔ حالانکہ یہ قدیم اور سب سے زیادہ مکمل اسی سرزمین کی موسیقی معلوم ہوتی ہے۔ مگر اس کی طرف ہم اس وقت توجہ کریں گے جب مسلمانوں کی موسیقی کا تذکرہ آئے گا۔ یونانیوں میں بہت سی دیگر اقوام عالم کی بہ نسبت موسیقی کی زیادہ قدر و منزلت تھی۔ لیکن اس تاریخی بیان کے سوا اگر ہم اس بات کو معلوم کرنا چاہیں کہ انکی موسیقی کیا تھی اور کیسی تھی تو کچھ بھی کہہ نہیں چل سکتا۔ ہر قوم کی موسیقی ان گیتوں کے ذریعے سے جن میں اچھی اور دلکش دھنیں بندھ جاتی ہیں بعد والی نسلوں میں منتقل ہوتی رہتی ہے۔ اور انھیں کوئس کے بعد والوں کو اپنے متقدمین کی موسیقی کی نوعیت کسی نہ کسی حد تک ضرور معلوم ہو جایا کرتی ہے۔ بخلاف اس کے یونانیوں کی موجودہ نسلوں میں اپنے بزرگان سلف کی نہ زبان ہی باقی رہی اور نہ ان کا نغمہ ہی باقی رہ گیا۔ پرانے یونانیوں کی موسیقی کا جو کچھ حصہ مل سکتا ہے وہ ان کی چند منشر تحریریں ہیں جو کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتیں۔

دنیا میں جس وقت خط ایجاد کیا گیا تو اس کی پوری کوشش کی گئی کہ انسان کی آوازیں محارج کے لحاظ سے مختلف حروف میں قلمبند کر لی جائیں۔ تاکہ جو لفظ جتنے محارج کی آوازیں سے مرکب ہے پہنچی ہر فون کے ذریعے سے تحریر میں لایا جائے۔ لیکن اس کی کبھی کوشش نہیں کی گئی کہ آواز اپنے ترتیب و تنزل پہنے زیر و بم۔ اور میڈون اور زمرزموں کے لحاظ سے تحریری نشانات میں دکھائی جائے۔ یہ ایسی کمی تھی جس کے باعث کوئی قوم اپنے موسیقی کو چاہے وہ کیسے ہی کمال کے درجے کو پہنچی ہوئی ہو دوسروں کے ذہن نشین

کرنے کے لیے قلیل نہ کر سکی۔

یونان کے اکثر قدیم فلسفیوں خصوصاً فیثاغورس۔ افلاطون اور ارسطو کے شاگردوں نے موسیقی پر لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن دنوں یونان میں موسیقی کا سکھانا اعلیٰ ترین طبقہ کے رئیس زادوں کی تعلیم کا جزو لازمی تھا اور نیز یہ کہ چسپی اور محبتوں میں لطف پیدا کرنے ہی کے لیے نہیں بلکہ مذہبی رسوم اور عبادات میں بھی موسیقی سے کام لیا جاتا تھا۔ وہ لوگ چونکہ ایشیائے کوچک سے جا جا کے بسے تھے اور سین کے علاقوں کے نام کی نوآبادیان یونان میں قائم ہو گئی تھیں لہذا انھیں نوآبادیوں یا اُنکے اصلی ایشیائی علاقوں کی جانب اعلیٰ دھنیں اور اُن کے نئے منسوب تھے۔ چنانچہ اپنے بعض نغموں کو لید یا سے ماخوذ بتاتے تھے جہاں پُرانا معنی "آتمی اور اس فن کی تعلیم دیتا تھا۔ بعض نغموں کو آر کا ڈیا سے حاصل کیا تھا جہاں چرواہے باللی وغیرہ نہایت ہی دلکش تانین لگایا کرتے تھے۔ اُن کے گانے کے ٹھاٹھ مقامات فرجیا۔ ڈوریا۔ ایولیا۔ اور ایونیا کی جانب منسوب تھے۔

خیال کیا جاتا ہے کہ یونانیوں کی موسیقی صرف سُرون تک محدود تھی۔ اور اس میں نے نہ تھی۔ کیونکہ اُن کے نزدیک وزن کا تعلق صرف نظم سے تھا۔ مگر غالباً یہ قیاس ویسا ہی ہو جیسے ہندوستان کے موسیقی دان اکثر اعتراض کیا کرتے ہیں کہ انگریزوں کی موسیقی میں گے نہیں ہے۔ یونانیوں نے اپنے علمی مذاق سے اس بات کی بھی کوشش کی تھی کہ موسیقی کی دھنوں کو تحریر میں لے آئیں۔ مگر اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اس لیے کہ جو اُن کے غلے سے نہ سن چکا ہو وہ اُس تحریر کے ذریعے سے ہرگز نہیں سمجھ سکتا کہ وہ نغمہ سُرون کی کس مناسب ترتیب سے اور کس دھن میں ادا ہوتا ہے۔ اُنھوں نے موسیقی کی تحریر کی بنیاد حروف تہجی پر رکھی تھی۔ سُرون کے لحاظ سے اُن حروف کی صورتیں بدلی اور بگاڑی گئی تھیں جس کی بدولت اُن کے بہت سی مختلف صورتیں ہو گئیں۔ اور پھر اُن پر زیر و بم اور مزمرہ وغیرہ کے علامات اضافہ

کیے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بڑھتے بڑھتے سولہ سو سے زیادہ تحریری نشانات ہو گئے۔ اور موسیقی کی حیثیت سے اُن کی الف بے چینیوں کی الف بے بن گئی۔ جس میں ہزاروں حروف ہیں۔ اور آخر اُن علامتوں اور بگڑے اور بدلے حروف کی وجہ سے وہ تحریر اس قدر پیچیدہ ہو گئی کہ کسی طرح سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ مگر اس سے اس بات کا ضرور اندازہ ہو جاتا ہے کہ اُنھوں نے موسیقی میں کس قدر زیادہ ترقی کر لی ہوگی۔ تاخرین میں یہ سوال پیدا ہوا تھا کہ ”آیا یونانیوں کو تنہا لف نغموں یعنی مرکب دھنوں کا علم تھا یا نہیں؟“ اور بڑے روڈ قدح کے بعد جو فیصلہ ہوا یہ تھا کہ ”نہیں۔ اُنھیں ایسی دھنوں کا علم نہ تھا۔“

یونانیوں میں عرب کے بازار عکاظ کی طرح مختلف شہروں میں میلے ہوتے تھے جن میں ہر قسم کے کرتب اور ہر فن کے کمالات دکھائے جاتے۔ اُنھیں میوین یونانی شعرا اپنی نظموں کو ہمارے مولانا شبلی نعمانی کی طرح موسیقی کی مناسب دھنوں میں گانے سنایا کرتے۔ نیز اُنھیں گیون (میلون) میں موسیقی، شاعری کے لیے انعام مقرر تھے۔ اور پیٹھیا کے گیم (میلے) میں جو بہت آخر زمانے میں ہوا کرتا تھا صرف باجون اور آلات طرب پر کمال دکھا والوں کو انعام دیا جاتا۔ یونانیوں میں جتنی عزت موسیقی کے پروفیسروں کی تھی اور کسی فن کے پروفیسروں کی نہ تھی راواٹھیں بڑی بھاری تنخواہیں ملا کرتی تھیں اہل یونان نے جس طرح موسیقی کو مصر والوں سے لیا تھا اسی طرح رومیون نے یونانیوں سے لیا۔ روم کی قوم ایک خالص سپہگیر اور جنگجو قوم تھی۔ اور ایسے فنون لطیفہ کی طرف فوجی مذاق والوں کو زیادہ توجہ نہیں ہو سکتی۔ مگر پھر بھی وہ فن موسیقی کی نہایت ہی قدر کرتے تھے۔ اور موسیقی دانوں کی اُن میں بڑی عزت کیجی تھی۔ اپنے ابتدائی عروج کے زمانے میں اس فن کو اُنھوں نے بہت ہی کم ترقی دی۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ مطلق توجہ نہیں کی۔ یہاں تک کہ نیر و قصیر کا زمانہ آیا۔ اور اُس نے بارجو دیکھ ظالم تھا موسیقی کو اعلیٰ درجہ ترقی و عظمت تک پہنچا دیا۔ اُس نے خود اس لطیف فن کو حاصل

کیا۔ اور اپنا زیادہ وقت تو ریپوس کی شاگردی میں صرف کر دیا جو اُس عہد کا سب سے زیادہ نامور مغنی اور چنگ نواز تھا۔ اب چونکہ اس فن کی جانب سلطنت کی توجہ مائل ہو گئی تھی لہذا تیرو کے بعد اُس کے جانشینوں سے بھی جان تک بنا فنون موسیقی۔ فوجی کرتون۔ اور ڈراما کو معتد بہ ترقی دی۔ یہاں تک کہ رومیون کے تنزل کے ساتھ اُن کی موسیقی بھی مٹ گئی۔ جس کے بدتون اور صدیوں بعد موجودہ اہل ایتالیا نے اپنی پرانی موسیقی کو پھر زندہ کیا۔

رومیون کے معاصر ایران کے ساسانی تھے۔ اگر غور سے دیکھے تو انکی قدیم الایام کی سطوت و جبروت ساری دنیا سے جس قدر بڑھی ہوئی تھی۔ اور جس انتہائی کمال کو اُن کی عیش پرستی پہنچی ہوئی تھی وہی درجہ انکی موسیقی کو بھی حاصل تھا۔ اُن میں قدیم الایام سے بڑے بڑے مغنی اور سرود و چنگ نواز ہوتے چلے آئے تھے۔ مگر آخر میں بار بار اور نکمیا نے جو خسر و پر دوزیر کے دربار کے مغنی کے جاتے ہیں اس فن کو ایسے کمال تک پہنچا دیا کہ اپنے نمونوں سے ساحری کا کام لیتے۔ مگر افسوس انکی تاریخ کی طرح انکی موسیقی کا بھی نام ہی نام دنیا میں باقی رہ گیا۔ انکی عظمت و سطوت کی تاریخ تو دیگر معاصر اقوام کے ذریعے سے محفوظ رہی بہت مل بھی گئی مگر انکی موسیقی کا ذوق کسی غیر کو کیا ہو سکتا تھا جو وہ ہمیں اُس کی خمیوں سے آگاہ کرتا۔

اب عربوں نے رومیون اور ساسانیوں دونوں کا دفتر اُلٹ کے شام و عراق میں ایک نئی اسلامی معاشرت قائم کی۔ قرون اولیٰ کے مسلمانوں نے خدا پرستی اور عبادات کے جوش و ذوق میں موسیقی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا۔ خصوصاً اُس لیے کہ موسیقی بت پرستوں کے عبادات میں داخل تھی۔ اور بنی اسرائیل کا خدہ پرست گروہ اس فن سے قطعاً متنفر تھا۔ اگرچہ حضرت سرور کائنات صلعم نے عورتوں اور لڑکیوں کو بار بار گاتے بجاتے دیکھا اور نہیں روکا تھا۔ جشیون کا رقص دیکھا اور نہیں منع فرمایا تھا۔ فن تجوید و قرأت کی تحصیل کو موجب ثواب آخرت بتایا جو کہ دراصل موسیقی ہی کا ایک روح افزا شعبہ تھا۔ جس سے کافی طور پر تہہ چل سکتا ہے کہ موسیقی کا وہی حصہ ممنوع ہے جو رسوم

ثبت پرستی یا جذبات شہوت پرستی سے تعلق رکھتا ہو مگر اسلام میں سوا اظہار یہ فرقہ اہل حدیث کے اکثر علما نے موسیقی کو ناجائز ہی قرار دے دیا مگر صحابہ اور تابعین ہی کے زمانے میں ہم اتنے اتنے بڑے اور اس پائے کے لوگوں کو گانا سنتے دیکھتے ہیں کہ عین تحریم موسیقی کے عام فتوے پر تعجب آتا ہے۔ اس شرعی روک پر بھی مسلمانوں میں فن موسیقی کو فطرتی طور پر ترقی حاصل ہونے لگی۔ جس کی وجہ غالباً یہ ہوئی کہ صرف امرا و لوگ ہی نہیں سلف کے سلمان اتقا و دوزخا د بھی دینی خلوص اور بے نفسی کے جذبات کے ساتھ ذوق و شوق سے گانا سننے لگے۔ سب سے پہلے ابوسعج نے جس کے حالات ہم دگلہ ذہبی کے صفحہ ۱۰۸ پر بتا چکے ہیں نارس و روم کے دور دورہ شہروں کی خاک چھان کے دنیا کے مسلم بالکانون سے فن موسیقی کو سیکھا اور اُس کے بعد عربی میں نہایت اور مقبول عام و محسن قائم کیں۔ ابوسعج کے بعد عربوں میں بڑے بڑے نامور مغنی پیدا ہونا شروع ہوئے جن کے مفصل حالات کتب تاریخ میں موجود ہیں۔ خصوصاً مامون کے زمانے میں اُس کے دربار کے مغنی اسحق متولی اور مامون کی بہن عسلیہ نے موسیقی کے ایسے ایسے کمالات دکھائے کہ عربوں کے نزدیک ساری دنیا میں اُن سے بڑے مغنی موجود نہ تھے۔ اغانی کی ضخیم کتاب جو میں اکیس جلدوں میں ختم ہوئی ہے صرف ”ماتہ اصوات المتخارہ“ یعنی دولت عباسیہ کے عہد کی سب سے مقبول عام و محسنوں کے بیان میں ہے۔

مسلمانوں کے اعلیٰ کمال موسیقی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اُن کا سب سے بڑا فلسفی اور حکیم ابو نصر فارابی جو حکماء اسلام میں ”معلم ثانی“ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے جس کی نسبت سب کو اتفاق تھا کہ ارسطو کے بعد اُس کے پائے کا کوئی حکیم دنیا میں نہیں پیدا ہوا۔ اور جس کے تصانیف نے ابی سینا کو حکیم بنادیا تھا۔ چوتھی صدی ہجری کے آغاز میں موسیقی کا سب سے بڑا بالکال پروفیسر تھا۔ موسیقی کا مشہور ارجا ”قانون“ اُسی کا ایجاد کیا ہوا ہے۔ وہ بھلات دیگر علما و فضلاء کے ترکیبیاہوں کی وضع میں رہا کرتا تھا۔ اور صورت دیکھ کے لوگ سمجھتے کہ کوئی مہولی درجے کا فوجی ترک ہے۔ جب شہر دمشق میں پہونچا تو اُسی سادی سپاہیانہ وضع میں فرمان رواے شام سیف الدولہ بن حمدان کے دربار میں گیا۔ جہاں بڑے بڑے مشہور روزگار

علا جمع تھے اس مہذب مجمع میں ابونصر کو خاموش کھڑے ہوئے دیکھ کے سیف الدولہ نے کہا ”بیٹھ جاؤ“ ابونصر نے پوچھا ”اپنے رتبے کے مناسب مقام پر بیٹھیں یا آپ کے دربار کی مناسبت سے؟“ سیف الدولہ نے کہا ”اپنے رتبے کے مناسب مقام پر۔“ یہ سنتے ہی ابونصر اہل دربار کی تمام صفوں کو قطع کرتا ہوا خود سیف الدولہ کے مندر پر پہنچا اور اس طرح پھیل کے بیٹھ گیا کہ خود سیف الدولہ بھی مندر سے باہر نکل گیا۔ یہ دیکھ کے سیف الدولہ دل میں نہایت برہم ہوا۔ اور اپنے مسلح غلاموں کی طرف دیکھ کے ایک خاص زبان میں جس کو سوا اُس کے غلاموں کے دربار کا اور کوئی شخص نہ سمجھتا تھا کہا ”اس شخص نے سخت بے ادبی کی ہے۔ میں اس سے چند سوالات کرتا ہوں اگر جواب نہ دے سکے تو بے رحمی سے پوچھے اس کے گویے اڑا دینا۔“ غلام تو خاموش رہے مگر ابونصر نے اسی زبان میں جواب دیا ”یا امیر صبر کیجیے۔ ہر ام کا انکشاف انجام میں ہوا کرتا ہے“ سیف الدولہ نے گھبرا کے پوچھا ”تم اس زبان کو جانتے ہو؟“ جواب ملا ”جی ہاں جانتا ہوں۔ اور اسی زبان پر موت و تنہا نہیں میں ستر زبانوں میں بخوبی گفتگو کر سکتا ہوں“ یہ کہہ کے ابونصر نے علماء سے گفتگو شروع کی اور جو جس فن میں شہرت رکھتا تھا اُسی فن میں بحث کر کے اُسے خاموش کر دیا۔ حقوڑی ہی دیر میں ظاہر ہو گیا کہ سارے علماء دربار میں سے کوئی بھی کسی فن میں اُس کی ہمسری کا دعویٰ نہ کر سکتا تھا۔ تمام حاضرین اور خود سیف الدولہ کی یہ حالت تھی کہ عیش عیش کر رہے تھے۔ اور حیران و مبہوت تھے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ علماء حاضرین نے دربار شاہی کو درمہ نہا دیا۔ اور جو الفاظ ابونصر کی زبان سے سنتے اُنھیں قلمبند کرنے لگے۔ یہ رنگ دیکھ کے سیف الدولہ نے دربار کے برخاست ہونے کا حکم دے کے تمام علماء کو رخصت کر دیا۔ اور ابونصر کو ساتھ لے کے دربار خاص میں چلا گیا اور پوچھا ”کچھ نوش فرمائیے گا؟“ ابونصر نے کہا ”نہیں“ پوچھا ”کچھ پیجیے گا؟“ ”نہیں“ پوچھا ”اچھا گانا سنئیے گا؟“ ابونصر نے کہا ”ضرور!“ اس کا تو مجھے خاص شوق ہے“ فوراً دربار نشاط حاضر ہوئے۔ اُس زمانے کی شہور و مقبول عام گانے والیاں سامنے کھڑی ہو کے مجھے گانے لگیں۔ اور

آلات طب کے جتنے اعلیٰ درجے کے ماہر شہر میں موجود تھے اپنے اپنے سارا
لے کے کھڑے ہوئے۔ اور بجانے لگے۔ مگر ابونصر کی یہ حالت تھی کہ ہر ایک
کے حکمانے اور بجانے میں عیب نکالتے۔ اور ایسی سخت نکتہ چینیان لیکن کہ
ان کے رعب سے گانے بجانے والوں کو اپنا فن بھول گیا۔ اور سیف الدولہ
نے تعجب سے کہا۔ ”کیا جناب اس فن کو بھی جانتے ہیں؟“ جواب دیا ”جی ہاں جانتا
ہوں“ اب سب لوگ مصر ہوئے کہ ”کچھ سنائیے“ ابونصر نے کہا ”بہتر“ یہ کہہ کے
ایک قسیلی میں سے جو ساتھ قحی لکڑی کے چند ٹکڑے سے نکالے۔ انھیں ایک
خاص ترتیب و ترکیب سے جوڑ کے بٹھایا۔ ان پر تار کھینچے۔ اور انھیں بجایا
کے ایک ایسی دھن میں گانا شروع کیا کہ جو سننا اُسے ہنسی آنے لگتی۔ نتیجہ
ہوا کہ دم بھر میں تمام حاضرین محفل مارے ہنسی کے پوٹنے لگے۔ پھر اُنھوں نے
اس ساز کو کھول کے نئی ترکیب سے جوڑا۔ اور ابکی سُر ملا کہ جو گانا بجا شروع
کیا تو تمام حاضرین زار و قطار رو رہے تھے۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ درود دیوار پر
رقت طاری ہے۔ اس کے بعد اُنھوں نے اُس ساز کو پھر کھول ڈالا اور
تیسری ترکیب سے جوڑ کے بجانا شروع کیا تو تمام سامعین پر غنودگی طاری ہوئی
چند منٹ نہیں گزرے تھے کہ سب لوگ حتیٰ کہ خود سیف الدولہ اور میرے
والے تک غافل سو رہے تھے۔ ان سب کو غافل دیکھ کے ابونصر نے اپنا ساز
کھول کے پھیلی میں رکھا چونکہ سے اٹھ کے چلے گئے۔ اور سب لوگ سوتے
کے سوتے رہ گئے۔ ان باتوں کا یہ اثر تھا کہ علامہ ابونصر فارابی مرتے دم
تک سیف الدولہ کے دربار میں رہے۔ اور سیف الدولہ ہی نے اُنکے جنازے
کی غازی پڑھائی حکیم ابن سینا بھی اس فن کا اتنا بڑا کمال تھا کہ شنائی اُسی کی ایجاد ہو۔
عربوں نے بھی یونانیوں کی طرح اس بات کی کوشش کی کہ فن موسیقی کو
تحریر میں لائیں۔ سُر وں اور نکلے کے دیگر خصائص نغمہ کے اظہار کے لیے کسی
خاص خط کے ایجاد کرنے کی طرف تو ان کا خیال نہیں گیا مگر سُر وں کو سہرود
کے تار وں اور ان کے ساتھ انگلیوں کے تعلقات کا لحاظ رکھ کے اُنھوں
نے اپنے تصانیف میں دھنوں کو اس طرح بتانا چاہا کہ مثلاً ”ثقیل اول“

باسبابت فی بحری البصر“ دقتیں ہے اور اول۔ پچ کی انگلی سے گر چھٹنگلیا کے برابر والی انگلی کی چال میں) اسی طرح کی بسیون اصطلاحیں ہیں جن کو ہم اور ہمارے زمانے کے لوگ مطلقاً نہیں سمجھ سکتے۔ حالانکہ عربی کی جو ہزار ہا دھنین ان اصطلاحوں میں بتائی گئی ہیں ان سے کتاہن بحری بڑی ہیں۔ انوس ان سے ہمارے موجودہ موسیقی دان فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ خلافت عباسیہ کے ساتھ ہی عربوں کی موسیقی بھی مٹ گئی کیونکہ جس طرح مسلمانوں نے اپنے قرون اولیٰ کے تمام فنون کو آخر تک محفوظ رکھا تھا اپنی پرانی موسیقی کو وہ نہ بچا سکے۔ جو تھوڑی بد نصیبی کی بات نہیں ہے۔

اصل یہ ہے کہ موسیقی خالص علمی فن ہے۔ اور اس کا تعلق بہت کچھ ہر قوم کی زبان۔ لہجے اور اس کے مخارج و اصوات سے اور اس سے بھی زیادہ اس قوم کے گلے کے خصائص اور ان کے مذاق و عادات کے ساتھ ہوتا ہے۔ زبان لب و لہجہ۔ مخارج اور ذوق و عادات کے چھوٹنے کے ساتھ ہی موسیقی بھی چھوٹ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان عرب سے نکلنے کے بعد جان گئے اپنے مذہب اور اپنے تمام علوم و فنون کو تو ساتھ لیتے گئے مگر موسیقی کو نہ لے جاسکے۔ ایران میں پہونچ کے جب وہ فارسی بولنے لگے تو ان کی موسیقی بھی وہی ہو گئی جو ایران میں فارسی بولنے والوں میں مروج تھی۔ اور جب ہندوستان میں آ کے ہندی بنے تو عربی موسیقی بالکل خواب و خیال ہو گئی اور ہندوؤں کی موسیقی ان کی موسیقی بن گئی۔

شاعری کا فن بھی اسی قسم کا ہے۔ مگر چونکہ اس کا بہت کچھ حصہ خیالات و تشبیہات سے وابستہ ہے۔ اس لیے مسلمان جان گئے اپنی شاعری کو ساتھ لیتے گئے۔ مسلمانوں کے زمانے کی فارسی شاعری دراصل عربی شاعری ہی کا ایک نمونہ ہے۔ جس میں بہ استثنائے چند جملہ تشبیہات و استعارات عربی سے ماخوذ ہیں۔ اور یہی حال ہماری اُردو شاعری کا ہے جو آج تک زیادہ تر عربی شاعری ہی کا ایک ضخیمہ ہے۔ مگر عربی موسیقی نہ ایران تک آ سکی اور نہ ہندوستان میں پہونچ سکی۔ اگر موسیقی کے لیے کوئی ایسا خط ایجاد ہو جاتا جس میں آوازیں

مخارج کے لحاظ سے نہیں بلکہ اپنے مختلف سُرون اور گھٹنے بڑھنے کے اعتبار سے نقوش میں ادا کی جاسکتی ہیں۔ اور تانوں - مینڈون اور گنگری وغیرہ گھٹے کے مخصوص حرکات کی بنیاد پر علامات تحریری قائم کر دیے جاتے تو شاید عربی موسیقی ایسی تحریر میں آجاتی جو آج تک بتا سکتی کہ اُن کے موسیقی کے کیا اصول تھے اور وہ کس وضع کی تھی۔

ہندوستان میں مسلمان عربی و ایرانی موسیقی کو کلیتہً بھول گئے اور انھیں اپنے پُرانے نغموں کے عوض سنسکرت کا ایک ایسا مکمل فنی موسیقی مل گیا جو بے اعتبار اپنے قدیم اصول اور اپنی وسعت کے ساری دنیا کے موسیقی سے بڑھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یہ موسیقی جو ہندوؤں کی صحبت بائے عیش اور اُن کی حیا و کی جان تھی چند ہی روز میں راجاؤں کی سمجھاؤں سے مسلمان بادشاہوں کے دربار میں - اور ہندوؤں کے مندروں سے مسلمان صوفیوں کی محفلِ حالِ قتال میں پہنچ گئی۔ اور آخر دولتِ مغلیہ کے عروج کے زمانے میں خود مسلمانوں میں سے ہندی موسیقی کے ایسے ایسے باکمال پیدا ہو گئے کہ اُن کے سامنے پُرانے ہندو گویوں کی شہرت مٹ گئی۔ اور جن تے گانے کے کمالات آج قومی روایتوں میں کرامات و معجزات کی شان سے بیان کیے جاتے ہیں۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ آج ہندوستان کی موسیقی کا فن زیادہ تر مسلمانوں ہی میں ہے اور بڑے بڑے مشہور گویے سب مسلمان ہیں۔

ہندی موسیقی کی تفصیل بتانے کے لیے اس وقت ہمارے پاس کافی گنجائش نہیں ہے جس کسی کو شوق ہو فارسی کی کتاب "اصول النغمات الصغیہ" اور راجہ نواب علی خان صاحب کی کتاب "معارف النغمات" کا مطالعہ کرے۔ رومیوں کے بعد یورپ کی موسیقی رتوں تک نہایت ہی اتر حالت میں رہی۔ عیسائیوں نے چونکہ ثبت پرستوں کی تمام باتوں کو اختیار کر لیا تھا اس لیے موسیقی کو بھی روم کے پُرانے بتِ خانوں کی طرح اپنے معبودوں اور گرجوں میں مروج کر دیا۔ مگر اُنکی ابتدائی زمانے کی موسیقی ہمارے ڈھالیوں کے راگ سے زیادہ وقت نہ رکھتی تھی۔ ۱۷۳۷ء میں شہرِ لائسن کے اُسقف

سینٹ امیر دس نے یہ دیکھ کے کہ گرجون کی موسیقی بالکل بے اصول اور
 بے آگندہ ہے اصلاح کی طرف توجہ کی اور وہ خاص دھن ایجاب کی جو
 "امیر دسین چانٹ" (نغمۂ امیر دس) کے نام سے مشہور ہے۔ پوپ گریگوری
 کے مرنے کے بعد جو مسئلہ کا واقعہ ہے اس بات کی کوشش شروع ہوئی کہ موسیقی
 کی دھنوں کو کسی طریقے سے قلمبند کیا جائے۔ مگر اس زمانے میں جو خط موسیقی
 ایجاد کیا گیا اُس کا لکھنا چاہے آسان ہو مگر گاتے وقت اُس کا لحاظ رکھنا اور
 اُس پر عمل کرنا بہت ہی دشوار تھا۔ اسلئے کہ ہمارے یہاں جس طرح بعض لوگوں
 نے سُرون کے ناموں کے پہلے حرف یا کڑے لکھ دیے ہیں یہاں بھی لکھ دیے
 جاتے تھے۔ مثلاً سرگم کی جگہ س یا سر۔ رکھب کی جگہ ر یا رکھ۔ گندھار
 کی جگہ گ یا گن۔ یہ تحریر کسی حد تک دھنوں کو محفوظ ضرور کر سکتی تھی مگر گانے
 والے محانتے وقت اُن سے مطلق فائدہ نہ اٹھا سکتے تھے۔ اور آواز کے دیگر
 خصائص مطلقاً نہیں معلوم ہو سکتے تھے۔

دسین صدی کے آخر میں اس تحریر کو من جمیع الوجوہ ناقص دیکھ کے ایک
 نیا طریقہ ایجاد کیا گیا۔ اس میں سُرون کے شمار کے لحاظ سے متوازی خطوط
 قائم کیے جاتے۔ نغمہ کا خط اُن میں لہا ہوا چلتا اور گلا جس سُر پر پہنچتا اُسی
 سُر کی لکیر پر پہنچا دیا جاتا۔ اور اس کے ساتھ گئے کے دیگر خصائص و حرکات
 نقطوں اور خطوں کے اشارے سے بتا دیے جاتے۔ اس خط نے موسیقی
 کی تحریر بہت آسان کر دی۔ لیکن ۱۶۷۸ء میں جب پوپ بنی ڈکٹ ہشتم کا زمانہ
 تھا اس خط موسیقی میں اور بہت سی ترقیاں اور اصلاحیں ہوئیں۔ چنانچہ اسی
 زمانے میں بادیوں کے بنی ڈکٹس گروہ کے ایک راہب نے جو علاقہ
 ٹسکانی کے ایک گناہ گاروں آبرؤ میں پیدا ہوا تھا اور گوئی ڈو کے نام
 سے یاد کیا جاتا تھا ساتوں خطوط متوازی کا شمار سات سے گھٹا کے چار
 ہی کر دیا۔ اس لیے کہ چار خطوط اور اُن کے درمیان کی تین خلاؤں سے
 بل کے سات مقامات قائم ہو سکتے تھے۔ اس میں چونکہ خطوط کی درمیانی
 خلا سے بھی کام لیا گیا تھا اس لیے نقطوں اور آڑے خطوں کے علامات

دشنامت اُن خطوں کے درمیان میں بھی قائم کر دیے جاتے۔ یہی تحریر موسیقی آج تک یورپ میں مروج ہے۔ اور وہاں کے تمام موسیقی کا لہجہ میں اسی خط موسیقی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اور اگرچہ اس اعتراض کا جواب نہیں کہ سنسکرت کی قدیم مکمل و باضابطہ موسیقی سے غافل رہ کر یورپ والوں نے اپنے آپ کو ایک بڑے علمی ذخیرے سے محروم و بے برہ رکھا ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ یورپ میں فی الحال ہر حیثیت سے موسیقی کو بڑی ترقی ہو رہی ہے۔ اور گلے بازی اور آلات طرب و نون چیزوں میں وہ ممالک ارض سے بڑھتے جاتے ہیں۔

ہمارے یہاں بھی اب موسیقی جاہل معنیوں سے نکل کے پڑھے لکھے اور شائستہ لوگوں میں آنے لگی ہے۔ بعض علما نے اُس کے جواز کے فتوے دیے ہیں۔ اور ہندوؤں نے بھی اپنے قدیم موسیقی کو نئے سرے سے سنبھالا اور اُس میں از سر نو جان ڈالنا شروع کر دیا ہے۔ ایسی حالت میں تعجب معلوم ہوتا ہے کہ اپنے موسیقی کے تحریر میں لانے کی اس وقت تک مطلقاً کوشش نہیں کی گئی۔ جبکہ اُردو کا نیا شارٹ ہینڈ خط بھی ایجاد ہو گیا تو تعلیم یافتہ شائقین موسیقی کی کوشش و توجہ سے کسی مکمل خط موسیقی کا ایجاد ہونا ہمارے موسیقی کی ترقی کے لیے لازمی اور ضروری ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ہمارے احباب اس کمی کو جلد پورا کریں گے۔

فلینڈرس کی ایک کہانی

ہر قوم اور ہر ملک میں کچھ ایسی داستانیں موجود ہیں جن کو یہ وقت تو نہیں حاصل ہے کہ صفحات تاریخ میں لکھی جائیں۔ مگر اکثر تاریخ نگار خاندان ایسی ہی کہانیاں اور اسی قسم کے قومی گیت ہوتے رہے ہیں جو پستہ و پستہ سے چلے آتے ہیں اور قوم کا کوئی فرد نہیں جو انکو نہ جانتا ہو۔ عرب صلیبیہ کی تاریخ کا بھی ایک معتد بہ حصہ اسی طرح کے قومی نغموں اور

سے لیا گیا ہے۔ لیکن اسے ملحوظ خاطر رہنا چاہیے کہ ایسی کمائیوں میں خیر
حملہ آوروں کی عظمت دکھانے کے بعد خاتمہ ہمیشہ اپنی کامیابی ہی پر کیا جاتا ہے۔
اور اکثر یہ ہوتا ہے کہ انجام غلط ہوتا ہے اور آغاز صحیح۔ اسی قسم کی ایک کمائی
یورپ کے علاقہ فلینڈرس میں جو مملکت ہالند میں واقع ہے بہت مشہور ہے۔
اور ایسی ہے کہ اُسے مسلمان بڑی دلچسپی سے سنیں گے۔ ہالند کا سچہ سچہ توصیف
سے جانتا چلا آتا ہے اب دگلداز کی زبان سے اُسے مسلمانان ہند کے بچے
بھی سن لیں۔

جب عربوں نے یورپ پر حملہ کیا اور اُندلس اور فرانس کے غالب
حصہ کو فتح کر کے اُنکی فوجیں خشکی یا دریا کے راستے سے شہر اینٹ ورپ تک
پہنچ گئیں تو اس زمانے میں اس شہر کا حاکم بڈرین نام ایک شخص تھا اینٹ ورپ
آج کل کی طرح اُس زمانے میں بھی ایک بہت بڑا شاندار شہر تھا۔ کیونکہ
شمالی یورپ کے تمام اندرونی ممالک کی تجارت اسی شہر کے ذریعے سے
ہوتی تھی۔ سب مال جازون کے ذریعے سے بین آتا تھا اور یہاں سے
تمام اندرونی ممالک میں بھیجا جاتا تھا۔ جس کی وجہ سے اس شہر کی بڑی وقعت
اور شہرت تھی۔ لیکن پورے ملک پر کوئی مستقل حکومت نہ تھی۔ ہر شہر اور
ضلع مختلف زمینداروں کے ہاتھوں میں تھا جو وہاں کے حاکم اور تمام سیاہ
وسفید کے مالک تھے۔ عربوں نے بہت ہی آسانی سے اینٹ ورپ کو
فتح کر لیا اور بڈرین کو اپنی جان بچانے کے لیے شہر چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔
اُس نے ایک قریب کے شہر میں پناہ لی جہاں کا حاکم اور شخص تھا۔ بڈرین
نے اُس سے اور آس پاس کے تمام حاکموں سے امداد چاہی کہ عربوں سے
لوٹے مگر عربوں کی مصیبت ایسی چھائی ہوئی تھی کہ کسی نے اُن سے بگاڑنا
مناسب نہ جانا اور کسی نے بھی مدد دینے کی حامی نہ بھری۔ بڈرین اگرچہ بالکل
بد دست و پا اور مجبور تھا مگر دل سے اپنے شہر کی محبت نہ گئی۔ بھیس بدل
کے اینٹ ورپ میں آیا۔ اور وہاں کے لوگوں کو عربوں کی مخالفت پر
اُبھارنے لگا۔ مگر سب کو لڑائی کی مصیبتیں یاد تھیں۔ کوئی آمادہ نہ ہوا قطع

نظر اس کے عربوں کی حکومت میں اٹھو کوئی تکلیف بھی نہ تھی۔ بلکہ پہلے سے زیادہ آرام اور اطمینان حاصل تھا۔ اسی اثنا میں ایک روز بڑے میں اینٹ ورپ کی گلیوں میں چکر لگا رہا تھا کہ کسی عرب سپاہی کو اُس پر جاسوس کا شبہ ہوا۔ فوراً اُسے گرفتار کر لیا۔ اور اُسی عدالت کے مکان میں مجرموں کی طرح بیجا کے کھڑا کر دیا جس میں سال ڈیڑھ سال پہلے کا ذکر ہے کہ یہ خود بیٹھ کر انصاف کیا کرتا تھا۔ اس نے جو اظہار و یادہ بالکل ناکافی تھا کیونکہ اپنے چال چلن کی صفائی میں وہ کسی شخص کو بھی شہادت میں نہ پیش کر سکا۔ مگر عربوں نے بھی اُس کے متعلق کچھ زیادہ گریہ نہیں کی۔ اس لیے کہ اول تو ان دنوں انھیں کسی زبردست حریف کا اندیشہ نہ تھا اور دوسرے یہ بات تھی کہ بڑے میں کے خلاف کسی الزام کا صریح ثبوت بھی ان کے پاس موجود نہ تھا۔ بس اتنا ہی حکم کافی سمجھا گیا کہ وہ شہر بدر کر دیا جائے۔

مسلمانوں نے تو اُسے اس حکم کے مطابق شہر کے باہر کر کے چھوڑ دیا۔ جسکی نظر سے غائب ہوتے ہی اُسے اتفاقاً اپنے چند بڑے رفیق مل گئے جو اسے دیکھ کے بہت خوش ہوئے۔ اور ہر طرح اُس کی خدمت و رفاقت کو آمادہ ہوئے۔ اُس کو بھی اپنے شہر سے بہت اُنس تھا اور کسی طرح اُسے چھوڑ کے جانے کو دل نہ آتا تھا۔ غصیل کے باہر ہی ایک پوشیدہ مقام میں رہنے لگا اور وہ رفیق بھی اُس کے ساتھ تھے۔ بہت دنوں تک یہ لوگ سوچتے رہے کہ کس طرح شہر پر دوبارہ قبضہ کیا جائے۔ مگر کوئی تدبیر بن نہ پڑی۔ سب تدبیر و ن سے عاجز آ کے بڑے میں نے ایک سُرنگ کھودنی شروع کی۔ اور چند روز میں اُس نے اور اُس کے رفیقوں نے رات دن محنت کر کے سُرنگ کو تکمیل کے قریب پہنچا لیا۔ اس سُرنگ کے کھودنے میں اصلی مقصد یہ تھا کہ ایک ایسا خفیہ راستہ بنالیں کہ شہر کے پھاٹک بند کے بند رہیں اور اُس کے ذریعے سے پوری فوج شہر میں داخل ہو جائے۔

مگر اب فوج کہاں لائے؟ اسی فکر میں تھا کہ معلوم ہوا سلطنت فرانس کی ایک زبردست فوج اینٹ ورپ کے قریب سے گزرنے والی ہے جو

کسی دور کی ہم پر جاری تھی۔ اُن لوگوں کا قصد اس شہر کی طرف آنے کا نہ تھا۔ کیونکہ شہر کی تفصیل بہت مضبوط تھی اور عربوں سے مقابلہ کرنا آسان کام نہ تھا۔ مگر بڑے زمین اُس فوج کے افسر سے ملا اور سمجھایا کہ میں بغیر کسی مزاحمت کے فوج کو شہر کے اندر داخل کرادوں گا۔ پہلے تو اُسے اُس کے کہنے کا یقین نہ آیا۔ مگر جب اُس نے افسر کو لہجہ کے وہ خفیہ سُرنگ دکھائی اور بتایا کہ صرف آدھ گھنٹہ کی محنت میں یہ سُرنگ خاص حاکم کے محل کے اندر نکلے گی تو وہ اینٹ ورپ پر حملہ کرنے کے لیے آمادہ ہو گیا۔

عربوں کو اس کی بالکل خبر نہ تھی کیونکہ کسی کو وہ خفیہ راستہ نہیں معلوم تھا۔ فرانسیسی فوج جب اس شہر کی طرف بڑھی تو عربوں نے شہر سے باہر نکل کے مقابلہ کرنا چاہا۔ مگر باہر نکل کے اپنی صفیں ہی درست کر رہے تھے اور لڑائی ابھی جاری نہیں ہونے پائی تھی کہ شہر سے شور و غل کی آواز بلند ہوئی۔ پیچھے پھر کے دیکھا تو معلوم ہوا کہ شہر کے اندر لڑائی ہو رہی ہے۔ اور فرانسیسی فوج کا ایک حصہ شہر میں داخل ہو کے اُس پر قابض ہو گیا ہے۔ ایسی حالت میں اُن کیا بن پڑ سکتا تھا۔ مگر ہمت ہارنا اور ہتھیار رکھنا اُنکی شان سے بعید تھا۔ ہزار مایوسی تھی مگر جان توڑ کر لڑنے لگے۔ اور سب نے بڑی شجاعت و ناموری کے ساتھ خوشی خوشی اور ذوق و شوق سے شہر بت شہادت پی لیا۔ اس طریقے سے فلینڈرس میں صرف پانچ ہی برس کے بعد مسلمانوں کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

فرانسیسیوں نے بڑے زمین کو پھر وہاں کا حاکم تو بنادیا مگر وہ پہلی آزادی نہ نصیب ہو سکی۔ کیونکہ نئے فتحیابوں نے اُسے حاکم بھی بنایا تو اپنا غلام اور ماتحت بنا کے رکھا۔

چاہ کن راجہ درپیش

یہ مثل تو ہمیشہ سے مشہور ہے۔ مگر جس عجیب اور انوکھے طریقے سے یہ فارسی

کے قدیم زبردست شاعر کمال الدین اسماعیل اصفہانی پر منطبق ہوئی خدا نہ کرے کہ کسی اور پر منطبق ہو۔ کمال الدین موصوف دولت مند تھے معزز تھے ہر دلعزیز تھے۔ حسب و نسب کے اعتبار سے بھی نہایت محترم تھے۔ اہل وطن اُنکے کمال شاعری کے بھی نہایت معترف تھے یہاں تک کہ انھیں مقبولیت عامہ کے دربار سے خلاق المعانی کا خطاب ملا تھا۔ لیکن کسی موقع پر انھیں ہم وطنوں سے صدمہ بھی پہنچ گیا۔ شاعر نازک خیالی کے ساتھ نازک مزاج بھی ہوتے ہیں۔ آپ نے اُس پر بگڑنے کے اہل اصفہان یعنی اپناے وطن کے حق میں بددعا کی اور یہ قطعہ کہا۔

اے خداوند ہفت سیارہ بادشاہے فرست خونخوارہ
تا در و دشت را چو دست کند جوئے خون اور در جو بارہ
عد و عدوان بفراید ہر یکے را کند دود و پارہ

خدا جانے کس گھڑی یہ بددعا کی تھی کہ چند ہی روز میں پوری ہو گئی۔ اور چنگیز خان کے بیٹے اُقتائی خان کا تاتاری لشکر آ پہنچا۔ اہل اصفہان تاب مقاومت نہ لاسکے۔ اور تاتاریوں نے شہر میں گھس کے قتل عام کا حکم دیا۔ ہمارے خلاق المعانی صاحب کو جانبری کی کوئی صورت نہ نظر آئی تو فطری لباس کر کے اصفہان سے نکلے اور شہر کے باہر ایک خانقاہ میں بیٹھ کے اللہ اللہ کرنے لگے۔ تاتاریوں کے غول اُدھر سے گزرتے اور انھیں لہا لہا درویش خیال کر کے چلے جاتے۔ اتفاقاً کسی مغل بچے (تاتاری لڑکے) نے یہاں قریب کسی طائر کو دیکھ کے شکا کرنا چاہا۔ اور کمان میں تیر رکھ کے چاہتا تھا کہ اُس طائر کو اڑا دے کہ کمان ہاتھ سے چھوٹ کے گنوں میں جا پڑی جو اسی خانقاہ کے متعلق تھا۔ لڑکے کا کمان نکالنے کے لیے گنوں میں اُترا۔ اور اپنی کمان لی مگر اندر جا کے اُسے معلوم ہوا کہ گنوں میں بہت سامان و اسباب اور سامان دولت پڑا ہوا ہے جسے کوئی شہر والا تاتاریوں کی دست برد سے بچانے کے لیے اُس گنوں میں ڈال گیا تھا۔ تاتاریوں کو جیسے ہی اُس کا پتہ لگا سمجھے کہ یہی درویش صاحب جو فقیر بنے بیٹھے ہیں۔ اپنا مال و اسباب گنوں میں ڈال کے خود فقیر بن گئے ہیں۔ اس خیال کا پلہ ہوا تھا کہ سیکڑوں

تاتاری وحشی خانقاہ میں گھس پڑے اور انھیں اُن کے سچا دے ہی پر قتل کر ڈالا۔ یوں خلافتِ المعانی کمال خود اپنی بددعا کا نشانہ بنے۔ اُسی کنوین میں گرے جسے ہم وطنوں کے لیے کھودا تھا۔ اور جو تمنا اہل اصفہان کے لیے کی تھی ایسی تکمیل کے ساتھ پوری ہوئی کہ خود بھی نہ بچ سکے۔

عبداللہ بن ابی بکر صدیق

عشاقِ عرب میں یوں تو بڑے بڑے مشہور نام موجود ہیں مگر اولیت کا تاج عبداللہ بن ابی بکر کے محترم سر کے ساتھ مخصوص ہے جن کا محبت بھرا چہرہ صبحِ اسلام کے نمودار ہوتے ہی دُنیا کو نظر آیا تھا۔ عبداللہ مدوح حضرت ابوبکر صدیق کے فرزندِ دلبند تھے اور اُن خوب رو و صاحبِ جمال جوانانِ قریش میں تھے جن کی آنکھیں آفتابِ اسلام کے طلوع ہوتے وقت تھکے ہی کھل گئیں۔ چونک کے اُٹھے۔ سچے ہادیِ برحق کی پُر اثر آواز سُن کے خدا سے واحد و الجلال پر ایمان لائے۔ اور صحابہ کے محترم گروہ میں شامل ہو گئے۔

جس وقت حضرت رسالت (روحی فداہ) نے اعترافِ اہلِ وطن کے مظالم سے تنگ آکے اور جان سے ہاتھ دھو کے حرمِ ربانی کو چھوڑا اور گھربار کو خیر باد کہی ہے اُس وقت عبداللہ کا غفوانِ شباب تھا اور سین بھیکتی تھیں۔ تین دن جب تک اُن کے پیرِ بزرگوار اور حضرت رسولِ خدا صلعم غارِ ثور میں رہے معمول تھا کہ روز رات کوسب کی آنکھ سچا کے غار میں آتے دونوں بزرگوں کے لیے کھانا لاتے۔ قریش اور اہل مکہ کے حالات اور اُن کے ارادوں سے آنحضرت کو مطلع کرتے۔ اور رات کو عین غار میں پڑ رہتے۔ صبح تڑکے پھر مکہ میں واپس چلے جاتے۔ اس کے بعد جب یہ پہلے دونوں داعیِ اِلٰہی الحق ہاجر غار سے نکل کے عازمِ مدینہ ہوئے تو عبداللہ کا دل برابر اُن میں لگا رہا۔ ایک ایک سے جا جا کے خبر پوچھتے کہ ہمارے مظلوم مفروکہ کمان ہیں۔ یہاں تک کہ عبداللہ بن ابی بکر نے جو ارضِ شریف آتا تھا شردہ سنایا کہ دونوں بزرگ خیریت کے ساتھ مدینے پہنچ گئے۔ یہ سننے ہی عبداللہ بن ابی بکر نے سفر کی تیاریاں کر دیں۔ اور دو چار ہی روز بعد اُن بزرگوں سے جا ملے۔

بھرت کے آغاز میں عبد اللہ موصوف جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں ایسے حسین و خوش رُوزوں
تھے کہ انکی جوانی مسلمانوں کی نظر کے سامنے شبابِ جنت کی تصویر لاکے کھڑی کر دیتی۔ اور قافلہ
ہے کہ جس طرح روپیہ روپیہ کو کھینچتا ہے، حسن بھی حسن کو اپنی طرف کھینچا کرتا ہے۔ چنانچہ ان کی
شادی سعید بن زید کی بہن عاتکہ بنت زید کے ساتھ ہو گئی جو ویسی ہی صاحبِ حسن و جمال
تھیں جیسے کہ عبد اللہ بن ابی بکر تھے۔ جوڑا نہایت ہی مناسب و موزون تھا۔ اور اس کا
یہ لازمی نتیجہ تھا کہ دونوں میں حد سے زیادہ محبت پیدا ہو گئی۔ چند ہی روز میں وہ نہت
بڑھتے بڑھتے عشق کے درجے کو پہنچ گئی۔ جس نے عبد اللہ کو ناز آفرین بی بی کے صحت
و ناز برداری کے سوا سارے معاملات زندگی بلکہ دین و دنیا سے بیخبر کر دیا اور کھاج
کے بعد ایک ہی سال کے اندر یہ حالت ہو گئی کہ عبد اللہ کو کسی چیز کا ہوش نہ تھا۔
عبد اللہ اور حضرت صدیق کے سارے خاندان کا ذریعہ کسب معیشت تجارت تھی۔
اور شام و مین کے قافلے جب مدینے میں آتے تو اکثر تاجران مکہ و مدینہ بغیر دور و دراز کا
سفر کیے گھر بیٹھے مناسب لین دین کر لیا کرتے۔ اتفاقاً شام کا قافلہ آیا۔ لوگ کاروبار میں
مصروف ہوئے۔ اور مال کا مبادلہ مناسب نرخ پر ہونے لگا۔ عبد اللہ بن ابی بکر کو اُس کے
آنے کی خبر ہوئی۔ اور لین دین کے لیے گھر سے نکلے۔ مگر گھر سے دو ہی قدم گئے تھے کہ
مشتوقہ پمپری تماش کی صورت نظر کے سامنے آ گئی۔ اور کہا اب کون جائے؟ ذرا چل
پیاری عاتکہ کا جمال جان آرا تو دیکھ آؤں۔ فوراً عاتکہ کے پاس واپس آئے۔ اور مشتوقہ
شیرین ادا کی باتوں میں ایسے مصروف ہوئے کہ تجارت کا شامی قافلہ لے دے کے چلا گیا اور
مشتوقہ پمپری تماش کے ناز و نیاز ہی میں پھنسے رہ گئے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اس
بات کو دیکھا مگر خاموش ہو رہے۔ اور خیال کیا کہ عبد اللہ نے اگر کاروبار میں غفلت
کی تو کچھ اپنا ہی بگاڑا۔ اور کسی کا کیا نقصان ہوا؟ اور یہ تجربہ شاید آئندہ کے لیے
ان میں احتیاط پیدا کر دے۔

اس کے چند روز بعد ایک جمعے کو حضرت صدیقؓ نے جمعہ پڑھ کے گھر میں واپس
آئے تو دیکھا کہ صاحبزادے مشتوقہ کے پاس بیٹھے ہیں۔ اور اُس کی باتوں میں اس قدر
محو ہیں کہ دین و دنیا کی خبر نہیں۔ پوچھا "عبد اللہ! تم نے جمعہ کی نماز بھی پڑھی؟"
عبد اللہ نے نشہ عشق سے چونک کے پوچھا "کیا نماز ہو گئی؟" یہ جواب سنتے ہی حضرت

صدیق دم بخود رہ گئے۔ دل میں کہا "عشق نے پہلے تو اسے فقط دنیا سے بنجو درکھا تھا مگر اب یہ دین کی طرف سے بھی غافل و بے پردا ہے" یہ ایسی بات نہ تھی جس کو حضرت صدیق کا سا سچا حق پرست صحابی ایک گھڑی کے لیے بھی برداشت کر سکتا۔ فوراً بڑی کے ساتھ کہا "عائکہ کی الفت نے تمہیں تجارت سے غافل کیا اور میں نے اُس کی کچھ پردا لگی ملکہ ایک کلمہ بھی زبان سے نہ نکالا۔ لیکن اب اس الفت نے تمہیں نماز کی طرف سے غافل کر دیا جو ایک گھڑی کو بھی قابل درگز نہیں۔ لہذا اس کی سزا یہ ہے کہ اسی وقت عائکہ کو طلاق دو" پدر بزرگوار کا یہ حکم نہ تھا بڑھکا کہ یکایک دل دھجک دو لون میں ترزا دھو گیا۔ سعادت مند بیٹے تھے عذرا انکار کی مجال نہ تھی۔ اس کی بھی جرأت نہ ہوئی کہ باپ کے سامنے زبان سے اُن کا کلمہ زبان سے نکالیں یا آنکھوں سے اشک حسرت کا کوئی قطرہ ٹپکے۔ صبر کی سل سینے پر رکھی۔ بے عذر و حجت معشوقہ نازنین سے دست بردار ہو کے اُسے طلاق دے دی۔ اور باپ سے چھپ کے کونے میں جا کے رونے لگے۔ اُدھر غریب عائکہ بھی جس کے دل میں عبد اللہ کے سوا کسی کا خیال نہ آسکتا تھا جاننا ز شومر سے چھٹنے کے غم میں خون کے آنسو بہاتی ہوئی الگ جا بیٹھی کہ اب عبد اللہ سے سروکار ہی نہیں رہا۔

اس طلاق کے روز قیامت کے بعد جب شام ہوئی تو عبد اللہ کی یہ حالت تھی کہ بچھونے پر اس طرح تڑپتے تھے جیسے کوئی انگاروں پر لوٹتا ہو۔ کروٹ پر کروٹ بدستے اور کسی پہلو پر قراؤ نہ آتا۔ بار بار رو رو کے اپنے چند اشعار پڑھتے اور کلیجہ تھا کے رہ جاتے۔ ان شعروں میں سب سے پچھلا شعر یہ تھا۔

قَلَمُ ارْشَلِي طَلَّقَ الْيَوْمَ مَشَلْهَا وَلَا مَشَلْهَا فِي غَيْرِ شَيْءٍ يُطَلَّقُ

دو تین نے نہ اپنا سا کوئی عاشق دیکھا ہے کہ اُس کی سی دمہ جبین کو آج طلاق دے دی اور نہ اُس کی سی نازنین کو سوا اس کے اور کسی بات پر طلاق دی جاسکتی ہے) اتفاقاً جس جگہ عبد اللہ قیام ہو ہو کے یہ اشعار پڑھ رہے تھے اُس کے قریب ہی کے کونے پر ابو بکر صدیق نماز پڑھ رہے تھے۔ بیٹے کی اس حالت اور آہ و زاری نے اُن کے دل پر بڑا اثر کیا۔ بہت ہی متاثر ہوئے۔ اپنے پہلے حکم پر کھپتے گئے اور فوراً بیٹے کے پاس آکے کہا "تھارے ہی حالت ہے تو مجبوری ہے۔ خیر جاؤ

عالمکے سے پھر نکاح کر لو، طلاق بائن تھی نہیں اور دولہا دولہن دونوں میں صدمہ فراق برداشت کرنے کی تاب نہ تھی لہذا دوبارہ نکاح میں کوئی دشواری نہیں پیش آئی فوراً نکاح ہو گیا اور خدانے دلدادہ عاشق و معشوق کو تھوڑی دیر کے لیے بھر و فراق کا مزہ چکھا کے پھر ملا دیا۔ اور پھر وہی پہلی سی ناز و نیاز کی پُر لطف زندگی گزرنے لگی۔

اب ایک دن عبداللہ نے جوش محبت میں اپنا ایک باغ پیاری مشقہ عالمکے کے نام لکھ دیا۔ اور اُس کا معاوضہ یہ قرار دیا کہ میرے بعد تم جیتی سبنا کو سبنا اور سے نکاح نہ کرنا۔ اس شرط کو عالمکے نے قبول کیا اور دونوں بہت ہی عیش و کامرانی کی زندگی بسر کرنے لگے۔ اور گو کہ عبداللہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوہ خنین اور فتح مکہ میں موجود تھے اور بہادری سے لڑے مگر خدانے دونوں مرتبہ چشم زخم حوادث سے بچایا۔ فتح مکہ کے بعد جب عبداللہ علم رسالت کے ساتھ غزوہ طائف میں گئے تو زمانے کی بے رحمیوں سے نہ بچ سکے بعض کہتے ہیں کہ کوئی تیرا کہ لگا۔ اور بعض کا بیان ہے کہ کوئی پتھر ایسا لگا کہ سخت زخمی ہوئے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ زخم کاری ہونے پر بھی اچھا ہو گیا۔ مگر اس کا اس قدر اثر باقی رہ گیا تھا کہ زندگی کی بہت ہی کم امید تھی اسی خاتین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر آخرت کیا۔ اتفاقاً آپ کو حیرہ کی دو چادروں کا ایک ٹکڑا بچھا کے کسی مصلحت سے اتار لیا گیا اور دوسرے کفن میں دفن ہوئے۔ عبداللہ نے وہ پہلا کفن لے کے رکھ لیا کہ ”یہ کپڑا چونکہ حضرت سرور عالم کے جسم اطہر کو مس کر چکا ہے اس کو میں اپنا کفن بناؤں گا“ مگر پھر اسے پلٹ گئی۔ اور کہا ”جس کپڑے کو خدانے اپنے رسول کے لیے نہیں پسند کیا اُسے میں بھی نہیں پسند کرتا“ آنحضرت کی وفات کے بعد عبداللہ کے اُس طائفہ والے زخم نے بہت طول کھینچا جس سے جان نہ ہو سکے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے چالیس ہی روز بعد سفر آخرت کیا۔

پیارے شوہر کی موت کا عالمکے کو ہیچ صدمہ ہوا۔ انکے مرثیہ میں چند شعر کے جن میں انکی شجاعت کی بھی تعریف کی ہے۔ اور تم کھائی ہے۔ کہ ”اب میری آنکھ ہمیشہ اشکبار رہے گی اور میرا پیٹا ہمیشہ خاک آلود رہے گا“ مگر ان دنوں اہل عرب

کا مذاق قدیم رواج اور شریعت غزالی کی اجازت سے ایسا تھا کہ اگر کوئی عورت بیوگی میں خاموش بیٹھا بھی جائے تو شرفاؤ کا بر قوم بیٹھنے نہ دیتے تھے۔ جیسے ہی عاتکہ کا زمانہ عدت ختم ہوا حضرت عمرؓ نے نکاح کا پیام دیا۔ عاتکہ نے عذر کے طریق سے عبداللہ کی وصیت اور باغ کے مہیہ کر دینے کا حال کہلا بھیجا۔ حضرت عمرؓ نے اس بارے میں جا کہ حضرت علیؓ سے فتویٰ لیا کہ آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟ انھوں نے غور فرما کے یہ فتویٰ دیا کہ عبداللہ کا وہ باغ اُن کے ورثا کو واپس کر دو۔ اور نکاح کر لو۔ یہ فتویٰ سننے کے بعد جب حضرت عمرؓ نے وعدہ کیا کہ باغ کا معاوضہ ادا کرنے کو میں تیار ہوں تو عاتکہ مجبور ہو گئیں۔ پیام کو قبول کر لیا۔ اور حضرت عمرؓ کے ساتھ عقد ہو گیا۔ نکاح کے بعد حضرت علیؓ نے عاتکہ کو اُن کا وہ مرثیہ والا عہد یاد دلایا کہ نہ کبھی میرے آنسو بند ہوں گے اور نہ کبھی نیڑا دھلاؤنگی۔ اور فرمایا کہ ”انسان جو کہے وہی کرے“ اس کے جواب میں عاتکہ حسرت کے ساتھ خاموش ہو رہیں۔ کاش حضرت علیؓ نے دوسرے نکاح سے پہلے یاد دلایا ہوتا۔ حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد عاتکہ کے ساتھ حضرت زبیر بن عوام نے نکاح کیا جب وہ بھی جنگ جمل میں شہید ہو گئے تو حضرت علیؓ نے پیام دیا۔ جس کے جواب میں عاتکہ نے کہلا بھیجا ”میں جس سے نکاح کرتی ہوں شہید ہو جاتا ہے اور آپ کے لیے میں اس کو پسند نہیں کرتی۔“ لیکن اس کے بعد جب حضرت امام حسینؓ نے پیام دیا تو عاتکہ کا ہوا گئیں۔ اور آپ سے اُن کا چوتھا نکاح ہوا۔ پھر جب امام حسینؓ بھی میدان کربلا میں شہید ہو گئے تو عبداللہ ابن عمرؓ نے کہا ”جسے شہادت کا شوق ہو عاتکہ سے نکاح کر لے“ لیکن حضرت عاتکہ ایسی حسین و صاحب جمال تھیں کہ اس کا بھی لوگوں نے خیال نہ کیا۔ اور حضرت امام حسینؓ کے بعد آپ کو مروان نے نکاح کا پیام دیا۔ جس کے جواب میں آپ نے کہلا بھیجا ”رسول اللہ صلعہ کے گھر کی بوجھنے کے بعد میں کسی خاندان کی بیوہ نہ بنوں گی“ اور اس کے بعد ایسی خاموشی کی زندگی بسر کی کہ پھر تاریخ میں نام نہ سنا گیا۔

حضرات - ”حسن کاواکو“ حصہ دوم تیار ہو۔ عام قیمت فی جلد ۱۲، مگر خریداران دگلدار سے ۸ روپے

نمبر میں اس کے ویلیو دیا آئے کے خریداران دگلدار کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔ اس کے سوا کوئی اور اطلاع نہ دی جائے گی۔ جو صاحب نہ لینا چاہیں منع فرما دیں۔ **منجور دگلدار**



قیصرہ تھیوڈورا

جناب سرور کائنات صلعم کی ولادت قسطنطنیہ کی مشرقی سلطنت روم کے تاجدار جسٹن دوم کے عہد میں ہوئی ہے جو ۵۲۷ء یعنی ولادت محمدی کے چوتھے برس تک قسطنطنیہ کے تخت پر حکومت کرتا رہا تھا۔ اس سے پہلے اُس کا چچا جسٹین قسطنطنیہ کے ساج و تخت کا مالک تھا اور ۵۲۷ء سے ۵۶۷ء یعنی ۴۰ سال تک یورپ کی مشرقی دنیا کے سیاہ و سفید کا دی مالک تھا۔ جسٹین کے زمانے اور اُس کے حالات پر غور کرو تو عجب متضاد واقعات نظر کے سامنے آ جاتے ہیں۔ وہ عقلمند تھا۔ اچھا تھا۔ بڑا زبردست تھا۔ نئے نئے قوانین جاری کیے۔ بہت سے ملک فتح کیے۔ قسطنطنیہ کی جامع آیا صونیہ کو جو اہل روم کی علم کی دیوی کا مندر تھی از سر نو تعمیر کر کے عیسائیوں کا گرجا قرار دیا۔ پھر اسی کے ساتھ یہ بھی ہے کہ اُس کے زمانے میں بڑے مظالم ہوئے۔ اُس کا عہد فتنوں اور ہنگاموں سے بھرا ہوا تھا۔ اور اُسے اپنے ملک کے اندرونی جھگڑوں اور تہذبات کی بدولت کبھی ایک گھڑی کو بھی اطمینان سے بیٹھا نہیں نصیب ہوا۔ اور ان سب باتوں سے بڑھی ہوئی یہ بات تھی کہ اُس کی بی بی تھیوڈورا تھی جو ایک عجیب و غریب عورت تھی۔ جس کے مذاق و اطوار کی دورنگی بابل کی قدیم ملکہ سمیرامیس کی زندگی سے بھی زیادہ حیرت انگیز تھی۔ اور یہی یقین ہے کہ اُس کے حالات ناظرین دنگل از

کے لیے بہت ہی دھکپ ثابت ہون گے۔

اُن دنوں قسطنطنیہ کے فرمان رواؤں اور امیروں کو قدیم یونانیوں اور رومیوں کی طرح تھیٹر دن اور سرکوں کا بڑا شوق تھا۔ سرکوں میں وحشی درند عام ناظرین کے سامنے لاکے باہم لڑائے اور بد نصیب مجرموں اور قیدیوں پر چھوڑے جاتے تھے۔ جس ضرورت سے اکثر شہر دن ریچھون چیتون اور تیندو دن کی ایک بڑی بھاری تعداد موجود رہا کرتی تھی۔ انطاسیوس قیصر کے زمانے میں قسطنطنیہ میں ان وحشی درندوں کا دار و نہ اقا قیوس نام ایک شخص تھا جو ہمارے ذات بابکات کا مل پاشا کا ہم وطن یعنی جزیرہ قبرس دسائرس کا رہنے والا تھا۔ یہ شخص سارے قسطنطنیہ اور اُس کی قلم دین ریچھ والا کہلاتا تھا۔ جو بھیتی صورت و سیرت کے لحاظ سے کامل پاشا پر بھی پوری طرح صادق آسکتی ہے اقا قیوس کے ریچھ والا کہلانے کی وجہ شاید یہ ہو کہ وہ ریچھوں کو زیادہ پالتا اور انھیں بڑی کامیابی کے ساتھ سدھاتا تھا۔ یہ خدمت سمر زہویانہ ہو مگر اس میں شک نہیں کہ کل امرا میں وحشی جانوروں کا تماشا دیکھنے کا شوق ہونے کی وجہ سے رُسا کے ایک بڑے حلقے پر اُس کا اثر تھا۔ اقا قیوس جب مرا تو اُس نے تین کافر جرابیٹان چھوڑیں۔ بڑی قومیٹو مچھلی تھیوڈورا اور چھوٹی انطاسیہ۔ باپ کے مرنے کے وقت ان میں سے بڑی بھی سات سال سے زیادہ کی نہ تھی بیوہ مان نے اپنے شوہر کی دار و نگاہ وحش حاصل کرنے کے لیے بڑی دڑ دھوپ کی۔ ایک ایک کے پاس جا کے روئی۔ اور جب دیکھا کہ اس خدمت کے سربزبان دینے کے لیے کسی مرد کی شدید ضرورت ہے تو جھٹ پٹ نکاح کر کے اپنے نئے شوہر کا نام بھی دربار میں پیش کر دیا مگر سماعت نہ ہونا تھی نہ ہوئی۔

اب اُس نے اپنی تینوں کسں نادان بھولی بھالی جیون کو فریادیوں کے کپڑے پہنا کے تھیٹر میں بھیجا۔ اُن دنوں رومی رُسا و امرا دو گروہوں میں بننے ہوئے تھے۔ سبز بانے والے اور نیلے بانے والے۔ (جسکے مفصل حالات ہم دگلد از کے کسی آئندہ نمبر میں لکھیں گے) ان دنوں گروہوں میں باہم سخت رقابت تھی اور ہمیشہ پیشی رہا کرتی۔ یہ خوبصورت ننھی ننھی فریادین اُن کے سامنے گئیں تو سبز بانے والوں

نے اُن کی تحقیر و تضحیک کی۔ اور نیلے بانے والوں کو اُن پر ترس آیا۔ مگر ان کا مطلب اب بھی نہ حاصل ہوا۔

ان حسین لڑکیوں میں سے منجھلی تھیوڈور اسب میں زیادہ حسین و نازنین اور سب سے بڑھ کے ذہین و ہوشیار تھی۔ نیلے بانے والوں کا یہ سلوک اُس کے دل پر نقش ہو گیا۔ اور جب موقع ملا تو ایسا بدلا لینے میں اُس نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ بری حال تھیوڈور اُن دنوں اگرچہ ایک بکیس و بے یار تمیہ تھی اور قسطنطنیہ کے لوگوں نے اُس کی پامالی میں کوئی بات نہیں اٹھا رکھی تھی مگر تقدیر برسرِ پارسی تھی۔ اور خود قدرت نے عجب عالمگیر قوت کے ساتھ اُسے پالنا نشو و نما دینا اور اُس کے حسن و جمال کو چمکانا شروع کیا۔ اُس کے اُٹھتے ہوئے شباب اور اُس کی کافر ماجرائی کی ادائوں کو دیکھ دیکھ کے سارے زمانے کی زبان پر تھا۔

”اب توفتہ ہے کوئی دن میں قیامت ہوگی۔“

یہ تینوں لڑکیاں جب جوان ہوئیں تو اپنی بے بسی و بے کسی سے اور نیز اس وجہ سے کہ کوئی عربی سر پر نہ تھا اہل قسطنطنیہ کی جلوت و خلوت کی لچھریاں اور عشرت پرستیوں کا مشغلہ بن گئیں۔ اندرونی زندگی میں اُن کو شوقین رُوسا کے شہر نے بے آبرو کیا۔ اور اُن کی ظاہری زندگی یہ تھی کہ خوبصورت ایکٹرسوں کی طرح اسٹیج پر آ کے اپنے ناز و کرشمے سے ناظرین کی دلربائی کرتیں۔ پہلے بڑی بہن قومیٹو اسٹیج پر آئی۔ اور اُس کے بعد جب تھیوڈور ابھی اسٹیج پر آ کے نمودار ہوئی تو اُس کے حسن و جمال نے اُس وقت کے قسطنطنیہ میں قیامت کی سی ہلچل ڈال دی۔ جب وہ ایک نوعمر خوبصورت غلام کے بھیس میں ایک تپائی سر پر رکھے اسٹیج پر آتی تو ہزاروں تماشائی دل مسوس کے رہ جاتے۔ اور جو وہ آزادی و مہیا کی سے اپنی دل فریب ادائیں دکھاتی لوگوں کے دل ہاتھ سے نکلنے جاتے۔ وہ نہ کبھی ناچی نہ گاتی۔ نہ اُس نے بانسری بجائی۔ صرف اپنے ناز و انداز کے کرتب دکھائے۔ اور اپنے پیدائشی حسن کو کرشموں سے دنیا کو جیتنا شروع کیا۔ اکثر مذاق کے کھیلوں میں وہ یک بیک کچھ ایسی دلربائی کی ادا سے منہ نہ تو تھا لیتی۔ اور ایسے مضحکہ خیز لہجے اور آواز میں شکوہ کرتی۔ اور بگڑ

بگڑ کے ڈھیلے ہاتھوں سے مارنے لگتی کہ دیکھنے والے آپے سے باہر ہو جاتی۔ اور ہزار ہا خلقت سے تحسین اور تعریف کے نعرے بلند ہوتے۔ اُس کے دل فریب حُسن پر اُس کی یہ شوخ ادایمان اور چلبے پن کی حرکتیں ایسا زیب دیتی تھیں کہ چوٹا اُس کا فریفتہ تھا۔ اُس کے خط و خال نہایت ہی لطیف و نازک تھے۔ اور مصوروں اور شاعروں کا خیال حُسن کی جو اعلیٰ سے اعلیٰ تصویر کھینچ سکے تھیوڈورا کا پیارا چہرہ اُس پر غالب ہی آ جاتا۔ رنگت کسی قدر زرد اور گندنی تھی۔ اور اُس میں ایک ایسی نظری دلکشی تھی کہ اُس کے خوبصورت چہرے کو دلوں کا مقناطیس کہیے تو بیجا نہ ہوگا۔ شوخ آنکھیں چلبے پن کے ساتھ ہر وقت چلتی ہی رہتی اور اُس کی ہر حرکت اور اُس کے ہر انداز میں اپنا تھوڑا سا جادو اس طرح شریک کر دیا کرتی کہ کوئی دل نہ تھا جس پر اُس کا جادو چل نہ جاتا۔ اُس کی بات بات میں نزاکت تھی۔ اور ہر ادا میں لگاوٹ۔ غرض ایک فتنہ تھا کہ اُس کے سامنے سارے فتنے دب گئے۔

مگر افسوس تو یہ ہے کہ ایسے اعلیٰ درجے کے حُسن کی سخت بے وقعتی ہو رہی تھی۔ اس لیے کہ یہ آفتاب حُسن عوام کی نظروں کے سامنے تھا۔ ہر شخص کے شہوت پرستی کے جذبات اُسے نہایت ہی آسانی و سہولت سے حاصل کر سکتے تھے۔ اور ایسے بے مثال جمال تمام زنا کار لوگوں کے لیے عام اس سے کہ خاص شہری ہوں یا آفاقی اور چاہے کسی طبقے اور درجے کے ہوں اور کوئی پیشہ و حرفہ کرتے ہوں بے عذر موجود تھا۔ عشاق کے ہجوم اور حُسن پرستوں کی مزارحمت نے اکثر یہ رنگ بھی دکھایا کہ ایک عاشق اپنی خوش نصیبی پر ناز کرتا ہوا اسکے بستر عیش پر بیویا لگا کر اسی رات کو کسی دوسرے زبردست اور دردمند عاشق نے اُسے دھکیل کے تھیوڈورا کے بستر عیش پر اپنا قبضہ کر لیا۔ آخر یہاں تک نوبت پہنچی کہ جب وہ سڑکوں پر گزرتی تو جو لوگ بدتمیزی و بیجا ئی سے بھاگتے یا جو ایسی ہرجائی نازنین کے عاشق و فریفتہ ہو جانے سے ڈرتے منہ چھپا کے یا راستے سے کتر ا کے مٹھل جاتے۔ اسی قدر زمین مورخین ڈرانا بتاتے ہیں کہ تھیوڈورا کی بے شرعی آخر اس حد کو پہنچ گئی تھی کہ بارہا ایک سٹیج پر بیٹھنے کے اُس نے اپنے ہنر اور اپنے ناز و انداز دکھائے۔ عیش پرستی کے فنون لطیفہ میں تھکنے کے بعد وہ فطرت کے اس سخیل کی شکایت کرتی کہ انسان کو اُس

عیش کے برداشت کرنے کی بھی کس قدر کم طاقت دی ہے۔ شائستگی کی زبان اس قسم کے واقعات کو ہمیشہ پردے میں رکھا کرتی ہے۔ مگر تھیوڈورا کی بے اعتدالی اس درجے کو پہنچ گئی تھیں اور اُس کے شہوت رانی کے جذبات - اور اُس کے عیاں شانہ ہنر اس قدر اعتدال سے باہر تھے کہ کسی پردے میں نہیں چھپ سکتے۔ بہر حال قسطنطنیہ کے معزز طبقہ والوں اور عام دولت مندوں میں سے شاذ و نادر ہی کوئی باقی رہا ہوگا جس نے تھیوڈورا کے حسن و جمال کے مزے نہ لوٹے ہوں۔

تھوڈورے زمانے تک حسن پرستان قسطنطنیہ کی دیوی اور بے شرمی کی مکہ بنی رہنے کے بعد وہ اقبولوس نام ایک معزز شخص کے گھر بیٹھ گئی اور اقبولوس مصر و افریقہ کا گورنر مقرر ہو کے اپنے علاقے کو گیا تو اُس کے ساتھ وہ بھی روانہ ہوئی مگر قیامت یہ تھی کہ باوجود اس کے کہ اقبولوس اُس کی پرستش کرتا تھا اور اُسکی حکومت و دولت کا زیادہ حصہ اُسی کی نازبرداری میں صرف ہو جاتا تھا مگر وہ اپنی اندرونی عشق بازیوں سے باز نہ آتی۔ ظاہر میں اقبولوس کی پابند تھی اور باطن میں دیکھیے تو اندر ہی اندر بہتوں سے تعلقات تھے۔ جسے اُس کی عادت پڑ گئی ہو کہ سیکڑوں سے آنکھیں لٹائے اور بیسیوں کا آغوش شوق گرم کرے اُس سے ایک کا ہو کہ رہنا بہت دشوار تھا آخر اقبولوس نے تنگ آ کے ایسی فضول خرچ اور بے عصمت معشوقہ کو نکال باہر کیا۔

اب تھیوڈورا بے یار و مددگار بے انیس و ہدم اسکندریہ کی سڑکوں پر افلاس و فلاکت زدگی کی حالت میں ماری ماری پھرتی تھی۔ گر اُس کے بے مثل و نظیر حسن سے بڑا مددگار کون ہو سکتا تھا؟ اُسی کے کرشموں سے انسانوں کا شکار کیلیتی اور قدم قدم پر خلقت کو انیاسیر کیونباتی ہوئی خشکی کی راہ سے قسطنطنیہ کی طرف روانہ ہوئی۔ ارض شام سے ایشیائے کوچک کے آخر تک ہر مقام میں اُس کا گزر رہا۔ اور ہر شہر نے اِس حسین و پری جمال قبرسیہ کے حسن کے مزے لوٹے۔ جہاں گئی لوگ اُس کے غیر معمولی حسن کی وجہ سے اُسے کوئی انسان سے مافوق مخلوق جو۔ یاد دیوی خیال کرنے لگے۔ یونانیوں کے حسن کی دیوی و مینس (زہرہ) بھی خرمیزہ قبرس ہی میں پیدا ہوئی تھی۔ لہذا عام خیال تھا کہ یہ نئی مہجین اگر دینس کا کوئی نیا روپ نہیں

تو اُس کی نسل سے ضرور ہے۔

تھیوڈور اس بات کو بخوبی سمجھی ہوئی تھی اور روز بروز سمجھتی جاتی تھی کہ دنیا میں
نعمتزد کامیاب ہونے کے لیے خدا نے مجھے جو سلاح دیا ہے وہ میرا عالمگیر حسن ہے
لہذا اُس کی حفاظت اور اُس کے اُبھارنے اور چمکانے میں کبھی ذرا بھی غفلت و کوتاہی
نہ کرتی۔ خاصۃً اس بات کی تدبیرون میں ہمیشہ لگی رہی کہ کوئی بچہ نہ پیدا ہونے پائے لیکن
اس آوارہ گردی کے زمانے میں جب وہ روزِ نیا دانا کھاتی نیا پانی پیتی اور سنکے
پلنگ پر سوتی تھی ایک بار نیچر کی کندھ میں پھنس ہی گئی جل رہ گیا۔ اور ایک لڑکا پیدا ہوا
جسے اُس نے کسی معزز سردار کے سر تھوپا۔ اور اُسی کے آغوش میں چھوڑ کے اگے بڑھی۔
اب تھیوڈور کی عام دلربائیوں سے اس قسم کے واقعات اکثر پیش آتے کہ لوگ
اُس کی لگاؤ میں آکے اُس کے جملہ نازین باریاب ہوتے۔ مگر چند ہی باتیں کرنے
پاتے تھے کہ کوئی دوسرا شخص آکے اُنھیں دہان سے نکال باہر کرتا اور خود اُس کا شائد
عیش کا مالک بنجاتا۔ ان واقعات نے ہر صحت میں مشہور کیا کہ جنون اور دیوانہ
سے اُس سے تعلقات ہیں۔ اور یہ اُنھیں کا کام ہے کہ جو کوئی اُس کے دل میں جگہ
پاکے اُس کی خواہ گاہ تک پہنچ جاتا ہے اُسے اُٹھا کے پھینک دیتے ہیں۔ اپنی
بے وفائیوں اور زبردستیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے کیا عجب کہ خود تھیوڈور ا
ہی نے اس خیال کو پھیلایا ہو۔

اسی اثنا میں اُس نے خواب دیکھا کہ میں کسی بڑے زبردست شہنشاہ کی ملکہ
ہوں اور ساری دنیا پر حکومت کر رہی ہوں۔ یہ خیال اُس کے دل میں اس قدر
جم گیا کہ اُسی خیال کا پلاؤ پکاتی ہوئی قسطنطنیہ میں آئی۔ مگر اس عظمت و سلطنت کی آرزو
نے بیکایک اُس کا مذاق بدل دیا۔ اور اُس کی زندگی میں اتنا بڑا تغیر ہو گیا کہ گویا وہ کوئی دوسرا
تھیوڈور تھی۔ اب بجائے سڑکوں پر مارے مارے پھرنے ایک ایک سے آنکھ
لڑانے۔ دونوں پر نگاہ ناز کے پتھر برسانے۔ اور ہر راہرو کو اسیر گیسو کرنے کے
عوض وہ خود داری اور رکھ رکھاؤ سے رہنے لگی۔ اور پاکدامن ہوسٹیوں کی
سی وضع اختیار کر لی۔ ایک چھوٹے سے مکان میں خاموشی کے ساتھ رہتی تھی۔
اُون کات کات کے پیٹ پالتی تھی۔ اور گویا کسی سے مطلب ہی نہ تھا۔ اگرچہ

ساری دنیا جانتی تھی کہ یہ ہی حسن فردش تھیوڈورا ہے۔ جو ہزاروں آدمیوں کا پہلو گرم کر چکی ہے۔ اور اُس کے حالات کسی سے پوشیدہ نہ تھے۔ مگر اس انقلاب مزاج اور اس کا پاپٹ کو دیکھ دیکھ کے ہر شخص حیران و شجب ہو رہا تھا۔

ان دنوں جشن اول قیصر روم کا بھتیجا جسٹین قسطنطنیہ میں شہنشاہ کے بعد سب سے بڑا بطریق اور صاحب اثر شخص تھا جو ایک حسین و خوشرون جوان تھا۔ اور اپنے چچا کی طرف سے دولت مشرقی روم کی ساری قلم و پر حکومت کر رہا تھا۔ اتفاقاً کسی موقع پر تھیوڈورا کے چہرے پر جیٹھ نین کی نگاہ پڑ گئی اور دیکھتے ہی شیدا ہو گیا۔

۶ وہ نظر ہی وداع طاقت تھی۔ اگر تھیوڈورا وہی پہلی تھیوڈورا ہوتی تو اس نے عشق کا جھگڑا بھی دو چار روز کی شہوت رانی پر ختم ہو جاتا۔ مگر اب اُس نے اپنے آپ کو روکا۔ اور جس دولت حسن کو کمال بے پروائی کے ساتھ دہر ذلیل سے ذلیل شخص کی طرف پھینک دیا کرتی تھی اس موقع پر اُسے ذرا روک کے رکھا۔ اور جسٹین کی آتش شوق بھڑک بھڑک کے خوب تیز ہو گئی۔ آخر تھیوڈورا نے چند روز تک اُسے ہجر و فراق کی تکلیفوں کا مزہ چکھا کے اور اپنے وصل کی قدر و قیمت بتا کے اُس سے تعلق پیدا کر لیا۔ یہ تعلق اگرچہ ناجائز اور غیر مستقل تھا مگر تھیوڈورا نے بڑی ہی عقلمندی اور ہوشیاری سے کام لیا۔ ملنے پر بھی رکتی۔ اور روز بروز اُس کے دل پر زیادہ قبضہ کرتی جاتی۔ اپنے بڑا اُسے کچھ ایسا خلوص اور ایسی سچی محبت ظاہر کی کہ جسٹین کا دل اُس کے ہاتھ میں تھا۔ اور جسٹین کی تمام آرزوؤں اور مسترتوں کا خلاصہ یہ تھا کہ تھیوڈورا مسرور و شاد کام ہو اور ملک بھر میں اُس سے زیادہ معزز و محترم اور دولت مند کوئی نہ ہو اُسے یقین ہو گیا کہ میں زندگی کے کسی مرحلے میں بغیر تھیوڈورا کی رفاقت کے کامیاب نہیں ہو سکتا۔ آخر اُس نے اپنے اقتدار سے مشرقی سلطنت روم کا سارا خزانہ تھیوڈورا کے قدموں پر لا کے ڈال دیا اور دل میں ٹھان لی کہ میں اسے مذہبی رسوم و آداب کے ساتھ اپنی بی بی اور اپنی شریک زندگی بناؤں گا۔ مانا کہ یہ کل تک ایک فاحشہ عورت تھی مگر آج تو پاکدامن خاتون اور میرے دل و جان کی مالک ہے۔

مگر دشواری یہ تھی کہ اول تو روم کے قانون میں صراحت موجود تھا کہ سینیٹ (مجلس حکمرانی) کا کوئی معزز ممبر کسی ایسی عورت کے ساتھ شادی نہیں کر سکتا جو بے آبرو ہو۔ یا اودے درجے کی ہو۔ یا کبھی اسٹیج پر آچکی ہو۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ موجودہ قیصر روم یعنی اُس کی چچی ٹوپی تینہ جو اگرچہ خود ایک وحشی قوم کی نسل سے تھی مگر نہایت ہی پاکدامن تھی اُس نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں ایک بازاری کسی کو اپنی بھتیجی ہو کر نہ بناؤں گی۔ خود جیٹینین کی ماں وی جی لاشیہ نے باوجودیکہ تھیوڈورا کے حسن و جمال کو بہت ہی پسند کیا مگر اس اندیشہ سے اُسکے ہونے پر وہ بھی راضی نہ ہوتی تھی کہ ایسا نہ ہو یہ مکار حسینہ میرے بھولے بھالے بیٹے کے اخلاق اور اُس کی مسرتوں میں فرق ڈال دے۔ مگر جیٹینین کو یہی دھن تھی کہ شادی کر دے گا تو تھیوڈورا سے۔

اُس نے ماں کی مخالفت کی تو پردہ ہی نہ کی۔ جو نہایت دگر فتگی کے ساتھ خاموش ہو کر چچی کا البتہ اندیشہ تھا اس لیے کہ وہی وارث تاج دوہیم تھا اور چچی کے ناراض کرنے میں سلطنت سے محروم ہو جانے کا خوف تھا۔ اس لیے خاموشی کے ساتھ اُس کے مرنے کا انتظار کرنے لگا۔ اسی درمیان میں اُس نے اپنے چچا کو سمجھا کچھ کے اور نہایت ہی دانائی سے کام لے کے اس مضمون کا ایک فرمان جاری کرادیا کہ ”قدیم رسوم کی پابندی کی کسی کو کچھ ضرورت نہیں ہے۔ اور اس بارے میں جو پُرانے قوانین مروج ہیں منسوخ تصور کیے جائیں۔“ اس حکم نے اُن تمام محروم قسمت عورتوں کے گھروں میں گھئی کے چراغ جلائے جنہوں نے کسی معزز رکن سلطنت کو اپنے حسن و جمال پر بٹھا کے اور اُس کے دل پر قابو پا کر اُسے نکاح کرنے پر آمادہ کر لیا تھا مگر قانون کی گرفت سے مجبور تھیں۔ اور کوئی زور نہ چلاتا تھا۔ اب انھیں آزادی حاصل تھی کہ جس بڑے سے بڑے امیر سے چاہیں شادی کریں اور خوشیاں منائیں۔ اس نئے قانون پر عملدرآمد شروع ہی ہوا تھا کہ قیصرہ مرگئی اور جیٹینین کے لیے میدان صاف تھا۔ بڑی دھوم دھام اور نہایت ہی تزک و احتشام سے شادی ہوئی۔ اور جیٹینین کسی پاکدامن و دیشیزہ کی طرح ملائگ فربہ تھیوڈورا کو بیاہ لایا۔ اب تھیوڈورا قسطنطنیہ کی ساری معزز بگیوں۔ محترم شاہزادیوں۔ اور قسطنطنیہ کی کل مشریت زادیوں کی سرتاج تھی۔ اسی درمیان میں جیٹین قیصر نے جیٹینین کو باضابطہ طور پر اپنا ولی عہد قرار دیا۔ اور جس وقت شہنشاہ اور مقتدائے اعظم نے حسب

رسوم مروجہ جسٹی نین کو خلعت ارغوانی پٹھا کے تاج قیصری اس کے سر پر رکھا تو دوسرا خلعت و تاج انھیں اپنے معزز و متبرک ہاتھوں میں تھوڑا کو بھی پٹھا پٹا پڑا جو نہایت ہی ملکنت سے اس کے برابر کھڑی زبان حال سے کہہ رہی تھی کہ "شرافت و پاکدامنی چرمن یون فتح پاتا ہے!" مگر یہ عورت و شوکت بھی تھیوڈورا کی نظر میں کچھ زیادہ نہ تھی۔ اصل یہ ہے کہ معمولی قسم کی عزتیں جو رومی آداب سلطنت نے شاہزادیوں نواب زادیوں اور معزز طبقے کی بیگم کے لیے مقرر کر رکھی تھیں وہ نہ تھیوڈورا ہی کے لیے کافی تھیں اور نہ اس کے عاشق جسٹی نین کی تھوڑا آرزو کی پوری کرنے والی تھیں۔ جسٹی نین کو ولی عہد مقرر ہوئے پورے دو سال بھی نہیں ہوئے تھے کہ شہنشاہ جسٹن اول آغوشِ لحد کے سپرد کیا گیا اور جسٹی نین نے قیصر روم اور قسطنطنیہ کا شہنشاہ قرار پا کے تاج جہان بانی سر پر رکھا۔ اور تخت پر قدم رکھتے ہی اس نے تھیوڈورا کو بھی اپنے برابر بیٹھا کے صاحب تاج و تخت بنایا۔ یون تو ہر بادشاہِ ملکہ روم میں ایک خاص شان اور خاص اثر رکھتی آئی تھی مگر تھیوڈورا دستور سابق کے خلاف ایک مستقل شریک سلطنت تسلیم کی گئی۔ اور تمام وایان ممالک کے نام رعایا سے عہد و فاداری لینے کے جو فرمان جاری ہوئے وہ صرف جسٹی نین نہیں بلکہ اس کے اور تھیوڈورا دونوں کے ساتھ عہد و فاداری کرنے کے بارے میں تھے۔ اور جو برتاؤ ہندوستان میں جہانگیر نے نور جہان کے ساتھ کیا تھا وہی قسطنطنیہ میں جسٹی نین نے تھیوڈورا کے ساتھ کیا۔ گو کہ تھیوڈورا کو نور جہان سے کوئی نسبت نہیں ہو سکتی۔ نور جہان پاکدامن اور عقیقہ تھی اور تھیوڈورا ایک بازاری عورت اور انتہا درجے کی بدنام فاحشہ مگر تقدیر دونوں کی ملتی جلتی تھی۔ ہر تقدیر جسٹی نین کی سرور آرائی کے ساتھ ہی مشرقی دولت روم کی ساری رعایا تھیوڈورا کے آگے سب سے مین گر پڑی اور وہی بازاری کسی جس نے بے شمار خلقت کے سامنے قسطنطنیہ کے تھیمکٹرین اسٹیج پر نقالی کی تھی اسی شہر میں متین و سنجیدہ مجسٹریٹون مقدس و دیندار اسقفون۔ فتحمند سپہ سالارون۔ اور ایسے شہہ شاہان ارض سب سے اُسے بلا تامل اپنی ملکہ اور اپنے جان و مال کی مالک تسلیم کر لیا۔

اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ بے عصمتی عورت کی ساری خوبیوں کو مٹا دیتی ہے۔ اس

خیال کے لوگ غالباً اُن مورخوں کے بیان کو بڑے شوق اور بڑی دلچسپی سے سنیں گے جو تھیوڈورا کو ہر بات پر الزام دیتے ہیں۔ اُس کی برائیاں بتانے میں بالآخر کرتے ہیں۔ اور اُس کے ہنردن کو بھی عیب بنا کے دکھاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اُسے ہر صحبت میں جو انا نہ شہوت پرستی کے الزام دیے جاتے تھے۔ اور ہر شخص جو اُس کے حسن سے لطف اٹھا چکا تھا اسے حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اور اسی مذمت سے تھیوڈورا کو بھرے دربار میں اہل دربار سے چار آنکھیں کرنے کی جرات نہ ہوتی۔ خواہ مذمت یا توہین و تحقیر کے ڈر سے جان تک بنتا وہ عام مجموعہ میں آنے سے بچتی۔ اور کسی ایسے بڑے دربار میں بلائی جاتی تو انکار کر دیتی۔ اسی قدر نہیں وہ دارالسلطنت قسطنطنیہ میں رہنے ہی سے بھاگتی۔ اور اُس کا سال کا زیادہ حصہ اُن عالی شان قصروں باغوں کو شکون اور نزہت گاہوں میں گزرتا جو ہسپانٹ اور باسفورس میں سمندر کے کنارے بنے ہوئے تھے۔

یہاں اُس کی زندگی عیش و نعم اور خود آرائی میں بسر ہوتی۔ ہوشیار مشاطائیں اس کا بناؤ سنگھار کرتیں۔ اس کے چاند سے چہرے کی آب و تاب کو چمکاتیں۔ اور اُس حسن و جمال کی آبیاری کرتیں جس نے جستی نہیں کے دل کو ہاتھ میں لے کے ساری دنیا کو مفتوح کر لیا تھا۔ حامون میں ناناہا کے نکھرتی۔ میسر پر بیٹھ کے الوان نعمت کا مزہ لیتی۔ عشرت گاہوں میں بیٹھ کے اپنی خواہشوں سے ہنستی بولتی۔ اور نرم نازک سپہیوں پر لیٹ کے جوانی کی نیندیں لیتی۔ اُس کے حضور کے اسٹاف میں حسین و خوش سلیقہ خواہشیں۔ نازک اندام و خوش روئے عمر لڑکے۔ اشاروں پر دوڑنے والے خواجہ سرا اور مدہا غلام تھے۔ جن کے جھگڑے چکانے میں اُسے گھر بیٹھے عدالت و حکمرانی کا مزہ آجاتا۔ اُس کے خلوت کمرے کے قریب وہ دیوان خانہ تھا جس میں بڑے بڑے ارکان دولت۔ اُمراء و رؤساء۔ سپہ سالار اور وزراء۔ اُربان اور مقتدا پارلیمانی و آستان بوسی کی تمامین اکے جمع ہوتے۔ گھنٹوں انتظار کرتے۔ اور امید واری کی سختیاں برداشت کرنے کے بعد انھیں صرف اتنی اجازت ملتی کہ ادب و تعظیم سے آگے تھیوڈورا کے قدموں کو بوسہ دیں اور نظر نیچی کیے واپس چلے جائیں۔ اکثر ایسے موقعوں پر یہ منظر دیکھ کے خود اُس کا دل دھڑکنے لگتا کہ وہی امیر جس نے

کبھی اُس کے حسن و جمال کے مزے لوٹے تھے اُسے آغوش شوق میں بٹھایا تھا اور اُس کے لبِ لعلین کے بوسے لیے تھے آج اس بات کو اپنی بڑی اقبالمدی سمجھتا ہے کہ اُس کے قدموں کو چوم سکے۔ کھیوڈورا کو اس کا اندیشہ لگا رہتا تھا کہ اگر جیٹی نین مر گیا تو میرا کوئی نہ ہوگا۔ اور وہ لوگ جو آج میری پرستش کر رہے ہیں میری تذلیل کے درپے ہو جائیں گے۔ اس خیال سے اُس نے بے انتہا روپیہ جمع کر لیا۔ تاکہ وقت پڑنے پر کم از کم اتنا تو ہو کہ میں کسی کی محتاج نہ ہوں۔

مگر سب سے بڑی قیامت یہ تھی کہ کھیوڈورا کے دل سے یہ خیال کسی طرح نہ جاتا تھا کہ لوگ مجھے ذلت و حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ یہ خیال بڑھتے بڑھتے جنون اور وہم کے درجے کو پہنچ گیا۔ اُس نے ہزاروں جاسوس مقرر کر رکھے تھے جو محلوں محلوں مارے مارے پھرتے۔ اور گھر گھر کی خبر لیتے۔ اور روز آگے اُسے خبر دیتے کہ فلان شخص نے آپ کی نسبت یہ کلمہ کہا۔ فلان نے آپ کو یہ الزام دیا۔ فلان آپ کو یہ کہتا تھا۔ اور فلان آپ پر یہ حملہ کرتا تھا۔ اس قسم کی صد ہار پین ردز آتیں۔ اور وہ ہر ایک سے بدگمان ہوتی جاتی۔ ایسے لوگوں کے سزا دینے کے لیے جنکی نسبت ایسی بھریاں ہوتیں اُس نے ایک بڑا بھاری خوفناک اور زمین دوز قید خانہ بنا رکھا تھا جو ایک طلسمی راز تھا۔ اور کسی کو اس کے مفصل جاننا معلوم نہ ہو سکے۔ جاسوس جن لوگوں کی نسبت ایسی کوئی خبری کرتے۔ دو تین روز بعد وہ ایک بیک گھر سے یا راہ چلتے سے غائب ہو جاتے اور اسی قید خانے میں لاکے ڈال دیے جاتے۔ بغیر کسی تحقیقات کے اور بغیر اس کے کہ کسی عدالت نے فیصلہ کیا ہو یہ لوگ زبردستی چرا لائے جاتے اور اس قید خانے میں بند ہو جاتے جہاں رحم اور ترس کھانے کے نام سے بھی کوئی آشنا نہ تھا۔ آسمان کبھی کسی کو کھانا نہ نصیب ہوتا۔ سورج کی روشنی وہاں تک پہنچ نہ سکتی۔ اور اندھیرے میں روشنی لے کے کوئی بڑی ہی سنگدل اور ظالم عورت آتی جو تمام اسیروں کو کوڑوں سے پٹواتی۔ اُن پر طرح طرح کے عذاب کرتی۔ اور اُنھیں ہر قسم کی تکلیفیں دیتی۔ زمین سے اندر یہ مظلوم ستم زدہ درد و تکلیف سے چیختے چلاتے۔ دو ہا بیان دیتے۔ ایک ایک کی خوشامد کرتے۔ مگر کوئی اُن پر ترس نہ کھاتا۔ اور نہ کبھی ان کی آہ و نہاد ہی

سنی جاتی۔ غرض یہاں ایسی روح فرسا اور جان گزاتکلیفین دیکھتیں کہ بہت سے لوگ اسی قید خانے میں تکلیفین اور اذیتیں اٹھاتے اٹھاتے مر گئے۔ اور کسی کو خبر بھی نہ ہوئی کہ کیا ہوئے اور کہاں گئے۔ بعض برگشتہ بخت ناشاد چھوٹ کے بھی آئے تو اس قابل نہ تھے کہ زندگی سے لطف اٹھائیں یا کسی کو دنیا میں سند دکھائیں کیونکہ کسی کی ناک غائب تھی۔ کسی کے کان کٹ گئے تھے۔ کسی کی آنکھ چھوٹ گئی تھی۔ کسی کا کوئی اور عضو کاٹ لیا گیا تھا۔ اور پھر اس کے ساتھ اکثر غبوظہ لخواں تھے۔ اور دل و مانع نہیں ٹھکانے رہے تھے۔ ماسوا اس کے اُن کی نام دولت و جامداد تباہ کر دی جاتی۔ اور قید خانے سے باہر آنے کے بعد وہ سڑکوں پر مارے مارے پھرتے۔ بڑھنے کے لیے کوئی جگہ بھی نہ نصیب ہوتی۔ اور اپنی ناکارگی کی حالت اور تباہی و بربادی سے دنیا کے سامنے تھیوڈورا کے انتقام کا زندہ ثبوت پیش کیا کرتے۔ اُس کے ہاتھ کے سزایا بون میں عوام ہی نہیں بعض اراکان سلطنت اور محترم مقتدایان دین بھی تھے۔ ایسے معزز مجرموں کی نسبت قتل وغیرہ سزائوں کا حکم دینے وقت تھیوڈورا اپنے معتمد علیہ دار و نہ قہاری سے کہتی کہ اگر میرے حکون کی تعمیل میں تم نے ذرا بھی کمی کی تو میں اُسی خدا کی قسم کھا کے کہتی ہوں جو ہمیشہ زندہ رہے گا کہ تمہاری کھال کھینچوا لوں گی، رہائی پانے والوں میں زیادہ تعداد اُن نو عمر لڑکوں کی تھی جنکی نسبت وہ بدگمان ہو گئی ہوتی۔

ہم بیان کر آئے ہیں کہ ایشیا کے کوچک میں تھیوڈورا ایک لڑکا جن کے کسی اپنے منظور نظر آشنا کے پاس چھوڑ آئی تھی۔ اُس لڑکے کو اُس شخص نے بڑی حفاظت سے پالا۔ اس راز کو اُس سے مخفی رکھا کہ اُس کی ماں تھیوڈورا ہے۔ جب اُسے یہ خبر پہنچی کہ اب تھیوڈورا قیصرہ روم اور شہنشاہ قسطنطنیہ کی شریک زندگی و شریک سلطنت ہے تو اس خوف سے کہ ایسا نہ ہو ماں کی ماتا جو ش مارے اور اس لڑکے کو زبردستی چھینوالے اُس نے اس بچہ کو ارض عرب میں بھیج دیا۔ جہاں کی آزاد سرزمین روم و فارس دونوں کی دست رس سے باہر تھی۔ اس کے بعد جب وہ شخص بیمار ہوا اور جانا کہ میرا یہی عرض مرض موت ہے تو اُس نو عمر لڑکے کو عرب سے بلوایا۔ اور مرنے سے چند ساعت پہلے بستر مرگ پر پڑے پڑے اُسے بتایا

کہ تھاری مان اس وقت دنیا کی سب سے بڑی ملکہ اور قسطنطنیہ کی شہنشاہ بیک تھیوڈورا ہے۔ اس راز کے کھلتے ہی سادہ مزاج لڑکے کے دل میں خدا جانے کامیابی و مقصد کی اور دولت مندی و حکومت کی کیسی کیسی آرزوئیں پیدا ہو گئیں کہ باپ کو آغوشِ خود کے سپرد کرتے ہی قسطنطنیہ کی راہ لی۔ اور قیصرہ کے محل کے پھاٹک پر پہنچ کے اپنے آنے کی خبر کرائی۔ تھیوڈورا یہ سننے ہی چونک پڑی اور ابگنی (عرض بگن) کو حکم دیا کہ اُسے قدر و منزلت سے اندر لے آؤ۔ لڑکا خوش خوش اندر گیا۔ مان کے تحت کے سامنے ادب سے زمین بوس ہوا۔ مان نے اُس پر سر سے یاؤن تک ایک نظر ڈالی۔ اور پھر اس کے بعد پتہ نہ لگا کہ وہ کہاں گیا اور کیا ہو گیا۔ تھیوڈورا کی زندگی ہی نہیں اُس کے مرنے کے بعد پھر کسی نے اُس لڑکے کی صورت نہ دیکھی اور یقیناً وہ اُس کے دوزخ میں پہنچ گیا۔ اُس کے زمانے والے اس سے سہ قدر جلے ہوئے تھے کہ اُس کے عقائد اور مذہب پر بھی اعتراض کرتے اور اُسے لازمہ مذہب کہتے ہیں۔ مگر یہ صرف تعصب ہے۔ وہ دل سے سچی مسیحی تھی۔ اور مسیحیت کی ترقی اور دینی خدمات کی جانب اپنے سٹوہر کو ہمیشہ متوجہ کرتی رہی۔ لیکن لازمہ مذہب نہ ہونے پر بھی اس میں شک نہیں کہ وہ متکبر حریص طالع اور ظالم تھی۔ محض ظالم ہونے سے یہ نتیجہ نکلا کہ وہ مسیحیہ نہ تھی تاریخِ عالم کی تغلیط کرنا ہے۔ وہ تو ایک نفس پرست اور بہ اطوار ملکہ تھی اچھے اچھے پابندِ دین اور خدا پرست مسیحیوں نے انتقام لیتے وقت روم کے بت پرستوں پر یہودیوں پر مسلمانوں پر جیسے جیسے مظالم کیے ہیں انہیں تھیوڈورا کی سنگدلیاں کچھ زیادہ بڑھی ہوئی نہیں۔

اب بمصدق عیب اور جملہ بگھتی ہنرش سنیز گاؤ ہم تھیوڈورا کے بعض عین بھی بیان کرتے ہیں۔ اُس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ شہنشاہِ حبشی میں کے ناقابلِ برداشت غیظ و غضب کو ہمیشہ اعتدال پر لے آتی تھی۔ اس میں شک نہیں ہے کہ اگر وہ نہ ہوتی تو حبشی میں نہایت ہی ظالم و جابر اور اُس کے ساتھ ہی بہت ہی ناکام و نامراد بادشاہ ثابت ہوتا۔ اور غالباً اس کو ہر وقت کارِ تسلیم کر لے گا کہ حبشی میں جتنی خوبیاں تھیں وہ اُسکی نہیں بلکہ اصل میں تھیوڈورا کی خوبیاں تھیں۔ دیندار ہی اور جرأت و شجاعت کے ساری کاموں میں حبشی میں

کے نام کے ساتھ تھیوڈور اکا نام یکسان عزت و وقعت کے ساتھ شامل تھا۔ اور یہ ایسی نیکی تھی کہ اُس کے دشمن بھی امید دلاتے ہیں کہ باوجود تمام گناہوں کے شاید وہ اُس کی نجات کا ذریعہ ہو سکے۔

ہر شخص کو اپنے گروہ والوں سے زیادہ ہمدردی ہو ا کرتی ہے۔ اس لیے کہ انکی تکلیفوں اور مصیبتوں سے جس قدر وہ واقف ہوتا ہے دوسرا نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ تھیوڈور کو سب سے زیادہ ہمدردی عصمت فروش و ناما کام رنڈیوں سے تھی۔ اُس نے جو سب سے بڑی اور اعلیٰ درجہ کی فیاضانہ تربیت گاہ قائم کی اپنی اُن ستم زدہ بہنوں کے لیے تھی جنہیں کسی مرد کی بے رحمانہ بے شرمی نے بے آبرو کر ڈالا تھا۔ یا جو ہر طرف سے عاجز آکے رنڈی کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور ہوئی تھیں۔ اس غرض کے لیے باسفورس کے ایشیا کی ساحل کا ایک عالیشان قصر شاہی ایک با عظمت و جبروت خانقاہ بنادیا گیا۔ اس کے مصارف نہایت حسین کے ساتھ سلطنت نے اپنے ذمے لیے اور اُس میں ۵۰۰ ایسی عورتیں لاکے رکھی گئیں جو قسطنطنیہ کی سرکون اور دہان کے قحبہ خانوں سے سمیٹ لائی گئی تھیں۔ اس امن و امان کے قلعہ اور تقدس و اتقا کے امن میں یہ سوسائٹی کی ستائی اور مذہب دوبارہ سے ملعون بنا کے نکالی ہوئی عورتیں خاموشی اور تنہائی کی زندگی بسر کرتی تھیں۔ ان عورتوں کی روم میں یہ حالت ہو رہی تھی کہ اسی طبقہ کی چند بنصیب عورتیں ہجوم نامردوں سے گھبرا کے اور زندگی سے عاجز آکے سمندر میں بھانڈ پڑی تھیں۔ انکی انیناقلی بل برداشت نامرادی اب اس فیاض مربیہ کی عنایت سے شکرگزاری اور اصلاح سے بدل گئی۔ اور یہ ہے کہ تھیوڈور نے اس تربیت گاہ کے ذریعہ سے ہزاروں عورتوں کو گناہ و عذاب اور ذلت و بے عزتی سے بچالیا۔

تھیوڈور انکی دانائی و ذہانت کا خود جیٹنی نہیں معرفت تھا۔ جن عمدہ اور مضبوط قوانین کو اُس نے جاری کیا اُنہیں وہ اپنی نہایت ہی مقدس و محترم ملکہ ہی کی جانب منسوب کرتا ہے اور اس کی نسبت یہ الفاظ زبان پر لاتا ہے کہ ”دنیا کے لیے وہ ایک بڑی نعمت و برکت ہے“ تھیوڈور دل کی نہایت ہی مضبوط اور بات کی بہت ہی پختی تھی۔ بڑے بڑے صاحب اثر افراد و ذرائع کے مجموعہ میں نہایت آزادی ہوشیاری

سے مناسب راے دیتی۔ اور اکثر خوفناک موقعوں پر اُس سے ایسی غیر معمولی چیزیں ظاہر ہوئی کہ بڑے بڑے جو افراد حیران رہ گئے۔ ایک بار سبز اور نیلے بانے والوں کی برہمی سے قسطنطنیہ میں سخت بلوہ ہو گیا تھا۔ بلوائیوں نے شہر کی عمارتوں میں آگ لگا دی تھی۔ سارے شہر پر شعلے بلند تھے۔ سینٹ صوفیہ کی عالیشان عمارت جو قسطنطنیہ اعظم نے دانا کی کی دیوی کی یادگار میں بنائی تھی جل کے خاک کا ڈھیر رہ گئی۔ رعایا شہر چھوڑ کر بھاگنے لگی۔ حبشی نین بھی اپنے ایک بیرونی قصر میں چلا گیا۔ اور وہاں بھی اطمینان نہ نظر آتا تھا۔ امرائے دربار نے یہ تجویز پیش کی کہ حبشی نین کو مع اُس کے محلوں اور حرموں کے جہازوں پر سوار کر کے کسی دُور کے شہر میں پہنچا دیا جائے۔ اس تجویز کی محرک گو کہ دغا بازی و سازش تھی اور اس وقت شہر سے نکلنا تاج و تخت سے جدا ہونا تھا مگر حبشی نین گھبراہٹ میں فریب کو نہیں سمجھا اور چلے جانے پر راضی ہو گیا۔ اس موقع پر تھیوڈورا بہادر وں کی طرح اٹھ کھڑی ہوئی اور کمال جو امردی سے بولی ”مانا کہ بھاگتے ہی میں جان بچتی ہے مگر میں بھاگنے کو دلت و حقارت سمجھتی ہوں۔ موت پیدا ہوتے ہی ہماری قسمت میں لکھ دی گئی ہے۔ مگر جو صاحب تاج ہیں وہ تاج و تخت سے علیحدہ ہو کے زندہ نہیں رہ سکتے۔ میری راگاہ الہی میں یہ تمنا ہے کہ کبھی کوئی دن بغیر تاج جہان بانی اور خلعت ارغوانی کے نہ دیکھوں۔ اوقیر! اگر تم نے بھاگنے ہی کا ارادہ کر لیا ہے تو تمھارے پاس دولت کے خزانے ہیں۔ اور سامنے دیکھو جہاز بھی کھڑے ہیں۔ جب چاہو ان پر چلے جا سکتے ہو۔ مگر اس سے ڈرو اور کانپو کہ مبادا نڈکی کی ہڈیاں میں تحقیق بد نصیبی کی جلا وطنی اور ذلیل قسم کی موت نہ نصیب ہو جائے باقی رہی میں تو میرا شعار تو یہ قدیم الایام کا مقولہ ہے کہ ”تخت ہی مبارک مقبرہ ہے!“ تھیوڈورا کی اس تقریر نے سارے دربار پر عجیب اثر کیا۔ اور اسی کی اس مضبوطی کا نتیجہ تھا کہ حبشی نین اپنے دار السلطنت سے نہیں ہٹا۔ اور اس کو کسی قسم کا آزاد نہ پہنچ سکا۔

حبشی نین کے نکاح میں آنے کے بعد سے تھیوڈورا کی عصمت کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ اب کبھی اس سے کوئی ایسی بد عنوانی نہیں ہوئی جو

طشت از بام ہوئی ہو یا جیٹو نین کو اُس کی عفت پر شبہ ہوا ہو۔ لیکن اُس کی اس پاکدامنی میں زیادہ دخل اس کے محض قید خانے اور اُس کی سختیوں کو تھا دشمن تو کیا کہتے سارے شہر میں کسی کی مجال نہ تھی کہ اس کے چال چلن کے خلاف ایک لفظ بھی زبان سے نکال سکے۔ ممکن ہے کہ اس زمانے میں بھی اس کے مخفی عشاق ہوں۔ اس کی پراکٹ خدمت اور ہر وقت کے کاموں کے لیے دس خوش رُو اور بانگے ترچھے نوجوان تھے۔ جو جلوت و خلوت میں ہمیشہ سامنے رہتے۔ اور اُس کے نہایت ہی منظور نظر تھے۔ لیکن جب خود جیٹو نین کو اُس پر بدگمانی نہیں ہوئی تو اور کسی کو بُری رائے قائم کرنے کا کیا حق ہے؟ اور واقعی وہ دل کی ایسی مضبوط تھی کہ کوئی تعجب کی بات نہیں اگر اُس نے اپنے شوق پیش اور بد اطواری کی پُرانی عادتوں کو اپنے موجودہ فرائض و مقاصد پر قربان کر دیا ہو؟

اسی اخلاقی پالیسی کا اثر تھا کہ انجی دانائی و قابلیت سے اُس نے جیٹو نین کی محبت کو کبھی گھٹنے نہ دیا۔ اور ہمیشہ اُسے یکساں درجے پر قائم رکھا۔ بلکہ جیٹو نین کو روز بروز قطعی یقین ہوتا جاتا کہ بغیر تھوڈور کے میں نہ حکومت کر سکتا ہوں اور نہ زندہ رہ سکتا ہوں بہر تقدیر جس سٹھی میں تبصر کا دل تھا وہ کبھی ڈھیلی نہ پڑنے پائی۔ کبھی کبھی خفیف سی باتوں پر میان بی بی میں شکر رنجی بھی ہو جاتی مگر وہ دراصل ملاپ کا مزہ لینے اور جوش و صل میں تازگی پیدا کرنے کے لیے تھی۔ بعض بے وقوفوں نے اُن رنجشوں کو دلی عناد خیال کر لیا اور بادشاہ کو تھوڈور کے زیادہ مخالف بنانے کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ مگر یہ کوشش اُن کے حق میں سم قاتل ثابت ہوئی۔ دو ہی تین روز میں میان بی بی میں پھر ملاپ ہو گیا اور وہ اپنے کیفر کردار کو پہنچے۔

شادی کے بعد تھوڈور کو سب سے بڑی تمنا اولاد و نرینہ کی تھی۔ تاکہ سلطنت روم اُسی کی نسل میں رہے۔ مگر اس برکت کی صلاحیت کو اپنی ابتدائی بے اعتدالیوں میں اُس نے خود ہی ہاتھ سے کھو دیا تھا۔ تاہم قدرت نے اُس کے آنسو پونچھے اور ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ مگر اس کی عمر نے وفانہ کی۔ اور بچپن ہی میں مان باب وہ نون لے کیلون کو دواغ دے کے آغوش اجل میں چلی گئی۔ جسے تھوڈور نے اپنے

اپنے آسوں میں نہلا کے دفن کیا۔

جوانی کی بے اعتدالیوں نے اُسے اولاد ہی کی برکت سے محروم بنیں رکھا بلکہ اُس کی صحت بھی اچھی نہ تھی۔ وہ کبھی سوٹی اور تیار نہیں ہونے پائی۔ ہمیشہ نازنین و نازگ۔ اندام دلی بلی اور چھری تھی۔ اور اب آخر میں اس کی صحت زیادہ بگڑ گئی۔ اُس کے طبیبوں نے یہ علاج بتایا کہ علاقہ پچھیا کے حامون میں جا کے نہائے اور اس نے فوراً اُس سرزمین کا ارادہ کر دیا۔ سفر میں ایک بڑا بھاری جلوہ س اُس کے ساتھ تھا۔ اطباء کے علاوہ ایک استقف سلطنت کا سب سے بڑا خزانہ چند کاؤنٹ (نواب) اور بطریق (امرا) تھے۔ اور چار ہزار ملازموں اور خادموں کا باشندان و شوکت گردہ ہمراہ رکاب تھا۔ جس طرف سے ملکہ عالم کی سواری گزرتی سرکین دو تین روز پہلے سے درست اور صاف کر دی جاتیں۔ اسے فر دکش ہونے کے لیے ہر منزل پر ایک قصر شاہی بنا ہوا ملتا۔ جو خاص اُس کے مقیم ہونے کے لیے تعمیر کیا جاتا۔ جاتے جاتے جب شینہ میں پہنچتی تو دہان کے گرجوں خانقاہوں اور ہسپتالوں پر اس نے بڑی بڑی فیاضیاں کیں۔ اور عام انعام و اکرام کے ساتھ مذہبی خدمات بجالانے میں ذرا بھی کوتاہی نہیں کی۔ یہ سب اس امید میں تھا کہ گرجوں خانقاہوں اور ہسپتالوں واسطے اُس کی صحت کے لیے دعا کریں۔ مگر کسی کی دعا کا اثر نہ ہوئی۔ اور فرشتہ اجل آہی پہنچا۔ چنانچہ شادی کو چوبیسواں اور فرمانروائی کو بائیسواں سال تھا کہ ناگہان نہر باد ہو گیا۔ جس سے جان بر نہ ہو سکی۔ اور جبین کو اُس کے مرے کا بچہ مدہ ہوا۔

ہندوؤں کے علوم

دنیا اپنی نادانی سے چاہے قدر نہ کرے مگر یہ ہے کہ ہندو مذہب اور اُس کے ساتھ ہندوؤں کی قوم موجودہ دنیا کے آغوش میں ایک نامعلوم قدامت کی قابل قدر باتیں ہیں۔ اور سلف کے جو ایام قدامت کے دُھندلے مین آگئے اُن کے نہایت ہی بیش بہا تیرکات ہندوؤں کی پرانی زبان سنسکرت اور ان کے ہمیشہ زندہ رہنے واسطے علوم ہیں۔ زمانہ ہر چیز کو مٹاتا رہتا ہے۔ کسی میں چاہے کیسی ہی ابدی زندگی کی صلاحیت

ہو زمانہ اُس پر آہستہ آہستہ مردِ آیام کی خاک ڈالتی جاتا ہے۔ یہاں تک کہ موت دراز کے بعد ہی خاک اُس کی قبر بن جاتی ہے۔ اور وہ بے مرے زندہ دفن ہو جاتا ہے۔ زمانے کے ان زندہ مدفونوں میں مہرِ بابی اسرائیلی یونانی اور رومی ہیں جو ایسے علوم و فنون اور ایسی تاریخی یادگارین چھوڑ گئے ہیں کہ قدامت کی خاک میں دب جانے کے بعد بھی یہ خاک سے پکار پکار کے اپنا نام بتاتے اور اپنی زندگی کا ثبوت دیتے رہتے ہیں۔ مگر ہندوستان کی برائی آریہ قوم نے باوجودیکہ سب سے قدیم ہے زمانے کی اُس خاک کو ہمیشہ جھٹک جھٹک کے ہٹا دیا۔ اور اُس پر مردِ آیام کا زور نہ چلنا تھا نہ چلا۔ اور زمانہ اور دن کی طرح اُس کے زندہ دفن کرنے میں کسی طرح کا مہیا نہ ہو سکا۔ ہندو قوم نے زندگی کی محاسنوں پر ہمیشہ فتح پائی۔ جو دشواریاں پیش آئیں سب کو خاک کی طرح چھاڑ کے الگ پھینک دیا۔ اور حضرت مسیح سے ہزار ہا سال پیشتر کے ان پس ماندگان سلف کو آج بیسویں صدی عیسوی میں ہم دیکھتے ہیں کہ معجزانہ زندگی ابدی کا جامہ پہنے ہوئے اپنے پُرانے علوم کو خود ہی دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ آغاز ہستی کے ذنگل کے پہلو اوزن میں سے آج کون باقی ہے؟ بابل والے۔ اسیریا والے۔ مصر والے۔ ایران والے۔ یونان والے۔ اور اُن کے زلہ خوار اہلِ روم سب مٹ گئے۔ نہ اُن کا مذہب باقی ہے۔ نہ اُنکی معاشرت باقی ہے۔ صرف اُن کے چند علوم ہیں جو غیروں کے ہاتھ کا کھٹو ناہیں۔ مگر ہندو! آبجیات کے سرشار ہندو۔ ابدی ڈھائی چھوٹے کے مشتاق ہندو! آج پارمی کے ساتھ خود ہی کھڑے ہوئے اپنے مذہب۔ اپنی معاشرت۔ اپنے کارناموں اور اپنی تاریخ کو دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ اور اگر کوئی غیر اُن کے علوم کے سمجھنے میں ذرا بھی غلطی کرتا ہے تو فوراً بھڑک کے ٹوک دیتے ہیں۔ اور اپنی تاریخ و قسمت کا فیصلہ دوسروں کے ہاتھ میں نہیں چھوڑتے۔

ہندوؤں کا نایاب علمی ذخیرہ کیا بہ لحاظ اُن کی مذہبی روایتوں کے اور کیا بہ لحاظ اُن کے رسم خط کے نہایت ہی قدیم ہے۔ اور جس قدر قدیم ہے اُسی قدر نادر۔ اس موقع پر ہم چاہتے ہیں کہ اُن کے علموں کا ایک مختصر گوشوارہ اپنے احباب کے سامنے پیش کریں۔ اُن کے پُرانے تصانیف قریب قریب سب نظم میں ہیں جو امر کہ اُنکی قدامت کا ذریعہ

ثبوت ہے۔ ظاہر میں لوگ سمجھتے ہیں کہ نثر نظم پر مقدم ہے۔ لیکن علمی دنیا میں صحیح نہیں۔ گفتگو میں بیشک نثر کو تقدم ہے۔ مگر جذبات دلی کے ظاہر کرتے وقت انسان میں ایک ایسی متانت اور غیر معمولی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ چاہتا ہے انھیں کسی غیر معمولی وضع و عنوان سے ظاہر کرے۔ اسی شوق نے انسان کو اُس کے بچپن ہی میں نظم کی طرف متوجہ کر دیا۔ جذبات و خیالات شاعرانہ کو نثر میں ادا کرنا شاعری کے بہت دنوں بعد شروع ہوا۔ لہذا ہندوؤں میں اُن کے تمام علوم کا نظم میں ادا کیا جانا ہی اُن کی قدیم کا ثبوت ہے۔

ہندوؤں کے قریب قریب تمام علوم کو مذہب نے اپنے آغوش میں لے لیا ہے یا اپنا لباس پنھا کے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ ان کے علوم میں سب سے مقدم چار وید ہیں جو ان میں مذہبی روح بھروسے کے مکمل ذرائع ہیں۔ اُن میں دعاؤں اور مناجاتوں کے ذریعے سے فلسفہ دین اور خدا شناسی کی بہت اعلیٰ تعلیم دی گئی ہے۔ وہ چاروں وید حسب ذیل ہیں (اول) رگ وید۔ (دوسرا) یجر وید۔ (تیسرا) سم وید (چوتھا) اتھرو وید۔ ان چاروں ویدوں کے ماتحت چار اُپ وید ہیں۔ اور ان کے نام یہ ہیں (پہلا) ایش (دوسرا) دھنیش (تیسرا) گندھرب (چوتھا) ارکھ۔ ان چاروں اُپ ویدوں کے بعد اُپ انگ ہیں۔

چار اُپ وید جن کا ذکر آجکا ہندو مذہب میں دوسرے درجے کی مقدس و قدیم کتابیں ہیں۔ جن میں جراج۔ طب۔ یو سنی۔ ستر قاسی۔ سپہ گری۔ مہاری اور دیگر فنون علمی کا بیان ہے۔ اور ان کے دیکھنے سے انسان کو حیرت ہوتی ہے کہ اُس قدیم زمانے ہی میں ہندوؤں نے امور معاشرت اور ضروریات زندگی کے متعلقہ فنون میں کس قدر ترقی کر لی تھی۔

چھ وید انگ ان فنون کے بیان میں ہیں جو خاص ویدوں کی تعلیم سے تعلق رکھتے ہیں۔ مایوں کہنا چاہیے کہ ویدوں کے سیکھنے اور برتنے کے آلات ہیں۔ اُن میں پہلے فن تجوید ہے جس کے ذریعے سے ویدوں کی قرأت و تلاوت کے قاعدے معلوم ہوتے ہیں۔ انہیں الفاظ کے ادا کرنے کے لیے۔ آوازوں کے مخارج اور دیگر خصوصیات صوتیہ مکرر ہیں جبکہ ویدوں کے پڑھنے کے وقت لحاظ رکھنا ضروری لازمی ہے۔ اسی سلسلہ میں

نحو و صرف کا فن۔ آدازون کی ترتیب اور اُن کے باہمی تناسب کے قاعدے اور علوم نجوم و ہیکٹ بھی بصرحتہ بتائے گئے ہیں۔

ان تمام علوم اور فنون کی نسبت ہندوؤں کا اعتقاد ہے کہ خداوند جل و علا نے انھیں الہام کے ذریعے سے نیک نفس و پاک باطن پر مہنون کے دلون میں القا کر دیا تاکہ اُن کی مدد سے دنیا والے دیدون کو پڑھیں اور سمجھیں۔ کیونکہ بغیر ان علوم کے دنیا دید کی بانی تعلیموں سے فائدہ نہ اٹھا سکتی۔

آپ انگ کی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ ویدانگون کے بعد اور ان سے کم درجے کے ہیں۔ لیکن اگر غور سے دیکھو تو وہ بہت ہی عظیم الشان اور اعلیٰ درجے کے علوم تہی و روحانی پر حاوی ہیں۔ اُن میں منطق ہے۔ اور الہیات ہیں۔ یعنی وہ مسائل و رموز علم الہی جو دیدون کی تصریحات کی تشریح کے لیے بعد والوں کے ذریعہ سے معلوم ہوئے۔ احکام شریعت کا تشریحی انھیں میں ہے اور اسی سلسلہ میں دیتاؤں اور پرانے رشیوں اور شیون کی کہانیاں اور داستانیں بھی ہیں۔ ان سب ضروری کتابوں کی مجموعی تعداد اٹھارہ ہے۔ اور یہی کتابیں پُران کہلاتی ہیں جن کے ماننے سے آریہ سماج والے انکار کرتے ہیں۔ لیکن چاہے اُن پر بھر دسہ نہ کیا جائے مگر یہ غیر ممکن ہے کہ اُن سے فائدہ نہ اٹھایا جائے۔ اس لیے یہ تمام علوم دیدون کے حرم میں داخل ہونے کی گنجیاں ہیں۔ جن کو چھوڑ دیا جائے۔ تو نہ دیدون کے مضامین سے صحیح استدلال کیا جاسکے گا اور نہ اُن کے سمجھنے پر پورا وثوق ہو سکے گا۔

مذکورہ علمی کتابوں کے علاوہ ہندوؤں کے قدیم علمی خزانے کا زیور و دہانیت ہی ہتھم با نشان منظوم کتابیں ہیں جو مقدس روایات میں شامل کر دی گئی ہیں۔ یہ دونوں رامائن اور مہاتھارت ہیں۔ رامائن میں اوجو دھیا کے چندر بنسی تاجدار راجہ رام چندر جی کے حالات و واقعات عجب موثر و مجرب شاعری میں بیان کیے گئے ہیں جو نہایت ہی دلچسپ نتیجہ خیز ہیں اور تاریخی قصے کے عنوان سے دینی و روحانی کترین ظاہر کرتے ہیں۔ رام چندر جی۔ بشن جی کے ساتوین اوتار مانے جاتے ہیں۔ اور اُن کی زندگی اعلیٰ ترین کمالات انسانی کا نمونہ ہے۔ مہاتھارت میں وہ عظیم الشان لڑائی مذکور ہے جو ہستنا پور کے تخت کے لیے پانڈو اپنے بنی اعمام کو رڈون سے لڑے تھے۔ اور

جسکی نسبت ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ دنیا میں کبھی اس سے بڑی کوئی لڑائی نہیں ہوئی
ان کتابوں کے مقابلہ میں یونان کے پہلے شاعر ہومر کی تمنویان ایلید اور اوڈے پیش
کی جاتی ہیں مگر کیا یہ لحاظ وسعت بیان اور کیا یہ اعتبار شاعرانہ خوبوں کے یونان
کی ان دونوں پرانی منظوم کتابوں کو ہندوستان کی رامائن و مہا بھارت سے کوئی نسبت
نہیں۔ مہا بھارت ۸ کتابوں یا بابوں پر منقسم ہے۔ اور اس میں ایک لاکھ سے
زیادہ بند ہیں۔

اب ہندوؤں کی ان چند کتابوں کا مختصر تذکرہ بھی ضروری ہے جو ان کے مذکورہ
لٹریچر سے ملتی اور انکے ضمیمے ہیں۔ اول مگدھ بدھ (یعنی سن علم) مصنفہ گوسوامی جی
یہ اصل میں سنسکرت کی بہترین گرامر ہے۔ جس میں قواعد صرف و نحو نہایت صفائی و توضیح
سے بتائے گئے ہیں۔ فن لغت میں سنسکرت کی اٹھارہ کتابیں مشہور ہیں۔ مگر ان سب سے
بہتر اور مکمل "امرسنگھ" ہے۔

سنسکرت کی نظموں سے عجب قسم کا سوز و گداز اور نہایت شیرینی ظاہر ہوتی ہے
جس کا آغاز ان کے قدیم ترش عردا ملیکی جی سے ہوا ہے۔ انھوں نے اپنی مشہور کتاب
رامائن کے علاوہ ایک اور پیر درد واقعہ منظوم کیا ہے۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ ایک
نوجوان اپنی ناز آئین مشوقہ کے ساتھ گھر بار سے دور ایک پُر فساد شہر میں
سب سے الگ تھلک رہتا تھا۔ جو مار ڈالا گیا اور اس کی مشوقہ اس جنگل میں اپنے
ہمیشہ کے لیے چھوٹ جانے والے عاشق کی لاش پر روتی پڑتی اور آہ و زاری کرتی
ہے ظاہر ہے کہ دامیلیکی کے متبرک قلم نے جیسے مبداء فیاض سے المامی مدد ملتی تھی اس
حسرتناک داستان میں کیسا سوز و گداز اور کیسا دل کو تر پادینے والا اثر پیدا
کر دیا ہوگا۔

ڈراما کی ایجاد اگرچہ بہت پہلے سے ہو چکی تھی مگر کالی داس کی شہرت نے پرانے
سنسکرت ڈراما کو تقریباً فنا کر دیا۔ یورپ والے اب جو اس کے کمالات سے واقف
ہوئے ہیں اسے مشرق کا شیکسپیر کہتے ہیں۔ اس کا بہترین ڈراما "سکنتلا" ہے جس کا
ترجمہ انگریزی میں سر ولیم جونسن نے اور جرمنی زبان میں فارسٹر ہرڈ نے اور دیگر سنسکرت میں
مصنفین جرمنی نے کیا ہے۔ ہر ڈر کو یہ ڈراما اس قدر پسند آیا کہ کہتا ہے "اس عظیم شے"

ڈراما کا ہر سین ایک چمن ہے۔ جس کی ہر ہر کیا ری میں سے دھچپ واقعات فطرتی طور پر خوبصورت بودھون کی طرح اُگ آتے ہیں۔ اور اس میں کثرتِ دہ پر اثر اور نازک خیالات ملتے ہیں جن کا یونانی ڈراما میں کمین پتہ نہیں۔ اسی کالی داس کی ایک اور نظم ”میگہ دوت“ ہے۔ دکنس نے انگریزی میں اُس کا ترجمہ کیا ہے اور مشرق کے شاعرانہ کمالات پر شعراے مغرب کو حیران کر دیا ہے۔

ہندو لڑکچر کی قدرِ یورپ خصوصاً جرمنی میں روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ مگر ہندو لوگ محض اس غرور میں کہ یہ علوم اُن کے اور اُن کے گھر کے ہیں اُس قدر توجہ نہیں کرتے جیسی کہ جوئی چاہیے۔ خوشی کی بات ہے کہ اب ہندوؤں کو سنسکرت دانی کا شوق ہو چلا ہے۔ اور جا بجا اُس کے مدارس اور کالج قائم ہو رہے ہیں۔ خصوصاً بنارس تعلیم سنسکرت کی اعلیٰ یونیورسٹی قرار پائی ہے۔ لیکن جب تک سرکاری یونیورسٹیوں کا یہی طرز عمل رہے گا اور جب تک یونیورسٹی کی ڈگریاں ذریعہ معیشت بنی رہیں گی انہا سے وطن میں ہندو ہوں یا مسلمان تحصیل علم کا بھادوق پیدا ہونا دشوار ہے۔ دعوے کیا جاتا ہے اور نظا ہر صحیح بھی نظر آتا ہے کہ ان یونیورسٹیوں اور تعلیم کے موجودہ انتظامات نے ہندوستان میں علم کو بڑھا دیا ہے۔ لیکن اگر خور کرو تو علم بڑھانین بلکہ گھٹا اور گھٹنا جاتا ہے جو قوم علم کو کاسے گدا کی بنانا چاہتی ہو اسے علم ہرگز نہیں آسکتا۔ اگلے زمانے کا ایک متبصر دیدانت یا شاستری اور اسی طرح مسلمانوں میں ایک عالمِ دافضل آج کل کے سیکولر سند یافتہ گریجویٹوں سے اچھا تھا۔ ویسے دو عالم اچھے۔ اور ایسے دو ہزار زبردست علم فروش نہیں اچھے کاش ہندو مسلمان اپنی اپنی یونیورسٹیاں قائم کرنے کے خبط کے عوض اس بات کی کوشش کرتے کہ سرکاری یونیورسٹیاں علم کی سچی اکاڈمیاں بنا دی جائیں۔ اور ملازمت و کسب معیشت سے اُن کو کوئی واسطہ نہ رہے جیسا کہ خود انگلستان میں ہے۔ مگر ابھی ہندوستان یوں کو اس کی مصلحت سمجھنے کے قابل ہو خ نہیں آیا ہے۔ ابھی اس مسئلہ کو چھیڑنا انگریزی تعلیم یافتوں اور گریجویٹوں کے حقوق میں دخل دینا ہے۔ وہ زمانہ بعد آئے گا جب ہندوستان کے تمام فرزندوں کو معلوم ہوگا کہ اپنے وطن اپنی قوم۔ اپنے علوم۔ اور اپنے قدیم کمالات کے حقوق چند گریجویٹوں کے حقوق سے مقدم ہیں۔

چند خیالات و اوقات

کاپور کا جھگڑا عام مسلمانوں کے جوش بعض معزین اسلام کے ایشا نفس اور حضور و اسیراے کی عنایت و توجہ سے طے ہو گیا۔ اسیران بلا چھوٹے اور مسجد کے اوپر کا دالان بننے کی اجازت ملی۔ اگرچہ نیچے ایک عام راستہ نکال دیا گیا۔ ہر طرف سے اطمینان و شکر گزاری کی آوازیں بلند ہوئیں اور قیامت زما شور و ہنگامے کے بعد ملک میں ایک خوشگوار خاموشی ہے۔

مسلمانوں کے بعض حلقوں سے اب بھی ناراضی کی آوازیں سُنی جاتی ہیں۔ لیکن اب توجہ کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ اور جب سارے ہندوستان سے شکر گزاری کا نعرہ بلند ہو گیا تو اختلاف بے نتیجہ ہے بلکہ اب اس کو دیکھنا چاہیے کہ داسیراے کی اس فیاضی و رعایا نوازی پر انٹیکنائٹین اخبارات پر سخت حملہ کر رہے ہیں۔ کیا یہ اچھا ہے کہ ہمارے ہی لیے حضور و اسیراے اپنے لوگوں میں بُرے ہون اور پھر ہم بھی مطمئن نہ ہوں؟ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ انگریزوں کے اخبارات کی یہ ناراضی بھی موجودہ پائلکس کی پالیسیوں اور کانٹری بیوشنل گورنمنٹ کی نیرنگیوں میں سے ایک نہایت ہی آن بان کی دل کش و دلربا اداس ہے۔ مگر جو ہمیں اپنی وفاداری کی وضع نہ چھوڑنا چاہیے۔

بعض حضرات مولانا عبدالباقی صاحب پر حملے کر رہے ہیں کہ انھوں نے بغیر دیگر علالت سے پوچھ کیوں اس صورت کو قبول کر کے اس کے جواز کا فتوے دے دیا؟ مگر سچ یہ ہے کہ مولانا نے ایک فتنہ کو شتم دیکھ کے اور اُن مصیبت زدوں کی حالت اور ان کے انجیام کا خیال کر کے جو اسیر و پابز بجزیر تھے ایک مناسب و معقول صورت کو منظور کر لیا جس پر صرف نیک نیتی کی بنا پر وہ آمادہ ہوئے۔ اور شکر کیے کے مستحق ہیں۔

مگر لطف یہ ہے کہ نواب رام پور کے طرفدار اس کامیابی کا سہرا اپنے حضور کے سر باندھ رہے ہیں۔ خیر اُن کے سر پر جس کا سہرا چاہے چھین کے باندھ دیا جائے ہمیں عذر نہیں لیکن ہندوستان کی آزاد پبلک کے اسٹیج پر قدم رکھ کے انھوں نے جو مزہ اُٹھایا ہے وہ نہ کبھی اُنھیں بھولیگا اور نہ ہمیں۔ لیکن اس سے زیادہ لطف کی یہ بات ہے کہ حامیان

نوابی عبدالرحمن سے بعض قویہ فرماتے ہیں کہ یہ فیصلہ جو ہوا یہی ان کا شیخ زاد ہے۔ اور بعض فرماتے ہیں کہ نواب صاحب جو فیصلہ کرتے تھے اس سے اچھا اور سلفانوں کی پوری آرزو کے موافق تھا۔ جس کی رو سے مسجد کی نیچے کی زمین بھی مسجد کو ملتی رہے تو زمین کی میزائیں اور زمینوں کی خبر گیری ہوتی۔ اور جن اخباروں سے ضمانتیں لی گئیں واپس ہو جاتیں۔ خدا جانے دونوں میں کون سچا ہے۔ بہتر ہو کہ نواب صاحب پھر ایک بار قوی دربار میں قدم رکھ کر فرما کے خود ہی بتا دیں کہ ان میں سے کون سچا ہے؟ مگر ہمیں تو افسوس اس بات کا ہے کہ دایمیر اسے بہادر کے ارشاد کے موافق ہم تو اس جھگڑے کو بھول جانا چاہتے ہیں مگر نواب صاحب کے طرفدار ہمیں بھولنے دیتے۔

لیو لو

نقاد۔ شروع سال ۱۹۱۳ء سے یہ اردو رسالہ ایسی آب و تاب اور ایسی خوبی و رعنائی کے ساتھ نکل رہا ہے کہ اُسے دیکھ کر جی چاہتا ہے ہماری زبان اردو بھی ایسی ہی ترقی یافتہ اور دل فریب ہوتی جیسا یہ اُس کا رسالہ ہے اُس کا ہر نمبر سابق نمبروں سے ترقی کرنا لگیا ہے۔ اور حضرت دلگیر کی ستھدی سے امید ہے کہ آئندہ بھی انہیں ترقی کرتا رہے گا۔ اردو خوان ملک کا فرض ہے کہ اس کی قدر کرے۔ ٹائٹل کے علاوہ ۲۰ x ۲۶ پیمانہ کے ۵۲ صفحات پر ہوتا ہے۔ کاغذ اور لکھائی اور چھپائی اچھی ہی نہیں دل فریب ہیں۔ سالانہ چندہ صرف تین روپیہ سالانہ۔ درخواستیں "سیوہ کٹرہ" اگرہ کے پتے پر حضرت شاہ دلگیر صاحب کی خدمت میں بھیجی جائیں۔

اطلاع

جمہ خیرداران دکن کی خدمت میں التماس ہے کہ وہ خط و کتابت میں اپنا نمبر خریداری لازمی طور پر بتا دیا کریں جو ان کے پتے کے ساتھ لکھا ہوتا ہے۔ رجسٹرڈ نمبر اسے اس ڈاک خانہ کا نمبر ہے اسکے حوالہ کی ضرورت نہیں۔ اگر نمبر کا حوالہ ہوگا تو ممکن ہو جواب ہی تاخیر ہو جائیگا دیا جاسکے۔ بیہرہ دکن

لفظی کتب خانہ مہذب پاک ایجنسی

۱۱۲	نتیجہ محبت	۱۸	جنگ طرابلس	۱۸	محبت کی پتی
۱۱۳	بنو جان	۱۸	کشتہ ناز کامل	۱۸	کرشمہ الفت
۱۱۴	موقع طرابلس	۱۸	بروگ	۱۸	خون تمنا
۱۱۵	عروج زوال	۱۱۲	پیاری دنیا	۱۱۲	کرشمہ محبت
۱۱۶	شہنشاہ عیاران	۱۸	سوانح محمدی شاہ بابر	۱۸	دبدبہ امیری
۱۱۷	نشر	۱۸	نشہ جوانی	۱۸	کھکشان
۱۱۸	ارمان	۱۱۲	بہشت برین	۱۱۲	دلیس کا بامکا
۱۱۹	محبوبہ لندن	۱۱۲	امراؤ جان	۱۱۲	ثمرہ دیانت
۱۲۰	اندرا	۱۸	حیات پنج حلی	۱۸	حسرت دید
۱۲۱	پیر ارمان لوطی	۱۱۲	ترجیحی نظر	۱۱۲	تاریخ جنگ چان بوس
۱۲۲	میٹھی چھری	۱۸	کنیز فاطمہ	۱۸	سرور رامائن
۱۲۳	احمق الذین	۱۸	مالن کی مٹی	۱۸	نرالا عاشق
۱۲۴	پرستان کی پری	۱۸	ایران کی شہزادی	۱۸	دستاویز محبت
۱۲۵	رزم بزم	۱۸	حاجی بخلول	۱۸	کاپا پلٹ

ان مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ اور بھی ہر قسم کی کتابیں روانہ ہو سکتی ہیں

المشہر پریس ڈپلٹر کا خانہ مہذب پاک ایجنسی۔ لکشمہ بزن بیگ خان لکشمہ

اخلاق عزیزی

اصول معاشرت اور فلسفہ اخلاق پر یون تو ہزاروں کتابیں لکھی گئی ہیں مگر جو وقت
 برومی فلیسوف سلف حکیم سنیکا کی کتاب "مارس آت سنیکا" کو حاصل ہو اور جیسی
 مقبولیت عامہ اس نثرانی اخلاقی کتاب کو یورپ اور تمام شائستہ قوموں میں حاصل
 ہوئی کسی کتاب کو نہیں نصیب ہو سکی۔ سچ یہ ہے کہ یہ کتاب ہر زبان بنانے کے قابل ہے
 اور اسے ہر وقت ہر گھڑی اور زندگی کے ہر مرحلے میں ہر زن و مرد اور ہر بوڑھے
 بچے کے پیش نظر رہنا چاہیے۔ اور اسی خیال سے میں نے اس کا ترجمہ
 حتی الامکان فصیح اور سلیس اردو میں کر کے اخلاق عزیزی کے نام سے
 شائع کر دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ روشن خیال ہر وطنوں میں سے جو صاحب
 اس کتاب کو نہ دیکھیں گے ایک نعمت عظمیٰ سے محروم رہ جائیں گے۔
 یہ کتاب دو جلدوں میں ہے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ سب چیزیں اچھی
 اور قابل پسند ہیں۔ اور قیمت دونوں جلدوں کی دو روپیہ ساڑھے ہے۔
 شایقین فوراً منگوائیں۔

المشتہر۔ محمد عبدالعزیز کورٹ انسپکٹر لاٹوش روڈ لکھنؤ

بہارِ حسن

اکثر لوگ جدید مذاق کے دھوکے میں پڑ کے اپنی ان بُرائی چیزوں کو بھول جاتے ہیں جو نہایت لطیف و نفیس و ارشادِ زیادہ فائدہ مند ہیں۔ اور تجربہ سے صحیح اصول سے ملنے والی مذاق کے مطابق تیار کی جاتی ہیں۔ خوبصورتی کے جو ہر بھاری رنگت کو کھار کے صاف کرنا اور جلد کو ملائم و نازک بنانے کیلئے اسوقت تک دنیا میں آج سے بہتر کوئی چیز نہیں ایجاد ہوئی۔ مگر کوئی کی جانت ہے کہ اپنے گھر کو چھوڑ کے باہر تلاش کرتے۔ اور اگر نیری عازنوں اور صاحبزادوں میں رو بہ صیغہ کرتے ہیں۔ حالانکہ جو بات بٹنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اور کسی طرح نہیں نصیب ہو سکتی۔ مثلاً جلد کو نہایت نازک و نفیس بنانے کا کندی رنگ پیدا کرتا ہے۔ جو بن کو نکھارتا۔ سانس لینی کی گت میں عجیب ملاحات نمایاں کرتا اور سارے پنڈے کو عجیب روح افزا معشوقانہ خوشبو سے مہکا تا ہے۔ سچ پوچھیے تو سب بڑا عمل تسخیر و توندی ہی بنتا ہے۔ کیونکہ اس کے استعمال کے بعد جس کی نظر اگر فوج پر پڑ جاتی ہے چاہتا ہے کہ دیکھائی کرے اور جو ایک گھڑی کے لیے پاس بیٹھ جائے گا چاہے کہ کہ حدیث یا س ہی بیٹھا رہے۔ مگر افسوس عمدہ بیٹا بنانا یا شکل ہے۔ لکھنؤ کا بیٹا مشہور ہے۔ مگر ہمارے کارخانے سے بٹنے کا وہ خاص نختہ نہ دیکھا ہے جو حرم سرا شاہی اور محترم ہائیکے سرا اور کسی کو نصیب نہیں ہو سکتا تھا۔ مثلاً اور صفوں کے ہمارے بٹنے میں یہ خاص صفت ہے کہ چھوڑے پھینکے نشانات اور چہرے کے بد نما دغون کو بھی دور کرتا ہے۔ قیمت فی کس جس میں آدھ یا دو بیٹا اور ایک ٹپک اعلیٰ درجے کا جمیلی کاتیل ہوتا ہے۔ عدد علاوہ محصول ڈاک۔

نمک سلیمانی سفوف دافع لرزه و نجار

اس سفر کے استعمال سے لڑھکھا میں دن میں جا رہا تھا اور اگر سات روز استعمال کر لیا جاوے تو دوبارہ نہیں کرنا اگر آپ کو نہیں کے استعمال سے بچنا چاہتے ہیں تو اسے استعمال فرمائیے۔ قیمت ۲ خوراک کی ۲ حصہ لڑاک نہیں مٹی یا ڈورڈ سے خریدار۔

اگر خراب تندرستی کی قدر جانے میں تو ایک نشیہ کی مانند
منگو کو رکھ لیجیے۔ تندرستی کی حالت میں اس کی ایک چمکی ڈالنے
کا استعمال۔ جملہ امراض سے بچا نامہ اور بیماری
کی حالت میں جودہ کی جوش کا تھون کہ دور کر دیتا ہے۔ ہر مہینہ میں
تین دفعہ نہایت مزاج بہت قیمت ۱۲

المشترک حکیم محمد سراج الحق سینیچہ کا راجہ یسین الصحت کٹرہ بن بیگ خان لکھنؤ

تاج ہیر آئل

مسٹر آرزو کے ایجاد کیے ہوئے ان مقوی دماغ اور مفرح و روح افزا تیلوں نے نہایت ہی شہرت و مقبولیت حاصل کر لی ہے جس کسی نے ایک مرتبہ استعمال کیا پھر کسی دوسرے تیل میں نہ اُسے لطف آیا۔ اور نہ وہ تفریح و تازگی روح حاصل ہو سکی جو ان تیلوں کے ذریعہ سے حاصل ہوئی تھی۔ اسی خیال سے کارخانہ روض الزیاحین نے لکھنؤ میں اسکی ایک نئی قبول کر لی جو ہمیشہ مفرح اور منتخب تیلوں کو سپلک کی ضرورتوں کے لیے فراہم کیا کرتا ہے۔

تاج ہیر آئل جو اپنی نزاکت و نفاست اور جان بخشی کے لحاظ سے نازک طبع اور نفیس مزاج ملکہ ہند تاج محل کی جانب منسوب ہیں تقویت دماغ اور فرحت افزائی میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ اور اسی لیے کارخانہ روض الزیاحین اپنے گاہکوں اور ہندوستان کے عام نازک طبع لوگوں اور ضعف دماغ کے شاکیوں کو ان نو ایجادات طبی کی طرف خاص توجہ دلاتا ہے۔

تاج ہیر آئل تین طرح کے مخصوص تیل ہیں جن میں مقوی دماغ و رغنوں میں نہایت ہی لطیف خوشبوئیں پیدا کر دی گئی ہیں۔

(۱) تاج روغن بادام بنفشہ قیمت فی شیشی ۴

(۲) تاج روغن زیتون و یاسمن - - - ۴

(۳) تاج روغن آملہ و بنولہ - - - ۱۲

ان تیلوں کی آمد و آمد باوکی نہایت خوبصورت شیشان ہمارے پاس موجود ہیں۔ درخواست آئے ہی دلیوری اسل روڈ انہ ہوگا بار داندہ مصارف ملک غیرہ ان قیمتوں کے علاوہ ہیں۔

المشتر منیجر روض الزیاحین۔ لکھنؤ کٹرہ زن بیگان



۱۹۱۳ء کا خاتمہ

اس سال کا دور بھی ختم ہونے کو آیا۔ مگر دنیا اُسی طرح سرگردان ہے۔ سقف فلک کی قندیون کو متحرک دیکھ کے اگلے سمجھتے تھے کہ ہم تو اپنی جگہ پر ٹھہرے ہوئے ہیں مگر قدرت نے ہمارے مزاج کا یہ رنگ دیکھ کے کہ ایک حالت پر قرار نہیں آتا اور کھڑی بھر کو بھی نچلے نہیں بیٹھ سکتے ہم میں سکون و مشغولیت پیدا کرنے اور ہمارے خیال کو ایک غیر کی انقلاب پذیری میں مصروف کرنے کے لیے آسمان کو ایک دھب خانوس خیال بنادیا ہے۔ مگر اب معلوم ہوا کہ چند زندہ دل تارون کے سوا سقف فلک تو اپنی جگہ پر قائم ہے خود ہمارے پاؤں میں چکر ہے۔ اور جس برقی تحریک کو ہم اپنے سروں پر تصور کیے ہوئے تھے وہ دراصل ہمارے پاؤں کے نیچے اور زمین میں ہے۔

مگر ہمارے علم و خیال میں چاہے جتنا بڑا عظیم اُشان انقلاب ہو گیا ہو مرد و ریا یام کا ظاہری سلسلہ ویسا ہی ہے جیسا کہ پہلے تھا۔ اُسی طرح صبح و شام کے رو و بدل سے دن۔ دنوں کے چکر سے ہفتے۔ ہفتے کے مروت سے مہینے۔ اور مہینوں کے دور سے برس ایسی خوشی کے ساتھ چلے جاتے ہیں کہ اکثر اُسی وقت خبر ہوتی ہے جب جاچکے ہیں۔ زمانے کا مکتوب آگے کی طرف کھلتا جاتا ہے اور پیچھے سے پلٹتا آتا ہے جو لپٹ گیا وہ گیا۔ اور ماضی کے محافظ خانے میں منقل ہو گیا اور نہیں اس سے کوئی واسطہ

نہیں رہا۔ کیونکہ وہ ہماری گرفت سے باہر ہے۔ جو حصہ آگے کی طرف کھلنے والا ہے وہ ابھی آئندہ کے دُھندلے میں ہے۔ پٹ چکنے والا حصہ گو ہماری رسائی سے باہر ہو گیا مگر اُس میں لپٹی ہوئی چیزوں میں سے بعض بعض تو ہمیں یاد ہیں آئندہ کھلنے والے حصے میں تو مطلق نہیں معلوم کہ کیا ہے۔ دھڑکا لگا ہوا ہے کہ کیا ہو گا۔ نجومیوں سے پوچھتے ہیں۔ رتالوں سے قرعہ ڈالتے ہیں۔ مرتاض و پاکبطن علماء روحانیین سے جا جاتے سوال کرتے ہیں۔ مجذوبوں کی گالیاں سنتے ہیں مگر کچھ نہیں پتہ لگتا۔ اور آخر تھک کے اور عاجز آ کے دعائیں مانگتے ہیں کہ خداوند آئندہ یہ ہو۔ اور یہ نہ ہو۔ ہماری فلاں آرزو پوری ہو۔ اور فلاں بات کی حسرت نکل جائے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اسی فکر میں روتے گڑ گڑاتے اور ناک رگڑتے رہ جاتے ہیں اور ہوتا وہی جو ہوتا ہے۔

ان دونوں جانب کے کھلنے اور پٹنے والے حصوں کے درمیان میں ”اب“ کی نہایت ہی مختصر اور تنگ وسعت ہو جس میں اتنی بھی گنجائش نہیں کہ ہم پوری طرح پلک بھی مار سکیں۔ ”اب“ کا میدان اس قدر محدود اور کم ہے کہ اُسے ہم اگر ایک نقطہ موجدوم کہیں تو غالباً بیجا نہ ہو گا۔ تنگی اور بے حقیقی میں اگر اُس کی کوئی تشبیہ ہو سکتی ہے تو وہ ہمارے شعرا کے معشوق کے دہان و کمر ہیں۔ ان دو کے سوا دنیا میں اور کوئی چیز اس قدر بے حقیقت و بے بنیاد نہ ہو گی جس قدر کہ زمانے کے مکتوب میں گذشتہ و آئندہ کے لیے ہوئے حصوں کے فیما بین ”اب“ کا میدان ہے۔ جس کا یہ حال ہے کہ ہوا کے ایک تیز جھونکے کی طرح آیا اور نکل گیا۔ اُسے اور نکل جانے والے حصوں پر نظر جمتی ہے۔ مگر ”اب“ کی رفتار اس قدر تیز ہے کہ اُس پر نظر بٹھری نہیں سکتی۔ وہ چورون کی طرح دبے پاؤں آیا۔ اور عجب مشوقانہ شوخی کے ساتھ ہمیں جھوٹے نکل گیا۔ اور ہنوز خبر بھی نہ ہونے پائی تھی کہ ہم سے دُور اور گذشتہ کی ہیئت میں آچکا تھا۔

لیکن خدا کی قدرت کا تماشا جیسا اس مختصر ”اب“ کی معجز نمایوں میں نظر آتا ہو کسی چیز میں نہیں نظر آ سکتا۔ باوجود اس اختصار و ہریت بلکہ کادیت کو دنیا میں جو کچھ ہوا ہے اسی ”اب“ میں ہوا ہے۔ اور ہمیں اور ساری دنیا بلکہ سارے عالم مخلوقات کو

جو کچھ ملا ہے "اب" ہی کی معرفت ملا ہے۔ غور سے دیکھو تو تخلیق کا نفس طلسمی اور عالم ہستی کی کنبی یہی ادب ہے۔ جو کچھ ہے "اب" ہے۔ اور جو "اب" نہیں وہ دراصل نہیں ہے۔ غیر ممکن ہے کہ کوئی چیز ہو اور "اب" نہ ہو۔ اسے سراپا اعجاز "اب" تو ہی تو خدا کا وہ کلمہ "کن" نہیں جس نے سارے عالم ہستی کو پیدا کیا ہے؟

آہ! "اب" امید کو یاس اور یاس کو امید بنانے والی مسیب و محسب "اب" تجھ میں بُری پہلی سب طرح کی باتیں ہیں۔ تو ہی مراد بر لاتی ہے۔ تو ہی نامراد کرتی ہے۔ تو ہی خوشی دیتی ہے۔ تو ہی رنج دیتی ہے۔ تو ہی ہنساتی ہے اور تو ہی رُلائی ہے۔ کاش تجھے قیام ہوتا۔ کبھی تیرا دامن ہمارے ہاتھ میں آجاتا اور ہم ایک گھر میں کے لیے روک کے اتنا دیکھ لیتے کہ تیری صورت کیسی ہے؟ تیرے طلسمی چہرے میں کیا بات ہے کہ اُس پر کسی کی نظر نہیں ٹھہرتی؟ اور تجھ میں کون سا جادو کوٹ کوٹ کے بھریا گیا ہے کہ تیری نہ نگہیں سارے عالم تخلیق کو حیران کیے ہوئے ہیں۔ تو ہمیں شاہد آرزو سے ہم کنار کرانی ہے مگر تون تک ستاسا کے اور ڈھکا ڈھکا کے۔ تو ہمیں ہوم و غم میں مبتلا کرتی ہے مگر برسوں تک امید کی بھارے دے دے کے اور خوشی کے خواب دکھا دکھا کے۔

لیکن "اب" میں جب رنج و راحت کے یہ دونوں تساوی اور متضاد پہلو موجود ہیں تو پھر یہ ہیں اچھی اور دلچسپ کیون معلوم ہوتی ہے؟ ہمارے دل میں اس کا اشتیاق کیون ہے؟ اس کے شوق میں آئندہ کے تیرے وتار عالم ظلمات کی طرف ہماری نظر کیون لگی رہتی ہے؟ اور جب یہ آنکھ بچا کے گزر جاتی ہے تو اس کے پانے یا کم سے کم چھو لینے کی دُھن میں ہم کمال از خود رفتگی کے ساتھ گزشتہ کی فکر کی طرف کیون رخ کر کے کھڑے ہو جاتے ہیں جبہ اگر ذرا بھی قدم بڑھایا تو کا رخا نہ قدرت کے پہرے والے ڈپٹ کے کہتے ہیں "تادب"۔ اگرچہ یہ شوخ اور چلبلی "اب" ایک معشوقہ طرار کی طرح سامنے ہے مکمل گئی ہے مگر اصل میں یہ کوئی محبوبہ شیریں ادا نہیں کہ عشاق دلدادہ کی طرح ہمیں اُس کے وصال کا انتظار ہو۔ یا شاعر دن کے شل اپنا ہاتھ سے کھویا ہوا دل اُس کی زلف سے چھڑانے کے لیے ہم اُس کے پیچھے دوڑیں؟ پھر آخر ہم اس کے لیے کیون بیکار ہیں؟ کیون مستقبل کے چھانک کے سامنے اُس کے شوق میں آغوش شوق کھولے کھڑے ہیں؟ اور کیون اُس کے گزرتے ہی ماضی کے دردازے کی طرف حسرت سے دیکھ کے اور

ہاتھ مل کے رہ جاتے ہیں ؟

صرف اس لیے کہ "امید" "اب" کے آغوش میں پلتی اور "اب" ہی کے ہاتھ سے ہمیں ملتی ہے۔ وہ امید کہ جس کی نسبت لوگ کہتے ہیں کہ "دنیا بامید قائم" مگر ہم کہتے ہیں "ہماری دنیا ہی امید ہے"۔ بس یہی شوق ہے جو ہر حال میں اور ہر طرح کی مصیبتیں پھیلنے پر بھی ہمیں اس بے وفا "اب" کی طرف سے بدظن نہیں ہوسنے دیتا۔ یہ "اب" ہمارے ساتھ جو چاہے کرے ہم اُس کے شدید ہی بنے رہتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ اس کے ایسے پُر امید رشتے سے ہمارا ساتھ چھوٹے۔

اسی قدر نہیں۔ ہمیں نظر آ رہا ہے کہ ہماری زندگی اور ہستی بھی "اب" ہی کے ساتھ ہے۔ ہم اُسی وقت تک ہیں جب تک "اب" ہے۔ اور جب "اب" نہ ہوگی ہم بھی نہ ہوں اگرچہ یہ سوتہ نہیں سمجھ میں آتا کہ "اب" کے اس غلبت کے ساتھ گزر جانے کے بعد ہم زندہ کیوں ہیں بلکہ یہ سمجھ بھی اگر اپنی زندگی کو "اب" سے اس قدر وابستہ دیکھ کے ہم اس بات کی کوشش کریں کہ "اب" کو روک کے اپنی عمر بڑھائیں۔ اور اُس کے تنگ اور نہایت محدود دامن سے اپنی آرزوؤں کو زبردستی چھین لیں تو ہمیں معذور خیال کرنا پڑے گا کہ غیر ممکن تھا کہ یوں "اب" کو وفاداری و قیام کا سبق دیا جاسکے لیکن ہماری ہوس نے یہ خیال پیدا کر لیا اگرچہ "اب" کا دامن فی الحقیقت وسیع نہ ہو سکے گا مگر ہمیں تو اُس میں اپنے مذاق و مقاصد کے مطابق وسعت نظر آجائے گی۔

اسی پہلو کو پیش نظر رکھ کے ہم نے زمانے کو دونوں - ہفتوں - مہینوں - برسوں - اور صدیوں پر تقسیم کر لیا۔ اور اُن میں سے ہر ایک کو جس میں "اب" کی موبہوم گھڑی واقع ہو "موجودہ" کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ غور سے دیکھو تو اُن میں ایک نہایت ہی مختصر موبہوم گھڑی تو اب ہے باقی جو کچھ ہے گزشتہ اور آئندہ کی لپیٹ میں آیا ہوا ہے۔ مگر چونکہ وہ مبارک گھڑی ان کے آغوش میں ہے اور ان کے سبب سے ہمیں "اب" کا پُر امید دامن زیادہ وسیع اور پھیلا ہوا نظر آتا ہے اس لیے ہم ان سب کو موجودہ کے لفظ سے تعبیر کر کے اپنا دل خوش کر لیا کرتے ہیں۔

رخصت ہونے والا سال ۱۳۱۲ء بھی انہیں برسوں میں سے ہے جنہیں اُن کے گزرنے کے زمانے تک ہم "موجودہ برس" یا "اب کا سال" کہتے رہے۔ اور اُن کے ذریعے سے

اپنی بے ثبات زندگی کو بارہ مہینوں تک کی وسعت دے لی۔ یا یوں کہیے کہ اپنے دل کے ہبلانے کو اسے ایک دھوکے کی ٹٹی بنایا تھا۔ مگر افسوس زمانے کو ہماری اتنی تسلی بھی منظور نہیں۔ اور یہ سلسلہ ۱۹۱۳ء کی ٹٹی بھی ہم سے چھینی جاتی ہے۔

ہم نے کیا۔ خود دنیا نے اپنی ساری زندگی میں کوئی ایسا سال نہ دیکھا ہوگا جو صرف بُرا یا صرف بھلا ہو۔ ہر برس اپنے ساتھ خوشیاں بھی لاتا ہے اور رنج بھی لاتا ہے۔ اور اُس کے دور میں ہماری حالت ہر روز نئی ہوتی ہے۔ کبھی نہایت ہی مسرور و شاد کام ہوتے ہیں۔ اور کبھی بہت ہی غموم و مبتلاے آلام۔ ختم سال پر پہونچ کے پیچھے کی طرف دیکھنے اور یاد کرنے سے اس بات کا فیصلہ البتہ کیا جاسکتا ہے کہ اب کی سال بہنِ حد سے زیادہ پہونچے یا خوشیاں زیادہ نصیب ہوئیں اور اسی پر برسوں کے اچھے یا بُرے ہونے کا دار تکڑا جاتا ہے۔

اسی اصول کے مطابق اگر ہم اس وقت توجہ سے دیکھ کے اس قریب الختم سلسلہ ۱۹۱۳ء کے حالات پر غور کریں تو ماننا پڑے گا کہ بعض شکایات کی وجہ سے ہمارا جوش و خروش اس سال چاہے ہمیشہ سے بڑھ گیا ہو مگر قریب ہی کے گورے پونے ماقبل برسوں کے دیکھتے یہ سال اچھا تھا۔ ۱۹۱۳ء جب شروع ہوا تھا مشرق و مغرب کی زمینیں ہنگاموں سے بھری ہوئی تھیں۔ اور دنیا نہایت ہی خطرناک حالت میں نظر آتی تھی۔ مشرق اقصیٰ میں چین، بنگا و تون اور ہنگاموں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اور مغرب میں دولتِ عثمانیہ کی انتہا سے زیادہ نازک حالت تھی۔ ۱۹۱۲ء کی گورے کو اس طرح ذبح کر کے گیا تھا کہ اس اسلامی بسل کے جان برہونے کو کوئی امید نہ نظر آتی تھی۔ جس کے غم میں مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک ساری اسلامی دنیا سو گوار تھی۔ اور سچ یہ ہے کہ مسلمانوں کی نظر میں دنیا تیرہ دتار اور زندگی و شوار تھی۔ ڈر رہے تھے کہ دیکھیے یہ نیا سال کونسی آفتیں اور مصیبتیں اپنے ساتھ لاتا ہے۔

مگر تجربے سے معلوم ہو گیا کہ ہمارے حکمران و اشراف و اہل دولت و دولت مند کی طرح قضا و قدرت کے دربار سے برس بھی کبھی گرم کیجے جاتے ہیں اور کبھی سرد۔ چنانچہ اسی سلسلہ ۱۹۱۳ء نے تجربہ کرا دیا کہ سلسلہ جو خدادید ہنگامے پیدا کر گیا تھا اُن کو اس سلسلہ ۱۹۱۳ء نے بہت کچھ رفع کیا۔ اس صدی کے اندر قسمت کے ہاتھ سے نفع اٹھانا تو ٹر کی کمانی

شاید کسی ایشیائی مملکت کی قسمت میں نہیں ہے۔ اور اس رستخیز میں جبکہ آفتاب نے (وہ تہذیب و علم و فضل ہی کا کیون نہ ہو) مغرب سے طلوع کیا۔ اور اہل مشرق کے لیے دروہ بھی بند ہو چکا تھا ایشیا و اٹلان کو کسی فلاح کی امید رکھنا بالکل بے سود ہے مگر گر پڑ کے سنبھل جانا اور دست برد زانہ سے بچ جانا بھی موجودہ حالات کے دیکھتے ہم اہل مشرق کے حق میں نعمت غیر مترقبہ ہے۔ اور یہی نعمت اس سال کی برکتوں سے ٹر کی کو نصیب ہوئی۔ یا تو اندیشہ تھا کہ تنظیمیہ بھی علم توحید کے نیچے سے جاتا ہے۔ اور سنت صوفیہ کے گنبد پر پھر تثلیث کی صلیب نصب ہوا چاہتی ہے۔ ایشیائی مقبوضات کا بچنا بھی دشوار ہے۔ اور حرمین کی آزادی میں بھی فرق پڑ جانے کا اندیشہ ہے۔ کیونکہ کامل پاشا کی وزارت دلت کے ساتھ سلطنت کو ہاتھ سے دے رہی تھی۔ اور ایڈریا نوپل کو اگرچہ ساری دنیا کے مسلمان نہیں دینا چاہتے تھے مگر خود ترکی کینیٹ دینے کو تیار تھی۔ یا تو یہ مایوسانہ حالت تھی یا یکایک چند بہادر حامیان وطن نے اٹھ کے ایک دم میں کچھ سے کچھ کر دیا۔ نہ تو ذلیل وزارت عثمانی تھی اور نہ وہ پستی و حقارت۔ اگرچہ بگڑی ہوئی حالت کا سنبھالنا دشوار نہ تھا مگر یہ بھی کم نہیں کہ چند فوئز بہادروں نے قومی تاریخ کی آبرورکھی اور دولت عثمانیہ اس سخت دلت کی صلح سے بچ گئی۔ ابتداءً اگرچہ ایڈریا نوپل کو حرمین کے حملوں سے نہ بچا سکے۔ مگر اس پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ اور گولک کا بہت بڑا حصہ نکل گیا مگر ایڈریا نوپل کے مل جانے سے ایک بات رہ گئی۔

بے شک جزیرہ نماے بلقان میں اس سال سال گذشتہ سے زیادہ خونریزی ہوئی۔ اور لاکھوں ہندکان خدا قتل ہو گئے۔ مگر سچ پوچھیے تو یہ سلسلہ کی کارستانیوں کا نتیجہ تھا۔ سنہ حال نے اول ہی سے اصلاح کی بنیاد ڈالنا شروع کی۔ اور اس میں اس قدر کامیاب ہوا کہ جاتے وقت دولت عثمانیہ کو نہایت ہی امن و خاموشی کی حالت میں چھوڑے جاتا ہے۔ وہیں نہیں آج چین میں بھی امن ہے۔ اور اُن دنوں مشرقی و مغربی دول ایشیا کو سلسلہ ۱۹۱۳ء موقع دیے جاتا ہے کہ اگرچے قومی جوش اور حقیقی اشیاء نفس سے کوشش کریں تو اپنے آپ کو سنبھال لے جائیں۔ ٹر کی پر سب سے بڑا احسان اس سال کا یہ ہے کہ کامل پاشا کے ایسے ملک و ملت فردش کو اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ جس سے بڑا خطرناک دشمن ٹر کی کے لیے کوئی نہ ہو سکتا تھا۔ کامل پاشا کی

سوت پڑی کو ستمبر ۱۹۱۳ء کا نہایت ہی شکر گزار ہونا چاہیے۔ مگر اصلی شکر گزاری یہ ہے کہ ترکان اہل عثمان میں پھر ایسے قومی نمکھرام نہ پیدا ہوں۔ ترکی میں ہمیں جو چیز سب سے زیادہ خطرناک نظر آتی ہے وہ یہی ہے کہ ان میں اور انھیں پر موقوف نہیں سارے ایشیا میں ایسے بہت سے کامل پاشا پیدا ہو سکتے ہیں۔

مسلمانان ہند میں ستمبر ۱۹۱۳ء میں کانپور کی مسجد کا ایک نہایت ہی ناگوار واقعہ پیش آگیا تھا۔ جس نے انھیں ایک مدت تک نہایت ہی مشتعل رکھا۔ مگر اسی سال نے اس جھگڑے کو نہایت ہی کامیابی و خوش اسلوبی کے ساتھ رفع و دفع بھی کر دیا۔ اور اب جاتے وقت ہمیں ہر طرف سے نہایت ہی مطمئن چھوڑے جاتا ہے۔

دُلکداز کے ساتھ بھی اس کا سلوک قابل شکر گزاری رہا۔ جس کی انتظامی حالت اب بفضلہ تعالیٰ اچھی ہے۔ اور امید ہے کہ آئندہ سال میں وہ بہت نمایاں ترقی کرے گا۔ ناول "حسن کا ڈاکو" جو ستمبر ۱۹۱۳ء کے خریداروں کی نذر کیا گیا تھا اس کا دوسرا حصہ بھی خریداروں کی خدمات میں پہنچ گیا اور پسند کیا گیا۔ چونکہ اس ناول سے اکثر بے محبت و اہلیان ملک کی اچھی تادیب ہوئی ہے اس لیے اکثر حضرات مصرعین کہ اس ناول کا سلسلہ "اسرار و بار حرام پور" کے نام سے جاری رکھا جائے۔ مگر سروسٹ ایسے بے محبت ذمہ داران بنی نوع انسان کے لیے اسی قدر سزا کافی ہے۔ تاہم اپنے احباب کے اصرار سے ہم نے ان صداقات کو جو مختلف مقامات سے روز بتائے جاتے ہیں اور ہمارے پاس کثرت سے پہنچ رہے ہیں ترتیب سے جمع کرنا شروع کر دیا ہے۔ اگر ضرورت پیش آئی اور مناسب معلوم ہو تو انھیں زیادہ خوبی و تفصیل کے ساتھ آئندہ شایع کرتے رہیں گے۔ مگر دُلکداز کے خریداروں کو آئندہ اس ناول کا کوئی جز نہ دیا جائے گا۔ بلکہ علیحدہ شایع ہوگا۔

ستمبر ۱۹۱۳ء کے خریداروں کے لیے ایک نیا اور بہت اہم تاریخی ناول جس کا نام "رومۃ الکبریٰ" ہے زیر طبع ہے۔ اس میں تاریخِ روم کے ساتھ رومیوں کی معاشرت اور ان کی وہ زوال پذیری کی حالت نہایت ہی دلچسپی کے ساتھ دکھائی گئی ہے جب رومیوں نے پُرانا مذہب بت پرستی چھوڑ کے دین مسیحی اختیار کیا تھا۔ اور قوم "گوٹھ" کے فرمان روا "الارقی" نے رومۃ الکبریٰ کو تباہ کیا تھا۔ تاریخِ روم کے شایع اس

نادول میں رومی عہد کی جیتی جاگتی تصویریں دیکھ لیں گے۔ اور چودہ پندرہ صدی پیشتر کاروتہ الکبرنی اُن کی ستیہ آنکھوں کے سامنے پیش ہو جائے گا۔
اس نادول کے متعلق کوشش ہو رہی ہے کہ جنوری ۱۹۷۱ء ہی میں تیار کر لیا جائے
لیکن اگر نہ ہو سکا تو فروری کے آخر تک اُس کے فی پھر یا پھر کے وی۔ پی جن کے ذریعے
سے ۱۹۷۱ء کی قیمت وصول کی جائے گی قدر دان و حوصلہ افزا ناظرین دنگاز کی
خدمات میں حاضر ہو جائیں گے۔

گنگا کنارے کا پُرانا برگد

بڑے عاقل کے وقار و ملکیت سے خاموش کھڑا ہے۔ اگرچہ ایک بلند ٹیلے پر ہے۔ اور
اسکی چوٹی کو سون سے دکھائی دیتی ہے مگر اپنی عزت گزینی کے لیے اس نے ایسا خاموش
اور سناٹا مقام اختیار کیا ہے جہاں آبادی کا کو سون پتہ نہیں۔ اُس کے سائے میں ایک
چھوٹی سی ویران مسجد ہے۔ ایک مختصر سا اُجاڑ شوالہ ہے۔ اور چند اور عمارتوں کے
منہدم و شکستہ آثار ہیں جن کو دیکھ کے کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ آیا کسی کے رہنے کے
مکان تھے؟ خانقاہ تھے؟ ٹھاکر و دارے تھے؟ کیا تھے؟ ہاں مسجد کے متصل چند
پُرانی قبریں ہیں جن میں سے بعض اپنی حالت پر قائم ہیں اور بعض مٹ رہی ہیں۔ جس سے
اندازہ ہی نہیں یقین ہو جاتا ہے کہ بہت سی مٹ بھی گئیں۔ لیکن اتنا اطمینان ضرور ہے
کہ سیہ مستان خواب فنا کا پورا ساتھ دے کے اور اُن کی پڑیوں تک گئے تھل گئے
خاک ہو جانے کے بعد مٹی ہیں۔

دن کو اکثر گڑیوں کے لڑکے اپنی بھڑ بکریوں کے ساتھ اس پرانے گھنے درخت
کے سائے میں اُکے بیچتے۔ کھیلنے کودتے۔ اور بفکری کے گیت گاتے ہیں۔ اُن کی
بکریاں اور بھڑیں ادھر ادھر دوڑ کے چرتی۔ ٹیلے کے دامن پر جولانیاں دکھاتی۔
اور نیچے اُتر کے گنگا کے پانی سے سیراب ہوتی ہیں۔ اس کی ٹہنیوں پر اور بڑے بڑے
پتوں کی چٹنوں میں صد ہا طیور اور گلہریاں۔ اور ہزار ہا قسم کے حشرات الارض آواز
سے جھپے بیٹھے ہیں۔ جو ہر صبح، شام کو اپنے مستانہ نغموں سے ساکنان کو غریبان کے

مسکون پر نوبت بجایا کرتے ہیں۔ مگر رات کا اندھیرا ہوتے ہی سب کے سب نہایت ہی خموشی و سکون کے ساتھ اپنے نشیمنوں میں غائب ہو جاتے ہیں اور اُس وقت شب زندہ دار اُتو جو دن کے شور و ہنگامے سے کول کے اندر سرگ کے روشنی سے بہت دُور پر جا کے مصروف مراقبہ ہو گیا تھا باہر نکل کر خاموش دنیا اور سنسان عالم پر نگاہ عبرت ڈالتا۔ اور اپنے تجربے سے گردن باہر نکال کے ہوا بھائی کی ضربیں اور زخموں لگانا شروع کرتا ہے۔

کیا دنیا کے پردے پر اس سے زیادہ عبرت ناک منظر کوئی اور بھی ہے یا اور یہاں کی خموشی سے بڑھ کے بھی کوئی پُر معنی اور مضمون خیز کتاب ہو سکتی ہے یا ہرگز نہیں۔ اس چھوٹے اور محدود عالم میں ایک غیر محدود خلقت آباد ہے۔ جو اپنے شور و ہنگامے سے زندگی و زندہ دلی کا اور اپنے سکوت و سکون سے ہماری ہستی مہیوم کی بے ثباتی و بے استقامتی کا ثبوت دیتی رہتی ہے۔

خدا جانے یہ پُرانا درخت کب سے یہاں گنگا کا پوجاری بنا کھڑا ہے۔ اور عالم کی نیرنگیوں کے کیسے کیسے تماشے دیکھ چکا ہے۔ طیور کا جو عالم اس پر بسا ہوا ہے خدا جانے کیا کیا انقلابات دیکھ چکا ہے۔ اس عالم میں طوفان آئے ہیں۔ آندھیاں چلی ہیں۔ قیامتیں ہوئی ہیں۔ اور بڑے بڑے ہنگامے بپا ہوئے ہیں۔ زندگی و موت کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔ خدا جانے کتنے ایک اور کیسے کیسے خوبصورت طیور اس کی ٹہنیوں میں پل کے بڑے ہوئے ہیں۔ اور یک بیک کمال بے اُسنی اور بے پروائی کے ساتھ بچپن کے دوستوں اور طفولیت کے رفیقوں سے رخصت ہو کے چلے گئے ہیں۔ یہی وہ صحرا کا درخت تو نہیں جس کی پُر عبرت تاریخ کا ایک عکرا نظیر اکبر آبادی نے اپنی نظم ”میں نامہ“ میں اس تمہید سے بیان کیا ہے کہ

آیا تھا کسی شہر سے اک نہیں بکارا اک پیڑ پہ صبح اُکے کیا اُس نے گزارا

لیکن چاہے یہ وہی درخت ہو یا کوئی اور اس میں شک نہیں کہ اس پر روز و رے ہی ہنگامے چلے رہتے ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ جو مخلوق اس نباتی عالم میں آباد ہے نہایت ہی ستین و مضابط ہے۔ اور ہماری طرح ادنیٰ ادنیٰ سی باتوں پر آپے سے باہر نہیں ہو جاتی۔ یہاں بھی روز و لائوتین ہوتی ہیں۔ اور اس دنیا میں بھی روز و

بازار مرگ گرم رہتا ہے۔ مگر ہمارے گھرون کی طرح نہ بیان ولادت پر اُھول بجتی ہے۔ اور نہ موت پر شور ماتم بلند ہوتا ہے۔ دنیوی مسرت و اطم پر یہ لوگ ہم سے زیادہ فلسفیانہ نظر ڈالتے ہیں۔ اور ہم سے بدرجہا زیادہ بے پرواہ ہیں۔ وہ اپنی مخلوقیت کے راز اور ”فعل الحکیم لا یخلو عن الحکۃ“ کے فلسفہ کو بخوبی سمجھ گئے ہیں۔ اور قدرت کی دست بُرو پر دم نہیں مارتے۔ نہ کبھی کوئی کلمہ شکایت اُن کی زبان سے نکلتا ہے۔ اور نہ کسی تکلیف پر اُن کرتے ہیں۔

لیکن جو عالم اس مرتع عبرت درخت کے اندر واقع ہے اُس سے قطع تعلق کر کے اگر اُس چھوٹے سے شرخا سوشان کے حالات پر نظر ڈالیے جو اس کے سایے میں اور اس کے آس پاس ہے تو خدا جانے کیا کیا باتیں خیال میں آجاتی ہیں۔ خود اس سے پوچھو تو کچھ نہ بیان کرے گا۔ کیونکہ مقدس رُود گنگا کُنار کھڑی ہو کر یہ سدا پڑ خالق بے ہمتا کے تسبیح و تلیل کر کوئی اور بات گناہ سمجھتا ہے۔ اور اپنی خالق سے باتیں کرنے میں اس قدر محو اور اس درجہ مصروف ہو کہ ہماری نہیں سنتا۔ لیکن اس کا ہر ہر بہتہ تاریخ کا ایک ورق ہے۔ اور اس کے دامن میں اگلے خلائق کی تصویریں نظر آرہی ہیں حقیقت میں نظر آ رہی ہیں۔ مسجد مندر قبرین۔ منہدم مکان کے آثار کہہ رہے ہیں کہ کبھی یہاں آبادی تھی۔ یہ لوگ جو ان ٹوٹی قبروں میں سو رہے ہیں کبھی زندہ تھے۔ اس درخت کے قریب رہتے اور گرد و پیش کے میدانوں میں چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔ مسجد میں اذان ہوتی تھی۔ اور شوالے میں ناقوس بجاتا تھا۔ خدا پرستی کے دونوں عنوان زندہ تھے اور ایک دوسرے سے ربط و اُنس رکھتے تھے اگرچہ مذہب و اعتقادات میں باہمی اختلاف تھا مگر نہ لڑائی تھی نہ جھگڑا جس کا اس سے زیادہ واضح ثبوت کیا ہو گا کہ دونوں کو عبادت خانہ جو ایک دوسرے کے جوار میں تھے اپنی اصلی حالت پر قائم ہیں اور سلف کی تبرکات کی شان سے ہم تک پہنچے ہیں۔ جو ہندو مسلمان اس پُرانے برگمہ کے آغوشِ فناء میں سو رہے ہیں اپنے عہد میں ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے۔ اور مختلف المذہب پڑوسیوں کو شائنا اُن کے اصول اخلاق سے ناجائز تھا انہیں کہیں دُور لیجا کے اپنا معبد بنانے کا خیال نہ تھا بلکہ چاہتے تھے کہ ایک دوسرے کے پہلو پہلو کھڑے ہو کے اپنے خدا کی پرستش کریں۔ ممکن ہے کہ آج کل کے

زہریلے اثر سے وہ بھی متاثر ہو جاتے۔ اور لڑ جھگڑ کے ایسا قانون بناتے کہ ایک فریق کا معبد الہی دوسرے فریق کے معبد کو دور ہو۔ مگر خدا نے ایسے پُر فتن زمانے کے شروع ہونے سے پہلے ہی انھیں اپنے پاس بلالیا۔ اُن کے معبد ہیں۔ اور حال کے تعمیر معابد کی طرح معرکہ آرائی اور جنگ و پیکار کے قلعہ ہونے کے عوض خالص عبادت کرے ہیں۔ اس لیے کہ انھیں خاموش اور سناں پڑا رہنا پسند ہے اور یہ نہیں گوارا کہ جھگڑاؤ نازیوں اور پوجاریوں کے معبد ہیں۔ موجودہ سیاحتیہ منش عابدوں کو بھی یہ سادے اور بے شر معبد نہیں پسند ہیں۔ وہ اپنے لیے نئے مذاق کے معبد بنائیں گے مگر ان میں نماز گزار ہی کے لیے نہ جائیں گے۔

آہ! اس زمانے کے لوگ چاہے اُن کی بے شرمی کی زندگی اور اُن کے صلح جوئی کی مذاق کو نہ پسند کرتے ہوں مگر ہمیں اُن کی اگلی بے آزار زندگی پر بھی حسد آتا ہے اور ان کی بعد مرگ کی اس خاموش زندگی پر بھی۔ خیال کرو کہ جب وہ زندہ ہوں گے اور یہ مکانات آباد ہوں گے تو اُن کے باہمی انس و محبت نے اس مبارک خط زمین کو مسرت و شادمانی کا کیسا پُر لطف مامن بنا دیا ہو گا۔ یہاں کے ہندو مسلمان خلوص اور صاف دلی کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ ملتے جلتے ہوں گے۔ اور کسی کا کوئی کام بغیر دوسرے کی مدد اور شرکت کے پورا نہ ہوتا ہو گا۔ اور جب دنیوی کاروبار سے فرصت ملتی ہو گی اُس وقت دونوں نہایت ہی اخلاقاً نہ رفق و دوست کے ساتھ ایک دوسرے سے جدا ہو کے خدا کی عبادت کے لیے اپنے اپنے معبدوں میں چلے جاتے ہوں گے۔ اور جس طرح طیور اس برگد کی ٹہنیوں پر بیٹھ کے بقول فیضی فیاضی

مرغان سحر بہر صبا سے خواند ترا بہ اصطلا سے

اپنے جدا جدا فنون سے خدا کو یاد کرتے ہیں یہ دونوں گروہ اپنی اپنی وضع اور اپنے اپنے مذاق میں اُس خالق بے ہمتا کی عبادت کرتے ہوں گے۔ نہ ان کی آواز اُن کو ناگوار ہوتی ہو گی اور نہ ان کا سنگھ ان کو مشتعل کرتا ہو گا۔ زندگی بھر ساتھ دینے کے بعد مرنے میں بھی دونوں نے ساتھ دیا۔ اور اسی درخت کے نیچے ایک گی ہڈیاں آغوشِ لحد کے سپرد کی گئیں اور ایک کی خاک کو گنگامائی

نے مادرِ شفقت کی طرح اپنی تبرک گو دین لے لیا۔
 غرض دونوں مبارک زندگیاں بسر کر کے چلے گئے۔ اور جو سلامتِ رومی کی وضع
 اختیار کی تھی اُسے دمِ دایمین تک نباہ گئے اور اپنی باقیہ الصالحات کے ذریعے
 سے آج تک نباہ رہے ہیں۔ افسوس ہے تو اس بات کا کہ ہم اور ہمارے زمانے
 والے نہ اُن کی مبارک زندگیوں سے سبق لیتے ہیں اور نہ اُن کی قبروں پر جا کے
 دُعا سنبھالتے اور فاتحے کو ہاتھ اٹھاتے ہیں۔

مسجد ایا صوفیہ

قلاؤئوس والیرئوس نے جو تاریخِ مین قسطنطین اعظم کے نام سے مشہور ہے جب
 اپنے حریف اور شریکِ سلطنت لی تیئوس کو ۳۲۳ء میں یعنی ولادتِ سرورِ کائنات
 صلی اللہ علیہ وسلم سے ۲۲۴ برس پیشتر شکست دے کے قتل کیا۔ اور بلا شرکت
 غیرے قیصرِ روم قرار پا کے رومۃ الکبریٰ میں داخل ہوا تو اہل روم جو بت پرست تھے
 اور اپنے شہر کی پوجا کیا کرتے تھے قسطنطین کے جھنڈوں اور ہر قون پر بجاے
 عقاب کے صلیب کو اور اُس کے ہاتھ میں بھوض سپٹر (عصاے شتاہی) کے ایک
 صلیبی چھڑی کو دیکھ کے اس قدر برا فرختہ ہوئے کہ نہ بچے دل سے اُس کا استقبال
 کیا اور نہ اُس کی مشابعت میں ویسی گرجوشی دکھائی جیسی کہ قیصرہ کے داخل
 کے وقت ظاہر کیا کرتے تھے۔ اہل روم کے اس سلوک نے قسطنطین کو خود رومۃ الکبریٰ
 کا دشمن بنا دیا۔ اور وہ اس فکر میں ہوا کہ اپنا دارِ اسطنت روم کے علاوہ کسی
 اور شہر کو قرار دے۔

قسطنطین نے اپنی کامیابیوں میں ہمیشہ الہامی و عوون سے کام لیا تھا۔ اپنے
 حریف لی تیئوس کے مقابل صف آرا ہوتے وقت اُس نے اپنی فوجی قوت کو ضعیف
 اور حریف کے لشکر کو زبردست پا کے اور یہ دیکھ کے کہ لی تیئوس اور دیود
 کے جانی دشمن عیسائی ہیں جن پر طرح طرح کے ظلم ہو رہے تھے اپنی روحانی آنکھوں
 سے آسمان پر نورانی صلیب دیکھی تھی۔ اور اُسی رات خواب دیکھا تھا کہ

حضرت مسیح نے باوجود انہی کے کہ وہ عیسائی نہ تھا اُسے ایک صلیبی جھنڈا دیا اور فرمایا کہ "جا اس جھنڈے کو لے کے اپنے دشمنوں سے مقابلہ کر۔ جس کا یہ اثر تھا کہ سارے عیسائی اُس حضرت عیسیٰ کے دیے ہوئے جھنڈے کے نیچے کھڑے ہو گئے۔ اب اس موقع پر اُس نے رومہ الکبریٰ کی عداوت میں دوسرا یہ خواب دیکھا کہ خدا اُس سے کہتا ہے کہ "جا اور بیزان طیوم کو اپنا دار السلطنت قرار دے کے از سر نو آباد کر۔"

بیزان طیوم جس سے موجودہ قسطنطنیہ مراد ہے ایک پُرانا شہر تھا جو لوگوں کے لیے ایشیا سے یورپ میں اور یورپ سے ایشیا میں آنے کی پُرانی گزرگاہ تھا اور بری و بحری دونوں حیثیتوں سے نہایت عمدہ موقع پر واقع تھا۔ قسطنطین نے اُسے آکے دیکھا تو اُجاڑ اور ویران پایا۔ فوراً اپنا خواب پورا کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ اُس کی تعمیر شروع کر دی۔ اور تکمیل میں اس سرگرمی سے متوجہ ہوا کہ خلافت امید چند ہی روز میں ہر طرف صد ہائی عالیشان عمارتیں بنا کے کھڑی کر دیں اور تیار می کے بعد "نیارو" نام رکھ کے اُسے اپنا دار السلطنت قرار دیا۔ مگر زمانے کے دربار نے اُس کے مجوزہ نام کو نامناسب قرار کر کے "قونستانتینوپولس" نام رکھ دیا جسے بگاڑ کے انگریزوں نے کانستینٹی نپول اور عربوں نے قسطنطنیہ کر دیا۔

ان دنوں مغربی شہروں کا زیور بت خانے اور دیوی دیوتاؤں کے مندر اور استھان سمجھے جاتے تھے اس لیے قسطنطین اعظم نے بھی اگرچہ مسیحیوں کی طرف بے انتہا رجحان رکھتا تھا اپنے اس نئے شہر کی رونق بڑھانے کے لیے بجائے اس کے کہ اُس میں کوئی گرجا تعمیر کرائے جا سکا ایک عالیشان مندر بنوائے۔ جن میں دیویوں کی مورتیں رکھوائیں اور کئی معبد غیر مجسم روحانی قوتی کے نام سے بھی تعمیر کرائے جن میں سے ایک یہی مسجد ایا صوفیہ تھی جسے اُس نے بڑے اہتمام سے بنوائے وہاں کی روحانی دیوی "صوفیا" کے نام سے رکھ دیا تھا۔

قسطنطین اعظم کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اُس نے مرتے وقت مسیحیت کا پتہ لے لیا تھا۔ لیکن اُس کے مذہب کی نسبت بہت سوچ سمجھ کے اور اُس کی حالات پر غور کر کے کوئی رائے قائم کرنی چاہیے۔ اُس کے حالات اور اُس کے طبعی رجحان سے معلوم

ہوتا ہے کہ اُس کا پولیکل مذہب مسیحیت ضرور تھا۔ اور مرتے وقت ہی نہیں شروع ہی سے اُس نے مسیحوں کی طرف داری اور مسیحیت کی حمایت کی پالیسی اختیار کر لی تھی۔ جس کے نتیجے میں وہ اپنے تمام حریفوں کو پامال کر کے ساری مغربی دنیا کا شہنشاہ بن گیا۔ اور مسیحیوں کا اُس پر یہ ایسا احسان تھا کہ اس کے معاوضے میں اُس نے اُن کو قوت دی۔ ہر جگہ انھیں تبلیغ دین اور آزادی کے ساتھ اپنا مذہب پھیلانے کا موقع دے دیا۔ اُن میں مملک مذہبی اختلافات دیکھ کے نیقہ کی کونسل شاہانہ ترک و احتشام سے منعقد کرا کے مسیحیت کو ایک مضبوط اور باقاعدہ مذہب بنا دیا۔ اور وہ "نقیح کرید" عقائد نیقوی مدون کر دیئے جو آج تک کیتھولک مسیحیت کے معتقد علیہ ہیں۔ مگر یہ جو کچھ ہوا قسطنطین اعظم کی خوش اعتقادی یا دینی سرگرمی کے تقاضے سے نہیں بلکہ سب مسیحیوں کے احسانات کا بدلہ تھا۔

سچ پوچھیے تو اپنی ذات سے وہ پُرانے عقائد کا بت پرست ہی تھا جس مذہب کے ذریعے سے وہ سکندر اعظم اور دیگر قیصرہ سلف کی طرح اپنے آپ کو انسانیت کے درجے سے اوپر چڑھا کے ایک آسمانی دیوتا بنا نا چاہتا تھا۔ چنانچہ باوجودیکہ وہ مسیح کی صلیب لے کے لڑنے کو چلا تھا۔ اور باوجودیکہ مسیح ہی کے حکم سے اُس نے اپنے نئے شہر قسطنطنیہ کو آباد کیا تھا مگر اُس میں جتنی مذہبی عمارتیں تعمیر کرائیں سب بت پرستوں کے مذاق کی تھیں۔ اور سب سے زیادہ لطف کی یہ بات کی کہ ایک مینار پر یونانیوں کے مہادیو "پالو" کی ایک مورت اس ترمیم کے ساتھ قائم کرائی کہ سارا دھڑ تو پالو کا تھا مگر اُس پر چہرہ اپنا لگا دیا۔ اور دیوتاؤں کے چہروں کے گرد تصویروں میں جو روشنی کی کرنیں چمکائی جاتی ہیں اُن کی جگہ تین طرف صرف تین کرنیں دکھا کے نور کی ایک صلیب بنوا دی۔

یہی اوصاف تبار ہا ہے کہ قسطنطین بہ خلافت دین مسیحی اختیار کرنے کے خود دیوتا بنا چاہتا تھا۔ اس کوشش میں اُس نے بت پرستی اور مسیحیت کو ایک میں ملایا۔ اور اُس مذہبی معجون مرکب کا مہادیو خود بنا۔ جس دھوکے میں پڑ کے عیسائی بے تکلف اُس کی پرستش بھی کرنے لگے تھے۔ الغرض قسطنطین کے دم واپس تک قسطنطنیہ میں کوئی کنیسہ موجود نہ تھا۔ اور سنیت صوفیا کی عمارت اصل میں ایک غیر متشکل

دبوی کا مندر تھی۔ مگر اس کے بعد جب اُس کی اولاد عقیدۂ عیسائی ہو گئی۔ اور تھیوڈوسیوس قیصر کے زمانے میں دولت روم کا مذہب مسیحیت قرار پائی۔ اور تمام بتکدے منہدم کر دیے گئے تو اس عالیشان مندر پر یہ بڑا احسان کیا گیا کہ بجائے کھود کے مٹا دینے کے وہ میسون کا ایک کنیسہ اعظم بنالیا گیا۔

تھیوڈوسیوس کے بعد جب اُس کے بیٹوں کی باہمی نزاع کی وجہ سے مشرقی و مغربی سلطنت باہر روم جدا جدا قائم ہوئیں اور شکستہ عیسوی میں ارتقا دیوس پہلا مشرقی شہنشاہ قرار پایا تو رومۃ الکبریٰ اور قسطنطنیہ میں پوری پوری رقابت شروع ہو گئی۔ اور اگرچہ ابھی تک یونانی کلیسا یوپ کی حکومت سے خارج نہیں ہوا تھا مگر قسطنطنیہ کے مقتداے اعظم کو پوپ ہی تھے قریب قریب مرتبہ دس دیا گیا۔ اور کنیسہ سینٹ صوفیا چونکہ اس مشرقی مقتداے دین کا دارالقرار تھا۔ اس لیے اُسے بھی قریب قریب وہی عظمت حاصل ہو گئی جو رومہ کے گرجوں لا طران وغیرہ کو حاصل تھی۔

اب سینٹ صوفیا کے جوار میں راہبوں اور محترم اچھوتیوں (نون) کی خانقاہیں تھیں۔ دولت و حکومت نے ان متقاض و تارک الدنیا بزرگوں کو چند ہی روز میں ایسا غارت کر دیا کہ اُن کی فتنہ پرداز یوں کی بدولت سینٹ صوفیا نہایت ہی ناپاک سازشوں کا مرکز بن گیا۔ اور کوئی دن کم گزرتا تھا جب اُن اچھوتیوں کے کسی عنوان سے چھوٹ ہو جانے اور اُن کی بدکاریوں کے طشت از بام ہونے کا کوئی نیا واقعہ نہ سنا جاتا ہو۔ ان سازشوں اور بے شرمیوں کے دُور کرنے کے لیے شہنشاہ نے ۳۹۷ء میں انطاکیہ کے اسقف اعظم یوحنا کریسوستوم کو جس کا وعظ کسی سفر میں سُن کے وہ بہت متاثر ہوا تھا نہایت ہی رازداری کے ساتھ انطاکیہ سے بلوایا اور قسطنطنیہ کا مقتداے اعظم مقرر کر دیا۔ یہ شخص حقیقت میں نہایت ہی نیک نفس و پاک باطن تھا۔ ریاکاری نام کو نہ تھی۔ مذہب کے آگے کسی کی کچھ پروا نہ کرتا تھا۔ اور سینٹ صوفیا کے ممبر پر کھڑے ہو کے نہایت ہی آزادی سے ہر ادنیٰ و اعلیٰ پر تکلم بھی کرتا۔ عام رعایا اور تمام مسیحی اُس کی حد سے زیادہ متقد تھے۔ اور اُس کے نام پر جان فدا کرنے کو تیار تھے۔ مگر اُس نے آتے ہی نون کی بدکرداری پر سخت حملے کیے اور

راہبوں کی سازشوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عام مسیحیوں میں تو اُس کی قدر اور زیادہ ہو گئی مگر مقتدایان ملت دل میں اُس سے عناد رکھنے لگے۔ آخر اُنھوں نے اندر ہی اندر سازش کر کے ایک طرف شہنشاہ بگیم قسطنطنیہ ملکہ یوڈوکسیا کو اُس کے خلاف کر دیا۔ اور دوسری طرف سکندریہ کے اسقف تھیوفیلوس نے اُس پر بہت سے مذہبی الزام عائد کیے۔ پھر اس کے بعد یہ کارستانی کی گئی کہ اسکندریہ کے اسقف اور راہب ایک جہاز پر آئے۔ ایک کونسل منعقد کی۔ مقتدائے اعظم قسطنطنیہ یوڈوکسیا کو ملزم قرار دے کے اُس کی جلا وطنی کا حکم جاری کیا۔ اور ملکہ کے ایک ملازم افسر نے فوراً غریب کری سوپٹوم کو گرفتار کر کے چپ چپاتے شہر بٹینہ میں پہنچا دیا۔ لیکن دوسرے مقتدائے منتخب ہونے سے پہلے ہی رعایا کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تو سب لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اسکندریہ سے آئے ہوئے راہبوں کو قسطنطنیہ کی مٹرکون پروٹھونڈھ ڈھونڈھ کے اور چن چن کے قتل کر ڈالا۔ اور ملکہ یوڈوکسیا کو تنگمداؤں کے سامنے خوشامد اور بجا جت سے التجا کرنی پڑی کہ جس قدر جلد ممکن ہو یوڈوکسیا کری سوپٹوم کو بلوایئے تاکہ شہر میں امن و امان قائم ہو۔ چنانچہ کری سوپٹوم پھر اپنی مقدس خدمت پر بڑے شان و شکوہ سے بلوایا گیا۔ اُس کے داخلے میں شاہی جلوس کی شان تھی۔ اور اُس کے آنے کی خوشی میں شہر میں روشنی کی گئی۔

اتفاقاً ملکہ نے اپنی ایک سورت بنو کے سینٹ صوفیا کے قریب نصب کرانی چاہی۔ اس سے یوحنا نے اختلاف کیا۔ اور جب ملکہ کی طرف سے اس پر اصرار ہوا تو اُس نے آزادی کے ساتھ سینٹ صوفیا کے ممبر پر کھڑے ہو کے یہ سخت ترین الفاظ کہے ”ہر ڈی یا پھر قہر آلود ہے۔ ہر ڈی یا پھر ناچ رہی ہے۔ اور پھر یوحنا کا سر باگلی ہے۔“

یہ انجیل کی تاریخ کے ایک ہولناک واقعہ کی طرف اشارہ ہے کہ ارض جلیل کے یودی بادشاہ ہرد وائلنٹی پاس کے سامنے ہرڈیا نامی اسی کو خاندان کی ایک لڑکی ناچی۔ اور ناچ کے اُسے اپنا ذریعہ کیا۔ اور جب وہ بے اختیار اُس پر شیدا ہو گیا تو اپنے وصال کے لیے یہ شرط پیش کی کہ حضرت عیسیٰ کے پتہ سادینے والے پیش رو یوحنا کا سر کاٹ کے اُسے دیا جائے۔ جس کی فوراً تعمیل ہوئی۔ یہاں کری سوپٹوم کی مراد ہرڈیا سو ملکہ یوڈوکسیا اور یوحنا خود آپس

آخر چند روز کے بعد ملکہ نے پورا بندوبست کر کے اور شہر والوں کی روک تھام کر کے راجہوں کی مدد سے پھر کرمی سوسٹوم کو جلا وطن کرایا۔ اور اب کی جلا وطنی میں وہ اتنی دُور بھیجا گیا کہ سفر و غربت ہی میں جان دی۔ اس مرتبہ اُسے دوبارہ قسطنطنیہ آنا نہیں نصیب ہوا بلکہ اُس کے مرنے کے تیس برس بعد اُس کی ہڈیاں لاکے قسطنطنیہ میں دفن کی گئیں۔ اس کی نیک فہمی اور اُس کے علم و فضل کا سب نے اقرار کیا۔ اور روسن کیتھولک اور کلیسیا سے یونان دونوں آج تک اُس کی یاد میں ایک مبارک دن منایا کرتے ہیں۔

جب یوحنا کرمی سوسٹوم کی پہلی جلا وطنی کے وقت پانچویں صدی کے دوسرے ہی تیسرے برس شہر میں ہنگامہ بپا ہوا ہے تو بلوایوں نے دوسری مسیحی عمارتوں کے ساتھ سنیٹ صوفیا میں بھی آگ لگا دی تھی۔ جس سے اُسے بہت نقصان پہنچا۔ لیکن غالباً اُسی زمانے میں اُس کی مرمت کر دی گئی۔ اور وہ نقصان زیادہ نہیں محسوس کیا گیا۔ لیکن اُس کے سوا سو برس بعد عہدِ حبشی میں ۵۳۲ء میں یعنی حضرت رسول آخر الزمان علیہ السلام کی ولادت سے اُنالیس برس پیشتر قسطنطنیہ میں نیلے بانے والوں اور سبز بانے والوں کی وجہ سے ایسا عظیم الشان ہنگامہ ہوا اور اس بے رحمی سے ہر عمارت میں آگ لگائی گئی کہ سارا شہر جل کے خاک ہو گیا۔ اور سنیٹ صوفیا کی مہتمم بالشان عمارت بھی اس بلوے میں بالکل منہدم و برباد ہو گئی۔ اس بلوے کے وقت تو شہنشاہ حبشی میں کو خود اپنی جان کے لالے پڑے تھے۔ مگر بلوے کے فرو ہونے کے بعد جب اُس کے حواس درست ہوئے اور عیسائیوں نے آکے اپنی مذہبی بے حرمتی کا حال بیان کیا تو شہنشاہ نے انھیں تسلی دی۔ اور مضبوط وعدہ کیا کہ سنیٹ صوفیا کو میں بہت جلد بنوا دوں گا۔ چنانچہ اُس مشہور ہنگامے کے چالیس ہی روز بعد حبشی میں نہایت ہی خوش عقیدگی سے سنیٹ صوفیا کی تعمیر میں مصروف ہوا۔ جس میں اُس کی مذہبی ارادت کو شاہانہ غرور و بزدلی زیادہ ابھارتا رہتا تھا۔ اچھے میوَس مہندس نے نقشہ تیار کیا جسے سب نے نہایت پسند کیا۔ اب پہلے سے بہت زیادہ رقبہ اراضی اُس کے حدود میں داخل کر دیا گیا۔ قرب و جوار کے مکانات شہنشاہ نے بڑی سیر چشتی کے ساتھ خاطر خواہ معاوضہ دے دے

کے لیے اور گرجے میں شامل کر لئے۔ جب پورا رقبہ شخص ہو چکا۔ تو پڑا نے منہدم کھنڈروں کو کھود کے اور ملے ہٹا کے زمین برابر کی گئی۔ اور ایک ساتھ دس ہزار کاریگر کام میں لگائے گئے۔ جن کو روز بلانا نہ شام کے وقت غروب آفتاب سے پہلے چاندی کے سکون میں اجرت مل جاتی۔ خود جیٹوئین ہر وقت نگرانی میں لگا رہتا۔ اور جب دیکھیے ایک سادہ سوتی ڈھیلا ڈھانٹا کوٹ پہنے ہوئے کام کو ادھر ادھر دیکھتا پھرتا۔ اور انعام دے دے دے کے کاریگروں کی حوصلہ افزائی کرتا۔

اس اہتمام سے پانچ سال گیارہ مہینے اور دس دن میں یہ عالی شان گرجا بن کے تیار ہوا۔ اور بڑے ہی دھوم دھام اور نہایت ہی تزک و احتشام سے اُس کا افتتاح کیا گیا۔ اور جیٹوئین اس عمارت کی خوشنہائی اور شاندار سی کو دیکھ کے اس قدر آپے سے باہر ہو گیا تھا کہ افتتاح کے موقع پر عجب و نخوت کے یہ کلمات اُس کی زبان سے نکلے "عظمت و جبروت والا ہے وہ خدا جس نے مجھے ایسے بڑے کام کی توفیق دی اور اس کا اہل خانہ۔ اور اب اے سلیمان میں نے تیری عظمت شادی" جیٹوئین کا اس موقع پر حضرت سلیمان پر حملہ کرنا کسی کو پسند نہ آ سکتا تھا۔ اور اگر سچ پوچھیے تو جیٹوئین کے اس کام کو چاہے وہ کتنا ہی بڑا ہو حضرت سلیمان کے کام سے کوئی نسبت نہیں ہو سکتی۔ نہ یہاں وہ سلیمان علیہ السلام کی سی پیغمبرانہ پاک نفسی تھی اور نہ اتنا اہتمام ہی کیا جاسکتا تھا جتنا کہ حضرت سلیمان نے مسجد اقصیٰ کی تعمیر میں کیا تھا۔

خدا کو بھی جیٹوئین کا یہ دعویٰ پسند نہیں آیا۔ اور تعمیر کو پورے بیس برس گذر کر ہون گے کہ آسمان سے بجلی گری اور سینٹ صوفیا کے عظیم الشان گنبد کا مشرقی حصہ ٹوٹ گیا۔ جیٹوئین اب تک برسر حکومت تھا گنبد کے ٹوٹنے سے اُس کے دل کو صدمہ ہوا مگر اسی پہلی ستمبر سے پھر اُس کی اصلاح اور مرمت میں مصروف ہو گیا۔ اور اُس کے زمانہ حکومت میں جس کی وسعت ۳۶ سال کی تھی سینٹ صوفیا کا بڑے کروڑوں روپے دوبار افتتاح ہوا۔ مگر جیٹوئین کا غرور توڑنے کے بعد خدا نے اُس کی حفاظت کی۔ یہاں تک کہ قسطنطین اعظم کی بنیاد کے ۲۹ ۱۱ برس اور جیٹوئین کی تعمیر ادنیٰ کے ۲۱ برس بعد آل عثمان کے نامور اعظم سلطان محمد فاتح نے قسطنطینیہ پر قبضہ کر کے سینٹ صوفیا کو مسجد جامع ایا صوفیہ بنا دیا۔

اس درمیان میں اس گرجے کو مسیحی دنیا میں بہت اہمیت حاصل رہی تھی۔ اور جب

کلیسیاے یونان کلیسیاے روم سے الگ اور پوپ کی غلامی سے آزاد ہوا تو یہی معبد اعظم یونانی کلیسیا کا مرکز قرار پا گیا تھا۔ اور بیان کا اسقن اعظم ساری یونانی اعتقیدہ مسیحیوں کا سب سے بڑا مقتدا تسلیم کیا جاتا تھا۔ اس خود سری کزنائی میں جبکہ سینٹ صوفیا یونانی عیسائیوں اور اُن کے ساتھ روسیوں اور تمام شمالی نفرانیوں کا قبلہ بنا ہوا تھا۔ اُس نے بہت ہی غیر معمولی عظمت و وقعت حاصل کی۔ اور اُس کے حلقے میں گویا ایک شہر بسا ہوا تھا۔ جس میں ہر قسم کی خانقاہوں مدرسوں اور عدالت گاہوں کے علاوہ بازار بھی تھے۔ اور شان و شوکت میں اُس کا مقابل شاید دنیا کا کوئی اور معبد نہ ہوگا۔ کیونکہ اب مشرقی سلطنت روم کو جو جاہ و خستہ حاصل تھی خود رومہ الکبریٰ کی حکومت کو نہیں نصیب تھی۔

مسلمانوں کے قبضے میں آنے سے پیشتر اس کا حال ابن بطوطہ نے اپنے سفر نامے میں بیان کیا ہے۔ وہ جب پھرتے پھرتے سلطان محمد اوزبک خان کی قلمرو میں پہنچا تو کریمیا اور بحر اسود کے شمالی سواحل (موجودہ قلمرو روس) پر واقع تھی تو اس سلطان کے چار محل پائے اور وہ چار دن ملک میں پردے کا رواج نہ ہونے کی وجہ سے غلامیہ دربار کیا کرتی تھیں۔ انھیں ملکاً و ن میں ایک یونانی فرمان رواے قسطنطنیہ کی بیٹی تھی جس کا نام وہ ”بلون“ بتاتا ہے۔ یہ سیمہ شاہزادی اُس سے بہت مانوس ہو گئی۔ اُس نے ابن بطوطہ کو دنیا کا ایک غیر معمولی سیاح و جان گرد اور سیر و سفر کا شائق دیکھ کے اپنے وطن قسطنطنیہ کی سیر کا شوق دلایا۔ اور جب مان باپ سے ملنے کے لیے اپنے سیکے میں گئی تو اُسے اپنے ہمراہ لیتی گئی۔ یون ابن بطوطہ کو قسطنطنیہ جانے کا شوق ہوا۔ در نہ سوا اسلامی ممالک کے کسی غیر مذہب حکومت میں وہ کم جاتا تھا۔

اغرض اسی شاہزادی ”بلون“ کے ہمراہ رکاب وہ بلغاریہ ہوتا ہوا قسطنطنیہ پہنچا۔ شہنشاہ قسطنطنیہ یعنی ملک ”بلون“ کے باپ کا نام وہ شاہ ”تکفور“ بتاتا ہے اور لکھتا ہے کہ اس بادشاہ کا باپ جبرجیس ابھی زندہ موجود تھا مگر بچے کو تخت سلطنت پر بٹھا کے تارک الدنیا ہو گیا تھا۔ آج ہی کل کے مثل اُس زمانے میں بھی وہ قسطنطنیہ کے دو حصہ بتاتا ہے۔ ایک باسفورس (جس کا نام اُن دنوں وہ

"اسی" لکھا ہے) کے مشرق جانب ہے جو اصطنبول کہلاتا ہے۔ اور دوسرا باسفورس
 کے بائیں یعنی مغربی جانب جس کا نام اُن و نون بھی "غلط" تھا۔ اصطنبول میں
 کشاہی محل تھا اور خاص اہل شہر اور درباریوں کا مسکن تھا۔ اور غلط میں دیگر
 ممالک فرنگ کے لوگ جنوادیے۔ فرانسیسی۔ فرنگی۔ رومی وغیرہ آباد تھے۔ آج کل بھی ہے
 سینق صوفیا کی نسبت اُس کا یہ بیان ہے کہ ہم نے حرن اس گرج کو باہر سے
 دیکھا۔ اندر نہیں دیکھ سکے۔ اس کا نام ایسا صوفیا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ عمارت
 آصف بن برخیا کی بنائی ہوئی ہے جو حضرت سیار بن کے خاندان زاد بھائی تھے۔ یہ کنیہ
 ملکیت روم کے تمام کنیسوں سے بڑا ہے۔ اُس کے گرد اگر دو ایک دیوار احاطہ کیے
 ہوئے ہے۔ جس کی وجہ سے بجائے خود ایک شہر معلوم ہوتا ہے۔ اُس چاندیواری
 میں داخل ہونے کے لیے تیرہ بھاٹک ہیں۔ اور اُس کے اندر خاص حرم کا جو حصہ ہے
 وہ ایک میل کے پھیلاؤ میں ہے۔ اور اُس میں ایک عظیم الشان بھاٹک لگا ہوا ہے۔
 جس میں جانے سے کسی کو روک ٹوک نہیں کی جاتی۔ خود بادشاہ کے تارک الدنیا
 باپ کے ساتھ میں اُس بھاٹک میں داخل ہوا۔ اس بھاٹک کے اندر ایک ڈیڑھ
 سی ہے جس کے اندر صحن میں سنگ مرمر کا فرش ہے اُس فرش کے بیچ میں ایک نہر گزرتی ہے
 جو کنیسہ کے اندر سے نکل کے آتی ہے اور اس کے دونوں جانب سنگ مرمر کی
 ایک گز اونچی منڈیر چلی گئی ہے۔ جس میں طرح طرح کے نقش و نگار بنے ہوئے
 ہیں۔ اور اُس منڈیر کے برابر دونوں جانب ترتیب وار درخت چلے گئے ہیں خواہ
 گرجے کے دروازے سے اس بیرونی بھاٹک تک انگر کی تاکین خوشنمائی کے ساتھ
 پھیلی ہوئی ہیں۔ اور اُن کے نیچے زمین پر چھیلی اور دوسری قسم کے خوشبودار
 پھولوں کے درختوں سے چمن بندی کی گئی ہے۔ ڈیڑھ سی سے نکلے ہی ایک خوبصورت
 اجڑی بیگمہ سا مقام ہے جس میں لکڑی کی بچین ہیں۔ اور اُن پر دربان اور ڈیڑھ سی
 کے خدام بیٹھے رہا کرتے ہیں۔ اُس بیگمہ کے داہنی جانب کمرے اور کوٹھریاں ہیں جو
 زیادہ تر لکڑی کی بنی ہوئی ہیں۔ اُن پر قسطنطنیہ کے قاضی اور اہل دفتر بیٹھ
 کے اپنا کام کرتے ہیں۔ اور اُن کوٹھریوں اور کمروں کے درمیان میں بھی ایک چوبی
 بیگمہ ہے جس میں کئی زینے چڑھ کے انسان جا سکتا ہے۔ اُس میں ایک کرسی ہے

جس پر غلاف پڑا ہوا ہے۔ اُس پر بیان کا سب سے بڑا قاضی بیچے کے اجلاس کرتا ہے۔ یہ سب تو اُس بڑے بیچے کے داہنی جانب تھا۔ اُس کے بائیں طرف عطاروں کا بازار ہے اور وہ نہرِ ناحض جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے تقسیم ہونے کے دونوں جانب بڑھ جاتی ہے۔ ایک حصہ قاضیوں کے اجلاس کی طرف پھیلا ہوا ہے اور دوسرا عطاروں کے بازار کی طرف۔ کینسے کے گرد کے صحن کا یہ منظر دیکھ کے جب انسان اُس کے خاص اندرونی دروازے پر آتا ہے تو اُسے وہاں متعدد برج نظر آتے ہیں جن میں خدام کینسے بیٹھے رہتے ہیں جو اندر باہر سب جگہ جھاڑ دیتے ہیں۔ شام کو چراغ روشن کرتے ہیں۔ اور رات کو سب بچاٹک بند کرتے ہیں۔ اور کسی شخص کو جب تک وہ صلیب اعظم کے سامنے جو یہاں قائم ہے سجدہ نہ کرے کینسے کے اندر قدم نہیں رکھنے دیتے۔ اس صلیب کی نسبت ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ جس شہتیر پر حضرت یسوع کی صورت کا بنجانے والا شخص مصلوب کیا گیا تھا اُسی کے ایک ٹکڑے سے یہ بنی ہے۔ یہ کینسے کے دروازے پر نصب ہے۔ دس دس گز کے لمبے دو سونے کے خول ہیں جن میں اہلی صلیب کی کڑھی اتار دی گئی ہے۔ اور وہی دونوں خول صلیبی وضع سے ایک دوسرے سے وابستہ کر دیے گئے ہیں۔ اس دروازے کی دیوار اور محراب میں سونے چاندی کے پتھر جڑے ہوئے ہیں۔ اور اس کی دونوں زنجیریں بھی خالص سونے کی ہیں۔ مجھ سے بیان کیا گیا کہ اس کینسے میں ہزاروں کی تعداد میں راہب اور اسقف رہتے ہیں جنہا میں سے بعض خاص حواریین حضرت یسوع علیہ السلام کی نسل سے ہیں۔ اور اسی احاطہ کے اندر ایک کینسہ عورتوں کے لیے مخصوص ہے جن میں ہزاروں دنیا ترک کرنے والی عابدہ و زاہدہ کنواریاں (اچھوتیاں) رہتی ہیں۔ اور جو دوسری عورتیں دنیا ترک کر کے زہد و تقویٰ کے جوش میں یہاں آ کے گوشہ گزین ہو گئی ہیں ان کی تعداد ان اچھوتیوں سے بھی زیادہ ہے۔

بادشاہ اور اُس کے تمام اہل دربار اور تمام اہل شہر کا معمول ہے کہ ہر روز صبح کو اس کینسے کی زیارت کے لیے آیا کرتے ہیں۔ اور سال میں ایک بار خود پوپ روم اس کی زیارت کو آتا ہے۔ بادشاہ شہر سے باہر چار میل جا کے اُس کا استقبال کرتا ہے۔ سامنا ہوتے ہی ادب سے پا پیادہ ہو جاتا ہے۔ شہر کے اندر اُس کی سواری کے

آگے آگے پیدل چلتا ہے۔ اور جب تک قسطنطنیہ میں اُس کا قیام رہے روز بلا ناغہ صبح شام کو اُس کے سلام کو حاضر ہوتا ہے۔

ابن بطوطہ اس کہنے کے اندر کے حالات نہیں دیکھ سکا جس کی وجہ یہ تھی کہ جب وہ تارک الدنیا بادشاہ سابق کے ساتھ کہنے کے اندر جانے لگا تو اُن راہبوں نے جو درباری کی خدمت بجالا رہے تھے روکا اور بادشاہ نے ترجمان کے ذریعے سے اُسے بتایا کہ یہاں معمول ہے کہ جب تک کوئی صلیب کا سجدہ نہ کرے اندر نہیں جاتے پاتا۔ اور اس قاعدہ کی اس سختی سے پابندی کی جاتی ہے کہ میں بغیر اس کے آپ کے اندر لے جانے سے معذوری ہوں۔ ابن بطوطہ نے شرک کو گوارا نہ کیا۔ اور صاف کہہ دیا کہ اگر ماسوا اللہ کا سجدہ کیے بغیر کوئی اندر نہیں جاسکتا تو میں اس کی سیر سے باز آیا۔

ابن بطوطہ آگے بڑھ کے بتاتا ہے کہ ایاصوفیہ کے احاطہ کے اندر بہت سے مانتار (مانسٹریان) یعنی خانقاہیں ہیں۔ اور ہر ایک کے متعلق علیحدہ عبادت خانہ ہے۔ زمانی اور مردانی دو خانقاہیں پچھلک میں داخل ہوتے ہی ملتی ہیں جن میں نہرین جاری ہیں۔ اُن کے علاوہ بائیں طرف ایک اندھون کی اور ایک سلبو الجو اس بوڑھون کی خانقاہ ہے جس کے گرد اُن لوگوں کے رہنے کے حجرے ہیں۔ مجھے یہاں ایک ایسی خانقاہ ملی جس میں شاہی خاندان کی پان سو کے قریب خوبصورت باکرہ شہزادیان تھیں۔ اور ایک دوسری خانقاہ میں اس کے قریب وزیروں اور امیروں کی کنواری بیٹیاں تھیں۔ جو موٹے جھوٹے کپڑے پہنے تھیں۔ اور اہبانہ زندگی بسر کرتی تھیں۔ اُن کے حلقوں میں بیٹھ کے خوبصورت لڑکے ایسی خوش گلوئی سے انجیل پڑھتے ہیں کہ سننے سے دل پر بڑا اثر پڑتا ہے۔

الغرض ۱۴۲۵ھ تک اس کہنے کی یہی حالت رہی۔ اور مسیحی فرمان روایان قسطنطنیہ اسے روز افزوں کرتی دیتے رہے یہاں تک کہ سنہ مذکور میں سلطان فاتح محمد ثانی نے قسطنطنیہ کو فتح کر کے توحید کے زیر علم کیا۔ اُس وقت سینٹ صوفیا کے کلسون پر سے صلیب اتارنا چاہی اور اُس کی جگہ ترکون کا نشان ہلال قائم کیا گیا۔ سلطان محمد شہر میں داخل ہوتے ہی پھر تباہ کرتا جب سینٹ صوفیا کے صدر دروازے پر پہنچا تو گھوڑے سے اتر پڑا۔ اندر داخل ہو کے اُس کی حالت دیکھی اور ساتھ والوں سے کہا اگر مال غنیمت مجاہد

سپاہیوں کے لیے ہے تو شہر کی عمارتیں بادشاہ کی ہیں۔ اور اسی حق اور اختیار کی
 رُود سے میں اس معبد کو خدا ہی واحد و ابجلال کی مسجد قرار دیتا ہوں۔
 یہ کہہ کے سلطان چلا گیا۔ اور اُسی وقت سے اُس کے حکم کی تعمیل شروع ہو گئی۔
 مشرکانہ عبادت کے آلات و ظروف سمیت کے باہر کیے گئے۔ اُصلیبین اکھاڑ کے دُور
 کی گئیں۔ سورتیں توڑ کے باہر پھینک دی گئیں۔ دیواروں پر جو تصویروں اور
 صلیبیں بنی تھیں مٹا دی گئیں۔ اور ساری عمارت دھو دھلا کے اور پاک و
 صاف کر کے خدا سے وحدہ لا شریک کا ایک سادہ عبادت خانہ بنادی گئی۔ بعد
 والے جمعہ کو موزوں نے دو بچے مینار پر چڑھ کے نعرہ اُٹھا کر بلند کیا۔ اور امام نے
 جس کے پیچھے خود محمد ثانی شریک جماعت تھا نماز جمعہ اور نماز شکرانہ ادا کی۔
 بس اُس وقت سے آج تک یہ عمارت مسلمانوں کی مسجد ہے۔

د لگد از کی قیمت میں اضافہ

قدردانان و لگد از ابد لگد از کی حیثیت درست کرنے کے لیے جو کچھ کوششیں گزشتہ تین سال کے
 اندر کی گئیں محض اس امید پر تھیں کہ اشاعت بہت زیادہ ترقی کر جائے گی۔ ورنہ آپ خود خیال
 فرما سکتے ہیں کہ ولایتی چکنا کاغذ لگانا جو زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔ اُس کی اب و تاب قائم رکھنے
 کے لیے خشک چھپوانا جس میں چھپائی کے مصارف پورے دُونے ہو جاتے ہیں۔ صفحات
 کی تعداد کو ۱۶ سے بڑھانے ۲۴ کر دینا جس میں کل مصارف ڈیڑھ سے ہو گئے۔ اور ان سب
 باتوں کے علاوہ ہر سال ختم سال پر تقریباً دس جز کا ایک نیا ناول طبع کر کے مفت
 خریداروں کی نذر کرنا ایسے مصارف ہیں جو ایک روپیہ سالانہ میں کسی طرح نہیں پورے
 پڑ سکتے۔ اس ایک روپیہ میں سے بھی ۳۴ ہر سال محصول ڈاک کے نکل جاتے ہیں۔ اور
 دفتر کے مصارف کے لیے کل ۱۳ ان تمام ملکی و قومی خدمات کا سالانہ اخام باقی رہ
 جاتے ہیں۔ ٹائٹل ملا کے رسالوں کی سالانہ مقدار ضخامت ۱۱ جز کی ہوتی ہے اور
 ناول کے اگر ۱۰ جز قرار دیے جائیں تو کل ۳۱ جز ہوئے جو ۱۳ میں خریداروں کو
 دیے جاتے ہیں۔

عہدہ چھاپنے والے مطابق دلیسی کاغذ کی صاف اور واضح چھپائی جو خشک کاغذ

بھی نہیں ہوتی فی روپیہ ۳۲ جز کے حساب سے دیتے ہیں۔ اور اگر ولایتی کاغذ پر خشک چھپوایا جائے تو چھپائی کا نرخ عوامانی روپیہ ۲۵ جز ہو جاتا ہے۔ اس کے مقابل دنگاز کو ایک مستقل مطبع اور اعلیٰ درجے کا اسٹاف رکھنے پر ۱۳۱۳ میں ۳۱ جز دینا پڑا۔ قیمت اُس وقت ایسے قائم رہ سکتی ہے جب اشاعت پانچ ہزار سے زیادہ ہو جائے اور ہم وعدہ کرتے ہیں کہ جب اشاعت ہوگی ہم سالانہ قیمت ایک روپیہ چھپانے کے موجودہ حالت میں جبکہ تین سال کے تجربہ میں دنگاز کی اشاعت ڈھائی ہزار سے نہ بڑھ سکے تو ہم قیمت کے بڑھانی پر مجبور ہیں۔ اور آئندہ سے سالانہ قیمت بجائے ایک روپیہ کے ڈیڑھ روپیہ سالانہ مع محصول ڈاک قرار دیتے ہیں۔ اور سچ پوچھیے تو حساب سے بھی یہی قیمت ہونی چاہیے آپ کو یاد ہو گا کہ جب دنگاز کا حصہ مضامین صرف ۱۶ صفحات کا تھا۔ چھپائی بہت معمولی تھی۔ اور کوئی ناول مفت نہیں نذر کیا جاتا تھا اکیلا حصہ مضامین کی قیمت سالانہ سواروپیہ چھپائی لہذا اب صفحات کے تعداد کے ۱۶ سے ۲۴ ہو جائے۔ نہایت عمدہ چھاپے۔ اور ایک ناول مفت نذر کرنے کی صورت میں ایک روپیہ کیونکر کافی ہو سکتا ہے؟ اگر انصاف کیجیے تو ڈیڑھ روپیہ بھی زیادہ نہیں ہو سکتا۔

قیمت کے کم اور غیر کافی ہونے ہی کا سبب ہے کہ باوجود ہر طرح کی کوششوں اور جھانسنے کسی طرح انتظام نہیں سنبھل سکتا۔ انھیں دشواریوں کو خیال کر کے ہمارے صد ہا احباب برابر تین سال سے لکھ رہے ہیں کہ موجودہ قیمت بہت کم ہے کچھ نہ کچھ ضرور بڑھانی جائے۔ مگر ہم نے محض اس امید میں کہ اشاعت کی کافی تعداد اُس کی کو پورا کر لے جائے گی تین سال تک وہی ایک روپیہ قائم رکھا مگر اب مجبور ہو کے ہم اپنے اُن عاقبت میں احباب کو مشورے کے مطابق سالانہ چندہ ایک روپیہ سے ڈیڑھ روپیہ (بہر) کیے دیتے ہیں۔ اور ناول ہدیہ رومۃ الکبریٰ کے دی۔ پی جو آخر جنوری یا اوائل فروری میں حاضر ہوں گے (بہر) ڈیڑھ روپیہ) چندہ سالانہ۔ اور ۱۲ یا ۱۳ محصول و منی آرڈر فیس ملا کے ایک روپیہ و س آنے (بہر) یا ایک روپیہ گیارہ آنے (بہر) کیے ہوں گے اس پر اگر اول میں ”سلسلہ کا خاتمہ“ والی مضمون کے آخر میں غلطی سے اُن دیلوں کی قیمت جو بہر یا بہر تائی گئی ہے وہ غلط ہے اس کی جگہ بہر یا بہر خیال کی جائے۔ جو حضرات اس اضافہ قیمت کو ناپسند فرمائیں بذریعہ تحریر منع فراویں تاکہ اُن کی خدمت میں دی۔ پی روانہ کیو جائیں۔ خاکسار۔ محمد عبدالحکیم خٹک

بڑی جہتری ۱۹۱۳ء یہ جہتری علی احمرم "نامی جہتری" کیون کہلاتی ہے؟ اس لیے کہ حضرت سعد کے نامی پرپس کو اس سے اور اس کو حضرت سعد کے نامی پرپس سے جو خصوصیت ہے اُس نے اسے اور پرپس دونوں کو ہندوستان میں شہرت و مقبولیت کی سبب بڑی سندوی ہے۔ اس کے اعلیٰ درجہ کے چھپے ہوئے نسخے اپنے آبدار کاغذ۔ اپنی نفیس چھپائی۔ اپنی نادر نقاشی۔ اور اپنی لطیف رنگین تصویروں کے اعتبار سے شائستہ لوگوں کی میزوں کا زیور اور امیرانہ ڈرائنگ روموں کی رونق ہیں۔ جس دفتر میں یہ جہتری نہیں وہ ہرگز فیشن ابل نہیں کہا جاسکتا۔ اور پھر لطف یہ کہ جن حضرات کے پاس نامی پرپس کی تمام اگلی پچھلی جہتریاں موجود ہیں اُن کے پاس ساوی اور فصیح اردو میں تاریخ کا ایک ایسا احاطہ اور سلجھا ہوا ذخیرہ موجود رہتا ہے جو کہیں نہیں نصیب ہو سکتا۔ عام بازار میں جہتریوں کی قیمت تو فی جلد ۲۰ روپے۔ مگر شکوانے کے قابل وہ نفیس رنگین جہتریاں ہیں جن کی قیمت ۵۰ روپے۔ پتہ صرف نامی پرپس کا پتہ کاشی

ایک فوری ہدایت۔ مراسلت میں جو حضرات اپنا نہیں بتاتے ہیں کاش انہیں معلوم ہو تاکہ وہ پنجرہ دگلڈز پر کتنا بڑا ظلم کرتے ہیں حتی الامکان انکا نام ہونڈھ کر ضرور جواب دیا جاتا ہے لیکن ہائیک لند براہ کرم جو خط بھیجیں اپنا نام ضرور بتا دیا کریں ورنہ اندیشہ یہ کہ انکو جواب دیا جاسکے۔ خاکسار پنجرہ دگلڈز

سیرۃ العباس۔ عم رسول اشرا و خلفاء عباسیہ کی مورث اعلیٰ حضرت عباس بن عبد المطلب کے سوانح عمری مصنفہ مولانا حکیم سید فرید احمد صاحب عباسی۔ یہ ایک عالمانہ تصنیف ہے اور کسی ملک کے کتب خانہ کو اس سے خالی نہ رہنا چاہیے۔ قیمت فی جلد ایک روپیہ علاوہ محصول ڈاک

المشتر بنجر مہذب تک ایک نئی کڑہ بز بن بیگان لکھنؤ

کشمیر جنت نظیر
(ایک نئے انداز کا سفر نامہ)

مصنفہ مسٹر محمد ظریف ایم۔ اے۔

ملنے کا پتہ راجا رام دفتری ۱۲۱۱ بانی بیج۔ سرکلر روڈ۔ کلکتہ

کتاب خانہ مہذب بیک ایجنسی لکھنؤ

نصف	دوسری لکچر کتابیں	نصف	حکیم محمد علی انصاری ایڈیٹر مرقع عالم و القاص
۱۸	حیات شیخ حلی	۱۴	بنو جان
۱۴	ترجیحی نظر	۱۶	مرقع طرابلس
۱۸	کنیز فاطمہ	۱۶	عروج زوال
۱۸	مالن کی بیٹی	۱۶	شہنشاہ عیاران
۱۸	ایران کی شہزادی	۱۶	نشرت
۱۸	حاجی بغلول	۱۶	ارمان
۱۸	محبت کی پتلی	۱۶	محبوبہ زندان
۱۸	کرشمہ الفت	۱۶	اندرا
۱۸	خون تمنا	۱۶	پڑا ارمان لڑکی
۱۲	کرشمہ محبت	۱۶	میٹھی چھری
۱۲	ادب و امیری	۱۲	احق الدین
۱۰	ککشان	۱۲	پرستان کی پری
۱۶	ونیس کا بانکا	۱۲	رزم بزم
۱۶	شرہ دیانت	۱۲	امراؤ جان
۱۰	حسرت وید	۱۲	کشتہ ناز کامل
۱۰	تاریخ جنگ پان و	۱۲	بروگ
۱۰	سرور امان	۱۲	پاری دنیا
۱۰	نرالا عاشق	۱۲	سوانحری شہنشاہ
۱۸	دستاویز محبت	۱۲	نشہ جوانی
۱۲	کایا پٹ	۱۲	بہشت برین

ان مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ دوسری کتابیں بھی کفایت روانہ ہو سکتی ہیں
 از شتر نیمبر مہذب بیک ایجنسی - کٹرہ بزن بیک خان - لکھنؤ

تاج ہیر آمل

انگلش ٹریڈنگ کمپنی کی ایجاد کردہ ہوئے مقوی دماغ اور مغز و روح افزا تیلوں نے نہایت ہی شہرت و مقبولیت حاصل کر لی ہے۔ جس کسی نے ایک مرتبہ استعمال کیا پھر کسی دوسرے تیل میں نہ اسے لطف آیا۔ اور نہ تفریح و تازگی روح حاصل ہو سکی جو ان تیلوں کے ذریعے سے حاصل ہوئی تھی۔ اسی خیال سے کارخانہ روض الریاحین نے لکھنؤ میں اس کی ایجنسی قبول کر لی جو ہمیشہ مغز اور منتخب تیلوں کو پبلک کی ضرورتوں کے لیے فراہم کیا کرتا ہے۔

تاج ہیر آمل جو اپنی نزاکت و نفاست اور جان بخشی کے لحاظ سے نازک طبع اور نفیس مزاج ملکہ ہند تاج محل کی جانب منسوب ہیں تقویت دماغ اور فرحت افزائی میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ اور اسی لیے کارخانہ روض الریاحین اپنے گاہکوں اور ہندوستان کے عام نازک طبع لوگوں اور ضعف دماغ کے شایکوں کو ان نوابہاد معجزات طبی کی طرف خاص توجہ دلاتا ہے۔

تاج ہیر آمل تین طرح کے مخصوص تیل ہیں جن میں مقوی دماغ و روغن میں نہایت ہی لطیف خوشبوئیں پیدا کر دی گئی ہیں۔

(۱) تاج روغن بادام بنفشہ - قیمت فی شیشی ۱۴

(۲) تاج روغن زیتون و یاسمن " ۱۴

(۳) تاج روغن آملہ - و بنولہ " ۱۲

ان تیلوں کی آدھ آدھ پاؤ کی نہایت خوبصورت شیشیاں ہمارے پاس موجود ہیں۔ درخواست آتے ہی ویلیو پی ایل روڈانہ ہوگا بارودانہ اور معارف ڈاک غیر ان قیمتوں کے علاوہ ہیں۔

المشتر منجبر روض الریاحین - کٹرہ بن سلیخان - لکھنؤ

بہارِ حسن

یہ ایک اعلیٰ درجے کا مرکب جڑ ہے جو حرم سرا سے شاہی مین مروج تھا۔ ایک ہی ہفتہ استعمال کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ حسن کو کس خوبی سے نکھار دیتا ہے یہ جلد کو نہایت نازک و لطیف بنا کر کند فی رنگ پیدا کرتا ہے اور سانسوئی رنگت میں عجب ملاحیت نمایاں کرتا ہے اور سارے پنڈے کو روح افزا معشوقانہ خوشبو سے مہکاتا ہے۔ اس کا روزانہ استعمال رخساروں کی جھانیاں سیاہی بد نما داغ جھریاں چھپ و غیرہ دور کر کے چہرے کو مثل گلاب کے بنا دیتا ہے قیمت فی کبس -

(عمر)

<p>سرمہ مقوی نظر - آنکھوں کی بنیائی بڑھانے میں بے نظیر مطالعہ کرنے والی اصحاب کو بے حد مفید ثابت ہوا ہے اس کا دائمی استعمال دھند جالا اور آنکھوں کی پانی بجھنے کو موقوف کرتا ہے قیمت فی تور -</p>	<p>نمک سلیمانی - سیکڑوں کی بنا ہو کر اور ہونے والی گرہ اور چھڑ ہے اس کی ایک چمکی کا روزانہ استعمال جلد باریک و نسی بچاتا ہے اور منہ کی بیماریاں کو دور کرتا ہے ہینہ میں بھی مفید ثابت ہوا ہے۔ قیمت فی شیشی ۱۲</p>	<p>منجن - دانتوں پر بے مثل جلا کر کے معنیہ کرتا ہے اور گندہ دہنی کو دور کرتا ہے قیمت فی شیشی ۱۲</p>
<p>سفوف وافع جریان واحتملام - یہ سفوف جریان احتلام درد کر ضعف اعصاب وغیرہ کو دور کر کے اصلی حالت پیدا کرتا ہے بدن کو چست و داغ کو صبح اور چہرہ کو سرخ سفید کرنا اسکا معمولی کام ہے فی کبس جس میں ۱۲ خوراکیں ہوتی ہیں -</p>	<p>سفوف وافع لرزه و بخلہ - اگر آپ علاج کرتے کرتے پریشان ہو گئے ہوں تو اس سفوف کا استعمال کیجئے انشاء تین دن میں لرزه و بخلہ جاتا رہے اور سات روز کے استعمال میں دوبارہ عود کرنے کا اندیشہ نہ رہے قیمت (۷) خوراک کی ہے</p>	<p>ضیق النفس - یہ مرض بہت مشکل سے جاتا ہے اور مر لیں ہر وقت جان بلب رہتا ہے جو لوگ علاج کرنے سے مایوس ہو گئے ہوں طلب کریں قیمت فی ڈبہ ۷۰</p>
<p>المشہر حکیم محمد سراج الحق مالک رخانہ معین اصحت کٹرہ بن بک خان لکھنؤ</p>		<p>طلائے حیات - اس کے استعمال سے پتھوں میں لرزه جال آجاتی ہے یہ عضو مخصوص کی سستی و لاغری کچی کو دور کرنے کے لیے بے نظیر دوا ہے۔ قیمت فی شیشی -</p>

المشہر حکیم محمد سراج الحق مالک رخانہ معین اصحت کٹرہ بن بک خان لکھنؤ



نیاسال و نیانیال

دوستو! اب ہم سلسلہ ۶ میں ہیں۔ اور سلسلہ ۱۹۱۳ء اسی عدم آباد میں پہنچ گیا جان اُس کے سے ہزار ہائیں ماضیہ جاچکے ہیں۔ سلسلہ ۶ کے خاتمہ سے ذرا پہلے ہم نے آپ کو متنبہ بھی کر دیا تھا کہ یہ برس رخصت ہو اچا ہوتا ہے۔ اپنی منازل دوازدہ گانہ پوری کر چکا اور اب جانے ہی کو ہے۔ لیکن اس بتا دیے پر بھی جس وقت یہ راتوں رات منہ چھپا کے ہماری دنیا سے بھاگا ہے شاید آپ کو خبر نہ ہوئی ہوگی۔ آپ نے دیکھ لیا کہ یہ کس طرح خاموشی و سہولت سے اور ہم سب کی آنکھ بچا کے چورون کی طرح بھاگا ہے۔ اور کیسے دبے پاؤں گیا ہے کہ ۳۱ دسمبر کی رات کو آپ آرام اور بے فکری سے سوتے اور یکم جنوری کی صبح کو اٹھتے تو معلوم ہوا کہ سلسلہ ۶ گیا اور ہم سلسلہ ۶ کے آغوش میں ہیں۔

برس آتے تو خوشیوں اور امید و آرزو کے پُر لطف خیالوں کے ساتھ ہیں۔ مگر جاتے اس طرح چھپ کے ہیں کہ انھیں رخصت کرتے وقت دوا آفسو بہانے کا بھی موقع نہیں ملتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہم سال کے پہلے دن خوشیاں مناتے مسرت و شادکامی پر ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے ہیں مگر جانے والے سین کو گرجوشتی سے الوداع کہنے کا ارادہ ہی کرتے رہ جاتے ہیں اُس کی نوبت نہیں آتی۔ اور

اسی اندیشہ سے ہم نے رخصت کی گھڑی آنے سے پہلے ہی اُسے رخصت کر دیا اور چند کلمات حسرت زبان سے ادا کر کے دل کی حسرت نکال لی۔

یہ اُس کا سیابی ہی کی برکت ہے کہ اب فارغ البالی کے ساتھ ہم اپنے نئے دوست ۱۹۱۴ء سے معاف کرتے ہیں۔ یہ نیا سال اپنے آغاز ہی میں ہمارے شہر کے لئے ایک غیر معمولی خوشی و خوش نصیبی لایا ہے۔ وہ یہ کہ حضور و اُس سر اسے لاڑ پھار گورنر جنرل بہادر ادا مل جنوری میں ہمارے شہر میں رونق افروز اور ہمارے مہمان ہوئے۔ اور قبل اس کے کہ ہمیں کسی فکر و تردید یا کسی رنج و الم سے سابقہ پڑے سب کے پہلے ہم نے اپنے مہربان و اُس سر اسے کے رو و مسعود پر جشن طرب منایا۔ سچ یہ ہے کہ ہماری اس سال کی زندگی کی بنیاد اچھی پڑ گئی۔ اور ۱۹۱۴ء کے واقعات مسرت و کامرانی سے آغاز ہو گیا۔ جس پر لکھنؤ جس قدر فخر کرے بجا ہے۔

لہذا جس طرح دکاندار صبح صبح کوئی اچھا سودا ہو جانے پر خوش ہو کے کتا ہے "بہنی اچھی ہوئی ہے دن بھی اچھا کٹے گا" ویسے ہی ہم بھی آغاز سال کی اس اعلیٰ مسرت و مارے خوشی کے جانے سے باہر ہو کے کہتے ہیں کہ ۱۹۱۴ء کا آغاز لطف و مسرت سے ہوا ہے تو بارھون میںے انشاء اللہ شاد کامی و لطف میں گزریں گے۔

نیک فانی کے اس سے زیادہ نمایان کیا آثار ہوں گے کہ پائلٹس کے اُفتی سے قتل و خونریزی اور تاخت و تاراج کا ابر چھٹ گیا اور مطلع صاف نظر آ رہا ہے۔ جتنے فتنے فساد تھے اور جو کچھ شور و شر تھا سنہ گذشتہ کے ساتھ گیا۔ اور سنہ حال کی پہلی صبح صبح اقبال اور امن و امان کی سحر میں کے نمودار ہوئی ہے۔

بس۔ اب کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں۔ کیا ضرور ہے کہ اس عیش کو انکار زمانہ سے مکدر اور اس لطف کو کل کی فکر دن سے منقص کر کے ہم خود بھی پریشان ہوں اور اپنے احباب اور قدر افزایان و لکھنؤ کے اطمینان میں بھی خلل ڈالیں۔ لہذا اس مسرت و شاد کامی کے موقع پر ہم خوشی خوشی اپنے احباب سے بغلیں ہوتے اور نہایت ہی گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہیں۔ خدا ہمیں بھی مبارک کرے اور ہمارے سارے دوستوں کو بھی۔

آل عثمان میں پہلی سلطنت مسیحیہ

ترکان آل عثمان کا دوسرا تاجدار اور خان ہے جو عثمان خان بانی خاندان کا سعادتمند فرزند تھا۔ اُس کا عہد ۱۲۸۱ء سے لے کے ۱۳۲۹ء یعنی ۴۸ سال تک رہا۔ اریکہ آرائی کے اعتبار سے گو کہ وہ اپنے خاندان کا دوسرا تاجدار تھا مگر سچ یہ ہے کہ سلطنت عثمانیہ اُسی کے عہد سے ایک ترقی کرنے والی زبردست سلطنت بننا شروع ہوئی۔ اُس زمانے تک اُدھر کی تمام اسلامی قلمروں میں پُرانا سلجوقیوں کا سکہ مروج تھا اور خان نے خاص اپنے خاندان کا سکہ جاری کیا۔ سب کے پہلے اُس نے شہر بروصہ پر قبضہ کر کے اُسے اپنا مرکز حکومت بنایا۔ عالی شان جامع مسجد - شاہانہ عظمت و جلال کے دارالعلوم - اور ریح اشان خیرات خانے سے اُس نے اپنے اُس نئے دارالسلطنت کو رونق دی۔ اور اُسے ایک اسلامی شہر بنا دیا۔ توحید کی صدا بلند ہوتے ہی نیتھ کا عیسائی کلیسیا (فرقہ) فنا ہو گیا۔ اور جس طرح خدا کے شریک دیوتاؤں کے مندر مسیحیت کی صدا سے منہدم ہوئے تھے ویسے ہی اب بیٹے والے خدا کے معبود خدا سے تم بید و دم پوئلہ کے آگے سر بسجود ہو گئے۔

چند ہی روز میں اور خان نے مسیحی دولت یونان کے اُن شہروں اور علاقوں پر قبضہ کر لیا جو ایشیائے کوچک میں واقع تھے اور جنہیں یونانیوں کی قدیم مہاجرت جنگِ ٹرائے سے تعلق تھا۔ اُن دنوں یونانی سلطنت جس کا دارالسلطنت قسطنطنیہ تھا وحشی بلغاریوں کے دستِ ستم و ستمناہی تھی۔ اور اُن سلطنت میں بگڑے تھے۔ اور سلطنت یونان اپنے پڑوسیوں کا نام لے لے کے وہاں بیان دے رہی تھی اسی اثناء میں ترکوں نے اپنی بحری قوت مضبوط کرنا شروع کی تاکہ جزائر یونان اور بلاد یورپ پر حملہ آور ہوں۔ ترک اُدھر بڑھنے کا منصوبہ دل میں ٹھہرا ہی رہے تھے کہ "کاناکوزین" نے جو ولی کی حیثیت سے نظم و نسق سلطنت کا ذمہ دار تھا بلغاریوں کی آفت سے بچنے کے لیے انھیں خود ہی اپنی مدد پر

ملا یا۔ یہ دونات ہی فیاضی اور کشادہ دلی سے دی گئی۔ ایک ترک سردار اپنے زبردست لشکر کو جازون میں بٹھا کے ساحل بلقان پر لے گیا۔ ساری فوج جازون ہی پر چھوڑی اور تھوڑے سے منتخب جوانوں کے ساتھ شہر ڈیوٹیکا میں پہنچا جہاں یہ حالت تھی کہ کاناکوزین "منہ چھپا کے سردار کی طرف بھاگ گیا تھا۔ لوگوں کو خبر بھی نہ تھی کہ زندہ ہے یا مر گیا۔ اُس کی بی بی "ایرینہ" شہر کے اندر محصور تھی۔ اور بلغاری محاصرہ کیے ہوئے تھے۔ ترکوں نے پہنچتے ہی بلغاریوں کو بھگا دیا۔ اور اگرچہ سخت سردی کا موسم تھا تفصیل شہر کے باہر اتر پڑے۔

ملکہ ایرینہ نے اظہارِ شکر گزاری کے لیے بہت سے قیمتی تحفے دے دیے اور نفیس گھوڑے، ہتھیار، نذر کیے اور سردار عساکر ترک کو اپنے محل میں بطریق دعوت بلایا۔ اُس کی دلچسپی کے لیے بڑے بڑے سامان کیے۔ اور کھانا بھیجا کہ جلد ہی تشریف لائے۔ میں آپ کی منتظر ہوں۔ مسلمان سردار نے اس دعوت کے قبول کرنے سے انکار کیا۔ مگر کیوں؟ خیال کیا گیا کہ شاید سردار ترک اس لیے عیش کدہ شاہی میں نہیں آتا کہ اُس کے ہمراہی شہر کے باہر برت اور سردی میں پڑے اُتر رہے ہیں۔ وہ نہیں چاہتا کہ اپنے رفیقوں کو تکلیف میں چھوڑ کے خود دعوت کھائے اور قصر شاہی میں عیش منائے۔ لیکن مسلمان سردار کا معیار شرافت یونانیوں کے خیال و مذاق سے بہت بلند اور نہایت شریفانہ تھا۔ اُس نے کھانا بھیجا۔ میرا نفس اس بات کو نہیں گوارا کرتا کہ میرا جو برگشتہ بخت دوست گھر سے غائب اور خاندان برباد ہے اُس کی غیبت میں اُس کی جورو کے پاس اُٹھوں بیٹھوں اور اُس سے ہم صحبت ہوں؟ یہ ایک ایسی اعلیٰ تہذیب تھی جس سے یورپ والوں کے کان اُس وقت تک نا آشنا تھے۔ الغرض اُس نے جہاں تک بنا حاکم زبان کاناکوزین کی جستجو کی۔ اور جب اُس کا بہتہ نہ لگا تو بغیر اس کے کہ اُس کی بی بی سے تنہائی میں ملے بہت سالانہ غنیمت اور بہت سے لونڈی غلام جو دشمنوں سے ملے تھے لے کے واپس چلا آیا۔

مورخین یورپ کہتے ہیں کہ ترکوں نے دول بلقان کو باہم لڑا کے اُس ملک پر قبضہ کر لیا۔ مگر دغا بازی کے اس فن کے استاد رومی تھے۔ مسلمانوں اور ترکوں کو یہ کاٹ پھانسی نہیں آتی تھی۔ اُن کا قدم خالص ہمدردی کے خیال سے پہلے پہل یورپ میں گیا تھا۔ لیکن اس موقع پر یورپ والوں نے اُن کی زبردست بحری قوت کو دیکھ کے کوشش کی کہ اُن کا استیصال کر دیں۔ چنانچہ قبائلوں کو کتبہ جناب پوپ نے اُن کے خلاف جناد (کروسیڈ) کا فتویٰ دے دیا۔ شاہ قبرس۔ سلطنت جمہوری وینس۔ اور سنیٹ جان کی نیتھ والے مذہبی بانگے جو صلاح الدین اعظم کے ہاتھوں بیت المقدس سے نکالے گئے تھے اور مسیحی دنیا میں خدائی فوجدار بنے پھرتے تھے مع حارمین حضرت پوپ ایک جھنڈے کے نیچے جمع ہوئے۔ مگر لڑائی میں اپنا رنگ کچھ ایسا بگڑتا نظر آیا کہ گھبرا گئے اور وہ بکے صلح کر لی۔

ان موافقانہ و مخالفانہ واقعات نے پوپ صاحب کو ترکوں کی قوت توڑنے کی مصلحت سمجھائی لیکن ترکوں کو جو مصلحت سوچھی وہ انوکھی دلچسپ اور مزہ دار تھی۔ وہ یہ کہ حاکم یونان سے قرابت پیدا کی جائے سلطان اور خان نے کاناکوزین کی حسین و نازنین عروش و پری جہاں بیٹی تھیوڈورا کو کہیں دیکھ لیا تھا۔ اور دیکھتے ہی اُس کے رخ زیبا پر فریفتہ ہو گیا تھا۔ اس پوٹیکل مصلحت کا خیال آتے ہی کاناکوزین سے بہ ادب و تہذیب درخواست کی گئی کہ اگر آپ اپنی بیٹی تھیوڈورا کو میرے عقد نکاح میں دے دیں تو میں آپ کا دوست بن جاؤں۔ اور ایک ادنیٰ خادم اور بیٹے کی طرح آپ سے پیش آیا کروں۔

شریعت اسلام نے کتابیہ یعنی نثرانیہ اور بیویہ عورت کے ساتھ نکاح پہلے ہی سے جائز بتایا تھا۔ مسیحیت کی پُر تعصب دنیا میں اس کا فتویٰ حاصل کرنا البتہ دشوار نظر آتا تھا۔ لیکن جب شہنشاہ قسطنطنیہ کو اس قرابت میں اپنی پوٹیکل مصلحت نظر آئی تو یونانی کلیسا نے بھی ذوق و شوق سے اجازت دے دی۔ اور قسطنطنیہ کے محل میں شہنشاہانہ جشن کا سامان شروع ہوتے ہی

جوش و خروش سے ہریالے گائے جانے لگے۔

خود اور خان دُھن کے بیٹے کو نہیں گیا بلکہ اُس کی جگہ اُس کا سفیر اور بہت سے معزز سرداران ترک ۳۰ ہزاروں پر سوار ہو کے گئے اور مقام سیلبر یا مین پہنچے جہاں دُھن والوں کی طرف سے جشن طرب منعقد ہونے والا تھا۔ شاہانہ جاہ و جلال سے ایک عالیشان کوشک بنا کر حیدر علی کی طرح آراستہ کی گئی۔ جس کے چاروں طرف ریشمی زربار پر دس بڑے ہوئے تھے۔ اور آراستگی کا کوئی سامان نہیں اُٹھا رکھا گیا تھا۔ صبح کا اُٹھنا وقت تھا کہ مسلح فوج زرق وریان اپنے صفیں باندھ کے گرد کھڑی ہو گئی۔ کل اعلیٰ و ادنیٰ افسر ادب سے پایادہ کھڑے تھے فقط سردار کانا کرین گھوڑے کی پیٹھ پر تھا۔ کوشک کے اندر ایک مہر صحن تخت زرین پر مہ جہین تھیوڈورا بڑے بناؤ چٹاؤ کے ساتھ لاکے بٹھائی گئی۔ وہ پرتکلف بھاری کپڑے پہنے تھی۔ سر سے پاؤں تک زبور و جواہرات سے آراستہ تھی۔ بڑی بڑی پوشیاری مشاطاؤں نے اس کا سنگھار کیا تھا۔ اور وہ ایک آسمانی دیوی یا حور بنا کے اپنے تخت زرنگار پر نزاکت و انداز سے بٹھائی گئی۔ جب سب سامان درست ہو گیا تو ایک تڑپ بجی۔ اور اُس کی طلسمی آواز کے ساتھ ہی تمام حاضرین اور سہیلیاں والوں یعنی سرداران ترک کو ایک جادو کا سا کارخانہ معلوم ہوا۔ یعنی وہ تمام زرنگار پردے ایک چشم زدن میں خود بخود کھینچ کے غائب ہو گئے۔ اور نظر آیا کہ شعلین بلند ہیں۔ مستابین چھوٹ رہی ہیں۔ ملائک فریب تھیوڈورا اپنے زرنگار مہر صحن تخت پر جلوہ افروز ہے۔ اُس کی مان شنشاہ بیگم ایرمیا اُس کے برابر بیٹھی شوق و محبت کی نگاہوں سے بیٹی کے پردان چڑھنے کا تماشہ دیکھ رہی ہے۔ اور صد ہا خواجہ سرا۔ فرشتہ صورت غلام اور جوہر طلعت کنیزیں آگے پیچھے اُس کے گرد حلقہ باندھے ہوئے ہیں جو ادب کے ساتھ کھٹے ٹیکے اور ہاتھ جوڑے ہیں۔ گویا سب اپنی پری رخسار دیوی کی پرستش کر رہے ہیں۔ پردوں کے پٹے ہی ہر چار طرف باجے بجنا شروع ہوئے۔

غیری اور شنائی کا نغمہ بلند ہوا۔ نقاروں پر چوبین پڑیں۔ ڈومینون نے میری

ہریائی بڑکا ترانہ گایا۔ اور مستند شعراے زمانہ نے اُس کی مدح کے قصیدے سنائے۔ اس شان اور اُن بان سے بغیر اس کے کہ گرجے میں عقد نکاح کی کوئی رسم ادا ہو دھن رخصت کر کے ترک سفرون کے سپرد کر دی گئی۔ اور خان نے صرف اس بات کا اقرار کیا تھا کہ دھن اپنا مذہب بدلنے پر مجبور نہ کی جائے گی۔ اور کسی سچی رسم کو نہیں قبول کیا تھا۔ جیسے ہی دھن کی سواری برسہ میں پہنچی اور خان نے اپنے چاروں بیٹوں اور تمام بی بیوں حرموں اور مخصوصین دربار کے ساتھ شہر کے باہر آ کے استقبال کیا۔ بیان اسلامی اصول کے مطابق عقد نکاح ہوا۔ اور تھیوڈور اسمانوں کی سلطانہ بنی

ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ

اس کے تسلیم کرنے میں شاید کسی کو عذر نہ ہوگا کہ ہندوستان میں مشرقی تہذیب تمدن کا جو آخری نمونہ نظر آیا وہ گزشتہ دربار اودھ تھا۔ اگلے دور کی یادگار اور بھی کئی دربار موجود ہیں مگر جس دربار پر پرانی تہذیب اور اگلی معاشرت کا خاتمہ ہو گیا وہ یہی دربار تھا جو بہت ہی آخر میں قائم ہوا اور عجیب و غریب ترقیان دکھا کے بہت ہی جلد فنا ہو گیا۔ لہذا سندرجہ بالا عنوان کے تحت میں ہم اس مرحوم دربار کے مختصر حالات اور اُس کی خصوصیتوں کو بیان کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے تسلیم کرنے میں تو شاید کسی کو عذر نہ ہوگا کہ جس خطہ زمین پر یہ پچھلا دربار قائم ہوا اُس کی وقعت اور اہمیت ہندوستان کے تمام صوبوں سے بڑھتی ہوئی ہے۔ پڑانے چندر بنی خاندان خصوصاً راجہ رام چندر جی کے اعلیٰ کارنامے اور عظیم انظیر ناموریاں اس درجہ کمال کو پہنچی ہوئی ہیں کہ تاریخ کے ظرف کو تنگ اور محدود دیکھ کے انھوں نے مذہبی تقدس کا جامہ پہن لیا ہے۔ اور آج ہندوستان کا شاذ و نادر ہی کوئی ایسا بد نصیب گاؤں ہوگا جہاں اُن کا یاد ہر سال رام میلہ کے مذہبی ناٹک کے ذریعے سے تازہ نہ کر لی جاتی ہو۔ لیکن اودھ کے اُس قدیم ترین دیوتائی دربار کے حالات اور اوجو دھیا کا اُس عہد کا جاہ و جلال والیکے ایسی معجز منافحات کے ساتھ دکھایا کہ وہ ہر عقیدت کش کی

روح دل پر لکھ گیا۔ لہذا ہمیں اُس کے اعادے کی ضرورت نہیں۔ جن لوگوں نے ابوجہا کے بُرائے پر شکوہ زمانے کی تصویر دالمیکی کے لٹری مرقع میں دیکھی ہے وہ اُسی مبارک خطے پر آج دگلڈ از میں فیض آباد کی تصویر دیکھیں۔ لہذا ہم سلسلہ واقعات کو اُس وقت سے شروع کرتے ہیں جب اس آخری دربار کی بنیاد پڑی جسے فنا ہوئے کچھ اوپر پچاس سال سے زیادہ زمانہ نہیں ہوا۔

جب نواب برہان الملک امین الدین خان یلشا پوری شہنشاہی دربار دہلی کی طرف سے صوبہ دار اودھ مقرر ہوئے تو شیخرا دگان لکھنؤ کو مغلوب کر کے قدیم مستقرا دھ یعنی محترم و متبرک شہراجو دھیا میں پہنچے اور آبادی سے فاصلے پر دریائے گھاگرا کے کنارے ایک بلند ٹیلے پر اپنا خیمہ نصب کیا۔ چونکہ انتظام صوبہ کی محبت میں اُنھیں عالیشان عمارت بنانے کی فرصت نہ تھی اور نہ اپنی سادہ مزاجی کی وجہ سے ایسے نمائشی کردار کا اُنھیں شوق تھا اس لیے ایک زمانے تک خیموں میں بسر کی۔ اور جب چند روز کے بعد اُنھیں برسات میں تکلیف ہوئی تو وہاں سے تھوڑی دور ہٹ کے ایک مناسب مقام پر اپنے لیے ایک چھپر بنوایا پھر اس کے بعد اُس چھپر کے گرد کچی دیوار کا ایک بہت وسیع مربع حصار کھجوا لیا جس کے چاروں کونوں پر قلعہ بندی کی شان سے چار کچے برج بنوادیئے تاکہ گرد و پیش کی نگرانی کی جاسکے۔ یہ احاطہ اس قدر وسیع تھا کہ اُس کے اندر رسالے۔ پلٹین۔ توپخانے۔ اصطبل اور دیگر ضروری کارخانے آسانی سے رہ سکتے تھے۔ برہان الملک کو چونکہ عمارت کا شوق نہ تھا اس لیے اُن کے زمانے اور ہیگمات کے قیام کے لیے بھی کچے مکانات ہی بنائیے گئے۔ غرض اُس کچے بنگلے میں اُس وقت کا والی اودھ جب اُسے اضلاع کے دورے اور سفر ہائے حکمرانی سے فراغت ہوتی آرام و آسائش کے ساتھ رہتا تھا اور کسی بات کی شکایت نہ تھی۔ اور اُس کا یہ دارالامارت چند روز میں ”بنگلہ“ کے نام سے مشہور ہو گیا۔

عہ فیض آباد کے یہ تمام حالات منشی محمد فیض بخش کی ”تاریخ فوج بخش“ سے لیے گئے ہیں۔ اصل کتاب ہم نے نہیں دیکھی مگر اُس کا انگریزی ترجمہ مترجمہ دلیم ہوئی جو سنہ ۱۳۸۵ء میں گورنمنٹ پریس الہ آباد میں چھپاتے ہمارے پاس موجود ہے۔

برہان الملک کے انتقال کے بعد جب نواب صفدر جنگ کا زمانہ شروع ہوا تو یہ بستی فیض آباد مشہور ہوئی۔ یہ ہے بنیاد شرفیض آباد کی جس نے اپنے بننے اور بگڑنے کی سرعت میں لکھنؤ کو بھی مات کر دیا۔ اب ان دنوں اُس کی جگہ جوار دیوار کے گرد اکثر نعل سرداران فوج نے اپنی دلچسپی کے لیے باغ اور پُر فضا و فرحت بخش نزہت گاہیں بنائیں۔ اور شہر کی رونق ترقی کرنے لگی۔ اس کچے احاطے کا ایک پچھلک "دلی دروازہ" کلاتا تھا جو مغرب کی طرف تھا اس کے باہر دیوار ان آتما رام کے بیٹوں نے ایک شاندار بازار بنوایا۔ اور اُسی کے سلسلے میں رہنے کے لیے مکانات بھی تعمیر کرائے۔ اسی طرح اسماعیل خان رسالدار نے بھی ایک بازار بنوایا۔ اور چار دیواری کے اندر خواجہ سراؤں اور مختلف فوجی لوگوں کے بہت سے مکان بھی تیار ہو گئے۔

نواب صفدر جنگ کی وفات کے بعد اس نئی بستی پر چند روز کے لیے تباہی برس گئی۔ جس کی وجہ سے اتنے دنوں میں جو کچھ بنا تھا زمانے نے بگاڑ کے دکھ دیا۔ اس لیے کہ اُن کے فرزند نواب شجاع الدولہ نے اپنی سکونت کے لیے لکھنؤ کو پسند کیا تھا اور وہیں رہتے تھے۔ گو سال میں دو ایک راتیں اپنے باپ دادا کے اس قدیم مسکن میں ضرور بسر کر لیا کرتے۔ یہاں تک کہ ۱۲۶۳ھ میں انھیں بکسر کی لڑائی میں انگریزوں سے شکست ہوئی۔ اُس وقت وہ کمال پورہ سامانی سے بھاگتے ہوئے فیض آباد میں آئے اور وہاں کوٹلہ میں جو کچھ ساز و سامان موجود پایا لے کے راتوں رات چل کھڑے ہوئے۔ اور لکھنؤ پہنچے۔ یہاں بھی ایک ہی رات قیام کر کے جو کچھ ہاتھ آیا لیا اور بریلی کی راہ لی۔ تاکہ انا غنہ رُو ہلکھنڈ کے پاس جا کے پناہ لیں۔ لڑائی کے نو مہینے بعد انگریزوں سے اُن سے صلح ہو گئی۔ جس کی رُو سے شجاع الدولہ کے ذمے واجب تھا کہ محاصل ملک میں سے بیچ آتی انگریزوں کو ادا کیا کریں۔

صلح ہونے سے پہلے اس سفر میں اتفاقاً شجاع الدولہ کا گزر فرخ آباد میں بھی ہوا تھا جہاں احمد خان بنگش سے ملاقات ہوئی جو اُس عہد کے پُرانے تجربہ کار شجاعوں میں خیال کیے جاتے تھے۔ انھوں نے شجاع الدولہ کو مشورہ دیا کہ اب کی

جو تم جاکے عنان حکومت ہاتھ میں لینا تو میری این دو باتوں کو نہ بھولنا۔ ایک تو یہ کہ
مغلون کا کبھی اعتبار نہ کرنا بلکہ اپنی دیگر ملازمتوں اور خواجہ سراؤں سے کام لو۔ اور
دوسرے یہ کہ کھنڈ کا رہنا چھوڑو اور فیض آباد ہی کو اپنا دارالحکومت بناؤ۔
یہ باتیں شجاع الدولہ کے دل پر بیٹھ گئیں۔ اور انگریزوں سے معاہدہ ہونے
کے بعد ۱۸۵۷ء میں جو انھوں نے اپنی قلمرو کی راہ لی تو سیدھے فیض آباد آئے
اور اُسی کو اپنا دارالحکومت قرار دے دیا۔ اب یہاں انھوں نے نئی فوج بھرتی
کرنا شروع کی۔ نئے رسالے مرتب کرنے لگے۔ اور نئی عمارتوں کی بنیاد ڈالی۔ پُرانے
حصار کو ایک مضبوط شہر پناہ کی شان سے از سر نو تعمیر کرایا۔ جو اب قلعہ کہلاتا تھا۔
مغلون کے جو مکانات اندر واقع تھے ڈھا دیے۔ اور اپنے اکثر خانگی ملازمتوں
کو حکم دیا کہ شہر پناہ کے باہر مکان بنوائیں۔ اُس حصار کے گرد اگر دہرطن دو دو
میل کا میدان چھوڑ دیا گیا جس کے گرد گہری خندق کھود کے قلعہ بندی کی وضع سے
درست کی گئی۔ اور ملازمین سرکار اور افسران فوج کو اجازت ہوئی کہ اپنی حیثیت اور حالت
کے مناسب قطععات زمین لے کے اُسی میدان میں مکان بنائیں۔ جیسے ہی یہ خبر مشہور
ہوئی کہ شجاع الدولہ نے فیض آباد کو اپنا مستقر قرار دیا ہے ایک دنیا کا رٹن ادھر
پھر کیا۔ ہزار ہا خلقت آ کے آباد ہونا شروع ہوئی۔ شاہجہان آباد میں یہ حالت
تھی کہ جسے دیکھیے فیض آباد جانے کے لیے تیار ہے۔ چنانچہ وہاں کے اکثر بالکالوں نے
وطن کو خیر باد کہی اور پورب کا رخ کیا۔ شب و روز لوگوں کے آنے کا تانا باندا
رہتا تھا۔ اور قافلے پر قافلے چلے آتے تھے۔ جو آ کے یہاں بستے اور فیض آباد کی
سواد میں کھپتے چلے جاتے۔ چند ہی روز کے اندر ہر قوم و ملت کے خوش باش۔
اہل قلم۔ اہل سیف۔ تاجر۔ صناع۔ اور ہر طبقے اور ہر درجے کے لوگ یہاں جمع
ہو گئے۔ اور جو آتا آتے ہی اس فکر میں پڑ جاتا کہ کوئی قطعہ زمین حاصل کر کے
مکان بنائے۔

چند ہی سال کے اندر اس پہلے حصار کے علاوہ دو اور فصیلین تعمیر ہو گئیں۔ ایک
جو پہلے مربع کے جنوبی پہلو سے لی ہوئی تھی اُس کے رقبے کا طول و عرض دو میل کا
تھا۔ اور دوسرا حصار ایک میل کے پھیلاؤ میں تھا جو تعلقہ اور بیرونی فصیل کے درمیان

واقع تھا۔ اسی زمانے میں ترپور یا اورچوک بازار تعمیر ہوئے۔ جن کی سڑک قلعہ کے جنوبی پھاٹک سے شروع ہو کر سڑک آباد کے ٹکڑے تک چلی گئی تھی اور اتنی کشادہ تھی کہ برابر برابر دس چھکڑے آسانی سے گزر سکتے تھے۔ انیس شہر کا اثنا رزمین کے پاس چاہے جتنا ہو درمیان میں دس گز سے کم نہ تھا جو اور پورچ کے پانچ گز رہ گیا تھا۔ اس تفصیل پر قاعدہ اور بے قاعدہ دونوں طرح کی فوجوں کے دستے رات بھر روند پھرا کرتے۔ اور جا بجا پردہ دیتے۔ باقاعدہ سپاہیوں کی دردی لال تھی اور بے قاعدہ سپاہیوں کی دردی سیاہ۔ انیس سپاہیوں کی ضرورت سے برسات میں تفصیل پر جا بجا چھپر ڈال دیے جاتے مگر برسات کے ختم ہونے ہی آگ لگنے کے اندیشے سے وہ لازمی طور پر اُتار ڈالے جاتے۔ چنانچہ صرف تفصیل کی دیواروں کے لیے ہر سال تقریباً ایک لاکھ چھپر چھائے اور چار مہینے بعد نوبت کے پھینک دیے جاتے۔

عالی شہر میں دو مرغزار شکار گاہ قرار دیے گئے تھے جن میں سے ایک مغرب کی جانب گرجی بیگ خان کی مسجد سے گیتار گھاٹ تک چلا گیا تھا جو ایک معتد بہ مسافت ہے۔ اُس کے دونوں طرف کچی دیوار بن تھیں اور تیسری طرف لگا کر واقع ہوئی تھی۔ اس میں ہرن چیتے۔ بارہ شگے۔ نیل کائین وغیرہ شکار کے جانور کثرت سے چھوڑے گئے تھے۔ جو نہایت آزادی سے چھوٹے چھوٹے پھرتے اور بھڑکتے ہی چوڑیاں بھرنے لگتے۔ دوسری شکار گاہ شہر سے مشرق طرف موضع جنورا اور چھاؤنی گوشائین سے دریا کنارے تک تھی جس کا پھیلاؤ چھ میل کا تھا۔ اس کے رقبہ میں گیارہ موضع اور اُن کی اراضی آگئی تھی۔ مگر یہ شکار گاہ ناقص ہی رہی۔ اور اس کی نوبت نہ آنے پانی کہ اُس میں وحشی جانور چھوڑے جائیں۔

خاص شہر کے حلقے کے اندر تین ایسے نزہت بخش باغ تھے جو اس قابل تھے کہ امرا اور شاہزادے آکے اُن میں سیر کریں اور اُن کی بہار اور شادابی سے لطف اُٹھائیں۔ ایک انگوری باغ جو قلعہ کے اندر واقع تھا۔ اور اُس کے رقبہ کے چوتھائی حصہ پر عادی تھا۔ دوسرا موتی باغ جو عین چوک کے اندر واقع تھا۔

تیسرا لال باغ جو سب باغوں سے زیادہ وسیع تھا۔ اس میں نہایت ہی نفاست سے
چمن بندی کی گئی تھی۔ اور ہر طرح کے نازک و نظر فریب پھول قرینے سے لگائے گئے
تھے۔ سارے صوبے میں اس کی شہرت تھی۔ اور دور دور کے لوگوں کو تنہا تھی کہ
کوئی خوش نصیبی کی شام اس روح افزا باغ میں بسر کریں۔ شہر کے نوجوان شرفاء
غول روز سہ پہر کو اُس میں گشت لگاتے اور دل بہلاتے نظر آتے۔ اس باغ کی
جان فزائی کی شہرت یہاں تک تھی کہ شہنشاہ دہلی شاہ عالم بادشاہ جب الہ آباد سے
پلٹے تو اسی باغ کی سیر کے شوق میں فیض آباد ہوتے ہوئے دہلی گئے۔ اور کچھ
زمانے تک اسی کے اندر اُن کا قیام رہا۔ ان تین باغوں کے علاوہ آصف
باغ اور بلند باغ بھی نواح شہر میں لکھنؤ کے راستہ پر واقع تھے۔

نواب شجاع الدولہ بہادر کو شہر کی درستی کا اس قدر شوق تھا کہ ہر صبح و شام سوار
ہو کے سڑکوں اور مکانات کو معائنہ کرتے۔ مزدور پھروے اور کوالین لیے ہوئے
ساتھ ہوتے۔ جہاں کہیں کسی مکان کو ٹیڑھا اور اپنی حد سے بڑھا ہوا پاتے یا کسی
دکاندار کو دیکھتے کہ اُس نے سڑک کی زمین بالشت بھر بھی دبالی ہے فوراً اُس سے
لکھدے کے برابر اور سیدھا کر دیتے۔

فوج کی اصلاح کی طرف بھی شجاع الدولہ کو خاص توجہ تھی۔ رسالے کے اعلیٰ
سردار نواب مرتضیٰ خاں برتج اور بہت بہادر اور اُمراؤ گریہ نام دو گو شائین تھے۔
ان کے ماتحت اتنے سوار تھے کہ ان میں کے علاوہ اونچے چھوٹے چھوٹے جمہدار تھے
سب کی فوج کی مجموعی تعداد سے ان میں سے ہر ایک کی جمعیت زیادہ تھی۔ دیگر
سردار ان فوج احسان کبوتری۔ گرجی بیگ خاں گوتال راؤ مرہا۔ میر جملہ کے
دادا نواب جمال الدین خاں۔ مظفر الدولہ تنویر جنگ بخشی ابوالبرکات خاں
ساکن کا کوری۔ اور محمد معز الدین خاں لکھنؤ کے ایک شیخ اوسے تھے۔ ان میں سے
کوئی نہ تھا جس کے ماتحت نہرا پانسو سپاہیوں کا گروہ نہ ہو۔ ماسوا ان کے
خواجہ سرا اور وہ نو عمر خواجہ سرا جو اُن کے زیر نگرانی تربیت پاتے۔ چیلے۔ اور
شاگرد پیشہ تھے۔ بسنت علی خاں خواجہ سرا کے ماتحت دو دویژن فوج یعنی
چودہ ہزار باقاعدہ فوج تھی جس کی وردی سرخ تھی۔ ایک دوسرا بسنت خواجہ سرا

تھا جس کے زیرِ کمان ایک ہزار بے قاعدہ نیزہ باز سوار اور ایک پلٹن تھی۔ منبر علی خان خواجہ سرا کی افسری میں پان سو سوار اور ایک پلٹن تھی۔ جن کی درویان سیاہ تھیں۔ محبوب علی خان خواجہ سرا کے زیرِ علم پان سو سوار اور چار پلٹن تھیں۔ اتنی ہی فوج لطافت علی خان کے ماتحت تھی۔ رگھوناتھ سنگھ اور پرشا سنگھ میں سے ہر ایک کے زیرِ کمان تین تین سو سوار اور چار چار پلٹن تھیں۔ اسی طرح مقبول علی خان اول و دوم اور یوسف علی خان کے ہمراہ پان پان سو مغل سواروں اور پیدلون کی جمعیت تھی۔ اور تو پچانہ بے حد دے حساب تھا۔

لہذا کل فوج جو شجاع الدولہ کے قبضہ میں تھی اور فیض آباد میں موجود ہارکتی اُس کی مجموعی تعداد یہ تھی۔ سرخ وردی والے تیس ہزار باقاعدہ اور سیاہ وردی والے چالیس ہزار بے قاعدہ پیادے۔ ان کے افسر اعلیٰ یعنی سپہ سالار اعظم سید احمد تھے جو "بائسی والا" کے لقب سے مشہور تھے۔ جلدی بھرنے اور زیر کرنے کے اعتبار سے ان کی توڑے دار بندو قوں کے مقابلے میں انگریزی فوج کی بندو قین کوئی وقعت نہ رکھتی تھیں۔

اس جمعیت کے علاوہ شجاع الدولہ کے پاس بائیس ہزار ہر کار سے ادخیر تھے۔ جو ہر ساتویں روز پوناسے اور ہر پندرہویں دن کابل سے خبریں لاتے۔ دربار میں ہمیشہ بلا دور و دراز کے حکمرانوں کے نائب موجود رہا کرتے۔ ایک نائب مرہٹوں کا تھا۔ ایک نظام علی خان فرمان رواے دکن کا۔ ایک ضابطہ خان کا۔ اور ایک نواب ذوالفقار الدولہ نجف خان کا۔ جن کے ساتھ اُن کے دفتر اور سپاہی بھی کئے۔ ان لوگوں کے علاوہ اور بھی بہت سے فوجی افسر اپنی جمعیتوں کے ساتھ بیان موجود رہتے۔ جیسے میر نعیم خان جن کے جھنڈے کے نیچے ثنابت خانی بند کھینڈی چندیلہ اور میواتی سپاہیوں کا ہجوم تھا۔

محمد بشیر خان قلعہ دار تھے شہر کی فصیولوں اور پچھلکوں پر انھیں کے سوار اور پیادے پھیلے رہتے۔ اور قلعے کے اندر ہی اُن کے رہنے اور دفتر کے لیے عمدہ مکانات اور اُن کے سپاہیوں کی بارکین بنی ہوئی تھیں۔ جب ہر دنی دیواروں میں بھی جگہ نہ باقی رہی تو سید جمال الدین خان اور گوپال راؤر ٹھانے

باہر نکل کے موضع نور اہی کے پاس سکونت اختیار کی اور اپنے مکانات اور کھج
دہان بنائے۔ اور اس جگہ کی تنگی کی وجہ سے نواب مرتضیٰ خان بریج میزاج
بانی دالا۔ میرا پو ابھرا کات اور شیخ احسان اچوہیا اور فیض آباد کے درسیان
جینون میں رہتے تھے۔

آدمیوں کی کثرت اور سپاہیوں کے ہجوم سے شہر کے اندر خصوصاً چوک میں
اس قدر بھڑکائی رہتی کہ گزرنے والے شوار تھا۔ اور غیر ممکن تھا کہ کوئی شخص بغیر اس کے
ہوئے سیدھا چل جائے۔ فیض آباد نہ تھا انسانوں کا جنگل تھا۔ بازار میں دھچک
لگوں لگوں کا مال ڈھیر تھا۔ اور یہ خبر سننے کے کہ فیض آباد میں نفیس مراعات
رہیدن اور شوقین امیروں کا منتخب مجمع ہے ہر طرف سے تاجروں کے قافلے
لے پھندے چلے آتے تھے۔ اور چونکہ چاہے کیسا ہی قیمتی مال ہو ہاتھوں ہاتھ
بک جاتا اچھی سے اچھی چیزوں کے آنے کا سلسلہ بندھ گیا تھا جب وہیں
ایرا آئی۔ کابلی۔ چینی۔ اور فرنگی سوداگر نہایت گران قیمت اور بھاری مالی
لئے ہوئے موجود رہتے۔ اور جو جو نفع اٹھاتے ہوس بڑھتی اور زیادہ جستہ
جائے نشانی سے نیا مال لے آتے۔ سیوڑان تیل سیوڑان سون اور سیوڑان پیرور
وغیرہ کے ایسے دوسو نرانیسی جو یہاں اقامت گزین ہو گئے تھے سرکاری زمین
ملازم تھے۔ اور شجاع الدولہ کی سلطنت سے روابط اتحاد رکھتے تھے جو سپاہیوں
کو فوجی تعلیم دیتے۔ اور توپیں بندوقین اور دیگر اسلحہ جنگ اپنے اہتمام میں
تیار کراتے۔

منشی فیض بخش مصنف تاریخ فرخ بخش جن کی عنایت سے میں یہ दा تعات
معلوم ہوئے ہیں خود اس زمانے میں موجود تھے اور انھوں نے جو کچھ لکھا ہے
اپنے مشاہدے سے لکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں جب پہلے پہل گھر چھوڑ کے فیض آباد
میں گیا ہوں ممتاز نگر ہی تک پہنچا تھا جو شہر کے مغربی پھاٹک سے چار میل
کی مسافت پر ہے میں نے دیکھا کہ ایک درخت کے نیچے انواع و اقسام کی خطائیاں
گرنے لگی ہیں۔ کباب۔ سالن۔ روٹیاں۔ اور پراٹھے وغیرہ بک رہے ہیں۔
سبیلین رکھی ہوئی ہیں۔ نان خطائیاں مختلف قسم کے شربت اور فالودہ بھی

بک رہا ہے اور عہد ہادی خریداری کے لیے اُن دکانوں پر گرسے پڑتے ہیں۔ بنگے خیال گزرا کہ میں شہر کے اندر داخل ہو گیا اور خاص چوک میں ہوں۔ مگر متحیر تھا کہ ابھی تک شہر کا پھاٹک تو آیا ہی نہیں میں اندر کیسے پہنچ گیا ہوں گویا سے پہنچا تو ایک راہ گیر نے کہا ”جناب شہر کا پھاٹک یہاں سے چار میل ہے۔ آپ کس خیال میں ہیں؟“

اُس جواب پر حیرت کرتا ہوا میں شہر میں داخل ہوا تو عجیب چل پھل نظر آیا۔ رنگینیاں تھیں اور دیکھپیان۔ جہدھر دیکھتا ہوں ناچ ہو رہا ہے۔ مداری تماشکر رہے ہیں۔ اور لوگ طرح طرح کے سیر تاشوں میں مصروف ہیں۔ میں یہ رونق اور شور و ہنگامہ دیکھ کے بہوت رہ گیا۔ صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک کوئی وقت نہ ہوتا جب فوج اور پلٹھوں کے نقاروں کی آواز نہ سنی جاتی ہو۔ پہوٹ اور گھڑیوں کے بتانے کے لیے بار بار نوبت بجتی اور گھڑیاؤں پر موگیاں پڑتیں جن کے شور غل سے کان اڑے جاتے۔ سڑکوں پر دیکھیے تو ہر دم گھوڑوں۔ ہاتھیوں۔ اونٹوں۔ خچروں۔ شکاری کتوں گائے بھینسوں۔ بیلوں۔ چھکڑوں۔ اور توپوں کے گزرنے کا سلسلہ جاری رہتا۔ جن کا شمار حساب اور اندازے سے باہر تھا۔ راستہ چلنا دشوار تھا۔

ایک عجیب رونق و تگت کا شہر نظر آیا جس میں وضع داران دہلی میں سے خوش پوشاک اور وضع دار شریف زادے۔ حاذق اطباء یونانی۔ اعلیٰ درجے کے مردانے اور زنانے طائفے۔ ہر شہر اور ہر مقام کے مشہور اور باکمال گویتے سرکار میں ملازم تھے۔ اور بڑی بڑی تنخواہیں پا کے عیش و فراغ الہامی کی زندگی بسر کرتے۔ ادنیٰ و اعلیٰ سب کی جمعیں روپوں اشرفیوں سے بھری ہوئی تھیں۔ اور ایسا نظر آتا کہ جیسے یہاں کبھی کسی نے افلاس و احتیاج خواب میں بھی نہیں دیکھا ہے۔ نواب وزیر (نواب شجاع الدولہ بہادر) شہر کی سرسبزی و رونق اور رعایا کی مرفہ الحالی میں ہمہ تن مصروف تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ چند ہی روز میں فیض آباد دہلی کی ہمسری کا دعویٰ کرے گا۔

چونکہ کسی مملکت اور کسی شہر کا رئیس اُس نفاست اور شان و شکوہ سے نہیں

رہتا تھا جس طرح کہ نواب شجاع الدولہ رہتے تھے۔ اور اُس کے ساتھ ہی یہ نظرات
 تھا کہ کہیں کے لوگ اس بے جگری سے ہر کام میں اور ہر موقع و محل پر دولت صرف
 کرنے کو نہیں تیار ہو جاتے تھے۔ اس لیے ہر قسم کے اور ہر جگہ کے اعلیٰ دستکار و
 صناعتی اور طالب علموں نے وطن کو خبر باد کہہ کے فیض آباد ہی کو اپنا مسکن
 بنالیا۔ اور یہاں ہر زمانے میں ڈھاکے - بنگالے - گجرات - مالوہ - حیدر آباد -
 شاہجہان آباد - لاہور - پشاور - کابل - کشمیر - اور ملتان وغیرہ کے طالب علم
 ایک بڑا بھاری گروہ موجود رہتا جو ملاکی درس گاہوں میں تعلیم پاتے۔
 اور اُس چشمہ علم سے جو فیض آباد میں جاری تھا سیراب ہو ہو کے اپنے گھروں کو
 واپس جاتے۔ کاش نواب دزیر اور دس بارہ برس جی جاتے تو گھراگرا کر
 ایک نیا شاہجہان آباد آباد ہو جاتا۔ اور دنیا ایک نئی زندہ دہلی کی صورت
 دیکھ لیتی۔

یہ نواب شجاع الدولہ کے صرف نو سال کے قیام کا نتیجہ تھا جس نے فیض آباد
 کو ایسا بنا دیا۔ اور ان نو سال میں بھی صرف برسات کے چار مہینے وہ شہر میں
 رونق افروز رہتے۔ باقی زمانہ اپنی قلمرو کے مدرسے اور سیر و شکار میں صرف
 ہوتا تھا۔ شجاع الدولہ کا طبعی میلان مہجبین عورتوں کی اور رقص و سرود
 کی طرف تھا جس کی وجہ سے بازاری عورتوں اور ناچنے والے طاغون کی
 شہر میں اس قدر کثرت ہو گئی تھی کہ کوئی گلی کو چہ اُن سے خالی نہ تھا۔ اور
 نواب کے انعام و اکرام سے وہ اس قدر خوش حال اور دوہمذہب تھیں کہ اکثر
 رنڈیاں ڈیرہ دار تھیں جن کے ساتھ دو دو تین تین عالیشان خیمے رہا کرتے۔
 اور نواب صاحب جب اخلاص کا دورہ کرتے اور سفر میں ہوتے تو نوابی
 خیموں کے ساتھ ساتھ اُن کے خیمے بھی شاہانہ شکوہ سے چھکڑوں پر لٹکے
 روانہ ہوتے اور اُن کے گرد دس دس بارہ بارہ تلگوں کا پہرہ رہتا۔
 اور جب حکمران کی یہ وضع تھی تو تمام امرا اور سرداروں نے بھی بے تکلف
 یہی وضع اختیار کر لی۔ اور سفر میں سب کے ساتھ رنڈیاں رہنے لگیں۔ اگرچہ
 اس سے بد اخلاقی اور بے شرمی کو ترقی ہو گئی لیکن اس میں شک نہیں کہ ان

شاہان بازاری کی کثرت اور اُمرا کی شوقینی سے شہر کی رونق بدرجہا زیادہ بڑھ گئی تھی اور فیض آباد ملن بن گیا تھا۔

شجاع الدولہ نے مغرب کا سفر کیا۔ اس سفر میں شاہی کیمپ کی رونق اور چلن پہل بیان سے باہر تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ نوابی علم اقبال کے ساتھ ساتھ ایک بڑا بھاری شہر سفر کر رہا ہے۔ لکھنؤ ہوتے ہوئے اٹاوس پہنچے جس پر سرچے قابض تھے۔ ایک ہی خط میں اُسے اُن سے چھین کے اپنے قبضے میں کیا۔ اور احمد خان بگیش کی قلعہ دین داخل ہو کے کوریا گنج اور کاس گنج میں خیمہ زن ہوئے۔ یہاں سے اُنھوں نے حافظ رحمت خان فرمان روا سے بریلی کو لکھا کہ گزشتہ سال میں نے ایک کروڑ روپے مہاجی سینہ صیامرٹے کو بھیجے تھے جس نے آپ کا وہ تمام علاقہ جو درمیان دو آب ہے آپ سے چھین لیا تھا۔ وہ رقم ادا کر کے میں نے آپ کا وہ علاقہ اُس کے قبضے سے چھڑایا اور آپ کے حوالے کر دیا لہذا اب پچاس لاکھ کی رقم جو آپ کی طرف سے میں نے ادا کی تھی فوراً ادا کیجیے۔ حافظ رحمت خان نے اپنے تمام افغان سرداروں اور بھائی بندوں کو جمع کر کے کہا ”شجاع الدولہ لڑائی کے لیے ہانڈھوڑھ رہے ہیں۔ مناسب یہ ہے کہ یہ مطلوبہ رقم ادا کر دی جائے۔ میں لاکھ میں اپنے پاس سے دیتا ہوں اور مالیتی تیس لاکھ تم جمع کرو۔“ نانا عاقبت اندیش پٹھان سرداروں نے جواب دیا ”شجاع الدولہ کے سپاہی دیکھنے ہی کے ہیں وہ بھلا ہم سے کیا مقابلہ کر سکیں گے۔“ باقی رہی انگریزی فوج جو اُن کے ساتھ ہے تو اُن کی تو پون پر جس وقت ہم تلواریں سوت سوت کے جاڑیں گے سب کے حواس جاتے رہیں گے۔ دینے لینے کی کچھ ضرورت نہیں۔“ حافظ رحمت خان نے یہ سن کے کہا ”تھیں اختیار ہے۔“ مگر میں ابھی سے کہہ رہا ہوں کہ اگر لڑائی کا رنگ بدلاتو میں میدان سے زندہ نہ آؤں گا۔ اور اُس کا جو کچھ انجام ہو گا وہ تمھیں کو بھگتنا پڑے گا۔“ بہر تقدیر شجاع الدولہ کو اپنی خواہش کے موافق جواب نہ ملا۔ فوج لے کے چڑھ گئے۔ لڑائی ہوئی۔ اور لڑائی کا وہی انجام ہوا۔ جسے تقدیر نے حافظ رحمت خان کی زبان سے پہلے ہی سنوا دیا تھا۔ حافظ صاحب شہید ہوئے۔

اور اُن کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ مگر یہ فتح شجاع الدولہ بہادر کو کبھی سزاوار نہ ہوئی۔ ۱۳ رصفہ ۱۸۸۸ء (۱۲۸۸ھ) کو لڑائی ہوئی تھی۔ ارشاد بن کو شجاع الدولہ بریلی سے کوچ کر کے لکھنؤ آئے۔ ماہ مبارک رمضان لکھنؤ میں بسر کیا۔ ۸ شوال کو لکھنؤ سے کوچ کر کے ۱۲ کو فیض آباد میں داخل ہوئے۔ اور فتح کو مہینے دس ہی دن ہوئے تھے۔ اور گھر میں پورے ڈیڑھ مہینے بھی آرام کرنے کا موقع نہیں ملا تھا کہ ۲۳ رذیقہ ۱۲۸۸ھ (۱۲۸۸ھ) کو رگڑا سے عالم جاودان ہوئے۔ اور افسوس اُن کی وفات ہی کے سا تھ فیض آباد کی ترقی کا دور بھی ختم ہو گیا۔

اس وقت حکومت اودھ میں سب سے بڑا اثر نواب شجاع الدولہ بہادر کی بی بی بہو بیگم صاحبہ کا تھا۔ جو نہایت ہی دولت مند بھی سمجھی جاتی تھیں۔ اُن کی منظوری سے نواب آصف الدولہ مسند نشین حکومت ہوئے۔ مگر اُن کی اخلاقی حالت نہایت خراب تھی۔ اور مصاحبوں کو مناسب معلوم ہوا کہ ان بیٹوں کو الگ رکھیں۔ چند روز تک سیر و شکار میں مصروف رہنے کے بعد نواب آصف الدولہ بہادر نے لکھنؤ میں قیام اختیار کر لیا۔ جوہیں سے بیٹھے بیٹھے مان کو ستا یا کرتے۔ اور بار بار اُن سے روپیہ طلب کرتے۔

بہو بیگم صاحبہ کے موجود رہنے سے فیض آباد کو اُن کی زندگی تک تھوڑی بہت رونق حاصل رہی۔ اگرچہ اُن کی زندگی میں بھی نواب آصف الدولہ کی نالا فقیوں نے بہو بیگم صاحبہ کے اطمینان میں اور اس کی وجہ سے فیض آباد کے امن و امان میں خلل ڈالا۔ مگر اُس محترم خاتون کی زندگی تک وہ جھگڑے اور ہنگامے بھی ایک گونہ باعث رونق ہو جایا کرتے تھے اُن کی وفات پر فیض آباد کی تاریخ ختم ہو گئی۔ اور لکھنؤ کا دور شروع ہوا جس کا حال ہم آئندہ لکھیں گے۔

مغرور جوتا

میں اپنے ٹوٹے ہوئے جوتے کو اتار رہا تھا کہ اُس نے اور دانت نکال دیئے۔ اور

میں ایسا جھنجھلا یا کہ اُسے نوچ کے پھینک دیا۔ میری یہ متکبرانہ برہمی اُس ناگوار سی
گزر سی اور زبان حال سے بولا "میرا قصور ہے" میں نے بے پروائی سے کہا "۶"
کفش چوں دندانِ نمایدے کند اند یاے دورے اُس نے کہا "خیر آپ کو میری
ضرورت نہیں رہی ہے تو نکال دیجئے مگر یوں ذلیل کر کے تو نہ نکالئے؟" اُس کے
اس غرور پر مجھے ہنسی آگئی۔ اور کہا تمہیں دنیا میں تجھ سے بھی زیادہ ذلیل کوئی
چیز ہے؟ تو انسان کے افضل ترین حصہ جسم سے وابستہ ہے۔ ہر وقت پاؤں سے
کچلا اور رونداجاتا ہے۔ اور ہمیشہ راستہ کی بجائے سٹون میں آلودہ ہوتا
رہتا ہے۔ تہذیب کی صحبتوں میں تیرا گزر نہیں ہو سکتا۔ صفائی کی مغفون
میں تو گھسنے نہیں پاتا۔ ہم جب کبھی کسی احسان فراموش کو دیکھ کے کہتے ہیں کہ یہ
ہماری ہی جوتیوں کا صدقہ ہے اس وقت تجھے انتہا درجے کی ذلت سے دیکھتے
ہیں۔ اور ہماری محبوبہ فرحبین نے کل جو اپنی زلف برہم کی طرح پیچ و تاب
لکھا کے "میری جوتی کی نوک سے" کہا تھا تو اُس نے تجھے حد سے زیادہ
حقیر خیال کیا تھا۔ تو یہ بھی نہیں دیکھتا کہ جسے کمال درجہ ذلیل کرنا ہوتا ہے
اُسے تیری ماری ماری جاتی ہے؟ اور تیری ایک بے نتیجہ چوٹ بھی اپنے
سِر و سنان اور شمشیر و خنجر کے ہزار جان ستان زخموں سے زیادہ ناگوار
گزرتی ہے؟ یہ سب کیوں؟ اس لیے کہ تو نہایت ہی حقیر اور حد سے زیادہ
ذلیل ہے۔ لیکن باوجود ان سب باتوں کے تجھے بیجا بیائی سے اپنی عزت کا
خیال ہے؟

میں سمجھتا تھا کہ یہ باتیں اس سرکش جوتے کو خاموش کر دیں گی مگر اُس پر
کچھ اثر نہ ہوا اور بولا "یوں تو آپ کو اختیار ہے کہ اپنے نزدیک جسے چاہیں
متغز خیال کر لیں اور جسے چاہیں ذلیل کریں۔ لیکن خدائی فیصلہ آپ کی تجویز
اور مرضی سے نہیں ہو سکتا۔ خدا نے ہر شخص اور ہر چیز کو اپنے مقام پر ایک
نفیلت اور خصوصیت عطا کی ہے جس پر وہ جس قدر فخر و ناز کرے بجا ہے۔
لیکن اُس پر آپ کی طرح کسی کو اترا انداز چاہیے۔ مجھ میں اگر کوئی ذلت کی
بات ہے تو وہ آپ کی بدولت ہے۔ آپ اپنے گھر میں مجھے ذلیل سمجھا کریں۔

لیکن میں اپنی جگہ پر غور کرتا ہوں تو اپنے مین کوئی ذات و حقارت کی بات نہیں پاتا۔ میں جس چیز سے بنا ہوں اُسی سے آپ کا جسم بنا ہے۔ یہی زندگی یہی نرمی۔ یہی حس۔ اور یہی خوبی جو آپ کی کھال میں ہے کبھی مجھے مین بھی تھی۔ یہی غذائیں جو روز آپ کا جزد بدن ہوا کرتی ہیں کبھی میرا جزد بھی ہوا کرتی تھیں۔ مرنے کے بعد میری حالت آپ سے اچھی ہی رہی۔ مین تو سڑے گلے سے بچ کے آپ کے پاؤں کا لباس بن گیا۔ آپ کی کھال میں اگر نفع رسانی خلق کا کوئی مادہ شاید ہو بھی تو اس مستعار زندگی ہی تک ہے۔ مرنے کے بعد آپ کے جسم کے کسی حصہ کو خلق اللہ کی خدمت کا کوئی موقع ملے اس کی ہرگز امید نہیں۔ ممکن تھا کہ میں ایک پڑتکلف ٹوپی کا استر بن کے آپ کے سر پر جا پہنچتا۔ ممکن تھا کہ میں پوستین کی صورت میں نمودار ہو کے آپ کے جسم سے لپٹ جاتا۔ ممکن تھا کہ میں ایک بیٹی بنتا اور آپ کی کمر میں بندھا رہتا۔ اور ممکن تھا کہ میں کوئی اور ایسی خوبصورت چیز بن جاتا جسے آپ نہایت عزیز رکھتے؟

جوتے کی ان داغخانہ باتوں سے مین دل میں کانپ گیا مگر یہ اچھا نہ معلوم ہوا کہ ایک ایسی ذلیل شے سے قائل ہو جاؤں۔ جواب دیا "ان صورتوں میں سے جو صورت ہوتی ویسی ہی تمہاری قدرو منزلت بھی کی جاتی۔ مگر اب تو تم ایک جوتے ہو اور ٹوٹے ہوئے جوتے! ایسی حالت میں عزت کا نام لیتے تھیں شرم نہیں آتی؟" مگر وہ جوتا بھی کچھ ایسا جھنجھلایا ہوا تھا کہ کسی طرح جان نہ چھوڑی اور کہا "مین تو جوتا ہونے میں بھی اپنی توہین و تذلیل کی کوئی وجہ نہیں پاتا۔ جوتا ہونے سے کیا کوئی ذلیل ہو جاتا ہے؟ اگر میں آپ کے بادشاہ یا کسی معمولی حاکم ہی کا جوتا ہوتا تو آپ زمین پر سر رکھ کے مجھے چومتے۔ اگر میں آپ کے مرشد یا کسی دلی اللہ کا جوتا ہوتا تو آپ مجھے باوجود شکستگی کے آنکھوں سے لگاتے۔ اگر میں آپ کے استاد یا کسی دوسرے بزرگ کا جوتا ہوتا تو آپ اپنی سعادتمندی تصور کر کے مجھے سیدھا کرتے۔ اور بالفرض اگر میں اُسی مہجبین کی جوتیان ہوتا جس کے "میری جوتی کی نوک سے" کہتے ہیں آپ کو میری حقارت نظر آئی تو آپ میری مار کو بڑے شوق اور مزے سے کھاتے۔ اب آپ ہی

فرمائیے کہ جوتا ہونے سے میری کیا آبرو لکھ گئی؟ ہاں اس بات کو میں البتہ مان لوں گا کہ آپ کے ایسے ناطق شناس انسان کی پاپوش بننے سے میری عزت جاتی رہی۔ اور مجھ میں ذلت و حقارت جو کچھ ہے آپ کو ملنے آپ کے پاس آئے اور آپ کی صحبت میں رہنے کی وجہ سے ہے۔

اب گفتگو مٹنے ایسی صورت اختیار کر لی تھی کہ اپنی کمزوری ظاہر ہونا درکنار مجھے یہ نظر آ رہا تھا کہ میرا ہی جوتا مجھے کمال بے باکی سے ذیل کر رہا ہے۔ برہمی کے ساتھ کہا "تیری حقارت کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ حضرت موسیٰ جب مقدس دربار الہی میں پہنچے تو حکم ہوا کہ "فاخلع نعلیک" (اپنی جوتیاں اتار ڈالو) جوتے لئے کہا بے شک اس مقام پر جناب موسیٰ کو جوتیاں اتارنا پڑیں۔ مگر جس منزل تک وہ جوتیاں پہنے چلے گئے اور جہان تک میرا اُن کا ساتھ رہا وہاں تک آپ تو کیا ہیں بڑے بڑے ائمہ دین کی بھی رسائی نہیں ہو سکتی۔ ذات وحدت کی قربت میں ضرورت تھی کہ حضرت موسیٰ دنیا کی تمام ناشتوں سے معری ہو جائیں۔ جوتیاں تو جوتیاں وہاں تو انھیں سارے کپڑے اتار ڈالنا چاہیے تھے۔ اس میں اول تو میری ذلت نہیں ہوئی اور جو ہوئی بھی تو آپ کے مقابلے میں نہیں۔ آپ سے افضل ہی ہوں۔

آخر میں نے تنگ آ کے پوچھا "کیا تو سچ مچ اپنے آپ کو مجھ سے افضل و اعلیٰ سمجھتا ہے یا یہ فقط تیری سخن پروری ہے؟" اُس نے کہا سخن پروری اور ضد انسان کے صفات ہیں۔ اور انسان کے سوا ساری مخلوق ان سرکشانہ صفات سے مبرا ہے۔ رہا اپنی بُرائی اور فضیلت کا خیال۔ تو وہ نفس پرستی کا تقاضا ہے۔ اور خدا نے مجھے اس مرض سے محفوظ رکھا ہے اپنے مخلوقیت کے فرائض ادا کرنے کی دُھن میں کبھی مجھے اس مسئلہ پر غور کرنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔ میں کیا جانوں کہ آپ افضل ہیں یا میں؟ ہاں ایک بات البتہ خیال میں آتی ہے۔ مگر آپ شاید اسے مانیں یا نہ مانیں؟ میں نے گھبرا کے پوچھا "وہ کون سی بات ہے؟" جواب ملا کہ "اپنے فرائض زندگی کو جو شخص جتنی زیادہ عمدگی و مستعدی سے بجالائے اُسی قدر اُسے افضل

ہونا چاہیے۔ میں نے کہا "بے شک!" میری زبان سے بے شک کا لفظ سننے ہی وہ ایک جوشِ مسرت کے ساتھ بولا اچھا "تو پھر میں۔ آپ سے افضل ہوں۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اپنے فرائض ادا کرنے میں کبھی میں نے کوتاہی نہیں کی۔ میں آپ کے سپرد کیا گیا تھا۔ اور دربار الہی سے آپ کے یہاں میرا تقرر ہوا تھا۔ آپ نے جب اور جو کام لینا چاہا میں نے عذر نہیں کیا۔ آپ برسے کاموں کے لیے گئے۔ سید کار یوں میں مبتلا ہونے کے لیے گھر سے نکلے۔ ایذا رسانی اور مخلوق کو آزار پہنچانے کے لیے روانہ ہوئے اور ہمیشہ مجھے پہن کے گئے۔ میری طرف سے آپ کی فرمان برداری میں خرابی بھی کمی ہوئی پھر تو فرمائیے کہ آپ مجھے پہن ہوئے نجاستوں میں چلے گئے۔ کانٹوں اور پتھروں میں گھس گئے۔ مجھے ان باتوں سے تکلیف ہوئی مگر میں نے اطاعت سے منہ نہ موڑا۔ آپ کی رفاقت میں مجھے حد درجے کی بے نفسی کام لینا پڑا۔ نیکی اور بدمی کی طرف سے اپنے آپ کو بالکل بے حس کر لینا پڑا۔ غرض میں نے ہر طرح کی مصیبتیں جھیلیں مگر آپ کی نافرمانی نہیں کی۔ اب اس کے مقابلے میں آپ اس کا ثبوت دین کہ آپ بھی اپنے فرائض زندگی کو بے عذر و بے تامل ادا کرتے رہے۔ اور کبھی آپ سے ان مقاصد زندگی کے بجا لاسنے میں قصور نہیں ہوا۔ اگر آپ اسے ثابت کر لے جائیں تو گو کہ اس سے حرفِ میری آپ کی مساوات ثابت ہوگی مگر میں آپ کو اپنے سے افضل مان لوں گا۔ ورنہ بندہ نواز قصور معاف آپ ہزار ہر ہر کے باتیں بنائیں میں آپ سے اچھا ہوں!"

اب میں کلیتہً لاجواب تھا خصوصاً اس لیے کہ اُس کے یاد دلانے سے زندگی بھر کے گناہ اور قصور میری آنکھوں کے سامنے پھر رہے تھے کمال بے اختیاری سے قبول کر لینا پڑا کہ "میں ہارا اور تم جیتے۔ واقعی تم مجھ سے ہزار درجے بہتر ہو۔ اور میں نے جو تمھاری تحقیر کی اُسے معاف کرو!"

رہو رہو

اردو۔ لاہور سے اردو زبان کا یہ ایک نیا لٹریٹری رسالہ اکتوبر ۱۹۱۳ء سے

شایع ہونا شروع ہوا ہے جس کے مالک و ایڈیٹر مولوی فتح محمد خان صاحب جالندھری ہیں جنھوں نے اپنے تصانیف صحت و نحو اردو کے ذریعے سے زبان اردو پر اپنے حقوق پیدا کر لیے ہیں۔ اور جن کی ذات سے امید ہے کہ تہذیب و ترقی اردو کا سلسلہ خوش اسلوبی کے ساتھ جاری رکھ سکیں گے۔ اس کے پہلے دو نمبر جو ہماری نظر سے گزرے قابل قدر ہیں۔ اور اردو کے شائقین کے لیے اچھا ذخیرہ رکھتے ہیں۔ لکھائی، چھپائی، اور کاغذ قابل اطمینان ہیں۔ سائز ۱۸ x ۲۲ ہے۔ اور سالانہ قیمت مع محصول ڈاک تین روپے ہے۔ جن حضرات کو زبان اردو کی تحقیق و تدقیق کا شوق ہو اس رسالے کی ضرورت قدر فرمائیں۔ اور جناب ایڈیٹر صاحب موصوف کی خدمت میں لاہور کے پتہ پر مراسلت کر کے طلب فرمائیں۔

ظریف یہ بھی ایک نیا اردو رسالہ ہے جس کو ”زندہ دل اصحاب کا رسالہ“ ہونے کا دعویٰ ہے۔ اور دسمبر ۱۹۷۳ء سے لاہور سے شایع ہونا شروع ہوا ہے۔ ایڈیٹر پیر زادہ عبدالرشید صاحب ہیں۔ اگر یہ رسالہ اپنے مذاقیہ لٹریچر کو اچھی طرح سمجھنے کے بناء لے گیا تو عام پسند ثابت ہوگا۔ لیکن یہ نہایت ہی مشکل کام ہے۔ جس کی زیادہ توجہ یہ ہے کہ زبان جتنی عام ہوتی ہے اتنی عام ظرافت نہیں ہوتی۔ ہر مقام اور ہر سوسائٹی کی ظرافت اپنی خصوصیتوں کے لحاظ سے جدا ہوتی ہے۔ ظرافت کی بنیاد جن واقعوں محاوروں اور خیالوں پر ہوتی ہے وہ اُس قدر عام نہیں ہو سکتے جتنی کہ عام زبان ہوتی ہے۔ اور ایسے لطیفہ اور مضامین ظرافت جو تمام لوگوں کو یکساں لطف دے جائیں دشواری سے ہاتھ آسکتے ہیں۔ پہلے نمبر کی ضخامت ۱۸ x ۲۲ پیاجے ۳۲ صفحوں کی ہے۔ قیمت عام شائقین سے ایک روپیہ بارد آئے طلبہ سے دو آنے کم۔ نمونے کے لیے ۲ روپے خریداری کے لیے پیر زادہ عبدالرشید صاحب سے ”کنکرنڈی ہال لاہور“ کے پتہ پر مراسلت کی جائے۔

انتخابِ توحید - ۱۸ x ۲۲ پیاجے کے ۷۴ صفحوں کا رسالہ ہے جس میں مرحوم اخبار توحید پیرکھ کے بہت سے منتخب مضامین جمع کر دیے گئے ہیں۔ پہلے حصے میں جو

۱۱۰ صفحات پر ختم ہوا ہے مولانا خواجہ حسن نظامی صاحب کے مضامین ہیں۔ اور دوسرے صفحے میں جو ۶۴ یا ۶۵ صفحات پر ہے دیگر انشا پردازوں کے مضامین۔ مضامین موثر۔ شوخ۔ انوکھے۔ دلچسپ۔ اور جدت کو لکھ کر پڑھنے والوں کو جو چیزیں کہ ہمارے محترم دوست خواجہ صاحب کا خاص جو ہر ہیں۔ چھپائی نہایت واضح اور صاف ہے اور کاغذ اچھا اور روشن قیمت فی جلد ایک روپیہ۔ شایقین منشی محمد انور صاحب ہاشمی بنجر اخبار توحید سے ”لال کورتی۔ میرٹھ“ کے پتہ پر لکھ کے طلب فرمائیں۔

سیرور! سمجھا۔ یہ پنجاب کے مشہور ”لیلیٰ مجنون“ کا دلچسپ اور عام پسند قصہ ہے جسے منشی مولانا بخش صاحب کشتہ نے نئے لطف کے ساتھ پنجابی نظم میں تحریر فرمایا ہے۔ ہمارے اکثر پنجابی احباب نے اسے پسند فرمایا۔ اور ہم سمجھتے ہیں کہ زندہ دلاں پنجاب بہت پسند فرمائیں گے۔ قیمت فی جلد ۱۲ مصنف صاحب سے ”امرت سہر۔ دھاب کھٹیکان۔ کوچہ ڈاکٹر جھنڈے خان“ کے پتہ پر خط لکھ کے منگوایا جاسے۔

دربار حرام پور کے اسرار

ناول ”حسن کا ڈاکو“ کی نسبت بعض حلقوں میں مشہور ہے کہ اس کو کسی خاص ریاست یا رئیس سے تعلق ہے۔ واقعات میں تو اردو توافقی ہو جانا اور بات ہے مگر ہمارا رومی سخن کسی کی طرف نہیں۔ ہماری غرض عام دایان ملک و روسا کی تنبیہ و اصلاح ہے نہ کسی خاص نواب صاحب کی۔ لیکن لوگوں نے اس ناول اور اس کے عنوان کو اس قدر پسند کیا کہ ہمارا حوصلہ بڑھ گیا۔ اب ہمارے دوستوں کا بہت جی چاہتا ہے کہ یہ مشغلہ ختم نہ ہو۔ لہذا اس قسم کے ناولوں کا ایک سلسلہ شروع کر دیا جاتا ہے جس کا نام ہم نے ”دربار حرام پور کے اسرار“ قرار دیا ہے۔ اس سلسلہ کا ایک نہ ایک حصہ ہر دو سرے تیسرے مینے شایع ہو جا یا کرے گا جو نہایت دلچسپ و پُر لطف اور مقبول عام ہو گا۔ اور امید ہے کہ اس کا مجموعہ ایک مشرقی نواب کی مکمل اور عبرت خیز زندگی کی تصویر بن کے دنیا کی لائبریری میں ہمیشہ کے لیے محفوظ رہے گا۔

ایڈیٹر دنگد از۔



ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ

(لکھنؤ)

ٹھیک کسی کو نہیں معلوم کہ لکھنؤ کی آبادی کی بنیاد کب پڑی ہے اس کا بانی کون تھا؟ اور وجہ تسمیہ کیا ہے؟ لیکن مختلف خاندانوں کی قومی روایتوں اور قیاسات سے کام لے کے جو کچھ بتایا جاسکتا ہے یہ ہے۔

کتے مین راجہ رام چندر جی لنکا کو فتح کر کے اور اپنے بن باس کا زمانہ پورا کر کے جب سریر جہان پناہی پر جلوہ افروز ہوئے تو یہ سرزمین انھوں نے جاگیر کے طور پر اپنے ہم سفر و ہمدرد بھائی چکھن جی کو عطا کر دی۔ چنانچہ انھیں کے قیام یا ورود سے یہاں دریا کنارے ایک اونچے ٹیکے پر ایک بستی آباد ہو گئی جس کا نام اسی وقت سے ”چکھن پور“ قرار پایا۔ اور وہ ٹیکہ ”چکھن ٹیلا“ مشہور ہوا۔ اُس ٹیلے میں ایک بہت ہی گہرا غاری کنواں تھا جس کی کسی کو تھاہ نہ ملتی تھی۔ اور لوگوں میں مشہور تھا کہ وہ سیس ناگ تک چلا گیا ہے۔ اس خیال نے جذبات عقیدت کو حرکت دی۔ اور ہندو لوگ خوش اعتقاد ہی سے جا جا کے اُس میں پھول بانی ڈالنے لگے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مہاراجہ جو دھستہ کے پوتے راجہ جنم جے نے یہ علاقہ مرتاض

عہ ہندو دیو مالا میں سیس ناگ اُس ہزار سردن والے سانپ کا نام ہے جو دھرتی (زمین) کو اپنے پھن پر اٹھائے ہوئے ہے۔ اور قدرت و عظمت انہی کا ایک واجب الاحترام طور ہے۔

بزرگوں - رشیوں اور مینوں کو جاگیر میں دے دیا تھا جنھوں نے یہاں چہرہ پہ اپنے آسٹرم بنائے اور ہر کے دھیان میں مہرون ہو گئے۔ ایک مدت کے بعد اُن کو کمزور دیکھ کے دوئی تو میں ہالیہ کی ترائی سے آکے اس ملک پر قابض ہوئے جو باہم ملتی جلتی اور ایک ہی نسل کی دو شاخیں معلوم ہوتی تھیں۔ ایک ”بھر“ اور دوسری ”پالسی“

انھیں لوگوں سے سید سالار مسعود غازی سے ۵۵۹ھ محمدی (سنہ ۶) میں مقابلاً ہوا۔ اور غالباً انھیں پر تختیاں بخشی ۶۳۱ھ محمدی (سنہ ۶) میں چڑھائی کی تھی۔ لہذا اس سرزمین پر جو مسلمان خاندان پہلے پہل آکے آباد ہوئے وہ انھیں دونوں حملہ آوردوں خصوصاً سید سالار مسعود غازی کے ساتھ آنے والوں میں سے تھے۔ بھر اور پالسیوں کے علاوہ برہمن اور کائستھ بھی یہاں پہلے سے موجود تھے ان سب لوگوں نے مل کے یہاں ایک چھوٹا سا شہر بنالیا۔ اور امن دامن سے رہنے لگے۔ لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس بستی کا نام ”چھمن پور“ سے بدل کے ”لکھنؤ“ کب ہو گیا۔ اس آخری مروجہ نام کا پتہ شہنشاہ اکبر سے پہلے نہیں چلتا۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہندو مسلمانوں کی کافی آبادی بہت پہلے سے موجود تھی۔ جس کا ثبوت اس واقعے سے ہو سکتا ہے جو شیوخ لکھنؤ کی خاندانی روایتوں میں موجود ہے کہ ۹۶۹ھ محمدی (سنہ ۱۵۶۱ء) میں جب ہمایون بادشاہ کو شیر شاہ کے مقابل جو پور میں شکست ہوئی تو وہ میدان چھوڑ کے سلطان پور لکھنؤ پہنچے ہوتا ہوا بھاگا تھا۔ لکھنؤ میں اُس نے صرف چار گھنٹہ دم لیا تھا۔ اور گوکہ شکست کھا کے آیا تھا اور کوئی قوت و حکومت نہ رکھتا تھا مگر لکھنؤ کے لوگوں نے محض ہمدردی انسانی اور ہمان نوازی کے خیال سے اُن چند گھنٹوں ہی میں دس ہزار روپیہ اور پچاس گھوڑے اُس کی نذر کیے تھے۔ اتنے تھوڑے زمانے میں اس سامان کے فراہم ہو جانے سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اُن دنوں یہاں معتد بہ آبادی موجود تھی۔ اور اُن دنوں کا لکھنؤ آج کل کے اکثر قصبات سے زیادہ بارونق و خوش حال تھا۔ اُسی قدیم زمانے کے آنے والوں میں شاہ مینا کا خاندان بھی جو جن کا مزار پُرانوا آج تک مرجع انام ہے۔ اور غالباً اُسی عہد کے آنے والوں میں شاہ پیر محمد بھی تھے

جنھوں نے خاص لکھن ٹیلے پر سکونت اختیار کی۔ اور وہیں پیوند زمین ہوئے۔ اُن کے قیام کی وجہ سے وہ پُرانا ٹیکرا لکھن ٹیلے سے ”شاہ پیر محمد کا ٹیلا“ ہو گیا۔ اور مردِ ایام سے وہ گہرا غار بھی پٹ گیا۔ اُس پر بعد کے زمانے میں شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے جو بہ نفس نفیس بیان آیا تھا ایک عمدہ مضبوط خوبصورت اور شاندار مسجد بنا کے کھڑی کر دی جو آج تک عالمگیر کی طرف سے صدائے ”اُسدا اکبر“ بلند کر رہی ہے۔

شاہنہ محمدی (۱۵۹۶ء) میں شہنشاہ اکبر نے جب سارے ہندوستان کو بارہ صوبوں میں تقسیم کیا تو صوبہ اودھ کے صوبہ دار یا دالی کا مستقر بادلی النظر میں لکھنؤ ہی قرار پایا تھا۔ اُن دنوں اتفاق سے شیخ عبدالرحیم نام ضلع بجنور کے ایک خستہ حال و پریشان روزگار بزرگ تلاشِ معاش میں دہلی پہنچے۔ وہاں اُس دربار میں رسوخ پیدا کر کے بارگاہ شہنشاہی میں باریاب ہوئے آخر منصبداران شاہی میں شامل ہو کے لکھنؤ میں جاگیر پائی۔ اور چند روز بعد بڑے تزک و احتشام اور گردِ فرسے اپنی جاگیر میں آ کے مقیم ہوئے۔ یہاں خاص لکھن ٹیلے یا شاہ پیر محمد کے ٹیلے پر مقیم ہو کے اُنھوں نے پنج محل بنوایا۔ شیخ دروازہ تعمیر کرایا۔ اور لکھنؤ ہی میں پیوند زمین ہوئے۔ اُن کا مقبرہ ”نادان محل“ کے نام سے آج تک مشہور ہے جس کی عمارت کو ابھی چند روز ہوئے گورنمنٹ آف انڈیا نے پسند کر اپنی زیر حمایت لے لیا ہے۔

اسی زمانے میں یہاں شیخ عبدالرحیم نے لکھن ٹیلے کے پاس ایک دوسری بلندی پر ایک چھوٹا قلعہ تعمیر کرایا جو قربِ دجوار کی گڑھیوں سے زیادہ مضبوط تھا۔ اور گرد و نواح کے لوگوں پر اُس کا بڑا اثر پڑتا تھا۔ یا تو اس لیے کہ شیخ عبدالرحیم کو دربار شاہی سے علمِ ماہی مراتب عطا ہوا تھا یا اس لیے کہ اس قلعہ کے ایک مکان میں چھبیس محرابیں تھیں اور ہر محراب پر معمار نے دو مچھلیاں بنا کے باون مچھلیاں بنادی تھیں اس قلعہ کا نام ”چھی بھون“ مشہور ہو گیا۔ ”بھون“ کا لفظ یا تو قلعہ کے معنوں میں ہے یا ”بادن“ سے بگڑ کے بن گیا ہے۔ جس معمار نے اس قلعہ کو تعمیر کیا وہ لکھنا نام ایک اہیر تھا۔ اور کہتے ہیں کہ اُسی

نام سے شہر کا نام لکھنؤ ہو گیا۔ اور بعض کا خیال ہے کہ چھن پور ہی بگڑ کے لکھنؤ بن گیا ہے۔ ان میں سے جو بات ہو مگر اس آبادی نے یہ نام شیخ عبدالرحیم کے آنے کے بعد پاپا چندر دے بعد شیخ عبدالرحیم کے خاندان والوں یعنی شیخزادوں کے علاوہ یہاں پٹھانوں کا ایک گروہ آ گیا۔ جو جنوب کی طرف بسے اور "ارام نگر کے پٹھان" مشہور ہوئے۔ انھوں نے اپنی زمینداری کی حد اُس مقام تک قرار دی تھی جہاں اب گول روڑہ واقع ہے۔ کیونکہ وہاں سے دریا کی طرف بڑھے تو شیخزادوں کی زمین شروع ہو جاتی تھی۔ ان پٹھانوں کے بعد شیوخ کا ایک نیا گروہ آ کے مشرق کی طرف بس گیا جو "شیوخ بنہرہ" کہلاتے ہیں۔ اُن لوگوں کی زمین وہاں پر تھی جہاں اب رزیدنسی کے کھنڈر پڑے ہیں۔

یہ تینوں گروہ اپنے اپنے علاقوں پر متصرف اور اپنے حلقہ کے حاکم تھے۔ لیکن شیخزادوں کا اثر سب پر غالب تھا۔ اور قرب و جوار پر اُن کا دباؤ پڑتا تھا جس کا قومی سبب یہ تھا کہ یہ لوگ دربار دہلی میں رسوخ رکھتے تھے۔ اُن میں سے کئی کھن پورے ملک اودھ کے صوبہ دار مقرر ہو گئے تھے۔ اور اُن کے قلعہ بھی بھون کی مضبوطی کی اس قدر شہرت تھی کہ عوام کی زبان پر تھا جس کا مچی بھون اُس کا کھنڈر اکبر ہی کے زمانے میں لکھنؤ ترقی کرنے لگا تھا۔ اور اُس کی آبادی بڑھتی اور پھیلی جاتی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ صوبہ دار اودھ اُنھیں شیخزادوں میں سے منتخب ہوئے لیکن عام معمول یہ تھا کہ اس خدمت پر معززین دہلی مقرر ہوتے۔ جو سالوں سال اپنے گھر بیٹھے رہتے۔ فقط تحصیل وصول کے زمانے میں ایک دورہ کرتے اور اُن کے نائب یہاں رہا کرتے۔ لہذا اُن سے شہر کی ترقی کی کوئی امید نہ کی جاسکتی تھی۔ ہاں یہاں کے دو ایک شیخزادے جو صوبہ دار مقرر ہو گئے تو اُن کے تقرر سے البتہ لکھنؤ کو فائدہ پہونچا۔

لیکن اکبر کو معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ کی طرف خاص توجہ تھی۔ چنانچہ اُس نے یہاں کے برہمنوں کو باج پئی چڑھاوے کے لیے ایک لاکھ روپیہ مرحمت فرمائے تھے۔ اور اُسی وقت سے لکھنؤ کے باج پئی برہمن مشہور ہوئے۔ اسی سے پتہ چلتا ہے کہ لکھنؤ کے قدیم ترین ہندو محلہ جو اکبر کے وقت میں موجود تھے

باچ پئی ٹولہ۔ کٹارتی ٹولہ۔ سوئدھی ٹولہ۔ تجارتی ٹولہ۔ اور ابہری ٹولہ ہیں اور یہ سب چوک ہی کے اطراف میں ہیں۔

مرزا سلیم نے جو تخت پر بیٹھ کے نور الدین جہانگیر کے لقب سے مشہور ہوئے باپ کی زندگی اور پوئیام ولی عہدی میں مرزا منڈی کی بنیاد ڈالی جو مچھی بھون سے مغرب طرف واقع ہے۔ اکبر کے آخر عہد میں یہاں کے صوبہ دار جواہر خان تھے۔ وہ تودہ ہی میں رہے مگر اُن کے نائب قاضی محمود بکرامی نے چوک کے جنوب میں اُس سے ملی ہوئے داہنی طرف محمود نگر اور بائیں طرف شاہ گنج آباد کیے اور اُن کے اور چوک کے درمیان میں بادشاہ کے نام سے اکبری دروازہ تعمیر کرایا۔

عہد اکبری میں جبکہ یہ عمارتیں بن رہی تھیں اور یہ محلے آباد ہو رہے تھے لکھنؤ ایک اچھی تجارت گاہ بن گیا تھا۔ اور ترقی کے اس درجے کو پہنچا ہوا تھا کہ ایک فرانسیسی ساجرنے جو گھوڑوں کی تجارت کرتا تھا یہاں قیام کر کے نفع حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اور دربار شہنشاہی سے لکھنؤ کے قیام کے لیے سند مستثنیٰ حاصل کر کے یہاں اپنا اصطبل قائم کیا۔ اور پہلے ہی سال میں اُس کا کام اس قدر چلا کہ چوک کے متصل چار عالیشان مکان تعمیر کر لیے۔ سال ختم ہونے پر جب اُس نے پورا نہ مستثنیٰ کی تجدید چاہی تو اُسے زیادہ قیام کی اجازت نہ ملی۔ اور اس پر بھی اُس نے زبردستی ٹھہرنے کا ارادہ کیا تو حسب الحکم شہنشاہی حکام شہر نے اُس کے مکانات ضبط کر کے نزول سرکار کر لیے اور اُسے یہاں سے نکال دیا۔ وہ چاروں مکان مدت تک سرکار کے قبضے میں رہے یہاں تک کہ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں جب ملا نظام الدین سہا لومی نے اپنے قصبہ کے فسادوں سے عاجز آگئے لکھنؤ میں سکونت اختیار کرنے کا قصد کیا تو عطیہ سرکار کے طور پر وہ چاروں مکان اُنھیں دے دیے گئے۔ اور اُنھوں نے اپنے پورے خاندان کے ساتھ اُن کے

عہد مستامن کے معنی طالب امن۔ یورپ والوں کو چونکہ مسلمانوں اور ہندوؤں میں اپنے لیے خطرہ نظر آیا کرتا تھا اس لیے جہاں قیام کرنا چاہتے وہاں کے لیے دربار وہلی سے مستثنیٰ کی سند حاصل کر لیا کرتے۔ تاکہ عمال و حکام اور نیز رعایا اُنھیں نہ ستائے۔ اس سند سے چونکہ سلطنت پر ذمہ دار یاں عائد ہوجاتی تھیں اس لیے ایک سال سے زیادہ کی سند کم دی جاتی تھی۔

مکانوں میں سکونت اختیار کی جو اپنے گرد و پیش کے بہت سے مکانات کے ساتھ آج تک "فرنگی محل" کہلاتے ہیں۔ ملا صاحب کے قدوم کی برکت سے لکھنؤ علم و فضل کا مرکز اور طلبہ علوم کا مرجع و ماویٰ بن گیا۔ اور اس علمی مرجعیت کو اس قدر ترقی ہوئی کہ ملا نظام الدین کا مرتب کیا ہوا نصاب تعلیم جو سلسلہ نظامیہ کہلاتا ہے مدت دراز سے ہندوستان ہی کا نہیں سارے ایشیا کا نصاب تعلیم ہے۔ اور علمی کمالات کے ساتھ اس میں ویسا نہ برکتیں بھی مضمر تصور کی جاتی ہیں۔ اور اس سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اُس قدیم زمانے ہی میں کمان کمان اور کتنی کتنی دور کے طلبہ علوم لکھنؤ میں جمع رہتے ہوں گے۔

یوروپین سیاح لیکٹ جو شہنشاہِ محمدی (۱۶۳۱ء) یعنی شاہ جہان بادشاہ کی سلطنت کے اوائل میں ہندوستان کی سیر کر رہا تھا لکھنؤ کی نسبت لکھتا ہے کہ "یہ عظیم الشان مندر ہے"۔ عہدِ شاہجہانی میں یہاں کے صوبہ دار سلطان علی شاہ قلی خان تھے۔ اُن کے دو بیٹے تھے۔ مرزا فضل اور مرزا منصور۔ انھیں دونوں کے نام سے انھوں نے محمود نگر سے جنوب کی طرف آگے بڑھ کے دوئے محلے فضل نگر اور منصور نگر آباد کیے۔

اس زمانے میں بیان اشرف علی خان نام ایک رسالہ در تھے انھوں نے اُسی سلسلہ میں اشرف آباد بسایا۔ اور اُن کے بھائی مشرف علی خان نے تالہ کی دوسری طرف اپنا گھر بنا کے مشرف آباد نام ایک اور محلہ قائم کیا جس کا نام مرواریام سے اب نو تبتہ ہو گیا ہے۔ انھیں دونوں پیر خان نام ایک اور نوجوی افسر تھے جنھوں نے ان سب محلوں سے مغرب کی طرف دو دو جا کے اپنی گڑھی بنائی جو مقام آج تک "پیر خان کی گڑھی" کہلاتا ہے۔

شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے کسی ضرورت سے اجودھیا کا سفر کیا تھا۔ واپسی کے وقت لکھنؤ میں ٹھہرتا ہوا دہلی گیا۔ اس موقع پر اُس نے شاہ پیر محمد کے شیلے والی مسجد تعمیر کرائی۔ جو خاص کچھن شیلے پر ہونے کی وجہ سے ایسی بلند ہی پر واقع ہو جس سے زیادہ مناسب جگہ مسجد کے لیے لکھنؤ میں نہیں ہو سکتی۔ اور غالباً اُسی موقع پر اُس نے فرنگی محل کے مکانات علامہ زمان ملا نظام الدین کی مذکور ہوئے۔

محمد شاہ ریگیلے کے زمانے میں لکھنؤ کا صوبہ دار گردھانا سنگا نام ایک بہادر ہندو رسالدار تھا۔ اُس کا چچا چھبیلے رام دربار دہلی کی طرف سے الہ آباد کی حکومت پر مامور تھا۔ چھبیلے رام کے مرنے پر گردھانا سنگا نے سرکشی اختیار کی اور ارادہ کیا کہ چاکر جگہ زبردستی الہ آباد کا حاکم ہو جائے۔ مگر پھر خود ہی کچھ سوچنے کے اُس نے اظہارِ اطاعت و فرمان برداری کیا۔ اور دربار سے اُسے اودھ کی صوبہ داری کا خلعت عطا کیا گیا۔ اُس نے یہاں کی سکونت اختیار کی اور اُس کی بی بی سے جو رانی کہلاتی تھی رانی کٹرہ آباد کیا۔

مگر یہاں کا حاکم اور صوبہ دار چاہے کوئی پوشیزخراہ ادون کا زور اس قدر تھا کہ کسی والی کو چاہے کیسا ہی زبردست ہو اور کیسی ہی سند حکمرانی ملے کے آیا ہو یہ جرات نہ ہو سکتی تھی کہ اُن کے حلقہ میں قدم رکھے۔ چھبیلے بھون کو اگرچہ قنارہ رات کی حیثیت حاصل تھی لیکن شیخراہ ادون نے اُسے اپنی موردی جانداو بنالیا تھا۔ اور دہلی سے جو والی آتا اُس کے پاس بھی نہ پھٹکنے پاتا۔ اُنھوں نے چھبیلے بھون کے پاس دو اور عمارتیں تعمیر کرائیں جن میں سے ایک کا نام "سارک محل" تھا اور دوسری کا "پنچ محل" تھا۔ پنچ محل کی نسبت کوئی کہتا ہے کہ پنچ منزلی عمارت تھی اور کوئی کہتا ہے کہ ایک دوسرے کے پاس پنچ محل بنے ہوئے تھے۔ اور اُن کے جنوب طرف ایک بڑا محراب دار پچانک تھا جو "شیخن دروازہ" کہلاتا۔ شہر سے جو لوگ شیخراہ ادون کی مذکورہ عمارتوں میں جانا چاہتے اسی پچانک میں سے ہو کے گزرتے۔

اس پچانک کی محراب میں بانکے شیخراہ ادون نے ایک سنگی تلوار لٹکا رکھی تھی اور حکم تھا کہ جو کوئی آنا چاہے چاہے کوئی ہو اور کتنا ہی بڑا شخص ہو پہلے اس تلوار کو جھک کے سلام کرے پھر آگے قدم بڑھائے۔ کس کی مجال تھی کہ اس حکم کی تعمیل میں عذر کرے؟ یہاں تک کہ دہلی سے جو والی اور حاکم مقرر ہو کے آتے تھے اور شیخون سے ملنے کو جاتے تو انھیں بھی جبراً و قہراً اس تلوار کے آگے ضرور سر جھکا دینا پڑتا۔

لکھنؤ کی یہ حالت تھی کہ اللہ محمدی (۱۱۳۷ھ) میں نواب سعادت خان برہان الملک دربار دہلی سے اودھ کے صوبہ دار مقرر ہو کے آئے۔ جن سے

ہندوستان کے اُس آخری مشرقی مدبار کی بنیاد پڑی جس کے عروج کو ہم مشرقی تمدن کا آخری نمونہ قرار دے کے بیان کرنا چاہتے ہیں۔ پہلے نمبر میں ہم نے فیض آباد کی حالت دکھائی جو اسی تمدن کا نقشِ اولین اور اسی مشرقی دربار لکھنؤ کا ایک ضمیمہ تھا۔ اس نمبر میں اس دربار کے قائم ہونے سے پیشتر کے لکھنؤ کی تصویر دکھا دی۔ اور اُس بساط کو اپنے ناظرین کے پیش نظر کر دیا جس پر اس دربار نے اپنی شطرنج بچھائی۔ آئندہ چند نمبروں میں اس نیشاپوری خاندان کی تاریخِ حکومت بیان کریں گے۔ اور اُس کے بعد دکھائیں گے کہ یہ تمدن کیا اور کیسا تھا۔

سقفِ فلک

انسان کی جب پہلے پہل دنیا میں آنکھ کھلی ہوگی اور اُس نے اس نیلگون سقفِ فلک کی طرف نظر اٹھا کے دیکھا ہوگا تو اُس کی عجیب حالت ہوئی ہوگی۔ ہم اس بالائی طلسم کو دیکھتے دیکھتے عادی ہو گئے ہیں۔ اور ہمارے دلوں کو صبر آ گیا ہے کہ اُس کس کشود و کشاید بہ حکمت این معاریٰ، لیکن اُس وقت انسان کی متجسس طبیعت کو اپنے اس عجز کی خبر نہ تھی۔ وہ بڑے بڑے دعوے رکھتا ہوگا۔ اور جانتا ہوگا کہ ہم سب کچھ کر سکتے ہیں۔

چیز یہ ہے کہ اُس وقت اس طلسمِ فلک کا راز معلوم کرنے کے شوق نے اُسے بہت ہی پریشان کیا۔ یہ تماشا دیکھتے دیکھتے وہ حیران ہو گیا کہ دن کو تو اس گنبدِ ناقص دور میں ایک ہی قندیل روشن ہوتی ہے جس کی تیز روشنی سے ہر طرف اُجانا ہو جاتا ہے۔ مگر رات کو جب وہ دن والی بڑی قندیل غائب ہو جاتی ہے تو جا بجا بے ترتیبی سے سیکڑن چراغ روشن ہو جاتے ہیں۔ اور تہہ نہیں چلتا کہ کیوں روشن ہوتے ہیں اور انھیں کون روشن کرتا ہے؟ پہلا خیال یہ تھا کہ یہ قندیلیں اس لاجوردی چھت میں قائم ہیں۔ مگر مشاہدے سے معلوم ہوا کہ نہیں یہ چلتی پھرتی رہتی ہیں۔ اور ایک جگہ قائم نہیں۔ یہ دیکھ کے اول حیرت ہوئی دل میں کہا "اُس سے تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ کچھ لوگ مقرر ہیں جو آسمان پر ان چراغوں کو لیے پھرتے ہیں۔"

جب نظر اس راد قدرت کو کسی طرح نہ پاسکی اور یقین ہو گیا کہ اب یہ حال بغیر پاس
 جا کے دیکھے نہیں کھل سکتا تو انسانوں نے بڑی بے صبری کے ساتھ اس بات کی کوشش
 شروع کی کہ جس طرح بنے اس چھت پر چڑھیں۔ جہاں تک رسائی ہو سکی ڈھونڈھا اور
 تلاش کیا مگر کسی جگہ کوئی زینہ نہ ملا جس پر سے ہو کے اوپر جائیں۔ سیڑھی بنانے کی
 کوشش کی مگر بہت سے بانس اٹھا اٹھا کے دیکھ کوئی آسمان تک نہ پہنچا آخر سب نے مل کے
 ایک مینار بنانا شروع کیا۔ اور اس دھن میں لگ گئے کہ جب تک آسمان نہ ملے گا
 ہم اس مینار کو اودھن کرتے ہی چلے جائیں گے۔ اس مینار کے بنانے میں اُنھوں نے
 بڑی بڑی استعدادیں دکھائیں۔ نہ دن کو دن سمجھے نہ رات کو رات۔ لیکن اُسے
 جس قدر بلند کرتے جاتے تھے اُسی قدر آسمان اور اونچا ہوتا جاتا تھا۔ آخر ہاتھ
 پاؤں محنت سے رہ گئے۔ ساری کوشش بیکار گئی۔ مہینے بہت ہو گئیں۔ اور نظر
 آ گیا کہ کسی ایسے بُرج کے بنانے کا خیال کرنا جو آسمان سے جا لگے محض جنون ہے۔
 لیکن انسان سعی کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ فلک و دوز بُرج بنانے کی کوشش میں
 عاجز ہوا تو اس راز کے حل کرنے کی دوسری تدبیریں سوچنے لگا۔ ظاہر میں نظر
 آرہا تھا کہ چاروں طرف آسمان کے کونے سطح زمین کے کونوں سے ملے ہوئے ہیں۔
 بنانے والے نے اس نیلگوں گنبد کو دیواروں پر نہیں قائم کیا بلکہ ایک گول پیالا ہے
 جو فرش زمین پر اوندھا دیا ہے۔ اس کے ساتھ آسمان و زمین کے کنارے
 جہاں پر ملے تھے وہ مقام کچھ بہت دُور نہ نظر آتا تھا۔ بہت سے اُلو الغزموں نے
 کہا "اگر ہم آسمان پر سیڑھی نہیں لگا سکتے۔ کوئی ایسا بُرج دینا نہیں بنا سکتے
 جس کی چوٹی اس نیلی چھت کو چھو سکے تو ہم اُفق کی طرف جائیں گے جس طرح بنے گا
 گرتے پڑتے پہنچیں گے۔ اور اس اوندھے پیالے کے گگردن کو چھو لیں گے۔ چنانچہ
 ہر شخص اپنی مرضی کے موافق کسی نہ کسی طرف چل کھڑا ہوا۔ کسی نے پورب کی راہ لی
 اور کسی نے پچم کی۔ کوئی اُتر کی طرف چلا اور کوئی دکن کی طرف۔ مگر سب حیرت
 سے دیکھتے تھے کہ جس قدر آگے بڑھتے ہیں اُسی قدر اُفق پیچھے ہٹتا جاتا ہے۔ تیزی
 سے قدم اٹھایا۔ وہ بھی اُسی تیزی سے دُور ہونے لگا۔ دوڑے وہ گویا ان سے
 بچنے کے لیے اُٹھتا بھاگنے لگا۔

اسی دُھن میں یہ لوگ منزلوں چلے گئے۔ ہزاروں کو س آگے نکل گئے۔ مگر اُنہی
 اتنی ہی دُور تھا جتنی دُور کہ گھر سے چلتے وقت نظر آیا تھا۔ آخر بعض کو سمندر نے روکا۔
 اور اپنی لہروں سے چین بچین ہو کے قدرت کی طرف سے ڈانٹا کہ ”تو اب!“ بعض کو
 سربفلک پہاڑوں نے روکا اور عظمت و جبروت کے لیے مین کہا ”زیادہ حد اب!“
 لیکن اُنہی کی جستجو میں اتنی دُور نکل آئے تھے کہ پاؤں نے جواب دے دیا تھا۔ گھر
 واپس جانا کمال تھا۔ جہاں پہنچے وہیں کے ہو گئے۔ مگر اپنی جستجو طبیعت سے
 مجبور تھے۔ دُھن اب بھی یہی تھی کہ آسمان کو چھو لیں۔

ہوس آیز امید نے اب ان کے دلوں میں یہ خیال پیدا کیا کہ اگر گوشتہ فلک کو
 چھولیں گے تو اس کے اوپر چڑھنے کی کوئی راہ بھی ضرور نکل آئے گی۔ کوئی دروازہ
 یا کوئی کھڑکی موجود ہی ہوگی۔ بس ہم اُس کے پار ہوئے اور آسمان پر چڑھ گئے۔
 جن کے پاؤں سمندر نے پکڑ لیے تھے اُنھوں نے سوچتے سوچتے مدتوں میں دریا پر
 سفر کرنے کے مخدوش ذریعے پیدا کر لیے۔ کشتیاں بنائیں۔ اور اُن پر سوار ہو گئے
 ڈلگاتے اور موجوں کے تھپڑے کھاتے ہوئے آگے بڑھے کہ اُنہی فلک تک پہنچیں
 جو سامنے ہی ہے۔ اُنہی تو اب بھی نہ ملا۔ اپنی وضع کے مطابق دُور ہی ہوتا گیا۔ مگر
 صد ہا جزیرے مل گئے۔ جن میں جابجا کے اُنھوں نے سکونت اختیار کی۔ اور کوئی
 مقام نہ باقی رہا جہاں نہ پہنچ گئے ہوں۔

جن لوگوں کو پہاڑوں نے روکا تھا وہ پہلے تو ہیبت کھا کے اور خون زدہ ہو کے
 رُکے۔ ذرا اٹھڑے۔ پھر غور سے جو دیکھا تو پہاڑوں کی چوٹیاں آسمان سے
 باتیں کرتی نظر آئیں۔ اور دل میں کہا ”یہ تو آسمان پر پہنچنے کے اچھے خاصے
 زینے موجود ہیں۔ ہم نے وہ بُرج بنانے کی فضول ہی کوشش کی تھی۔“ فوراً پہاڑوں پر
 چڑھنے لگے۔ اب اس سعی لا حاصل میں لگے ہوئے ہیں۔ ٹھوکرین کھا کھا کے گرتے ہیں
 ہانپ ہانپ کے قدم اٹھاتے ہیں۔ مگر چڑھتے ہی چلے جاتے ہیں۔ آخر اکثر کوچوٹوں
 جا کے نظر آیا کہ یہاں سے بھی آسمان اتنی ہی دُور ہے جتنی دُور کہ زمین پر سے تھا
 مگر بعض جن کی نہایت بلند پہاڑوں کی برن آلود چوٹوں تک رسائی نہ ہو سکتی تھی
 اُنھیں یقین ہو گیا کہ اُدھر جا کے بھی سق فلک کو نہ چھو سکیں گے لیکن پھر بھی

رہ رہ کے یہ خیال آتا تھا کہ اگر اس برف کے سمندر کو نبھانے کے لیے پہلے
جائیں تو شاید آسمان کی حقیقت یہاں سے کچھ زیادہ معلوم ہو سکے۔ اسی خیال
سے اور اوپر چڑھنے کی ہوس میں بہتوں نے جانیں دے دیں۔ مگر آسمان کو
کوئی نہ چھو سکا۔

اس جستجو سے لا حاصل سے انسان کی آرزو تو نہ برآئی مگر خدا کا جو منشاء
تخلیق تھا وہ آپ ہی آپ بڑی خوبی کے ساتھ پورا ہوتا گیا۔ یعنی ساری زمین
انسانوں سے آباد ہو گئی۔ اور حضرت آدم کو خلافت و نیابت الہی کا جو وعدہ
ملا تھا اُس کی البتہ بوجہ احسن تکمیل ہوئی۔

لیکن اس تھکنے اور عاجز ہونے پر بھی انسان اپنی جستجو سے باز نہ آیا۔ اب
اُس نے زمین ہی پر بیٹھے بیٹھے آسمان میں تھکلیان لگانا شروع کیں۔ غور کرنا
شروع کیا کہ آخر یہ طلسم کیا ہے۔ اس سقف زرنگار پر کون لوگ رہتے ہیں۔ آخر
غور اور سوچنے لگے اُسے وہی ان اور مراقبہ کی برکتیں دکھانا شروع کیں۔
اور خیالات نے پرورش پا کے واقعیت اور حقیقت کے ایسے ایسے لباس
پہنے کہ اُسے اپنی روحانی سیرون اور باطنی جستجوؤں کا یقین آ گیا۔ اور سمجھا کہ
آسمان پر جا کے جو کچھ معلوم کر سکتے اُسے یہیں گردن جھکا کے اور آنکھیں بند
کر کے چشم حقیقت میں سو دیکھ لیا کرتے ہیں۔

دنیا میں انسان کو جنگلوں پہاڑوں اور سمندروں میں بہت سی ایسی چیزیں
نظر آتی تھیں جن کی غنط سے مغلوب و خائف ہو کے اُس نے خیال کر لیا تھا
کہ ان میں کوئی غیر مجسم قوی موجود ہیں جو اپنی صورت تو نہیں دکھاتیں مگر ہم پر اپنا
رعب بٹھا دیا کرتی ہیں۔ جب ان قوتوں کا اُسے بہت زیادہ یقین ہوا تو کبھی کبھی اُس کے
خیال کی آنکھوں نے ان روحانی قوتوں کی صورتیں بھی دیکھ لی تھیں۔ اب اُس کا
خیال اس جانب مائل ہوا کہ یہ سقف فلک انھیں باطنی اور مخفی قوتوں کا نشیمن
ہے۔ اس خیال کی طرف توجہ ہونے کے بعد جب انسان نے مراقبہ و مکاشفہ کے
قاعدوں سے اُس کو خوب پرورش کیا تو آسمان پر اُسے بڑے بڑے تماشے نظر
آنے لگے۔ اُس کی باطنی جستجوؤں نے سقف فلک کے اوپر جس روحانی عالم کا پتہ

لگایا تھا وہ ایک بڑا وسیع عالم نظر آیا۔ جس میں دیوتا رہتے تھے۔ دیویان اپنے لازم والی
 ابدی حسن کے کرشمے دکھا رہی تھیں۔ اُن کے رہنے کے محل اُن کے سیر کرنے کے چمن اور
 اُن کے سارے ساز و سامان و نیوی تکلفات سے بدرجہا زیادہ بڑھے چڑھے نظر آئے۔
 زیادہ غور و خوض اور مزید توجہ نے اس بات کو بھی محسوس کر لیا کہ آسمانی
 تاروں کی حرکتیں نئی نئی اور جدا گانہ ہیں۔ اور سب ایک ہی مسافت پر نہیں بلکہ
 نسبتاً قریب و بعید ہیں۔ کوئی بہت زیادہ دُور ہے اور کوئی بہ نسبت اُس کے نزدیک۔
 ان نئی باتوں کے معلوم ہوتے ہی انسان کی جستجوؤں نے رفتہ رفتہ اس سقّ فلک
 ایک بڑا بھاری نوکھنڈا محل بنا کے کھڑا کر دیا۔ اور چونکہ اس نو منزی عمارت میں
 سب درجوں کے تارے اور اُن کی حرکتیں نیچے سے بخوبی نظر آ سکتی تھیں اس لیے یہ بھی
 فیصلہ ہو گیا کہ یہ ساری عمارت صاف اور شفاف شیشے کی بنی ہوئی ہے۔ یہ معلوم ہونا تھا
 کہ سقّ فلک کا یہ نو منزل محل فرشتوں اور دیوتاؤں کا عالیشان شیش محل بن گیا۔
 جس میں سے سر دشتان کی ابدی کنواریان اور دنیا پر تصرف کرنے والی دیویان
 جھانک جھانک کے دنیا والوں کے ہر فعل اور اُن کی ہر حرکت کو دیکھتی رہتی تھیں۔
 اب ان خیالات کے ساتھ عقیدت نے دنیا کا رنگ ہی بدل دیا۔ ساتوں سیاروں
 میں سے ہر ایک دیوتا یا دیوی بن گیا۔ مراقبون۔ روحانی سیروں۔ اور جستجوؤں نے
 ان دیوتاؤں کی صورتیں شکلیں۔ اُن کے لباس۔ اُن کے رنگ اور اُن کے بانے
 (شعار) بتائے۔ اُن ساتوں تاروں کے جیسے شیش محل سقّ فلک پر نظر آئے تھے
 دنیا میں بننے اور تیار ہونے لگے۔ اور بڑے زور و شور سے اُن کی پرستش ہونے لگی۔
 سب کو یقین آ گیا کہ دنیا والوں کا روحانی کمال یہی ہے کہ یہ جسم جو بوجھل ہونے کی
 وجہ سے اُوپر اُڑنے نہیں دیتا۔ اس سے الگ ہو کے اور نسوت روح بن کے انسان
 فلک کے اس شیش محل میں پہنچ سکتا ہے۔ اور یہی اُس کی نجات ہے۔ اور یہیں سے
 روحانیت کا عالم قائم ہوا جس نے محققین مابعد کی جستجوؤں سے ہر عہد اور ہر زمانے میں
 نیا رنگ بدلا اور نئی شان دکھائی۔

یہ نو کھنڈا شیش محل ہزار ہا سال تک قائم رہا۔ اگرچہ اس بارے میں کہ اُس میں
 کیا ہے اور کون اور کیسے لوگ رہتے ہیں بعد کی جستجوؤں نے اختلافات پیدا کر دیے۔

ہر گروہ ایک نئے نتیجہ کو پہونچا۔ اور جس طرح بادشاہوں کی دست برد سے دنیا کا جغرافیہ بدلا کرتا تھا اُسی طرح سقف فلک کا جغرافیہ بھی ہر گروہ اور ہر مذہب کے خیال کے مطابق بدلتا اور کچھ سے کچھ ہوتا رہا۔ لیکن پُرانے محققوں کا بنایا ہوا شیش محل بدستور قائم تھا اور امید بھی کہ قیامت تک برقرار رہے گا۔ کیونکہ فنا ہونا اور کنار اُس کا خرق و اکتیام تک محال تھا۔

لیکن دور جدید کی تحقیقات اور دور بینی کے نئے آلات نے اب ہزار ہا سال کے بعد سقف فلک کے اُس شیش محل کو جس کے ٹٹنے کو دنیا محال و خلاف عقل سمجھے ہوئے تھے اس طرح مٹا کے رکھ دیا کہ گویا تھا ہی نہیں۔ اب نہ وہ شیش کے آسمان ہیں۔ اور نہ اُن کی وہ گردش۔ بلکہ تارے خود ہی اپنے حیز پر چکر لگا رہے ہیں۔ تاروں کی بھی وہ شکلیں اور وضعیں خواب و خیال ہو گئیں۔ نہ عطار و مرد مقدس ہے نہ مریم بانکسا سپاہی۔ نہ زہرہ اپنی چشمِ فتن سے دلبری کرتی ہے نہ مشتری بال کھولے بین بجا رہی ہے۔ بلکہ بجائے اس کے کہ یہ سب دیوتا یا دیویاں ہوں ہماری زمین ہی کے سے کُڑے اور بڑے بڑے عالم نکلے۔ تاہم اُس شیش محل کے ڈھاجا زریعہ روحانیات کا عالم باقی ہے جو اُسی سے نکلا تھا۔ مگر کُڑوں کے عالموں تک پہونچنا اور اُن میں زندہ رہ کر مخلوق کا پتہ لگانا ابھی باقی ہے۔ ہوائی گھوڑے انسان نے پیدا کر لیے ہیں۔ اور امید ہے کہ باقی ماندہ رموز بھی کسی مابعد زمانے میں حل ہو جائیں گے۔

ہندوستان کا ایک دلچسپ مناظرہ

مسلمانوں میں یا تو علم و فضل کی یہ حالت تھی کہ بڑے بڑے زبردست بادشاہ اور خلفا بھی مخالفت کی ہر بات کو سنجیدگی و متانت سے سنتے اور اُس پر غور کرتے تھے اور علما کی صحبت روشن دلی کا آئینہ ہوتی تھی نہ مرغون اور بٹروں کی پالی۔ مگر جب مسلمانوں میں وہ پُرانی علمی برکتیں فنا ہو گئیں تو اُن کی علمی محفلوں اور تحقیق و تدقیق کی صحبتوں نے جہالت کے دلچکون کی صورت اختیار کر لی۔ چنانچہ اسی کا ایک دلچسپ نمونہ یہ ہے۔

دلگذاڑ کے گزشتہ نمبر میں ہم دکھا چکے ہیں کہ شجاع الدولہ کے زمانے میں فیض آباد کیسا بارونق شہر ہو گیا تھا۔ اور ہندوستان کے تمام باکمال اُس کی سوا دین کس کسرت سے جمع ہو گئے تھے۔ جہاں اور لوگ تھے وہاں پانچ حاذق اور پابند شریعہ طبیب بھی تھے جو دہلی سے آ کے نواب شجاع الدولہ - اُن کی بی بی بہو بیگم صاحبہ اور اُن کی والدہ محترمہ کی سرکاروں میں بڑے بڑے بھاری درماہیوں پر مقرر ہوئے تھے۔ نواب شجاع الدولہ کے انتقال کے بعد بھی بیگم کی سرکاری قلم رہیں۔ اور وہ اطباء انھیں سے وابستہ اور اسی شہر میں مقیم رہے۔ انھیں میں ایک صاحب علم اور سن رسیدہ طبیب حکیم معالج خان تھے۔

اُن دونوں میں ایک اعلیٰ درجے کے صاحب علم ملا مولوی محمد منیر تھے جو فارسی اور عربی کتابوں کا درس دیتے۔ اور اُن سے تعلیم پانے کے لیے شہر میں بہت سے طلبہ کا ہجوم رہتا۔ ان مولوی صاحب کو بہو بیگم صاحبہ کے خواجہ سرا اور اُن کے داروغہ جواہر علی خان کی سرکار سے محض علمی خدمت کے طور پر کچھ ماہوار ملتی تھی۔ جواہر علی خان اُن کے علم و فضل کا بڑا معترف تھا۔ یہ خواجہ سرا اُن کے زمانے میں فیض آباد کا سب سے بڑا صاحب اقتدار اور صاحب اثر شخص تھا۔ فوج اور توپخانے سب اُس کے زیر حکم تھے۔ اور گویا سارے شہر پر اُس کی حکومت تھی۔ حکیم معالج خان کو چونکہ فن طب کے علاوہ اپنے علم پر بھی غرہ تھا اس لیے اُن سے اور مولوی محمد منیر سے چشمک ہو گئی۔ اکثر صحبتوں میں وہ مولوی صاحب پر کوئی نہ کوئی اعتراض جمادیا کرتے۔ اور ہیشہ عیب چینی میں مصروف رہتے۔ یہ بات جواہر علی خان کو ناگوار ہوئی۔ اُس نے کئی بار حکیم صاحب کو سمجھایا۔ مگر انھوں نے عیب گیری سے زبان نہ روکی۔ اسی اثنا میں ایک بڑے زبان آور ایرانی مغل جو ملا عبد المجید کے نام سے مشہور تھے فیض آباد میں وارد ہوئے۔ اُن سے اور مولوی محمد منیر سے راہ درسم بڑھا۔ تو حکیم معالج خان صاحب اُن دونوں شخصوں پر طعن و تشنیع کرنے لگے۔ آخر جواہر علی خان اس کے درپے ہوا کہ کسی موقع پر حکیم صاحب کو ملا صاحب کے مقابلے میں زک دلو کے ذیل کرائے۔ اتفاقاً حکیم معالج خان نے کسی صحبت میں اپنا یہ عقیدہ ظاہر کیا کہ امام

زین العابدین کے صاحبزادے زید بن علی شہیدوں میں شامل نہیں ہیں۔ اس لیے کہ انھوں نے امام زمانہ امام محمد باقر سے بغاوت کر کے خروج کیا تھا۔ یہ مسئلہ جو اہر علی خان نے ملا عبد المجید سے دریافت کیا۔ انھوں نے کہا "زید کی شہادت یقینی ہے اور اُس سے انکار کرنا ہرگز درست نہیں ہے۔" عجی ملا صاحب کا یہ قول حکیم معالج خان نے سنا تو دعوے سے کہا "میں احادیث ائمہ سے ثابت کر دوں گا کہ زید کو شہید نہ کہنا چاہیے۔"

آخر کار مناظرہ قرار پا گیا۔ اور یہ ٹھہری کہ ماہ ذی قعدہ ۹۳ھ کی گیارھویں تاریخ بہار علی خان خواجہ سرا کے مکان میں دونوں حضرات جمع ہو کے ایک دوسرے کے مقابل اپنے دعوے کو ثابت کریں۔ روز مقررہ کو بہت سے آدمی مناظرہ سننے کے لیے جمع ہو گئے۔ اور بڑی بھاری محفل مرتب ہو گئی۔ سب سے پہلے جو اہر علی مولوی محمد منیر کو مع ان کے طلباء اور طرفداروں کو لے کے آیا اور باہر بھاٹک پر اُس کی فوج کے تقریباً دو سو سپاہی کھڑے ہو گئے۔ اندر بھی بہار علی خان اور جو اہر علی خان کے دو تین سو ملازم موجود تھے۔ ان کے علاوہ بہت سے شہر والے بھی بحث سننے اور تماشا دیکھنے کو آگئے تھے۔ الفرض سب ملا کے کوئی پندرہ سولہ سو آدمیوں کا مجمع تھا۔

اتنے میں حکیم معالج خان ایک کتاب ہاتھ میں لیے ہوئے اپنے مکان سے نکلے۔ جو بیگ صاحبہ کے مکان یعنی اسی عمارت کے پھاٹک کے اندر واقع تھا۔ اُن کے برابر اُن کے صاحبزادے تھے۔ اور شاگردوں کا ایک بڑا غول اُن کے پیچھے تھا۔ یہ

عہ حضرت زید نے امامت کا دعویٰ کیا تھا۔ اور کہتے تھے کہ کچھ ضرور نہیں کہ ایک وقت اور ایک عصر میں ایک ہی امام ہو۔ جائز ہے کہ دنیا میں ایک ہی زمانے میں دو یا زیادہ امام ہوں۔ حضرت علی کو خلفائے ثلاثہ سے افضل مانتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ جائز ہے کہ کوئی کم فضیلت والا اپنے سے افضل کو چھوڑ کے امام ہو جائے۔ اور اس بنیاد پر وہ خلفائے ثلاثہ کی خلافت کو جائز مانتے تھے۔ عبد الملک بن مروان کے زمانے میں انھوں نے اپنے پیروں کے ساتھ علم امامت بلند کیا۔ مگر ساتھ والوں نے دغا کی۔ چھوڑ کے چلے گئے۔ اور عبد الملک نے انھیں گرفتار کر کے مصلوب کیا۔ پہلا شیعہ فرقہ زیدیہ ہیں۔ اور آج تک سواحل میں پر کثرت سے موجود ہیں۔

سب صاحب آکے ایک طرف بیٹھ گئے۔ اُن کے بعد ایرانی ملا آغا عبد المجید اور اُن کے رفقا کو لے کے بیوہ علی خان خواجہ سرا آیا۔ یہ بھی ایک بڑا زبردست عالم اور رئیس تھا اور اُس کے ہمراہ بھی اُس کے ملازموں اور مسلح سپاہیوں کا ایک بڑا بھاری غول تھا۔

یہ سب لوگ آکے اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔ اور وقت آیا کہ مناظرہ شروع ہو۔ مگر محفل کا رنگ خطرناک تھا۔ تیون گردہ مسلح تھے۔ ان لوگوں کو اس کا خیال نہ تھا کہ یہ ایک علمی تحقیق کی صحبت اور اہل علم کا جلسہ ہے۔ کسی گڑھی یا قلعے کا فتح کرنا نہیں ہے۔ ہر گردہ کے سپاہیوں کو صرف اس بات کا خیال تھا کہ ہمارے آقا سے کسی سے ٹکرا رہو گئی ہے۔ اور آج ہمیں حق نیک اور کرنا ہے۔ جیتنے تھے سب ہتھیار لگا لگا کے اور ادبچی بن کے پہنچے تھے۔ اور کٹھنہ مارنے کو تیار تھے۔ تیون گردہوں کے سپاہی الگ الگ صفیں باندھ کھڑے تھے۔ بند و تین بھری ہوئی تھیں۔ اور توڑے سُلگ رہے تھے۔ یہ عمارت وسیع تھی اور کافی گنجائش رکھتی تھی۔ تیون طرف محرابین بنی چلی گئی تھیں۔ اور بیچ میں کشادہ صحن تھا۔ مگر لوگوں کا اس قدر ہجوم تھا کہ اندر باہر کہیں تل رکھنے کی جگہ نہ تھی۔ اور سب اس طرح کچا کچھ بھوسے ہوئے تھے کہ سانس لینا دشوار تھا۔

اب مناظرہ کا تماشا دکھانے سے پہلے بہتر ہو گا کہ ہم دونوں متقابل حریفوں کی تصویریں بھی اپنے ناظرین کے سامنے کر دیں۔ مولوی محمد منیر خاموش تھے اس لیے کہ بحث کرنے کا کام آغا عبد المجید نے اپنے ذمے لیا تھا۔ اُنھیں صرف خاموشی بیٹھ کے دیکھنا تھا۔ آغا صاحب کی یہ شان تھی کہ اول تو وہ ایک زبان آور یا وہ گوغل تھے۔ دوسرے ایرانی تھے جو ہندوستانیوں کی اپنے سامنے کچھ ہستی نہیں سمجھتے۔ تیسرے وہ بڑے طعرات سے باتیں کرتے تھے۔ آواز بلند تھی۔ اور اُس کے ساتھ خوش لہجہ تھے۔ چوتھے ابھی اُن کا غفوان شباب تھا۔ عمر پورے تیس برس کی بھی نہ ہوگی۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ شہر کے بڑے بڑے صاحب اثر لوگ اُن کے طرفدار تھے۔ برخلاف اس کے اُن کے حریف معالج خان کی یہ قطع تھی کہ اول تو پستہ قد اور ضعیف تھے۔ اور بیٹھ جھکی ہوئی تھی۔ دوسرے بڑے

اور ناتوان تھے۔ تیسرے کئی سال ہوئے انھیں نقوہ مار گیا تھا جس کی وجہ سے گردن ٹیڑھی ہو کے رہ گئی تھی۔ اور صرف دواؤں کے زور پر جی رہے تھے۔ بات کرتے وقت گلے کی رگیں پھول جاتیں۔ اور بڑی دشواری کے ساتھ زبان سے لفظ نکلتا۔ چوتھے اُن کی حمایت پر کوئی نہ تھا۔ بلکہ شہر کے ادنیٰ بازاری لوگ اُن کی بڑھاپے کی کمزوریوں اور بگڑی ہوئی صورت کا مذاکِ اڑاتے۔ اور سب سے بڑا نقصان اُن میں یہ تھا کہ کبھی انھیں کسی مجمع عام میں بحث کرنے کا اتفاق نہیں پیش آیا تھا۔

مناظرہ کا شروع اور آغاز یوں ہوا کہ آغا صاحب نے کھلے کھلے۔ فضول طعنان اور دم و خم کے ساتھ پوچھا ”جناب حکیم صاحب! امام کے فرزند کی شہادت کے بارے میں جناب کیا فرماتے ہیں؟“ جواب دینے کی کوشش میں حکیم صاحب نے گلے کی رگیں پھلایں۔ اٹیٹھی ہوئی زبان کو کئی بے نتیجہ حرکتیں دین۔ چہرے نے کئی قطعیں بدلیں۔ پھر کچھ دیر تک ہکلائے۔ اور بہت زور لگا کے کہا ”اُن پر لعن کرنا درست ہے۔ آغا صاحب! اُس کی دلیل؟“ حکیم صاحب نے انھیں پہلی دشواریوں اور چہرے کی سفتی کا نہ تبدیلیوں کے ساتھ کہا ”یہ معتبر حدیث ہے۔“ مگر قبل اس کے کہ حدیث کے الفاظ زبان سے نکلیں آغا صاحب نے بات کاٹ کے کہا ”معتبر حدیث وہ کون سی حدیث ہے؟“ حکیم صاحب کو چونکہ بات کرنا دشوار تھا کاغذ کا ایک پرزہ ملا کے ہاتھ میں دے دیا۔ اب کسی کو اس کی خبر نہیں کہ اُس پرزے میں کوئی حدیث لکھی بھی تھی یا نہیں۔ اور لکھی تھی تو وہ کون سی حدیث تھی اور نہ کسی نے اُس کاغذ کے دیکھنے کی کوشش کی۔ مگر جالاک ایرانی ملا صاحب نے وہ پرزہ اچھے پھینک دیا اور چلا کے کہا ”میں یہ نہیں جانتا مذہبی جواب دیکھیے اب حکیم صاحب خاموش تھے۔ بدشواری کچھ بولتے بھی مگر جھجھلاہٹ سننے رہی سہی زبان بند کر دی۔ اُن کے صاحبزادے نے خوب ابر ہیٹھے تھے باپ کی زبان بند دیکھ کے کچھ لب ہلائے تھے کہ آغا صاحب بولے ”تم کون ہو جو جوع میں بولتے ہو؟“ حکیم صاحب اس موقع پر جلدی سے بول اٹھے ”یہ میرا بیٹا ہے۔ آغا نے کہا میں باپ بیٹا نہیں جانتا۔ گفتگو تو مجھ سے آپ سے ہے آپ جواب دیں“ اب باپ بیٹے دونوں

بے زبان تھے۔ اور چالاک آغا صاحب نے بہ آواز بلند کہا "حضرات! حکیم صاحب کی بحث پر فاتحہ! اور یہ کہتے ہی دونوں ہاتھ اٹھا کے سرورہ فاتحہ پڑھنا شروع کر دی۔ فاتحہ سنتے ہی سب لوگ ایک ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ سب کے کھڑے ہو جانے سے اندھیرا ہو گیا۔ گھبراہٹ کے ساتھ لوگ ادھر ادھر ٹاپنے لگے کسی کو خبر نہ تھی کہ کون کہاں ہے۔ کون آگے ہے اور کون پیچھے۔ سب ایک دوسرے کو ڈھکیں کے نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر زور کسی کا نہ چلتا تھا۔ تمام حاضرین پر ایسی بدحواسی طاری تھی کہ نہ آقا نوکر کو پہچانتا تھا نہ نوکر آقا کو۔

اس پر دنگی یہ ہوئی کہ جو لوگ باہر صحن میں کھڑے تھے وہ سمجھے کہ کسی سے چل گئی۔ اور سب کے سب بے تحاشا اندر گھسنے کی کوشش کرنے لگے۔ مگر راستہ کسی کو نہ ملتا تھا۔ سب ٹھٹھ لگائے کھڑے تھے اور غل بچارہ تھے۔ ان کا غل سن کے فوج کے سپاہی جو پھاٹک کے باہر تھے سمجھے کہ اندر کوئی مار ڈالا گیا۔ اور سب کے سب ایک بار گی اندر کی طرف لپکے۔ پھاٹک کھلا ہوا تھا۔ مگر ایک ہی پھاٹک تھا۔ اور ہر سپاہی چاہتا تھا کہ سب سے پہلے پہنچے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سب پھنسے کھڑے تھے۔ اور لوگوں کی پیش قیضیں تلواریں جو لوگوں کی گردن میں بھین اور بند و تین جو ہاتھوں میں تھیں ان کے ایک دوسرے سے کھٹا کھٹ لڑنے اور الجھنے سے عجب شور بلند تھا۔ جتنے تھے پریشان و مضطرب تھے اور کسی کا کچھ زور نہ چلتا تھا۔ ان کی یورش اور مضطربانہ شورش سن کے سارے شہر میں غل مچ گیا کہ مناظرے میں چل گئی۔ اور دونوں حریفوں کے طرفدار ستر کے ہر کونے اور ہر ٹکے سے تلوار۔ چھری۔ کلہاڑی۔ لاکھی یا جو حربہ ہاتھ میں آگیا لے لے کے دوڑے۔ اور سب نے بہار علی خان کے مکان پر دھوا کر دیا۔ شیخ احمد علی عنبر علی خان کے دیوانے میں تلوی اور سکون کے راجاؤں اور کئی اور چھوٹے چھوٹے زمینداروں کو بیٹھے معاملہ کی باتیں کر رہے تھے اور کاروبار ریاست میں مصروف تھے۔ ثابت خانی ٹھکانوں کے کچھ مسلح سپاہی ان کے پاس کھڑے ہوئے تھے کہ یکایک غل سنا اور خبر آئی کہ جواہر علی خان پر لوگوں کا زعمہ ہے۔ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور تین سو مسلح سپاہیوں کو لے کے وہ بھی آ پہنچے۔ مگر باہر ہی کھڑے تھے۔ اندر گھسنا غیر ممکن تھا۔

غرض ایک قیامت بپا تھی اور کسی کو خبر نہ تھی کہ واقعہ کیا ہے۔ بعض دلی بازوں نے مکان کے اندر اندھیرے اور لوگوں کی بدحواسی سے موقع پا کے یہ دلی کی کہ جس کے سر پر ہاتھ پہنچا اُس کی پگڑی اُچھال کے ایک گھرے حوض میں پھینک دی جو باس ہی تھا اور خشک پڑا تھا۔

جب دیر تک یہ حالت رہی تو اکثر بگڑے دل سپا ہیون نے تلواریں کھینچ لیں۔ اور جب دو چار نے تلواریں کھینچیں تو سب کے ہاتھ اپنے اپنے اسلحہ کے قبضوں پر جا پڑے۔ تلوار - فنج - پیش قبض - قرابین غرض جو حربہ جس کے پاس تھا اُسے تان کے کھڑا ہو گیا۔ اور اکثر نے پھنکیتی کی مشاقی دکھانے کے لیے پتیرے بدل بدل کے چاروں طرف غالی ہاتھ مارنا شروع کر دیے۔

سب سے زیادہ کثرت جواہر علی خان کے طرفداروں کی تھی۔ اور سب کا خیال تھا کہ جواہر علی خان پر کسی نے حربہ کر دیا۔ اس بات کو جواہر علی خان سمجھ گیا۔ اور دل میں خیال کیا کہ جب تک لوگ میری صورت نہ دیکھ لیں گے یہ ہنگامہ موتوں نہ ہو گا۔ یہ خیال آتے ہی وہ ایک اندر دینی زینے پر سے ہو کے کوٹھے پر چڑھ گیا اور بالا خانے کے دروازے کھول کے سب کو اپنی صورت دکھائی۔ اور اطمینان دلایا کہ کوئی گھبرانے کی بات نہیں۔ میں خیریت سے ہوں۔ اُس کی صورت دیکھتے ہی سب نے خوشی کے نعرے بلند کیے۔ اور اطمینان کے ساتھ اپنے اپنے گھروں کی طرف چلے۔ جب کہیں خدا خدا کر کے امن و امان قائم ہوا۔ اور لوگوں کو جانے کا راستہ ملا۔

لیکن طلوع آفتاب سے دو پہر تک اس مناظرے نے فیض آباد میں عجب گرم جوشی اور قیامت خیز پریشانی قائم رکھی۔ ایسا دلی کا ہنگامہ بپا تھا کہ لوگ مدتوں تک یاد کرتے رہے۔ اور یہ ارذی قعدہ ۱۳۷۷ھ کا دن لوگوں کو جب یاد آتا مارے ہنسی کے لوٹ جاتے۔ اس واسطے پر انشا پر دازوں نے زور قلم دکھائے۔ شعرا نے مثنویاں تصنیف کیں۔ اور بھائوں نے گیت بنائے جو سالہا سال تک فیض آباد کی سڑکوں پر گائے جاتے رہے۔ افسوس اُن میں سے کوئی نظم ہماری نظر سے نہیں گزری ورنہ ضرور نذر ناظرین کرتے۔

روحانی جاسوس

اگر انسان کا کائنات درست ہو اور اُس میں سچی جستجو سے حق ہو تو اُس کی روحانی قوت ہی سچی جاسوس بن جاتی ہے۔ یہی قوت ہے جو انبیاء و اقیان میں معجزات و کرامات کی شان دکھاتی ہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ وہ کوئی خفان فطرت چیز نہیں۔ بلکہ روحانی جاسوس ہے جو اکثر بہت سچی مخبری کیا کرتا ہے۔

چنانچہ اس روحانی جاسوس کی مخبری کا ایک واقعہ یہ ہے کہ معتقد با تشہد عباسی ایک دن دوپہر کو سوتے سوتے چونک پڑا۔ گھبرایا ہوا اٹھا۔ اور خدام کو آواز دی۔ اور جیسے ہی لوگ حاضر ہوئے حکم دیا کہ اسی وقت دوڑتے ہوئے چلے کے کن رے جاؤ۔ سب کے پہلے جو کشتی لے اُسے حراست میں کر لو۔ اور ملاح کو پکڑے میرے پاس لاؤ۔ لوگ گئے۔ اور ایک ملاح کو دیکھا کہ بدحواس اور گھبرایا ہوا تھا اور کشتی کو ایک طرف بھگائے لیے جاتا ہے فوراً اُس کی کشتی روک کے اُس پر پہرہ مقرر کر دیا۔ اور اُسے لے کے معتقد کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

اُس کی صورت دیکھتے ہی معتقد نے بڑی ہی زور سے اُسے ڈانٹ بتائی۔ اور کہا ”بد معاش جلد ہی تباہی عورت کو تو نے آج مار ڈالا ہے اُس کا کیا واقعہ ہے اور سچ بتانا۔ نہیں تو اسی وقت سر اڑا دوں گا۔“ ملاح خلیفہ کی ڈانٹ سُن کے سہم گیا۔ اور بولا ”امیر المومنین قصور تو ہوا ہے آج صبح میں فلاں گھاٹ پر تھا کہ ایک نہایت ہی حسین و پری حال عورت میری کشتی میں سوار ہوئی اور فلاں مقام پر لچاٹے کو کہا۔ حسن و جمال کے ساتھ وہ نہایت ہی معزز و دولت مند معلوم ہوتی تھی اس لیے کہ بہت ہی بھاری کپڑے پہنے تھی اور سر سے پاؤں تک مرصع زیور سے لدی ہوئی تھی۔ اُس کو تنہا دیکھ کے مجھے لالچ معلوم ہوا۔ کشتی کے اندر گرا کے فوراً چھاپ بیٹھا۔ وہ چپچپے نہیں پانی تھی کہ منہ بند کر کے گلا گھونٹ دیا۔ پھر اُس کے کپڑے اور اُس کا سارا زیور اُتار لیا۔ اور لاش دریا میں بہا دی۔ اس کے بعد ارادہ کیا کہ اُن کپڑوں اور زیور کو گھر لے جاؤں مگر اندیشہ ہوا کہ اس وقت انھیں لے کے کشتی سے نکلوں گا تو ممکن ہے کہ کوئی راستہ میں

کپڑے۔ اس لیے کشتی کو سیدھا شہر واسطی طرف بھگالے گیا۔ دوپہر کو جب دیکھا کہ دریا کشتیوں سے خالی ہے تو پلٹ آیا۔ اور غریب کشتی چھوڑ کے گھر جانے کو تھا کہ ان لوگوں نے پکڑ لیا۔ "معتقد نے کہا" اور وہ زیور اور کپڑے کہاں ہیں؟" کہا "کشتی کے بیچ میں تختوں کے نیچے رکھے ہیں۔"

معتقد نے خدام کو حکم دیا کہ "اسی وقت جانے ان کپڑوں اور زیور کو لے آؤ۔ اور میرے سامنے حاضر کرو۔" دم بھر میں وہ سب چیزیں آئیں۔ اور ملاح نے دیکھ کے اور پہچان کے کہا کہ "ہاں یہی ہیں۔"

اب معتقد کے غصے کی کوئی انتہاء تھی۔ اُس ملاح نے جس طرح اُس خاتون کو مارا اور ڈبو دیا تھا اُسی طرح اُسے وجہ میں ڈبو دیا۔ اور بغداد میں دھندھوڑا پڑا دیا کہ "جس گھر کی کوئی جوان عورت آج صبح کو بھاری کپڑے اور زیور پہنے ہوئے فلاں گھاٹ پر جا کے غائب ہو گئی ہو اُس کے لوگ بارگاہ خلافت میں حاضر ہوں۔" دوسرے دن اُس عورت کے گھر والوں نے آگے اطلاع کرائی۔ نور آدر بار میں بلالے گئے۔ خلیفہ نے اُن سے اُس عورت کی کیفیت و حالت دریافت کی۔ پھر وہ کپڑے اور زیور منگوائے دکھائے جنہیں اُنہوں نے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ تب معتقد نے وہ سب زیور اور کپڑے اُن کے حوالے کیے۔ اور بتایا کہ وہ خاتون شہید ہوئی۔ اُس کی لاش دریا میں بہا دی گئی۔ اور قاتل کو بھی سزا دی جا چکی۔

اس وقت دربار میں ابو محمد حسین بن محمد صالحی موجود تھا جو اس کارروائی کو اول سے آخر تک دیکھتا رہا تھا اُس نے بہ ادب عرض کیا "یا امیر المومنین! حضور کو اس واقعہ کی کیونکر اطلاع ملی؟ کیا حضور پر آسمان سے وحی اُترتی ہے؟" معتقد نے کہا "نہیں! دوپہر کو میری ذرا یونین سی آنکھ لگ گئی تو خواب میں کہا دیکھتا ہوں کہ ایک مقدس و متبرک صورت کا پیر مرد جس کے سر کے بال برتنے سے زین۔ سفید ڈاڑھی نہایت ہی نورانی ہے۔ اور سر سے پاؤں تک سفید براق کپڑوں میں لپٹا ہوا ہے میرے سامنے آگے کھڑا ہے اسے احمد (یہ معتقد بابت کا اصلی نام ہے) اس گھڑی سب سے پہلے جو ملاح دریا میں کشتی لے کے

آئے اُسے گرفتار کر لے۔ جس حسینہ کو اُس نے قتل کیا ہے اور اُس کے زیور اور کپڑے لیے ہیں اُس کے قتل کا اقرار کر ا۔ اور اُس پر حد شرع جاری کرے یہ سنت ہے میری آنکھ کھل گئی۔ پھر اُس کے بعد جو کچھ واقعات پیش آئے تم دیکھ ہی چکے ہو۔ یہ پیر مرد جو مقصد کے خواب میں آیا کون تھا؟ یہی روحانی جاسوس تھا جو ایک مقدس بزرگ کے بھیس میں آیا۔ اور مقصد کو اُس کے فرائض حکمرانی سے مطلع کر گیا۔

رہ لولو

تاریخ اودھ۔ مولانا عظیم محمد نجم الغنی خان صاحب رام پوری نے یہ تاریخ بڑی محنت جستجو اور قابلیت سے تصنیف فرمائی ہے اور ہمارے قدیم کرم فرما مالک اخبار نیر اعظم مراد آباد نے اسے شایع کیا ہے۔ یہ بیش بہا کتاب چار جلدوں میں پوری ہوئی ہے۔ پہلی جلد ۱۹۰ صفحوں پر ہے جس میں آغاز سے آخر عہد نواب صفدر جنگ تک کے حالات ہیں۔ دوسری جلد ۲۹۶ صفحوں پر ختم ہوئی ہے جس میں نواب شجاع الدولہ بہادر کی مسند نشینی سے نواب وزیر علی خان کے معزول اور خارج کیے جانے تک کے حالات ہیں۔ تیسری جلد ۲۲۴ صفحوں میں تکمیل کو پہنچی ہے۔ اور اُس میں نواب سعادت علی خان کی مسند نشینی سے ٹٹنا جان ابن نصیر الدین حیدر کے معزول اور چار گڑھ بھیجے جانے تک کے واقعات ہیں۔ اور چوتھی جلد جو ۱۳۴ صفحوں میں پوری ہو گئی ہے محمد علی شاہ کی تخت نشینی سے آخر انتہاء سلطنت تک کے واقعات میں قابل مصنف کا مذاق تاریخ سچا اور اچھا ہے۔ طرز بیان عمدہ پیچیدہ واقعات کے سلجھانے اور صاف کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس تصنیف کے لیے اُنھوں نے پوری وسیع انظری پیدا کی ہے۔ قریب قریب اودھ کی تمام تاریخوں پر نظر ڈالی ہے۔ اور جو کام کیا ہے اچھی طرح تیار ہو کے کیا ہے۔ حکومت اودھ اور خوانین روہیلکھنڈ کے درمیان میں جو افسوس ناک واقعات پیش آئے اُن میں مصنف حکومت اودھ ہی کو ملزم ٹھہراتے ہیں۔ اور اس میں ذرا شک نہیں کہ اُس عہد کے دیکھتے حکمرانان اودھ کی یہ اتنی بڑی

پوٹیکل غلطی تھی جو قابل معافی نہیں۔ لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ مسلمانوں نے اپنے زوال کے زمانے میں معافی کے قابل کون سا کام کیا تھا جو اس کو کہا جائے؟ اس داستان حسرت کے ہر ہر ٹکڑے کو ہم سوا اس کے کہ "شدنی" کہہ کہہ کے اپنے آپ کو سمجھائیں اور کس طرح اپنے دل کو تسلی دے سکتے ہیں۔

اس تاریخ میں حکمرانان اودھ کی بُری تصویر دکھائی گئی ہے۔ جس میں اُن ریپورٹوں نے بڑی مدد دی ہے جو لکھنؤ کے ریڈیٹ تیار اور مرتب کر کے بھیجا کرتے تھے۔ مگر ہم مصنف صاحب سے عرض کرتے ہیں کہ عیب اور جملہ جگہ جگہ پر نش نیز بگو۔ انھیں بدنام فرمان رواؤں کے ہاتھوں نے بہت سے اچھے کام بھی کیے ہیں۔ حکومت اودھ کی قلم دین اُن دنوں اگر چند مظلوم تھے جن کے حالات دنیا کے سامنے پیش کر دیے گئے ہیں تو اسی کی حدود میں اُن دنوں مرزا الحالی بھی ایسی تھی کہ پھر کبھی نہ نصیب ہوگی۔ انگریز ریپورٹروں اور مورخوں کا یہ عام مقولہ ہے کہ شہر والے گلچھرے اُڑا رہے تھے مگر گاؤں ویران اور تباہ تھے۔ مگر ہمیں اتفاقاً جتنے گاؤں ملے سب ایسے ہی ملے کہ اُن دنوں نہایت آباد اور بارون تھے اور اب حد سے زیادہ ویران و خراب ہیں۔ لکھنؤ میں بے شک وہ تمام عیوب پیدا ہو گئے تھے جو عیش پرستی کی وجہ سے دنیا کے ہر مشہور شہر میں پیدا ہو جایا کیے ہیں لیکن لکھنؤ ہی نے ایک ایسا شایستہ تدن پیدا کر دیا تھا اور ایسی نگہری سوسائٹی بنایا کر دی تھی جس نے لکھنؤ کو ہندوستان کا پیرس مشہور کیا تھا اور جس کی یاد و تدن میں بھولے گی۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ایشیائی تہذیب کا آخری گوارہ لکھنؤ کا گم شدہ دربار تھا۔ اور اس گوارے میں بڑے ہماری اصلی تہذیب ایسی موت کی نیند سوئی ہے کہ قیامت تک نہ جاگے گی۔ اور انسوس تو یہ ہے کہ اپنی ذاتی تہذیب کو کھو کے ہم کسی دوسری تہذیب کے چاہے نقال بن جائیں مگر مالک قیامت تک نہ بن سکیں گے۔

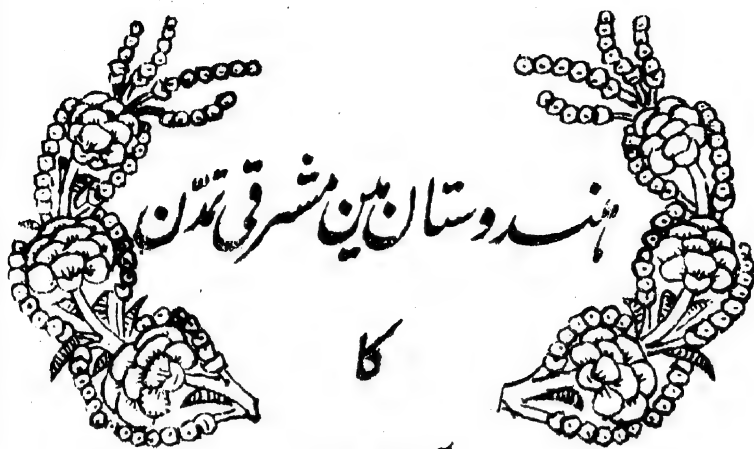
تاہم ہمیں اعتراف ہے کہ مصنف صاحب نے یہ تاریخ بڑی قابلیت اور تکمیل کے ساتھ لکھی ہے۔ جس کے لیے ہم اُن کے نہایت شکر گزار ہیں لیکن آخر میں معلوم ہوتا ہے کہ جناب مصنف لکھتے لکھتے اکتا گئے تھے۔ اور اس کے درپے تھے کہ اس بلا کو

کسی طرح ٹالیں۔ چنانچہ پچھلی جلد جس میں بہت زیادہ واقعات ہونا چاہیے تھے صرف ۱۳۴ صفحوں میں ختم ہو گئی ہے۔ محمد علی شاہ - امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ کے حالات کے تشنہ رہنے کے علاوہ مرزا برہیس قدر اور قدر کے حالات ناگوار اختصار کے ساتھ ٹال دیے گئے ہیں۔

پہلی جلد کے مول میں مصنف صاحب کی تصویر ہے۔ اور چوتھی جلد کے آخری حیارہ صفحہ جناب مصنف کے سوانح عمری کی نذر ہوئے ہیں جن میں ان کے حالات کے علاوہ ان کی غزلیں ان کی نظمیں اور ان کا واسوخت بھی درج کر دیا گیا ہے۔ کتاب ۲۶ x ۲۶ پیمانے کے معمولی کاغذ پر چھپی ہے۔ چھپائی بھی معمولی ہے۔ اور قیمت ہر جلد کی پیر یعنی پوری کتاب کی قیمت چھ روپیہ (۶) ہے۔ مالک اخبار نیر اعظم مراد آباد سے دہلی - آئی سنگوائی جاسے۔

رومۃ الکبریٰ

اب کی جونا دل قدرو اتان دنگداز کی نذر کیا جائے گا اُس کا نام "رومۃ الکبریٰ" ہے۔ اُس میں گوتمہ لوگوں کے ہاتھ سے رومۃ الکبریٰ کی تباہی اُس عہد کے روم کی آبادی و معاشرت کی سچی تصویر دکھانے کے اور نفوس شاہ گوتمہ کے ایک ناز پروردہ شاہزادی پر عاشق ہونے اور لڑائی سے تھک کے محبت و خلوص کے ذریعے سے اپنے عشق میں کامیاب ہونے کے بچہ تاریخی واقعات دکھائے گئے ہیں۔ اور آئین اسپین کی اُس گوتمہ سلطنت و دولت کا پتہ دے دیا گیا ہے جسے تین صدیوں بعد عربوں نے تباہ کیا تھا۔ بہت دلچسپ اور توجہ خیز ناول اور تاریخ و دم کے عمیق مطالعہ کا جو ہر درست ہے۔ یہ ناول ۸۸ صفحوں پر ختم ہوا ہے۔ اور جو خریدار نہیں ہیں ان سے اس کی قیمت سواروپیہ ۱۱ ہے۔ مگر ۱۱/۳ کے خریداروں کی خدمت میں مفت نذر کیا جائے گا۔ تیار ی میں کسی قدر دیر ہو گئی نصف سے زیادہ چھپ چکا ہے۔ تیار ہونے ہی خریداروں کے نام عہد پر دی جائے گا۔



آخری نمونہ

نواب سعادت خان برہان الملک کے خاندان کے متعلق اسی قدر بتا دینا کافی ہے کہ میر محمد نصیر نام نیشاپور کے ایک سید زادے جن کا سلسلہ نسب امام موسیٰ کاظمؑ سے ملتا ہے (صفحہ ۱۲۳ محمدی) (صفحہ ۶) عہد بہادر شاہ مین وارد ہندوستان ہوئے۔ ان کے بڑے بیٹے میر محمد باقر ساتھ آئے تھے جنہوں نے یہاں شادی کر لی۔ اور باب بیٹوں نے ناظم بنگالہ کے زیر حمایت عظیم آباد پنشن مین سکونت اختیار کی۔ محمد باقر کو ہندوستان کی بی بی سے خدا نے ایک بیٹا دیا جو بعد کو شیر جنگ کے معزز لقب سے مشہور ہوا۔

میر محمد نصیر کے آنے کے دو سال بعد ان کے چھوٹے بیٹے میر محمد امین بھی نیشاپور سے ہندوستان مین آ گئے۔ عظیم آباد پہنچے تو سنا کہ والد نے سفر آخرت کیا۔ اور اب دونوں بھائی میر محمد باقر اور میر محمد امین دہلی کو روانہ ہوئے۔ جہاں پہنچنے کے بعد میر محمد امین کو شاہزادوں کی جاگیر کا ٹھیکہ مل گیا۔ اس مین انہوں نے ایسی ایاقیت مستعدی اور کارگزاری دکھائی کہ تمام لوگوں مین شہرت ہو گئی۔ اقبال برسر یاری تھا۔ چند ہی روز بعد دربار شاہی کے معزز امروں اور منصفداروں مین شامل ہوئے۔ پھر صوبہ دار اکبر آباد کی مٹی سے نکاح ہو گیا۔ اور اس اعلیٰ طبقہ اُمرا مین شمار کیے جانے لگے جس پر سلطنت کی ذمہ داری کی خدمتوں کے لیے انتخاب کی نظر مین پڑتی تھیں۔

اُن دنوں دہلی میں سادات بارہہ کا زور تھا۔ جن سے رعیت تو رعیت خود بادشاہ سلامت ڈرتے تھے۔ محمد امین نے اُن کو قتل کرا کے سیدوں کا زور ہمیشہ کے لیے توڑ دیا۔ اور لڑائی میں ایسی شجاعت دکھائی کہ دربار شاہی سے منصب ہفت ہزاری اور سات ہزار سواروں کی سرداری کے ساتھ برہان الملک بہادر جنگ کا خطاب عطا ہوا اور اُسی وقت اکبر آباد کے صوبہ دار مقرر ہوئے۔ اس کے بعد بادشاہی خواصوں کی داروغگی عطا ہوئی جو بڑا سبز زعمہ تھا۔ اس کے تھوڑے دنوں میں وہ صوبہ اودھ کے صوبہ دار اور اس کے ساتھ ہی بادشاہی توپ خانہ کے داروغہ مقرر ہوئے۔ آدمی ہوشیار اور نہایت ہی بیدار مغز اور اس کے ساتھ بڑے بہادر اور شجاع تھے۔ شاہی توپخانے کو اپنے ہاتھ میں لے کے انھوں نے ایسی زبردست قوت پیدا کر لی جیسی اُن دنوں سارے ہندوستان میں کسی کو نصیب نہ تھی۔ اس زمانے میں کوڑہ کے زمیندار بھگونت سنگھ نے سلطنت سے سرتابی کر کے بڑا زور باندھ رکھا تھا اور کئی اضربہ اس کی سرکوبی کو گئے اُس کے ہاتھ سے مارے جا چکے تھے۔ آخر برہان الملک اس مہم پر مامور ہوئے۔ اور یلغار کرتے ہوئے پہونچے۔ بلونت سنگھ نے چالاک سے اُن کو گھیر لیا اور لڑائی کا رنگ ایسا بگڑا نظر آیا کہ بڑے بڑے بہادروں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ مگر برہان الملک نے ایسی جوازدی سے مقابلہ کیا کہ دیر تک دشمنوں کے زعمے میں اُن کی لمبی سفید لڑائی ڈاڑھی چمکتی اور رعب ڈالتی رہی۔ تھوڑی دیر میں بھگونت سنگھ اُن کے تیر کا نشانہ ہوا۔ اور دشمن بھاگ کھڑے ہوئے۔ برہان الملک کی دوسری مہم اس سے بھی زبردست تھی۔ اُن دنوں مرہٹوں کا ہندوستان میں بڑا زور تھا۔ انھوں نے تاجدار دہلی سے چوتھ مقرر کرا لی تھی۔ اور بڑے بڑے سواروں کے نام سے کانپتے تھے۔ برہان الملک نے مرہٹوں کو زبردست فوج کے ساتھ جا کے ایسی سخت شکست دی کہ اُن کے حواس جاتے رہے۔ لوگ دم بھاگے۔ اور برہان الملک نے تعاقب شروع کیا۔ واقعات تاریخ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر اس موقع پر برہان الملک زبردستی روک نہ دیے جاتے تو وہ بڑھ کے مرہٹوں کا استقبال کر دیتے۔ اور سلطنت مغلیہ اپنے اگلے عہد شباب کی طرح سارے ہندوستان کے سیاہ و سفید کی مالک ہو جاتی۔ مگر اُس نصیب

زوال پذیر سلطنت کو مٹنا ہی تھا اور باریون کی سازش اور مقربین دربار کے حصہ
لے برہان الملک کی رفتار کو روکوا دیا۔

اس بات نے برہان الملک کو یقین دلادیا کہ بادشاہ مین اپنے نیک و بد کے
سمجھنے کی صلاحیت نہیں اور اہل دربار بددیانت و خود غرض ہیں فوراً مہنوں سے
صلح کر لی۔ پھر ارادہ کیا کہ اپنے صوبے میں جا کے قیام کریں۔ اور سب سے
اگلی ہو کہ اپنے علاقہ کو مضبوط اور منظم بنا دیں۔ غرض برہان الملک نے دل میں سمجھ لیا
کہ اب سلطنت مغلیہ بننے والی نہیں ہے۔ اپنا صوبہ لے کے اگلی ہو جانا ہی مناسب
ہے۔ اور دہلی کے دربار کو اس کی قسمت پر چھوڑ دینا چاہیے۔

لکھنؤ میں جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں شیخزادوں کا زور تھا۔ انھوں نے اپنی علوت
کے موافق انھیں بھی روکا۔ مگر برہان الملک حکمت عملی سے داخل ہو گئے اور نکمہ بھی
پھوٹنے نہ پائی۔ برہان الملک کے لکھنؤ میں داخل ہونے کے متعلق دروایتن شہور میں
ایک یہ کہ وہ برابر بڑھتے چلا آئے۔ یہاں تک کہ اکبری دروازہ پر روک گئے۔ چونکہ وہ سابق
کے تمام صوبہ داروں کے خلاف تجربہ کار اور متین و سنجیدہ شخص تھے۔ ٹھہر گئے۔ اور
محمود نگر میں پڑاؤ ڈال دیا۔ دو ایک دن کے بعد شیخزادوں کی دعوت کی۔ ان سے
بڑی خاطر تواضع سے پیش آئے۔ لیکن جس وقت غافل شیخزادے الوان نعمت کا فرہ
لوٹنے میں مصروف تھے شاہی فوج خاموشی کے ساتھ چوک میں داخل ہو رہی تھی جو
برابر بڑھتی ہی چلی گئی۔ یہاں تک کہ تجھی بھون کے پاس جا پہنچی۔

دوسری روایت یہ ہے کہ محمد خان بگٹش نے برہان الملک کو تبا دیا تھا کہ لکھنؤ
کے شیخزادے بڑے شور و پست ہیں۔ ان سے پیش پانا آسان نہیں۔ مگر قرب و
جوار کے دوسرے شیوخ ان کے خلاف ہیں۔ آپ ان لوگوں سے مدد لیجیے۔ اور انھیں
کی مدد سے لکھنؤ والوں کو زیر کیجیے چنانچہ برہان الملک نے کاکوری میں قیام کر کے
شیوخ کاکوری کو اپنے موافق بنالیا۔ انھیں کی مدد اور رہبری سے آگے بڑھے۔ اور
یہ سن کے کہ محمود نگر اور اکبری دروازے میں مقابلہ کا سامان کیا گیا ہے اصلی راستہ سے
کڑا کے مغرب کی طرف کٹ گئے۔ گنو گھاٹ کے پاس جدیا کے پار اترے۔ اور پار
کی طرف سے آہستہ آہستہ آگے اچانک بھی بھون پر آپڑے۔ غرض جو صورت ہو

اُنھوں نے بغیر اس کے کہ کوئی فرائض ہو قلعہ پر قبضہ کر لیا۔
 جب مجھی بھون پر قبضہ ہو گیا تو پھر کون دم مار سکتا تھا؟ شیخزادوں کے تمام عزیز
 یوگون نے حاضر ہو کے عاجزی سے سر جھکا دیا۔ برہان الملک ہاتھی پر سوار ہو کے
 شیخنی دروازے میں داخل ہوئے اور اُس تلوار کو جو بڑے بڑے بہادر دن کا سلام
 لے چکی تھی اپنی تلوار سے کاٹ کے گرا دیا۔ پھر شیخزادوں سے کہا ”ہمارے قیام کے
 لیے مجھی بھون خالی کر دو۔ اس میں اُنھوں نے لیت وھل کر ناچا ہی مگر نہ چلی۔ آخر
 ایک ہفتہ کی مہلت دی گئی۔ اور اس مدت کے اندر شیوخ جو کچھ اسباب نے جاسکے
 اُٹھائے گئے۔ اور جو رہ گیا اُس پر برہان الملک کے سپاہیوں نے قبضہ کیا۔ قلعہ میں
 جا کے رہنے سے پہلے اُس کے پاس ہی جہان حمیدہ وال کے وہ رہتے تھے وہاں ایک
 نوبت خانہ تعمیر کرا دیا جس میں دربار اودھ کے آخری عہد تک روزانہ چھ وقت نوبت کبھی رزم
 اس کے بعد برہان الملک اجدھیا میں گئے۔ اور دریا کنارہ وہ بنگلہ بنوایا جس کا
 حال ہم بیان کر چکے ہیں۔ لیکن وقتاً فوقتاً لکھنؤ میں آتے اور قیام کرتے تھے۔ کیونکہ
 صوبہ کا مستقر یہی شہر تھا۔ اُن کے زمانے میں یہاں کئی نئے محلے آباد ہوئے۔ مگر یہ سب
 محلے اُن کے مغل سرداران فوج کے پڑاؤ کے مقامات تھے۔ جہاں مستقل سکونت کے لیے
 لوگوں نے مکان بنا کر شروع کر دیے۔ سید حسین خان کا کمرہ، ابوتراب خان کا کمرہ، خدایار
 خان کا کمرہ، بزن بیگ خان کا کمرہ، وفابیک خان کا کمرہ، محمد علی خان کا کمرہ۔
 باغ ہما یارین۔ سر اسے معالی خان اور اسماعیل گنج (جو مجھی بھون کے مشرق طرف تھا اب لکھنؤ
 سب اسی زمانے کے محلے یا برہان الملک کے سرداران فوج کے لشکر گاہ ہیں۔
 نواب برہان الملک مجھ ہی برس اودھ اور لکھنؤ میں رہنے پائے تھے کہ ۱۲۸۰ھ بمطابق
 (۱۸۶۳ء) میں نادر شاہ نے ہندوستان پر حملہ کر دیا۔ اور وہ نہایت ہی تاکید کے ساتھ
 دہلی میں بلائے گئے۔ اُس پر فتنے زمانے میں جو کچھ واقعات گزرے اُن کو لکھنؤ سے
 تعلق نہیں۔ لکھنؤ میں اپنا نائب اور قائم مقام بنائے وہ اپنے بھائی اور داماد نواب ضفر
 کو چھوڑ گئے تھے۔ نادر دہلی کو لوٹ چکا تھا اور قتل عام کر چکا تھا مگر ابھی وہیں تھا کہ نواب
 برہان الملک نے دہلی میں وفات پائی۔ اُن کے بھتیجے شیر جنگ نے نادر شاہ سے سفارتیں
 اٹھوائی کہ نواب مرحوم کے بعد اودھ کی صوبہ داری انھیں دی جائے۔ لیکن اجدھ بھٹی

نے جو برہان الملک کے متعدد عہدہ داروں میں تھا نادر کی خدمت میں اس مضمون کی ایک عرضداشت پیش کر دی کہ "نواب برہان الملک شیرجنگ سے خوش نہ تھے۔ اور اسی لیے انھوں نے اپنی بیٹی اُن کو چھوڑ کے صفدرجنگ کو دی جو اُن کی نیابت کرتے تھے اور اس وقت بھی اُن کی طرف سے لکھنؤ میں موجود ہیں۔ برہان الملک کے مال و اسباب کی مالک سرکار ہے۔ جسے چاہے عطا کرے۔ اس لیے کہ یہ کوئی ورثہ نہیں ہے۔ یہ بھی عرض ہے کہ صفدرجنگ بڑبازر۔ خدا ترس۔ لائق اور وعدے کے سچے ہیں۔ اور سپاہ اُن سے خوش ہے۔ قطع نظر اس کے حضور کے لیے برہان الملک نے دو لاکھ روپے کی رقم کا وعدہ کیا تھا اُس کے ادا کرنے کا انتظام نواب صفدرجنگ لے کر گیا ہے۔ جس پر حکم ہو حاضر کر دیے جائیں۔ ان وجہ سے امید ہے کہ حضور انھیں کی سفارش فرمائیں گے یہ عرضداشت دیکھتے ہی نادر شاہ نے صفدرجنگ کے لیے محمد شاہ سے خود ہی خلعت صوبہ داری لے لیا۔ اور اپنے ایک مصاحب اور دو سو سواروں کے ساتھ اودھ میں صفدرجنگ کے پاس بھیجا۔ یوں خلعت صوبہ داری پہن کے صفدرجنگ نے وہ دو کڑوڑ کا نذرانہ نادر کے پاس بھجوا دیا۔ اور اپنے علاقے پر حکومت کرنے لگے۔

صفدرجنگ کا پورا نام مرزا مقیم ابوالمنصور خان صفدرجنگ تھا۔ گو اُن میں برہان الملک کی سی بھی بہادری سادگی۔ راست بازی۔ اور جفاکشی نہ تھی مگر نہایت فیاض۔ بلند حوصلہ۔ رحم دلی رعایا پرور۔ اور منظم تھے۔ شہرستون میل کی مسافت پر انھوں نے قلعہ جلال آباد تعمیر کرایا۔ اور کچھی بھون کے اندر پنج محلے کی جو قدیم سمارت تھی اُسے بھی شیخ زاوون سے لے لیا۔ اور اُس کے عوض میں دوکانوں میں ۶۰۰ ایکڑ زمین شیخ زاوون کو رہنے اور رہنے کے لیے عطا کی۔ جس سے اگرچہ شیخ زاوون پر ظلم ہوا مگر لکھنؤ کی آبادی کو وسعت اور ترقی حاصل ہوئی۔ کچھی بھون کو صفدرجنگ نے از سر نو تعمیر کرایا۔ اور اُسے بہت درست کیا۔

لیکن صفدرجنگ پانچ ہی برس اپنے صوبہ میں رہنے پائے تھے کہ دہلی میں اُن کی طلبی ہوئی۔ اور راجہ نول راے کو اپنی نیابت پر لکھنؤ میں چھوڑ کے وہ دہلی چلے گئے۔ نول راے علم دوست۔ وقت کا پابند۔ جفاکش بہادر۔ اور بہت بڑا منظم تھا۔ اور اس کے ساتھ اُسے خدا نے اپنے آقا کی سی اُلوال العزى و فیاضی بھی دی تھی۔

اُس نے ارادہ کیا کہ کبھی بھون کے سامنے دریا پر ایک پہلی تعمیر کرے۔ پانیوں کی بنیاد ڈالنے کے لیے گرسے کنوین لکھو دالے۔ لیکن پائے بننا شروع نہیں ہوئے تھے کہ اپنے آقا کی طلب پر اُسے فوج لے کے احمد خان بگش کے مقابلہ کے لیے جانا پڑا۔ اس موقع پر وہ بڑی زبردست فوج لے کے گیا۔ مگر مارا گیا۔ اور پہلے کام جو تعمیرات تھیں تمام بڑا رہ گیا۔ احمد خان بگش اُس زمانے کا بہادر ترین شخص تھا۔ اُس کے مقابلہ کے لیے بہانہ ملنے کی ضرورت تھی۔ صفدر جنگ اُس کے حریف مقابل نہ ہو سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ احمد خان کی اور اُن کے ساتھ افغانہ کی قوت ترقی کرتی گئی۔ صفدر جنگ نے لاکھ ہاتھ پاؤں مارے۔ خود شمشاد دہلی لٹکا کر اُس کے مقابلے کے لیے کھڑا کر دیا۔ مگر اُس کا کچھ نہ بچاڑ سکے۔ اور اُس کے اشارے سے حافظ رحمت خان نے اودھ کے شہر دن اور قصبوں میں لوٹ مار شروع کر دی۔ خیر آباد پر قبضہ کر لیا۔ اور خود احمد خان بگش کا بیٹا محمود خان فوج لے کے چلا کہ لکھنؤ پر قبضہ کرے۔ ۱۸۵۹ء

(۱۸۵۹ء) میں پٹنانون نے علی آباد میں اپنا تھانہ قائم کیا۔ اور ۱۸۵۸ء میں محرمی ۱۲۷۸ء میں محمود خان کا کوئی عزیز بیس ہزار فوج لے کے لکھنؤ کی طرف چلا۔ شہر کے باہر پڑاؤ ڈالا۔ اور اپنا ایک کوتوال مقرر کر کے شہر میں بھیجا۔ صفدر جنگ کے آدمیوں سے شہر خالی تھا جو چند تھے بھی پٹنانون کے آنے کی خبر سن کے بھاگ کھڑے ہوئے اور پٹنانون کے کوتوال نے شہر میں آ کے بے اعتدالیان شروع کر دیں۔

ان دنوں شیخ اویگان لکھنؤ میں سب سے زیادہ سربر آوردہ شیخ معز الدین تھے۔ وہ افغانہ کے سردار سے شہر کے باہر جا کے لے۔ اُسی وقت کسی نے اُس سے جا کے شکایت کی کہ شہر والے آپ کے کوتوال کی تحقیر توہین کرتے ہیں۔ اور کوئی اُس کا حکم نہیں مانتا۔ شیخ معز الدین بولے ”کیا مجال ہے کہ کوئی ایسی گستاخی کرے میں جاتا ہوں مفسدون کو سزا دوں گا۔“ یہ کہہ کے واپس آئے اور تمام بھائی بندوں کو مچ کے کہا ”پٹنانون کے قول و فعل کا اعتبار نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ ہم نواب صفدر جنگ کا ساتھ دیں۔ اور مقابلہ کر کے پٹنانون کو یہاں سے نکال دیں۔ اس کے بعد شیخ معز الدین نے اپنے گھر کا زیور بچ کر فوج جمع کی۔ اور ساری شیخزادوں کو لے کے کوتوال پر حملہ کیا۔ وہ اپنی جان لے کے بھاگا اور شیخ صاحب نے کسی مغل کو درباری

لباس پہنا کر اپنے مکان میں بیٹھا دیا۔ اور منادی کرا دی کہ صفدر جنگ فی اپنی طرف سے ہنس کر
کو تو ال بنا کر بھیجا ہو۔ اس کو ساتھ ہی علی کو نام کا ایک ہنر جھنڈا کھرا کیا اور لوگ اُس کو نیچے
آ۲ کے جمع ہونے لگے۔

یہ حالات سُن کر چٹانوں فی حملہ کر دیا۔ شہزادوں فی جان توڑ کر مقابلہ کیا۔ اور اپنی بڑائی
شہور شجاعت دکھا دی۔ چٹان مقابلہ کی تاب نہ لاسکے۔ پندرہ ہزار فوج کو ساتھ لے کر
اور موقع پا کر شہزادوں۔ اور چٹانوں کو سارے ملک اور وطن سے نکال باہر کیا۔
دو سال بعد جب احمد خان بنگش سے صلح ہو گئی تو ۱۸۲۲ء محمدی (۱۲۴۳ھ) میں
میں نواب صفدر جنگ پھر لکھنؤ میں آئے۔ اور مہدی گھاٹ پر آ کے ٹھہرے۔ ایک

خاص مکان اپنے رہنے کے لیے بنوایا اور سمجھا۔ اور سپاہ کی درستی میں مصروف
ہوئے۔ لیکن اس کی مہلت نہ ملی۔ اسی سال سلطان پور کے قریب پار گھاٹ
میں پڑاؤ تھا کہ انتقال کیا۔ لاش پہلے فیض آباد کی گلاب باڑی میں لے جا کے زمین
کے سپرد کی گئی۔ پھر تھوڑے دنوں کے بعد نڈیان دہلی میں لے جا کے دفن
کی گئیں جن پر نہایت ہی عالی شان مقبرہ موجود ہے۔ اور یہاں ارض اسیہ
آج تک عبرت و عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

ایک قاضی صاحب کا فتویٰ

اس سے پہلے نمبر میں ہم فیض آباد کا ایک مذہبی اور علمی مناظرہ دکھا چکے ہیں اب کی
بار دکھاتے ہیں کہ انھیں دونوں وہاں ایک قاضی صاحب کے فتوے نے کیسا مزے کا چکھا
رنگ دکھایا۔

شجاع الدولہ کی وفات اور نواب آصف الدولہ کے لکھنؤ چلے آنے کے بعد فیض آباد میں
صرف سوز و گم کے ہی بڑے ہی سرکارین رہ گئی تھیں۔ جن کی ذات سے شہر کی رونق ایک
بڑی حد تک برقرار تھی۔ ان میں سب سے اول شجاع الدولہ کی والدہ نواب سدر النساء
بیگم صاحبہ کی سرکار تھی۔ دوسری سرکار ان کی بیوی جناب عالیہ متعالیہ نواب بہو بیگم صاحبہ
کی تھی۔ جو سب سے بڑی سرکار تھی۔ تیسری بنی خان صاحبہ تھیں یہ بیگم الدولہ کی بیوی
تھیں۔ دربار لکھنؤ سے پانچ ہزار ماہوار پانچ تھیں۔ اور اس کے علاوہ بہت سے

جواہرات اور لاکھوں روپیہ کا اندوختہ تھا۔ ان تینوں خاتونوں کے علاوہ برہان الملک کے خاندان کی تمام معزز و محترم بیگمیں فیض آباد ہی میں تھیں۔ جن میں سے ہر ایک کی بجائے خود ایک مستقل سرکار تھی۔

بنی خانم صاحبہ نے اپنی کسی پیش خدمت کی بیٹی نور جہان کو بڑی محبت اور لاڈ پیار سے پالا تھا۔ وہ بڑی خوبصورت تھی اور اُس کے ساتھ نہایت ہی شوخ و چالاک۔ جب بڑی ہوئی تو بنی خانم کو اُس کی شادی کی فکر ہوئی۔ دروازے پر ایک سید صاحب بچوں کی تعلیم پر نوکرتھے۔ انھوں نے اپنے بیٹے میر محمد صالح کے لیے پیام دیا۔ بنی خانم نے اس نسبت کو اس خیال سے پسند کر لیا کہ لڑکی کہیں باہر نہ جائے گی۔ میرے ہی پاس بی رہے گی۔ اور شادی ہو گئی۔

یہ میر محمد صالح جاہل۔ بد صورت۔ بے عقل۔ متلون مزاج اور افسر میان کی لگائے تھے۔ اور بی بی ملی آفت کی پرکاش۔ جو بڑی ہی ہوشیار۔ عقل کی تیلی۔ شوخ و شریہ۔ با مذاق و سخن فہم۔ اور اس کے ساتھ بلا کی خود را سے اور ضد تھی۔ میان کو خطرے ہی میں نہ لاتی تھی۔ اُس نے میان کی کبھی نوکر سے زیادہ وقعت نہ سمجھی۔ میان تک کہ محمد صالح کی جوڑو ہونے پر شرماتی۔ اور کوئی منہ پر کبہ دیتا تو بُرا مانتی تھی۔ میان نے تو پورے ہی خاک اڑا دی اور وہ کبھی پاس نہ چلکتی۔

چند روز بعد بنی خانم نے نور جہان کو اپنے گھر کا داروغہ کر دیا۔ اب سارا لینا دینا اُس کے ہاتھ تھا۔ اندر باہر کی مالک تھی۔ روپیہ پیسہ خزانہ اور جواہرات جو کچھ سامان دولت تھا سب اُس کے قبضے میں تھا۔ اس سے اُس کا دماغ اور آسمان پر چڑھ گیا۔ اور میان سے کسی قسم کا تعلق ہی نہ باقی رہا۔ صورت دیکھے تک کی روداد نہ تھی۔ بنی خانم کے سگے بھائی آغا علی خان بیرونی کا دوبار کے مختار تھے۔ اور محل میں اُن کی اکثر آمد و رفت رہتی تھی۔ وہ شوخ ادا نور جہان پر ایک جان چھوڑ سوجان سے عاشق ہو گئے۔ دونوں کا تعلق نوکر چاکروں کے ذریعے سے باہر مشہور ہوا۔ اور ہر صحبت میں ان دونوں کے ناجائز عشق کا تذکرہ ہونے لگا۔

بنی خانم کی سرکار میں ایک اور عورت نوکرتھی جس کا نام ساجدہ خانم تھا۔ اُسے نور جہان نے کسی الزام پر برطرف کر دیا۔ وہ محل سے کل کے اپنے داماد

مرزا شیخا کے گھر میں آئی جنہیں بہو بیگم صاحبہ کے خواجہ سرا جو اہر علی خان کی سرکار میں رسوخ حاصل تھا۔ اُس نے داماد کے سامنے اپنا ڈکھڑا روئے روئے نور جہان کی آوارگیوں کا ذکر کیا۔ اور کہا "سار افسا دُوسری مُردار کا ہے"۔ مرزا شیخا نے یہ سنا تو انتقام لینے کے درپے ہو گئے۔

چند روز پہلے اتفاقاً ایک ایسا واقعہ پیش آیا تھا جس سے جو اہر علی خان اور آغا علی خان کے دونوں میں کدورت پیدا ہو گئی تھی۔ آغا علی خان کا ایک حام جو اہر علی خان کے مکان سے ملا ہوا تھا۔ اور وہیں پر آغا علی خان کا مکان بھی تھا۔ جو اہر علی خان نے اپنے آرام کے خیال سے کئی بار اُس حام کی مرمت کرا دی تھی۔ اُن کے اس تصرف سے آغا علی خان کو دل میں اندیشہ ہوا کہ یہ نہیں مرمت کراتے کراتے جو اہر علی خان اُس پر قبضہ نہ کر لیں۔ اس اندیشہ کے مٹانے کے لیے اُنھوں نے ایک رات اپنی آدمی بیچ کے اُس حمام کے روشندانوں کے شیشے اور کھڑکیاں ٹرٹ وا ڈالیں۔ اور جا بجا توڑ پھوڑ کے اس قابل ہی نہ رکھا کہ اُس کوئی نہا سکے۔ جو اہر علی خان کو یہ دیکھ کے بڑا ملال ہوا۔ ظاہر میں تو خاموش ہو رہا۔ مگر دل میں سوچنے لگا کہ آغا علی سے کیونکر اس کا بدلہ لے۔

اسی سوچ میں تھا کہ مرزا شیخا نے اپنی ساس کا ڈکھڑا روئے کے ساتھ نور جہان اور آغا علی خان کی عشق بازیوں کا حال بیان کیا۔ اور اسی وقت سے نور جہان اور آغا علی خان کے عشق کے خلائ سازش شروع ہو گئی۔ مرزا شیخا نے نور جہان کے شوہر میر محمد صالح کو اکیلے میں بلوایا کہ "تم بڑے بے غیرت ہو! اپنی جورو کی آوارگیوں اور آغا علی خان کے ساتھ اُس کے ناجائز تعلقات سنتے ہو اور دم نہیں مارتے!" محمد صالح نے کہا "میں کیا کر دن؟ میرا کچھ زور ہے؟ نہ مجھ میں طاقت ہے اور نہ میرے پاس دولت ہے۔ غریب کی کون سُنتا ہے؟ آغا علی خان قوت اثر و پیہ پیہ سب ہی کچھ رکھتے ہیں۔ اور میرے پاس کیا ہے؟ پہاڑ کے سامنے تنکے کی کوئی اصل و حقیقت ہے؟" مرزا شیخا نے کہا "اچھا ایک کام کرو۔ ایک عرضی جو اہر علی خان کی معرفت بہو بیگم صاحبہ کے ملاحظہ میں پیش کرا دو جس میں یہ سب حال لکھا ہو۔ جو اہر علی خان تمہاری چارہ چوٹی بھی کریں گے اور تمہارا کچھ وظیفہ

بھی مقرر کرادین گے۔ دوسری طرف تم یہ کرو کہ قاضی صاحب کے محکمہ میں بھی درخواست پیش کر دو۔“

محمد صالح نے فوراً ہو بیگم صاحبہ کی خدمت میں عرضی دی۔ اور اسی وقت قاضی صاحب کے محکمہ میں رجوع کیا۔ قاضی ایک معمولی درجے کے مفتی تھے۔ اور ان کی سماعت ہی کون کرتا تھا؟ درخواست دیکھتے ہی ان کا دم نکل گیا بولہ ”میں آغا علی خان کے خلاف کیا کر سکتا ہوں؟ مجھے رپٹ دو گے یا فیض آباد سے منکلاؤ گے؟ مگر جو اہر علی خان کی طرف سے انھیں شہ دی گئی۔ اور یقین دلایا گیا کہ آپ فتویٰ تو دین ہم آپ کی پوری پوری مدد کریں گے۔“

اب ایک مناسب موقع پر جو اہر علی خان نے وہ عرضی لے جا کے ہو بیگم صاحبہ کو سنائی۔ اور پورا واقعہ سمجھایا۔ ہو بیگم سے اگرچہ بنی خانم سے بڑی ملاقات اور رسم و راہ تھی۔ مگر آغا علی خان کی اس حرکت پر بہت بگڑیں۔ اور کماٹین شرع کے معاملہ میں کسی کی مروت نہ کروں گی۔ اس معاملے کو قاضی صاحب کے وہاں پیش کر دو۔ اور سارے شہر والوں کو بھی خبر کر دی جاے۔ جو خدا و رسول کا حکم ہو گا وہی ہو گا۔ یہ سب کچھ دیکر بنی خانم کو ابھی تک کا نون کا خبر نہ تھی۔ آغا علی خان نے کچھ سن گئی پائی مگر یقین نہ آیا کہ میرے مقابلے میں کوئی کارروائی کی جاسکے گی۔

آخر وہ دن آیا جو کارروائی کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ میر محمد صالح صبح صبح نئی درخواست لے ہوئے قاضی صاحب کے پاس پہنچے۔ اور داد خواہ ہوئے۔ جو اہر علی خان کی شہ تو تھی ہی۔ قاضی صاحب نے فوراً زور و شور سے آگے خود آغا علی خان کی مسجد میں اپنا شرعی اجلاس جمایا۔ اور ”بشارت“ و ”سعادت“ نام ہو بیگم کی سکار کے دو خواجہ سرا بجا آوری احکام کے لیے سامنے دست بستہ کھڑے ہو گئے۔ اب قاضی صاحب نے شرع کے مطابق فتویٰ دیا۔ اور اس فتوے کی بنا پر ایک قطعی حکم لکھ کے ان دونوں خواجہ سراؤں کے ہاتھ بنی خانم کے پاس بھیجا کہ ”نور جہان اسی وقت اپنے شوہر میر محمد صالح کے حوالے کر دی جاے جو ہماری عدالت میں داد خواہ ہوا ہے۔“ قلیل حکم میں اگر تاخیر ہوئی تو مسلمان محل میں گھس کے زبردستی حکم شرع کی تعمیل کرائیں گے۔“

بنی خاتم اس وقت تک واقعات سے بے خبر تھیں یہ حکم نامہ پہنچا تو شش درہ گئیں۔ اور برا فروختہ ہو کے بولیں "آمین! محمد صالح کی بھی اتنی مجال ہوئی کہ موامیر میری مرضی کے خلاف کسین درخواست دے اور یہ قاضی مواد یوں تو نہیں ہو گیا ہے؟ نور جان اور محمد صالح دونوں میرے نوکر ہیں اور میں ان کی مالک ہوں۔ جو چاہوں گی کر دوں گی۔ مونا ہی کاٹنا قاضی بیچ میں دخل دیتے والا کون؟" یہ کہہ کے وہ حکم نامہ ہاتھ سے پھینک دیا۔ اور پروا بھی نہ کی خواہر سراؤں نے جیسے ہی واپس آ کے یہ حال بیان کیا قاضی صاحب نے بے تحاشا غل بجایا "دین محمد! مسلمان دین اسلام کی مدد کو دوڑا اور میرا سا دوا" اب کیا تھا؟ جس نے نساہنے اور جان دینے پر تیار ہو گیا۔ اُس وقت گرد و پیش بواہر علی خان کی فوج کے لوگ تھے جو کمانی درویشان پہنچے تھے۔ اُنھوں نے درویشان اُتار اُتار کے پھینک دیں۔ اور سفید کپڑے پہن کے موجود ہو گئے۔ قاضی صاحب نے دین محمدی کا جھنڈا بلند کیا۔ اور بہت سے بے فکرے گندھن پر جھنڈا رکھ رکھ کے آگے۔ غرض ہزاروں کا غول جمع ہو گیا۔ جو "دین" "دین" کے نعرے لگاتے ہوئے بنی خاتم کے مکان کی طرف چلے۔ آخوند احمد علی اپنا دربار جو اُسے پیچھے تھے اور کچھ پیدل فوج اُن کے ساتھ تھی۔ دین دین کے نعرے سننے ہی وہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ اُن کے بہت سے بھائی بند اور شہر کے خوش باش اُن کے غول میں آئے اور وہ کوئی تین سو آدمیوں کے ساتھ قاضی صاحب کے لشکر عابدین میں آ کے شریک ہو گئے۔ آگے بڑھے تو بہت سے تماشاخی ہندو مسلمان بھی آئے۔

الغرض یہ ہزار ہا مجاہدین کا پُر شور گروہ بنی خاتم کی محاصرہ کے قریب پہنچا۔ سڑک تنگ تھی۔ اور مجمع اس قدر زیادہ تھا کہ لوگ کھٹے اور پیچھے ہٹنے لگے تھے ہتھیاروں کے لے چلنے کی گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے سب لوگ زعماء ہوں اور تلواروں کو ہاتھوں سے اوپر اُٹھا لے اور سردن کے اوپر بلند کیے ہوئے بنی خاتم کی ڈیوڑھی پر اس وقت ڈیڑھ سو سپاہی تھے جو اُن کے ملازم تھے اُنھوں نے جو ساری خدائی کواپنے اوپر زرخہ کر کے آئے دیکھا تو جا میں

لے لے کے بھاگ کھڑے ہوئے۔ میدان صاف دیکھ کے ان لوگوں نے مجلس گھر کی۔ خواجہ سرا محل کے اندر گھس گئے۔ اور نور جہان جس جگہ بیٹھی تھی وہاں پہنچ کے اُسے گود میں اٹھالیا۔ اور باہر لاکے ایک ڈولی میں بٹھا کر چڑھ باندھ دیا۔ اور بڑی شان و شوکت سے لے کے واپس چلے۔ بنی خانم یہ تماشا دیکھتی رہ گئیں۔ اُن کے بنائے کچھ نہ بنی۔ آغا علی خان اپنے گھر میں جا کے چھپ رہے جو بنی خانم کی مجلس کے پکھوڑے تھا۔ اور نور جہان کو مجاہد بلوایوں نے لاکے خرم خواجہ سرا کے مکان میں بند کر دیا۔

اب مجمع منتشر ہو گیا۔ لوگ اپنی دینی کامیابی اور اپنے زبردست غرور پر فخر کرتے ہوئے گھردن کو گئے۔ قاضی صاحب نے اجراءِ حکم شرع کے صلے میں جو اہر علی خان کی سرکار سے بھاری دوشالہ پایا۔ اور شوہر امیدوار محمد صالح کو بچا پس روپیہ دیے گئے کہ گھر گرسستی کا سامان درست کرے۔ اور اپنی جو رو کر رکھے۔ مگر نور جہان میان کی منہ سے صورتِ قطع دیکھ کے کچھ ایسی جھنجھلائی اور ضد یائی ہوئی تھی کہ اتنی آفت بچنے پر بھی محمد صالح کو چلا چلائے کو سستی اور گالیان دیتی تھی۔ اور کسی کی کچھ پروا نہ کرتی تھی۔

تین چار روز کے بعد وہ جو اہر علی خان کے حکم کے مطابق خرم کے مکان سے نکال کے ایک دوسرے مکان میں پہنچا دی گئی جو عبیر علی خان کے اصطبل سے ملا ہوا تھا۔ اس اصطبل میں جو اہر علی خان کے گھوڑے اور سائیں رہتے تھے۔ اس وقت تک تو نور جہان میان کو اُٹھتے بیٹھتے گالیان دیتی تھی مگر اب سوچ سمجھ کے اُس نے وضع بدلی۔ اور میان کو شیشے میں اتارنا شروع کیا۔ یہ ایک ایسی محبت کرنے اور اس طرح جان فدا کرنے لگی کہ عقل کے پورے میان اُس کا دم بھرنے لگے۔ یقین آ گیا کہ یہ سچ محبہ پر مبنی ہے۔ وہ جو کشتی منظور کر لیتے۔ اور جو کام کہتی کرنے کو تیار ہو جاتے۔

نور جہان کی خوش نصیبی سے جس مکان میں وہ رکھی گئی تھی اُس کے کوٹھے پر مغرب طن ایک کھڑکی تھی۔ اور اُس کے مقابل حمام کے کوٹھے پر لکڑی کا ایک اوٹ کھڑا تھا جس کے اُدھر آغا علی خان کی نشست رہا کرتی تھی۔ آغا علی خان

اوٹ کا ایک تختہ نکال ڈالا۔ اور معمول ہو گیا کہ اُدھر اپنے کوٹھے پر نور جہان آ کے بیٹھتی۔ اُدھر اوٹ کی آڑ میں یہ بیٹھتے۔ اور دونوں میں دُور ہی دُور سے اشاروں میں باتیں ہوا کرتیں۔ اب روز کا یہی مشغلہ تھا۔ دونوں کو کھون پر جے رہتے۔ اور جب دیکھے اشارے بازیاں ہو رہی ہیں۔

ان عاشقانہ دلچسپیوں کو چند ہی روز ہوئے تھے کہ سٹون کے فوجدار میر غلام امام فیض آباد میں آئے۔ اور عنبر علی خان کے مکان کے پھاٹک کے اوپر جو چھپرے پڑا تھا اُس میں اُترے۔ اس بالا خانے کے چھپرے سے اُن دونوں مکانوں کا سامنا تھا۔ اُنھوں نے ان عاشقانہ اشارہ بازیوں کا سینہ دیکھا۔ اور منشی فیض بخش مصنف تاریخ فیض آباد سے تذکرہ کیا۔ اُنھوں نے چھوٹے ہی جواہر علیخان کو خبر کی۔ اور اُس نے اپنے سائیسوں کو بلا کے حکم دیا کہ "نور جہان جس مکان میں رہتی ہے اُس کے کوٹھے کی کھڑکی بند کروادو۔ اور دیکھتے رہو کہ پھر کبھی نہ کھلے پائے"۔

اب وہ دُور کی نظریا زیاں بھی موقوف ہوئیں۔ جن سے دونوں ہجران زدہ دونوں کی تھوڑی بہت تسلی ہو جایا کرتی تھی۔ جب روزن در بھی بند ہوئے اور ویداریا کی کوئی صورت نہ نظر آئی تو نور جہان نے احمق میان ہی سے کام لے کے دوسرا راستہ نکالا۔ ایک دن جواہر علی خان کے پاس اُس کا شوہر محمد صالح آیا۔ اور بیوی کی طرف سے پیغام دیا کہ "اُنھوں نے حضور میں عرض کیا ہے کہ میں اس مکان میں اکیلی گھٹ گھٹ کے مری جاتی ہوں۔ نہ کوئی یہاں آئے والا ہے نہ کوئی جاتے والا۔ کوئی اتنا بھی نہیں جس سے دو گھڑی باتیں کر کے دل بہلاؤں۔ لے دے کے جو کچھ ہیں میان میں وہ بھی اکثر حضور میں حاضر رہتے ہیں۔ پھر کہیے میں کیا کروں؟ اور کیوں نہ دل بہلاؤں؟ اور نہیں تو ہمتی اجازت دیجئے کہ یہاں شہر میں میری ایک جان پہچان والی ہیں وہ کبھی کبھی دُلی میں بیٹھ کے میرے پاس چلی آئیں۔ اس درخواست کو ساتھ نور جہان نے اس قدر خوشامد کر دی تھی کہ جواہر علی کا دل نرم ہو گیا۔ اور اُس نے اجازت دے دی کہ دُلی پر بیٹھ کے جو عورت آئے نہ رو کی جائے۔ اور اُسے آئے جانے اور رہنے کی

اجازت ہے۔ اس اجازت کے مطابق اکثر ایک ڈوٹی کی آمد رفت رہتی۔ اور جو
سبخت آتیں دو دو تین تین دن کے بجلی جاتیں اور کوئی قرض نہ کرتا۔

اسی آزادی حاصل کرنے کے بعد نور جہان نے اس بات کی کوشش شروع
کی کہ مرزا شیخا کو اپنا دوست اور طرفدار بنائے۔ اُن کے پاس جکے سے کھلا بھیجا
کہ اگر میں پھر بنی خانم کے محل میں پہنچ گئی تو وعدہ کرتی ہوں کہ تمھاری ساس
کو دوبارہ نوکر رکھوا دوں گی۔ اور اسی قدر نہیں بلکہ اُن کی تنخواہ بھی کچھ بڑھ
دوں گی نہ مرزا شیخا لالچ میں آگئے۔ اور ایک دن رات کو سب کی آنکھ بچا کے

نور جہان سے ملے۔ باہمی دوستی و اتحاد کا اقرار کیا۔ اور دونوں میں بچے دل سے
مضبوط عہد و پیمان ہوا۔ اور مرزا شیخا نے کہا ”مجھ سے جہان تک بے گاہ آپ کو
آزادی دلانے کی کوشش کروں گا“ اس عہد و پیمان کے بعد نور جہان نے
آغا علی خان کے پاس کھلا بھیجا کہ میں نے اپنے میان اور مرزا شیخا دو لون کو
ہموار کر لیا ہے۔ اب تم خانم صاحبہ سے کہو کہ میرے بلانے کی کوشش کریں۔

کامیابی کا یہ پہلو نکلتے ہی آغا علی خان نے بھی محمد صالح کو بلانے کے اس پر
پیارا پھرا۔ اسی باتیں بنائیں کہ وہ اُن کا دم بھرنے لگا۔ اور اُنھوں نے زیادہ
دل دہی گئے لیے مہیں رو پیہ مہینہ اُس کی تنخواہ بھی مقرر کر دی۔ اور اُس کے بعد
جاکے بنی خانم کو نور جہان کا پیام دیا۔

بنی خانم کے بھی دل سے لگی ہوئی تھی فوراً تیار ہو گئیں۔ اول تو انھیں
اپنے گھر کے کاروبار میں جتنا بھروسہ نور جہان پر تھا کسی پر نہ تھا۔ اُن کے کام
جیسے نور جہان سے نکلتے تھے کسی سے نہ نکلتے تھے۔ اُس کی جگہ پر جو عورت اب کام
کرتی تھی اُس سے وہ خوش نہ تھیں۔ اور بات بات پر نور جہان یاد آتی تھی
سلامت اس کے جن زبردستیوں کے ساتھ نور جہان اُن سے چھینی گئی تھی اُس میں
انھیں اپنی سبکی اور بے وقعتی نظر آتی تھی۔ اس کا خار دل میں تھا۔ اور کبھی تھیں
کہ کسی طرح ہو جو اچر علی خان سے اس کا بدلہ ضرور لون گی۔ بہر تقدیر نور جہان کا
پیام سنتے ہی تیار ہو گئیں اور اُسی وقت سوار ہو کے ہو بیگم صاحبہ کے پاس
پہنچیں۔ دو تین دن وہاں رہیں۔ چوتھے دن ہو بیگم کے سامنے یہ معاملہ چھیڑا۔

اور کہا آپ جانتی ہیں کہ محمد صالح میرا خاںزادہ اور میرے غلام کا لڑکا ہے۔ اور اُسے اس میں کچھ عذر نہیں کہ نور جہان میرے پاس رہے جس کے بغیر مجھے بڑی تکلیف ہے۔ جو کچھ فساد ہے اوپر والوں کا ہے۔" ہو بیگم نے پوچھا محمد صالح اس پر راضی ہے کہ اُس کی جو روٹھارے بیان رہے ہوں؟" بنی خانم بولیں میرے کہنے کا یقین نہ ہو حضور خود اُس سے بلا کے دریافت فرمالیں۔ بلکہ ڈیوڑھی پر حاکم سے پوچھو لیجیے۔

محمد صالح اس سازش میں پڑ کے دس بارہ دن سے جواہر علی خان کے پاس نہیں گیا تھا۔ اور بنی خانم کا طرفدار تھا۔ اس وقت ہو بیگم صاحب نے دریافت کر لیا تو اُس نے بنی خانم کے بیان کی پوری پوری تصدیق کر دی۔ اُس کا بیان سن کے ہو بیگم صاحبہ بولیں "جب اُسے نور جہان کے تھارے بیان رہتے ہیں اطمینان ہے تو پھر کون روک سکتا ہے؟ اُسے اختیار ہے جہاں چاہے لے جا کے رکھے۔" اس حکم پر بنی خانم کو اطمینان ہو گیا اور نور جہان کو اپنے ساتھ لے کے سوار ہوئے کو تھیں۔ دروازے پر گاڑی کھڑی تھی۔ جلوس کے سوار بھی در دیاں پہنے ہوئے تیار تھے کہ پانی برسے لگا۔ اور انہیں ٹھہرنا پڑا کہ میچہ گئے تو سوار ہوں۔

یہ رات کا وقت تھا۔ اور جواہر علی خان مغربین کی نماز پڑھ کے بیٹھا ہی تھا کہ ایک سائیس نے کہا "نور جہان بھاگ گئی! ہم سب سمجھے کہ جوبی بی اکثر آیا کرتی تھیں وہی ڈولی میں سوار ہو کے جا رہی ہیں۔ لیکن جب دیر تک مکان میں نہ آئی رہا تو ہمیں شک ہوا۔ جا کے پکارا اور کوئی نہ بولا۔ تب اندر جا کے دیکھا۔ اور معلوم ہوا کہ وہ ہمیں جُل دے کے نکل گئی۔" جواہر علی خان نے حکم دیا کہ "جباؤ ڈھونڈو۔" اور جہان ہوئے آؤ۔ اتنے میں مرزا شیخا آگئے۔ اور جواہر علی خان نے اُن کی طرف دیکھ کے جوش کی آواز میں کہا "حضور عالیہ بیگم صاحبہ نے خاترا کی راہ سے آل بنی کی خبر لی تھی اور اس کا اُنہیں اجازت دے گا۔ اب اُسے اختیار ہے جو چاہے کرے مگر ہم نے اُس کے حق میں اچھا ہی کیا تھا۔ یہ کہہ کے اُس نے سپاہیوں اور بابا سوسون کو بلا کے حکم دیا کہ سارے شہر میں پھرنے

پتہ لگاؤ کہ یہ عورت کہاں گئی ہے۔ صد ہا آدمی ہر طرف پھیل گئے۔ اور گلی کوچوں میں ہر جگہ ڈھونڈ رہے ہوئے لگی۔

یہ جوہی رہا تھا کہ بہو بیگم کی ڈیوڑھی کے پیرے کے سپاہیوں میں سے ایک نے ان کو جنروی کہہ کوئی آدھا گھنٹہ ہوا نور جہان محل کے اندر داخل ہوئی ہے اور غریب بنی خانم اُسے گاڑی میں ساتھ بٹھا کے اپنے گھر لے جانے والی ہیں یہ سنتے ہی خواہر علی خان کو تن بدن میں آگ لگ گئی۔ حکم دیا کہ ”خبردار جانے نہ پائے جو کچھ ہو گا میں سمجھ لوں گا۔ بنی خانم اپنے گھر میں پہنچ بھی جائیں تو بھی تم بلاتامل گاڑی میں ہاتھ ڈال دینا۔ نور جہان بیگم کے گاڑی سے نکال لینا۔ اور چاہے پانی برسے۔ بجلی گرے۔ بادل کرے جو ہو تم اُسے اسی وقت پکڑ کے میرے پاس حاضر کر دینا“

خواہر علی خان کا حکم کوئی معمولی چیز نہ تھا۔ بے قاعدہ فوج کے ہزاروں سپاہی سڑکوں پر پھیل گئے۔ اور منتظر تھے کہ بنی خانم کی گاڑی اُسے اور دھوا کر دین۔ لیکن بنی خانم کے لوگوں نے اس ناکہ بندی کی خبر اُنھیں پہنچائی۔ سنتے ہی اُنھیں بھی ہند ہو گئی۔ دل میں کہا ”اب تو میں لے ہی کے جاؤں گی“ چلتے چلتے رگ گئیں اور سارے واقعات جا کے بہو بیگم سے کہہ دیے۔ اُنھوں نے برہم ہو کے ایک خواجہ سرا کی زبانی خواہر علی خان کے پاس کہلا بھیجا ”اُنھیں کیا ہو گیا ہے جو راستہ روکتے ہو؟ اپنی اس بیہودہ ضد کو چھوڑ دو“

خواہر علی خان اس وقت اس قدر غصہ میں بھرا ہوا تھا کہ آپے سے باہر تھا۔ یہ بھی بھول گیا تھا کہ بہو بیگم میری آقا اور مالک ہیں۔ اور میں اُن کا غلام ہوں۔ بیگم صاحبہ کے پیام کا کچھ جواب نہ دیا۔ بلکہ جب محل کا خواجہ سرا لوہاں جا چکا تو اپنے سرداران فوج کو دوبارہ تاکید کی کہ ”خبردار بنی خانم جانے نہ پائیں۔ تم لوگ اُسی طرح مستعد رہو۔ میں منع بھی کروں تو تم نہ ماننا۔ بے تکلف گاڑی پکڑ لینا۔ اور کہنا ہم نہ خواہر علی خان کو جانتے ہیں نہ کسی اور کو۔ ہم تو مسلمان ہیں۔ اور ہمارا دین اسلام ہے۔ زیادہ روک کی گئی تو ہم غدر مجاہدین اور سید کی جائز منکوحہ کو اُس کے آشنا سے چھپنے کے شوہر کے حوالے کر دیں گے۔

پھر وہ جانے اور اس کا کام جانے۔ دین کا حکم ہے کہ ہم جاہل مر جائیں مگر سیدانی سید ہی کے پاس رہے گی۔

ہو بیگم صاحبہ کو جب معلوم ہوا کہ جوہر علی خان نے کچھ جواب نہیں دیا تو تردد ہوئیں کہ کیا کریں۔ کسی اور خواجہ سرا کے پاس اتنی نوج نہ تھی کہ جوہر علی خان کا وہ مقابلہ کر سکے۔ بار بار جوہر علی خان ہی کے پاس آدمی بھیجتی تھیں اور وہ کچھ جواب نہ دیتا تھا۔ غصہ میں بھرا بیٹھا تھا۔ منہ میں کف تھا۔ اور آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ آخر دیر تک کے نامرد پیام کے بعد جوہر علی خان نے قبول کیا کہ "اگر خود محمد صالح آ کے کہہ دے کہ میں نے اپنی جوڑ کو پایا۔ اور اُسے جہان چاہوں گا لے جا کے رکھوں گا تو میں نہ روؤں گا۔ اپنی خاتم نور جہان کو لے جائیں۔ لیکن بغیر اس کے نور جہان کو کوئی نہیں لے جاسکتا۔"

اس قرارداد کے مطابق محمد صالح کی تلاش شروع ہوئی۔ اُس سے لوگوں نے کہہ دیا تھا کہ "جوہر علی خان کے سامنے نہ جانا وہ تمہیں مار ہی ڈالیں گے۔" یہ سنتے ہی ایسا بدحواس بچھا گا کہ ایک ذلیل جھانچہ بجالے واسے کے تنگ و تاریک مکان میں جہان اندھیرا گھپ تھا۔ دیک کے بیٹھ رہا۔ اور ڈر کے مار سے زور سے سانس بھی نہ لیتا تھا۔ چاروں طرف لوگ اُسے ڈھونڈتے پھرتے تھے اور اُس نے ایسی چپ سادھی تھی کہ کسی طرح سراغ نہ لگتا۔ بڑی دیر کے بعد خدا خدا کر کے ملا۔ اور لوگ کھینچتے ہوئے پھاٹک پر لائے۔ یہاں پہنچتے ہی اُس نے دو ہائیان دینا شروع کیں کہ "نہ مجھے جوہر علی خان کے سامنے نہ لیجاؤ!"

آخر جوہر علی خان کی نظر قمر سے بچنے کے لیے وہ ایک ڈولی میں بٹھایا گیا جس میں پردہ باندھ دیا گیا۔ اور پردہ کی بو بونٹا کے ڈپوڑھی میں لایا گیا۔ جوہر علی خان بھی اب معمول کے موافق محل کے اندر آ چکا تھا اُس کے سامنے محمد صالح نے پردے کے اندر سے چلا کے کہا "خدا حضور کو سلامت رکھے! حضور کی مہربانی سے مجھے اپنی جوڑ ملی گئی۔ اور اب چاہتا ہوں کہ وہ بنی بیگم صاحبہ ہی کے پاس رہے وہ میری آقا اور میرے جان و مال کی مالک ہیں۔"

خوش عقیدہ مصنف تاریخ فرح بخش کا بیان ہے کہ جیسے ہی یہ کلمات محمد صالح

کی زبان سے نکلے بادل زور سے گر جا۔ بجلی کرناک کے زمین پر گری۔ جواہر علی خان کی زبان سے بے تحاشا آہ نکل گئی۔ اور جتنے لوگ کڑے تھے مہوت و شہد رہ گئے۔

اب کیا تھا باہنی خام دور جہان کو لے کے اپنے گھر ہو چکے۔ اپنی کامیابی پر خوشیاں منانے لگے۔ نور جہان کے بیان لکھی کے چراغ جل گئے۔ اور آغا علی خان کی آرزو برآئی۔ اب نہ کہن قاضی صاحب کے فتوے اور شرعی فیصلے کا پتہ تھا نہ وہ دین محمدی کا جھنڈا بلند تھا۔ اور نہ فیض آباد میں وہ ”دین دین“ کے نعشے بلند ہو رہے تھے۔ لیکن ہاں اس واقعے کے طغیل میں بارہوی صدمی بھری کے آخر کی ایک شرعی عدالت کی وضع۔ حالت۔ شان اور حکومت نظر آ گئی۔

چچیک کا ٹیکا اور لیڈی مانگو

کتنی بڑی حیرت کی بات ہے کہ چچیک کا ٹیکا جو آج دنیا میں خدا کی ایک بڑی بھاری برکت ہے اور جس کے رواج دینے پر یورپ جس قدر فخر و ناز کرے بجا ہے دراصل ایک مشرقی علاج ہے۔ اور غالباً مسلمانوں ہی سے لیا گیا ہے۔ ہم ہندوستان میں دیکھتے ہیں کہ کامیابی کے اتنے تجربوں کے بعد بھی اب تک یہ حال ہے کہ ٹیکا لگائے جانے کے خوف سے مائیں بچوں کو چھپاتی پھرتی ہیں۔ پرائے مذاق کے باپ بھائی ننھے بچوں کے لیے ٹیکا لگانے والوں سے گشتیان لڑنے یا انھیں رشوتیں دینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ بڑے بڑے مہذب لوگوں تک کا یہ حال ہے کہ دفعہ الموتی کے لیے جھوٹ فقرے بناتے ہیں اور بہت سے ملکی حکیم اور وید بھی باوجود عقل رکھنے کے اپنی طرف سے تصنیف کر کر کے نیچے کے رواج دینے پر مختلف اور طح طرح کے اعتراضات کرتے ہیں۔ اور یہ نہیں پسند کرتے کہ اس لاکھوں دنوں کے آزمائے ہوئے علاج سے فائدہ اٹھایا جائے۔ ان کی اس نفرت و مخالفت کو دیکھ کے جب ہم اس کا خیال کرتے ہیں کہ یہ طریقہ علاج انھیں کے بیان سے سیکھا گیا ہے تو بڑی حیرت معلوم ہوتی ہے۔ اور تعجب آتا ہے کہ اپنی ہی چیز اگر غیروں کے ہاتھ سے ملے تو وہ کس قدر جھبی

اور مصیب بن جانی ہے ؟

ٹیکے کو سب سے پہلے انگلستان کی ایک تعلیم یافتہ شریف زادی اور مہذبہ وانا خاتون نے رواج دیا جس کا نام لیڈی ماننگو میری ورٹلی تھا۔ وہ ۱۱۹۱ھ محمدی (۱۷۷۹ء) میں انگلستان کے علاقہ 'نورنگھم' شاعر میں پیدا ہوئی تھی۔ اعلیٰ درجے کے امیر اور شریف گھرانے کی بیٹی تھی اس لیے اچھی صحبت میں نشوونما ہوا۔ اُس کا باپ ڈیوک آف گلسٹن روشن خیال اُمراء انگلستان میں تھا جس نے بیٹی کو اچھی سے اچھی تعلیم دلائی۔ اور بیٹی کو بھی علم و فضل کا ایسا شوق تھا کہ لاطینی زبان میں بہت اچھا درخور حاصل کر لیا اور بڑی نمایاں ترقی کی۔

بائیس برس کے سن کو پہونچی تو انگلستان کے ایک نامی گھرانے کے اقبالند نوجوان ایڈورڈ ورٹلی ماننگو کے ساتھ شادی ہو گئی جو پہلے اول آف سینڈ وچ کا فرزند تھا۔ مسٹر ماننگو نے پارلیمنٹ میں جھکنا اور نوادہ حاصل کرنا شروع کیا۔ چند ہی روز میں وہ بڑا قابل آزاد اور روشن خیال ممبر ثابت ہوا۔ مشہور شاعر ایڈلین سے اُس سے بڑی دوستی تھی۔ اور انگلستان کے اعلیٰ درجے کے مدبران سلطنت میں شمار کیا جاتا تھا۔

۱۱۹۵ھ محمدی (۱۷۸۲ء) میں مسٹر ماننگو قسطنطنیہ کے سفیر مقرر ہو کے دولت عثمانیہ کے دارالسلطنت کو روانہ ہوئے اور لیڈی میری ماننگو نے بھی جن کی عمر اب ۲۶ برس کی تھی پیارے شوہر کے ساتھ استنبول کی راہ لی۔ جہاں دونوں میان بوی کو دو سال تک رہنا پڑا۔

قسطنطنیہ میں انگلستان کے بہت سے سفیر اس سے پہلے بھی آچکے ہوں گے مگر مسٹر ماننگو نے محض اپنی بی بی کی قابلیت سے جو ناموری و شہرت حاصل کی اس سے پہلے کسی کو نہیں نصیب ہوئی تھی۔ لیڈی میری بیان ترکی اُمراء کے خاندانوں سے ملین اُن کے حالات دریافت کیے۔ اور جو کچھ واقعات معلوم ہوئے انہیں لکھ لکھ کے لندن میں اپنے دوستوں کو بھیجا کرتیں۔ یہ خطوط اس قدر چسپ تھے کہ لوگوں نے شوق اور قدر سے جمع کیے۔ اور ہر طرف لوگوں میں اُن کے

پڑھنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔

قیام قسطنطنیہ کے زمانے ہی میں لیڈی میری مانگلو کو تہ لگا کہ یہاں کے بعض حکام و افسران میں جینک کے رد کرنے کے لیے بعض مامورین اپنے بچوں کے ٹیکا لگایا کرتی ہیں۔ اس نے اور عجیب علاج کو اُنھوں نے اُن کا کون میں جا کے دریافت کیا۔ جو عورتیں اُس کا طریقہ جانتی تھیں اُن سے مل کے کیفیت معلوم کی۔ اُن لڑکوں کو دیکھا جن کے ٹیکا لگایا تھا۔ خوب اچھی طرح آزمائش کے بعد خود اپنے فرزند کے ٹیکا لگایا۔ اور دیکھا کہ وہ چمک سے بالکل محفوظ رہا۔ تب اُنھوں نے آزمائش کے لیے اور بہت سے لڑکوں کے ٹیکا لگایا۔ اور پھر اُسے عام لوگوں میں پھیلانے لگیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مشرقی یورپ میں اُن کی کوشش سے ٹیکے کا رواج ہو گیا۔ اور لوگ اس خطی علاج کی قدر کرنے لگے۔

سلسلہ محمدی (سلسلہ ۶) میں لیڈی میری اپنے خواہر کے ساتھ انگلستان واپس آئیں۔ اور مقام ٹوئی نسٹ میں بود و باش اختیار کی۔ اب یہاں اُن سے انگریزی کے مشہور شاعر پوپ سے بہت راہ و رسم ہو گیا تھا۔ اور گو کہ وہ اپنے دلچسپی کے اوقات پوپ کی صحبت میں بسر کرتی تھیں مگر یہاں بھی اُنھیں شب و روز ٹیکے کے رواج دینے ہی کی فکر رہا کرتی تھی۔

اس کے بعد خدا جانے کیا بات ہوئی کہ پوپ سے بگڑ گئی۔ اور پوپ نے باوجود ایک بلند خیال اور عالی و ماخ شاعر ہونے کے جذبے میں آ کے لیڈی میری کی بھومین چند شعر کہ ڈالے جن میں اُن کے اخلاق پر حملہ کیا۔ اور چاہا کہ لیڈی میری کی سلسلہ نامور می۔ قابلیت۔ پاکیزگی خیال اور نیک نفسی کی شہرت کو خاک میں ملا دیں۔ مگر چونکہ اخلاقی جرأت نہ تھی اور پوپ کے دل میں خود ہی چور تھا اس لیے اُن اشعار کو گناہ طور پر شایع کیا۔ اگر کسی نے پوچھا بھی کہ یہ آپ کے شعر میں تو انکار کر دیا۔ لیکن ایسی باتیں کہیں چھپائے چھپی ہیں ہر جگہ شہرت ہو گئی کہ یہ شعر اصل میں پوپ ہی کے ہیں۔ مگر چونکہ بے اصل و حقیقت ہیں اس لیے وہ اپنی طرف منسوب کرتے ڈرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بجا بے اس کے کہ لیڈی میری کے نام پر کسی قسم کا حرف آئے خود پوپ کو سخت بدنامی نصیب

ہوئی۔ عام لوگوں نے اُن کی اس حرکت کو ناپسند کیا۔ اور اُنے انھیں کو ذلیل و کمینہ سمجھنے لگے۔

اب سلسلہ محمدی (۱۳۹۰ء) شروع ہوا۔ اور لیڈی میری کا برس ۴۹ سال کا تھا۔ طبیعت ناساز رہنے لگی۔ اور معلوم ہوا کہ انگلستان کی آب و ہوا موافق نہیں ہے۔ تبدیل آب و ہوا کے لیے اٹلیا کا سفر کیا۔ وہاں شہر وینس میں جا کے اقامت گزی ہوئیں۔ اور صحت برقرار رکھنے کے لیے اس طرح پاؤں توڑ کے بیٹھیں کہ ۲۲ سال وہیں گزر گئے۔ سلسلہ محمدی میں گئی تھیں اور سلسلہ محمدی (۱۳۹۱ء) میں ۵۷ برس کی بوڑھی اور واجب التعلیم خاتون بن کے پھر انگلستان میں آئیں۔ اس لیے کہ اُن کی صاحبزادی لیڈی مہوٹ نے تاکید سے بلوایا تھا۔ مگر عمر پوری ہو چکی تھی۔ تندرستی نے جواب دے دیا۔ اور وطن میں آ کے شاید پورے ایک برس بھی نہ رہی ہوں گی کہ سلسلہ محمدی (۱۳۹۲ء) میں دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ اور ناموری و نیکو کاری کے جبرط میں اپنا نام لکھوا کے دوسرے عالم باقی میں جا پہنچیں۔

مگر دنیا میں اُن کی دو نہایت ہی قابل قدر یادگارین ہمیشہ باقی رہیں گی۔ جن میں سے ایک بھی کسی کو حاصل ہو تو اُس کی ناموری و برکت کے زندہ رکھنے کو کافی ہے۔ ایک تو چیمپ کا ٹیکہ جس سے اب ساری دنیا نفع اٹھا رہی ہے۔ اور ہندوستان ہی نہیں دنیا کے ہر ملک کے گاؤں گاؤں میں لیڈی میری کی یہ یادگار اپنی برکتوں سے نزع انسان کو نفع پہنچا رہی ہے۔

اور دوسری یادگار اُن کے وہ خطوط ہیں جو انھوں نے قسطنطنیہ سے اپنے احباب کو لکھے تھے۔ انگلستان کے لوگوں میں اُن کے مطالعہ کا شوق اس قدر بڑھا کہ اُن کی وفات کے دوسرے ہی سال یعنی سلسلہ محمدی میں وہ خطوط تین جلدوں میں مرتب و مدون ہو کے چھپے اور شایع ہوئے۔ چند روز بعد لوگوں کو کچھ اور خطوط ملے۔ اور چوتھی جلد بھی مرتب ہو کے شایع ہو گئی۔ ان خطوط کی زبان ایسی دلکش اور شیریں تھی کہ بہت ہی پسند کیے گئے۔ خصوصاً اس لیے کہ ترکوں کے قومی خصائص معلوم ہونے کا یورپ میں

میں تو رشوق تھا اُسی قدر حالات سے لاعلمی تھی۔ لیڈی میری سے پہلے کسی نے ایسی تفصیل و تحقیق سے آل عثمان کے حالات نہیں بتائے تھے۔ بلکہ کہا جاتا ہے کہ ترکوں کے حالات میں جو پہلی کتاب انگلستان میں شایع ہوئی یہی تھی۔ لوگوں نے اس کتاب کے لیے اس کثرت سے شوق کے ہاتھ بھیلے کہ پہلا ایڈیشن چند ہی روز میں ختم ہو گیا۔ دوبارہ چھپی اور تھوڑے زمانے میں فروخت ہو گئی۔ غرض برابر ایڈیشن پر ایڈیشن شایع ہوتے چلے جاتے تھے بیان تک کہ سترہویں (سنہ ۱۶۷۰ء) میں یعنی لیڈی میری کی وفات کے اہم برس بعد ان کے صاحبزادے نے از سر نو درست اور مرتب کر کے اُن خطوط کی چاروں جلدوں اور اپنی مان کی دیگر قابل قدر تصانیف کا ایک نیا اعلیٰ درجے کا ایڈیشن شایع کیا۔

لیڈی میری کے صاحبزادے ایڈورڈ ورتلی مانگو کی نسبت کہتے ہیں کہ دماغ بگڑا ہوا تھا۔ امارت اور گھر کی فارغ البالی پسند نہ تھی۔ جب دل میں آتی گھر سے بھاگ کھڑے ہوتے۔ اوکسی ایسے کام کو اختیار کر لیتے جو ان کی حالت و حیثیت سے بہت ہی گرا ہوتا۔ دوسرا کمال ان میں یہ تھا کہ سچ سے نفرت تھی۔ غلط اور بے بنیاد واقعات کو اس طرح شوکت الفاظ سے بیان کر لے اور ایسے قطعیہ باندھ دیتے کہ سننے والے کو سچ کا یقین آ جاتا۔ اس میں اس قدر ملکہ بڑھا ہوا تھا کہ فی البدیہہ قصے پر قصے دل سے بٹ کے بیان کرتے چلے جاتے اور کیا مجال کہ سلسلہ ٹوٹ جائے۔ مگر بھاگنا قیامت تھا۔

پہلی بار بھاگے تو گھروالوں کو غلے سے یاس ہو گئی چند روز بعد پتہ لگا کہ آپ ایک چینی سوئی پر کے نوکر ہیں۔ انگلستان کے ہر مکان بلکہ ہر گھر میں آتش خانہ بنا ہوتا ہے۔ اُس میں سے دھواں نکلنے کے لیے جوئی دیوار کے اندر ہی اندر اوپر تک چلا جاتا ہے اُسے چینی کہتے ہیں۔ اس چینی میں دو چار مینے میں اتنا کا جل جمع ہو جاتا ہے کہ نہ نکالا جائے تو راستہ بند ہو جائے۔ اس لیے وہاں بہت سے لوگ چینی سوپری یعنی چینیوں میں سے کا جل جھاڑنے کا کام کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے کپڑوں میں چونکہ ہمیشہ کا جل بھرا رہتا ہے اس لیے

سے زیادہ میلے پکچر ہوتے ہیں۔ اور انگلستان میں جو شخص جتنا زیادہ سیلا ہو
 ی قدر زیادہ ذلیل و حقیر تصور کیا جاتا ہے۔ فرض چینی سوئی پروں سے زیادہ
 بل اُس سرزمین میں کوئی نہیں ہوتا۔ مگر آپ کو جوش خاکساری میں ہی پیش
 باب سے زیادہ پسند آیا۔

لوگوں کو معلوم ہوا تو سمجھا سمجھا کے گھر میں لے آئے۔ لیکن چند روز بعد پھر
 چکر ہو گئے۔ اب کی خبر لگی کہ ایک مچھلی داڑے کے شاگرد ہیں۔ اور اُس کے
 تھکے کشتی میں بیٹھے مچھلیاں پکڑتے ہیں۔ لوگ گھیر گھار کے پھیر لائے۔ مگر
 بڑے زمانے کے بعد پھر قیمت ہو گئے۔ اب کی شاید مان کے مطبوعہ خطوط کا
 تھا کہ قسطنطنیہ میں آگے ترکوں کی طرح رہنے لگے۔ انھیں کی وضع اختیار
 لی۔ انھیں کے سے کپڑے علانیہ پینا شروع کیے۔ انھیں کی سی ٹوپی اور
 مار سر پر تھی۔ اور چونکہ اُن کی پوری پوری معاشرت اختیار کرنی تھی اس لیے
 ناسید ہے کہ تشریف سے تو بہر کر کے مسلمان بھی ہو گئے ہوں گے۔ لہذا ہم
 کے حق میں دعا سے معفرت کر کے سلسلہ بیان کو ختم کرتے ہیں۔

لیو لو

مالاٹ سرسید۔ شیخ ضیاء الحق صاحب جن سے پبلک خوب واقف
 اور چند سال ہوئے اخبار پیشوا کے ایڈیٹر کی حیثیت سے پبلک کے
 ج پر نمایاں ہوئے تھے فی الحال انھوں نے ایک نہایت اہم اور مفید کام
 شروع کیا ہے۔ جس سے امید ہے کہ قوم کے اخلاق و تمدن ہی نہیں قومی لڑائی
 حق میں بھی نہایت سودمند ثابت ہوگا۔ انھوں نے سرسید مرحوم کے تصانیف
 ملفوظات سے وہ تمام اقوال جو ملکی و قومی اتحاد و اتفاق۔ اخلاقی تمدنی
 مائشرتی قربانی۔ علمی و ادبی و مذہبی اصول تعلیم و تربیت وغیرہ کے متعلق
 چُن کے جدا جدا مرتب کیے ہیں۔ تاکہ وہ ایک نئی ترتیب سے انبائے
 کے سامنے پیش ہوں اور اُن سے زیادہ فائدہ اُٹھایا جاسکے۔ ان میں
 وہ حصہ جس میں ہندو مسلمانوں کے اتحاد پر سرسید مرحوم کے اقوال کیجا

کر دیے گئے۔ یہی بطور ایک حتمی کتاب اور اشتہار کے جدا گانہ شایع کر دیا گیا
 ہے جس کی قیمت صرف ۲۲ روپے تھے۔ پوری کتاب کی قیمت ڈیڑھ روپیہ (میں)
 ہوگی جو زیر طبع ہے۔ درخواستیں مصنف صاحب کے پاس پہنچ جلتی چاہیے تاکہ
 انھیں کے انداز سے پہلا ایڈیشن تیار کیا جائے۔ مصنف صاحب کا پتہ "لاہور
 اندرون موری دروازہ - مقابلہ خالصہ ہائی اسکول" ہے۔

رومۃ الکبریٰ

ہمارا یہ نیا ناول بفضلہ تعالیٰ مکمل اور تیار ہو گیا۔ اس کی قیمت بجائے خود
 سو روپیہ ہے۔ مگر سنہ ۱۹۱۳ء کے خیردارانہ دنگلڈاز کی خدمت میں بلا قیمت
 نذر کیا جائے گا۔ اس پرچہ کے شایع ہونے کے بعد ہی اُنس کے وی۔ پی۔ روٹہ ہوتا
 شروع ہو جائیں گے۔ سنہ ۱۹۱۳ء کا چندہ دنگلڈاز ڈیڑھ روپیہ ہے اور محصول و منی آرڈر
 کے ۳۲ لکھ ہر وی۔ پی۔ ایک روپیہ گیارہ آنے (میں) کا ہوگا۔ جن صاحبوں کو
 لینے میں کوئی عذر ہو فوراً تحریر فرمادیں تاکہ نقصان نہ اٹھایا جائے۔ اور
 جو لین تو جہاں تک بنے دی پی کے لینے کے لیے تیار ہیں اگر کسی میں باہر جانے والے
 ہوں یا جنھیں گھر پر موجود نہ رہنے کا خیال ہو اپنے عزیزوں اور نوزکوں کو بتا
 دیں کہ وہ دنگلڈاز کے وی۔ پی۔ کو آتے ہی قبول کر لیں۔ ڈاکخانے کا طرز
 عمل ایسا ہے کہ ان کی ذرا سی بھی غفلت ہمیں اور اُن کی کو بہت پریشان
 کرتی ہے۔ اور دونوں میں سے کسی نہ کسی کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔
 خاکسار مہتمم دنگلڈاز

اطلاع

جلد خیردارانہ دنگلڈاز کی خدمت میں اتنا س ہے کہ خط و کتابت میں اپنا نمبر
 خریداری لازمی طور پر بتا دیا کریں جو ان کے پتہ کے ساتھ لکھا ہوتا ہے رجسٹرڈ نمبر ۱۳۱
 ڈاکخانہ کا نمبر ہے اس کے حوالہ کی ضرورت نہیں۔ اگر نمبر کا حوالہ نہ ہوگا تو
 ممکن ہے جواب میں تاخیر ہو یا جواب ہی نہ دیا جاسکے۔ نمبر دنگلڈاز



موجودہ وارشان دولت فراغتہ قدیم اور خدیوان مصر کے خاندان کا پہلا
بانی یہی محمد علی پاشا تھا۔ یہ نامور شخص دنیا کے اُن متنازع لوگوں میں ہے جنہوں نے
اپنی درجہ ذلت سے ترقی کرنا شروع کی۔ اور بڑھتے بڑھتے اپنے آپ کو انتہائی
درجہ کمال پر پہنچا دیا۔ انھیں لوگوں کے حالات دیکھ کے معلوم ہو سکتا ہے کہ
اگر انسان میں طلب صادق اور سچی مستعدی ہو تو اپنے لیے ترقی کی راہیں
خود ہی پیدا کر لیا کرتا ہے۔ اور کوئی دشواری اور مزاحمت اُس کو آگے بڑھنے
سے نہیں روک سکتی۔

یہ محمد علی صوبہ البانیا کے لوگوں میں سے تھا جنھیں ترک لوگ ارناؤط کہتے
ہیں۔ البانیا جزیرہ نمائے بلقان کے جنوب و مغرب میں ہے۔ سیار الملک
کوہستانی ہے۔ گویا پیچیدہ سلسلہ ہائے کوہ کی ایک نہ سلجھنے والی گتھی ہے۔
اور ویسی ہی پولٹیکل گتھی اُس کی موجودہ حالت بھی ہو رہی ہے۔ اس سنگستانی
سرزمین میں درشت مزاج جفاکش اور ایسے خیرہ سر لوگ رہتے ہیں جو بات
بات پر بگڑتے اور دل میں ٹھان لیں تو ہر مشکل کا سامنا کرنے کو تیار
ہو جاتے ہیں۔ ابھی تک تو اس سرزمین میں مسلمانوں کی تعداد عیسائیوں سے

زیادہ تھی۔ مگر آئندہ کی نسبت خدا ہی جانتا ہے کہ کون لوگ زیادہ ہوں گے۔ اس لیے کہ متعصب نھار اسے بلقان مسلمانوں کو طرح طرح سے قتل کر کے اپنی کثرت بڑھانا چاہتے ہیں۔ دولت عثمانیہ میں حمایت دین کی قوت نہیں۔ اور وہ دل پر دنیا کا نادک دل گو کہ ہر حصہ ارض کی ادنیٰ بے اعتدالی پر دیکھ جاتا ہے مگر مسلمانوں کی مظلومی پر نہیں ہسرتا۔

الفرض محمد علی اسی ملک کا ایک بہت ادنیٰ اور معمولی درجہ کا کسان تھا۔ اس کسان میں بھی اتنی حیثیت نہ تھی کہ اپنا اور اپنے خاندان کا پیٹ پال سکتا۔ اس لیے ترک وطن کر کے روسیلیا یعنی اُس صوبے میں چلا آیا جس میں خاص قسطنطنیہ واقع ہے۔ اور شہر قبائل میں ایک چھوٹی سی ادنیٰ درجے کی دکان کھول دی۔ لیکن جس طرح کسان اس کے لیے کسب معیشت کا کافی ذریعہ نہ تھی دکان داری بھی نہ ثابت ہوئی۔ مجبوراً تجارت کو بھی خیر باد کہی۔ اور ہنوز سترہ اٹھارہ سال ہی کی عمر تھی کہ دکان بند کر کے فوج میں نوکری کر لی۔ اب وہ اُس ڈھب پر پڑا جسے تقدیر نے اُس کی ترقی کا راستہ مقرر کر رکھا تھا۔ بس اسی وقت سے وہ یونانیوں سے عروج پانے لگا۔

اتفاقاً اُن دنوں کانڈیا یعنی کریٹ کے دریائی ڈاکوؤں نے سر اٹھایا تھا۔ دولت عثمانیہ نے ان جبری لوٹیروں کی سرکوبی کے لیے جو فوج بھیجی اُس میں محمد علی بھی تھا۔ وہاں بغاوت کے فرو کرنے اور سرکشوں کے ہموار کرنے میں اس سے ایسی بہادری اور جان بازی ظاہر ہوئی اور اُس نے ایسی شجاعت کے ساتھ ہوشیاری و دانائی سے کام لیا کہ اُس کے افسر بے انتہا خوش ہوئے۔ باب عالی میں اُس کے نمایان خدمات کی رپورٹ کی۔ اور سلطنت اُس کی قدردانی و قدر افزائی پر آمادہ ہو گئی۔

چنانچہ ۱۸۲۹ء (۱۲۵۶ھ) میں وہ ایک الہامی لشکر کا سردار بنا کے مصر میں بھیجا گیا تاکہ فرانسیسیوں سے جو مصر پر قبضہ کیے لیتے تھے لڑے۔ اور انگریزوں کا ساتھ دے جو مصر کو فرانس کے تصرف سے بچانا چاہتے تھے۔ گو کہ اس زمانے میں اُس کی عمر ۲۱ ہی سال کی تھی مگر اُسے بڑی نمایان کامیابی ہوئی۔ فرانسیسیوں سے لڑا۔ اٹھیں

قلمرو مصر سے مار کے نکال دیا۔ اور خود مصر میں ٹھہر گیا۔

اس مہم میں محمد علی کو سب سے زیادہ قیمتی نفع یہ ہوا کہ اگر نیر اُس کے دوست ہو گئے۔ جن کی حالت دیکھ کے اُس نے اپنی ذات اور اپنی فوج میں بہت سی اصلاحیں کیں۔ مصر میں اُس نے اہل مصر کے ساتھ بڑی ہمدردی کی۔ رعایا کو اپنا دوست بنالیا۔ اور ہر جگہ اُس کو والی مصر اور شرفائے ملک کے درمیان میں پڑے اہل وطن کی مرضی کے موافق طے کرادیا کرتا۔

پُر اس نے ملوک جن کے ہاتھ سے کئی صدی پہلے دولت عثمانیہ نے ملک مصر کو لیا تھا اب ملک موجود تھے۔ سلطنت کے ہاتھ سے نکل جانے کے باعث وہ بے پڑے تھے مگر فنانہیں ہوئے تھے۔ مصر کی پولٹیکل حالت دیکھ کے محمد علی نے اپنی ترقی و کامیابی کا ذریعہ اُنھیں لوگوں کو قرار دیا۔ اور اپنی قسمت بنانے کے لیے جو منصوبہ دل میں ٹھہرایا تھا اُس پر عمل درآمد شروع کر دیا۔

چنانچہ اب اُس نے یہ پالیسی اختیار کی کہ اپنا سارا وطن اور خاصہ ملوکوں کا اظہار اور سرگروہ بن گیا۔ اور ہر امر میں اُن کی طرفداری کر کے اُنھیں اپنا ایسا اگر ویدہ کر لیا کہ وہ اُس کے حکم پر جان دینے کو تیار ہو جاتے۔ ان دنوں سلطان کی طرف سے مصر کا گورنر جنرل خسرو پاشا تھا۔ محمد علی ملوکوں کو اُس کے خلاف ابھارتا۔ اور روزے نئے نئے فساد اُٹھ کھڑے ہوتے۔ یہاں تک کہ اہل مصر نے پوری قوت یکڑ لی۔ اور محمد علی ہی کو اپنا حاکم و فرمان و ماتمب کر لیا۔ اور جب اس کا ہنگامہ کسی طرح موقوف نہ ہوا تو مجبوراً سلطان نے سنہ ۱۲۳۵ھ

(سنہ ۱۸۱۹ء) میں محمد علی کو محمد علی پاشا ہنا کے گورنر جنرل کا ہرہ مقرر کر دیا۔ پھر اُس کی خوش انتظامی و اطاعت دیکھ کے دوسرے سال اُسے اسکندریہ کی گورنری بھی دے دی گئی۔ اور اب سارا ملک مصر اُسی چند سال پیشتر کے ادنیٰ و کذاذ و سالہ کے تابع فرمان تھا۔ باب عالی سے یہ ظاہر تو یہ ترقیان اس لیے دی گئیں کہ وہ اُن کا اہل تھا اور سلطنت کی اُس نے بڑی قابل قدر خدمتیں کی تھیں۔ لیکن دراصل اُس نے باب عالی کے تمام وزیروں اور سلطنت کے گرد و پیش والوں کو بے انتہا شیون

دے دے کے اپنے موافق بنالیا تھا۔

اس انقلاب نے ملوکوں اور اُمراء سے مصر کا حوصلہ بڑھا دیا تھا اور ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ حاکم کو بدلتا ہمارے اختیار میں ہے۔ جب چاہیں سرکشی کر کے اُسے نکال دے سکتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب محمد علی پاشا بلا شرکت غیرے حاکم ہو گیا تو اُس کی اطاعت میں بھی وہ چون و چرا کرنے لگے۔ اور ہر وقت بغاوت کا اندیشہ لگا رہتا تھا۔ سلطان کے دربار کو تو محمد علی رشوت دے کے موافق بنا سکتا تھا مگر ان لوگوں کا سیدھا کرنا بہت ہی دشوار بلکہ غیر ممکن نظر آیا۔

لیکن محمد علی پاشا نہ کمزور طبیعت کا حاکم تھا کہ دب جاتا اور نہ ایسا نرم دل اور سیدھا سادہ تھا کہ رعایا کے ہاتھ کی کٹھ پتلی بن جاتا۔ آمادہ ہو گیا کہ اُمراء سے مصر اور ملوکوں کی قوت کا باطل خاتمہ کر دے۔ پہلے اُس نے سبھا بھگا کے اور حکمت عملی سے کام لے کے اُن کے مطیع و متقاو بنانے کی بہت کوشش کی مگر مطلق کامیابی نہ ہوئی۔ آخر ستمبر ۱۸۸۲ء میں اُس نے قاہرہ کی شہر پناہ کے اندر ۱۴ ملوکوں اور سرکش امیروں کی دعوت کی۔ اور جبکہ وہ غافل اور مست بادہ عیش تھے یک بیک اُن پر شمشیر بکف سپاہی ٹوٹ پڑے اور ایک آٹا فنانا میں سب کو کاٹ کے ڈال دیا۔ ساتھ ہی اُس نے حکم دے دیا کہ جہاں کہیں کوئی ملوک یا اُن لوگوں کا طرفدار ملے بے پوچھے قتل کر ڈالا جائے۔ چنانچہ ۱۴ چوٹی کے لوگوں کے علاوہ شہر اور قصبہ میں ۱۲۰۰ معزز ملوک اور قتل ہوئے۔ دو ہی چار روز میں سرکشوں سے میدان صاف ہو گیا۔ اور ہر جگہ محمد علی پاشا کا ایسا رعب بیٹھ گیا کہ سارے ملک میں کسی کی مجال نہ تھی کہ اُس کے سامنے چون بھی کر سکے۔ لوگ اُس کے نام سے کانپتے اور اُس کی صورت سے ڈرتے تھے۔ ملک کی ساری مخالفانہ قوتیں فنا ہو گئیں اور ساحل بحر روم سے بلندی مصر تک ہر جگہ اُس کے نام کی رھا کہ بیٹھی ہوئی تھی۔

۴۱ سی اثنائیں ارض حجاز میں دبا بیون کا فتنہ اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ وسط

عرب کے علاقہ نجد کے لوگ مدت سے منبلی یا اہل حدیث تھے۔ توحید کے زبردست حامی۔ سنت نبی کے دلدادہ۔ رسوم شرک و بدعات کے سخت مخالف اور قبر پرستی کے جانی دشمن تھے۔ ان میں عبدالوہاب نام ایک شخص پیدا ہوا جس نے ان کا مقتدا بن کے سارے ملک کو اپنے زیر فرمان کر لیا۔ عبدالوہاب کے بعد جب اُس کا بیٹا محمد بن عبدالوہاب باپ کی گدی پر بیٹھا اور قوم کا مقتدا اور سرگروہ بنا تو اُس نے ان لوگوں میں حد سے زیادہ دینی جوش پیدا کر دیا اور فتویٰ دے دیا کہ جو لوگ شرک میں مبتلا ہوں اور قبر پرستی کریں گواہ اپنے آپ کو مسلمان ہی کہتے ہوں ان پر جہاد کرنا فرض ہے۔
یہ حکم سنتے ہی سارا نجد جہاد کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا اور سب نے یکایک نزعہ کر کے مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ پر قبضہ کر لیا۔ گو اس میں شک نہیں کہ ان لوگوں میں اعلیٰ درجے کی بدوی شجاعت تھی۔ مگر تمدن سے کوسوں دور تھے۔ جس کے باعث ان کے ہاتھ سے حرمین کے لوگوں پر نہایت ظلم ہوا۔ اور کہتے ہیں کہ سوار و صہ اقدس کے انھوں نے تمام قبرین کھود کے پھینک دیں۔ اس لیے کہ حدیث صحیح میں ہے کہ حضرت علی کو جناب رسول مقبول صلعم نے حکم دیا تھا کہ ”جو قبر لے آئے کھود کے زمین کے برابر کر دیں۔“
دولت عثمانیہ کو جب نظر آیا کہ وہابیوں نے حرمین پر سے آل عثمان کی حکومت ہی اٹھا دی تو محمد علی پاشا کے نام فرمان سلطانی صادر ہوا کہ فوراً جا کے وہابیوں کی سرکوبی کرے اور حرمین شریفین میں پھر ہلالی علم بلند کرے۔ محمد علی پاشا زبردست فوج لے کے ارض حجاز میں گیا۔ چھ سال خونریزیوں کے بعد وہابیوں کو حرمین سے نکال کے ارض نجد کی طرف پھر ہٹا دیا۔ اور حرمین کا بخوبی انتظام کر کے مصر میں واپس آیا۔ محمد علی پاشا کی زندگی اُلو العزیزیوں سے بھری ہوئی تھی۔ ارض حجاز کی مہم سے فرصت ہوئی تو اپنے ایک بیٹے اسمعیل پاشا کو ایک زبردست لشکر کا سالار بنا کے مملکت نوبیہ کی طرف بھیجا کہ اُسے فتح کر کے قلمرو مصر میں شامل کرے۔ اسمعیل نے اس مہم میں بڑی کامیابی حاصل کی۔ اور

علاقہات ڈنگولا - سنغار - اور برکوفان وغیرہ کو فتح کر کے اپنے زیر علم کر لیا محمد علی نے ادھر تو بیہ کو فتح کیا اور ادھر یورپ کے ابھارنے اور بڑھانے دینے سے یونانیوں نے دولت عثمانیہ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا - سلطان نے باغیوں کی سرکوبی کے لیے فوج بھیجی - اور محمد علی پاشا نے بھی ۱۶۳ جہازوں کا ایک زبردست بیڑا سوا حل یونان پر بھیجا جس کا امیر البحر اُس کا بیٹا ابراہیم پاشا تھا - اس مصری بیڑے نے یونانیوں کے ہوش پران کر دیے - جس شہر پر پہنچا اُسے تہ وبالا کر دیا - اور اُس کے سپاہیوں نے جہان خشکی پر قدم رکھا یونانیوں کو پامال ہی کر کے رہے - مسلسل تین سال تک ان مصری جہازوں نے یونان کو نہایت ہی پریشان رکھا تھا کہ دول یورپ نے دیکھا یونان کے بنائے کچھ نہیں بنتی لہذا متفقہ آواز بلند کی کہ "یونان کو آزادی دی جائے" باب عالی نے اس کی کچھ پروا نہ کی اور انگلستان فرانس اور روس کے متحدہ بیڑے یونانیوں کی مدد کو آ پہنچے - بندرگاہ فویری نوپر ۱۲۵۶ء محمدی (۱۲۵۶ء) میں دنیا کی وہ یادگار بحری لڑائی ہوئی جس میں یورپ کے متحدہ بیڑوں نے عثمانی اور مصری بیڑوں کو بالکل تباہ کر دیا - اور یہی وہ بد نصیبی کا دن تھا جس روز دولت عثمانیہ کی بحری قوت کا خاتمہ ہوا - اب یورپ کی خواہش کے مطابق صلح ہوئی - جس کی رُو سے یونان کو آزادی ملی - اور ڈنمارک کا ایک شاہزادہ وہاں کا ازغیبی تاجدار بنایا گیا -

گو کہ ترکوں کا اس لڑائی میں بڑا بھاری نقصان ہوا تھا مگر باب عالی نے اس امر کو تسلیم کر لیا کہ محمد علی پاشا کی فوج اور اُس کے بیڑے سے سلطان کو بڑی مدد ملی - اور اُس کے صلے میں ۱۲۵۹ء محمدی میں کانڈیا یعنی کریت کی گورنری بھی اُسی کو دی گئی - مگر یہ انعام و معاوضہ محمد علی پاشا کی امید سے کم تھا - اُس نے درخواست کی کہ ان خدمات کے صلے میں ملک شام بھی میرے حوالے کیا جائے - اس درخواست کو باب عالی نے قطعاً نامنظور کیا - اور محمد علی پاشا نے برا فرود خستہ ہو کے خود ہی ملک شام پر فوج کشی کر دی - سلطان کا لشکر ملک شام سے دُور اور غیر منظم حالت میں تھا - بخلاف اس کے مصر کی

سرحد شام سے ملی ہوئی تھی اور محمد علی پاشا کا لشکر خوب آراستہ اور تیار تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مصری فوج شہر دن پر شہر فتح کرتی چلی جاتی تھی اور سلطان کے بنائے کچھ نہ بنتی تھی آخر چند ہی روز میں محمد علی پاشا سارے ملک شام کا مالک ہو گیا۔ اور قسطنطنیہ کے پھر قریب آگیا اور ایشیائے کوچک میں داخل ہوا۔ محمدی مین شہر تونسہ کے نزدیک ترکون اور مصریوں میں ایک خونریز لڑائی ہوئی جس میں عساکر سلطانی ہسپا ہوئے۔ اور محمد علی پاشا جوش اور دلوے کے ساتھ خاص قسطنطنیہ پر حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھا۔

مگر یہ امر دول یورپ کی پالیسی کے خلاف تھا کہ حاکم مصر سلطان پر غالب آئے۔ اور مشرق میں ایک نئی زبردست دولت و قوت قائم ہو۔ چنانچہ سب نے درمیان میں دخل دیا۔ اور محمد علی سے کہا کہ اب خبردار آگے قدم نہ بڑھانا۔ محمد علی پاشا نے اپنے مربی و آقا کے کہنے کی تو کچھ پروا نہ کی تھی مگر یورپ والوں سے ڈرا اور صلح قبول کی۔ شہر قسطنطنیہ میں دونوں جانب کے سفیر دن نے معاہدہ صلح کی تکمیل کی جس کی رٹ سے محمد علی پاشا کو ملک شام اور علاقہ عہد نہ دے دیے گئے۔

اب ۱۲۹۵ھ محمدی (۱۸۷۸ء) آیا جبکہ محمد علی پاشا ستر برس کا بوڑھا تھا۔ اور بڑی شجاعت اور کمال ہوشیاری کے ساتھ مصر۔ سوڈان۔ شام۔ عرب۔ اور جزیرہ کرٹ پر حکومت کر رہا تھا۔ یکایک سلطان روم یعنی سلطان محمود خان ثانی نے ارادہ کیا کہ ملک شام کو محمد علی پاشا کے قبضے سے نکال لیں۔ مگر پہلی ہی لڑائی میں سلطانی لشکر کو شکست ہوئی۔ اور سلطان نے مجبوراً انگلستان اور دول یورپ سے مدد مانگی۔ یہ اجنبی دول جو غیر دن کے معاملات میں دخل دینے ہی کو اپنا ذریعہ ترقی سمجھتی تھیں فوراً مدد دینے کو تیار ہو گئیں۔ محمد علی پاشا ان کی بحری قوت سے زک اٹھا چکا تھا مگر پھر بھی پروا نہ کی اور سب سے لڑنے کو تیار ہو گیا۔ ساحل شام پر بیروت کے قریب لڑائی ہوئی۔ جس میں محمد علی پاشا کو شکست ہوئی۔ اور اسی قدر نہیں بلکہ اُسے یہ بھی نظر آیا کہ دول کے جہازوں نے اسکندریہ کا راستہ

بند کر دیا ہے۔ اپنی بے دست و پائی دیکھ کے حریف کی شرطیں قبول کرتے پر راضی ہوا اور ملک شام سے دست بردار ہو کے صرف مصر وغیرہ کا حاکم رہ گیا۔

لیکن اسی معاہدے میں اُس کی اتنی اشک ستوئی بھی کی گئی کہ وہ ملک مصر کا مستقل والی تسلیم کیا گیا۔ اور قرار پایا کہ گو وہ سلطان ہی کی جانب سے مصر کا گورنر جنرل ہو گا مگر اس ملک سے کبھی بدلانہ جائے گا۔ اور ولایت مصر ہمیشہ اُسی کی نسل میں رہے گی۔ یوں ملک مصر اُس کی اولاد کا حق بن گیا۔

اب اُس کی عمر زیادہ ہو چکی تھی۔ حوصلے اگرچہ بڑے بڑے تھے مگر جسمانی طاقت نے جو اب دے دیا۔ یہاں تک کہ ۱۷۷۳ء (۱۱۸۴ھ) میں اپنے بیٹے ابراہیم پاشا کو اپنا وارث بنا کے حکومت سے علیحدہ ہو گیا۔ اور دوسرے ہی برس ۱۷۷۳ء محمدی میں جبکہ اُس کی عمر پورے اسی برس کی ہو چکی تھی دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اُس کے جانشین ابراہیم پاشا کی عمر نے وفات کی چند ہی روز میں سفر آخرت کیا۔ اور اُس کی جگہ اُس کا بیٹا عباس پاشا والی مصر مقرر ہو کے باپ دادا کی سند حکومت پر بیٹھا۔

زندگی کے آخری دو برس میں محمد علی پاشا کے حواس بجا نہ تھے۔ بڑھاپے نے دماغ ماؤف کر دیا تھا۔ لیکن اس میں ذرا شک نہیں کہ وہ بہت ہی غیر معمولی آدمی تھا۔ اُس نے یورپ کے نظام سلطنت کو اپنی فکر و میں جا رہا کیا۔ اور مغربی اصول و آئین جنگ اختیار کر لیے تھے۔ اپنے ملک میں زراعت تجارت۔ اور صنعت و حرفت کو ترقی دی۔ جنگی اور طبی مدر سے کھولے۔ اور اہل فرانس کی قابلیت کا اس قدر معرفت تھا کہ غالباً مسلمان حکمرانوں میں پہلا وہی شخص ہے جس نے ضرورت اور مصلحت دیکھ کے اپنے دو بیٹوں کو تعلیم و تربیت کے لیے یورپ میں بھیجا۔

اُس نے اپنی زندگی خود ہی بنائی۔ اور بغیر کسی دوسرے کی مدد کے صرف اپنی کوششوں سے ہر امر میں ترقی کرتا گیا۔ بانیِ مملکت ادنیٰ ارناؤط کسان سے زبردست فرمان روا اور تاجدار بن گیا۔ تعلیم سے وہ پہلے بالکل بے بہرہ تھا۔

نیتا لیس برس کی عمر میں اپنے شوق سے لکھنا پڑھنا سیکھا اور تحصیل علم میں ایسی محنت کی کہ جاہل و کانداز سے ایک تعلیم یافتہ مدبر سلطنت ہو گیا۔ یہ امر البتہ انوس کے قابل ہے کہ وہ جو حاصل کرنے کے شوق میں اُس کے ہاتھ سے بڑے بڑے مظالم ہوئے۔ سازشوں کا بازار گرم ہوا۔ اُس نے جاہد عہدیان کیں۔ دغا باز یون سے کام لیا۔ اور بیگن ہون کے خون سے ہاتھ رنگے۔ طالبان سلطنت کے لیے یہ باتیں ہمیشہ ایک معمولی چیز ہوتی آئی ہیں۔

حسن کی کرشمہ سازیاں

اس سلسلے کو ہم نے چند روز کے لیے روک دیا تھا۔ اس لیے کہ ہمارا خیال تھا کہ ہمارے احباب ایک ہی عنوان کو بار بار پڑھتے پڑھتے اکتا گئے ہوں گے۔ اگرچہ ظاہر ہے کہ اس سلسلہ میں فقط عنوان ہی عنوان کی یکسانی تھی۔ ورنہ اصل میں ہر مرتبہ کسی نئی مشہور خاتون یا ملکہ کے حالات ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ انھیں تازگیوں اور دلچسپیوں یاد کر کے اکثر قابل احباب نے اُس سلسلے کے جاری کرنے کا تقاضا کیا۔ اور ہم ان کی خوش پوری کرنے کے لیے پھر دنیا کی اُن تاریخی عورتوں کے حالات شروع کرتے ہیں جنھوں نے اپنے حسن و جمال کی کشش اور اپنے بائکین کے اسلحہ سے کام لے کے دنیا پر کوئی خاص اثر ڈالا۔

بودیقیا اور قارطیس ماندوا

انگلستان کی تاریخ کا آغاز ان دو ملکاؤں کے کارناموں سے ہوتا ہے۔ جنھوں نے اپنی رعایا کو اپنے حسن کے دام گلوگیر میں اسیر کر کے اُن سے جو اور جیسا کام چاہے لیا۔ ان میں سے اول الذکر سبھی ملکہ بودیقیا (جس کے نام کا تلفظ انگریزی میں فی الحال بوڈیشیا کیا جاتا ہے) نہایت ہی شریفانہ طرز عمل رکھنے کے باعث دنیا میں سچی شجاعت و حمیت اور اعلیٰ درجہ کی قومی و ملکی محبت کا جوش دکھا گئی۔ اور دوسری یعنی قارطیس ماندوا جس کے نام کا تلفظ فی الحال کارٹسٹاڈ کیا جاتا ہے اپنی مذکورہ ہمت بہن کے خلاف نہایت بے حمیت و بے غیرت

اور بے عصمت و بے عفت تھی۔ جو بے وفائی و بے عصمتی کا شرمناک ترین نمونہ دکھائے اور ابدی بدنامی حاصل کر کے دنیا سے رخصت ہوئی۔ لیکن جہن یہ خیال کر کے افسوس آتا ہے کہ پہلی جو اچھی تھی وہ تو دنیا سے ناکام و نامراد گئی۔ اور دوسری اپنے ناپاک جرم کی سزا سے بچ جانا درکنار اپنے مقاصد میں کامیاب و بامراد ہوئی۔

ملکہ بوادلیقا کی سرگزشت یہ ہے کہ اُس کا شوہر پراسو طاغوس (پراسو) انگلستان کے علاقہ ایتی کا بادشاہ تھا جو علاقہ کہ اب نار فولک کے نام سے مشہور ہے۔ اُن دنوں انگلستان میں چونکہ رومیون کا اثر بڑھ رہا تھا۔ اور وہاں کی قومی قوتیں رومی اسلمہ سے مرغوب ہو ہو کر فنا ہوتی جاتی تھیں اس لیے پراسو طاغوس نے وصیت کر دی کہ میرے مرنے کے بعد میری حکومت و سلطنت کے وارث شہنشاہ روم اور میری بیٹیاں ہوں۔ اس وصیت میں اُس کی یہ مصلحت تھی کہ شہنشاہ روم تو انگلستان میں آ کے میری قلمرو پر قبضہ کرنے سے رہا۔ میری بیٹیاں ہی مالک ہوں گی۔ اور شہنشاہ کے تعلقات غمی وجہ سے وہ ہر طرح کی دشواریوں سے محفوظ اور تمام بیرونی حملوں سے مامون ہو جائیں گی۔ اور کسی پاس پڑوس والے فرمان روا یا کسی رومی سپہ سالار کی اتنی جرات نہ ہو سکے گی کہ میری قلمرو کو نگاہ اٹھا کے بھی دیکھ سکے۔

لیکن اُس کی امید کے خلاف یہ اُلٹا نتیجہ ظاہر ہوا کہ اُس کی آنکھ بند ہوئی ہی رومی سپہ سالار نے اُس کے شہر اور محل پر قبضہ کر لیا۔ رومی سپاہیوں نے سارے شہر اور محل میں ٹٹس مچا دی۔ جو ہاتھ آیا اپنا مال سمجھ کے لوٹ لے گئے۔ اور اسی قدر نہیں بوادلیقا کی ناز پروردہ شاہزادیوں کو بھی جو شریک وراثت قرار دی گئی تھیں نہایت بے رحمی کے ساتھ بے آبرو کیا۔ ملکہ بوادلیقا نے اس پر اظہارِ ناراضی کیا تو اُس غریب کو کپڑے کے سربازار خاص اُس کی رعایا کے سامنے کوڑوں سے مارا اور تحقیر و تذلیل کی کوئی بات اٹھانہ رکھی۔

رومی جب لوٹ مار کے اور ہر طرح کی بے حرمتیاں کر کے واپس گئے تو بوادلیقا نے اپنی رعایا کو رومیون کی مخالفت پر ابھارا۔ رومیون نے اس موقع پر کچھ ایسی بے رحمی اور غنا بازی سے کام لیا تھا کہ ساری رعایا طیش میں بھری ہوئی

تھی۔ اور جتنے آدمی تھے اگرچہ جانتے تھے کہ رومیوں سے مقابلہ کرنا جنوں اور اُن کے مقابل ہتھیار اٹھانا خودکشی ہے اپنی ملکہ کی صدا لے فریاد سنتے ہی لڑنے مرنے اور جان دینے کو اٹھ کھڑے ہوئے۔ بوادیقیا اُن سب کو اپنے جھنڈے کے نیچے جمع کر کے اور قومی اسلحہ سے مسلح کر کے بڑے جوش و خروش کے ساتھ مردانہ وار چلی۔ اور رومیوں کے قلعہ تمام لوگوں پر جواب کال چسٹر کے نام سے مشہور ہے دھوا کر دیا۔ رومیوں نے پوری قوت سے مقابلہ کیا۔ اپنے بیٹے ہوئے اصول جنگ کے مطابق صفیں باندھ کے بڑے۔ مگر برطانیہ والوں کے پُر جوش سیلاب کا روکنا دشوار تھا۔ ہزار کوششیں کیں کسی طرح کامیاب نہ ہوئے۔ آخر شکست کھا کے بھاگے۔ اپنی دغا بازی و بے حیاتی کے پاداش میں نہایت ہی بوسے پن کے ساتھ مارے گئے۔ اور بوادیقیانے مذکورہ رومی قلعہ پر قبضہ کر لیا۔

اس فتح نے اس برطانی ملکہ کا حوصلہ بڑھا دیا۔ فوج درست کرنا شروع کی۔ ملک کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا۔ رومیوں کی شائستگی و تہذیب کو تو اُن کے ظالمانہ و وحشیانہ حرکات سے پہلے ہی دھبہ لگ گیا تھا اب اُن کی سپہگرمی و شجاعت بھی خاک میں مل گئی۔ اور اُن کے نام کو ایسا داغ لگا جو کسی طرح مٹا نہ مٹا تھا۔ آخر زبردست رومی سپہ سالار سویطونیوس جو شمالی انگلستان کی قوتوں کی پامالی میں مصروف تھا اپنا جہاز لشکر لے آیا۔ اور بوادیقیا کو اُس کے مقابلے میں صف آرا ہونا پڑا۔ اس زبردست لشکر سے مقابلہ کرنا برطانیوں کی قوت سے باہر تھا۔ اگرچہ جان پر کھیل کے لڑے۔ اور دیر تک ملکہ کے اشاروں پر جو جو قلب فوج میں موجود تھی اور تلوار کو حرکت دے دے کے اُنھیں حوصلہ دلایا ہی تھی وہ بڑھ بڑھ کے اپنے سر کٹواتے رہے۔ مگر آخر کار شکست ہوئی بدحواس و بددل ہو کے بھاگے۔ بہانہ ملکہ بوادیقیا کو بھی مجبوراً میدان چھوڑنا پڑا۔ اور اسی میدان پر اُس باحیث ملکہ کے کارناموں کا خاتمہ ہو گیا۔

اُس کے انجام کی نسبت مورخین میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ عین معرکہ کا رزار میں بہادری کے ساتھ لڑتی چھوٹی ماری گئی۔ اور بعض کا بیان ہے کہ اپنی جان

بے کے میدان سے تو نکل آئی تھی مگر ناکامی کی زندگی کو اُس کا شریف نفس نہ گوارا کر سکا۔ گھر آتے ہی زہر کھا کے اپنی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔ جو اُن دنوں رومیوں کے نزدیک نہایت ہی شریفانہ اور مبارک موت تھی۔ بوادلیا کی زندگی کا خاتمہ

سابقہ قبل محمد (س ۶) میں ہوا۔

قارطس مانڈوا دوسری بدکار انگلش ملکہ بھی قریب اسی زمانے یعنی جناب سرور کائنات علیہ السلام کی ولادت سے تقریباً پانسو برس پیشتر یا پہلے عیسوی عیسوی میں تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اصلی وارث سلطنت اور مالک تاج و سریر وہی تھی۔ اور اُس کا شوہر دینو طیس اُس کی طرف سے نیابت حکومت کر رہا تھا۔ لیکن اپنی نیک نفسی و شجاعت سے سارے ملک میں ہر دے عزیز ہو گیا تھا۔ کل فوج والے اُس کا دم بھرتے تھے۔ اور ہر سپاہی اُس کے نام پر شیدا تھا۔ مگر خرابی یہ تھی کہ میان کو رعایا کے خوش رکھنے اور ملک میں عدل و انصاف کرنے کا شوق تھا تو بادشاہ بگم بی کار ٹھانڈا کو نفس پرستی اور اپنے دل کی ہوسیں نکالنے کا۔ انھیں اپنے عیش و آرام اور شہوت پرستی کے سوا اور کسی بات کی فکر ہی نہ تھی۔ انھیں بے باکانہ شہوت رانیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ کے اسلحہ بردار دیلو قاطوس سے آنکھ لڑ گئی۔ اور دونوں ایک دوسرے کی محبت کا دم بھرنے لگے۔ دینو طیس (بادشاہ) کو یہ بات ناگوار گزرنے لگی۔ اور اس بات کی تدبیریں سوچنے لگا کہ کیونکر اپنے رقیب کو زک دے جو بستر عیش کا مالک بن کے اس کی زندگی گوروز بروز زیادہ بد مزہ کرتا جاتا تھا۔

وہ ان منسوبوں کو دل میں سوچتا ہی رہا اور بی بی نے اپنے حقوق و اقتدارات شاہی کو عمل میں لا کے اُسے بالکل چھوڑ دیا۔ اور علانیہ دیلو قاطوس کا آغوش گرم کرنے لگی۔ اُس وقت تک برطانیہ والوں نے دین مسیحی نہیں اختیار کیا تھا۔ اپنے قدیم بت پرستی کے مذہب پر تھے۔ اور اُس وقت کے آئین و رسوم کے مطابق شاید عورتوں کو اس بات کا حق حاصل ہو کہ شوہر کو جب چاہیں چھوڑ دے اور جس کسی کو پسند کریں اُس سے آشکارا طور پر تعلقات پیدا کر لیں۔ لیکن جو ہر برطانی لوگوں نے اپنی ملکہ کے اس فعل کو پسند نہیں کیا۔ پہلے اُسے سمجھایا

اور روکا اور جب اُس نے کسی طرح نہ مانا تو بغاوت کر دی۔ اور ارادہ کیا کہ قارطس مانڈوا کو تخت سے اتار کے کسی اور کو اپنا فرمان روا بنالین۔
 رعایا کو برہم وافر و ختمہ دیکھ کے ملکہ نے رومیوں سے مدد مانگی جو طرح طرح کے بہانے اور حیلے پیدا کر کے سارے جزیرے میں اپنی حکومت قائم کرتے جاتے تھے۔ اس سے بہتر اور کون موقع ہو سکتا تھا۔ فوراً رومیوں کو مار کے سیدھا کر دیا۔ اور رعایا کے بعد خود ہی سلطنت کے بھی مالک ہو گئے۔ رومیوں کی مدد سے قارطس مانڈوا کو شاید اپنے محبوب آشنا سے ملنے کی آزادی مل گئی ہو۔ مگر سلطنت پھر نہ نصیب ہوئی۔ اور رومیوں کی گرفت ایسی قوی تھی کہ اسی وقت سے اس پرانے خاندان حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ

صفدر جنگ منصور علی خان کے انتقال کے بعد ۸۲ھ (۱۵۳۷ء) میں اُن کے بیٹے نواب شجاع الدولہ مسند نشین ہوئے جن کے کچھ حالات اس مضمون کے پہلے حصے میں بیان ہو چکے ہیں۔ وہ ایک مضطرب و بیقرار طبیعت کے اُلوالعزم فرمان روا تھے لیکن برہمنی سے اُن کا عہد بڑے بڑے فتنوں اور یادگار زمانہ انقلابوں سے بھرا ہوا تھا۔ دنیا کی دوزبردست تاریخی قوموں اور قوتوں کی قسمت کا فیصلہ اُنھیں کی آنکھوں کے سامنے ہوا۔ پہلے پانی پت کی محشر انگیز لڑائی ہوئی جس میں احمد شاہ درانی۔ شجاع الدولہ اور نجیب الدولہ کے ساتھ خوانین روہیلکھنڈ کی تمام زبردست فوجیں ایک طرف تھیں اور مرہٹوں کا ٹرمی دل دوسری طرف۔ اس لڑائی نے ۸۶ھ (۱۵۶۱ء) میں ایک ہی دن کے اندر فیصلہ کر دیا کہ ہندوستان چاہے مسلمانوں کا رہے یا نہ رہے مگر مرہٹوں کا نہیں ہو سکتا۔ اُس کے بعد بکسر کا قیامت خیز میدان گرم ہوا جس میں انگریزوں کی باقاعدہ فوج ایک طرف تھی اور شجاع الدولہ کا لشکر کٹر ایک طرف۔ اس لڑائی نے جنگ پانی پت کے چار سال بعد ۹۳ھ (۱۵۶۸ء) میں چوبیس گھنٹہ کے اندر اس بات کا

تخصیہ کر دیا کہ ہندوستان اب مسلمانوں کا نہیں انگریزوں کا ہے۔
 ان بڑائیوں سے پہلے شجاع الدولہ اگرچہ لکھنؤ ہی میں رہے مگر بڑی بڑی
 مہموں پر نیکل مشغولیتوں اور فوجی اصلاحوں سے انھیں اتنی مہلت ہی نہ ملی کہ شہر کی
 ترقی و آرائش کی طرف توجہ کریں۔ انھوں نے قلعے بنوائے۔ گڑھیاں قائم کیں۔ فوجی
 سامان اور آلات جنگ کو فراہم کیا۔ اس کی فرصت نہ ملی کہ اپنے گھر کو درست اور
 اپنے شہر کو آراستہ کریں۔ بکسر کی لڑائی کے بعد عسبیا کہ ہم بیان کر چکے ہیں وہ فیض آباد
 میں جا کے اقامت گزین ہو گئے۔ اس لیے لکھنؤ ان کی تمدنی برکتوں سے محروم رہ گیا۔
 سنہ ۱۸۵۷ء (۱۲۷۵ھ) میں انھوں نے سفر آخرت کیا اور نواب آصف الدولہ
 ان کے جانشین ہوئے۔

آصف الدولہ نے سندھ حکومت پر قدم رکھتے ہی مان سے ناراض ہو کے لکھنؤ کی
 راہ لی۔ اور یہی وہ زمانہ ہے جب سے دربار اودھ کی قوت و زبان رو دانی گھٹنے اور
 لکھنؤ کی ظاہری رونق بڑھنے لگی۔ بکسر کا میدان جیتنے کے بعد انگریزوں نے دربار
 اودھ میں دخل دہی کے بہت سے حقوق حاصل کر لیے تھے۔ جن کی بنا پر یہاں فوجی
 ترقیوں کی روک ٹوک کی جاتی اور ہمیشہ غائر نظر سے اس بات کی نگرانی کی جاتی کہ
 حکومت اودھ کو پھر ایسی قوت نہ حاصل ہوئے پائے کہ اُس کی فوجیں دوبارہ
 انگریزی لشکر کے سامنے صف آرا ہو سکیں۔ تاہم شجاع الدولہ جب تک فیض آباد میں
 زندہ رہے فوجی اصلاح ہی میں مصروف رہے۔ اور رات دن اسی بات کی
 دھن دھن تھی کہ جس طرح بنے اپنی قوت کو بڑھائیں۔ چنانچہ منشی فیض بخش اپنی تاریخ
 فرح بخش میں اسی زمانے کا چشم دید حال بیان کرتے ہیں کہ ”جلدی بھرنے اور
 فیر کرنے کے اعتبار سے شجاع الدولہ کی فوج کی ہندو قوتوں کے مقابلے میں انگریزی
 فوج کی ہندو قوتیں کوئی دھت نہ رکھتی تھیں“

لیکن آصف الدولہ کا عہد شروع ہوتے ہی یہ سب باتیں تشریف لے گئیں۔
 انگریزوں نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ اپنے دخل دہی کے حقوق کو بڑھا نا
 شروع کیا۔ اور نہایت ہی دانائی سے آصف الدولہ کو اس بات پر آمادہ کو یا کہ
 فوجی اصلاح کی طرف سے بلے پر دیا ہو کے دوسرے مشاغل میں دل بہلا لیں۔

آصف الدولہ کو خود بھی فوج کا زیادہ شوق نہ تھا۔ اُنھیں ٹائے اور مرسلے اڑانے کے لیے روپیہ کی ضرورت تھی۔ جو بغیر فوج کے موقوف کیے پوری نہ ہو سکتی تھی اس لیے اُنھوں نے تھوڑی سی فوج رکھ لی۔ باقی سب کو معزول کر دیا۔ اور عیش و عشرت میں مصروف ہو گئے۔ وہ اپنے مغربی دوستوں کے اطاعت کیش دوست تھے۔ جو اُن کے اشاروں پر چلتے۔ اور اُن کے مشورے کے آگے کسی کی نہ سنتے۔

اس خلوص عقیدت کے صلے میں انگریزوں نے روہیلکھنڈ پر اُن کا قبضہ کر دیا۔ اپنی ماں بہو بیگم صاحبہ کے ستانے اور ٹوٹنے کے لیے جب اُنھوں نے انگریزوں سے مدد مانگی تو نہایت فیاضی کے ساتھ اُنھیں اخلاقی مدد دی گئی اور اُن کی طرفداری کی گئی۔ لیکن اس پر بھی اُن کے زمانے تک اُنھیں یا لکھنؤ کی رعایا کو بہت ہی کم محسوس ہو سکا کہ ہمارے نظم و نسق میں کسی بیرونی قوت کو دخل ہے۔ جس کی زیادہ توجہ یہ تھی کہ آصف الدولہ کی عام فیاضی اور عیش پرستی نے ساری رعایا کو بھی عیش پرست و عشرت طلب بنا دیا تھا۔ اور کسی کو موجودہ راحت و آرام کے آگے انجام پر غور کرنے کی ضرورت ہی نہ محسوس ہوتی تھی۔

اس عیش پرستی کا نتیجہ یہ تھا کہ ظاہری صورت میں اُن دنوں لکھنؤ کے دربار میں ایسی شان و شوکت پیدا ہو گئی جو کہیں اور کسی دربار میں نہ تھی۔ اور ایسا سالانہ عیش جمع ہو گیا تھا جو کسی جگہ نہ نظر آتا۔ اُن دنوں شہر لکھنؤ ایسی رونق پر تھا کہ ہندوستان ہی نہیں شاید دنیا کا کوئی شہر لکھنؤ کے اوج و عروج کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ شجاع الدولہ جو روپیہ فوج اور جنگی تیاریوں میں صرف کرتے تھے اُسے آصف الدولہ نے اپنے عیش طلبی کے ذوق اور شہر کی آرائش و خوش حالی میں صرف کرنا شروع کر دیا۔ اور چند ہی روز کے اندر ساری دنیا کی دھوم و حام اپنے یہاں جمع کر لی۔ اُن کا حوصلہ بس یہی تھا کہ نظام حیدر آباد و ہون یا شیو سلطان کسی دربار کا کروڑا در کسی کی شوکت و حشمت میرے دربار سے زیادہ نہ ہو سکے۔

اپنے بیٹے وزیر علی خان کی شادی میں اُنھوں نے ایسا حوصلہ دکھایا کہ برات کا ترنگ و احتشام تاریخ ارض کے تمام تکلفات سے بڑھ گیا۔ برات کے جلوس میں بارہ سو ہاتھی تھے۔ دولہا جو شاہی خلعت پہنے تھا اُس میں بیس لاکھ کے جواہرات

ٹنگے ہوئے تھے۔ محفل طرب کے لیے دو عظیم الشان اور پُر تکلف خیمے بنوائے گئے جن میں ہر ایک ۶۰ فٹ چوڑا ۱۲۰ فٹ لمبا اور ۶۰ فٹ بلند تھا۔ اور ایسا عمدہ نفیس اور قیمتی کپڑا لگایا گیا تھا کہ اُن دونوں کی تیاری میں سلطنت کے دس لاکھ روپیہ صرف ہو گئے۔

انھوں نے دریا کنارے چھٹی بھون کے مغرب طرف دولت خانہ - رومی دروازہ اور اپنا کیتا سے روزگار امام باڑہ تعمیر کرایا۔ سلسلہ محمدی (سلسلہ ۶) میں اودھ میں قحط پڑ گیا تھا۔ اور شرفائے شہر تک فاقہ کشی میں مبتلا تھے۔ اس نازک موقع پر رعایا کی دستگیری کے لیے امام باڑے کی عمارت چھڑ دی گئی۔ چونکہ شریف لوگ دن کو مزدوری کرنے میں اپنی بے عزتی خیال کرتے تھے اس لیے تعمیر کا کام دن کی طرح رات کو بھی جاری رہتا۔ اور غریب و فاقہ کش شرفائے شہر رات کے اندھیرے میں آکے مزدور دن میں شریک ہو جاتے۔ اور شعلوں کی روشنی میں کام کرتے۔ اس عمارت کو ثواب نے جیسے خلوص عقیدت اور جوش دینداری سے بنوایا تھا ویسے ہی خالص اور سچے دلی جوش سے لوگوں نے تعمیر بھی کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایسی نفیس اور شاندار عمارت بن کے تیار ہو گئی جو اپنی نوعیت میں بے مثل اور نادرد و زگار ہے۔ اُس کا نقشہ بنانے کے لیے بڑے بڑے مشہور مہندس اور معمار بلائے گئے۔ اور سب نے کوشش کی ہمارا نقشہ دوسروں کے مجوزہ نقشوں سے بڑھ جائے۔ مگر کفایت اللہ نام ایک بے مثل زمانہ معمار کا نقشہ پسند کیا گیا۔ اور اُسی کے مطابق عمارت بننا شروع ہو گئی جو ۱۶۷ فٹ لمبی اور ۵۲ فٹ چوڑی ہے۔ اینٹ اور نہایت اعلیٰ درجے کے چوٹے سے یہ عمارت بنائی گئی جس میں فرش سے چھت تک لکڑی کا کین نام نہیں ہے۔ اس عمارت کو شاہان مغلیہ کی سنگین عمارتوں سے کسی قسم کا تعلق نہیں ہے۔ لکھنؤ میں اُس کثرت سے سنگ مرمر و ستیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن امام باڑے اور آصف الدولہ کی دوسری عمارتوں کو دیکھیے تو ایک نئی خوشنوائی اور نرالی عظمت و شان رکھتی ہیں۔ امام باڑے کی لداؤ کی چھت جو کڑا دے کے بنائی گئی ہے اتنی بڑی ہے کہ اتنی بڑی لداؤ کی چھت ساری دنیا میں کہیں نہیں ہے۔ اور اسی وجہ سے یہ بھی دنیا کی عجوبہ روزگار کار ریکرڈوں میں شمار کی جاتی ہے۔

آصف الدولہ کی عمارتوں پر یورپ کی عمارتوں کا ذرا بھی اثر نہ تھا۔ وہ اپنی نوعیت میں خالص ایشیائی ہیں جن میں نمایاں ترین اصلی و حقیقی شان و شوکت پائی جاتی ہے۔ نواب آصف الدولہ کے بعد ان کی یہ عمارتیں کس میسر میں پڑی رہیں۔ غدر کے بعد انگریزوں نے ان پر قبضہ کر کے گرد و پیش کے مکانات کو منہدم کر دیا۔ اور سو اس جانب کے جدھر دریا ہے باقی تینوں طرف میدان کر کے امام باڑہ کو قلعہ اور رد می دروازے کو اس کا پھاٹک بنالیا۔ اس زمانے میں اس امام باڑے کے اندر گورے رہتے تھے۔ اس کے بڑے ہال میں سلج خانہ تھا۔ اور اس فرش پر بڑی بڑی توپیں دوڑتی پھرتی تھیں۔ مگر کبھی نہ زمین کھدی نہ درو دیوار کی کوئی چپ اٹھڑی۔ اب سرکار انگریزی نے امام باڑے کو چھوڑ کے پھر مسلمانوں کے حوالے کر دیا ہے۔ اس کی مسجد میں ایک مجتہد صاحب نماز پڑھاتے ہیں۔ اور امام باڑے میں تعزیر داری ہوتی ہے۔

نواب آصف الدولہ کی عمارتوں کی مضبوطی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ انھیں تعمیر ہوئے اگرچہ سو اسو برس سے زیادہ مدت گزر گئی مگر آج تک اسی عظمت و شکوہ اور اسی مضبوطی و پائیداری سے اپنی جگہ پر قائم ہیں۔ نہ کوئی اینٹ اپنے مقام سے ہٹی ہے اور نہ کسی جگہ چولنے نے اینٹوں کو چھوڑا ہے۔ بہ خلا ان کے دیگر شاہان اودھ نے کھڑ وڑوں روپیہ صرف کر کے جو عمارتیں بعد کو بنوائیں وہ قومی و ملکی وضع داری کے مفقود ہو جانے کے علاوہ نہایت کمزور ہیں۔ اور اگر وقتاً فوقتاً مرمت نہ ہوتی رہتی تو آج تک کب کی منہدم ہو چکی ہوتیں۔ آصف الدولہ امام باڑے اور بھی بھون کے متصل اپنے محل دولت خانے میں رہتے تھے۔ شہر کے باہر اور دریا پار ہجوم خلافت سے دور اور دنیوی جھگڑوں سے الگ رہ کے معروف عیش ہونے کے لیے بیابا پور کا محل بنوایا۔ اکثر جب وہ سیر و شکار کے لیے جاتے تو اسی مکان میں قیام کرتے۔ اسی طرح چنٹ میں ایک پرنس و نر بہت بخش مکان۔ اور چار باغ اور عیش باغ میں کوشکین بنوائیں۔ اور اسی زمانے میں کبھی گنج میں اور اس کے متصل امپبل بنے۔ پھر محلہ وزیر گنج قائم ہوا جو آصف الدولہ کے بیٹے وزیر علی خان کی قیام گاہ ہونے کے باعث انھیں کی طرف

منسوب اور انھیں کی یادگار رہے۔

اب لکھنؤ میں حاکم اور فرمان روا کے مستقل طور پر سکونت پذیر ہو جانے کی وجہ سے عام خلقت کا رُخ لکھنؤ کی طرف پھر گیا۔ جو لوگ شجاع الدولہ کے زمانے میں فیض آباد میں بس گئے تھے انھوں نے فیض آباد کو چھوڑ چھوڑ کے لکھنؤ میں آ آ کے بسنا شروع کیا۔ دوسری طرف دہلی کے لوگ اپنے وطن کو خراباد کہہ کہہ کے سیدھے لکھنؤ میں آتے تھے اور پھر واپس جانا نہ نصیب ہوتا تھا۔ خلقت کے اس ہجوم نے نئے محلہ آباد کرنا شروع کر دیے۔ اس لیے کہ باہر کے آنے والوں میں سے جسے جہاں جگہ مل جاتی آباد ہو جاتا۔ اور سیکڑوں نے محلے آباد ہوتے چلے جاتے۔

چنانچہ آمانی گنج - فتح گنج - رکاب گنج - نخاس - دولت گنج - بیگم گنج - نواب گنج خانسانمان کا احاطہ (جسے نواب آصف الدولہ کے ایک خانگی داروغہ نے آباد کیا اور افتتاح کی تقریب میں خود انھیں بلایا) ٹکلیٹ گنج - ٹکلیٹ رائے کا باراد (جو وزیر اعظم مہاراجہ ٹکلیٹ رائے کی جانب منسوب ہیں) ترمی گنج - ٹکلیٹ - یا ٹکلی - حسین الدین خان کی چھاؤنی - حسن گنج - باولی - بھوانی گنج - بالک گنج - کشمیری محلہ - صورت سنگہ کا حاطہ - نواز گنج - تحسین گنج - خدا گنج - ٹکریا (جس کی نواب آصف الدولہ کی ماں ہو بیگم صاحبہ نے اسی دن بنیاد ڈالی جس دن دریا پار انھوں نے علی گنج کی بنیاد رکھی تھی) - غنبر گنج - محبوب گنج - توپ دروازہ - خیالی گنج - جھاؤ لال بازار - جھاؤ لال کاپل (ان دونوں محلوں کے بانی راجہ جھاؤ لال سلطنت اور کے وزیر خزانہ تھے) یہ سب وہ محلہ ہیں جو عہد آصفی میں بسے اور تعمیر ہوئے۔ اور انھیں دونوں دریا کے پار حسن رضا خان نے حسن گنج بسایا۔

نواب آصف الدولہ کی فیاضیوں کی عام و خاص میں شہرت تھی۔ اور دور دور کے شہروں میں ان کی داد و دہش کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ لوگ اُٹھتے بیٹھتے محبت و عزت کے ساتھ ان کا نام لیتے۔ اور ان کے تمام ذاتی عیوب فیاضی کے دامن میں چھپ کے نظروں سے غائب ہو گئے تھے۔ اور عوام کو نواب کی صورت میں ایک عیش پرست فرمان روا نہیں بلکہ ایک بے نفس اور درویش صفت ولی نظر آتا۔ ہندوؤں کا ندر تک صبح کو آنکھ کھلتے ہی جوش عقیدت سے کہتے

”یا آصف الدولہ ولی!“

اُسی زمانے میں جنرل کلاو مارٹن نام ایک بہت بڑا دولت مند فرانسیسی تاجر لکھنؤ میں آ کے رہ پڑا تھا۔ اُس نے ایک نہایت ہی عالیشان کوٹھی کا نقشہ بنا کے نواب آصف الدولہ کے ملاحظہ میں پیش کیا۔ نواب نے اُسے اس قدر پسند کیا کہ اُس کی قیمت میں دس لاکھ انٹرفیان دینے کو تیار ہو گئے۔ بیع کا معاہدہ تکمیل کو نہیں پہنچنے پایا تھا کہ نواب آصف الدولہ نے سفر آخرت کیا۔ اور عمارت ہنوز تکمیل کو نہیں پہنچی تھی کہ خود مسیو مارٹن دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اُنھوں نے چونکہ دولت بے پایاں چھوڑی تھی اور وارث کوئی نہ تھا اس لیے مرتے وقت وصیت کر دی کہ میری لاش اسی کوٹھی کے اندر دفن کی جائے تاکہ میرے بعد اُسے حکمرانانِ اودھ ضبط نہ کر سکیں۔ اس عمارت کا نام اُنھوں نے کاسٹلین شیا (قسطینیا) قرار دیا۔ تھا۔ مگر عوام میں وہ آج کل ”مارکین صاحب کی کوٹھی“ مشہور ہے۔ اور دیکھنے کے قابل ہے۔ مرنے کے بعد وہ اسی کوٹھی میں دفن ہوئے۔ اور وہ مدرسہ آج تک جاری ہے جس سے بہت سے طلبہ کو کھانا اور کپڑا ملتا ہے۔ مگر سنتے ہیں کہ مارٹن صاحب نے اس اسکول اور اُس کے وظائف کو کسی مذہب اور قوم کے ساتھ مخصوص نہیں کیا تھا۔ بلکہ وصیت کی تھی کہ عیسائی ہندو مسلمان سب ہی یکساں طور پر اس سے فیض یاب ہو سکتے ہیں لیکن اب یہ مدرسہ صرف یوروپین بچوں کے لیے مخصوص ہے۔ کسی ہندوستانی کو وظیفہ نہ ملنا رکنا اُس کی تعلیم میں بھی شریک نہیں کیا جاتا۔ شاید یہ اس وجہ سے ہو کہ غدر کے زمانے میں جاہل و پرجوش بلوایوں نے قبر کھود کے مسٹر مارٹن کی ہڈیاں نکال لیں۔ اور اُنھیں ادھر ادھر پھینک دیا۔ اگر نزدیکی کو بعد تسلط اتفاقاً ایک ہڈی مل گئی تھی جو پھر آئی جگہ خاک میں دبا دی گئی۔ لیکن اُن بلوایوں کے فعل کے ذمہ دار عام ہندوستانی نہیں ہو سکتے۔

۱۲۲۷ھ محمدی (۱۸۹۵ء) میں نواب آصف الدولہ نے سفر آخرت کیا۔ اور اُن کی جگہ نواب وزیر علیخان مسند نشین ہوئے۔ جی کی شادی کی دھوم دھام کا حال ہم بتا چکے ہیں۔ مگر چار ہی مہینے میں اُن سے ایسے بیودہ اور قابل نفرت

حرکات ظاہر ہوئے کہ اکثر لوگ اُن سے ناراض تھے۔ خود ہو بیگم صاحب اُن کے مقابل اپنے سوتیلے بیٹے یحییٰ الدولہ نواب سعادت علی خان کو زیادہ پسند کرتی تھیں۔ ادھر اس چیز کی شہرت ہوئی کہ وزیر علی خان آصف الدولہ کے بیٹے ہی نہیں ہیں۔ کیونکہ آصف الدولہ کی نسبت بہتوں کا خیال تھا کہ پیدایشی عثمان تھے۔

نواب سعادت علی خان آصف الدولہ کی مخالفت کے باعث اُن کے زمانے میں مدتوں قلمرو سے باہر اور دور رہے تھے۔ مدتوں کلکتہ میں رہے اور ایک زمانہ دراز تک بنارس میں قیام رہا۔ وزیر علی خان کی نسبت یہ خیال قائم ہونے کے بعد قلعہ انتخاب نواب سعادت علی خان پر پڑا۔ وہ بنارس سے لائے گئے اور بیابا پور کی کوٹھی میں خود گورنر جنرل باہر نے دربار فرما کے وزیر علی خان کی معزوری اور نواب سعادت علی خان کی سند نشینی کا فیصلہ کیا۔ وزیر علی خان فوراً گرفتار کر کے بنارس بھیج دیے گئے۔ جہاں اُنھوں نے طلبش میں آ کے سسٹر چری کو مار ڈالا۔ اور اس کی سزا میں گرفتار کر کے چار گڑھ بھیجے گئے۔ اور وہیں مرے۔ اُن کی مصیبتوں اور سرگردانیوں کا ایک بڑا بھاری قصہ مشہور ہے جس کا یہ مختصر مضمون تحمل نہیں ہو سکتا۔

خیالات و واقعات

ان دنوں مسلمانوں میں جو آزادانہ پولٹیکل تحریک پیدا ہوئی ہے وہ ہر جگہ کسی نہ کسی عنوان سے اپنا جلال دکھایا کرتی ہے۔ چنانچہ ندوۃ العلماء کے دارالعلوم میں طلبائے اسٹراٹگ کر دی۔ اور جو گتھی بڑی تھی کئی مہینے گزر جانے پر بھی سلجھے کو نہ آئی جس کی وجہ زیادہ تر جلسہ انتظامی ندوہ کی بے پردائی کی کارروائی۔ اور ارکان ندوہ کی باہمی رنجش تھی۔ طلبہ بہ ظاہر چاہے کچھ کمین لیکن اصل میں اس مذاق تعلیم کو پسند کرتے ہیں جس کے موجب مولانا شبلی نعمانی ہیں۔ بعض کا عام خیال یہ ہے کہ جب تک مولانا شبلی زندہ ہیں بغیر اُن کے ندوہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ ارکان ندوہ میں سے جو حضرات برسر کار ہیں اُن میں مولانا شبلی کا خیال ہے کہ چاہے ندوہ مٹ جائے مگر مولوی شبلی کو ہم نہ آنے دیں گے۔

بڑے غور اور بہت سے رد و قدح کے بعد ندوہ کے مقاصد یہ قرار دیے گئے تھے کہ اُس کا دارالعلوم دیگر عربی مدارس کی طرح عام قسم کی پُرانی تعلیم نہ دے گا بلکہ وہ ایسے زمانہ شناس اور جدید مذاق میں سموائے ہوئے علمائے اکرام کا جو جدید تعلیم یافتہ یعنی انگریزی دان گروہ کی پیشوائی کر سکیں۔ یہ خطرناک حالت دس بارہ سال سے نمایان طور پر نظر آئے لگی ہے کہ انگریزی مدارس کے پڑھنے ہوئے اپنے پیشواؤں کی گرفت سے باہر ہوتے جاتے ہیں۔ انھوں نے موجودہ علمائے کو چھوڑ کے شعر کی طرح اُن کے ہر فعل پر جیسے شریعہ کر دیے ہیں۔ بات بات پر انھیں بناتے ہیں۔ اور علمائے بھی خیال کر لیا کہ ہمارے ماننے والے صرف ادنیٰ طبقوں کے مسلمان ہیں۔ اس لیے ہمیں انھیں سے سروکار رکھنا چاہیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سنی مسلمانوں کا سربراہ آدرہ گروہ بے سرہو کے ایسا خود سر ہو گیا ہے کہ اُن میں ہی کا ہر جاہل آپ اپنا مجتہد بنا جاتا ہے۔ اسی آفت کے دور کرنے کے لیے ندوہ نے اپنے دارالعلوم کے لیے ایسا نصاب قائم کیا کہ اس دارالعلوم کے تعلیم پائے ہوئے انگریزی دان گروہ پر اپنا اثر ڈال کے انھیں اپنا پیرو بنا سکیں۔

مولانا شبلی نے اس میں شک نہیں کہ اس خیال کو پیش نظر رکھ کے نصاب میں مناسب ترین میں کہیں۔ انگریزی تعلیم کو لازمی قرار دیا۔ تاریخ و ادب اور کلام و فلسفہ اسلام کے سبجکٹوں کو بڑھایا۔ ایک جماعت ایسے مبلغین اور مشنریوں کی قائم کی جو فارغ التحصیل ہونے کے بعد دعوت اسلام کر سکیں۔ اچھے واعظ ہوں اور اچھے مناظر۔ اور غیر مذہبیوں کے اُن عملوں کو رد کہیں جو اسلام پر ہورے ہیں۔ بہت سے طلبہ ان فنون کو اختیار کر کے اپنی زندگی کے کئی سال صرف کر چکے ہیں اور اُن کی موجودہ حالت دیکھی جائے تو اقرار کرنا پڑتا ہے کہ یہ لوگ بیشک ندوہ کے مقاصد پورے کر سکیں گے۔ اور اسلام کی اچھی خدمت کریں گے۔

لیکن مولانا شبلی کی علیحدگی کے بعد اب عجیب مختلف المذاق ارکان کے ہاتھ میں ندوہ کی قسمت چلی گئی ہے۔ جن میں سے کوئی صاحبِ توجہ ہے ہیں کہ تصوف کے

روحانی اصول کی تعلیم کے لیے ندوہ افلاطون کا مدرسہ النیات یا موجودہ زمانہ کا گردِ گل بنا دیا جائے۔ بعض حضرات خالص علم حدیث کی تعلیم چاہتے ہیں بعض بزرگوں کے ذہن میں ہے کہ ندوہ کے دارالعلوم میں سے اچھے اور مستند فقیہ نکال کر ان اس کشمکش نے پُرانے نصاب میں خلل انداز ہو کے ندوہ کو اُس کے پُرانے طے شدہ مذاق سے الگ کر دیا۔ اور طلبہ میں بے قراری اور پریشانی بڑھنا شروع ہوئی۔ اور اُن سے سرکشی کے آثار ظاہر ہونے لگے۔

طلبہ کی سرکشیان دیکھ کے جدید متعلمین نے ندوہ میں سخت قسم کی شخصی سلطنت قائم کی۔ طلبہ کے حرکات کی نگرانی اور اُن کے افعال کی جاسوسی ہونے لگے۔ اُن کے خطوط ہاتھ میں جانے سے پہلے ناظم کے ہاتھ میں جانے لگے۔ ڈاک والوں کو ہدایت کی گئی کہ طلبہ کے پرائیوٹ خطوط متظہر کے ہاتھ میں دیا کریں۔ اُن کی مذہبی محفلوں کی روک تھام۔ اور انھیں کسی اور سے لکھنے پڑھنے کی مانگت کی جانے لگی اور انھیں نظر آیا کہ ہم گویا حراست میں ہیں۔ اور ہمارے ہر کام پر ناظم صاحب کا پہرہ بیٹھا ہوا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ اسٹرائک ہو گئی۔

اسٹرائک کے دور کرنے کے لیے جو انتظامی جلسہ ہوا اُس نے باوجودیکہ مسلم عقلا کا مجموعہ تھا قبل اس کے کہ طلبہ کو بلانے کے خیالات و شکایات سے محض ناظم صاحب کی رپورٹ پر ایک طرف فیصلہ کر دیا کہ جو طلبہ ناظم صاحب کے مطابق اسٹرائک کے اصلی محرک اور بانی ہیں قطعاً خارج کر دیے جائیں۔ اور سب کو چند روز کی مہلت دی جائے۔ اُس مدت میں اگر مایوس تو خیر ورنہ سب نکال دیے جائیں۔ اس فیصلہ کا رنڈو یوشن پاس ہونے کے بعد طلبہ کو ایک حکم حکم قضا شیم کی شان سے سُنا یا گیا جس کے آگے سر جھکانے سے طلبہ نے قطعی طور پر انکار کر دیا۔ آخر انتظار کے بعد طلبہ علیحدہ کر دیے گئے جنھوں نے لکھنؤ ہی میں رہ کے اپنا جدا مدرسہ جاری کیا۔ اور اپنے اُسی نصاب کی تعلیم جاری کر دی۔

طلبہ کی اسٹرائک سے پہلے ہی بعض بزرگان ملت نے ندوہ کی بد نظمیوں اور بے ضابطگیوں کو دیکھ کے ”اصلاح ندوہ“ کے نام سے ایک انجمن قائم کی۔ اور اس بات پر غور کرنا شروع کیا کہ اول تو ندوہ کے اصول و قواعد کیا اور کیسے ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ بڑے بچے قواعد ہوں ان پر کہاں تک عمل درآمد ہوتا ہے۔

مگر خرابی یہ ہے کہ ندوہ کی کارروائیوں پر اعتراض ہوتے دیکھ کے ٹرسٹیان علی گڑھ کالج کو اپنی دستار بھی مرکز نفل سے ہٹی ہوئی نظر آئی اور اپنی کرتی ہوئی حیثیت میں ہشتیان لگانے کی غرض سے وہ بھی ارکان انتظامی ندوہ کے ہم آہنگ ہو گئے ہیں کہ مقررہ ذمہ دارجاعت کے اقتدارات میں دخل دینے کا حق کسی کو نہیں حاصل ہے۔ بیشک۔ پبلک کی عام مخالفت سے سلطنتیں پلٹ سکتی ہیں برطانیہ عظمیٰ کی پارلیمنٹ ٹوٹ سکتی ہے۔ حکومتیں اپنے قوانین میں رد و بدل کر سکتی ہیں۔ مگر علیگڑھ کالج کے ٹرسٹیوں اور ندوۃ العلما کے ممبران انتظامی کے اقتدارات پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ ساری دنیا کہتی ہے کہ سکرٹری صاحب علیگڑھ کالج بدلنے کے قابل ہیں۔ مگر ٹرسٹیوں کا مجمع علی رغم ان مسلمانان ہند ان پر اطمینان کا ووٹ پاس کرتا ہے۔ مگر یاد رہے کہ یہ من ترا حاجی بگویم تو مر املا بگو، کی کارروائی زیادہ زمانے تک نہیں چل سکتی۔

ریویو

سیر پنجاب۔ سرکار آصفیہ حیدر آباد دکن کے سابق دارالامام مہاراجہ برکشن پر شاہ دیکھیں اس سلطنت بہادر نے پار سال ایک سفر کیا تھا۔ ۶ جون ۱۳۲۵ء کو گھر سے نکلے تھے اور اخیر۔ بھلی۔ دہلی۔ پردوار۔ رڑکی۔ پیران کلیہ۔ امرتسر۔ لاہور۔ کورکشتیر۔ پانی پت۔ مٹھرا۔ فتح پور۔ ہسودہ۔ آد آباد۔ جیل پور کی سیر کر کے ۱۱ اگست ۱۳۲۵ء کو واپس آ گئے۔ جہن انسوس ہے کہ لکھنؤ ایسے روشن خیال رئیس اور ایسے صوفی مشایخ کی زیارت سے محروم رہ گیا اپنے اس سفر کے حالات میں آپ نے اپنا سفرنامہ ”سیر پنجاب“ کے نام سے شائع فرمایا ہے۔ جو اچھا چھاپا ہے۔ اور ۶۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

شکل سیان سیچے

بعض حضرات
شاہو پرچہ
بانتے ہیں

وہ بعض

نیر تر شاہ

ریتیل ہو

خفا ہوتے

بن اس کے

رے کرم

اؤن میں

جو حضرات

تر شاہ پرچہ

ہے ہوں

ن فوراً

ملاح دین

انھیں

ر شاہ پرچہ

باجا یا کر

منبر

دکنہ از

مہاراجہ بہادر کا علمی و ادبی مذاق بہت اچھا ہے۔ اثنائے سفر میں اکثر مجموعہ میں آپ نے جو تقریریں کی ہیں۔ اور جا بجا طبیعت کو حاضر یا کے جو کلام موزون کیلئے دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ شاعرانہ نازک خیالیوں کے علاوہ آپ تصوف کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اور سفر نامہ بتا رہا ہے کہ آپ جہاں جاتے ہیں اتفاق و اتحاد کے پرجوش مشتری بن کے پہنچتے ہیں۔ ہندو مسلمان دونوں فریقوں کے بزرگوں اور معبدوں کا ادب کرتے اور ہر جگہ تصوف کے جذبات سے دونوں میں قدرت الہی کے جلوے دکھاتے جاتے ہیں۔ جن حضرات کو دیکھ کر عاشق ہو مہاراجہ بہادر دام اقبالہ سے طلب فرما کے ملاحظہ فرمائیں۔

سفر حج کی صوغات۔ اکثر حجاج حج سے شریاب ہو کے اپنے دوستوں کے لیے طرح طرح کی صوغاتیں لایا کرتے ہیں مگر ہمارے مکرم دوست مولانا محمد الدین صاحب ایدر صوفی (ہندو بہادر الدین خلع گجرات) گذشتہ موسم حج میں حج کعبہ اور زیارت عبات عالیات سے مشرف ہو کے مسلمانوں کے لیے اسی صوغاتیں لائے ہیں جن کے ذریعہ سب تمام مسلمانوں کو ہی جلوہ دکھاتے ہیں جو دیکھ آئے ہیں۔ خانہ کعبہ اور دیگر تبرک مقامات کی آٹھ نوٹ اور ایک دفتر رسول اور سجدہ نبوی کا نقشہ تصویریں تو بھی ہیں مگر یہ نقشہ نہایت ہی اچھی چیز ہے جس میں بتا دیا گیا ہے کہ مسجد نبوی کا رقبہ اصل میں کتنا تھا پھر اس میں حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان ذی النورین، و زید بن عبد الملک، سہمی عباسی اور سلطان عبد المجید خان نے اپنے اپنے وقتوں میں کس کس جانب اور کس کس قدر زمین کا اضافہ کیا۔ یہ نقشہ کپڑے پر چڑھا ہوا اور رنگین ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ ان ہدیوں کو مولانا محمد دوح سے منگوائے اپنے گھر میں رکھیں۔

معلومات

اس نام کا ایک علمی و ادبی کاننامہ سالہ دکنہ از پریس میں چھپ کے جناب حکیم محمد عبدالوہابی صاحب بی۔ اے کی ایڈیٹری میں جولائی ۱۹۱۳ء سے شایع ہونا شروع ہو گا۔ مضامین نہایت ہی قیمتی اور علمی ہوں گے اور امید ہے کہ ایڈیٹر صاحب کا بے مثل علمی مذاق اس سال کے ذریعہ سے اردو کی ادبی و علمی نیامین بہت کچھ اضافہ کرے گا یہ رسالہ ۲۰ پ، ۳۰ پیسے کے ۴۰ صفحات پر ہو گا۔ کاغذ عمدہ دلائی رہے گا اور چھپائی نہایت اچھی اور روشن ہوگی۔ قیمت جملہ شائقین سے پانچ روپیہ سالانہ۔ ملک کو اپنی قدر و ادنی کا ثبوت دینے کے لیے فوراً رسالہ معلومات کا خیر مقدم ادا کرنا چاہیے۔ اس کے متعلق جملہ خط و کتابت حکیم عبدالوہابی صاحب بی۔ اے۔ ایڈیٹر معلومات سے "محلہ جھولی لولہ لکھنؤ" کے پتہ پر کی جائے۔



اس عنوان کے تحت میں د لگداز کے صفحوں پر ہم دنیا کی بہت سی نامور عورتوں کے حالات لکھ چکے ہیں۔ اور ابھی صد ہا ایسی عورتیں باقی ہیں جن کے واقعات آئندہ بیان کیے جائیں گے۔ لیکن اس دلچسپ سبک پر ایک عام بحث کی بھی ضرورت ہے۔ جس کی طرف اب ہم توجہ کرتے ہیں۔ بہ لحاظ ترتیب اس بحث کو سب سے پہلے ہونا چاہیے تھا۔ لیکن مضائقہ نہیں۔ ایک ماہانہ رسالے کے صفحوں کو ایسی مصفا نہ ترتیب سے ہمیشہ آزاد رہنا چاہیے۔ سچ پوچھو تو عورت کے حسن کی کشش ہی نوع انسان کو دنیا میں لاتی ہے۔ اگر حضرت آدم جناب حوا کی باتوں میں آکے خدا کا منع کیا ہو اچھل نہ کھاتے تو غالباً دنیا انسانوں سے خالی ہوتی۔ جناب حوا کے فقرے میں آکے حضرت آدم نے جنت الفردوس اور وہان کی آزادیاں اور بفکر بیان ہاتھ سے کھوئیں۔ اور وہ اس دنیا میں پھنکے گئے جہان ان کی اولاد کو ایک سخت آزمائش میں پڑنا اور محنت مشقت کر کے اپنا پیٹ بھرنا ہے۔

جنت سے جدا ہونے کے بعد بھی اگر انسان کی حیات پر غور کیجیے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صرن اس لیے آیا ہے کہ مرتے دم تک حسن کے کرشموں میں مبتلا رہے۔

اور اسی دھن میں جان دے۔ اُس کی زندگی و موت و دونوں حسن کے کرشموں سے وابستہ ہیں جو کچھ ہوا یا ہو رہا ہے سب حسن ہی کی کرشمہ آرائیاں ہیں۔ تو والد و تاسل کا سلسلہ اور گروہ انسان کا بڑھنا اور پھیلنا فقط اُس کشش کے نتائج ہیں جو خدائے حسن میں پیدا کر دی ہے۔ اور اب تو سائنس کی تحقیق و تدقیق یہاں تک ثابت کر چکی ہے کہ انسان ہی نہیں حیوان بھی۔ اور حیوان ہی نہیں سارے نباتات بھی اپنی بقا اور ترقی میں کشش حسن ہی کے زیر بار احسان ہیں۔

یہ تو دنیوی زندگی کی حالت تھی۔ اب موت کو لیجیے۔ ہر نیکو کار و دیندار کا خیال ہے کہ دوسرے عالم میں جا کے اُس روحانی اور نورانی عالم میں حورون کی ہمنامی نصیب ہوگی۔ چنانچہ ہر پاکباز مرنے والا حورون سے ملنے کے شوق کو دل میں لیے ہوئے دنیا سے خوش خوش جاتا ہے۔ گویا دہنیں جاتا بلکہ حوران جنت کے حسن کی کشش دہان کھینچ لی جاتی ہے۔ مسیحیوں کے نزدیک حورون کے علاوہ فرشتہ بھی آسمانی کنواریاں ہیں جو مقبول بندوں اور خدا رسیدیوں اور سنٹیوں کے سروں پر کوہ قاف کی تزاہد فریب پر یوں کی طرح معشوقانہ اداؤں سے آتے اور منڈلانے لگتے ہیں۔

نسل ابراہیمؑ کی ملتوں میں تو اُس عالم نور کے معشوق کا خیال تو اب آخرت اور نیکو کاری کے اجر تک محدود ہے دوسرے قدیم ادیان و ملل پر نظر ڈالیے تو ناز افروز حسینان عالم بالانے دلربائی و دلبری کے درجے سے قدم آگے بڑھا کے معشوقی سے معبودی کی وضع و شان اختیار کر لی ہے۔ ان کے الہیات کا عنصر اعظم مہ جبین دیویاں ہیں جو قدرت کے تمام شعبوں پر مہر و حکمران ہیں۔ ان کے نزدیک خدائی اختیارات حسین دیویوں ہی میں بنے ہوئے ہیں جو پاکبازان ارض پر اپنے چاند اور سورج کے ایسے حسن عالم آشوب کی کرنیں ڈال کے اُنھیں اپنا پوجاری بناتی ہیں۔ اور حسن ہی کی کشش ہے جس سے خدا کی معبودیت اور مخلوق کی عبادت و التبتہ ہے۔

حسن کی کشش ایسی زبردست ہے کہ غور سے دیکھیے تو وہی انسان کی بنائے

اور بھاڑنے والی ہے۔ اور خدا نے واقعی اُس میں ایک ایسی قوت پیدا کر دی ہے جو انسان سے جیسے کام چاہتی ہے کرادیتی ہے۔ جنت کا چھوٹا کوئی معمولی نقصان تھا یہ اتنا بڑا گناہ تھا کہ اگر آدمی میں اپنی طبیعت پر ذرا بھی قابو نہ ہوتا تو قیامت تک عورت کے پھندے میں نہ پھنستا۔ اور پھر کبھی اُس کے دل پر حسن کی کشش کوئی اثر نہ کرتی۔ مگر نہیں۔ ایسا نہ ہوا بلکہ یوں گناہ چاہے کہ نہ ہو سکا۔ اُس کے دنیا میں آنے کے بعد بھی جو پہلا فتنہ ہوا وہ بھی عورت کی اور حسن کی کشش ہی کی بدولت تھا۔ ہابیل نے عورت کی دلفن گر گہر میں پھنس کے نہایت ہی نیک نفسی اور پورے رضا و تسلیم کے ساتھ جان دی۔ اور قابیل نے عورت ہی کے شوق میں بھائی کے خون میں ہاتھ رنگے۔ اور پہلا قتل جہد کا مجرم قرار پایا۔ اس کے بعد سے دنیا کے تمام تاریخی واقعات کی یہ زمین چھپے تو حسن و عشق کے کرشموں سے بھر ہی ہوئی ہے۔ اور یہ بات تھوڑے تعجب کی نہیں کہ مذاہب جن کی غرض وفایت خدا پرستی اور نظام عالم کی اصلاح ہے سب کی تاریخ کا آغاز عورت کی کشش اور حسن کے جھگڑوں ہی سے ہوا ہے۔ یہود و نصاریٰ اور مسلمانوں ہی کی تاریخ کو دیکھیے جس کا متحدہ دمسلمہ انقلاب آدم و حوا اور ہابیل و قابیل کے واقعات سے ہے جن کو ہم بیان کر چکے ہیں۔

ہندوؤں کی دیو مالا اپنے شروع ہی سے ہر بڑے سے بڑے دیوتا کی ایک دیوی ثابت کرتی ہے۔ اور اُن کی تاریخ کا آغاز دو عظیم الشان لڑائیوں سے ہوتا ہے جو اگرچہ پوچھے تو حسن و عشق ہی کے جھگڑے۔ اور درو پدی۔ اور سینا جی کے بے مثال حسنوں کے کرشمے تھے۔ وہ کیسی نازک اور اند دہناک گھڑی تھی جب درو پدی نہایت توہین اور سنگدلی کے ساتھ پانڈوؤں کے ہاتھ سے زبردستی چھینی گئی، اور پھر وہ کتنا بڑا قیامت خیز میدان جنگ تھا جس میں اس ایک عورت کی عصمت پر ہاتھ ڈالنے کا انتقام لاکھوں آدمیوں کے قتل سے لیا گیا، اسی لیے وہ کیسا جگر خراش وقت تھا جب کیکنی کی آتش فشان زبان نے راجہ دسرت کو رام چندرجی کے بن باس پر مجبور کیا۔ اور اس کے بعد وہ بھی کس بلا کی عالم سو ز گھڑی تھی جب رات دن

ستیا جی کو اُن کے وحشت ناک جنگلی مسکن سے اڑا لے گیا۔ اور پھر ان دونوں واقعات کے نتیجہ میں وہ کیسا خون بار محشر ستان تھا جب لاکھوں آرمیوں کے مارے جانے کے بعد رام چندر جی نے اپنی عصمت مآب رانی کو خانمان برباد و شمنوں کے پتہ ستم سے چھڑایا۔

اب مشرق کو چھوڑ کے مغرب میں چلیے تو وہاں بھی مذہب اور تاریخ کا آغاز حسن کے اُن قیامت زاکر شمنوں سے ہوتا ہے جنہیں عالم شاعری کے آدم اور یونان کے پہلے شاعر ہومر نے اپنی قدیم نظم ایلید میں بیان کیا ہے۔ اُس کے بڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیسی سنسناہیت و انی ٹھٹھی تھی جب ایشیائے کوچک کے فرمان روا پریم کا حسین و خوبرو بیٹا یارس یونان کے بڑے دیوتا جیو پٹر کی بیٹی اور من لاؤس شاہ یونان کی ملکہ بلہین کو بھگلا لے گیا۔ اور پھر اس کے بعد وہ کیسی جان ستان رزم گاہ تھی جس میں یونانیوں نے اس مملکت کے دار السلطنت ٹراسے پر چڑھائی کر کے خون کے دریا بہا دیے۔ اور جس کے واقعات بتا رہے ہیں کہ یورپ و ایشیا کے فی ماہیں جو جھگڑے شروع ہوئے وہ حسن کی کرشمہ ساز یون کے کیسے خوفناک نتائج تھے۔

دنیا کے سب سے پہلے مورخ یونان ہیروڈوٹس نے اپنی تاریخ کو اسی قسم کے واقعات سے شروع کیا ہے۔ ایشیادالون کی قدیم روایتوں سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ کبھی اُن کا خیال بھی اس جانب گیا ہو کہ اہل یورپ سے اُن سے رقابت و عداوت ہے۔ مگر اہل یونان اور ایشیائے کوچک والے جو ایک دوسرے کے پڑوس میں آباد تھے اُن میں ابتدا ہی سے چھیڑ چھاڑ شروع ہو گئی۔ اس کے چند روز بعد یونانیوں سے اُن چند دوسری قوموں سے رقابت پیدا ہوئی جو اُن کے ملک تک پہنچتی تھیں۔ ان لوگوں کی دست برد سے انھوں نے پورے ایشیا کو اپنا دشمن خیال کر لیا۔ حالانکہ ایشیادالے ان معاملات کو سوا شخصی بے اعتدالوں کے کسی عام اور قومی عداوت پر محمول نہیں کرتے تھے۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ درہ دانیال کے اس پار اور اُس پار والوں میں ایک قسم کی قومی رقابت فرو پیدا ہو گئی تھی۔

لیکن میرود و دوس کتا ہے کہ یورپ اور ایشیا والوں میں مدت ہاے دراز اور قرن ہا قرن سے جو جھگڑے چلے آتے ہیں وہ شایستہ اور تعلیم یافتہ اہل فکر کے نزدیک صرف عورتوں کے لے بھاگنے یا بھگائے جانے کے نتائج ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ سب سے پہلی چھیڑ فینقی تاجروں نے کی۔ یہ لوگ ملک شام کے ساحلی علاقہ فیفہ کے رہنے والے تھے۔ دنیا کے پہلے تاجر اور پہلے جہازران تھے۔ بحری سفروں کے ذریعے سے انھوں نے اپنی تجارت اُسی قدیم زمانے میں ممالک و درود دراز پھیلا دی۔ اور مصر و بابل کا مال لے لے کے ممالک و بلاد یورپ تک جا پہنچے۔ انھیں تاجرانہ سیاحتوں میں ان کے چند جہاز یونانی بندرگاہ ارغوس میں پہنچے اور مال تجارت اہل شہر کے سامنے پیش کیا۔ ارغوس اُن دنوں یونان کے اکثر شہروں سے زیادہ بار دلق تھا۔ اُمراء کا بر یونان آ آ کے اُن کا مال خریدنے لگے۔ اور دریا کنارے بڑا بھاری بازار لگ گیا۔ اس بازار کو لگے چار ہی پانچ روز ہوئے تھے کہ ایک دن معزز یونانی گھروں کی خاتونیں اپنی پسند کا سودا خریدنے کو آئیں۔ جن میں وہاں کے فرمان روا شاہ ایٹا جو س کی حسین و گل انداز بیٹی ایو بھی تھی۔ یہ عورتیں جہاز کے کچھ حصے کے پاس کھڑی لیں دین کر رہی تھیں کہ یکایک فنیقی سودا گردوں نے اُن پر حملہ کر دیا۔ نازک بدن عورتیں مردوں کے اس حملے کی بھلا کیا تاب لاسکتی تھیں بہ گہرا کے بھاگیں۔ اور سب تو اپنی جان بچا کے نکل آئیں مگر شاہزادی ایو اور اُس کی چند سیلیان نہ بھاگ سکیں۔ فنیقی انھیں اپنے جہاز میں پکڑ لے گئے۔ جھٹ پٹ لنگر اٹھا دیا۔ اور مصر میں پہنچ کے دم لیا۔

یونانیوں کو اس کا بڑا املال ہوا۔ ایو تو نہ ملی۔ مگر انتقام کے خیال سے اُن کے چند جہاز مرزمین شام کے ساحل شہر طارمین پہنچے جو فنیقی لوگوں کا منشا و ماویٰ تھا۔ اور ایسی تدبیریں کیں کہ وہاں کے بادشاہ کی بیٹی شاہزادی یورو پاکو بھگائے گئے۔

اس واقعے سے یونانیوں کو اپنا انتقام مل گیا تھا مگر انھیں اتنے ہی میں مصر نہ آیا۔ اُن کے چند اور جہاز بحرا سود میں (جو اُن دنوں یوحین کہلاتا تھا) سفر کر کے

داس کوہ قات کے اُس ساحل پر پہنچے جہاں فی الحال اُبا زمی مسلمان رہتے ہیں۔ یہ سرزمین اُس زمانے میں کول چس کہلاتی تھی۔ اُس میں دریائے فابس کے کنارے آیا نام ایک ساحلی شہر تھا اور وہیں یہ یونانی جہاز لنگر انداز ہوئے تھے۔ اپنی مہم کے اغراض و مقاصد پورے کرنے کے ساتھ ہی ساتھ اُنھوں نے یہاں کی خلیج میں اور جاد و نگاہ عورتوں کو دیکھا جن کے حسن و جمال کی ساری دنیا میں شہرت تھی اور جن کے حسن کے کرشموں نے کوہ قات کی پر یون کو حسن و جمال کا مکمل ترین نمونہ بنا رکھا تھا۔ غرض نہایت خاموشی کے ساتھ کوشش کر کے وہ کسی حکمت سے وہاں کے بادشاہ کی بیٹی شاہزادی میڈیا کو اپنے جہاز پر لائے۔ اور اُسی وقت لنگر اُٹھا کے اُسے زبردستی یونان میں بھگالائے۔

کو لچس کے بادشاہ کو اپنی بیٹی کے پکڑ جانے کا بڑا صدمہ ہوا۔ اور اپنے ایلچی یونان میں بھیجے جنھوں نے اُسے یونانیوں سے اس دست بُرد کا جواب طلب کیا۔ اور استدعا کی کہ شاہزادی میڈیا اُن کے حوالے کی جائے تاکہ اُسے لیجا کے اُس کے جگر چاک باپ کے سینے سے لگا دیں۔ یونانیوں نے جواب دیا: ”جس طرح ایشیاء الون نے ہماری شاہزادی ایلو کے بھگائے جانے کی کوئی وجہ نہیں بیان کی اور نہ اُسے واپس کیا اُسی طرح ہم بھی نہ شاہزادی میڈیا کو واپس کریں گے اور نہ اس کی کوئی وجہ بیان کریں گے کہ اُسے کیوں بھگالائے۔“

ایشیاء الون میں یونانیوں کی اس دست بُرد کا انتقام لینے کا خیال برابر قائم رہا یہاں تک کہ ایک نسل گزر گئی اور پریم کا بیٹا اس بات کے درپے ہوا کہ کسی یونانی شاہزادی کو بھگال کے اپنی جوڑو بنائے۔ چنانچہ موقع پانگے وہاں کو بھگالایا۔ اور اُس کے نتیجے میں ایشیاء کو چک کو شہر کے ٹڑائے کا وہ میدان گرم ہوا جس کا ذکر ہم نے کیا ہے۔

گزشتہ واقعات پر اسے زنی کرتے وقت بقول ہر دو دوس کے ایشیاء والے اور اہل فارس کہتے تھے کہ شاہزادیوں کے بھگال جانے کے واقعات اگرچہ تا بڑ توڑ دونوں طرف سے پیش آئے۔ اور ابتداء اہل ایشیاء ہی سے ہوئی تھی مگر اصلی الزام یونانیوں ہی پر ہے۔ اس لیے کہ اہل ایشیاء کے بھگال جانے پر اُنھوں نے

آپ سے باہر ہو کے لڑائی ٹھان وی۔ ایرانی ان باتوں کو اتنی اہمیت نہ دیتے تھے کہ ان کی وجہ سے لڑائی ٹھان دیں۔ اُن کے خیال میں عورتوں کو بھگا لے جانا بے شک شرارت کا کام تھا لیکن ایسا ہو جائے تو اُس کی بنا پر انتقام کے درپے ہو جانا اور قتل و خونریزی کرنا اُن کے مذاق میں ایک لغو فعل تھا اور وہ کہتے کہ عقلمندوں کا یہ کام نہیں ہے کہ ایسے واقعات کی پروا کریں۔

بہر تقدیر یورپ کی مابجھارت یعنی ٹراے کا محاصرہ اور یورپ ایشیا کی سب سے پہلی معرکہ آرائی حسن بھی کی ایک دلچسپ کوشش تھی جسے ہومر نے ہمیشہ کے لیے زندہ کر دیا ہے۔

ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری زمانہ

نواب سعادت علی خان نے سنہ ۱۲۲۰ھ (۱۸۰۵ء) میں تخت پر بیٹھے ہی آدھا ملک انگریزوں کی نذر کر دیا۔ مشہور یہ ہے کہ وہ سلطنت سے مایوس و ناامید بنارس میں پڑے ہوئے تھے کہ خبر پہنچی نواب آصف الدولہ بہادر نے سفر آخرت کیا اور سند حکومت پر وزیر علی خان بیٹھ گئے۔ یہ سنتے ہی سلطنت کی رہی سہی امیدیں بھی خاک میں مل گئیں۔ اس قطعی یاس کے عالم میں تھے کہ بنارس کے کسی یورپین حاکم نے آکے پوچھا "نواب صاحب! اگر آپ کو بودھ کی حکومت مل جائے تو انگریزی حکومت کو کیا دیکھیے گا؟" جو چیز باتھ سے جا چکی ہو انسان کے دل میں اُس کی قدر ہی کیا ہو سکتی ہے بے اختیار زبان سے نکلا "آدھا ملک انگریزوں کی نذر کر دوں گا۔" یہ وعدہ سُن کے اُس انگریز حاکم نے کہا "تو آپ خوش ہوں۔ اور میں آپ کو خوش خبری سناتا ہوں کہ آپ ہی فرمان روا سے لکھنؤ منتخب ہوئے ہیں۔" سعادت علی خان یہ فرمودہ غیر مترقبہ سُن کے خوش تو ضرور ہوئے مگر اپنے وعدے کا خیال آیا تو ایک سنائے میں آ گئے۔ اور آخر تخت نشینی کے بعد اس وعدے کے ایفا میں اُنھیں اپنی ادھی قلم و بانٹ دینا پڑی۔ جس کا کاٹا زندگی بھر اُن کے دل

میں کھٹکارہا۔

انگریزی تاریخوں میں اُن سے وعدہ لیے جانے کا ذکر تو نہیں ہے مگر اس کو سب تسلیم کر رہے ہیں کہ نواب سعادت علی خان کو چونکہ انگریزوں نے تخت پر بٹھایا تھا اس لیے اُنھوں نے اپنا اُدھالاک شکر یہ کے طور پر انگریزوں کی نذر کر دیا۔ پھر تقدیر جو کچھ ہو سعادت علی خان کی تخت نشینی کے وقت اودھ کی حکومت اُدھی رہ گئی۔ لکھنؤ کے پُرانے لوگوں میں مشہور ہے کہ اسی کو فت میں سعادت علی خان نے نہایت ہی کفایت شعارِ می سے کام لے کے اور تحصیل وصول میں بے انتہا مستعدی و بیدار مغزی ظاہر کر کے بالیس تئیس کڑ وڑ روپیہ جمع کیا۔ اور انگلستان میں برٹش گورنمنٹ سے مراسلت کر کے یہ ط کر لیا تھا کہ ہندوستان کی حکومت کا ٹھیکہ بعوض ایسٹ انڈیا کمپنی کے اُن کو دے دیا جائے۔ اور معاہدے کی تکمیل ہونے ہی کو تھی کہ اُن کے سالے نے کسی سازش میں شریک ہو کے زہر دے دیا۔ اور وہی مثل پوری ہوئی کہ

ع آن قدح لبثکست د آن ساقی نہ ماند۔

یہ اور اسی قسم کے بیسیوں واقعات مشہور ہیں۔ جن کا ثبوت سوا ا فواہی ردایتوں کے اور کچھ نہیں مل سکتا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ سعادت علی خان اس قدر جُز رُس اور منظم واقع ہوئے تھے کہ اُن کے سے حاکم نے قلم و کا کوئی جُز آسانی سے نہ دیا ہو گا۔ دوسرے اُن کے طرز عمل اور اُن کی پالیسی میں ایک ایسی مضطربانہ ہوشیاری اور پُر اسرار بقیراری نظر آتی ہے کہ چاہے پتہ نہ چلے مگر صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی بڑا کام کرنے والے تھے۔ اور اُن کے تیور بہت ہی پُر معنی تھے۔

ملک کو بانٹ دینے کی وجہ سے اُنھیں سب سے بڑی مشکل یہ پیش آئی کہ سلطنت کی نصف آمدنی کھٹ گئی۔ اور آصف الدولہ مرحوم نے مصارف حد سے زیادہ بڑھا رکھے تھے۔ چنانچہ اُنھیں اپنے دربار کے مصارف کھانا پر پڑے جو نہایت ہی مشکل چیز تھی۔ اس کوشش میں اُنھوں نے حسابات کی جانچ کی۔ ادنی ادنی رقموں پر نظر ڈالی۔ معافیوں اور جاگیروں کی

نہایت سختی کے ساتھ چھان بنان کی۔ دربار کے مصارف میں جہان تک بنا کی کی۔ غرض جس طرح ہو سکا بدنامیاں اٹھا کے اور لوگوں پر سخت بے رحمان کر کے انھوں نے سلطنت کی آمدنی بڑھائی اور خرچ گھٹایا۔

یہ کارروایاں دیکھ کے ذمی ہوش اور منصف مزاج لوگ تو سعادت علی خان کی بیعت و خوش تدبیری کے قائل ہو گئے مگر عوام میں بے انتہا ناراضی پھیلی۔ ایک طرف ان معافی داروں اور جاگیرداروں کا گروہ شاکی تھا جن کی جائدادیں ضبط ہوئی تھیں۔ دوسری طرف وہ فضول اور اذکار رفتہ ملازمین روتے پھرتے تھے جن کی جگہیں تخفیف میں آگئی تھیں۔ اسی قدر نہیں ملک میں ایک بڑا بھاری گروہ اُن لوگوں کا بھی تھا جو وزیر علی خان کے طرفدار تھے۔ اُن کو جائز اور سچا حقدار سلطنت خیال کر کے سعادت علی خان کو غاصب بتاتے تھے۔ غرض ملک میں ہزاروں دشمن تھے جن سے خطرہ تھا کہ نواب کی جان پر نہ حملہ کر چکیں رعایا کے علاوہ فوج بھی نئے نواب سے نہایت ہی ناراض تھی۔ بیشمار فوج کا ٹری دل جو نواب شجاع الدولہ کے عہد میں جمع تھا اُس میں آصف الدولہ ہی کے زمانے میں سرکار انگریز بہادر کے مشورے سے تخفیف شروع ہو گئی تھی۔ مگر آصف الدولہ کی فیاضیوں اور فضول خرچیوں نے بھلائے رکھا۔ اور شکایت کی آواز زیادہ نہیں بلند ہونے پائی۔ سعادت علی خان نے جب زیادہ تخفیف کی اور اُس کے ساتھ جبرسی بھی اختیار کی تو ہر طرف ہاے ہاے پڑ گئی۔ اور جو تھا اُن کی جان کو رو رہا تھا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کی جان کی حفاظت کے لیے سرکار انگریزی کو ضرورت معلوم ہوئی کہ انگریزی باضابطہ فوجی گارڈ خاص شہر کے اندر رکھا جائے۔ کیونکہ شہر کے مفسدون اور سرکشوں کی سرکوبی کے لیے اور نیز امن و امان قائم رکھنے کی غرض سے ایک بیرونی زبردست قوت کا ہر وقت شہر میں موجود رہنا بہت ہی ضروری تھا۔ جس کی نسبت سنا جاتا ہے کہ نواب سعادت علی خان نے نہایت ہی ناگواری کے ساتھ منظور کیا۔

فرمانروایان اودھ نے اس سے پیشتر اپنے رہنے سننے کے متعلق نہایت ہی

سادگی ظاہر کی تھی۔ پہلے تین حکمرانوں یعنی نواب برہان الملک نواب صفدر جنگ - اور نواب شجاع الدولہ نے جن تین سادے مکانات میں زندگی بسر کی وہ بھی اُن کی ذاتی ملکیت نہیں بلکہ کرائے پر تھے۔ انھوں نے اپنا اصلی مکان یا تو میدان جنگ کو خیال کیا یا ساری مملکت کو جس میں دورہ کرتے رہتے اور ساری مملوکہ زمین کے ہر حصہ کو اپنا مسکن و مکان تصور کرتے۔ نواب آصف الدولہ اگرچہ نہایت ہی مصروف تھے۔ عیاشی و فضول خرچی میں بدنام تھے مگر اُن کے لیے بھی صرف ایک سادہ پُرانی قطع کا مکان یعنی چھ بجوں کے قریب والا بیچ محلہ کافی تھا۔ حالانکہ انھیں عمارت کا بڑا شوق تھا۔ اس سے زیادہ کیا ہو گا کہ بیس لاکھ روپیہ ایک امام باڑے اور مسجد کی تعمیر میں صرف کر دیے اور اس سے زیادہ ہی رقم چوک - مختلف بازاروں - منڈیوں - پلوں - اور سراؤں وغیرہ کی تعمیر میں خرچ کی۔ غرض پہلے تین فرمانرواؤں کا شوق تعمیر اگر قلعوں - گڑھیوں کی تعمیر اور فوجی سامان کے فراہم کرنے میں پورا ہو تا تھا تو آصف الدولہ کا شوق دینداری کی عمارتوں یا نفع رسانی خلق اللہ کے کاموں میں اس کے ساتھ عمارت کا قدیم مذاق بھی اب تک بنیما جلاتا تھا۔ آصف الدولہ کے زمانے تک کی عمارتیں قدیم مذاق تعمیر کا مکمل ترین نمونہ ہیں۔ دہلی و آگرے میں شاہجہان بادشاہ کو اعلیٰ درجے کا سنگ رخام اور سنگ سرخ قریب کی کانوں میں مل گیا تھا جس نے وہاں کی عمارتوں میں خاص قسم کی نفاست اور اعلیٰ درجے کی شان پیدا کرادی۔ لکھنؤ میں پتھر کا ملنا غیر ممکن تھا۔ اور آگرے اور جے پور سے لانا اس قدر دشوار تھا کہ کسی کو منگوانے کی جرأت نہ ہو سکتی تھی۔ آصف الدولہ نے اینٹ اور چونے سے وہی کام لیا۔ اور ویسی ہی شاندار می دکھا دی۔

نواب سعادت علی خان کو باوجود کفایت شعاری - جزر سی - اور ردِ پیہ جمع کرنے کی ہوس کے مکانات اور عمارتوں کا شوق تھا۔ مگر افسوس اُن کا یہ شوق کلکتہ وغیرہ میں رہنے اور مختلف مقامات کی عمارتوں کے دیکھنے کی وجہ سے ایسا غارت ہو گیا تھا کہ اُن کے عہد کی عمارتوں سے وہ پُرانی خصوصیتیں

جد اہو گئیں۔ اور اُس وقت سے گویا عمارت کا مذاق ہی بدل گیا۔
لکھنؤ میں اس انقلابِ تعمیر کا اصلی باعث کچھ تو تخت نشینی سے پہلے نواب
سعادت علی خان کی غریب الوطنی خانہ بدوشی اور اقوامِ یورپ سے ملنا جُلنا
تھا اور زیادہ تر یہ چیز تھی کہ جنرل مارٹن نے اپنے مذاق کی دوا ایک کوٹھیاں
ہی ان بنوائے ایک نئی وضع عمارت فرما رو ان کے سامنے پیش کر دی جو بلجام
مضبوطی کے ناقص اور باعتبار ضروریاتِ زندگی کے نہایت ہی دلچسپ تھی۔
جن عمارتوں کی حالت بالکل اُن کھلونوں کی سی تھی جو بچوں کے ہاتھ میں
دے دیے جاتے ہیں۔ اور روز ٹوٹتے اور نئے خریدے جاتے ہیں۔ ناقدین
یورپ تنقید کرتے وقت بڑے زور و شور سے اعتراض کرتے ہیں کہ آصف الدولہ
کے بعد دالے فرمانِ ردا یاں لکھنؤ کا مذاق عمارت بالکل بگڑ گیا تھا۔ اور اُن کی
تمام عمارتیں لڑکوں کے کھلونے یا لڑکیوں کے گھونڈے ہیں۔ مگر ادھر توجہ
نہیں کرتے کہ یہ مذاق بگاڑا کس نے؟ کہا جاتا ہے کہ یہاں کا قومی مذاق اس
بگڑ گیا کہ یہاں دراصل کوئی قوم تھی ہی نہیں۔ اور اس کا خیال نہیں کیا جاتا کہ
یہاں کی قومیت کو کس نے بگاڑا۔ اور کس کی کرشمہ ساز یوں نے لوگوں سے اُن کی
بڑی انی وضع چھڑا دی۔ سچ یہ ہے کہ ۱۶۰۰ء باد صبا میں ہمہ آوارہ لست۔
سعادت علی خان نے پہلی کوٹھی فرحت بخش پچاس ہزار روپیہ پر جنرل مارٹن
سے مول لی۔ اُسی میں رہنا شروع کیا اور اُس کے متصل اور کئی مکان بنوا
پھر وہاں سے قریب ہی صاحبِ ریڈنٹ کی سکونت کے لیے بیڑھی کوٹھی تعمیر
کی جس کے کھنڈر ریڈنٹ کی اندر پڑے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد اپنے
دربار کے لیے اُنھوں نے لال بارہ دری کی کوٹھی جس میں اب کتب خانہ ہے۔
اور اُن دنوں قصرِ سلطان کے نام سے مشہور تھی۔ اس کے علاوہ دریا پار
اُنھوں نے دلارام نام ایک نئی کوٹھی تعمیر کی۔ اور اسی سلسلے میں ایک بلند
ٹیکرے پر جو اب صدر یعنی شکرگاہ لکھنؤ کے علاقے میں واقع ہوا ہے اور جہاں
سارے شہر گرد کے میدانوں اور دریا کا دلکش منظر نظر کے سامنے ہو جاتا ہے
ایک خوبصورت کوٹھی تعمیر کی۔ اور دلکشا اُس کا نام رکھا۔ اُسی طرح ایک

اور کوٹھی تعمیر کی جس کا نام حیات بخش قرار دیا۔ مگر وہ کوٹھی نواب سعادت علی خان کے بعد کے فرمان روا یا ان اودھ کے استعمال میں نہیں رہی۔ اُس میں غدر سے پہلے یجرینک رہتے تھے۔ اور غدر کے بعد یہ معمول تھا کہ انگریزی گورنمنٹ کی طرف سے جو معزز یورپین اودھ کے چیف کسٹمر مقرر ہو کے آتے اُسی کو ٹھی میں قیام کرتے۔

مذکورہ بالا کوٹھیوں کے علاوہ نواب ممدوح نے مشہور عمارتیں منور بخش اور خورشید منزل بھی تعمیر کرائیں۔ اور چوڑے کا اصطبل بھی انھیں کی یادگار ہے۔ مگر ان سب عمارتوں کی تعمیر میں پُرانی وطنی عمارت کی وضع ترک کر دی گئی۔ اور یورپ سے آئی ہوئی نئی جدیدین اختیار کی گئیں۔ اور ظاہر ہے کہ اس بارہ خاص میں لکھنؤ کا کوئی فرمان روا بھی اُن نئی عالیشان عمارتوں کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا جو خود دولت برطانیہ کے اثر اور اہتمام سے ہندوستان کے مختلف شہروں میں تعمیر ہو چکی ہیں یا روز بروز تعمیر ہوتی رہتی ہیں۔ غرض یہی زمانہ ہے جب سے لکھنؤ میں اُن قدیم مذاق کی عمارتوں کا خاتمہ ہو گیا جو تاریخی وقعت رکھتی ہوں۔ اور کسی خاص خوبی کے لحاظ سے سیاحوں کو اپنی طرف بلاتی ہوں۔ نواب سعادت علی خان نے لکھنؤ کے مغربی حصہ میں ایک بڑا کچھ بنوایا۔ اور اُس کی آبادی و رونق کے لیے اس قدر اہتمام کیا کہ اُس کے واسطے خاص قوانین وضع کیے گئے۔ اور تاجروں اور دکانداروں کو خاص قسم کے حقوق عطا کیے گئے۔ اُس نے بڑی رونق پائی۔ اور آج تک باوجودیکہ شہر کی آبادی سے فاصلہ پر اور بالکل الگ واقع ہوا مختلف چیزوں کی سب سے بڑی منڈی ہے۔ اور عالم نگر کا اسٹیشن صرت اُسی کی وجہ سے روز بروز ترقی پاتا جاتا ہے۔

سعادت گنج کے علاوہ دوسرے بڑے بازار جو نواب ممدوح کے عہد میں قائم اور آباد ہوئے حسب ذیل ہیں۔ رتھاب گنج (جو آج لوہے کی سب سے بڑی اور غلہ وغیرہ کی ایک ممتاز منڈی ہے) جنگلی گنج۔ مقبول گنج۔ موئی گنج۔ گولا گنج۔ اور رستوگی محلہ۔ موئی محل میں جو اصلی اور پرانی عمارت ہے

وہ بھی نواب سعادت علی خان ہی کی بیوہ تھی۔ یہ عمارت موجودہ احاطہ موتی محل میں شمال کی طرف واقع ہے۔ اُس میں ایک نہایت ہی نفیس سفید گنبد تھا جس میں کارِ یگر نے موتی کی سی آب و تاب پیدا کر دی تھی۔

سعادت علی خان اودھ کے تمام فرمان رواؤں سے زیادہ بیدار مغزو و مدبر اور اُس کے ساتھ نہایت ہی کفایت شعار جزر و رس بلکہ بخیل خیال کہلاتے ہیں۔ ملک کا انتظام اُنھوں نے غیر معمولی ہوشیاری اور خوبی و شائستگی سے کیا۔ اور اس میں ذرا شک نہیں کہ اگر اُن کو آخرِ عمر تک پورا اطمینان نصیب ہو جاتا تو تمام گذشتہ بد نظمیان اور خرابیان دُور ہو جاتیں۔ اور وہ ملک کی پوری پوری اصلاح کر لے جاتے۔ لیکن خرابی یہ ہوئی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ اُن کے تعلقات اچھے نہیں رہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات اُن کا دل تاج تخت اور فرمانِ ردائی و جہان بانی سے کھٹا ہو گیا تھا۔ انھیں باتوں سے عاجز آ کے اُنھوں نے آدھے سے زیادہ ملک سرکارِ عظمت مدارِ برطانیہ کے سپرد کر دیا۔ اور سمجھے کہ اب میں اپنے مقبوضہ علاقے میں بے خرخشہ و بے تردد حکومت کر سکوں گا مگر افسوس کہ اب بھی اُن کو اطمینان اور چین نہ نصیب ہوا۔ جو ملک اُن کے قبضے میں چھوڑا گیا تھا اُس میں بھی جا بجا انگریزی فوج کے کیمپ قائم کیے گئے۔ اور بڑی مقدارِ خاص لکھنؤ اور اُس کے حوالی میں مقیم ہوئی جس کی سنبھال دشوار تھی۔ اور اُس کی تعداد کے زیادہ ہونے سے سلطنت پر سخت بار پڑ گیا تھا۔ اس کے مقابل انھیں اپنی بہت سی فوج گھنٹا دینی پڑی۔ مگر باوجود ان انکار و ترددات کے اُنھوں نے جو جو اصلاحیں کیں بہت کچھ قابلِ تعریف ہیں۔ مگر سب سے عجیب یہ بات ہے کہ بازارِ دکن کی ترقی اور تجارت کے فروغ کے ساتھ اُن کے دربار میں باکالوں اور قابلِ قدر لوگوں کا آنا بڑا مجمع ہو گیا تھا کہ اُس وقت ہندوستان کے اور کسی دربار میں ایسے صاحبانِ کمال نہ نظر آ سکتے تھے۔ ایسے لوگ اکثر اُسی جگہ جمع ہو ا کرتے ہیں جہاں کے رئیس معمول سے زیادہ فیاضی ظاہر کیا کرتے ہوں۔ سعادت علی خان جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں جزر و رس اور بخیل تھے۔ مگر اس بخیل و کفایت

شعاری کے ساتھ یہ صفت تھی کہ اُن کی ذاتی قابلیت دوسرے بالکالوں کی لیاقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتی تھی۔ اور اسی بات نے اُن کے ہاتھوں سے لائق لوگوں کی بڑی بڑی قدریں کرائیں۔ اور لکھنؤ پہلے سے زیادہ اہل کمال کا مرجع بن گیا۔ جو قابل آدمی جہاں ہوتا سعادت علی خان کی قدر دانی کی شہرت سنتے ہی اپنے وطن کو خیر آباد کہہ کے لکھنؤ کا رخ کرتا۔ اور یہاں اُس کے ایسا آرام پاتا کہ پھر کبھی وطن کا نام نہ لیتا۔

۱۲۴۳ھ محمدی (۱۸۲۷ء) میں نواب سعادت علی خان نے سفر آخرت کیا۔ اور اُن کے بیٹے غازی الدین حیدر مسند حکومت پر رونق افروز ہوئے قیصر باغ کی مربی عمارت کے اندر نواب سعادت علی خان اور اُن کی بی بی مرشد زادی کے مقبرے ہیں۔ ان دونوں مقبروں کی جگہ ایک مکان تھا جس میں نواب غازی الدین حیدر ایام دلی عہدی میں رہا کرتے تھے۔ باپ کی آنکھیں بند ہوتے ہی جب وہ ایوان شہریاری میں گئے تو کہا "میں نے والد کا گھر لیا ہے تو ضرور ہے کہ ایسا مکان اُنھیں رہنے کو دے دوں" اس خیال کے مطابق نواب مرحوم کو اپنے گھر میں دفن کرایا۔ اور پُرانا مکان منہدم کرا کے یہ مقبرے تعمیر کرا دیے۔

اب غازی الدین حیدر کے عہد میں نہ باپ کی سی بیدار مغزی اور دولت کی قدر تھی۔ اور نہ اگلے فرماندار اُن کی سی فوجی سرگرمی۔ ہاں آصف الدولہ کے عہد کی سی آرام طلبی اور عیش پرستی ضرور تھی مگر اُس میں بھی یہ فرق آگیا تھا کہ آصف الدولہ کا اصرار بھی ملک و ملت کی نفع رسانی کے لیے ہوتا تھا اور اب خالص نفس پروری تھی۔

غازی الدین حیدر کو باپ کا جمع کیا ہوا کروڑوں روپیہ کا نقد خزانہ مل گیا تھا جو شاہی شوق کے پورا ہونے میں نہایت ہی دریا دلی سے اڑنے لگا۔ موتی محل میں ہم کہ آئے ہیں کہ شمالی جانب سعادت علی خان نے ایک کوٹھی تعمیر کرائی تھی۔ غازی الدین حیدر نے اُس احاطہ میں دو در کوٹھیاں تعمیر کرائیں جن کے نام مبارک منزل اور شاہ منزل قرار دیے گئے۔ شاہ منزل کے

پاس ہی کشتیوں کا ایک پُل تھا اور مبارک منزل اس سے مشرق کی طرف تھی ہوئی تھی۔ شاہ منزل کے محاذی دریا پار رمتہ تھا جو ہزاری باغ کے نام سے موسوم تھا اور اُس میں سیلون تک نہرست بخشی سبزہ زار چلا گیا تھا۔ اُس میں اکثر مست ہاتھی گینڈے اور وحشی درندے لڑائے جاتے اور بادشاہ اس پار شاہ منزل کے کوٹھے پر جلوہ فرما ہو کے اُن کی لڑائی کا تماشا ملاحظہ فرماتے۔ شیردوں کی لڑائی بھی وہیں ہوتی۔ جس کے لیے مضبوط کٹھڑے اور ایک عمدہ سرکس بنا ہوا تھا۔ مگر جو چھوٹے غیر آزار رسان جانور لڑائے جاتے اُن کی لڑائی خاص شاہ منزل کے احاطہ میں اسی پار ہوتی۔

یہ درندوں اور وحشی جانوروں کے لڑانے کا شوق ہندوستان میں یہاں سے پہلے اور کہیں نہیں سنا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ رزیدنٹوں اور دربار اس اہل یورپ سے رومیوں کے اِلمینی تھیٹر کے حالات سُن کے جہان پناہ کے دل میں شوق پیدا ہوا۔ اور رومتہ الکبریٰ والوں کی ظالمانہ دُجسپیوں کا مذاق لکھنؤ میں بھی پیدا ہو گیا۔ اور موتی محل میں یہاں بھی ایک مختصر اِلمینی تھیٹر بن کے تیار ہو گیا۔ غازی الدین حیدر نے اپنی ایک یوروپین بی بی کے لیے ولایتی محل بنوایا۔ اور اُس کا نام ولایتی باغ قرار دیا۔ وہاں سے قریب ہی قدم رسول کی عمارت تیار کرائی۔ غازی الدین حیدر کی آرزو کے موافق دربار انگریزی سے اُنھیں "بادشاہی" کا لقب عطا کیا گیا۔ اس سے پیشتر فرمان روایان اودھ وزیر کے رتبے کے سمجھے جاتے اور سوانواب کے اور کسی اعزازی لقب سے نہیں یاد کیے جاتے تھے۔ اس زمانے تک ہندوستان میں شہنشاہی مغلیہ کی اتنی اُن بان باقی تھی کہ اگرچہ ملک خود مختار و خود سر حکمرانوں میں بٹ گیا تھا اور شہنشاہ دہلی کے قبضہ میں صرف دہلی کے گرد و پیش کی زمین باقی رہ گئی تھی لیکن اس بے بضاعتی پر بھی شہنشاہ و جہان پناہ وہی تھے۔ نہ سریر آرایان دہلی کے سوا ہندوستان میں کسی کو "بادشاہ" کہلانے کا حق تھا اور نہ خطاب و عزت دینے کا۔ اُن کے اس غرور کے توڑنے کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی نے غازی الدین حیدر کو جنھوں نے باپ کے اندوختہ

میں سے بہت سارے روپیہ انگریزوں کو قرض دے دیا تھا۔ شاہی کا خطاب دیا۔ اور دربار اودھ نے اس عزت و سرفرازی کو نہایت ہی قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ چنانچہ اس وقت سے حکمرانان اودھ جر زبڈنٹوں کے ہاتھوں کے کھلونے تھے بادشاہ بن گئے۔ اور آخری فرمان روا واجد علی شاہ کے مرنے تک ان کا سرمایہ ناز رہا۔

غازی الدین حیدر نے اسی خطاب شاہی کی یادگار میں دریا پار کچی بھون کے ایک نیابازار بسایا اور اُس کا نام بادشاہ گنج رکھا۔ اسی زمانے میں حکیم مہدی نے مہدی گنج آباد کیا۔ اور نائب السلطنت آغا میر کی شاہانہ عمارت کے دور تک پھیل جانے کی وجہ سے عین وسط شہر میں محلہ آغا میر کی ڈیوڑھی قائم ہوا۔ اور اسی عہد میں آغا میر کی سرائیمیر ہوئی۔

بادشاہ کو اور اُن سے زیادہ بادشاہ بیگم کو مذہبی معاملات میں بہت زیادہ انہماک تھا۔ صفویہ خاندان کے زمانے سے ایران کا عام مذہب شیعہ اثنا عشری تھا۔ مگر ہندوستان کے عام مسلمان سنی تھے۔ نواب برہان الملک چونکہ ولایت سے نئے آئے تھے اس لیے اُن کا اور اُن کے سارے خاندان کا مذہب شیعہ تھا۔ باوجود اس کے زمانے تک لکھنؤ میں حکومت کا وہی قدیم طریقہ چلا آتا تھا جو آغاز سلطنت اسلام سے دیگر بلاد ہند اور سارے ملک کا تھا۔ مگر اس وقت سے بادشاہ اور اُن کے خاص محل کے انہماک مذہبی کی وجہ سے شیعیت حکومت لکھنؤ کا ایک نمایان عنصر بن گئی۔ فرنگی محل کے علما کی طرف سے حکمرانوں کی توجہ ہٹ گئی۔ اور خاندان اجتہاد عروج پا کے سلطنت کا اصلی مقصد قرار پایا۔

لیکن شیعہ مذہب اپنی اصلی حالت پر قائم رہتا تو چند ان مضائقہ نہ تھا۔ خرابی یہ ہوئی کہ بادشاہ بیگم کی جابلانہ اور امیرانہ مذہبی سرگرمی نے مذہب شیعہ میں نئی نئی بدعتیں ایجاد کیں۔ جن کی وجہ سے اسی قدر نہیں ہوا کہ بادشاہوں اور امیروں میں طرح طرح کی طفلانہ مزاجیان پیدا کیں بلکہ لکھنؤ کی شیعیت ساری دنیا کی شیعیت سے نئی نئی اور عجیب ہو گئی۔

سب سے پہلے بیگم صاحبہ نے امام صاحب العصر کی چھٹی کی رسم قرار دی جس پر اگر یہ ہوتا کہ کسی محفل میں امام ممدوح کے حالات بیان کر کے ثواب حاصل کر لیا جائے تو مضائقہ نہ تھا مگر نین یہاں ہندوؤں کے جنم اسٹی کے رسوم کے موافق پورا راجہ خانہ مرتب کیا جاتا۔ اس کے بعد یہ ترقی ہوئی کہ صحیح النسب سیدوں کی خوبصورت لڑکیاں لے کے ائمہ اثنا عشر کی بی بیان قرار دی گئیں جن کا نام اچھوتیاں رکھا گیا۔ اور جب وہ اماموں کی بی بیان تھیں تو پھر ان کے وہاں اماموں کی ولادت بھی ہوتی۔ اور بارہوں اماموں کی ولادت کی تقریبیں بڑے کردار کے ساتھ منائی جانے لگیں۔

غازی الدین حیدر نابت ہی غضنہاک اور آشفہ مزاج بادشاہ تھے۔ اور رعب و داب اس بلا کا تھا کہ ان کے سامنے لوگوں کے موش و حوا اس بجا نہ رہتے۔ ان کے زمانے میں انگریزوں سے تعلقات تو اچھے رہے مگر آغا میر جو وزیر اسطنت تھا دربار پر اس قدر حاوی تھا کہ خود بادشاہ بیگم اور ولی عہد اسطنت تک اس کے آزار سے محفوظ نہ رہ سکے۔ نازی الدین حیدر اس سے اگھوئسوں اور لالتوں سے مارتے۔ جس مار کو وہ خوشی سے کھا لیتا۔ مگر اس کا بدلہ دیگر مغزین دربار اور اغرا سے شاہی تک سے لے لیا کرتا۔

اس پہلے بادشاہ اودھ نے مذہبی ارادت و عقیدت سے دریا کنارے اور سوتی محل کے متصل نجف اشرف یعنی روضہ مطہرہ حضرت علی کی نقل لکھنؤ میں بنوائی۔ اور اس کی روشنی و خدمت کے لیے بہت سارے پیر سرکار انگریزی کے حوالے کیا۔ جس کی بدولت آج تک وہ بارونق اور خوب آباد ہے۔ اور ۱۲۵۶ھ محمدی (۱۸۴۰ء) میں جب ان کا انتقال ہوا تو اسی میں دفن ہوئے۔

فقیروں کا بادشاہ

ہندوستان میں معمول ہے کہ لوگوں کا ہر گروہ اور ہر طبقہ بہ اعتبار اپنے خصوصیات و اطوار کے دوسروں سے جدا رہتا ہے۔ اور اس کے اخلاقی تعلقات اپنے ہی گروہ میں محدود رہتے ہیں۔ اسی امتیازی وجہ سے کہ

ہر گروہ کی بجائے خود ایک گورنمنٹ قائم ہو جاتی ہے جس میں ایک بادشاہ یعنی چوہدری ہوتا ہے۔ اور اُس کی مشیر ایک مجلس وزراء ہوتی ہے جسے پچایت کہتے ہیں۔

اس قسم کا نظام تمدن بعض دیگر ممالک میں بھی قائم ہے مگر وہ ان اس نظام کو ایسی قوت نہیں حاصل ہو سکتی جیسی کہ ہندوستان میں ہے۔ اس کی زیادہ وجہ یہ ہے کہ ہندوستان کے فرزندوں میں ذات اور برادری کی ایسی تفریقیں واقع ہوئی ہیں کہ وہ بالطبع اسی نظام کے خواستگار ہیں۔

ہمیں اپنے ایک قدامت پرست دوست سے معلوم ہوا کہ پچیس تیس سال کا زمانہ ہوا سندیلہ میں ایک پڑائے ہیچڑے کے مرجائے پر قریب قریب شمالی ہند کے کل ہیچڑے جمع ہوئے تھے۔ جن میں ایک ہیچڑوں کا بادشاہ بھی تھا۔ جس کی شاید نواح فرخ آباد میں بہت بڑی جاگیر تھی۔ اور اُس کی نسبت یہ روایت مشہور تھی کہ شاہنشاہانِ دہلی میں سے کسی تاجدار کا کوئی بیٹا ہیچڑا ہو گیا تھا۔ پہلے تو باپ کی نظر میں وہ ذلیل و خوار رہا۔ لیکن آخر بادشاہ کا بیٹا تھا مجبوراً اُسے دہلی سے دور ایک بڑی جاگیر عطا کی گئی تاکہ گھر سے الگ وہیں بیٹھ کے اپنی بے شرمی کی زندگی ختم کر دے۔ ہیچڑوں نے اُس کی یہ قدر کی کہ اپنا بادشاہ بنالیا۔ اور اُس وقت سے جو ہیچڑا اُس گدھی پر بیٹھا ہیچڑوں کا بادشاہ قرار پا گیا۔

عرض ہندوستان میں قریب قریب ہر ذلیل و حقیر گروہ کی ایک جماعت قائم ہوتی ہے جس کا کوئی فرمان روا بھی ضرور ہو اکر تا ہے۔ چنانچہ ہر گروہ اور ہر طبقہ کی شاہیناں یہاں مدت ہائے دراز سے چلی آتی ہیں۔ لیکن تعجب یہ ہے کہ ایک سب سے ذلیل گروہ کی بادشاہی کبھی ہندوستان میں نہیں سنی گئی تھی جس کا تکملہ انگلستان نے کر دیا۔

ہندوستان میں کبھی کوئی فقیروں کا بادشاہ نہیں سنا گیا۔ اگرچہ تصوف کے عام مذاق اور مددِ دیش پرستی کے رجحان نے یہاں ہر فقیر کو "شاہ جی" کا لقب دے کے شاہی دلوادی۔ اور ہر فقیر اپنی گدھی اور اپنے تکیہ کا

بادشاہ بن گیا۔ اور جب ہر فقیر بیان ایک بادشاہ بن گیا تو پھر کیونکر ممکن تھا کہ وہ کسی ہم عصر کے آگے سر نیاز جھکائے؟ اور کسی کو ان کی بادشاہی کا فخر حاصل ہو؟ لیکن انگلستان میں فقر و فاقہ کا ایک نامی گرامی بادشاہ ہو چکا ہے جس کی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ وہ ان کے عام فقرا "شاہ صاحب" نہیں مانے جاتے۔

ان انگلش شاہ گدایان کے حالات غالباً دلچسپی سے خالی نہ ہوں گے۔ ان شاہ صاحب کا نام "کارپو بام فائلڈ مور" تھا اور لقب "فقیر وں کا بادشاہ" آپ ایک گرجے کے مستم پادری صاحب کے فرزند و بلند تھے۔ مگر سیاست کا اس قدر شوق تھا کہ سوا شہر وں شہر وں مارے پھرنے کے کسی ایک جگہ قدم نہ جتا۔ ہنوز وطن ہی میں تھے کہ چند جیسی لوگوں نے بستی کے باہر آکے پڑاؤ ڈالا۔ جیسی ایک خانہ بدوش قوم ہے جو نہ کہین مگر بتاتے ہیں اور نہ کہین پاؤں توڑ کے بیٹھتے ہیں۔ مہن لوگوں کے خلاف وہ نہایت ہی بے پروا۔ بے شکلف اور سادہ مزاج ہوتے ہیں۔ گہا گری کرتے ہیں۔ اور ہاتھ دیکھ کے آئندہ زندگی کے حالات بتانا۔ اور انسان کو تقدیری واقعات اور پیش آنے والے سوانح سے مطلع کرنا ان کا کام ہے۔ انگلستان میں مشہور ہے کہ جیسی بچوں کو پکڑ لے جاتے ہیں۔ اور جب ان کا کوئی خاندان کسی بستی میں ہو کے گزرتا ہے تو مائیں بچوں کو گھروں میں پکڑ کے بٹھالیتی ہیں اور اکثر بچہ خود ہی ایسے سسے ہوتے ہیں کہ ان کا نام سننے ہی کو زون میں دھک جاتے ہیں۔

یہ خلاف عام اہل انگلستان کو جو جیسی لوگوں سے الگ ہی الگ رہتے ہیں یہ شاہ کارپو صاحب ان سے جا کے ملے۔ ملاقات پیدا کی اور چند روز میں ایسا ربط و ضبط پیدا کر لیا کہ ان کو ان سے اور ان کو ان سے ملنے میں لطف آئے لگا۔ ان ملاقاتوں میں شاہ کارپو کو جلسوں کی زندگی بہت پسند آئی۔ ان کی خانہ بدوشی کی رواروی اور ان کی ستادی زندگی میں کچھ ایسی دلکشیان نظر آئیں کہ جس طرح اگلے دنوں ہمارے یہاں بعض بگڑے شریف زادے شہد وں کی زندگی پسند کر کے انھیں میں مل جل

جاتے اور اُن کی معاشرت اختیار کر لیا کرتے تھے آپ نے اُن کی زندگی اختیار کر لی تمام دوستوں اور عزیزوں کو خبر باد کہہ دی اور حبیبوں کے ساتھ ہو لیے۔

اس زندگی کے اختیار کر لینے کے بعد شاہ کا ریو نے طرح طرح کے کارنامے دکھائے ہر گھر میں ایک نئی وضع میں آنے اور ایک نیا فقہ بنانے میں ایسے کمالات دکھائے کہ لوگ اُن کی باتوں کو جاوید یا کرامت ماننے لگے۔ ایک ہی صحبت کے سامنے دن میں چار چار پانچ پانچ بار آتے۔ ہر دفعہ ایک نئی بات بنائے پیش کرتے اور کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ آتا کہ یہ وہی شخص ہے جو ابھی چند گھنٹے پہلے دوسری وضع میں آیا اور کوئی اور فقرہ دے کے کچھ وصول کر لے گیا ہے۔ کبھی وہ ایک ستم زدہ مسم کنیسہ بن کے آتے اور کہتے "میں قاعدے کے موافق حلف نہ اٹھا سکا اور اپنی خدمت سے محروم رہ گیا" دوسری بار دوسرے بھیس میں آ کے فرماتے "میں ایک کو یگہ ہوں تجارت میں کھاتا ہوں سے تباہ ہو گیا" تیسری بار تیسری وضع میں آ کے فرماتے "میں ایک کشتی شکستہ ہوں۔ جہاز ڈوب گیا۔ اور مجھے تختوں یا موجوں نے ساحل پر پھینک دیا۔" چوتھی بار چوتھے بہروپ میں آ کے کہتے "میں فلان گاؤں کا لوہا ہوں۔ بھٹی کے بھڑک اٹھنے سے آگ لگ گئی۔ اور سارا گھر جل کے خاک ہو گیا۔ بی بی بچے شعلوں کی نذر ہوئے مصیبت کے ایام کاٹنے کے لیے میں زندہ ہوں ہر گھر میں نیا روپ بھرنے میں ان شاہ صاحب کی اس قدر شہرت تھی کہ تمام لوگوں کی زبان پر تھا ہر خطہ وضع و گران یا برآمد۔ اور تحیر ہو ہو کے کہتے کہ پردیسوں بھی عہ کو بکر مسیحوں کا ایک نیا مبدع گروہ تھا جو لوگ حلف اٹھانے کو بُرا سمجھتے۔ اور اپنی راست بازی میں مشہور ہیں۔

عہ پردیسوں یونانیوں کا ایک دریائی دیوتا تھا جسے گڑھی گڑھی اپنی صورت بدل لینے میں کمال بتایا جاتا ہے۔ وہ لوگوں کو آئندہ قسمت کا حال بتاتا تھا۔ جزیرہ فاروس کے ایک غار میں رہتا۔ لوگ وہاں سے غیب کی باتیں پوچھ کر جاتے لیکن صرف اُسی صورت میں کامیاب ہوتے جب کہ وہ سوتا ہوا ملتا۔ کیونکہ اگر جاگتا ہوتا تو اپنی ایسی صورت بنالیتا کہ کوئی پہچان ہی نہ سکتا۔

اتنی جلدی صورت نہ بدل سکتا ہوگا جس قدر جلد یہ حضرت روپ بدل لیا کرتے ہیں۔ ایک خاص طریقہ آپ نے یہ اختیار کر رکھا تھا کہ کسی خاص تدبیر سے لوگوں کے کٹوٹن کو پھسلالے جاتے۔ اور کسی کو کانوزن کان جز نہ ہوتی۔ اس جرم میں آپ دودفعہ گرفتار ہوئے سزایاب اور امریکہ میں جلا وطن کر دیئے گئے۔ مگر دونوں دفعہ کوئی نہ کوئی جتن کر کے وہاں سے بھاگ آئے۔

انھیں جلا وطنیوں میں سے ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ آپ علاقہ ورجینیا سے چلے تو بڑا بھاری جنگل قطع کیا۔ امریکہ کے مشہور دریائے ڈیلا وائر کے اس پار اس وضع میں آئے کہ ایک گھوڑے کی پیٹھ پر سوار تھے۔ اور لگام کے عوض صرف ایک رومال اُس کے سر سے اٹکا ہوا تھا۔

مملکت گرائی کے اس نامی فرمان روا کی نسبت کہتے ہیں کہ بلا کا حافظہ پایا تھا۔ اور جس سے بات کرتا اُس کا دل اس طرح بُھا لیتا کہ مجال نہ تھی وہ دھوکا نہ کھا جائے۔ نہایت ہی خوش اسلوبی کے ساتھ کبھی ایک رئیس اعظم بھی جاتا اور کبھی ایک درویش بے نوا۔

آپ نے اپنے ہم مذاق لوگوں یعنی مکار فقیروں کی ایک بڑی بھاری جماعت پیدا کر لی۔ جو ملک کے لیے ایک زبردست فتنہ تھی۔ اور چونکہ تمام باتوں میں آپ سب سے زیادہ قابلیت اور کمال رکھتے تھے اس لیے سب نے مل کے آپ کو اپنا بادشاہ منتخب کیا۔ اور اُسی وقت سے آپ فقیروں کے بادشاہ مشہور ہوئے۔ اور آخر زندگی تک اس معزز خدمت کو ایسی خوش اسلوبی سے انجام دیا کہ جیتے جی آپ ہی اُن کے فرمان روا رہے۔ کسی اور کے منتخب کرنے کی ضرورت نہیں پیش آئی۔

آخر اسی حکومت و فرمان فرمائی کے ساتھ سن ۱۸۷۷ء میں ستمبر برس کی عمر پاکے آپ دنیا سے رخصت ہوئے۔ اور انگلستان میں علاقہ ڈیون شائر کے قصبہ بک لے میں سن ۱۸۹۳ء عیسوی میں پیدا ہوئے تھے۔

ریلو

فلسفہ جذبات یعنی نفسانیات (سائیکالوجی) پر اردو زبان میں سب سے پہلی کتاب مصنف مولوی عبد الماجد صاحب بی۔ اے۔ - یہ کتاب ۲۲۲۱۸ پیمانے کے ۲۲۹ صفحوں پر ختم ہوئی ہے۔ انجمن ترقی اردو نے اسے اپنے اہتمام سے طبع کروانے کا شایع کیا ہے اور اردو کے کتب خانے میں ایک نہایت ہی قیمتی کتاب اضافہ کر دی ہے۔ جو جذبے نفس انسانی اور نفوس حیوانی میں پیدا ہوا کرتے ہیں ان پر خوش اسلوبی کے ساتھ عالمانہ و محققانہ بحث اس کو سوا اور کسی اردو کتاب میں نہ نظر آئے گی۔ جو حضرات عالمانہ مذاق کے دلدادہ ہیں ضرور ملاحظہ فرمائیں۔ مولوی عبد الماجد صاحب نہایت ہی گہرا علمی مذاق رکھتے ہیں۔ اور مسلمانوں میں ان کے ہم مذاق چند ہی لوگ نظر آئیں گے۔ ملک میں ایسے فلسفیانہ مذاق کا پیدا ہونا بڑی خوش نصیبی کی بات ہے۔ اور تعلیم یافتہ اہل وطن کا فرض ہے کہ اس علمی خدمت کی تندر اور مصنف کی حوصلہ افزائی کریں۔ آخر میں "فرہنگِ مسطلمات" کے عنوان سے گیارہ صفحوں کی ایک فہرست لگی ہوئی ہے جس میں ۱۳۵ تراجم اصطلاحات بتائے گئے ہیں جن کو فاضل مصنف صاحب نے خود ہی اختراع کر کے ان سے علمی مسائل کے ادا کرنے میں کام لیا ہے۔ یہ کتاب دو قسم کے کاغذوں پر چھپی ہے۔ عمدہ کاغذ والی کی قیمت چھ ارڈو سیرے درجہ والی کی قیمت چھ ارڈو فی جلد ہے۔ مہتمم صاحب "دارالاشاعت" انجمن ترقی اردو سے فلاور ملز لکھنؤ کے پتہ پر خط بھیج کے منگوائی جائے۔

فتح قسطنطنیہ یہ ۲۶ x ۲۶ پیمانے کے ۱۳۸ صفحوں کا نہایت ہی نفیس چھپا ہوا ایک بیس بہار سالہ ہے جس میں حاجی بدر الدین احمد صاحب بی۔ اے۔ نے سلطانین آل عثمان کے دلچسپ حالات آغاز سے فتح قسطنطنیہ کے زمانے تک بڑی خوبی کے ساتھ موثر اور پرجوش زبان میں بیان فرمائے ہیں۔ قیمت فی جلد چھ ارڈو ہے۔ ملک میں تاریخ کا مذاق ترقی کر رہا ہے۔ اور ہمیں یقین ہے کہ ہمارے جن دوستوں کو اسلامی تاریخ میں دلچسپی ہے اس تازہ تصنیف کو بہت پسند فرمائیں گے۔ جو نمبر ۱۹

اسٹریٹ ڈاکھانہ انٹائی - کلکتہ کے پتہ پر خود مصنف صاحب کو لکھ کے منگوائی جاسکتی ہے۔

لے ہیر کامل یہ چھوٹے پیمانے کے ۵۰۴ صفحوں کی ایک ضخیم کتاب ہے اور غور و فکر و درراکھ نام ایک عربی کتاب کا ترجمہ جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کلمات و نصائح و حروف تہجی کی ترتیب سر جمع کر دیے گئے ہیں۔ اصلی عربی کتاب کو مولف کا اسم گرامی علامہ عبدالواحد محمد بن عبدالاحد احدی مسمی ہے۔ اسناد و صحت روایت میں جو مصنفین سلف مشہور ہیں ان میں ہمیں اس مصنف کا نام کمین نہیں نظر آیا۔ اور نہ مترجم صاحب نے ان کے حالات اور ان کے زمانہ سرچشمین اطلاع دی ہو۔ لہذا یہ کتاب علم و حکمت کا چاہے کتنا ہی بڑا خزانہ ہو لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جانب منسوب ہونے کی وجہ سے ہم مجبور ہیں کہ اس کے ہر ہر قول کی تنقید روایت اسی احتیاط سے کریں جس احتیاط کا لحاظ اہل اسلام لطف سے آج تک احادیث و آثار صحابہ کے بارے میں کرنے آئے ہیں۔ اور جب تک ایسی صحیح روایتوں سے جو ہر طرح کی پرکھ میں پوری ترین یہ اقوال ہمارے سامنے نہ پیش کیے جائیں ہم انھیں حضرت علیؑ کی طرف منسوب کرنا شان مرتضوی میں بے ادبی تصور کرتے ہیں۔ حضرت علیؑ کا ایک دیوان اشعار بھی موجود ہے نہج البلاغہ میں آپ کے خطبات بھی جمع کر دیے گئے ہیں۔ لیکن اصول تنقید کی زد سے کوئی بھی اس قابل نہیں کہ اس پر وثوق کیا جائے۔ اس رسالہ کی قیمت چھ روپی جلد ہے۔ اور مستم صاحب کتب خانہ اسلامی کی خدمت میں "یکٹی دردازہ - لاہور - پنجاب" کے پتہ پر درخواست بھیج کے طلب کی جاسکتی ہے۔

چند خیالات و واقعات

مسلمانوں کو خواجہ کمال الدین صاحب کا سنایت ہی شکر گزار ہونا چاہیے کہ اس نازک زمانے میں جبکہ دنیا اسلام میں ہر جگہ سیاسی انحطاط نظر آ رہی ہے ان کی خالص ہی سرگرمیوں سے اسلام کی روحانی ترقیات کو کب اقبال کی طرح نمایاں ہوئیں۔ اسلام کا روحانی علم و بحال ان قوموں کے ہاتھوں میں ہے جو بڑھاپے کی وجہ سے ناتوان و کمزور ہیں۔ اس کے مدا کی اگر مرضی ہے کہ یہ سجادین باقی رہے تو بے شک اب وہ اس علم کا حامل و حامی ن قوموں کو بنائے گا جن کے ارادے نئے اور حوصلے تازے ہیں۔ اور جن کی رگوں میں

نیا پُر جوش خونی دھڑ رہا ہے۔ خدا کی یہ مشیت اگر خواجہ صاحب کے ذریعہ سے پوری ہوتی نظر آتی ہے تو ہمیں اُن کی نہایت ہی قدر کرنی چاہیے۔ مسلمانوں میں اگر اپنے دین کی سچی محبت ہے تو خواجہ صاحب کو پوری مدد دین گئے اور کوشش کریں گے کہ اُن کا مشن مضبوط ہو جائے بعض حضرات فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کو پہلے خود ہندوستان کے مسلمانوں کو اور اس کے بعد یہاں کے عام لوگوں کو مسلمان بنانا چاہیے یہ وہ سچ فرماتے ہیں۔ اور اسی لیے ہم ان کی خدمت میں بکمال التجا عرض کرتے ہیں کہ اس حصہ تبلیغ کو جو اُن کے نزدیک مقدم ہے اپنے ذمے لیں۔ اور جس کسی نے بعد کا کام اپنے ذمے لے لیا ہے اُسے اُس کا کام کرنے دیں۔

جو حضرات ایسی رائیں دیا کرتے ہیں وہ شاید ایک بڑی قوم کو چند ممبروں کی چھوٹی انجمن سمجھے ہوئے ہیں۔ کارروائیوں کے لیے اس قسم کا پروگرام بنانا کمیٹیوں اور انجمنوں کا کام ہے۔ قومیں جس کے افراد لاکھوں کروڑوں سے تجاوز کیے ہوں اپنے لیے کوئی پروگرام نہیں بناتی ہیں اور نہ بنا سکتی ہیں۔ اُن کے مختلف گروہ بلا لحاظ تقدم و تاخر اپنے خیال اور اپنے جوش کے مطابق مختلف کاموں میں لگ جاتے ہیں۔ اور سچا خیر اندیش قوم و خادمِ دملت وہی ہوتا ہے جو ہر گروہ کو اُس کے مقاصد میں مدد دے۔ اور ہم پوچھتے تو ہمارے نزدیک سب سے اہم اور سب سے مقدم دینی خدمت یہی ہے جو خواجہ صاحب بجالا رہے ہیں۔ اور اُن کی مدد میں کمی کرنا ایسی بے حسی ہے جس کے بعد مایوسی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔

ہمیں افسوس ہے کہ ہمارے نہایت پرانے دوست منشی گنگا پرشاد وراما ایدھری ہندوستانی اڈیٹور کیٹ و دنیا سر رخصت ہو گئے۔ وہ ہمارے عقوانِ شباب کی ساتھی اور دورِ یقینی زندگی تھے۔ انھوں نے لکھنؤ کو باع بنایا۔ اور اگر چند دواؤں و زہروں سے تو خدا جانے لکھنؤ کیا ہو جاتا۔ انھوں نے لکھنؤ میں نسلِ سنی کو زندہ کر دیا تھا۔ جس سے شہر کو بید نفع پہنچا۔ اُن کی وفات پر افسوس کرنا صرف اُن کے پس ماندوں کی ہمدردی نہیں بلکہ شہر لکھنؤ کی ہمدردی ہے۔ اس لیے کہ لکھنؤ کو ایسا سچا دوست پھر مشکل سے ملے گا۔

حسن کی کشتہ سازان

بشینہ محبوبہ میل

عاشق و معشوق ہر قوم اور ہر مرز میں مین گورے ہین مگر جیسے اور جتنے دارفہ مزاج نامی عاشق خاک عرب نے پیدا کیے شاید اور کوئی ملک نہ پیدا کر سکا ہوگا۔ ہر ملک کے لٹریچر میں دو چار جانا زبان محبت کے نام ضرب المثل اور شاعری کے عنصر قرار پا گئے ہین۔ مگر عرب میں میسوں عاشقوں نے اپنی مینا بیون اور بیکار یون کی بدولت ناموری کی شلشین پر جگہ پائی اور سب ملکی لٹریچر میں ضرب المثل ہو گئے۔

عرب کا قریب قریب ہر شاعر عاشق تھا۔ اور عاشق ہم نام کا نہیں بلکہ سچا عاشق جسے کسی معشوقہ کو دل و یا زندگی بھر اس کے عشق میں سرخسٹا رہا۔ اور اسی کے فراق میں روتا ہوا مرا۔ ان عشاق عرب میں سے صرف ایک مجنون عامری کا نام تو عربی شاعری سے نکل کے فارسی اور اردو شاعری میں بھی آ گیا۔ لیکن دوسرے دلدادہ عاشقوں کے نام عربی ہی کی ادب میں رہے جسکی وجہ سے ہمارے تمام اہل وطن کو انکے حالات کی بہت ہی کم اطلاع ہو سکی۔

ان خالص عربی شاعری کے نامور ان عشق میں سے قیس لبنی کے سچے حالات ہم اپنے ایک ناول کے ذریعہ سے قدر دانان و گلہ از کے سامنے پیش کر چکے ہین۔ اب ایک

دوسرے عاشق کے حالات نذر ناظرین کرتے ہیں جس کا نام جمیل تھا۔ اور اسکی معشوقہ بھی بٹینہ تھی جس کا خوبصورت نام ہے زیب عنوان کیا ہے۔ حسن کی کرشمہ ساز یون کے سلسلہ میں ہیں صرف اس نازنین عرب کے واقعات سے تعلق ہے۔ مگر عشق عاشق و معشوق کو ابد الابد تک کیلئے باہم ایسا وابستہ کر دیا کرتا ہے کہ دونوں کا جدا کرنا امکان سے باہر ہو جاتا ہے اور ایک کے حالات دوسرے کے حالات بن جاتے ہیں۔

بٹینہ بنت جہا قبیلہ بنی عذرہ کے ایک نہایت معزز خاندان کی لڑکی تھی۔ ہم بتا چکے ہیں اور غالباً ہمارے ناظرین کو یاد بھی ہو گا کہ بنی عذرہ سارے عرب میں حسن و عشق کے لحاظ سے ممتاز تھے۔ اُن کی لڑکیاں جیسی حسین و نازنین ہوتی تھیں ویسے ہی اُنکے لڑکے عاشق نراج اور تیغ ابرو کے گھاٹل ہو کر تے تھے۔ اسی عشق کی چاشنی نے بنی عذرہ کے لڑکوں اور لڑکیوں و دونوں میں شاعرانہ مذاق پیدا کر دیا تھا۔ لڑکے جس جوش و خروش سے عاشقانہ اشعار کہتے ویسے ہی ذوق و شوق سے لڑکیاں اُن اشعار کو سنتی اور کھیتی تھیں۔ اور ضرورت یا جوش کے وقت میں خود بھی غزل خوان ہو جاتی تھیں۔

غرض بٹینہ ایسے زندہ دل قبیلہ کی ایک پاک باطن و عفت شعار لڑکی تھی جس کا زیادہ تابعین کا تھا۔ اسکی شادی بنیہ بن اسود نام ایک شریف نوجوان کے ساتھ ہو گئی تھی۔ اسکے ذاتی صفات یہ تھے کہ قبیلہ کی تمام لڑکیوں سے زیادہ شیریں ادا و صاحب جمال اور حد درجہ کی سخن سنج و فصیح البیان تھی۔ اُس کی آنکھ میں بھی جادو تھا۔ اور زبان میں بھی اور انھیں خوبیوں نے اس کے ہم قوم شاعر جمیل بن عبد اللہ کو اسکا عاشق بنا دیا جو عہد نبی امیہ کے اعلیٰ ترین شعرا میں سمجھا جاتا ہے۔

عشق کی شمع دونوں دلوں کے اندر بچھن ہی میں روشن ہو گئی تھی۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ اگر بٹینہ کے حسن کی شہرت جمیل کے اشعار سے ہوئی تو جمیل کو بٹینہ ہی کے دلستان حسن نے شاعر بنایا۔ آغاز عشق یوں ہوا کہ ایک دن جمیل اپنی اونٹنیوں کو چرا تا ہوا علاقہ بغیض کی ایک وادی میں لے آیا جہاں پانی بھرا ہوا تھا۔ یہاں پہونچ کر خود ایک مقام پر صاف جگہ دیکھ کے لیٹ گیا۔ اور اونٹنیوں کو چھوڑ دیا بعض چرنے لگیں۔ بعض پانی پر بھگیں۔ اور بعض بیٹھ کے چوکائی کرنے لگیں۔ اتفاقاً اس وادی کے کنارے ایک طرف بٹینہ کے قبیلہ کا پڑاؤ تھا بٹینہ اپنی ایک ہمن سہیلی کے ساتھ یہاں پانی

لینے کو آئی۔ راستہ میں جمیل کی اونیٹیاں بھی ٹھیں۔ بیٹھنے نے انھیں کچھ اس طرح شوقی کے ساتھ چھڑا کہ وہ بھرک کے بھاگین۔ اور جمیل نے گالی دیکے کہا دو میری اونیٹیاں کو کیوں ستایا؟ بیٹھنے نے یہ سخت و سست کلمات سنے تو اُسے کہاں تاب تھی؟ بگڑ کھڑی ہوئی۔ اور ایک کی سوسنا دین۔ لیکن اُسکے اس بگڑنے اور کوسنے میں کوئی ایسی دلفریب ادا تھی جس نے جمیل کی خرم جان میں عشق کی آگ لگا دی۔ دل میں کہا۔ ع جواب تلخ می زید لب لعل شکر خارا۔ ساتھ ہی خیال آیا کہ کاش میری یہ تمس پوری ہوتی اور یوں کہ

گالیاں کھائے پر مڑے کے ساتھ گال گورے سے چومتا جائے
بس یہی جمیل کا آغاز عشق تھا جسے وہ خود اپنے اس شعر میں یاد دلاتا ہے۔

و اَوَّل مَا قَادَ الْمَوَدَّةَ بَيْنَنَا بَوَادِيْ غَضِيْفٍ يَابِثِيْنَ سَبَابِ

(جس ادا نے پہلے پہل ہم دونوں میں محبت پیدا کی وہ امی بیٹھنے تیرا کوسنا تھا)
غالباً یہ داوی القری کا واقعہ ہے جو کہ معظمہ اور مدینہ طیبہ کے درمیان واقع ہے اور جہاں جمیل کا نشو و نما ہوا تھا۔ اب دل میں عشق کی گرمی پیدا ہوئی تو طبیعت شاعرانہ رنگیناں اور اُس کے ساتھ ہی ساتھ سچے جوش کی پتیا بیان دکھانے لگی۔ آخر اپنے درہ دل کو اشعار کے ذریعہ سے ظاہر کرنے لگا اور وہ اشعار اہل زبان میں مقبولیت حاصل کرنے لگا اور چند ہی روز میں بیٹھنے پر اسکا عشق سارے عرب میں مشہور ہو گیا۔ جمیل کے مان باپ نے بیٹے کی یہ حالت دیکھی تو بیٹھنے کے باپ کو اپنے لڑکے کا پیام دیا۔ وہ اُس کے عشق کی خبر میں سُن سُن کے سخت برہم ہو رہا تھا۔ شادی کا پیام سُن کے بگڑ کھڑا ہوا اور کہا اشریف زاد یوں کا نکاح اُن بدعاشوں کے ساتھ نہیں ہو سکتا جو اُن پر اظہار عشق کر کے انھیں بدنام کرتے ہوں۔ غرض یہی نہیں ہوا کہ بیٹھنے کے باپ نے جمیل کا پیام نامنظور کیا اور بلکہ بیٹھنے بن اسود نام ایک اور شخص کے ساتھ اسکا نکاح بھی پڑھا دیا۔ اور سمجھے کہ جھگڑا ہمیشہ کے لیے چاک گیا۔ جیسا کہ ہم بیان کر آئے ہیں۔

جمیل کے لیے اس سے بڑی کوئی ناکامی نہ ہو سکتی تھی مگر عشق سچا تھا اور کسی شہوانی خواہش نے اُسے بیٹھنے کے رخِ زیبا کا دلوں نہ نہیں بنایا تھا۔ اس خبر نے آتش عشق کو اور بگڑ کا دیا۔ اور رات دن اسی کوشش میں رہنے لگا کہ کسی طرح بیٹھنے سے ملے۔

اُس کے حسن عالم آشوب کی زیارت کرے۔ اُسکی پیاری باتیں سُننے اور اُسے اپنے پُر سوز اشعار سُنائے۔ بٹینہ کے بھائی خواش نے جب یہ دیکھا کہ بٹینہ کی شادی ہو جانے پر بھی جمیل اُس پر اپنا عشق ظاہر کرنے اور اپنے اشعار میں اُسپر تشبیب کر نیے نہیں باز آتا تو غصہ میں آکے خود بھی شعر کہنا شروع کیے جن میں جمیل کی بہن پر اپنا عشق ظاہر کرنا جمیل نے اُسکی بھی کچھ پروا نہ کی۔ لیکن خواش کو چند ہی روز میں نظر آگیا کہ اُس کے اشعار کو کوئی سنتا بھی نہیں اور جمیل کے اشعار جمیل کی زبان سے نکلتے ہی سادی دنیا کی زبان پر جاری ہو جاتے ہیں پھر اُس نے اپنی بیوہ شاعری چھوڑ دی اور سمجھ گیا کہ جمیل کا عشق ایک ایسی بلا ہے جو کسی طرح نہیں ٹل سکتی۔

لیکن بٹینہ کے باپ بھائی اور شوہر کا زور ہی کیا چل سکتا تھا جبکہ خود بٹینہ دل میں جمیل کے عشق کی قدر کرتی تھی۔ اور باوجود دوسرے کی منکوحہ ہونے کے اُس کو جمیل کے ساتھ ایسا لگاؤ ہو گیا تھا کہ دل کو اُسکی طرف سے پھیرنا اختیار سے باہر تھا۔ ان دنوں جیسا کہ احادیث سے ثابت ہوتا ہے عرب کی مسلمان عورتوں کا معمول تھا کہ اچھے کپڑے پہن کے اور پورا بناؤ سنگھار کر کے عید کے دن عید گاہوں میں جایا کرتیں۔ اور اپنے عزیزوں اور دوستوں سے بے تکلف ملتیں۔ جمیل کو یہ موقع غنیمت معلوم ہوا عید گاہ میں جا کے وہ جگہ ڈھونڈنے نکالی جہاں بٹینہ اپنی رازدار بہن اُم الحسین کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ جمیل کو دیکھ کے وہ خوش ہوئی۔ اُس سے کھل کے ملی۔ باہم سوال و جواب رہے جن سے ناز و نیاز کے صد ہا سراغیاں ہو رہے تھے۔ غرض دیر تک لطف و محبت کی باتیں رہیں۔ اور آخر دونوں ایک دوسرے کی ملاقات سے غفلت ہو کر اپنے اپنے گھر واپس گئے۔ جمیل نے بے انتہا کوشش کی تھی کہ کوئی ایسی بات نہ ہو جس سے اسکا راز عشق دوسروں پر ظاہر ہو جائے۔ لیکن عشق بھلا پھینے والی چیز ہے، اُن تمام لوگوں اور لوگوں پر جو اس محبت میں شریک تھے راز فاش ہو گیا جس کو خود جمیل نے محسوس کر کے اپنے نئے اشعار میں ظاہر کیا اور بصد حسرت و یاس کہا کہ ”ہاے! اب پھر پارسا عید ہی میں ملنا ہوگا“

ان اشعار نے راز عشق کو اور طشت از بام کر دیا۔ اہل قبیلہ نے بٹینہ سے کہا کہ خیر دار پھر کبھی اس خیریر شخص سے نہ ملنا، مگر اُس کے تو دل کو ملی ہوئی تھی قسم کھا گئی

کہ چاہے کچھ ہو میں تو جمیل سے ضرور ملونگی۔ اور جب سنون کی کہ دروازے پر آیا ہوا تھا اور
 باہر نکل آؤں گی۔“ بٹینہ کی اس قسم کا حال جمیل کو معلوم ہوا تو بار بار قبیلہ کے پڑاؤ کے
 آس پاس منڈلانے اور ٹاوسے بھرنے لگا۔ کسی نہ کسی ذریعہ سے اسے اپنے آنے کی خبر کر دیتا
 وہ بھی کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے گھر سے نکل کے آتی۔ دونوں ایک دوسرے کے دیدار سے
 خوش ہوتے جیتا کہ موقع پاتے بیٹھ کے باتیں کرتے اور رخصت ہونے کے اپنے مقام میں چلے جاتے
 ان خبروں کو سن سن کے بٹینہ کے اعزہ و انتون سے انگلیان کاٹتے۔ مارے
 غیرت کے زمین میں گرے جاتے۔ اور مشتعل ہو ہو کے انتقام کے درپے ہوتے۔ یہاں تک
 فوجیت پہنچی کہ سب اس تارک میں تھے کہ کسی جگہ دونوں کو باتیں کرتے دیکھیں اور تلواریں
 مار کے وہیں ختم کر دیں۔ اتفاقاً ایک دن انھیں خبر لگ گئی کہ آج جمیل بٹینہ سے ملنے
 کو آئے والا ہے فوراً دس بارہ آدمی تلواریں باندھ باندھ کے گھٹیوں میں چھپ رہے۔ اب
 اوہر سے بٹینہ اور اسکی بہن ام الحسین گھر سے نکل کے ایک وادی میں پہنچیں۔ اُدھر سے
 جمیل ایک تازہ دم اور صبار رفتار سائڈنی پر سوار آیا۔ اور معشوقہ سے مل کے جوش دل کو
 ظاہر کرنے لگا جس طرح بھولوں میں بیٹھ کے چمکتا ہو ویسے ہی آپ نے بٹینہ کا رخ
 زریا دیکھتے ہی غول خوانی شروع کر دی۔ اور شکوہ و شکایت کا دفتر کھل گیا۔ اپنے اشعار
 خوب گا گا کے سنائے۔ اور آخر ایک شعر سنایا جس کا مطلب یہ تھا کہ ”امو بٹینہ تیرے قبیلہ کے
 جن مردوں نے میرے مار ڈالنے کی نیت کی ہے اور میرا خون حلال کر لیا ہے ہر کس و ہر کس سے
 (اور مار ڈالے گا)“ یہ شعر پڑھا ہی تھا کہ ایک جانب سے وہ لوگ تلواریں کھینچے ہوئے
 نمودار ہوئے۔ لڑکیوں کے نازک کلیجے دہل گئے۔ مگر جمیل نے ان سے پھر ملنے کا وعدہ کیا
 اور جھٹ پٹ سائڈنی پر سوار ہو کے بھاگا۔ اونٹنی ایسی تیز تھی کہ دشمنوں کے مجمع میں سے
 ہو کے نکل گئی اور کسی نے اسکی گرد بھی نہ پائی۔

اس واقعہ کو چند ہی روز ہوئے تھے کہ ایک دن ایک اعرابی بٹینہ کے قبیلہ میں آیا
 اور لوگوں سے کہتا تھا کہ پڑاؤ کے قریب ہی پہاڑیوں میں میں نے تین شخصوں کو دیکھا
 جو معلوم ہوتا ہے کسی گھات میں ہیں۔ غالباً ڈکیتی کرنے کے۔ تم لوگوں کو ہوشیار رہنا چاہیے
 قبیلہ والوں نے ان لوگوں کے قتلے اور ان کی وضع پوچھی اور اعرابی کے بیان سے
 سمجھ گئے کہ نہ کوئی ڈاکو ہے نہ کوئی چور بلکہ میان جمیل ہیں جو غالباً بٹینہ سے ملنے کو آئے ہیں

اور ساتھ ہی خیال آیا کہ معلوم ہوتا ہے بٹینہ سے آج ملنے کا وعدہ ہے۔ اسلئے کوشش کرنی چاہیے کہ وہ آج گھر سے باہر نہ جانے پائے۔ فوراً بٹینہ کا خیمہ گھیر لیا۔ اور وہ غریب رات بھر اپنے خیمہ میں قید رہی۔ جمیل نے گھاٹیوں میں رات بھر نہایت ہی مینابی و مقناری سے انتظار کیا۔ اور صبح کو ناکام و نامراد اپنے آپ کو کوستا اور معشوقہ شیرین ادا پر بدگمانی کرتا ہوا واپس گیا کہ معلوم ہوتا ہے اُسے عہد وفا کو توڑ دیا پھٹتا ہوا گھر پہنچا تو وہاں کی بعض شہریر لڑکیوں نے جنھیں اس ناکامی کی خبر ہو گئی تھی بنانا شروع کیا کہ ”واہ۔ اچھی لڑکی پر مرتے ہیں جسے ان کی محبت کی پرواہی نہیں۔ اسی بے وفا پر مرتے تھیں شرم نہیں آتی؟“ اصل یہ ہے کہ جمیل کے قبیلہ والے چاہتے تھے کہ اُس کے دل کو بٹینہ سے نفرت ہو جائے اور اکثر لڑکیاں چاہتیں کہ بجائے بٹینہ کے اُسے اپنا شید ا بنالین۔ ان کی یہ طعن و تشنیع کی باتیں سُن کے جمیل نے چند شعر سنائے جن میں سے آخری شعر کا مطلب یہ تھا کہ ”جس سے محبت ہو اُس کے جھوٹ اور اسکی بے وفائی میں بھی مزہ ہے۔“

اس کے بعد ایک مدت تک دونوں میں فراق رہا۔ لیکن گو کہ جمیل کو کوئی جاناں میں جانا دشوار نظر آتا تھا۔ مگر شوقِ دل لے ہی گیا۔ دونوں میں وقت مقرر ہو گیا۔ اور سوادِ قبیلہ کے پہاڑوں کی ایک محفوظ گھونگھٹ میں عاشق و معشوق ایک دوسرے سے ملے۔ مگر بٹینہ کی ایک لونڈی کو خبر ہو گئی جو کسی بات پر جلی ہوئی تھی۔ فوراً جا کے اُسکے باپ اور بھائی کو خبر کر دی۔ اسی قدر نہیں خود اُن کے سروں پر لے جا کے کھڑا کر دیا۔ دونوں نے طیش میں آ کر تلواریں کھینچ لیں۔ اور دم سادھ کے آڑ میں کھڑے ہو گئے کہ اُن کی بے عصمتی و بے حیائی کی چند باتیں سُن لین تو حہ کرین۔ اتفاقاً جمیل نے آج ہمیشہ کے خلاف ولد ارناؤ فرین سے کہا ”بٹینہ! تم میری آہ دزاری سنتی اور میری مینابی و مقناری کو دیکھتی ہو مگر اس محبت کی قدر نہیں کرتیں؟“ بٹینہ نے کہا ”آخر کیا کروں؟ اور تمھاری محبت کی کیا قدر کروں؟“ بولا ”جس طرح عورتیں مردوں کی محبت کی قدر کر کے اُن کی آرزو پوری کیا کرتی ہیں“ یہ جواب سنتے ہی بٹینہ چونک سی پڑی۔ حیرت زدہ و بہوت ہو کے جمیل کی صورت دیکھی اور بولی ”تمھاری محبت کی یہی غرض ہے؟ مگر میرے دل میں تمھاری طرف سے خدا کی قسم کبھی ایسا خیال بھی نہیں گزرا تھا۔ میں ایک شریف عرب کی بی بی ہوں۔ اور گناہ سے ڈرتی ہوں۔ اگر پھر کبھی تمھاری زبان سے یہ کلمات نکلے تو یاد

رکھنا کہ زندگی میں پھر میری صورت نہ دیکھو گے۔ یہ جواب سن کے جمیل کا چہرہ خوشی سے
 چمک اٹھا۔ مسکرایا اور کہا ”بٹینہ! میں نے یہ فقط تمہارا امتحان کرنے کیلئے کہا تھا۔ اور سچ تو یہ ہے
 کہ اگر تم میری آرزو پوری کرنے کی ذرا بھی حامی بھر تین تو میرا دل ٹوٹ جاتا۔ دل میں کہتا
 کہ ایسی معشوقہ مجھے نہیں چاہیے۔ اور تلوار کھنچ کے تمہارا سر اڑا دیتا۔ لیکن اگر اسکا موقع
 نہ ملتا تو تمہیں چھوڑ کے چلا جاتا اور پھر کبھی نہ ملتا۔ میری محبت بھی تمہاری طرح پاک ہے جس کو
 اکثر اپنے اشعار میں ظاہر کر چکا ہوں۔ یہ کہہ کے اسی مضمون کے چند اشعار سنائے۔ یہ گفتگو
 سنتے ہی باپ نے تلوار میان میں کر لی۔ اور بیٹے سے کہا ”چلو گھر پلٹ چلیں۔ اب ہمیں ضرورت
 نہیں کہ ایسے پاکباز عاشق کے عشق میں مزاحم ہوں۔ یا بٹینہ کو اُس کے پاس جانے سے
 روکیں۔“ بیٹے نے بھی باپ کے خیال سے اتفاق کیا۔ اور دونوں واپس گئے۔ اور
 عاشق و معشوق نے اپنی صحبت و صل بے غل و غش پوری کی۔

لیکن اس پر بھی اہل قبیلہ کے کہنے سننے سے اور نیز تمام قبائل عرب میں بدنام
 ہونے کے اندیشہ سے پھر بٹینہ کو روکا۔ اور اس کو گوارا نہ کر سکے کہ جمیل آزادی کے ساتھ
 آ کے اُن کی لڑکی سے ملا کرے۔ مگر بٹینہ کے دل کو خود ہی ایسا لگاؤ ہو گیا تھا کہ ہزار روک
 اور بندش ہو وہ جب سنتی کہ جمیل پاس کی پہاڑیوں میں آیا ہے کوئی نہ کوئی جتن کر کے
 پہنچ جاتی۔ اور مل آتی۔ چنانچہ ایک دن جمیل نے کسی شخص سے کہا دو بھلا تم میری اتنی
 رو کر دو گے کہ مجھے بٹینہ سے ملا دو؟“ اُس نے کہا ”اچھا، پھر اسے ساتھ لے جا کے خاندان
 ٹینہ کے پڑاؤ کے پاس کی پہاڑیوں میں چھپا دیا۔ اور اُس کی انگوٹھی لے جا کے چپکے سے
 مینہ کے چرواہے کو دی۔ اور کچھ دے دلا کے کہا تم اس انگوٹھی کو بٹینہ تک پہنچا دو۔
 سے فلاں مقام کا پتہ دے دو۔ اور اس سے وعدہ لے آؤ،“ بٹینہ انگوٹھی دیکھتے ہی
 رے خوشی کے آپے سے باہر ہو گئی۔ چرواہے کا شکریہ ادا کیا اور رات کو آئے کا وعدہ
 با۔ چنانچہ رات کو جیسے ہی قبیلہ کے سب لوگ سو گئے وہ چپکے سے دبے پاؤں اٹھ کے
 اڑوں میں آئی۔ بڑے ذوق و شوق سے ملی۔ رات بھر یہ صحبت عیش گرم رہی جمیل کمال
 مانی کے ساتھ اپنے اشعار سناتا رہا اور صبح ہوتے ہی خست ہو کے بٹینہ اپنے خیمے میں
 گئی۔ اور جمیل نے اپنے قبیلہ کا راستہ لیا۔

(باقی پھر)

ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ

۱۲۵۶ء محمدی (۱۸۲۷ء) میں غازی الدین حیدر کے بیٹے نصیر الدین حیدر تخت پر بیٹھے۔ غازی الدین حیدر کے زمانے سے جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں فرمان روایان اودھ نواب نہیں بادشاہ تھے۔ اس دولت کا آغاز وزارت دہلی کے درجے سے ہوا تھا۔ اور اگلے زبردست و ذی وقعت فرمان رواں نواب وزیر کھلاتے تھے۔ لیکن اب جبکہ اصلی حکومت وسطوتِ خصمت ہو چکی تھی اور ہندوستان کے پانگلس میں ان لوگوں کا بالکل اثر نہیں باقی رہا تھا یہ بادشاہ بن گئے۔

خیال کیا جاسکتا ہو کہ انگریزوں نے حکمرانان اودھ کو بادشاہی عزت دی تو اپنی پشت پناہی سے ان کی سطوت بھی بڑھا دی ہوگی۔ اور انھیں نام ہی کا بادشاہ نہیں بلکہ حقیقتہً بادشاہ بنا کے دکھادیا ہوگا۔ لیکن نہیں ہمیں نظریہ آتا ہو کہ اس عہد میں اودھ سے باہر ان لوگوں کا اثر تو بالکل تھا ہی نہیں۔ خود انہی قلمرو میں بھی یہ اتنے آواز نہ تھے جتنے کہ ان کے مابین بزرگ ہوتے آئے تھے۔ اب کسی کی تخت نشینی بغیر انگریزوں کی منظوری کے ہو ہی نہ سکتی تھی۔ انگریزی فوج ساری قلمرو میں جا بجا پھیلی ہوئی تھی۔ کوئی اہم معاملہ بغیر صاحب رزیدنٹ کی دخل دہی کے طے ہی نہ ہو سکتا تھا۔ سریر شہر یاری ایک ایسیج تھا جسپر جو کچھ ہوتا یہ ظاہر نظر آتا کہ ایکٹر کر ہے ہیں مگر اصل میں وہ افعال کسی اور شخص کے قبضہ قدرت میں تھے جو بردے کی آرٹ میں تھا اور جو چاہتا تھا کرتا تھا۔

مگر خدا کی اتنی مہربانی تھی کہ ان پچھلے حکمرانان اودھ کی اور انکے ساتھ قریب قریب سارے دستگان دامن دولت کی جس مفقود ہو گئی تھی جس کی بدولت وہ اپنی کمزوری و بے دست و پائی کو بالکل محسوس نہ کر سکتے تھے۔ غازی الدین حیدر بادشاہ بننے ہی عیش و عشرت میں مشغول ہو گئے۔ اور نصیر الدین حیدر کو تو تخت شاہی و رتہ میں ملا تھا۔ نواب سعادت علی خان کا جمع کیا ہوا روپیہ عیش پرستی میں و دونوں کا مدد معاون ہوا۔ کچھ انگریزوں کو قرض دیا گیا کچھ ان بدستہ مذہبی رسموں کی بجا آوری میں صرف ہوا جنہیں بادشاہ اور ان کی ملکاؤں نے اپنے مذاق کے موافق ذوق و شوق سے ایجاد کیا۔ اور باقی فضول خرچیوں اور عیاشیوں کی نذر ہونے لگا۔ غازی الدین حیدر نے تو اتنا بھی کیا تھا کہ نجف اشرف کی

نقل ہوا کہ اپنی قبر کا ٹکھا ناکر لیا۔ اور بغیر اس کے کہ اپنے درشہ پر بھروسہ کریں کچھ روپیہ انگریزوں کے حوالے کیا کہ اُسکے سود سے پورے دینی آداب کے ساتھ نجف کی دعاغت کیا کریں چنانچہ آج تک اُن کی قبر پر ہمیشہ چراغ روشن ہوتا ہے مجلسین ہوتی ہیں۔ قرآن خوانی ہوتی ہے۔ اور محرم میں خوب روشنی ہوتی ہے جس کی طفیل تھوڑے سے غریبوں کی پرورش ہو جایا کرتی ہے۔ گر نصیر الدین حیدر کو جو جمعیہ میں اتنی بھی توفیق نہ ہوئی۔ دریا پار محلہ اداوت نگر میں انھوں نے ایک کمرہ بنوائی جو خود انھما مرتد قرار پانے والی تھی مگر اس کی خدمت وداشت کی ذرا بھی فکر نہیں کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج وہ ڈالی گنج کے اسٹیشن کے پاس اجاڑ اور خاموش پڑی ہے اور شاید کوئی چراغ جلائیو لا بھی نہیں۔ اُنکے زمانے میں نئے محلے گینش گنج اور چاند گنج میں دریا پار آباد ہوئے۔

نصیر الدین حیدر کو نجوم سے عقیدت تھی جسے علم ہیئت کی طرف توجہ دلائی۔ اور ارادہ کیا کہ اپنے شہر میں ایک اعلیٰ درجہ کی رصد گاہ قائم کر میں چنانچہ اسی غرض کیلئے ایک کوٹھی نواب سعادت علی خان کے مقبرے اور موتی محل کے درمیان میں تعمیر کرائی جو رصد گاہ ہونے کے باعث لکھنؤ میں تارے والی کوٹھی کے نام سے مشہور ہوئی۔ اُس میں بڑی بڑی دوربینیں اور اعلیٰ درجہ کے آلات رصد جمع کیے گئے۔ اُن کے مناسب طور پر قائم کرنے کا کام اور اُن کا انتظام و اہتمام کرنل ولکا کس کے سپرد ہوا جو ایک اچھے ہیئت دان تھے۔ مگر لکھنؤ کی یہ رصد گاہ کرنل صاحب موصوف ہی کی زندگی کا ایک بھول الحال کارنامہ تھی۔ کیونکہ ۱۲۵۶ھ محمدی سے نصیر الدین حیدر کی سلطنت کا آغاز ہوا جسکے چار بیچ سال بعد غالباً یہ رصد گاہ قائم ہوئی ہوگی۔ اور اس وقت سے ۱۲۷۶ھ محمدی ۱۸۶۰ء تک جبکہ آخری تاجدار اودھ واجد علی شاہ کا زمانہ تھا یہ رصد گاہ انھیں کے اہتمام میں رہی۔ سنہ مذکور میں کرنل صاحب کا انتقال ہوا اور انکی جگہ کوئی ہیئت دان اس خدمت پر نہیں مقرر کیا گیا۔ واجد علی شاہ نے اسکی طرف سے بے پروائی کی لکھنؤ کے بعض مستند اشخاص کی زبانی سنا گیا کہ اس کی سب سے بڑی دوربین کو واجد علی شاہ نے ایک کھلونے کیال کر کے حیدری طوائف کے حوالے کر دیا تھا۔ لیکن گزٹیر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رصد گاہ انتزاع سلطنت کے زمانے تک قائم تھی۔ غدر بین غالباً بلوایوں نے اسے تباہ کر دیا۔ کیونکہ احمد شاہ نے (جوڈ نکا شاہ بھی کہلاتے تھے) اور انگریزی فوج

بڑی مستعدی و کوششی کے ساتھ لڑے تھے تاہم والی کوٹھی ہی میں سکونت اختیار کی تھی اسی میں اپنا دربار قائم کیا تھا۔ اور باغی فوجوں کے افسر اکثر زمین جمع ہو کے مشورے کیا کرتے تھے۔

اسی زمانے میں روشن الدولہ نے جو وزیر سلطنت تھے اپنی خوبصورت اور شاندار کوٹھی تعمیر کرائی جس میں فی الحال ڈپٹی کمشنر بہادر اجلاس کرتے ہیں۔ اس لیے کہ واجد علی شاہ نے اس کوٹھی کو قصہ باغ بنواتے وقت ضبط کر لیا تھا۔ اور جب ملک انگریزوں کے قبضہ میں آیا تو یہ کوٹھی ایک سرکاری جائداد تھی۔

نصیر الدین حیدر کا زمانہ سچ یہ ہے کہ نہایت ہی خطرناک زمانہ تھا۔ ایک طرف تو انتظام مملکت کی خرابی تھی بادشاہ کو عیش و عشرت اور اپنی ایجاد کردہ دینداری کی رسوم سے فرصت نہ ملتی تھی۔ سارا نظام سلطنت وزیر پر چھوڑا جاتا تھا۔ اور وزیروں کی یہ حالت تھی کہ کوئی ایسا شخص ملتا ہی نہ تھا جو نیک نیتی اور خوش تدبیری سے کام چلا سکے حکیم ہمدی بائے گئے وہ منتظم تو اعلیٰ درجہ کے تھے مگر جانتے تھے سلطنت کو اپنی ہی سیرا بنالین۔ روشن الدولہ وزیر ہوئے ان میں نہ مادہ تھا نہ طبیعت داری ان سے کچھ کرتے دھرتے نہ بنی۔ بادشاہ کی فضول خرچیوں کی یہ حالت تھی کہ سعادت علی خان کا جمع کیا ہوا سارا روپیہ پانی کی طرح اڑ گیا۔ اور ملک کی آمدنی محل کے مصارف کے لیے کفایت ہی نہ کرتی تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ بادشاہ اور ان کی مان لینی نمازی الدین حیدر کی خاص محل میں جھگڑے پیدا ہوئے۔ وہ مناجان کو بادشاہ کا بیٹا بتاتی تھیں اور بادشاہ اس کو اپنا بیٹا تسلیم نہ کرتے تھے۔ ان باتوں نے ملک کی ایسی حالت کر دی تھی کہ معلوم ہوتا حکمرانوں میں حکومت کرنے اور ملک کے سنبھالنے کی مطلق صلاحیت نہیں ہے۔

صاحب ریڈنٹ اور گورنر جنرل ہند نے بار بار سمجھایا۔ طورایا۔ دھمکایا۔ انجام سے مطلع کیا۔ اور برابر کان کھولتے رہے مگر یہاں کسی کے کان پر جون نہ رینگی نصیر الدین حیدرین عدل میں رہتے رہتے اس درجہ زمانہ مزاجی پیدا ہوئی تھی کہ عورتوں کی سہی باتیں کرتے اور عورتوں ہی کا سالباہس پہنتے۔ زمانہ مزاجی کے ساتھ مذہبی عقیدت نے یہ شان پیدا کر دی کہ امہ اثنا عشر کی فرضی بی بی (اچھوتیان) اور ان کی ولادت کی تقریبیں جو ان کی مان نے قائم کی تھیں ان کو اور زیادہ ترقی دے دی۔ یہاں تک کہ ولادت امہ کی

تقریباً بیون میں خود حاملہ عورت بن کے زچہ منائے میں بیٹھے۔ چہرے اور حرکات سے وضع حل کی تکلیف ظاہر کرتے۔ اور پھر خود ایک فرضی بچہ جنتے جس کے لیے ولادت چھٹی اور نہان کے سامان بالکل اصل کے مطابق کیے جاتے۔ یہ تقریبیں استقرز زیادہ تھیں کہ سال بھر بادشاہ کو انھیں سے فرصت نہ ملتی سلطنت کی طرف کون توجہ کرتا۔

دربار اودھ اور سرکار انگریزی کے تعلقات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر گورنر جنرل اور ریڈیٹنوں کی نظر عنایت نہ ہوتی۔ اور انگلستان کا جو بورڈ ایسٹ انڈیا کمپنی کا مگر ان تھا کمپنی کو روکے تھامے نہ رہتا تو ان ترافع سلطنت کی کارروائی اسی زمانے میں ہو گئی ہوتی۔ مگر اس طفلانہ مزاجی کے دربار کی زندگی ابھی باقی تھی انگریز ملک کے لیے اس کا اودھ کر کر کے رہ گئے۔

نصیر الدین حیدر کی نسبت لکھنؤ کے پرانے معتبر لوگوں کا بیان ہے کہ اس زمانہ مزاجی اور ان طفلانہ حرکتوں کے ساتھ نہایت ہی ظالم بھی تھے۔ لیکن چونکہ ساری زندگی عورتوں میں بسر ہوتی تھی اس لیے ان کے مظالم کا شمار بھی زیادہ تر عورتوں ہی ہوتا ہے۔ بیسیوں عورتوں کو ادنیٰ قصور اور معمولی بدگمانی پر دیواروں میں چنوا دیا۔ کہتے ہیں کہ راہ چلتے کسی مرد کو کسی عورت کے سینہ پر ہاتھ رکھے دیکھ لیا تھا فوراً عورت کی چھاتیان اور مرد کے ہاتھ کٹوا ڈالے۔

آخر دس برس کی بے اعتدالیوں کے بعد جبکہ اندر باہر تمام اہل دربار زندگی سے عاجز آ گئے تھے بادشاہ خود اپنے دوستوں اور عزیزوں کے ہاتھ کا شکار بنے ماو کی نے زہر دے کے ۱۲۶۶ء (۱۳۱۷ء) میں قصہ تمام کر دیا۔ نصیر الدین لاو لد مرے تھے مناجان جنھیں غازی الدین حیدر کی بادشاہ بیگم نے ہمیشہ اپنا پوتا اور سچا وارث سلطنت بنا کے پیش کیا مگر غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر دونوں نے ان کے نسل شاہی ہونے سے انکار کیا تھا جس کی بنا پر گورنمنٹ انگریزی نے نواب سعادت علی خان مرحوم کے بیٹے نصیر الدولہ مرزا محمد علی خان کی تخت نشینی کا پہلے سے بندوبست کر لیا تھا۔ مگر بیگم صاحبہ نے نہ مانا مناجان کو لے کے لال بارہ درہی یعنی تخت گاہ میں آ گئیں۔ ریڈیٹ نے ہزار روکا اور سمجھایا مگر ایک نہ سنی اور زبردستی مناجان کو تخت پر بٹھادیا جنھوں نے تخت پر قدم رکھتے ہی نذیرین لین۔ اور اپنے دشمنوں سے فوراً بدلہ لینا چاہی۔

شروع کر دیا۔ بتوں کے گھر لٹوائے بعض کو گرفتار کیا۔ بعض قتل ہوئے۔ اور شہر میں ایک ہڑبونگ مچ گیا۔

صاحب رزیڈنٹ اور اُن کے اسٹنٹ فوراً دربار میں پہنچے۔ بادشاہ بیگم کو سمجھایا کہ مناجان وارث سلطنت نہیں ہو سکتے۔ اور اس میں آپ کو ہرگز کامیابی نہ ہوگی۔ پھر لاٹ صاحب کا تحریری فرمان دکھایا اور کہا بہتر یہی ہے کہ مناجان تخت کو خالی کر دیں۔ اور نصیر الدولہ کی تخت نشینی عمل میں آجائے۔ مگر کسی نے سماعت نہ کی۔ بلکہ کسی نے اسٹنٹ رزیڈنٹ پر حملہ کیا جس سے اُن کا چہرہ خون آلود ہو گیا۔ رزیڈنٹ نے منڈیاؤں سے انگریزی فوج پہلے ہی سے بلوالی تھی جس نے تنگناہ کے سامنے توپیں لگا دی تھیں اور سپاہی صفیں باندھے کھڑے تھے۔ مجبوراً صاحب عایشان نے گھڑی ہاتھ میں لی اور کہا دس منٹ کی ہمت دی جاتی ہے اس زمانے کے اندر اگر مناجان تخت سے نہ اتر گئے تو جبریہ کارروائی کی جائے گی۔ اس کا بھی کسی نے خیال نہ کیا حال آنکہ رزیڈنٹ بار بار کہتے جاتے تھے کہ اب باغ منٹ باقی ہیں۔ اب دو ہی منٹ رہ گئے۔ اور اب دیکھیے پورا ایک منٹ بھی نہیں۔

ان تنبیہوں کا کسی نے خیال نہ کیا اور یکایک توپوں نے گراہیں مارنا شروع کیں۔ آٹافانائین تیس چالیس آدمی گر گئے۔ درباری بدحواسی کے ساتھ گرتے پڑتے بھاگے۔ جو طائفہ جبریہ کر رہا تھا اس میں سے بھی کئی آدمی زخمی ہوئے۔ خیشہ آلات بھنا بھن ٹوٹ ٹوٹ کے گرنے لگے۔ جب کئی وفادار بہادر جو سینہ سپر تھے مارے جا چکے تو مناجان نے بھی تخت پر سے گر کے بھاگنے کا قصد کیا مگر پکڑ لیے گئے۔ غرض بیگم صاحبہ اور انہیں دونوں کو انگریزوں نے گرفتار کر لیا۔ ساتھ ہی نصیر الدولہ کی تخت نشینی عمل میں آئی جو محمد علی شاہ کے لقب سے بادشاہ اودھ قرار پائے۔ اور مناجان اور اُن کی دادی سخت حراست میں لکھنؤ سے کانپور اور کانپور سے قلعہ چنار گدھ میں بھیج دیے گئے۔ اور دو جزائر چارمورویہ باہوار اُن کی تنخواہ لکھنؤ کے خزانے سے مقرر کر دی گئی۔

محمد علی شاہ کی عمر تخت نشینی کے وقت ۶۲ برس کی تھی۔ بوڑھے تجربہ کار تھے زمانے کے گرم و سرد اور دربار کی طفلانہ مزاجیان دیکھتے رہے تھے۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ نواب سعادت علی خان کے بیٹے تھے اور اُن کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے۔ انھوں نے بہت سنبھل کے کام کیا۔ کفایت شعاری کے اصول جاری کئے۔ اور جہاں تک بنا نظام کے بنھانے کی کوشش کی۔ مگر عمر زیادہ آچکی تھی۔ اور قومی جواب دیتے جاتے تھے۔ تخت پر بیٹھتے ہی انھوں نے حکیم مہدی کو فرخ آباد سے بلوا کے خلعت وزارت دیا۔ مگر چند ہی روز بعد وہ مر گئے۔ کتب نظیر الدولہ کو خلعت وزارت ہوا۔ دو تین مہینہ بعد وہ بھی دنیا سے نصبت ہوئے۔ اور منور الدولہ وزیر قرار پائے۔ جنھوں نے دو چار مہینہ کے بعد ہی استعفا دے دیا اور کڑھٹا سے محلے چلے گئے۔ پھر خرف الدولہ محمد ابراہیم خان وزیر قرار پائے جو اوروں کے دیکھتے ذی ہوش اور متین تھے۔

محمد علی شاہ کی تخت نشینی پر گورنمنٹ انگریزی اور سلطنت اودھ میں ایک نیا معاہدہ ہوا جس کی رو سے سرکار انگریزی نے جو فوج اودھ کی نگرانی کے لیے رکھی تھی اُس میں معتد بہ اضافہ ہوا۔ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی گورنمنٹ کو یہ اختیار حاصل ہوا کہ ساری قلمرو اودھ یا اُس کے جس علاقے میں بد نظمی دیکھے اُسے جتنک چاہے اپنے زیر انتظام رکھے۔ بادشاہ نے ناگواری کے ساتھ اس عہد نامے پر دستخط کئے اور جہاں تک بنا ملک کی اصلاح کرنے لگے۔

تخت نشینی کے دو برس ہی برس انھوں نے اپنا مشہور امام بارگاہ حسین آباد اور اُس کے قریب ایک عالیشان مسجد تعمیر کرانا شروع کی جس کی بابت اہتمام کیا گیا کہ دہلی کی جامع مسجد سے رونق و وسعت میں بڑھ جائے۔

اُن دنوں لکھنؤ کی آبادی درویش اس قدر ترقی کر گئی تھی۔ اور اس کثرت سے آدمی اُس کی سوا دین آباد تھے کہ اُسے ہندوستان کا بابل کہنا بجا نہ تھا واقعی یہ شہر ہر حیثیت سے اُس عہد کا زندہ بابل تھا۔

اس شاہ بہت کوشاں انگریزوں یا کسی درباری سے سن کے محمد علی شاہ نے ارادہ کیا کہ لکھنؤ کو پورا پورا بابل بنا دیں۔ اور اپنی ایک ایسی یادگار قائم کر دیں

جو اُن کے نام کو تمام شاہان اودھ سے زیادہ بلندی پر دکھائے۔ انھوں نے بابل کے مینار یا دیوان کے ہوائی باغ کی طرح کی ایک عمارت حسین آباد کے قریب اور موجودہ گھنٹہ گھر کے مقام پر تعمیر کرانا شروع کی جس میں عمرا یون کی مذکور حلقہ پر دوسرا حلقہ اور دوسرے حلقہ پر تیسرا حلقہ - غرض یونین تلو اور پر قائم ہوتے چلے جاتے تھے۔ ارادہ تھا کہ یونین سات منزلوں تک اُسے بلند کر کے ایک اتنا بڑا اور اونچا برج بنا دیا جائے جو دنیا بھر میں لاجواب ہو۔ اور اُس کے اوپر سے سارے لکھنؤ اور اُس کے گرد کی فضا نظر آئے۔ یہ عمارت اگر پوری بن جاتی تو یقیناً لاجواب اور عجیب و غریب ہوتی۔ اس کا نام ”سٹیکھنڈا“ قرار دیا گیا تھا۔ اور بڑے اہتمام سے بن رہی تھی۔ مگر پانچ ہی منزلین بننے پائی تھیں کہ محمد علی شاہ نے سالہ محمدی (۱۲۴۲ھ) میں سفر آخرت کیا۔

محمد علی شاہ نے اپنے مختصر زمانے میں بغیر اس کے کہ اندرونی بھگڑے پیدا ہوں یا ملک میں بد نظمی کی فریاد بلند ہو لکھنؤ کو نہایت ہی خوبصورت شہر بنا دیا۔ حسین آباد کے پچھلک سے رومی دروازے تک دریا کنارے کنارے ایک سڑک نکالی۔ جو چوک کھلاتی تھی۔ اس سڑک پر باوجود دو طرفہ عالیشان مکانات کے ایک طرف رومی دروازہ آصف الدولہ کا امام بارگاہ اور اُس کی مسجد تھی۔ دوسری طرف سٹیکھنڈا اور حسین آباد کا پچھلک تھا۔ اس نئے امام بارگاہ کی مختلف سربلک عمارتیں تھیں اور اُن کے پہلو میں جامع مسجد واقع تھی۔ ان سب عمارتوں نے مل کے دونوں جانب ایک ایسا خوشنما اور نظر فریب منظر پیدا کر دیا تھا جو دنیا کے تمام مشہور و خوش سواد مناظر پر چشمک زنی کرتا تھا۔ اور اب بھی گو کہ درمیان میں باشندگان شہر کے جتنے مکانات واقع تھے سب کھٹ گئے مگر دنیا کا ایک بہترین منظر تصور کیا جاتا ہے۔

خلفاء نبی امیہ کا ادبی مذاق

خالص عربی مذاق کو قائم رکھ کے جیسی شاندار سی دکر و فر کے کرشمے نبی امیہ کے خلفائے دکھائے اور کوئی اسلامی سلطنت نہیں دکھا سکی ہو۔ اور یہی سبب تھا کہ اصلی عربی لٹریچر اور ادبی علم و فضل کا جتنا بڑا مرکز ملک ہسپانیہ بن گئی تھی بغداد کی عباسی خلافت بھی نہ تھی۔ خلافت بغداد کی قلمرو بے شک بڑی تھی اور اس کا دربار بھی زیادہ پُرسطوت و جبروت نظر آتا ہے لیکن بغداد کے خلفائے اپنے علمی ذوق میں جو کچھ کیا یہ تھا کہ دیگر زبانوں کے علوم کثرت سے عربی میں نقل کر لیے۔ اسکے سوا اور تمام باتوں میں ساسانی مذاق اور ایرانی معاشرت کا اُن پر اس قدر اثر پڑ گیا تھا کہ اُن میں نہ عربی وضع قطع ہی باقی رہی تھی نہ عربی سخن نبی۔ نہ عربی سادگی معاشرت باقی تھی نہ عربی آزادی و حریت اب اُن میں نہ وہ انکلا عربی لٹریچر تھا نہ وہ عرب الفربا کی پُرانی پُر جو ش و دولہ نیز شاعری۔ ہر چیز میں عجمیت کی بو آ رہی تھی۔ اور بعض یورپین مؤرخین کا کہنا بالکل بجا ہو کہ دربار خلافت کا بغداد میں قائم ہونا عربی سطوت کا بڑھنا نہ تھا بلکہ دراصل عربیت پر عجمیت کی ایک زبردست فتح تھی۔

یہ خلافت عباسیوں کے نبی امیہ کے دربار ابتدا سے آخر تک جہاں رہے خالص عربیت کے رنگ میں ڈوبے رہے۔ اور اسی وجہ سے اُن کے عہد میں عربی زبان اور عربی لٹریچر نے بڑی ترقیاں حاصل کیں۔ دمشق میں خلفای نبی امیہ اگرچہ سطوت قیصری سے بڑھ کے شان و شوکت دکھا رہے تھے اور عیش و عشرت کے سامانوں میں گھرے ہوئے تھے مگر اپنے مذاق عربیت کے قائم رکھنے کا یہاں تک اہتمام تھا کہ شاہزادے اور اعیان خلافت کے فرزند بچپن سے صحراے عرب میں بھیج دیے جاتے تاکہ قدیم قبائل عرب میں رہ کے عربی فصیح و خالص زبان کے ساتھ عربی خصائل و عادات کو سیکھیں اور بدوی شجاعت سے نا آشنا نہ ہونے پائیں۔ مگر نبی عباس کے زمانے میں یہ طریقہ تعلیم منقود ہو گیا تھا۔

غالباً کہا جائے گا کہ اُن خلفاء کے عہد تک عرب لوگ غیر قوموں کے مذاق و معاشرت سے آشنا نہیں ہونے پائے تھے اسلئے کہ وہ فتوحات عرب کا ابتدائی زمانہ تھا۔ لیکن نہیں بنی اُسیہ اندلس نے بھی جو بنی عباس کے معاصر اور پورے رقبہ تھے سرزمین اندلس میں پہنچنے کے بعد جو جزیرہ نماے عرب سے ہزار ہا کوس کی مسافت پر تھی اپنے عربی مذاق کو نہیں چھوڑا تھا۔

یہ دیکھ کے نہایت حیرت معلوم ہوتی ہے کہ گاتھ لوگوں کی سرزمین پر اور مسیحیت کے آغوش میں جہاں ایک طرف فرانسیسی واطینی معاشرت بھی اور دوسری طرف صحرائی و افریقہ کی رومی آئینہ ویت چند خانہ بدوش عربوں نے پہنچ کے ایک ایسی زبردست سوسائٹی قائم کر لی جس کا مذاق خالص عربی تھا۔ اور جس کا لٹریچر عربی ادب کا ایسا اعلیٰ نمونہ تھا جو کسی یورپی اثر سے مفسوش نہ تھا۔ وہاں ان پر نہ شارلمین کے دربار کا اثر پڑا نہ رومیوں کے علم و فضل کا۔ نہ گاتھک معاشرت نے اُن کی عادات و اطوار کو بگاڑا نہ یونانی علوم نے ان کی سادگی و مذاق و سادگی عقاید میں تفرقہ ڈالا۔ وہ خالص عرب تھے اور صدیاں گزرنے کے بعد بھی خالص عرب رہے بلکہ اگر غور سے دیکھیے تو اُن کا مذاق سخن مصر و شام اور عراق و عرب کے شعرا کے مذاق سے اچھا اور سچا تھا۔

اندلس میں عربی ادب و شاعری کا سب سے بڑا قدردان خلیفہ الحکم المستنصر بالمد تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ خود بہت بڑا عالم و ادیب تھا۔ اور تصنیف و تالیف اور کتب بینی میں جیسا انماک اُس کو تھا شاید دنیا کے کسی بادشاہ میں نہ دیکھا گیا ہو گا۔ اُس کا باپ مشہور خلیفہ اندلس عبد الرحمن ثالث الناصر لدین اللہ اگرچہ اپنی پچاس سال سے زیادہ زمانے کی حکومت میں ہمیشہ فتوحات اور فوج کشیوں میں مصروف رہا۔ لیکن اس پر بھی اسپین میں اس کی قدردانی سے بڑے بڑے گران پایہ فاضلون کا جمع ہو گیا تھا۔ خلف بن ابوبکر بن فرج کی شاعری کی ساری عربی دنیا میں دھوم تھی۔ اور اس کی نظموں اعلیٰ محفلوں میں راجحین ولی عہد خلافت

الحکم شاہی قصر مروان، میں منعقد کیا کرتا تھا اور جن میں تمام علما و فضلاء کی ملک جمع ہوتے تھے (نہایت ذوق و محویت کے ساتھ سُنی اور سُنائی جاتی تھیں۔ اسی قسم کی ایک صحبت وزیرِ سلطنت عبداللہ بن یحییٰ بن ادریس کے گھر پر بھی اکثر مرتب ہوا کرتی اور ابن فرج اور دیگر مشہور شعرا کے اشعارِ لطف کے ساتھ پڑھے جاتے۔ ابوبکر اسماعیل بن بدر بھی اُس زمانے کا ایک فاضل گران پایہ تھا جس کی خلیفۃ الناصر بڑی قدر و منزلت کرتا۔ جس کے اشعار پر بادشاہ نے شعر کے تھے۔ ایک اور گران پایہ صاحبِ علم و فضل سلیمان بن عبدالغافر الفریسی تھا۔ یہ عالم ہونے کے ساتھ ایک زبردست سپہ سالار بھی تھا۔ بڑے بڑے میدانون میں فتح کے جھنڈے اُڑا چکا تھا مگر اب دینا سے علیحدہ ہو کے لذات و نیوی سے کنارہ کش ہو گیا تھا۔ بہت ہی سادی زندگی بسر کرتا۔ جو تا پنہنا چھوڑ دیا تھا۔ بھیڑوں کی کھال اُس کا لباس تھا۔ اور شب و روز زہد و تقویٰ میں مصروف رہتا۔ اور باوجود اس شان کے اُس سے خلیفۃ الناصر سے اکثر صحبت رہتی۔ جسے اُس پر اس قدر وثوق تھا کہ غرُبا میں اکثر خیرات اُسی کے ہاتھوں سے تقسیم ہوتی۔ اور بہت سے مفلوک الحال خاندانوں کی خبر گیری دوست گیری کا ذریعہ وہی تھا۔ الناصر نے ایک دن برسبیل تذکرہ اُس سے کہا ”مجھے اپنی پچاس سال کی کامیاب اور فہمدیوں کی سلطنت میں صرف چودہ دن ایسے نظر آتے ہیں جن میں پورا اطمینان قلب حاصل تھا“

عبدالرحمن الناصر آخر عمر میں اپنی زندگی مدینۃ الزہراء میں بسر کرتا۔ جس چھوٹی سی خوبصورت بستی کو اُس نے قرطبہ کے پاس آباد کر کے اور اپنی ایک عجوبہ خاص زہراء کے نام سے نامزد کر کے بڑے بڑے خوبصورت قصرون اور عالیشان جامع مسجد سے آراستہ کر دیا تھا۔ یہیں اس کے گرد بڑے بڑے علما و زہاد کا مجمع رہتا۔ اور اُس کی ترک دنیا کی زندگی علمی صحبتوں میں گزرتی۔ ایک بڑا صاحبِ علم مصاحب دالی اشیلیہ ابوبکر اسماعیل بن بدر بن اسماعیل بن زیادہ تھا جو اموی النسل تھا۔ اُس کی نسبت ابن فرج نے اپنی کتاب ”جنات“ میں لکھا ہے کہ خیال آفرینی و سخن سنجی میں

تمام معاصرین سے بڑھا ہوا تھا۔

مرد تو مرد اُن دنوں بہت سی صاحب علم عورتیں الناصر کی متقیانہ صحبت علم میں موجود تھیں جن کے نام دینا سے اسلام میں ہمیشہ مشہور رہیں گے۔ بادشاہ کی اس پاکبازی کی صحبت کو اکثر تحسنہ کا دلکش نغمہ شگفتہ رکھتا۔ محسنہ صاحب علم و فضل تھی اور محل میں بادشاہ کی معتدی یا پیش دستی کی خدمت انجام دیتی۔ فن موسیقی میں کمال رکھتی تھی اور اس کے ساتھ گلا بھی بڑا پیارا پایا تھا۔ دوسری خاتون تھاکشہ بنت احمد بن قاسم تھی جو قرطبہ کی ایک نازک بدن و نازک طبع نازنین تھی۔ اس کی شاعری کی ان دنوں سارے اندلس میں دھوم تھی۔ اس کی نسبت عام خیال تھا کہ بہ اعتبار عصمت و عفت۔ حسن و جمال۔ اور علم و فضل کے سارے ملک میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ تصنیف بنت عبد الراعی بھی اس عہد کی ایک بڑی صاحبہ علم خاتون تھی۔ اُس کے اشعار بین شاعرانہ نازک خیالی کے ساتھ ایسی عالمانہ متانت و بلند پروازی تھی کہ خلیفۃ الناصر کو نہایت ہی لطف آتا۔ اسی درجہ کی ایک قابل کینز نا ترا امید یا تھی (غالباً یہ اندلسی زبان کا نام ہو گا یا ایسا بگڑا ہو کہ ہم نہیں پہچان سکتے) جو بادشاہ کی محبوبہ تھی اور اُس کی خوش طبعی و ظرافت بذلہ بنی و لطافت سے الناصر کے آخری ایام زندہ دلی و لطف میں بسر ہوتے۔

شہیدہ بین جب عبد الرحمن الناصر نے سفر آخرت کیا تو خلیفۃ الکملک علی ذوق و شوق پہلے سے بہ درجا زیادہ بڑھ گیا۔ ابتدا سے عمر سے اُسے علم کا بڑا شوق تھا۔ دینا کے تمام عیش و رکنا اُسے حکمرانی و فتحندی میں اتنی دلچسپی دے تھی جتنی کہ کتابوں کے جمع کرنے اور اُن کے مطالعہ میں تھی۔ اُس بات کی دُھن تھی کہ دینا بھر کی عربی کتابیں اُس کے کتب خانے میں جمع ہو جائیں۔ چنانچہ اُس کی سلسل کو مشغول سے شاعری ادب و دنیا و اخلاق۔ تاریخ و جغرافیہ اور تمام علوم و فنون کی کتابوں کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا جو دنیا کے کسی شہر میں نظیر نہ رکھتا تھا۔ اُس کے

نائب اور ایجنٹ کتابوں کو تلاش کرتے ہوئے ساری دنیا میں مارے مارے پھرتے تھے۔ اور اسی مضمون کے نامہ و پیام لے کے اس کے سیفر افریقہ۔ و مصر۔ شام و عراق۔ اور فارس و عرب کے اسلامی درباروں میں پہنچے۔ اور انھیں عام اجازت حاصل تھی کہ جتنا روپیہ درکار ہو خرچ کریں مگر کسی قیمتی کتاب کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ سر چند ہی روز میں شاہی قصر مروان کتابوں سے بھر گیا۔ کتابوں کے سوا اُس کے گردن میں کوئی چیز نہ نظر آتی۔ اور فریجہ وغیرہ جو کچھ تھا کتابیں تھیں۔ غرض سوا خلیفہ اندلس الحکم بن عبدالرحمن الناصر الملقب بـ مستنصر باللہ کے کوئی مسلمان فرمان روا دنیا میں نہیں گزرا جو جسے کتابوں اور علم و فضل کا اس قدر شوق ہوا ہو۔ اُس کے پاس کتابوں کے ذریعہ سے عربوں کے اُن تمام قبائل کے انساب جمع ہو گئے جو عرب و افریقہ میں آباد تھے۔ اور اُن کے عرب سے نکل کے دیگر ملکوں میں آباد ہونے اور مختلف مشاغل میں مصروف ہونے اور اُن کی نقل و حرکت کی پوری تاریخ موجود تھی۔ اُس کے قصر کا دروازہ اہل علم کے لیے ہمیشہ اور ہر وقت کھلا ہوا تھا۔ جن میں سے اکثر کو وہ بہت کچھ دولت دے کے روانہ کرتا کہ دنیا کی سیر کریں اور جو نئی کتابیں ملین اُس کے کتب خانے کے لیے آئیں۔ اسی قسم کے جو یاے علم علماے دربار میں سے ایک علامہ ابو اسحق محمد بن القاسم الشیبانی تھے جو مصر میں اُس کے لئے کتابیں تلاش کرتے۔ شام میں اُس کے ایجنٹ علامہ ابو عمر محمد بن یوسف بن یعقوب الکندی تھے جو غالباً مشہور فیلسوف عرب یعقوب کندی کے بڑے پوتے تھے۔

علامہ ابو الفرج اصفہانی نے جو نسل بنی امیہ سے تھے انھیں دنوں اپنی مشہور کتاب ”اغانی“ تصنیف کی تھی جس کی تصنیف کے ساتھ ہی ساری دنیا میں فہرت ہو گئی۔ خلیفہ الحکم نے علامہ موصوف کے پاس خاص اپنی دستخطی تحریر ایک ہزار اشرفیوں کے ساتھ بھیجی جس کا

مضمون تھا کہ یہ تھوڑی رقم ابتداءً نذر کی جاتی ہو اور اس کے سوا جس قدر مطلوب ہو خزانے سے روانہ کی جائے گی۔ مہربانی کر کے اپنی کتاب کا ایک نسخہ میرے پاس بھیج دیجئے گا علامہ مدوح نے فوراً اپنی کتاب مذکور کا ایک نسخہ روانہ کر دیا اور اُس کے ساتھ ہی خاندان بنی امیہ کی ایک تاریخ مرتب کر کے بھیجی جس میں تمام شاہان بنی امیہ کے حالات و انساب ایسے اثبتاً کے ساتھ درج آئے کہ کوئی جزئی واقعہ بھی مصنف کے قلم سے نہیں چھوٹا تھا۔ اور بلوک بنی مروان کی تعریف کے قصائد بھی تصنیف کر کے بھیجے۔

خاص بغداد میں بھی اُس کے ایجنٹ کی حیثیت سے محمد بن طحان موجود تھا جو ہر کتاب کو چاہے کتنے ہی دامن پرلے بلاتال خرید لیتا۔ اسی قدر نہیں الحکم نے دنیا کے ان تمام اسلامی شہروں میں جو علم و فضل کے اعتبار سے شہرت رکھتے کتاب مقرر کر رکھے تھے اور ان کو حکم تھا کہ جو کتابیں قیۃ دستیاب نہ ہو سکیں تو جس طرح بنے اُن کی نقلیں کر لائیں۔

اس کوشش اور ایسے ذوق و شوق سے الحکم نے قرطبہ کا کتب خانہ جمع کیا۔ جس میں کتابیں نہایت ہی صفائی اور اہتمام سے رکھی جاتیں جو علموں اور فنون کے لحاظ سے جدا جدا مرتب تھیں قصر مروان کے ہر کمرے اور بڑے ہال میں لکھ کے لگا دیا گیا تھا کہ اس میں کن کن فنون کی کتابیں ہیں۔ ان کتابوں کی اُس نے جو فہرست خود ہی مرتب کی تھی۔ اُس میں صرف کتابوں اور مضمون ہی کے نام نہ تھے بلکہ یہ بھی درج تھا کہ مصنف کون تھا؟ کہاں کا تھا؟ اُس کا نسب کیا تھا؟ اُس کے کمالات کیا تھے؟ اور علم و فضل کی دنیا میں اس کا کیا پایہ تھا؟ اس جستجو و مدقیق کا یہ نتیجہ تھا کہ الحکم کو اُن تمام عربوں کے انساب اذہر تھے جو اندلس کے مختلف شہروں میں جا جا کے آباد ہو گئے تھے۔ اور علم انساب میں وہ اپنے زمانے کا بے نظیر و بی ہمتا عالم تھا۔

اس علمی تحقیق میں اُسے اپنے معتمد ابو عبد السلام غالب بن محمد بن عبد الواہب سے نہایت ہی بیش قیمت مدد ملتی تھی۔ اسی ابو عبد السلام نے بادشاہ کے اشارے سے اندلس کے ہر ہر شہر اور قریے کا ایک ایک گریٹر مرتب کیا تھا جس سے سارے ملک کی حالت آئینہ ہو گئی تھی۔ علامہ ابو محمد ابن حزم جو اُن چند منتخب علما سے اسلام میں ہیں جن پر دنیا سے اسلام کو ناز ہو اپنی کتاب "الفصل فی الملل والاہواء والنحل میں" خلیفہ الحکم کی نسبت لکھتے ہیں کہ "یہ خلیفہ اپنی پندرہ سالہ فرمان روائی میں علم اور اہل علم کا حامی و مددگار رہا جس کے ساتھ رعایا کو دلی محبت تھی اور لوگ اس کی علم پروری پر ناز کرتے تھے"۔

اندلس کا نامور مورخ ابن خیّان الحکم کے اس کتب خانہ کا نام "کتب خانہ مروانیہ" بتاتا ہے۔ اسلئے کہ وہ قصر مروان میں تھا۔ اور لکھتا ہے کہ "اس کی فرست چوالیس جلدوں میں تھی۔ اور ہر جلد میں بیچاس تختے لگے تھے۔ اور یہ جلدیں اول سے آخر تک کتابوں اور مصنفوں کے ناموں سے بھری ہوئی تھیں"۔ ایک اور مصنف طلحہ الفقی کہتا ہے کہ "کتب خانے کی فرست الحکم کے زمانے میں پوری طرح مکمل نہیں ہونے پائی تھی اسلئے الحکم کے بعد اسکے بیٹے خلیفہ ہشام نے اسے تکمیل دے دیا"۔

ان واقعات کو سن کے انسان کے دل میں خیال گزر سکتا ہو کہ الحکم صرف کتاب کا کٹڑا تھا اور ملاؤں اور کتابوں میں حد سے زیادہ مصروف ہو جانے کے باعث فوج کشی خوش تدبیری اور دیگر امور سلطنت کی طرف سے بالکل غافل ہو گیا ہوگا۔ لیکن ایسا نہ تھا۔ انصاف نے اپنی زندگی ہی میں فرمان روائی سے گوشہ گیر ہو کے نظام سلطنت فاضل بیٹے کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔ اُس وقت اُس نے اپنی علمی مشاغل کے لیے وقت مقرر کر کے حکمرانی کے لیے کافی زمانہ نکال لیا تھا۔ اور تمام انتظامات نہایت ہی حسن و خوبی سے انجام دے لیکن بن بھی قدر دانی علم کا وہی حال تھا۔ افریقہ اندلس و ممالک اسلامیہ مشرق کے

تمام علما و فضلا کے پاس اُس نے پیام بھیجا کہ یہاں آ کے قیام کیجئے۔ اور ہسپانیہ کو اپنا گھر بنائیے۔ اُس کے دو بھائی تھے عبد العزیز اور المنذر جو علم و فضل میں اُس کے ہم مذاق تھے۔ کتب خانہ کو اُس نے عبد العزیز کے انتظام میں دیا۔ اور المنذر کو صرف اس کام پر مامور کیا کہ علما و فضلا کی خدمت و خبر گیری کیا کرے۔ اور اس طرح اُن کی ولد ہی کرے کہ وہ شوق سے یہاں رہیں اور اپنے وطنوں کو بھول جائیں ان دنوں برخلاف عام سلاطین اور دولت مندوں کے اندلس کی شاہی شہر مدینۃ الزہراء کے قصرون اور کو شکون میں بجا سے اس کے کہ عیش و عشرت کے کرشمے نظر آئیں اور رقص و سرود کی فغلیں گرم ہوں ہر وقت علمی صحبت قائم رہتی۔ اور سوا علوم و فنون کے کسی چیز کا چرچا نہ تھا۔ رضیہ نام ایک مہجین عورت الحکم کی محبوبہ خاص تھی۔ اُس کے سوا اور کسی پری و ش نازین کی صحبت میں اُس کا دل نہ لگتا۔ اس مہجین عورت کی نسبت مورخین اندلس کہتے ہیں کہ جس طرح حسن و جمال اور ناز و انداز میں جواب نہ رکھتی تھی اسی طرح علم و فضل اور تاریخ دانی و سخن سنجی میں بھی یکتا سے روزگار تھی۔ جس سے عافیت پتہ چلتا ہو کہ اُس کے ساتھ الحکم کو اس کی خوبصورتی کی وجہ سے نہیں بلکہ اُس کے علم و فضل کی وجہ سے محبت تھی۔ الحکم نے اُسے ”نجم السرور“ خطاب دیا تھا۔ اس لیے کہ اس کی صبح عید کا مطلع رضیہ ہی کا دلکش چہرہ تھا۔

الحکم کی خدمت میں سب سے زیادہ رسوخ علامہ محمد بن یوسف کو تھا جو وادی الجارہ کے رہنے والے تھے اور ایک مشہور زمانہ مورخ تھے۔ انھوں نے اسپین اور افریقہ کی ایک ضخیم و مستند تاریخ لکھی تھی جس میں بادشاہوں اور مشاہیر ملک کے حالات درج تھے۔ اسی عہد کا ایک اور ادیب محمد بن یحیی تھا۔ جس پر بادشاہ کوناز تھا۔ اس کی علمی قدر دانی کی یہ حالت تھی کہ تخت نشینی کے دوسرے ہی برس سرحد کے سیسی باغیوں کی سرکوبی کے لیے زبردست فوج لے کے روانہ ہوا تو طلیطل

(طالو) میں پونج کے سنا کہ فوج کا کوئی فوجوان بیماری کے عذر پر شرکت جہاد سے معافی چاہتا ہے۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ وہ قاضی عبدالوالد یونس بن عبداللہ شہیریہ "ابن الاصفہ" کا بیٹا عبداللہ ہے اور نو عمری ہی میں علم و فضل اور ذوق تاریخ کے لحاظ سے فرید زمانہ بن گیا ہے۔ سامنے بلوا کے اُس کی صورت دیکھی۔ حالات دریافت کیے۔ اور اپنے سپہ سالار سے کہا "انہیں رہنے دو۔ ان کی صحت بہت قیمتی ہے۔ اچھے ہو گئے تو ان سے ایسے کاموں کی امید ہے جو مجھے بہت عزیز ہیں" پھر اُس سے کہا، "عبداللہ! تم اُن لوگوں میں ہو جن کی ذات سے مجھے امید ہو کہ بنی عباس کی قلمرو کی علی ترقیوں کو حسد کی نگاہ سے نہ دیکھوں گا۔ بہتر یہ ہو گا کہ تم قرطبہ میں چلے جاؤ۔ اور وہاں میرے قاصر مطلقاً میں جو دریا کنارے ہو قیام کرو۔ وہاں کی آب و ہوا میں جب میرے اطباء پوری توجہ سے علاج کریں گے تو جلد ہی اچھے ہو جاؤ گے" فوجوان نے شکر گزار ہو کر عرض کیا "میں اپنے گھر کی خاموشی میں زیادہ اچھا کام کر سکوں گا" اور خلیفہ کی نظر عنایت کا اس قدر اثر پڑا تھا کہ وہ فوجوان تندرست ہوتے ہی شعراے سلف کے قصائد جمع کرنے اور ایک مکمل تاریخ مدون کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اور اس قدر جلد اس علی خدمت کو انجام دیا کہ ادھر اکمل فتح کے پھر میرے اُڑتا ہوا قرطبہ میں آیا اور اُدھر فوجوان عبداللہ بنی کتاب لے کے حاضر دربار ہوا جو علما و فضلا کے مجمع میں پسند کی گئی۔ اور عبداللہ بھی اُن مستند صاحب علم لوگوں میں شامل ہو گیا جنہیں خاص مدینۃ الزہراء کی اکیڈمی میں جگہ دی گئی تھی۔

جواہل علم و ہنر جمع تھے اُن میں ایک احمد بن سعید اللہ افی تھے۔ جنہوں نے اسپین کی تاریخ لکھی تھی۔ ایک یوسف بن ہارون الارادی تھے جو ابو عمرو کے لقب سے مشہور تھے۔ اسی طرح کے اور صد ہا عالم تھے جو مختلف علوم میں باکمال تسلیم کئے جاتے۔

اُن دنوں اسپین میں علم و فضل کو اس قدر ترستی تھی کہ مرد تو مرد عورتیں بھی اپنی علمی قابلیتوں سے ناموری حاصل کر رہی تھیں۔ المناصر کے عہد کی قسب علم عورتوں کے حالات ہم بتا چکے ہیں۔ الحکم کے زمانے میں یہ نئی عورتیں شہرت کے نشہ نشین پر آئیں۔ الحکم کے قصر لبتی میں ایک بہت بڑی صاحب علم نازنین تھی جو نحو و صرف ادب اور شاعری میں مشہور تھی۔ ان علموں کے علاوہ اُسے علوم ہندسہ و ریاضی میں بھی اچھا دخل تھا۔ عبارت نہایت ہی پاکیزہ لگتی تھی۔ اور اُس کی ہر ہر ادا کی طرح اس کا ہر ہر فقرہ بھی دلکش ہوتا تھا۔ بادشاہ جب محل میں ہوتا تو اُس کے ہاتھ کے لکھے ہوئے فرمان جاری ہوتے الحکم اُس کے زور قلم زور بیان اور اُس کی رائے صاحب کا نہایت ہی معترف تھا۔

محل ہی میں ایک اور لائق و فاضلہ فاطمہ بنت زکریا می شبلیری تھی اُس کے زور قلم اور عبارت آرائی کی بھی اندس میں دھوم تھی۔ ایک خاتون عائشہ بنت احمد بن محمد تھی جس کے علم و فضل اور ساتھ ہی ساتھ اُس کے دیگر محاسن کا قرطبہ میں بہت شہرہ تھا۔ ابن حیان اس خاتون کی نسبت اپنی تاریخ میں لکھتا ہے کہ سارے اسپین میں اُن دنوں کوئی عورت نہ تھی جو حسن و جمال عفت و عصمت اور فضیلت و عظمت میں اس کی مد مقابل ہو سکے۔ خوبی عبارت کے ساتھ اُس کی خوش خطی بھی ایسی اعلیٰ درجہ کی تھی کہ دیکھ کے آنکھیں روشن ہو جاتیں۔

شہر میں ایک اور صاحب علم خاتون تھی حفصہ بنت جعفر بن نصیر البتیمی اُس نے علمی کتابوں کا ایک بہت اچھا کتب خانہ جمع کر رکھا تھا اور اُس کے اشعار مقبول عام تھے۔ چونکہ وہ نہایت ہی خوش گلو تھی اسلئے اپنے اشعار ایسے دلکش نغمہ کے ساتھ سنایا کرتی کہ سننے والے وجد میں آ جاتے۔ ایک عالمہ خاتون مریم بنت ابوعقوب الیفصولی الثعلبی تھی اس نے انبیلیہ میں ایک مدرسہ نسوان جاری کر رکھا تھا جس میں دیان کے تمام معززین کی لڑکیاں تعلیم پاتیں۔ اور چند روز میں یہ ہو گیا کہ قرطبہ کی قریب قریب تمام امیرزادیان اور معزز خاتونیں اسی مدرسہ کی اولاد لڑکیاں تھیں۔ الحکم کی وفات کے بعد رضیہ نے محض علی شوق میں مشرق کا سفر اختیار کیا۔ سرشام و عراق کی تمام شہروں میں گئی۔ اور جہاں پہنچی اُس کا نام ہر جگہ اس سے پہلے پہنچ چکا ہوتا۔



ان دنوں جیل کا معاصر شاغر کثیر تھا۔ اور جس جیل بیتنہ کے شمع رخسار کا پروانہ تھا وہ غزوہ نام ایک مہ پارہ تازمین کی زلف گر گیر کا اسیر تھا۔ اتفاقاً کثیر ایک دن جیل سے آ کے ملا۔ جیل نے پہچان گمان سے آتے ہوئے، ”کما بیتنہ کے باپ کے پاس سے آ رہا ہوں“ ”پوچھا“ اور جاتے کہاں ہو؟“ ”کما“ غزوہ کے شوق دیدار میں جاتا ہوں“ ”بولتا تو پہلے ایک کام کرو۔ غزوہ سے پھر مل لیسا۔ اس وقت بیتنہ کے قبیلہ میں واپس جاؤ۔ اور جس طرح بے میرے لیے اُس سے وعدہ وصل لے آؤ“ کثیر نے عذر کیا کہ ”میں ابھی ابھی دہان سے چلا آ رہا ہوں دوبارہ جاتے شرم آتی ہو“ ”بولتا شرم آتی ہو تو آیا کرے۔ اس وقت تو تمہیں میری خاطر سے دہان جانا پڑے گا“ ”مجبور ہو کے کثیر نے کہا“ اچھا، تاؤ تمہیں اُس سے ملے ہوئے کتنے دن ہوئے؟“ ”کما“ اد اہل شوال میں اس کا دیدار نصیب ہوا تھا۔ اور ہوا یہ کہ میں اُس کے قبیلے کے پڑاؤ کے قریب داوی روم نام ایک نالاب کے کنارے پہنچا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں بیتنہ اور اُس کی ایک لونڈی لڑکوں کی گٹھری لیے ہوئے نہانے اور کپڑے دھونے کو آ رہی ہیں۔ جب وہ پانی میں

اُتر چکین تو مجھ سے نظر دوچار ہوئی۔ بیٹھنے نے کوئی اجنبی سمجھ کے جھٹ پٹ ایک بھیگی چادر میں منہ چھپا لیا اور لوٹدی نے پوچھا ”آپ کون ہیں؟“ میں نے کہا ”جیل“ نام سنتے ہی بیٹھنے نے چہرہ کھول دیا۔ مانوس ہو کے بے تکلف باتیں کرنے لگی۔ اور غروب آفتاب کے وقت تک اُس سے لطف و محبت کی باتیں ہوتی رہیں۔ اب جدائی کی گھڑی آپونچی تھی۔ میں نے پوچھا ”اب اس کے بعد کب ملو گی؟“ بولی ”اس وقت اس کا کیا جواب دوں؟ ہمارا قبیلہ یہاں سے کوچ کرنے والا ہے۔ کسے خبر کہ اب کہاں پڑاؤ ہو گا؟ اور کب اور کس جگہ ملنے کا موقع ملے گا؟“ لاچار میں چلا آیا۔ جب سے درد فراق میں مبتلا ہوں۔ اور اس درد کا علاج سوا تمہارے کسی سے نہیں ہو سکتا۔“

کثیر مہجور اُٹے پاؤں بیٹھنے کے قبیلہ کی طرف پھر چل کھڑا ہوا اور جیل سے کہتا گیا ”جب تک میں واپس نہ آؤں تم یہیں ٹھہرے رہنا“ بیٹھنے کے باپ نے جیسے ہی کثیر کو واپس آتے دیکھا جوش مسرت سے مرجا کھی اور واپسی کا باعث دریافت کیا۔ کہا ”آج تین نئے شعر میرے خیال میں آئے ہیں۔ جی چاہا کہ تمہیں آ کے سناؤں“ جواب ملا ”ضرور سناؤ۔ اس سے بڑی کیا غایت ہو سکتی ہے؟“ کثیر نے نیچے کے پاس کھڑے ہو کے اور اس بات کا یقین کر کے کہ بیٹھنے کے کان تک آواز پہنچ جائے گی اپنے دو اشعار سنائے۔ اُن اشعار کا مضمون یہ تھا کہ دو مین نے عمر سے کہا کہ اپنا قاصد بھیجوں گا تاکہ تو بتا دے کہ کب ملے گی۔ اور وصال کے بارے میں تیرا کیا حکم ہے۔ آخری ملاقات وادی روم میں ہوئی تھی جب پکڑے دھوئے جا رہے تھے۔ یہ اشعار سنتے ہی بیٹھنے بیتاب ہو گئی۔ بے اختیار سینہ پر ایک دو تہہ مارا۔ اور منہ سے نکلا ”اے اے اے“ باپ گہرا کے اندر دوڑا گیا۔ اور پوچھا ”بیٹی کیا ہوا؟ میریت تو ہے؟“ بولی ”کچھ نہیں۔ وہی گتا تھا جو لوگوں کے سو جانے کے بعد رات کو پہاڑوں سے نکل کے آتا ہے۔ میری آواز سن کے بھاگ گیا“ یہ کہہ کے اُس نے اپنی لونڈی سے چلا کے کہا ”جادوڑ کے دو مات (چند ٹیلون کا نام) سے لکڑیاں لے آ۔ تاکہ ہم ایک کبری ذبح کر کے اپنے مہمان کو کھلائیں“ کثیر نے یہ سن کے کہا ”نہیں! تکلیف نہ کرو۔ مجھے اس وقت

جانے کی جلدی ہو۔ ٹھہر نہیں سکتا۔ اور اسی دم واپس آکے جمیل سے یہ کیفیت بیان کی۔ وہ سنتے ہی مارے خوشی کے آپے سے باہر ہو گیا اور بولا "یُسرٰی بیٹہ نے اُس وقت جب سارے قبیلہ والے رات کو سو چکین گے دوات میں ملنے کا وعدہ کیا ہو،" کثیر نے کہا "اگر تمہارے نزدیک اُس نے وعدہ کیا ہو تو چلو، شام ہوتے ہوتے دونوں دوات میں پہنچ گئے۔ بیٹہ نے ساتھ لے کر اپنی بہن اُم الحسین اور اپنی خالہ زاد بہنوں لیتکی اور نجیا کو بھی راضی کر لیا تھا۔ جب سب سو گئے تو چاروں لڑکیاں اپنے خیموں سے نکل کے مقام موعود پر آپہنچیں۔ عاشق و معشوق عجیب خلوص اور خوشی سے ملے۔ صبح تک ایک دوسرے کی باتوں اور صحبت جانان کی لذتوں میں مشغول اور محو رہے۔ خود کثیر کہتا ہے کہ میں نے اپنی زندگی بھر نہ اس سے زیادہ عفت و پاکبازی کی کوئی صحبت دیکھی تھی۔ اور نہ کبھی اس سے بڑھ کے سچی محبت کا کوئی منظر نظر آیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے جذبات سے اس قدر واقف تھے اور دونوں کی باتوں کو اس طرح سمجھ جاتے تھے کہ سمجھ ہی میں نہ آتا تھا کس کا عاشقانہ علم غیب بڑھا ہوا ہوگا آخر روزِ عہد ان کی قیامت کا آفتاب نکلا۔ اور دونوں ایک دوسرے سے رخصت ہو کر اپنے گھروں کو سدھارے۔

اس ملاقات کی بیٹہ کے گھر والوں کو خبر ہو گئی۔ اور سب نے قسم کھالی کہ جمیل جہان ملے گا مار ڈالیں گے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جیل و بیٹہ پر دنیا تنگ تھی۔ بیٹہ کو گھر میں پڑی پڑی کڑھاکرتی۔ مگر جمیل کا یہ عالم تھا کہ جوشِ عشق جنون اور مایوسیا کی شان دکھانے لگا۔ راتوں کو قبیلہ بیٹہ کے قریب آتا نہ ہیرے میں ٹیلوں پر چڑھتا۔ اور دیارِ جانان کی طرف رُخ کر کے ہوا سے کہتا۔

ہبسی لی نسمة من دیہ بٹن و متی بالحبوب اے جمیل
 (بیٹہ کی خوشبو کا کوئی جھونکا لا۔ اور جمیل پر اتنا احسان کر کہ اس کی طرف چلے)
 یوں پہاڑوں میں رات رات بھر روتا اور صبح سے پہلے بھاگ جاتا۔ ادھر بیٹہ کا یہ عالم تھا کہ اپنی سہیلیوں سے بار بار کہتی "ہاے جمیل کے رونے کی آواز آرہی ہو،" وہ کہتیں "جوش کی دوا کرو۔ جمیل یہاں کہاں؟"

انہیں دنوں کثیر سے پہر ملا تھا ہوئی۔ اس جیل کی بتا بیان دیکھ کے اُس کے چند شعور اشعار یاد آئے۔ جو اُس نے بٹینہ کے فراق میں کہے تھے وہ اشعار پڑھے اور کہا، کیا بٹینہ نے یہ شعر نہیں سنے جو اس قدر بے پروا ہو؟ جیل نے اسی قسم کے چند اشعار کثیر کے پڑھ دیے اور کہا، کیا عذہ کے کان تک تمہارے یہ شعر نہیں پہنچے جو تعین نہیں پوچھتی؟، جواب معقول تھا دونوں نے پلٹ کے روزنا شروع کیا اور ساری رات روتے اور آنسو بہاتے رہے۔

آخر جو شش عشق اس حد کو پہنچا کہ نہ رہا گیا۔ اور جان پر کھیل کے جیل قبیلہ بٹینہ کی طرف چلا۔ اور ایک تالاب کے قریب پہونچ کے ٹھہر گیا کہ بٹینہ کی کوئی لونڈی یا اُس کے گلہ کی چرائے والی خادمہ ملے تو نہ ہے قسمت نحو شاید در آمد کر کے پیام شوق لیجا۔ نے پر راضی کرے۔ بٹینہ کی کوئی لونڈی تو نہ ملی مگر بنی عذرہ ہی کی ایک اور حبشن لونڈی مشک لیے ہوئے پانی لینے کو آگئی۔ وہ اتفاق سے جیل کو پہچانتی تھی۔ صورت دیکھتے ہی چلائی، درآغاہ! کیسے رہے؟ اور اُس کے ساتھ ہمدردی کرنے لگی۔ جیل نے کہا، تمہیں مجھ پر ترس آتا ہو تو اتنا احسان کرتین کہ کسی ہمارے سے میری یہ انگوٹھی لیجا کہ بٹینہ کو دے دیتیں۔

میرا پیام شوق پہونچا تین۔ اور اُس سے وعدہ وصل لے آئیں۔ تم جب تک واپس نہ آؤ گی میں یہاں تمہارا منتظر رہوں گا۔ لونڈی نے قبول کیا۔ اور انگوٹھی لے کے گھر گئی۔ یہاں باتوں میں اُسے اتنی دیر ہو گئی تھی کہ اُس کے آقا نے ٹھاہو کے پوچھا، اتنی دیر تو نے کہاں لگائی؟، اس نے کچھ معمولی عذر کر دیے جن کا کسی کو یقین نہ آیا۔ اور لوگ اس سے مار مار کے پوچھنے لگے کہ پیچ بتا اتنی دیر سے کہاں تھی؟، زیادہ مار پڑی تو اُس نے ساری کیفیت بیان کر دی۔ اور جیل کی انگوٹھی نکال کے اُن کے ہاتھ میں رکھ دی۔ اس واقعہ کی خبر بٹینہ کے گھر میں پہونچی تو اُس کے باپ بھائی اور شوہر تلوار میں سوت سوت کے کھڑے ہو گئے کہ اسی وقت جا کے اس کا کام تمام کر دیں گے۔ خدا کی قدرت دو چار عذری جوان آگئے جنہیں جیل سے ہمدردی تھی۔ انہوں نے ان لوگوں کو قتل پر آمادہ دیکھ کے کہا، کیا ہو کیا؟، انہوں نے ساری

سرگزشت بیان کر کے کہا ”جانتے ہیں جمیل کو مار ڈالیں گے، جو انون نے پوچھا جمیل ہو کہاں؟“، کہا ”اُن پہاڑیوں کے اُس طرف فلان تالاب کے کنارے“ انھوں نے کہا ”لیکن تم نے اسے کوئی جرم کرتے یا بیشینہ سے ملے نہیں پکڑا۔ یوں اس کی نکیر بھی پھوٹی تو اس کے اعزہ بدلہ لینے پر آمادہ ہو جائیں گے“ یہ سُن کے بیشینہ کے عزیز خاموش ہوئے اور کہا ”پھر کیا کریں؟“، کہا ”اگر اُس سے انتقام لینا چاہتے ہو تو ایسی تدبیر کرو کہ وہ بیشینہ کے پاس بیٹھا اور اس سے باتیں کرتا ہوا پکڑا جائے“ یہ تجویز پسند کی گئی۔ اور یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ اُس جشن لونڈی کو انگوٹھی واپس دی گئی۔ اور کہا گیا کہ ”تو اسے لے جا کے بیشینہ کو دے اور اُس سے وعدہ لے۔ اور یہ نہ بتا کہ کسی اور کو بھی خبر ہو گئی ہے۔ اور جس وقت وہ جانے کا وعدہ کرے اُس کی جا کے جمیل کو بھر کر دے“ لونڈی تو ادھر بیشینہ کے پاس گئی۔ اور یہ لوگ ادھر سیدھے جمیل کی تلاش میں روانہ ہوئے۔ پتہ پوچھ ہی لیا تھا دم بھر میں جا پہونچے اور سارے واقعہ کی خبر کر دی۔ جمیل نے کہا ”خیر میں تو چلا جاؤں گا مگر تم کسی طرح بیشینہ کو تو خبر کرو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ بیان آکے پریشان ہو“ سب نے اس کا وعدہ کیا۔ اور جمیل کو وہاں سے بھگا کے آئے اور بیشینہ کی لونڈی کو کچھ دے دلا کے راضی کیا۔ اور اُس کے ذریعہ سے اُسے بھی خطرے اور جمیل کے چلے جانے سے آگاہ کر دیا۔

اس کے بعد پھر جمیل و بیشینہ میں کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ اور اہل قبیلہ کو معلوم ہو گیا کہ بیشینہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتی۔ اور برابر جا کے ملتی ہے۔ تب ماچار ہو کے انھوں نے اُم منظور نام ایک بڑھیا کو بیشینہ کا نگہبان مقرر کیا جو ہر وقت سایے کی طرح اُس کے ساتھ رہتی۔ اور کسی طرح بیچھا نہ چھوڑتی۔ جمیل کو شوق دیدار اُم منظور کے پاس لے آیا۔ اُس کے ہاتھ جوڑے ناک رگڑی سب طرح لہا کہ ”بیشینہ کو ایک نظر دکھا دو“، وہ بگڑ کے بولی ”جاؤ اپنا کام کرو۔ میں کوئی لٹنی نہیں ہوں“ جمیل نے کہا ”وہ ایسا نہ کرو کہ پھر تمھیں میری شکایت ہو“ اُم منظور نے ایک نہ سنی۔ اور جمیل نے نہایت ہی حسرت کے ساتھ بے نیل مرام اپس آکے دو شعر کہہ ڈالے جن کا مضمون یہ تھا کہ ”ہاے وہ گھڑی نہ چھوڑی“

جب اُم منظور نے سب سے چھپا کے مجھے بیٹنہ کا جلوہ دکھایا تھا یہ اشعار اُمی زبان سے نکلتے ہی قبائل عرب میں مشہور ہو گئے۔ اور جب بیٹنہ کے شوہر اور باپ بھائی کے کان تک پہنچے تو وہ اُم منظور پر بہت بگڑے۔ اس نے لاکھ قسین کھا کھا کے اپنی برادری کی ایک نہ مانی اور اُس پر سے بھی اپنا اعتبار اٹھا لیا۔

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ جو واقعہ جمیل نے شعرون کے ذریعہ سے مشہور کیا اس کی کچھ اصلیت بھی تھی۔ کیونکہ مصعب بن زبیر نے اپنے عروج اور حکومت عراق کے زمانے میں کسی کی زبانی جمیل کے ان دو شعرون میں سے ایک کو سنا تو انہیں بڑا لطف آیا۔ اور جوش میں آ کے کہنے لگے کاش یہ معلوم ہوتا کہ اُم منظور نے جمیل کو بیٹنہ کا جلوہ کیونکر دکھایا تھا؟ جس نے شعر سنایا تھا اُسی نے ان کی یہ تمنا سن کے کہا وہ تو مشکل ہی کیا ہو۔ جس اُم منظور کا اس شعر میں ذکر ہو ابھی زندہ موجود ہو خود اُس سے بلا کے پوچھ لیجئے۔

مصعب نے فوراً جہان اُم منظور تھی وہاں کے عامل کو حکم بھیجا کہ اُم منظور کو فوراً میرے پاس عزت و حرمت سے سوار کرا کے بھیجو اور جب وہ آئی تو کہا بڑی بی اتنا بتا دو۔ تم نے کس ادا سے بیٹنہ کو جمیل کا جلوہ دکھایا تھا کہ اس سے ایسا مرے کا شعر نکل گیا؟ اُم منظور نے کہا بیٹنہ۔ میں نے ایک بار بیٹنہ کے گلے میں ڈال دیا تھا۔ ایک غار سرین لپیٹ دی تھی۔ کاکلون کی چوٹیاں گونڈھ دی تھیں۔ اور مانگ میں خلوق (خوشبو جو صندوق کی طرح لگائی جاتی تھی) لگا دیا تھا بس اتنا ہی سنگار کر کے میں نے بیٹنہ کو ایک جگہ بٹھا دیا اور جمیل کو صرف اتنی اجازت دی کہ اپنے اونٹ پر سوار ہو کے پاس سے گزر جائے۔ اسی شان سے وہ کن انکھيون سے دیکھتا ہوا گزرا۔ اور قدم قدم پر پھر پھر کے دیکھتا جاتا تھا یہاں تک کہ نظر سے غائب ہو گیا، مصعب کو ان دنوں عائشہ بنت طلحہ کے حشک کا زور تھا۔ اُن سے نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ اور ہر خط اُن کے شمع زخار کے پر دانے بن رہتے۔ ایک مینابی کے ساتھ اُم منظور کو قسم دلائی کہ یونہی تم مجھے عیشہ بنت طلحہ کا جلوہ دکھا دو، بڑھیا کو کیا عذر ہو سکتا تھا۔

اپنے خیال کے مطابق عایشہ بنت طلحہ لو اس وقت کی بیٹنہ بنا کے بٹھا دیا۔ اور
 مصعب اونٹ پر سوار ہو کے جس طرح بڑھیا نے بتایا تھا کن انکھینوں سے
 دیکھتے ہوئے نکل گئے۔ اور جب تک نظر کام دیتی تھی پھر کے دیکھتے جاتے تھے۔
 ہر تقدیر ان دو شعرون سے ام منظور کا کاٹنا تو راستہ سے نکل گیا لیکن
 مشرقہ پری مثال کے قبیلہ میں میان جیل جاتے کیونکر؟ وہ ان جو تعانوں کا
 پیاسا تھا۔ اور یہاں تاب فراق نہ تھی آخر ایک دن چرواہے کا بھیس کر کے
 چلے ہی گئے۔ اتفاقاً اس دن بیٹنہ کے گھر میں چند مہمان ٹھہرے ہوئے تھے
 آپ بھی ان کی آرٹ میں دبے ہوئے ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ بیٹنہ نے
 پوچھا ”تم کون ہو؟“ کہا ”دیکھو! غلام ہوں“ غلام خیال کر کے اس نے
 ان کو اور مہمانوں سے الگ بٹھایا۔ پھر آگ روشن کی۔ اور وہ خود اور
 اس کی ایک لونڈی آگ میں گوشت بھون بھون کے سب کو کھلانے لگیں
 اتنے میں آپ نے ایک شعر پڑھا جس کا مضمون یہ تھا کہ ”سرازدہ شکستہ
 حال کے لیے کیا حکم ہو؟“ وہ رات بھر آگ ہی اپتا رہے یا اسے اوڑھنے کو
 کچھ ملے گا؟“ بیٹنہ چرنک پڑی اور لونڈی سے کہا ”یہ تو خدا کی قسم
 جیل کی آواز ہو! جا کے دیکھ تو سہی“ لونڈی نے آگے دیکھا۔ اور واپس
 آ کے چپکے سے کہا ”آپ سچ کہتی تھیں۔ جیل ہی ہو“ اس جواب پر بیٹنہ
 نے قیاب ہو کے ایک ایسی چیخ ماری کہ پاس پڑوس کے تمام آدمی
 دوڑ پڑے۔ مگر جب تک کوئی آئے آئے اس نے گھبرا کے اپنا دوپٹہ
 آگ میں ڈال دیا۔ اور جب لوگوں نے آگے چہنچے کا سبب پوچھا تو بولی
 ”اے کیا کروں میرا دوپٹہ جل گیا“ اس کے بعد جب سب چلے گئے تو
 لونڈی بھیج کے جیل کو اپنے پاس بلایا۔ بڑی گرم جوشی سے ملی۔
 بچی کھی اور اس کی سنی۔ اور میں دن تک اپنے پاس پھپھانے
 لگا۔

اس موقع پر بیٹنہ نے اپنے اعزاء اور شوہر کی مرضی کے خلاف نہایت
 ماجرأت کا کام کیا تھا۔ لیکن عشق اور اس سچی محبت کے تقاضے سے

جو اُسے جیل کے ساتھ تھی وہ ہر طرح کے خطروں میں پڑنے اور اس سے بھی بڑھ کے جرائم کرنے کو تیار ہو جاتی تھی۔ چنانچہ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک اندھیری رات میں جبکہ بادل گرجتا تھا۔ میٹھ برس رہا تھا اور وہ بنی غدرہ کی کسی دعوت سے واپس آرہی تھی۔ اس کی بہن ام الحسین اور کئی اور لڑکیاں ساتھ تھیں۔ چلتے چلتے کسی لڑکی پر ایک کنکری آکے گری۔ وہ سمسی گئی اور ڈر کے بولی وہ یہ کنکری تو کسی جن نے ماری ہو، بیشنہ سمجھ گئی کہ جیل کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ لڑکیوں سے کہا، ان یہ جنوں ہی کا کام ہو۔ جلدی قدم اٹھاؤ۔ کہ بھاگ کے اپنے گھر ہو رہیں۔ اور جاتے ہی پڑ کے سو رہیں، سب لڑکیاں بجائے اس کے کہ کچھ دیر اُس کے پاس بیٹھ کے باتیں کریں بھاگ بھاگ کے اپنے گھر چلی گئیں۔ فقط ام الحسین اور وہ بڑھیا ام منظور جس کا ذکر آچکا ہو رہ گئیں۔ تو بیشنہ خود جا کے جیل کو اپنے خیمے میں بلا لائی۔ اور دونوں ساتھ بیٹھ کے باتیں کرنے لگے۔ ساری رات باتوں میں کٹ گئی۔ مگر کچھ کو مینہ کا ایسا غلبہ ہوا کہ دونوں ایک دوسرے کے پہلو میں پڑ کے غافل سو گئے۔ اور اسی حالت میں صبح ہو گئی۔ پاس ہی خیمے میں اس کا شوہر تھا۔ اسیلے کہ ان دنوں عربوں میں رواج تھا کہ میان بی بی جدا جدا خیموں میں رہا کرتے۔ اس کے شوہر کا معمول تھا کہ روز صبح کو اپنے غلام کے ہاتھ اُس کے پیچے کو ایک کٹورا دودھ خاص اپنے اہتمام سے بیجا کرتا۔ اُسی معمول کے مطابق آج جو غلام آیا تو کیا دیکھتا ہو کہ بیشنہ کے پہلو میں جیل پڑا سو رہا ہو۔ فوراً واپس گیا کہ اپنے آقا کو خبر کر دے۔ اتفاقاً لیلی نام قبیلہ کی ایک عورت نے جو بیشنہ کی دوست تھی اسے روک کے پوچھا کہ ان جاتے ہو؟ اور غلام نے سارا حال بیان کر دیا۔ لیلی کو بیشنہ کے حال پر ترس آیا۔ غلام کو باتوں میں لگایا اور چپکے سے اپنی لونڈی کو اشارہ کیا کہ بیشنہ کو جا کے ہوشیار کر دے۔ اُس نے آکے جگایا۔ اور راجا

بیان کیا تو بیٹھ گھبرا کے اُنھی جیل کو جھنجھوڑ کے اُٹھایا اور کہا خدا کے لیے اپنی جان بچاؤ! جیل نے کہا: میں ڈرنے والوں میں نہیں ہوں، تلوار کھینچ لی۔ اپنے ہمارا نہ عشق کی مدح میں فزیدہ و شعر پڑھے اور مقابلہ کو تیار ہو گیا۔ یہ دیکھ کے بیٹھ اور سہم گئی۔ اور خوشامد سے کہا: یہ وقت نہ ہمدردی کا ہو اور نہ شاعری کا۔ تمہارے لیے نہیں میں خود اپنی آبرو کے لئے ڈرتی ہوں۔ اسی میں مصلحت ہو کہ چپکے سے تخت کے نیچے دھک رہو، آخر مشفقہ نازنین کے کہنے سے جیل تخت کے نیچے گھس گیا۔ بیٹھ اپنے پچھونے پر لیٹ کے سوتی پڑ گئی اور اس کے پہلو میں بجائے جیل کے اُس کی بہن اُم الحسین آ کے لیٹ گئی۔ جب یہ کارروائی ہوئی اور لوٹتی نے واپس جا کے لیلیٰ کو اشارے سے بتایا کہ انتظام ہو گیا تب اُس نے اُس غلام کو رخصت کر دیا۔ غلام نے جاتے ہی اپنے آقا بیٹھ کے شوہر کو خبر کی۔ وہ تلوار لے کے دوڑا کہ اس فتنہ کو ہمیشہ کے لیے مٹا دے۔ مگر بیان آئے جب دونوں ہم پہلو سوئے والوں کے کھنوں پر سے چادر ہٹائی تو کیا دیکھا ہو کہ دونوں بہنیں آس پاس سو رہی ہیں۔ نہایت ندامت کے ساتھ غلام کو گالیاں دیتا ہوا واپس گیا اور تیلیے اسی وقت بیٹھ کے مان باپ کے پاس دوڑی گئی اور کہا: خدا تمہیں غارت کرے! اپنی لڑکی کو یوں بدنام کرتی ہو! اور یہ شریر کا نا (بیٹھ کے شوہر کی ایک آنکھ نہ تھی) خدا اس سے سچھے ہر روز کوئی نئی بات اُٹھا کے کھڑی کر دیا کرتا ہو! وہ دونوں داماد کو برا بھلا کہنے لگے اور ہر طرف سے اُس پر لعنت برسے لگی۔ بیان میان جیل دن بھر جیل جرم مشفقہ پری تمثال کے نیچے میں اُس سے پیار کی باتیں کرتے رہے اور جب شام ہوئی تو رخصت ہوئے۔ اور آتے ہی اس واقعہ کو بھی موزون کر کے سارے عرب میں پھیلا دیا۔

قبیلہ بنی مدرہ کے جس بطن (شاخ) میں بیٹھ تھی وہ بنی الاحب کہلاتا تھا۔ اب بنی احب کے ایک نوجوان عبید اللہ بن قطنہ نے جیل کی

ہجو میں اشعار رکنا شروع کیے۔ مگر شاعری میں بھلا جیل کا کوئی کیا مقابلہ کر سکتا تھا! جواب میں ایسی مٹی خراب کی کہ اُس کے حواس جاتے رہے اور چند روز کے رد و قدح کے بعد اس نے عہد کر لیا کہ پھر کبھی جیل کو نہ چھیڑوں گا۔ جب وہ بار چکا تو بنی احب کے ایک اور شخص عمیر بن رمل نے جیل کی ہجو میں طبع آزمائی شروع کی۔ اور وہ بھی ہمارے ندامت سے خاموش ہوا۔ جیل نے ان دونوں کی ہجو دہن میں چونکہ سارے قبیلہ کے اوپر حملہ کیا تھا اور جن کی ہجو تھی وہ بٹینہ کے عزیز تھے اسلئے انھیں سن کے بٹینہ بھی جیل سے خفا ہو گئی۔ اُدھر بٹینہ کے اعزہ سب طرف سے ہمارے اپنے علاقہ کے حاکم زکوۃ عامر بن ربیع کے پاس پہنچے اور فریاد کی کہ جیل ہمارے مردوں کی ہجو کرتا ہے۔ ہمارے گھروں میں چھپ چھپ کے آتا ہے۔ اور ہماری عورتوں کے ساتھ عشق بازی کرتا ہے۔ عامر نے کہا: ایسا ہے تو تمہارے لیے اُس کا خون حلال ہے۔ جان ملے بے تکلف مار ڈالو۔ اور کوئی مزاحم ہو تو مجھ سے آ کے کہنا۔ جیل کو جب یہ حال معلوم ہوا تو بنی احب کے علاقہ سے دُور دُور رہنے لگا۔

یہ زمانہ جیل کے لیے بڑی بد نصیبی کا تھا۔ ایک طرف جان کا خوف تھا اور دوسری طرف بٹینہ کی ناراضی کا صدمہ۔ اصل یہ ہے کہ عبید اللہ بن قطنہ اور عمیر بن رمل بٹینہ کے عزیز تھے۔ جیل نے اُن کی ہجو کہی تو اُسے بُرا معلوم ہوا۔ اور کہنے لگی: میرے ساتھ عشق کا تو دعویٰ ہے مگر میرے عزیزوں کی مذمت کرتے ہیں! آخر فراق کی بیتابی۔ اور اپنے دُور محبت کو اس عنوان سے اشعار میں ظاہر کیا اور اس طبع و بلوئی کی کہ بٹینہ کا دل صاف کیا۔ خیر جیل نے اپنی شاعری کے جادو سے بٹینہ کو تسخیر کر لیا لیکن حاکم کے موافق بنانے کی کوئی تدبیر نہ بن پڑی۔

آخر بے صبر دل کے ہاتھوں سے مجبور ہو کے اس خوف کے زمانے میں بھی ایک دن سب سے چھپ کے بٹینہ سے ملا۔ بائیں کین اور اس کے پاس بیٹھا ہی ہوا تھا کہ بنی احب سر پر آپہنچے۔ اور

اُسے پکڑ لیا۔ مگر غنیمت یہ ہوا کہ بنی احب جمیل کے قبیلہ واوون سے وہ بے ہوش ہوئے تھے۔ کیونکہ بنی عذرہ کے جس گروہ میں جمیل تھا وہ بڑا زبردست قبیلہ تھا۔ اسیلے غنیمہ کے اعزہ ڈرے کہ اگر جمیل کے قبیلہ والے انتقام لینے کو اٹھ کھڑے ہوئے تو کیا کریں گے۔ ناچار خاموش ہو رہے اور اُسے نکل جانے کا موقع دے دیا۔ مگر اُسی وقت والی ملک کے پاس دوڑے گئے اور سارا ماجرا بیان کر کے اپنی عاجزی و بیچارگی ظاہر کی۔ اس نے حکم جاری کر دیا کہ جان ملے گرفتار کر لیا جائے۔ اس حکم کے بعد جمیل کو بھاگتے راستہ نہ ملتا تھا۔ مجبوراً صبحت یار سے دست بردار ہو کے ملک مین کی راہ لی۔ اور وہاں کی دشت و درین خاک پھانسنے لگا۔ یہاں تک کہ وہ والی بدل گیا۔ اور بشینہ کے قبیلہ واوون یعنی بنی احب نے بھی علاقہ شام میں جا کے پڑاؤ ڈالا۔ جمیل کو خبر ہوئی تو پھر آہو پو پھا۔ اور پہلے کی طرح پھر بشینہ سے ملنا جلنا شروع کر دیا۔

اب پھر بشینہ کے اعزہ کا کوئی زور نہ چلتا تھا۔ آخر سب کے سب جمیل کے باپ ممر کے پاس آئے جو اپنے قبیلہ کا دولت مند حاکم اور صاحب اثر شخص تھا اور بڑی عاجزی سے کہا خدا کے لئے اپنے بیٹے کو روکیے۔ وہ ہماری لڑکی پر انہما ر عشق کرتے اُس سے بار بار آکے ملتے۔ اشعار میں اُس کے حسن و جمال کا ذکر کر کے اُسے بدنام کرتے۔ اور مین ساری دنیا میں رسوا کرتے ہیں گا ممر نے وعدہ کیا کہ اچھا میں اُسے سمجھا دوں گا۔ پھر اس کے بعد جب جمیل سے ملا تو کہا بیٹا۔ اس گراہی میں کب تک پڑے رہو گے؟ ایک شوہر والی عورت کے ساتھ علانیہ انہما ر عشق کرتے ہو جو ظاہر میں تم سے چکنی چھڑی باتیں کر دیتی ہو اور اصل میں اپنے شوہر کی جان تیار ہو۔ تمہیں اس پر شرم نہیں آتی کہ جسے اپنی معشوقہ بتاتے ہو وہ روزِ غیر کا پہلو گرم کرتی ہو؟ تمہاری ان حرکتوں کو سُن سُن کے مین مارے غیرت کے مرا جاتا ہوں مگر تم پر اثر نہیں ہوتا۔ سچ یہ ہو کہ مین نے تم سے زیادہ نالائق دیکھا ہو اور

نہ تم سے بڑھ کے کوئی بے وقوف ہو گا جو ایک ایسی عورت کے شوق میں عمر ضائع کرے جس کا لٹا غیر ممکن ہو۔ لہذا ان بیہودگیوں سے باز آؤ۔ میں نے اس بارہ میں خوب غور کر لیا ہے۔ اگر کوئی صورت امکان میں ہوتی تو تمہارے لیے اپنی ساری دولت خرچ کر کے میں اس عورت کو لے آتا۔ اور تمہارے حوالے کرتا۔ خوب یاد رکھو کہ بیشک جس کی ہونے والی تھی ہو چکی۔ تمہارے قبیلہ میں ایک سے ایک بڑھ کے خوبصورت لڑکیاں پڑی ہیں جس سے کہو شادی کر دوں مگر اُس کا خیال چھوڑ دو۔ جمیل نے کہا: آپ کی رائے نہایت مناسب ہے۔ اور جو کچھ آپ فرما رہے ہیں بالکل بجا و درست ہے۔ لیکن سچ فرمائیے۔ آپ نے کبھی کسی شخص میں اتنی طاقت پائی ہے کہ اپنے عشق کو دل سے نکال ڈالے؟ اور مشقہ سے دست بردار ہو کے دل کو تسلی دے سکے؟ خدا کی قسم اگر یہ بس کی بات ہوتی کہ اُس کی یاد کو دل سے بھلا دوں اور اُس کی صورت کو جو آنکھوں کے آگے قائم ہو گئی ہو سامنے سے ہٹا دوں تو میں ہرگز تامل نہ کرتا۔ مگر افسوس یہ امکان میں نہیں۔ دراصل یہ ایک آفت ہے جس میں پھنس گیا ہوں۔ اور اس سے بچنے کی کوئی صورت نہیں نظر آتی۔ جانتا ہوں کہ بیشک کے اعزہ و اقارب اور حکومت دشمن ہیں۔ مگر بہت سے باز نہیں آ سکتا۔ یہی نہ کہ اس شوق میں مار ڈالا جاؤں گا تو یہی میری تمنا ہے اور پُر جو شش اشعار میں دل کی حالت ظاہر کرتے لگا۔ اس وقت اُس نے اپنی بے بسی و بیقراری ایسے موثر الفاظ میں ادا کی تھی کہ باپ اور تمام شہنے والے زار و قطار روئے گئے۔

اب اُسے اپنی زندگی بہت دشوار نظر آنے لگی اور آمادہ ہوا کہ بھاگ کے ملک شام میں چلا جائے۔ چلتے وقت دل میں کہا اب کوی جاہلین سے جاتا تو ہمی ہوں چلو چلتے وقت ایک رخصتی لاقات کو کر لونے یہ خیال آتے ہی ایک رات کو جبکہ قبیلہ والے غافل تھے بے تکلف بیشک کے

خیمے میں چلا گیا۔ وہ صورت دیکھتے ہی سہم کے رہ گئی۔ اور کہا ”خدا کی قسم تم اپنی بھی جان دو گے اور میری بھی جان لو گے! تم کو یہاں آتے دُور نہ لگا؟“ جواب دیا ”آپ تو شام کو جاتا ہوں۔ اور جدائی کی گھڑی سر پر کھڑی ہوں۔ آیا ہوں کہ تم سے رخصت ہو لوں“ یہ سن کے اُس نے پاس بٹھا لیا۔ دیر تک عشق و محبت کی باتیں رہیں۔ پھر پلٹ پلٹ کے رخصت ہوا۔ اور کہا ”مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی میں پھر تمہاری زیارت نہ ہوگی“ یہ کہہ کے رویا مجوڑہ پری تمناں کو رُلا لیا۔ اور اپنے چند اشعار شوق و درد کے لہجے میں سنائے جلا لیا۔

ایک مدت تک ارض شام میں سرگردان رہنے کے بعد پھر واپس آیا۔ اور بیشینہ نے اُس کے آنے کی خبر سنی۔ اب بیشینہ کی بیٹائی دیقاری بڑھی ہوئی تھی۔ قبیلہ کی چند لڑکیوں کی معرفت اُسے خود ہی پیام بھیج کے بلوایا۔ اور ایک محفوظ مقام میں اطمینان سے ملی۔ دونوں نے اپنے دونوں کی حالت ایک دوسرے پر ظاہر کی۔ اور شکایت ہجران کے دفتر کھولے۔ انہیں باتوں میں مصروف تھے کہ کیا دیکھتے ہیں بیشینہ کے باپ اور بھائی سر پر تلوا میں کھینچے کھڑے ہیں۔

یہ دیکھتے ہی جمیل بھلی کی طرح ٹوٹ کے الگ جا کھڑا ہوا۔ تلوار کھینچ لی اور غمیش زنی کا ایسا کمال دکھایا کہ دونوں حریف مقابلے میں عاجز آ گئے اور ہمتیں ہار کے بھاگ کھڑے ہوئے۔ باپ بھائی کے جانے کے بعد بیشینہ نے گھبرا کے کہاتے اب تم خدا کے لیے واپس جاؤ۔ ذرا بھی ٹھہرے تو میں ایسی رسوا ہوں گی کہ کہیں کی نہ رہوں گی۔ اور ممکن ہے کہ سارا قبیلہ چڑھ آئے تو پھر کیا کر دے؟“ کہا ”میں سب سے مقابلہ کروں گا۔ تم حقوق سے جاؤ۔ مگر میں یہاں ٹھہرا رہوں گا۔ ان کا جو جی چاہے کہیں“ لیکن بیشینہ نے قسمیں دلا دلا کے چلے جانے پر مجبور کیا اس واقعہ کو بھی اس نے اپنے کلام میں موزون کیا ہے۔

اب پھر جمیل بیشینہ کے قبیلہ کے آس پاس مارا مارا پھرتا تھا۔ اور

پہاؤن بین بیٹہ بیٹہ کے مصیبت بھران پر روتا تھا۔ اتفاقاً ایک دن اپنے دو چاراد بھائیوں روتی اور مسعدہ سے ملاقات ہو گئی۔ اُن کو پُر جوش اشعار میں اپنا درد دل سنایا۔ اور کہا ”لنہ کوئی ایسی صورت حالو کہ میں اپنی بیٹہ سے مل سکوں“ انھوں نے کہا تمہارے معاملہ میں کون دخل دے؟ اس وقت قبیلہ میں ایک سے ایک بڑھ کے حسین لڑکے پڑی ہوئی ہو مگر تم بیٹہ کے نام پر سٹے ہوئے ہو۔ جو دوسرے کی جوڑ و ہج کا بیانی بھی ہو تو یا تم بدکاری میں مبتلا ہو گے جسے ہم تمہاری شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ اور یا ذلیل ہو گے جو بات ہمیں گوارا نہیں ہو سکتی اگر تم اپنے نفس پر تھوڑا سا جبر کرو۔ اپنی خواہشوں کو روکو۔ اور پرہیز کی کر دو ابٹ گوارا کرو تو ساری دشواریاں دور ہو جائیں گی“ یہ سن کے جمیل پھوٹ پھوٹ کے رو دیا اور کہا ”بھائی اگر یہ میرے بس کی بات ہوتی تو تمہارا کتنا ٹھیک تھا۔ لیکن کیا کروں دل ہی قابو میں نہیں ہو۔ میں تو ایک قیدی ہوں جو اپنے نفع کی کوئی بات نہیں کر سکتا۔ میں تمہارے پاس اس لیے آیا تھا کہ میری مدد کرو اور درد دل کا کوئی علاج بتاؤ۔ یہ اگر تم سے نہیں ہو سکتا تو نہ سہی مگر مجھے اور زیادہ پریشان تو نہ کرو“ یہ سن کے دونوں کو ترس آ گیا۔ اور کہا ”خیر اگر تم جان دینے ہی پر تلے ہوئے ہو تو ایک تدبیر ہو سکتی ہو۔ بنی احب میں جاؤ ایک جانی دوست ہو۔ اُس سے مدد مل جائے گی۔ بیٹہ آج ہی رات کو قبیلہ کی اور بہت سی لڑکیوں کے ساتھ ایک میدان میں کھیلنے کو جائے گی۔ ہم تمہیں چھپ کے وہاں لے چلیں گے۔ اس سے ملنا۔ جب تک موقع ہو باتیں کرنا۔ اور جب جمع ہوتے دیکھنا میرے ان دوست کے گھر میں جا کے چھپ رہنا۔ اس طرح ایک ماہ تک تم وہاں قیام کر کے اس سے ملے رہنا“ جمیل نے کہا اُس سے بہتر کیا ہو سکتا ہو؟ اور اُن کے ساتھ ہمیں دل کے راتوں رات بنی احب میں جا پوننا۔ ساتھیوں نے وہاں پہنچنے کے جب اپنے دوست سے یہ خواہش بیان کی تو اُس نے کہا تم مجھے

ایک بڑی آفت میں پھنسا رہے ہو۔ ذرا بھی کھل گیا تو سارا قبیلہ میری جان کا دشمن ہو جائے گا۔ اُنھوں نے پھر اصرار کیا تو اس نے جبراً و قہراً منظور کر لیا۔ اور ساتھ ہی جمیل کو اپنے نیچے میں چھپا کے بٹھالیا۔ اور رات ہی کو اپنی لونڈی کے ہاتھ اُس کی انگوٹھی بٹینے کے پاس بیٹھی۔ بٹینہ انگوٹھی پہناتے ہی لونڈی کے ساتھ چل آئی۔ بڑی گرم جوشی سے ملی۔ اور رات بھر دونوں میں اظہارِ شوق کی باتیں ہی ہوتی رہیں۔ غرض مسلسل آتین تک دونوں یونہی راتوں کو طے رہے۔ تیسرے دن جمیل نے بٹینہ سے کہا: اُمس نیک دل آدمی نے ترس کھا کے مجھے اپنے نیچے میں بٹھالیا۔ اور مسلسل تین دن تک ہمیں وصل کی لذت حاصل ہوتی رہی۔ اب اس پر زیادہ بار ڈالنا نہیں اچھا ہو۔ مکن ہو کہ کسی کو خبر ہو اور اس پر آفت آجائے اسلئے میں اب رخصت ہوتا ہوں۔

جمیل اور بٹینہ کے عشق میں ایک مرتبہ دو چار روز کے لیے جوش رقابت نکل انداز بھی ہوا تھا۔ اور ہوا یہ کہ بٹینہ اپنے قبیلہ کے کسی خوش رو لڑکے سے باتیں کر رہی تھی کہ جمیل نے دیکھ لیا۔ اس کا جواب اُس نے یہ دیا کہ اُس کے سامنے وہ بھی کسی اور جوان لڑکی سے ہنس ہنس کے باتیں کرنے لگا۔ ان واقعات نے دونوں دونوں میں ذرا رکاوٹ پیدا کر دی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہجر کی تکلیف دونوں کو بغیر اور جتا ب کئے ہوئے تھی۔ ایک دن اسے دور سے دیکھ کے وہ آئی گراہیل کے ٹھٹھک کے آڑ میں الگ ہی کھڑی ہو رہی۔ جمیل کا دل ہاتھ سے نکل گیا۔ اور میں شعر پڑھے جن میں سے پہلے کا مضمون تھا: ”مجھے دھڑکا لگا تھا کہ ایسا نہ ہو موت مجھے چما کر دے اور دل کی حسرتیں دل ہی میں رہ جائیں۔“ سننے ہی بٹینہ کا دل بھی ہاتھ سے جاتا رہا۔ اور دونوں میں ملاپ ہو گیا۔ اس وقت جوش میں آ کے بٹینہ نے کہا: جمیل اپنا یہ شعر مجھے اپنی زبان سے سناؤ۔

تخلّی معاً و تشرّی نو بلطیہا اذا من اترابا من یروقبا

اُس کا ہم سن چاہنے والا اُس کے پاس سے گزرا ہوا اور وہ پرے
 کی آڑ میں کھڑی ہو کے اُسے کن انکھیوں سے دیکھ رہی ہو کہ جیل
 نے اس شعر کو پڑھا۔ بیٹھنے سن کے رونے لگی۔ پھر بولی ”جیل ایسا کبھی
 نہیں ہوا۔ اور تمہیں بتاؤ کہ تم سے بڑھ کے میرا چاہنے والا کون ہو گا؟“
 اب جیل ملک شام میں تھا اور اپنے قبیلہ بنی عذرہ کے سردار کا
 مکان تھا۔ اُس کی سات بیٹیاں تھیں اور ساتوں حسین و گل اندام
 تھیں۔ اُس نے چاہا کہ اپنی کسی بیٹی کا اُس کے ساتھ عقد کر دے۔
 ان لڑکیوں کو سمجھا دیا کہ بناؤ سنگھار کیے رہا کرو۔ اور جب موقع ملے جیل
 کو اپنی صورت دکھا دیا کرو۔ عاشق مزاج نوجوان ہوا اور اس کے ساتھ شریف
 شاہ فریفتہ ہوئے کہ اسے پیام دے۔ لڑکیوں نے یہ معمول کر لیا کہ جب
 اسے تنہا پاتین پر دہاٹھا کے اپنی بھلک دکھا دیا کرتیں۔ جب جیل کو
 معلوم ہوا کہ جان بوجھ کے یہ حرکت کرتی ہیں تو اُن کی تحقیر اور بیٹھنے
 کی تعریف میں چند شعر کہے اور بھاگ کھڑا ہوا۔ اور ملک مصر کی راہ لی
 بنی احب کا پڑا اور راستہ ہی میں تھا۔ اُن کے قریب پہاڑیوں میں
 ٹھہر گیا اور ارادہ کیا کہ بیٹھنے کا ایک جلوہ دیکھ لے تو قدم آگے اٹھا
 معشوقہ شیریں ادا کی ہلکاری کے شوق میں بیتاب تھا کہ ایک دن
 اتفاقاً بیٹھنے کے قبیلہ کے مرد کہیں باہر چلے گئے۔ بیٹھنے کا خیمہ سربراہ
 اس سڑک کے کنارے تھا جو شام سے مصر کو گئی تھی۔ کئی دن سے
 بارش تھی۔ اب پانی بھی ذرا کھلا تھا کہ بیٹھنے کیا دیکھتی ہو ایک
 شکستہ حال بھوکا بدوی نیچے میں آ کے پناہ گزین ہوا ہو۔ بیٹھنے کے
 پاس ایک بڑھیا تھی جو صورت دیکھتے ہی چونک کے بولی ”جیل؟“
 جواب ملا ”مان میں جیل ہوں؟“ اُس نے پیسیر اور مسکے کھلایا۔ پانی
 پلایا۔ اور جب اُس کے حواس درست ہوئے تو کیفیت پوچھی
 پوچھتین دن سے سانس کی پہاڑیوں میں چھپا ہوا تھا۔ اور منتظر تھا
 کہ مرد جالین اور پانی کھلے تو بیٹھنے سے آ کے ملوں اور اُس کا ایک

جلوہ دیکھ لوں۔ اس لیے کہ اب بین مصر کی طرف جاتا ہوں۔ پھر دیکھنے زندگی میں آنا نصیب ہوتا ہے یا نہیں۔ یہ سن کے بیٹھنے اس سے بڑی سچائی اور لطف کے ساتھ ملی۔ تھوڑی دیر تک دونوں نے مزے مزے کی باتیں کیں۔ اور جمیل اس سے رخصت ہو کے مصر چلا گیا۔

مصر کا حاکم و والی اُن دنوں عبدالعزیز بن مروان تھا۔ اس نے جمیل کی بڑی قدر کی۔ ایک اعلیٰ درجہ کے مکان میں ٹھہرایا۔ ہر طرح کی خاطر مدارات کی۔ اور بیٹھنے سے ملانے کا مضبوط وعدہ کیا مگر افسوس عمر نے وفانہ کی۔ وہاں چند ہی روز کے قیام میں بیمار پڑ گیا۔ اور مرض ہلک ثابت ہوا۔ اتفاقاً سہل ساعدی اور ایک اور شخص اُس کی عیادت کو آئے۔ اس لیے کہ جمیل اُس وقت کا بے مثل و بے نظیر شاعر تھا اور لوگ اس کی صورت دیکھنے کے مشتاق ہوتے تھے۔ سہل بڑے فقیہ اور مقتدا سے ملت تھے اُن کو دیکھ کے جمیل نے پوچھا ”بھلا ایسے شخص کی نسبت آپ کیا فرماتے ہیں جس نے زندگی بھر نہ کبھی زنا کیا ہو۔ نہ شراب پی ہو۔ نہ کسی کی جان لی ہو۔ اور پچاس

سال سے اس بات کی شہادت دیتا رہا ہو کہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ“ سہل نے کہا ”میں سمجھتا ہوں کہ اُس کی نجات ہوگی۔ مگر ان خوبیوں کا کون آدمی جو؟“ بولائیہ خاکسار ”سہل سن کے حیران رہ گئے۔ اور حیرت کے ساتھ پوچھا ”بڑے نجب کی بات ہو کہ قریب قریب تمھاری ساری زندگی تو بیٹھنے پر اٹھا عشق کرتے گذری ہو اور اپنے آپ کو ایسا پاکباز و متقی بتاتے ہو،، جواب دیا ”آپ جانتے ہیں کہ میں اب چند ہی روز کا مہمان ہوں۔ لیکن مرتے وقت بھی دعوے کے ساتھ کہتا ہوں کہ مجھے محمد رسول اللہ صلم کی شفاعت نہ نصیب ہو اگر کبھی میں نے جرمی نیت سے بیٹھنے کے پنڈے میں ہاتھ بھی لگایا ہو۔ وصال میں اکثر میرا یہ کام ہوا کرتا کہ اُس کا نازک ہاتھ لے کے اپنے مضطرب دل پر رکھ لیا کرتا جس سے فوراً تھوڑی دیر کے لیے تسکین ہو جاتی اور اس کے بعد پھر وہی بے قرار می پیدا ہو جاتی۔

شاید اس کے چند ہی روز بعد کا واقعہ ہو کہ بنی احب کے خیموں کے پاس ایک دن ایک فتر سوار آیا۔ اونٹنی سے اتر کے ایک ٹیلے پر چڑھ گیا۔ اور ایک پُرسوز نوے کی دُھن میں تین شعر گا گا کے سناے جن کا آخری شعر یہ تھا۔
 قومی بھینٹ فاند بنی بھو میل واکبی خلیک دُون کل غلیل

(بھینٹ اٹھ۔ اور چلا چلا کے بین کر اور اپنے اُس محبوب پر دھو سب و ستون آئی تھا)
 یہ اشعار نہ تھے جاو دستھے کہ سنتے ہی سارے قبیلے کی حورتیں خیموں سے نکل پڑیں۔ اور سر اسیبہ و مضطر اس تازہ وارد شخص کی طرف دوڑیں۔

آگے آگے ایک غزالِ رعنا اور حوروش ماہ سیاتھی جو نہایت بدحواس اور مضطرب الحال نظر آتی تھی۔ اپنے کُرتے کے دامن میں اُلجھتی اور ٹھوکرین کھاتی ہوئی آئی اور کہنے لگی ”اُو شخص اگر تو سچا ہو تو تو نے مجھے مار ڈالا اور اگر جھوٹا ہو تو سوا کر فراخدا کے لیے تاکہ ماجر کیا ہو؟“ اُس نے کہا ”میں جھوٹا نہیں سچا ہوں۔ جمیل غدری نے ارض مصر میں انتقال کیا۔ وہاں مجھ سے اُن سے راہ درسم پیدا ہو گیا تھا۔ اُن دنوں جب وہ سخت بیمار ہوئے اور یقین آ گیا کہ یہی مرضِ مرض موت ہو تو ایک دن تنہائی میں اُنھوں نے مجھ سے کہا کہ ایک بات کا اقرار کرو۔ جب میں مرجاؤں تو میرے پاس جو کچھ ہو تم لے لو اور مجھے دفن کرو۔ پھر اس کے بعد میری اونٹنی پر سوار ہو کے قبایل بنی عذرہ میں سے قبیلہ بنی احب میں جاؤ۔ وہاں پہرے کے میری قباپہن لو۔ اِس کا گریبان چاک کر ڈالو۔ اور کسی بلندی پر کھڑے ہو کے میرے یہ تین شعر بہ آواز بلند اہل قبیلہ کو سنا دو۔ چنانچہ دیکھ لو یہ انھیں کی قبا میں پہنے ہوئے ہوں جن کا گریبان چاک ہوئے

یہ حالت سننے کے بعد پھر بھینٹ کو کمان قرار تھا؟ زور و شور سے رونے پٹنے اور بین کرنے لگی۔ اور قبیلہ کی ساری عورتیں ماتم میں اُس کے ساتھ شریک تھیں۔ روتے روتے غش کھا کے گری۔ پھر دیر کے بعد اٹھی اور جمیل کے مرثیے میں اپنے اشعار پڑھنا شروع کیے۔ جو برابر تین شبانہ روز تک دبان پر جاری تھے۔ یہاں تک کہ تیسرے دن اشی

غم میں وہ بھی دنیا سے چل بسی۔ اور ستمہ میں دونوں عاشق و معشوق کی زندگی کے ساتھ اُن کی داستان عشق بھی ختم ہو گئی۔

اہل ادب میں ایک ایسا واقعہ مشہور ہے جو بٹینہ کے اس وقت مرجانی کے خلاف ہے۔ وہ یہ کہ بٹینہ جب بڑھیا ہو گئی تو ایک دن عبد الملک بن مروان نے بلوا کے اس کے اور جمیل کے عشق کے حالات اُس کی زبان سے سنے۔ اور سُن کے کہنے لگا ”بٹینہ۔ تم میں کوئی خرابی نہیں نظر آتی۔ آخر تم میں کیا بات تھی جو جمیل تم پر عاشق ہو گیا؟“ بٹینہ نے برجستہ جواب دیا: ”اور آپ میں کیا بات تھی جو لوگوں نے آپ کو خلیفہ بنا لیا؟“ اس جواب پر عبد الملک مارے ہنسی کے لوٹ گیا۔ اور انعام و اکرام کے ساتھ بٹینہ کو رخصت کیا۔

اس قصہ کو کسی شخص نے بنا لیا ہے۔ اور اگر صحیح ہے تو بٹینہ کا نہیں کسی اور عورت کا ہے۔ اس لیے کہ اہل سیر کو اس پر اتفاق ہے کہ جمیل کی خبر مرگ سننے کے بعد بٹینہ تین دن سے زیادہ نہیں جی۔ علاوہ برین واقعات سندر جہ بالا سے صاف ظاہر ہے کہ بٹینہ جو ان مری ہے جبکہ اس کے حسن و جمال میں کسی قسم کا فرق نہیں آنے پایا تھا۔ اور عبد الملک بن مروان ستمہ میں یعنی جمیل کی وفات کے چار ہی برس بعد دنیا سے رخصت ہو گیا اس لیے یہ غیر ممکن ہے کہ چار ہی سال کے اندر بٹینہ جو ان سے بڑھیا اور ایک نکل اندام حسینہ سے کر یہ منظر ضعیف ہو گئی ہو۔

عالمگیر قتال مغرب

دینا دالون کی آج تک ہمیشہ کٹے مرتے ہی گزری ہے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ امن و امان سے بہتر کوئی نعمت نہیں۔ تہذیب اور علمی ترقی ہمیشہ ہی تعلیم دیتی ہے کہ صلح جوئی سے بہتر کوئی اخلاقی خوبی نہیں ہے۔ انسان کا نام انسان انہی لیے رکھا گیا ہے کہ اس میں اُس اور میل جول کے جذبات ہیں۔ اور

وحشی درندوں کی طرح ایک دوسرے کے خون کا پیا سا رہنا اس کا کام نہیں لیکن حیرت اور بڑے تعجب کی بات ہو کہ یہی انسان جس نے اپنا نام انسان رکھا ہو اس سے بھی بڑے بھڑے نہیں رہا جاتا۔ تعلیم۔ تہذیب۔ مذہب اخلاق سب خاموشی کی زندگی بسر کرنے کی ہدایت کرتے ہیں مگر اس کی یہ حالت ہو کہ علم و فضل اور تہذیب و معاشرت میں جس قدر ترقی کرتا جاتا ہو اسی قدر زیادہ لڑا کا اور خونخوار ہوتا جاتا ہو۔

موجودہ دور تہذیب سب سے زیادہ مدعی امن ہو۔ کہا جاتا ہو کہ آج کل کی شائستگی نے خونریزی موقوف کر دی۔ اور جان کمین اس جدید تہذیب کا اثر پڑا ہو وہ ان قتل و خون کا بازار سرد پڑ گیا ہو اور لوگ نہایت ہی امن و امان کی زندگی بسر کرنے لگے ہیں۔ اگلی خونریزیوں کا الزام مذہب کو دیا جاتا ہو کہ صرف اپنے عقاید کے تسلیم کرانے اور اپنے گروہ کی بات بالا کرنے کے لیے وہ ملکوں میں شمشیر قتال بلند کرایا کرتا تھا۔ اور موجودہ تہذیب نے چونکہ مذاہب کا اثر کمزور کر دیا ہو اس لیے لوگوں میں خونریزی موقوف ہو گئی اور دنیا کو پینپنے کا موقع ملا ہو۔

لیکن تجربہ نے آخر کار ان دعویٰ کو بھی توڑ دیا۔ اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ان حاملانِ لوائے تہذیب اور ہر ہم کنان صفوفِ اویان کے ہاتھوں سے ایسی خونریزی ہو رہی ہو جیسی کہ آج تک دنیا میں کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ علم و فضل اور تہذیب تمدن میں جرمن اور فرانس کا ترقی آج کل دنیا کی تمام قوموں سے بڑھا ہوا ہو۔ اور ان کے بعد سب سے اعلیٰ درجہ انگلستان اور امریکا کا خیال کیا جاتا ہو جن کی نسبت یہ رای قائم کی گئی ہو کہ تحصیل زر کو علمی ترقی کے شوق پر ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن انھیں تین اشرکے ہاتھوں سے آج کل دنیا پر ایسے ظلم ہو رہے ہیں اور نوع انسان اس بے رحمی سے قتل ہو رہی ہو کہ اس کی نظیر سے دنیا کی تاریخ خالی ہو۔ کبھی مذہب کے ہاتھوں سے ایسا قتل عام نہ ہوا تھا۔ دولتِ برطانیہ نے بہت تلک رہنا چاہا۔ مگر بن پڑی اور مجبوراً اسے بھی اپنے ہاتھ خون میں رنگنا پڑے۔

تاریخ عالم کے آغاز میں یہیں مشرق میں تھا بھارت اور آرمین کی لڑائیوں اور مغرب میں ٹرائے کی معرکہ آرائیان نظر آتی ہیں۔ اول الذکر دونوں لڑائیوں کے مرد میدان ہندو اور عیسوی جنگ کے سورایونانی تھے۔ دونوں کے شعرا اپنی ان لڑائیوں کو دنیا بھر کی لڑائیوں سے بڑا بتاتے ہیں لیکن سچ پوچھیے تو تینوں میدان قومی الوا العزمی اور مقامی سپہ گری کے اعلیٰ ترین دنگل ضرور تھے۔ مگر ان کے حالات کے بیان کرنے میں شعراے قوم نے بہت ہی مبالغہ کیا ہے کیونکہ اُس عہد کی قلت آبادی کے لحاظ سے نہ اُن میں جان بازون کی اتنی کثرت ہو سکتی تھی اور نہ موجودہ ذرائع سفر کے مفقود ہونے کی وجہ سے اُن کی خونریزی کا میدان اتنا وسیع ہو سکتا تھا۔

اُس کے بعد ہزاروں سال تک اسی قسم کی حملہ آوریوں اور خونریزیوں کا میدان گرم رہا۔ اسیر یا دبا بل والوں کا ارض پیودا پر آنا اور ساری نسل اسرائیل کو تباہ کر دینا۔ زرتشتینر کا (جسے بعض محققین کیخسر و عجم خیال کرتے ہیں) میں کس لاکھ سپاہیوں کے ساتھ یونان پر چڑھائی کرنا اور بحری لڑائی میں بالکل تباہ ہو جانا۔ رویوں کا قرقا جتہ والوں سے لڑنا اور انھیں تباہ کرنا۔ گوٹھ اور ہن کی سی وحشی قوموں کے سیلاب کا ملک روم میں آنا اور رومی تمدن و تہذیب کا غارت ہونا۔ صحرائی نشینان عرب کے عالم گیر لشکروں کا عرب سے نکلتا اور مشرق سے مغرب تک ساری متمدن دنیا کو زیر و زبر کر دینا۔ فیکسبی مجاہدوں کے طڈی دل کا کوہستان آپس سے نکل کے بنی اسرائیل کی موجودہ زمین پر گرنا اور صدیوں تک خالص دینی مقاصد پر نوع انسان کی قربانی ہوتی رہنا۔ اور سب کے آخر میں قراقرم کی گھاٹیوں اور دشت قحاق کے صحرا سے اٹاری ورنندوں کے طوفان کا اٹھنا اور عربی تہذیب کے ساتھ لاکھ آدمیوں کو عدم آباد میں اڑالے جانا۔

یہ سب ہوا۔ اور اس میں خدا کی کڑوڑوں مخلوق تلوار کے گھاٹ اُتری مگر وہ وحشی تھے۔ جاہل تھے۔ غیر مذہب تھے۔ اور تمدن سے مس نہ رکھتے تھے۔ لیکن مذہب دنیا میں تعلیم و تہذیب کے اعلیٰ ترین کمال پر پہنچنے کے بعد بھی

خون کا سیلاب ہے۔ اور انسان کی سی بے فطرت امانت خاک بین ملائی جائے تو پھر ہمیں یہی کہتے بنتا ہو کہ یہ مثل "لاکھ ٹوٹے کو پڑھایا پڑوہ حیوان ہی رہا" جانوروں ہی تک محدود نہیں بلکہ انسان کو ہزار لکھائیے پڑھائیے۔ لاکھ مذہب و شائستہ بنائیے اصل میں وہ ایک خوشخوار درندہ ہی ہو۔ صلح کی برکتوں کا یقین رکھنے اور امن و امان کے فائدوں سے واقف ہونے پر بھی ادنیٰ سی چھیڑ پڑ ہی پڑتا ہو۔

انگلی غیر مذہب لڑائیوں کے بعد اب ہم مذہب لڑائیوں کا ذکر کرتے ہیں۔ اُن کا آغاز نیپولین بونا پارٹ کی الوالعزمی سے ہوا جس نے سارے یورپ اور مصر و شام میں ہل چل ڈال دی اور اپنی ملک گیری کی ہوس پر لاکھوں آدمیوں کی قربانی چڑھائی۔ اُس کے بعد اسی تہذیب کا تقاضا ہوا کہ دولت عثمانیہ کو جس سے یون پیش پانا دشوار تھا رفتہ رفتہ کمزور کیا جائے۔ پہلے نوہنیو کی بحری لڑائی میں زبردست دول یورپ نے اُن کے عثمانی بیڑے کو بالکل تباہ و غرق کر دیا۔ اور ہزاروں آدمی بحر فنا میں غرق ہوئے۔ پھر کرمیا کی لڑائی ہوئی جس میں مذہب دول یورپ کا مقصد یہ تھا کہ روسی اثر جنوب میں بڑھنے نہ پائے۔ اور ترکوں کو کسی قسم کا فائدہ نہ ہو۔ لکھو کھا خلقت اس لڑائی میں بھی ضائع ہوئی۔ اس کے بعد فرانس و جرمن کی پہلی لڑائی ہوئی جس میں لاکھوں بندگان خدا جرمنی کے شوق ملک گیری پر بھینٹ چڑھے۔ بعد ازاں روسیوں اور ترکوں کی لڑائی ہوئی جس کے لیے ایک زمانے سے اُن کے صوبوں میں فساد کرایا جاتا تھا۔ اُن کے وڈرا کو رشوتیں دی جاتی تھیں۔ اُن کی جایا میں شورش پیدا کرائی جاتی تھی۔ آخر لڑائی چھڑ گئی۔ اور تہذیب و مذہب بھی دونوں طریقوں سے لاکھوں آدمی دونوں حریفوں کی فوجوں اور رزم گاہ کی رحایا میں سے قتل ہوئے۔ ترکوں نے آخر کئی صوبے آزاد کر کے جان چھڑائی اور امن و امان قائم کرنے کی فکر کرنے لگے۔ مگر زبردست فتنہ پردازوں کی سازشوں کے سامنے ایک کمزور صلح جو کا کیا زور چل سکتا تھا۔ کبھی چین سے بیٹھنا نہ نصیب ہوا۔ مذہب دنیا کا یہ عام مشغلہ تھا کہ جب اور کوئی فکر نہ ہوتی

توجہ دینا ہے بلقان اور قلمرو عثمانیہ کے پائلٹس میں ہمسایہ دخل دہی شروع ہو جاتی۔ یہ سلسلہ جاری تھا کہ جاپان (جس نے مغربی عقابوں کی نظر سے پیچھے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا اور مذہبان مغربی کا سامنا نہیں کیا تھا) سر اٹھایا اور خم ٹھوک کے روس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ بحری و بری دونوں لڑائیاں ہوئیں۔ اور لکھو کا آدمی دونوں کے اغراض حکمرانی پر قربان ہوئے آخر بڑی مصیبت سے روس نے جان بچائی۔ اب چند روز بعد تہذیب کا یہ تقاضا ہوا کہ اسلامی سلطنتوں کا خاتمہ کر دیا جائے۔ ایران سے مراکش تک ہر جگہ لڑائی چھڑ گئی۔ روس نے ایران کی پھر پھڑانے والی بے بس رعایا کو دیو چا۔ اٹلی نے بے پوچھے کچھ اور بے وجہ متوجہ طرابلس کے ساحلی شہروں پر قبضہ کر لیا۔ فرانس نے برطانیہ کے مراکو کا ٹکڑا دیا۔ پھر جب اقتصادی تہذیب کے صلح پسندوں نے دیکھا کہ اٹلی کا طرابلس پر کوئی زور نہیں چلتا۔ ہمت ہارے دیتا ہو۔ اور اس کے حواس بجا نہیں۔ تو سب طرف سے تقاضا ہوا کہ دولت عثمانیہ طرابلس سے دست بردار ہو کے صلح کر لے۔ اور کچھ ایسی ریشہ دوانیاں چالاکیاں اور سازشیں کی گئیں کہ عثمانی وزارت نے اس کو قبول بھی کر لیا۔

اور تہذیب اجماع یورپ کی صلاح سے اس صلح نامہ پر دستخط ہوئے اور ادھر انھیں کرم فرماؤں کی عنایت سے تمام ریاستہائے بلقان نے دولت عثمانیہ کے مقابلہ میں اشتہار جنگ دے دیا۔ اور سارے جزیرہ نماے بلقان میں خون کی ندیاں بننے لگیں۔ دولت عثمانیہ ان سب کے مقابلہ میں کمزور نہ تھی مگر حسن تدبیر سے وہ کمزور کر دی گئی۔ جان بادشاہیوں کو پیٹ کی روٹی اور سامان جنگ دونوں سے محروم رکھ کے پٹوایا گیا۔ اور آخر نتیجہ یہ ہوا کہ سوائے تھوڑے سے مشرقی علاقہ یورپ کے جو قسطنطنیہ کے حوالی میں ہو تمام مقبوضات یورپ دولت عثمانیہ کے قبضہ سے نکل گئے۔ اور جن علاقوں پر نصرانی ریاست ہائے بلقان کا قبضہ ہوا تھا ان میں مسلمان رعایا پر ایسے مظالم ہونے لگے کہ سننے سے روئیں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ غرض لاکھوں خلقت امن کے زمانے میں بھی تہذیب یورپ کی نذر ہوئی۔

لیکن جو دولت ترکان آل عثمان سے چھینی گئی تھی اُس کا ہضم ہونا آسان نہ تھا غیر منقولہ مال غنیمت کی تقسیم میں دشواریاں پیش آئیں اور اُسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ جرمنی کی ایسی صاحب علم و فضل قوم نے جو موجودہ ترقیوں کا اعلیٰ ترین نمونہ تصور کی جاتی تھی روس کے مقابل اشتہار جنگ دیا۔ اور فرانس پر صرف اس لیے کہ وہ سلطنت روسیوں کی دوست ہو فوج بڑھائی۔ بلجیم کی غیر جانبداری کے قائم رکھنے کا جو پرانا عہد نامہ تھا اُس کے ساتھ خود بلجیم کو بھی پامال کر ڈالا۔ جس کی وجہ سے انگلستان کی ایسی صاحب علم اور صلح جو سلطنت کو بھی اس کے خلاف اشتہار جنگ دے دینا پڑا۔ اور ایک ایسی لڑائی چھڑ گئی جو دنیا کی تمام گزشتہ لڑائیوں سے زیادہ خوفناک ہونے کے ساتھ ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہو۔ یورپ میں چار طرف شمال و مشرق میں روس و جرمن کی سرحد پر وسطی یورپ میں پروس و آسٹریا کی سرحد پر شمالی بلقان میں سربو و آسٹریا کی سرحد پر اور مغربی یورپ میں بلجیم اور فرانس میں کئی ہزار میل کی مسافت تک خون کا میخ برسر رہا ہو۔ ایشیا اور انتہائے مشرق میں سواحل چین پر۔ افریقہ میں زنجبار سے لے کے شمالی و مغربی سواحل افریقہ تک۔ اوشینیا یعنی جزائرستان میں آسٹریلیا اور نیوزیلینڈ کے پاس کے جزائر میں خونریزی ہو رہی ہو۔ اور سمندر جو اگلے دنوں آزاد رہا کرتا تھا آج کل عموماً خطرناک ہو۔ اور جو خطرہ بالٹک اور مار تھ سی کے سواحل سے شروع ہوا اُس سے ایٹلیٹک اوشن بے شک اوشن۔ آرٹکٹک اوشن اور انڈین اوشن تک خطرے سے خالی نہیں ہیں بلقان کے مظلوم مسلمان شعی کا یہ شعر پڑھ رہے ہیں۔

دید ی کہ خون ناحق پروانہ شمع را چندان امان نہ داد کہ شب را سو کند
اور ہمیں مہذب قوموں کا یہ رنگ دیکھ کے یہی ماننا پڑتا ہو کہ تہذیب و شائستگی
سوا اس کے کہ انسان کو لڑائی کے لیے زیادہ تیار کرے۔ اور اس کی خونریزی
کی قوت و ہوس کو اور بڑھا دے اور کچھ نہیں کرتی ؟

دو حصہ تیار ہیں ضرور ملاحظہ ہوں۔ فی حصہ

اسرار و بار حرام لور



ہندوستان میں شرقی تمدن کا آخری نمونہ

محمد علی شاہ کے بعد امجد علی شاہ اریک آرای سریر شہر یاری ہوئے۔ محمد علی شاہ نے کوشش کی تھی کہ ولی عہد سلطنت کی تعلیم اعلیٰ درجہ کی ہو۔ چنانچہ انھیں علما و فضلا کی صحبت میں رکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ امجد علی شاہ بجائے اس کے کہ تعلیم میں کوئی نایاب ترقی کریں اخلاق و عادات کے لحاظ سے ایک فقہ مولوی بن گئے۔ عمان حکومت ہاتھ میں آنے کے بعد اُن کا جو کچھ حوصلہ تھا یہ تھا کہ وہ اور اُن کے ساتھ ساری رعایا جناب قبلہ و کعبہ کی طقہ گویش ارادت بن جائے۔ لیکن ظاہر ہے کہ علما سے دین و معتدایان ملت کو پائٹلس سے کسی قسم کا واسطہ نہیں ہو سکتا۔ وہ نہ مدبر سلطنت ہو سکتے ہیں نہ اسٹیشنرین۔ اُن سے جو کچھ ہدایت مل سکتی یہ تھی کہ سیدہ ون کی خدمت گزار کی جائے۔ اور سلطنت کا روپیہ مسوئین کی اعانت و دستگیری میں صرف ہو۔ اور یہ کام بھی ارادت کیش اور محتاط ہر وزیر گارفران روا ہے اور وہ امجد علی شاہ کی نظر میں اُسی وقت قابل اطمینان ہو سکتا تھا جب خود جناب محمد العصر کے مبارک ہاتھوں سے انجام پائے۔ چنانچہ ملک کی آمدنی میں سے لاکھوں روپیہ زکوٰۃ کے نام سے اُن کی نذر کیا جاتا۔ اور اُس کے علاوہ اور بھی بہت سی خیرات کی رقبین انھیں کے ہاتھ میں جاتیں۔ امجد علی شاہ کے لیے تقویٰ طہارے کا خیالی مرض بن گیا تھا۔ انھیں

اپنے خیال کی پابندی شرع سے اتنی فرصت ہی دلتی تھی کہ نظم و نسق مملکت
طرف توجہ کریں۔ جس کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ محمد علی شاہ نے اپنی تجربہ کاری و پیدا
معزی سے جو کچھ انتظامات کیے تھے سب درہم و برہم ہو گئے۔ اور یہ حالت ہو گئی جو
قاضی محمد صادق خان اختر کے بیان کے مطابق یہ تھی کہ تمام عمال بدکار بہ باطن
اور خود غرض تھے۔ رعایا تباہ تھی۔ زبردست کاٹھننگا سرپرست کاظم و مجرم کو سزا
نہ ملتی۔ خزانہ خالی تھا۔ رشوت ستانی کی گرم بازاری تھی۔ اور جو فتنے پیدا ہوتے
کسی کے مٹائے نہ مٹ سکتے۔

لیکن اس اتنا کی خاموشی اور تمدنی غفلت بے پروائی پر بھی انھوں نے عمل
حضرت گنج آباد کیا جو آج لکھنؤ میں تمام محلوں سے زیادہ صاف ستھرا خوب آباد
نہایت خوبصورت۔ دولت مند تاجروں کا اعلیٰ ترین بازار ہے اور رسول لائن کا
سب سے زیادہ بارونی حصہ ہے۔ انھوں نے لکھنؤ سے کانپور تک براہ راست
ایک پختہ سڑک بنوائی۔ اُن کے عہد میں سب سے بڑا کام یہ ہوا کہ لوہے کے پُل کی
عمارت بن کے تیار ہو گئی۔ اس پُل کی تعمیر کا واقعہ یہ ہے کہ اس کے اجراء اور پُر
غازی الدین حیدر نے انگلستان سے منگوائے تھے۔ مگر وہ پُرزے جب تک لکھنؤ
میں پہنچیں پہنچیں بادشاہ رگراے عالم جادوان ہو چکے تھے۔ نصیر الدین
حیدر کے عہد میں جب وہ پُرزے ولایت سے آئے تو انھوں نے اپنے دربار کے
انجینئر مسٹر سنیکلر کو اُن پُرزوں کے جوڑنے اور پُل کو بنا کے کھرا کر لینے کا ٹھیکہ دیا۔ اور
حکم دیا کہ وہ پُرزے رزیدنسی کے سامنے پار دریا کے کنارے ڈال دیے جائیں
جس مقام پر پُل کے یہ آہنی پُرزے ڈالے گئے تھے اُس جگہ کا پتہ دینے کے لیے
آج وہیں ایک گھاٹ اور شوالہ قائم ہے۔ مسٹر سنیکلر نے دریا کے اندر ستون قائم
کرنے کے لیے گہرے کنوین کھدوائے۔ اور ستونوں کی جڑانی بھی کر لائے مگر اسکے
بعد اُن سے کچھ کرتے دھرتے نہ بنی اور پُل کی تکمیل میں ناکامی ہوئی محمد علی شاہ
کے زمانے میں یہ کام ناتمام پڑا رہا۔ مگر امجد علی شاہ نے اپنے عہد میں اس کی
جانب توجہ کی اور پُل بن کے تیار ہو گیا۔ لیکن جو لوہے کا پُل آج کل قائم ہے وہ
امجد علی شاہ کے زمانے کا پُل نہیں ہے۔ وہ ایک ہینگنگ بریج یعنی لٹکنے والا پُل تھا

جس کا سارا بار چار بلند اور زبردست آہنی کھنبوں پر لٹک رہا تھا۔ انگریزی زمانے میں جب اُس کے پُڑے زنگ آلود ہو کے کمزور ہوئے اور اُس پر عام آمد و رفت میں خطرہ نظر آیا تو اسے منہدم کر کے اُس کی جگہ دوسرا آہنی پُل قائم کیا گیا اور وہی پُل اس وقت موجود ہے۔

امجد علی شاہ ہی کے زمانے میں اُن کے وزیر امین الدولہ نے امین آباد آباد کیا۔ جس کی آبادی رونق آج کل روز افزون ترقی کر رہی ہے۔ امجد علی شاہ نے اپنے زمانے میں اگرچہ کچھ نہیں کیا اور نہ اپنے شوق سے کوئی ایسی عمارت بنوائی جو آج کل اُن کی یادگار ہو۔ مگر شاید اپنے اتفاقاً دہریہ ساز کے صلے میں اُنھیں یہ قدرتی ناموسی حاصل ہو گئی کہ لکھنؤ کے آج کل کے دو سب سے زیادہ مشہور سب سے زیادہ آباد سب سے زیادہ بارون۔ اور سب سے زیادہ دولت مند محلہ امین آباد اور حضرت گنج اُنھیں کے عہد کی یادگار ہیں۔

آخر زمانے نے اُن کے دور کا ورق بھی اُلٹا۔ اور ۱۲۷۲ھ محمدی (۱۸۵۸ء) میں جبکہ عمر اٹھالیس برس سے کچھ ہی دن زیادہ تھی مرض سرطان میں مبتلا ہو کے دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اور اپنے آباد کیے ہوئے محلہ حضرت گنج میں بیٹو خان رسالدار کی چھاؤنی کے اندر دفن ہوئے۔ اُن کا امام باڑہ جس میں وہ مدفون ہیں حضرت گنج کے مغربی حصہ میں لب ٹرک موجود ہے جس کی عمارت اُن کی وفات کے بعد واجد علی شاہ نے دس لاکھ روپیہ صرف کر کے بنوائی تھی۔ یہ امام باڑہ حسین آباد کی ایک ناقص نقل ہے۔ اور اگر حسین آباد کی طرح اُس میں بھی روشنی ہوتی تو محرم میں لکھنؤ کا مشرقی حصہ بھی عالم نور بن جایا کرتا۔ اگرچہ اُس کے لیے کوئی وثیقہ نہیں معین ہو لیکن اُس کی آمدنی بھی کم نہیں۔ احاطے کی عمارت کے بیرونی رخ کی دکانوں میں بہت سے اچھے اچھے تاجروں کی دکانیں ہیں۔ اور اندرونی عارتوں میں بہت سے یوریشین وغیرہ رہتے ہیں جن سے گراہی کی معتد بہ رقم وصول ہوتی ہے۔ مگر گراہی وصول کرنے والوں کا یہ بھی احسان ہے جو محرم میں خاص قبر اور امام باڑے میں چند چراغ روشن کر دیا کرتے ہیں اب امجد علی شاہ کے بڑے بیٹے واجد علی شاہ تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوئے

اُن کا زمانہ اس مشرقی مدبار کی تاریخ کا آخری درق اور اسی مرثیہ پاستان کا آخری بند ہو۔ چونکہ انتراع سلطنت اُنھیں کے عہد میں ہوا اس لیے تمام اہل الرائے کے ہدف سهام اور نشانہ ملامت وہی بن گئے۔ اور قریب قریب تسلیم کر لیا گیا کہ زوال سلطنت کا باعث وہ تھے۔ لیکن جس زمانے میں اُن کی سلطنت کا خاتمہ ہوا ہر اُن دنوں ہندوستان کی تمام وطنی قوتیں ٹوٹ رہی تھیں۔ اور بڑی بھلی سب طرح کی قدیم حکومتیں دنیا سے مٹتی جاتی تھیں۔ پنجاب میں سکھوں کا اور دکن میں مرہٹوں کا دفتر کیوں اُلٹا جو بہادر زبردست اور ہوشیار مانے جاتے ہیں؟ دہلی میں مغل شہنشاہی کا اور بنگالے میں نواب اظہر بنگالہ کا استیصال کیوں ہوا حالانکہ ان میں اتنی طغیان مزاجی نہ تھی جتنی کہ لکھنؤ کے اریکے آراء سلطنت میں بتائی جاتی ہو۔ مذکورہ چاروں درباروں میں کوئی واحد علی شاہ نہ تھا حالانکہ اُن کی تباہی کھنؤ کی تباہی سے کم نہ تھی۔

اصل یہ ہے کہ اس عہد میں ادھر اہل ہند کی غفلت و جہالت کا پیمانہ چھلکنے کے قریب پہنچ گیا تھا اور اودھ دولت برطانیہ کی قوت اور برٹش قوم کی عاقبت اندیشی۔ قابلیت جفا کشی اپنی کوششوں اور اپنی اعلیٰ تہذیب و شائستگی کا شہرہ پانے کی روز بروز مستحق ثابت ہوتی جاتی تھی۔ غیر ممکن تھا کہ دانیانِ فرنگ کی ذہانت و طباعی خوش چہ میری و باضابطگی ہندوستان کی جہالت و خود فراموشی پر فتح نہ پاتی۔ زمانے نے ساری دنیا میں تمدن کا نیا رنگ اختیار کیا تھا۔ اور پکار پکار کے ہر ایک قوم سے کہہ رہا تھا کہ جو اس مذاق میں میرا ساتھ نہ دے گا مٹ جائے گا۔ زمانے کے اُس ڈھنڈورے کی آواز ہندوستان میں کسی نے نہ سنی۔ اور سب مٹ گئے۔ انھیں ٹٹنے والوں میں ایک اودھ کی سلطنت بھی تھی۔ جس کے زوال کا مارغریب واجد علی شاہ پر ڈال دینا معقنہ مذاق کے خلاف ہو۔

پابندِ شرع باپ نے واجد علی شاہ کو بھی علما کی صحبت میں رکھ کے اپنا سنا سنا چاہا تھا۔ اور یہ رنگ ایک حد تک واجد علی شاہ پر چڑھا بھی جو انقضاے عمر کے ساتھ زیادہ کھلتا گیا۔ مگر واجد علی شاہ کا اس میں کچھ زور نہ چلا کہ وارث سلطنت فرزند کا فطری رُجان عیاشی اور فنونِ طرب و نشاط کی طرف تھا۔ اگرچہ باپ کی تاکید سے لکھنے

پڑھنے کی تعلیم بھی اچھی تھی لیکن موسیقی کا فوق غالب تھا۔ ولی عہدی ہی میں اپنے ذاتی شوق سے انھوں نے باپ کے نقشے کے خلاف گویون اور ڈھاڑیون کو اپنی صحبت میں رکھا۔ گانا بجانا سیکھا۔ آوارہ عورتوں اور ڈوم ڈھاڑیوں سے ربط و ضبط بڑھایا۔ اور انجام یہ ہوا کہ جو لطف انھیں حسین عورتوں اور گویون کی صحبت میں آتا علی مذاق کی مہذب صحبتوں میں نہ آتا۔

باپ کے خلاف انھیں عمارت کا بھی شوق تھا۔ اور ولی عہدی ہی میں انھوں نے خاص اپنی محفل طرب اور عیش کے لیے ایک پُر فضا باغ اور اُس میں دو ایک مختصر خوبصورت اور پر تکلف مکان بنوائے۔ علی نقی خان جنہیں تخت پر بیٹھتے ہی خلعت و وزارت عطا کیا اُن سے زمانہ ولی عہدی میں ایک رنڈی کے گھر پر ملاقات ہوئی۔ اُن کی جوانانہ شوخ مزاجی نے مزاج میں درخود پیدا کیا۔ اور جب مذکورہ بالا باغ اور عمارت اُن کے اہتمام میں تعمیر ہو کے پسند آئی تو سمجھ لیا گیا کہ وزارت اور انتظام مملکت کے لیے اُن سے زیادہ موزون کوئی شخص نہیں ہے۔ واجد علی شاہ کی سلطنت کا آغاز تو اس عنوان سے ہوا کہ نوجوان باغی بادشاہ کو عدالت گسری اور اصلاح فوج کی طرف غیر معمولی توجہ تھی۔ سواری میں آگے آگے دو فقرہ صندوق چلتے جس کسی کو کچھ شکایت ہوتی عرضی کلمہ کے اُن میں ڈال دیتا۔ کبھی خود بادشاہ کے پاس رہتی۔ محل میں پہنچ کے حضور ان عرضیوں کو نکالتے اور اپنے ہاتھ سے احکام تحریر فرماتے۔ اسی طرح کئی نئے رسالے اور کئی پلٹین بھرتی ہوئیں۔ رسالوں کے نام بادشاہ نے اپنی منشیانہ طباعی سے بانکا۔ ترچھا۔ گھنگھور رکھے۔ اور پلٹنوں کے نام آخری۔ نادہری رکھے گئے۔ خود بدولت بہ نفس نفیس گھوڑے پر سوار ہو کے جاتے اور گھنٹوں دھوپ میں کھڑے ہو کے اُن کی قواعد اور فنون جنگ میں اُن کی مشاقی دیکھتے۔ اور خوش ہو ہو کے باکمال سپاہیوں کو انعام و اکرام سے سرفراز فرماتے فوجی قواعد کے لیے خود ہی فارسی اصطلاحات اور کلمات مقرر کئے "راست رو پس" بیا۔ دُست چپ گرد" چند روز بعد جوان حسین عورتوں کی ایک چھوٹی زنانی فوج مرتب کی گئی اور اُن کو بھی انھیں اصطلاحوں میں قواعد سکھائی گئی۔

مگر جدید عہد کا یہ نقش اولین چند روزہ تھا۔ پورا ایک سال بھی نہ گزرا ہوگا کہ طبیعت ان چیزوں سے اکتا گئی۔ زمانہ ولی عہدی کا وہی پُرانا مذاق پھر عود کر آیا۔ حسین اور آوارہ عورتوں سے صحبت بڑھی۔ ارباب نشاط کا بازار گرم ہوا۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں دودھ مٹھاڑی ہی ارکان دولت اور رمزین سلطنت تھے۔ بادشاہ کے دل میں اب اگر کوئی علمی اور شریفانہ مذاق باقی تھا تو وہ شاعری تھی۔ کیونکہ خود شعر کہتے اور شعر کی قدر کرتے تھے۔

لکھنؤ میں ان دنوں شاعری کا چرچا حد سے زیادہ بڑھا ہوا تھا۔ اکیلے لکھنؤ میں اتنے شاعر موجود تھے کہ اگر سارے ہندوستان کے شعرا جمع کیے جاتے تو انکی تعداد لکھنؤ کے شاعروں سے نہ بڑھ سکتی۔ تیرا اور سودا کی پرانی شاعری تقویم پارینہ ہو چکی تھی۔ اب ناسخ کی زبان اور آتش کے خیالات و ماعون میں بسے ہوئے تھے جن میں زند و صبا کے زمانہ کلام اور نواب مرزا شوق کی مثنویوں نے شہوت پرستیوں کی روح پھونک دی تھی۔ اور اسی مذاق کو بادشاہ کی طبیعت کا اصلی رنگ چاہتا اور پسند کرتا تھا۔

اسلامی شاعری کا رنگ خلافت اسلامیہ کی پہلی صدی تک تو یہ تھا کہ شاعر ایک خاص عورت پر عاشق ہوتے۔ اُس کا نام لے لے کے اُس کے حسن کی خوبیوں اور اُس کی اداؤں کی دلفریبیوں کو بیان کرتے اور اُس کی طرف خطاب کر کے اپنی مینامیوں اور بیقراریوں کو ظاہر کرتے۔ اکثر چھپ چھپ کے اُس سے ملنے مگر تہذیب و عفت کے دائرے سے کبھی قدم باہر نہ نکالتے۔ چند روز بعد عرب ہی میں معشوق گناہ ہو گیا۔ اور عموماً شعرا کا معشوق اُن کے خیال کا ایک پتلا بن گیا جسے زند مشرب تو کوئی حسین عورت یا کوئی خوب و لڑکا بتاتے۔ مگر صوفی تھوڑی سی مثنوی تاویل کر کے اُسے حسین مطلق یعنی خلاق عالم بتا دیتے۔ یہی سوچا ہوا چھپا ڈھکا مذاقِ زندی فارسی شاعری میں رہا اور یہی مذاق اس وقت تک اردو شاعری کا بھی تھا۔ مگر نواب مرزا شوق نے اپنی شاعری کو حسین پردہ دار عورتوں پر عاشق ہو کر اُن کے خواب کرنے کا آلہ بنایا۔ اور قیامت یہ تھی کہ اُن کی مثنویوں کی زبان ایسی خوبصورت بے تکلف اور شستہ و رفته تھی اور ان میں عاشقانہ جذبات

اس کثرت سے بھر دیے گئے تھے کہ مہذب و شائستہ لوگوں سے بھی بے دیکھے اور مزہ لے نہ رہا جاتا۔

واجد علی شاہ نے بھی ان غنویوں کو دیکھا اور چونکہ ماشارالدہ سے خود شاعر تھے اس رنگ کو اختیار کر کے اپنے بہت سے عشقوں اور اپنی عنفوان شباب کی حد با زندانہ بے اعتدالیوں کو خود ہی موزون کر کے ملک میں پھیلا دیا۔ اور اخلاقی دنیا میں اقراری مجرم بن گئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ بادشاہ تو بادشاہ و نر اور اُمرا میں بھی شاد و نادر ہی ایسے گزرے ہوں گے جنہوں نے عنفوان شباب میں اپنی شہوت پرستی کی ہوسوں کو جی بھر کے نہ نکال لیا ہو۔ مگر وواجد علی شاہ کی طرح کسی نے اپنے ان بے شرمی کے جرائم کو خود ہی پبلک کے سامنے پیش نہیں کیا تھا۔ وواجد علی شاہ زور میں آئے تو چاہے شاعری میں نہ بڑھ سکیں مگر اپنے جذبات و خیالات اور اپنے کارناموں کے عالم آشکارا کرنے میں نواب مرزا سے بھی دو قدم آگے نکل گئے۔ اور یہاں تک ترقی کی کہ بعض موقعوں پر انھیں بتدل بازاری مذاق اور فحش الفاظ کے استعمال میں بھی تامل نہیں ہوتا۔

وہ کہاریوں - رنڈیوں - خواصوں - محل کی آنے جانے والی عورتوں غرض صد ہا عورتوں پر عاشق ہوئے۔ اور چونکہ ولی عہد سلطنت تھے اپنے عشق میں خوب کامیاب ہوئے۔ جن کی شرمناک داستانیں ان کی فلموں - تحریروں - اور تصنیفوں میں خود ان کی زبان سے سن لی جاسکتی ہیں۔ اور یہی سبب ہو کہ تاریخ میں ان کا کیکر کیڑ سب سے زیادہ ناپاک اور تاریک نظر آتا ہے۔

چونکہ عارت کا بید فوق تھا اس لئے تحت نشین ہوتے ہی قیصر باغ کی عمارت بنوانا شروع کر دی۔ جو چاہے آصف الدولہ کی عارتوں کی طرح مضبوط نہ ہو مگر خوبصورتی اور شاندار میاں لاجواب ہے۔ اس میں بہت سی خوشنما اور باشان و شوکت و وزنی عارتوں کا ایک مربع مستطیل قبو در تک چلا گیا تھا۔ جس کا ایک رخ جو دریائے گانج تھا غدر کے بعد کھود ڈالا گیا۔ اور تین ضلع اب تک قائم ہیں۔ جن کو مختلف قطعات پر بانٹ کے گورنمنٹ نے تعلقہ داران اودھ کے حوالے کر دیا ہے۔ اور حکم دیا ہے کہ ان میں رہن اور ان کو اسی وضع میں قائم و برقرار رکھیں۔

قصر باغ کا اندرونی صحن جس میں چمن بندی تھی جلو خانہ کھلتا تھا۔ درمیان میں پتھر والی بارہ دری تھی جو آج کل لکھنؤ کا ٹائون ہال ہے۔ اس میں اور کئی عمارتیں بھی تھیں جو اب نہیں باقی ہیں۔ اس کے باہر بیان کے متعلق بہت سی شاہی عمارتیں تھیں جنہوں نے اس قطعہ زمین کو مجموعہ روزگار بنا دیا تھا۔ یہ عمارتیں قصر باغ کے مشرقی پھاٹک کے باہر تھیں۔ آپ کو اس پھاٹک سے نکلنے ہی دو لون جانب چوبی آکر نہیں ملتی تھیں۔ جن میں سے گزر کے آپ چینی باغ میں پہنچتے۔ وہاں سے بائیں ہاتھ کی طرف مڑ کے آپ جل پریوں کے ایک عالیشان پھاٹک پر پہنچتے۔ جس پر مدارالہام سلطنت لڑا اب علی نقی خان کا قیام رہتا تھا کہ ہر وقت جہان پناہ سے قریب رہیں اور وقت ضرورت فوراً بلا لیے جاسکیں۔ اس پھاٹک کے اُس طرف حضرت بلخ تھا۔ اور اندر ہی داہنی طرف چاندی والی بارہ دری تھی۔ یہ ایک معمولی اینٹ چرنے کی عمارت تھی مگر چھت میں چاندی کے پتھر چڑے ہوئے کیوجہ سے چاندی والی بارہ دری کہلاتی۔ اُسی سے ملحق کوکھی خاص مقام تھی جس میں خود جہاں آباد سلامت رہتے۔ اور وہیں نواب سعادت علی خان کی بنائی ہوئی پرانی کوکھی بادشاہ منزل تھی۔

اب اُن چوبی اسکرینوں کے گھلارے سے نکل کے دوسری طرف مڑے تو یہی وہ عمارتوں کا ایک سلسلہ دُور تک چلا گیا تھا جو چوکھی کے نام سے مشہور تھیں۔ ان عمارتوں کا بانی حضوری نانی عظیم اللہ تھا جنہیں بادشاہ نے چار لاکھ روپیہ دے کے مول لے لیا تھا۔ نواب خاص محل اور معزز محلات عالیات اس میں بنتی تھیں اس کے اندر غدر کے زمانے میں حضرت محل کا قیام رہا۔ اور یہیں انکا دربار ہوا کرتا تھا۔

یہاں سے ایک سڑک قصر باغ کی طرف آئی تھی جس کے کنارے ایک بڑا بھاری سایہ دار درخت تھا اُس کے نیچے گرد اگر دسنگ مرزا کا ایک نفیس گول چبوترہ بنایا گیا تھا۔ جس پر قصر باغ کے میلوں کے زمانے میں جہان پناہ جوگی بن کے اور گہرے پتے پن کے آتے اور دھن فی رما کے بیٹھتے۔ اس چبوترے سے آگے بڑھ کے ایک عالیشان پھاٹک تھا جو کبھی پھاٹک کہلاتا اس لیے کہ اس کی تعمیر میں

ایک لاکھ روپیہ صرف ہوئے تھے۔ اور اُس سے بڑھ کے آپ پھر قیصر باغ میں آ جاتے۔ قیصر باغ کی عمارت میں سلطنت کے اسی لاکھ روپیہ صرف ہوئے تھے۔ اور اُس کے چاروں طرف کی عمارتوں میں جہان پناہ کی بیگمیں اور پری ہال و ماہ طلعت خاتونیں رہتیں۔ جن کی جگہ اب غیب و غریب صورتوں کو دیکھ کے بعض پُرانے زمانے والے کہہ اٹھا کرتے ہیں۔

پُری ہفتہ رخ و دیو در کُشید و ناز بہ سوخت عقل ز جہت کہ این چہ بوی لعل است

قیصر باغ کے مغربی پھاٹک کے باہر روشن الدولہ کی کوٹھی تھی اسے واجد علی شاہ نے ضبط کر کے اُس کا نام قیصر پسند رکھ دیا تھا اور اُن کی ایک محبوبہ نواب معشوق محل اُس میں رہتی تھیں۔ اب اُس میں صاحب ڈپٹی کمشنر ہمار کی عدالت ہے۔ اُس کے سامنے اور قیصر باغ کے اِس مغربی پہلو پر بھی ایک دو سرا جلو خانہ تھا۔

سال میں ایک مرتبہ قیصر باغ میں ایک عظیم الشان میلہ ہوتا جس میں ہلکے کو بھی قیصر باغ میں آنے اور جہان پناہ کی عشرت پرستیوں کا رنگ دیکھنے کا موقع مل جاتا۔ بادشاہ نے سری کرشن جی کا رہس جو ہندوؤں میں مروج ہے دیکھا تھا۔ اور سری کرشن جی کی معشوقانہ وض عاشقی اس قدر پسند آگئی تھی کہ اُس رہس سے ڈراما کے طور پر ایک کھیل ایجاد کیا تھا جس میں خود کھینچتے مہذرات عصمت آیات گویاں بنتیں۔ اور ناز رنگ کی محفلین گرم ہوتیں۔ کبھی جوش جوانی کے جذبات سے جوگی بن جاتے۔ موتیوں کو جلا کے بھھوت بنائی جاتی ہیں کی بدولت فقیر سی میں بھی شاہی کے کرشمے نظر آتے۔ میلے کے زمانے میں ان محبتیان میں ٹھٹھیک ہونے کی عام اہل شہر کو اجازت ہو جاتی کہ اس فرط کے ساتھ کہ گہرے کپڑے پہن کے آئیں جس کا نتیجہ یہ تھا کہ اسی اسی برس کے بڑے بھی مشنگری کپڑے پہن کے پھیلا بن جاتے۔ اور بادشاہ کی جوانی کے باددُطرب سے اپنے بڑھاپے کا جام بھر لیتے۔

یہ رنگ چلا جاتا تھا اور کفنوں میں کمال پہ فکری کے ساتھ رنگ رلیاں سنائی جا رہی تھیں کہ گورنمنٹ برطانیہ کو رپٹینٹوں نے یہاں کے حالات سے آگاہ کیا اور وہاں کے بورڈ نے یہ فیصلہ کر دیا کہ ملک ادوہ کلر و برطانیہ میں شامل کر لیا جائے

اس حکم کی تعمیل کے لیے انگریزی فوج لکھنؤ میں آئی۔ اور یکایک خلافت تو قع بادشاہ کے حکم سنایا گیا کہ آپ کا ملک انگریزی ممالک غروسہ میں شامل کر لیا گیا۔ آپ کے لیے بارہ لاکھ روپیہ سالانہ اور آپ کے جلاوسی لشکر کے لیے تین لاکھ روپیہ سالانہ مہوار جو آپ کی اور وابستگان دامن کی ضرورتوں کیلئے بخوبی کافی مقرر کی گئی۔ اور آپ کو اجازت ہو کہ شہر کے اندر آرام سے بے فکر بن کے بیٹھیں۔ اور رعایا کی فکروں سے آزاد ہو کے بے غل و غش رنگ رلیاں منائیے یہ احکام سنتے ہی شہر میں سناٹا ہو گیا۔ خود بادشاہ نے رو دھو کے بہت کچھ عذر خواہی کی۔ بادشاہ کی مان اور خاص محل نے حق و کالت ادا کیا مگر گورنر جنرل بہادر کے حکم میں رو د بدل کر نا صاحب ریٹینٹ کے اقتدار سے باہر تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی گورنمنٹ نے بغیر کسی زحمت و مزاحمت کے ملک اودھ پر قبضہ کر لیا۔ اور بادشاہ مع اپنی والدہ مدلی عہد خاص خاص محلات اور جان نثار رفقا کے کلکتہ روانہ ہوئے کہ انگلستان جا کے اپیل کریں اور اپنی بیگناہی ثابت کر کے انتزاع سلطنت کے حکم کو منسوخ کرائیں۔

عربوں کی فطری جمہوریت

اہل عرب بالطبع جمہوریت پسند واقع ہونے میں اور اسی سبب سے قدیم الایام میں کبھی کسی سے وہ مفتوح ہوئے اور نہ کبھی انھیں کسی غیر قوم کی غلامی کرنی پڑی ان میں ہزار ہا سال سے ایک قسم کی طبعی اور فطری جمہوریت چلی آتی تھی۔ باہمی ربط و ضبط قائم رکھنے کے لیے وہ اپنے شیوخ کا حکم ضرور مان لیا کرتے تھے۔ مگر شیخ کی حیثیت قبیلہ کے ایک وکیل یا آج کل کی جدید اصطلاح میں نمائندے کی سی ہوتی۔ جس کی سرداری و سرگروہی کو زیادہ تر سیاسیات خارجہ اور بین الاقوامی معاملات سے تعلق ہوتا۔ مخالفہ (یعنی دو قبیلوں کا باہم دوستی و کجبتی کا عہد و بیان کرنا) ان کے تمام شیوخ کو اور ان کے ساتھ کل قبائل کو ملا کے ملک میں ایک عام پارلیمنٹ قائم کرا دیتا۔ اور قبائل کے شیوخ اس پارلیمنٹ کے ارکان بن جاتے۔ ان میں قومی آزادی اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ ارض عرب میں اکیلا ہاؤس

آف کاسٹری رہا ہاؤس آف لارڈز کبھی نہ قائم ہو سکا۔

اسلام نے عربوں کی اس فطری جمہوریت کے لیے ایک بین الاقوامی قانون بنا دیا جس سے انھیں اور زیادہ آزادی مل گئی۔ اور نظام مملکت قائم ہوئے۔ بین خدا و رسول کی فرمان برداری کے سوا دہ ہر قسم کی غلامی سے محفوظ ہو گئے۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو خلیفہ منتخب ہوئے ان کی حیثیت بالکل پریسڈنٹ کی سی تھی۔ جن کی حکومت اسی حد تک تھی جہاں تک شرعی قانون کے اجراء کا تعلق تھا۔ قرآن مجید نے ان کی نسبت "اولوالامر منکم" کہہ کے ان کی پریسڈنٹ کی حیثیت اور زیادہ مضبوط کر دی۔ اور خدا اور رسول کے بعد انھیں بھی حکومت کرنے کا حق مل گیا۔ چنانچہ اسی قرآنی اصطلاح سے ان کے لیے "امیر المؤمنین" کا خطاب ماخوذ کر لیا گیا۔

کہتے ہیں کہ اولوالامری کی شان خلفائے راشدین کے زمانے تک قائم رہی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ خلافت راشدہ بھی اس کو آخر تک نہیں بناہ سکی جس کی وجہ یہ تھی کہ اسلامی خلافت اب وہ انگلی عرب ہی کی پارلیمنٹ نہ تھی بلکہ عربوں کو دنیا کی ایک زبردست سلطنت مل گئی تھی۔ اور عربوں کی پارلیمنٹ کو جو صرف علاقہ ہامی عرب کے لیے موضوع تھی دنیا کے بڑے بڑے آباد اور تمدن ملکوں پر فرمان فرمائی کرنا پڑی۔ اور روم و عجم کی شخصی سلطنتوں کی رعایا سے سابقہ پڑا جو بادشاہ کو ظل اللہ اور بجائے خلیفہ رسول اللہ کا نائب اور اس کے کارخانے کا مختار رکھ بلکہ معبود و مسجود خیال کرتی تھی۔ اور ایسی رعایا سے سابقہ پڑنے کا لازمی نتیجہ تھا کہ عرب کی پارلیمنٹ کے پریسڈنٹوں سے شخصی فرمان رواؤں اور خود سر تاجداروں کی وضع ظاہر ہونے لگی۔ اور جس طرح سکندر اعظم ایران کو فتح کر لینے کے بعد اہل یونان کے مذاق کا حاکم نہیں باقی رہا تھا ویسے ہی عرب کے یہ خلفا دنیا کے بڑے بڑے ملک فتح کر لینے کے بعد صرف پرانی عربی پارلیمنٹ کے پریسڈنٹ نہیں رہ سکتے تھے۔ بلکہ لازمی تھا کہ شخصی سلطنتوں کے تاجدار بن جائیں۔

پہلے دو خلیفوں نے اپنی پرانی وضع کو آخر تک بنا ہا۔ مگر حضرت عثمان کی عبادت گزار سی و ترتیب قرآن ہی نے یہ شان دکھا دی کہ مالک مفتوحہ و مقبوضہ کی

شکایتوں سے کان بہرے کر لیے۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ حرم مدینہ میں خوف ریزی ہوئی۔
 بازار فتنہ گرم ہوا۔ اور وہ خود کمال مظلومی و استقلال کے ساتھ شہید ہوئے۔ حضرت
 علی کی خلافت کا آغاز ہی اندرونی جھگڑوں سے ہوا۔ اور ان اندرونی جھگڑوں ہی
 نے اُس کا خاتمہ بھی کر دیا۔ ان جھگڑوں اور خوزریوں کو عام موزین ہول و انا
 بتاتے ہیں۔ مگر دراصل یہ عرب کی قدیم جمہوریت کا جدید شخصیت سے مقابلہ تھا۔
 جس میں بظاہر شخصیت کو ادارہ جمہوریت کو فروغ ہوئی۔ اس لیے کہ عرب نے اس
 خلافت ہی کو جو شاہی منہی جاتی تھی اپنے آغوش سے نکال کے باہر پھینک دیا۔
 خلافت مدینہ سے گئی اور پھر نہ آنے پائی۔

حضرت علی ہی کے عہد میں عرب کے باہر دو دربار قائم ہو گئے تھے۔ ایک کوفہ
 میں جو ارض عراق میں عربوں کی ایک نوآبادی تھی۔ اور دوسرا دمشق میں جو ارض
 شام کا بہت ہی پرانا تاریخی شہر تھا۔ کوفہ میں آزاد قبائلی عرب کے بڑے بڑے
 فرقا آباد تھے اور جنھوں نے حکومت کی آزادیوں کو ہمیشہ روک لیا تھا۔ تک کہ
 حضرت علی کبھی اُن کو اپنا سچا مطیع و متعاہد نہ بنا سکے۔ مگر دمشق اور ارض شام
 کا نشوونما ہی شخصی حکومتوں کے آغوش میں ہوا تھا لہذا وہاں جب امیر معاویہ نے اپنے
 شخصی اقتدارت بڑھائے۔ اور قیصرہ روم کی شان و شوکت اختیار کر کے اپنے دربار
 میں دس ہاٹزم (شخصیت) بڑھائی تو کسی نے چون نہ کی۔ اور ساری رعایا غلامی
 اختیار کر کے لیے تیار ہو گئی۔ اور جو دو چار آزاد مشرب عرب وہاں موجود تھے
 اور دربار کا رنگ دیکھ دیکھ کے بگڑنے لگتے تھے اُن کو معاویہ نے اپنے علم و راہی فیاضی
 سے مطیع بنا لیا اگرچہ اُن دونوں درباروں میں نہ وہ عربوں کی سادی اولوالامری تھی
 اور نہ وہ اگلی امیر المومنین۔ مگر کوفہ اور دمشق کی آب و ہوا کا فرق اُس وقت صاف
 نظر آ گیا جب ایک سرکش مؤذی کی تلوار نے حضرت علی کی خلافت کا خاتمہ کر دیا۔ اور
 اُن کے جانشین حضرت امام حسن کو خود اپنے لشکر کے باہمی اختلافات سے تنگ آ کے
 خلافت چھوڑ دینا پڑی مگر معاویہ کا شخصی دربار آخر تک قائم رہا۔

حضرت علی ہی کے عہد میں عربوں کی فطری جمہوریت کا پہلا نمونہ خوارج تھے جن کا
 خیال تھا کہ علی اور معاویہ قومی حقوق کی طرف سے بے پروا ہو گئے اپنے ذاتی اغراض

و مقاصد کے لیے لڑ رہے ہیں۔ پھر جب دونوں کی مسلمہ پنچایت میں حضرت علیؑ ہی کے نائب نے کہہ دیا کہ دونوں مدعیان خلافت علیؑ کو دیئے جائیں اور کوئی تیسرا شخص خلیفہ منتخب کر لیا جائے۔ اور پھر اس پر حضرت علیؑ نے عمل نہ کیا تو عدلیہ بناوٹ کروئی آیا کریمہؑ ان الحکم اللہ کو اپنا شعار بنایا۔ اپنے جھنڈے پر اُسے لکھا اور دعویٰ کیا کہ ”اُس خلافت کے جو قرآن وحدیث کی پابندی میں حکومت کرے اور سچی اولوالامری ہو کسی حاکم کی تقلید اور غلامی نہ ناکرام ہو“ یہ لوگ شکستین کھانے پر بھی فنا نہ ہو سکے اور کوفہ وبصرہ کے اطراف میں بیٹے کے سرسلطنت اور خلافت سے مرتبائی کرتے رہے۔ اب دمشق میں خلافت کے نام سے شخصی حکومت کا دربار قائم تھا۔ جو قوانین شریعت اور عربی آزاد مشرعی سے روز بروز زیادہ دور ہوتا جاتا۔ اُس کے فرمان روا بنی امیہ تھے جن کی زبان قانون تھی۔ اور سارے ممالک دور و دراز اُن کے آگے سر بسجود تھے۔ مگر عرب کے اندرونی قبائل کو یہ دیکھ دیکھ کے تاب نہ آتی تھی کہ ہماری ہی قائم کی ہوئی خلافت اولوالامری سے فرعیت بنتی جاتی ہو اور ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ اسی جوش نے حضرت امام حسینؑ کو فہیدہ کرایا اور اسی نے چند روز کے لیے عبداللہ بن زبیر کی خلافت خاص مکہ معظمہ میں قائم کرائی۔ مگر دمشق کی شاہانہ فوجوں کے مقابل میں وہ بھی زندہ نہ رہ سکی۔

ابن زبیر کی خلافت کا خاتمہ ہونے کے بعد وسط عرب کے لوگوں کو صبر آگیا کہ اگر خلافت اولوالامری نہیں رہی تو اب وہ ہمارے ملک میں بھی نہیں۔ ہم اپنے ملک میں آزاد ہیں۔ اور وہی پرانی قبیلہ مندیان موجود ہیں۔ دمشق کا شاہانہ ترقہ دوسرے ملکوں کے ساتھ جیسا سلوک چاہے کرے ہماری آزادیوں میں فرق نہیں ڈال سکتا۔ اور جب وہ ہماری آزادیوں میں فرق نہیں ڈالتا تو ہمیں کیا پڑی ہو کہ خواہ مخواہ کو جھگڑا مول لیں۔ مگر اطراف کوفہ وبصرہ کے خوارج کا جوش کسی طرح دھیم پڑنے کو نہ آتا تھا۔ وہ برابر مقابلہ کیے جاتے تھے۔ اور کوئی بادشاہ ہو اُس کی جان کے دشمن تھے۔ رہ رہ کے ابھرتے تھے۔ گر گر کے سلجھتے تھے۔ شکستین کھاتے تھے اور پھر اُٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ مارے جاتے تھے اور پہلے سے زیادہ جوش خو خوار سی کے ساتھ حملہ آور ہوتے تھے۔

دیکر خلفا سے بنی اُسیہ نے توفوج کشی ہی کے ذریعہ سے اُنھیں دبانا چاہا مگر عمر بن عبد العزیز نے اُن سے مناظرہ کر کے اپنی علمی قابلیت اور اپنے دینداری کے اثر سے اُن پر فتح حاصل کی جس کا بیان لطف سے خالی نہیں۔ اُس کی خلافت کا آخری سال تھا کہ والی کو عبد الحمید نے رپورٹ کی کہ بسطام بن یسکر خابری نے جوش و ہوش کے لقب سے مشہور ہوا اسی دیر سا بھی جمع کر کے عراق میں سر اٹھایا ہے اور ہر سر پر خاشاک ہے عمر نے عبد الحمید کے نام فرمان بھیجا کہ اُن لوگوں کو اپنی طرف سے نہ چھڑو۔ کسی بہادر اور فداکار سردار کو فوج دے کے اُن کے مقابلے میں بھیج دو مگر تاکید کر دو کہ جب تک وہ لوگ فتنہ انگیزی و خونریزی کے مرتکب نہ ہوں اُن سے مقابلہ نہ کرے، اس حکم کے مطابق عبد الحمید نے محمد بن جریر بن عبد المذبحی کو احکام خلافت کی پابندی کی تاکید کر کے دوسرا سپہ گردن کے ساتھ روانہ کر دیا۔ جس نے بسطام کے مقابلے میں جا کے پڑاؤ ڈال دیا۔ اور خاموشی سے حریف کے حملے کا انتظار کرنے لگا۔

عمر بن عبد العزیز نے جس وقت یہ فرمان عبد الحمید کو بھیجا ہے اُسی وقت ایک دوسرا خط براہ راست بسطام کو بھیجا تھا جس کا مضمون یہ تھا کہ میں نے سنا ہے تم نے خدا و رسول کے حکم کے خلاف بغاوت اختیار کی ہے۔ حالانکہ میں مجھ سے زیادہ استحقاق خلافت کا نہیں ہے۔ اچھا آؤ۔ ہم تم مناظرہ کر لیں۔ اگر ہم حق پر ثابت ہوں تو ساری دنیا کے مسلمانوں کی طرح تم بھی میری خلافت کو خاموشی سے قبول کر لو۔ اور اگر تم حق پر ثابت ہو تو ہم غور کریں کہ اس معاملہ میں کیا کرنا چاہیے، بسطام نے معمول کے خلاف جب یہ رنگ دیکھا کہ خلافت کی زبردست فوج سامنے خاموش پڑی ہوئی ہے اور خود خلیفہ بحث کرنا چاہتے ہیں تو عمر بن عبد العزیز کو خط لکھا آپ جو کچھ فرماتے ہیں بجا و درست ہے اور آپ کی خواہش کے مطابق میں اپنے دو محمد علیہ غصمون کو یہ خط دے کے بھیجتا ہوں۔ ایک تو بنی شیبان کا ایک حبشی غلام عاصم ہے اور دوسرا میرے قبیلہ بنی یسکر کا ایک معمولی شخص ہے۔ دونوں بسطام کا خطالے کے مقام خاصہ میں پہنچے جہاں اُن دنوں عمر بن عبد العزیز تھا۔ اور حاضر دربار ہوئے عمر اُن سے اخلاق کے ساتھ پیش آیا۔ اور اطمینان سے قریب بٹھا کے پوچھا تم لوگوں نے کس لیے بغاوت اختیار کی ہے؟ اور سترابی کا اصلی سبب کیا ہے؟

عاصم۔ میں آپ کے ذاتی افعال و خصال کی شکایت نہیں۔ جانتے ہیں کہ آپ نیک نفس پابند شرع عدالت گستر ہیں۔ اور لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کرتے ہیں۔ مگر یہ بتائیے کہ آپ اولوالامر کس حق سے بن گئے؟ کیا ساری دنیا کے مسلمانوں نے مشورہ کر کے اور بہ رضا و رغبت آپ کو امام منتخب کیا ہے؟

عمر نہیں۔ مگر حالت یہ ہو کہ نہ میں نے لوگوں سے خلافت مانگی۔ اور نہ جبر حاصل کی مگر مجھ سے پہلے وہ جس شخص کے ہاتھ میں تھی عام اس سے کہ اس نے جائز طور پر حاصل کی ہو یا ناجائز طور پر اُس نے میری جانشینی کی وصیت کر دی تھی۔ اُس وصیت کے بموجب میں نے اُس کو قبول کر لیا۔ کسی نے اس سے اختلاف نہیں کیا۔ اور نہ تمھارے سوا آج تک کوئی جھگڑا کرنے والا پیدا ہوا تھا۔ تم لوگوں کی بھی یہ رائے ہے کہ ایسے شخص کو خلیفہ ہونا چاہئے جو انصاف کرے اور عدالت گستری سے کام لے۔ تو پھر مجھی کو وہ منصف شخص خیال کرو۔ اور اگر میں حق کے خلاف کوئی کارروائی کروں یا مصلحت مستقیم سے گمراہ ہو جاؤں تو پھر میری اطاعت تم پر فرض نہ رہیگی۔ یہ تقریر سن کے بسطام کے دونوں نائبوں نے کہا ”اچھا تو پھر ہمارا آپ کا ایک بات فیصلہ ہو جائے گا“

عمر۔ وہ کون سی بات ہے؟
عاصم۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آپ اُن تمام افعال اور حرکات و سکنات کو بُرا سمجھتے ہیں جو آپ کے گھرانے کے اگلے حکمرانوں سے سرزد ہوتے رہے۔ اور اُن کو ظالم و جابر مانتے ہیں۔ لہذا اگر یہ آپ کے نزدیک صحیح ہو کہ وہ ضلالت پر تھے اور آپ حق پر ہیں تو اُن پر لعنت بھیجئے۔

عمر۔ میرا خیال ہے کہ تم لوگوں نے دنیا طلبی کے لیے ہتھیار نہیں اُٹھائے ہیں بلکہ فلاح اخروی کے خواستگار ہو؟

عاصم۔ بے شک ہم دنیا نہیں چاہتے۔
عمر۔ مگر تمھاری اس درخواست سے تو معلوم ہوتا ہے کہ راہ راست سے بھٹکے ہوئے ہو۔
عاصم۔ کیوں؟

عمر۔ حدیث سے ثابت ہے کہ اللہ جل شانہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو

لنت بھیجنے والا پیغمبر بنا کے نہیں مبعوث کیا تھا۔ اور ابراہیم خلیل اللہ کا قول تھا کہ بار الہا جو میری پیروی کرے میرا جو میرا کائنات مانے اُس کے لیے تو بخشنے والا مہربان ہو۔ اور ان دونوں بزرگوں کی نسبت وہ حضرت رب العزت فرماتا ہے وہ لوگ جن جنہیں خدا نے ہدایت کی ہے۔ اُس لیے تم بھی اُن کی پیروی کرو۔ میں نے ان کو فتنہ خلفاء کے افعال کو ظلم مان لیا۔ مذمت اور عیب چینی کے لیے اتنا کافی ہے۔ رہا گنگوہار پر لعنت بھیجنا تو یہ کوئی ایسا فرض نہیں ہے جس سے مسلمان کو مفرجی نہ ہو۔ اور اگر تمہارے نزدیک فرض ہے تو بتاؤ تم نے فرعون پر کب اور کتنی بار لعنت کی ہے؟

جام ”ہم تو یاد نہیں کہ فرعون پر ہم نے کبھی لعنت بھیجی ہو۔“
 عمرؓ تو پھر تمہارے لیے تو اگر فرعون پر بھی لعنت نہ بھیجو جو بدترین خلق تھا کوئی مضائقہ نہیں۔ اور میرے لیے اتنی بھی گنجائش نہیں کہ اپنے اُن خاندانی لوگوں اور قربات داروں پر لعنت نہ بھیجوں جو مسلمان تھے۔ نمازی تھے۔ روزہ دار تھے۔ اور عبادت گزار تھے؟

جام ”جو روئے ظلم کرنے کی وجہ سے کیا وہ کافر نہیں ہو گئے؟“
 عمرؓ ہرگز نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو اسلام کی دعوت کی۔ اور جن لوگوں نے وہ دعوت قبول کر لی۔ اور آپ کی شریعت کو مان لیا اُن کے ایمان کو آپ نے تسلیم فرمایا۔ پھر اس کے بعد اگر اُن سے کوئی گناہ منہمک ہوا تو اُن پر صرف حد جاری کی گئی اسلام سے خارج نہیں کیے گئے۔“

جام ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو توحید کی طرف بلایا تھا۔ اور اس کے ساتھ یہ شرط تھی کہ آپ پر خدا جو احکام نازل کرے اُن کے ماننے کا اقرار کریں۔“

عمرؓ نے شک۔ مگر گزشتہ خلفاء نے نبی امیہ میں سے تو ایک بھی ایسا نہیں گذرا جس نے کہا ہو میں احکامِ نبوت کو نہ مانوں گایا سنت رسول اللہ پر عمل نہ کروں گا اصل حقیقت یہ ہے کہ شقاوت اُن پر غالب تھی۔ اور جن امور کو حرام جانتے تھے جان بوجھ کے اُن کے مرتکب ہوئے۔“

جام ”اچھا لعنت بھیجنے میں آپ کو تامل ہے تو اُن کے افعال پر برا کیجیے جو آپ کے عمل کے خلاف ہیں۔ اور اُن خلفاء کے احکام کی تردید کیجئے۔“

عمرؓ: اچھا بتاؤ تم ابو بکر و عمر (رضی اللہ عنہما) کو کیسا سمجھتے ہو؟ حق پر تھے یا باطل پر؟
 عاصمؓ: حق پر تھے۔ اُن کے افعال کو کون باطل کہہ سکتا ہے؟
 عمرؓ: انھیں اس کی خبر ہو کہ ابو بکر نے جب مردوں پر حملہ کیا تھا تو اُن کا قتل واقع کیا۔ اُن کے اہل و عیال کو لوٹدی غلام بنایا۔ اور اُن کی جائیداد پر قبضہ کر لیا؟
 عاصمؓ: جی ہاں معلوم ہے؟
 عمرؓ: اور یہ بھی جانتے ہو کہ ابو بکر کے بعد عمر نے مردوں کے اہل و عیال کو قیدیہ لیکے چھوڑا تھا؟
 عاصمؓ: یہ بھی جانتے ہیں؟
 عمرؓ: تو کیا عمر نے ابو بکر کے اس فعل سے تبرا کیا تھا؟
 عاصمؓ: نہیں؟
 عمرؓ: انھوں نے کیا سہی۔ خود تم اُن دونوں خلیفوں میں سے کسی ایک کے فعل سے تبرا کرتے ہو؟
 عاصمؓ: ہم بھی نہیں کرتے؟
 عمرؓ: اچھا اب ایک اور بات بتاؤ۔ غالباً انھیں معلوم ہو گا کہ تمھارے بزرگانِ نروان (سب سے پہلے خواجه جو حضرت علیؓ سے لڑے تھے) میں سے کوفہ والوں کو کہ سرکشی پر آمادہ تھے نہ خونریزی کی اور نہ کسی کا مال لوٹا۔ بخلاف اس کے بصرے والے نروائیوں نے یہاں تک بیعت اختیار کی کہ عبد اللہ بن خطاب اور اُن کی لوٹدی کو بھی نہ چھوڑا جو حاملہ تھی؟
 عاصمؓ: ہاں یہ تو ہوا تھا؟
 عمرؓ: تو کیا جن خوارج نے خونریزی کی تھی خونریزی نہ کرنے والوں سے یا جن لوگوں نے خونریزی نہیں کی تھی خونریزی کرنے والوں سے تبرا کرتے تھے؟
 عاصمؓ: نہیں؟
 عمرؓ: انھوں نے نہ کیا تو مضائقہ نہیں تم اُن دونوں فریقوں میں سے کسی ایک سے تبرا کرتے ہو؟
 عاصمؓ: نہیں۔ ہم بھی نہیں کرتے؟
 عمرؓ: تو کچھ تمھارے لئے تو اس قدر گنجائش ہو کہ ابو بکر و عمر اور اپنے کوفہ اور بصرے والے دونوں گروہوں کیساتھ باوجود اُنکے باہمی اختلاف اعمال کے تو لا کرتے ہو کہ مجھے اپنے اُن عزیزوں سے جو مسلمان اور دیندار تھے تبرا کئے بغیر مفر نہیں؟
 اس کے بعد عمر بن عبد العزیز نے انھیں لاجواب کچھ کے سمجھا نا شروع کیا کھڑے ہو کر

سج یہ ہو کہ تم لوگ جاہل ہو۔ اور سمجھ سے کام نہیں لیتے۔ جن باتوں کو رسول اللہ صلعم نے منع کیا ہے انہیں تو جائز کر لیتے ہو اور جن باتوں کو ناجائز بتایا ہے ان سے لوگوں کو منع کرتے ہو۔ جس شخص کے لیے رسول اللہ صلعم سے خوف تھا اُسے تمہارے یہاں امان ملتی ہے اور جسے آپ نے امان دی تھی اُس کے تم جانی دشمن ہو! کلمہ گو کو تمہارے یہاں امان نہیں ملتی حالانکہ آنحضرت اُسے امان دیتے تھے۔ اور اُس کی جان و مال پر دست درازی کرنا حرام بتاتے تھے۔ تمام مذاہب کے پیروں کا خون تم اپنے اوپر حرام سمجھتے ہو تمہارے یہاں ایک حلال ہے تو کلمہ گو کا خون! یہ تقریر سن کے بسطام کے وہ دونوں سفیر عاجز اور لاجواب تھے۔ اور سر جھکائے ہوئے سوچ رہے تھے۔ آخر وہ یشکری شخص مراٹھا کے بولا اچھا ایک بات بتائیے۔ فرض کجیہ کہ ایک شخص کسی قوم کی جان و مال کا مالک ہو۔ اُن لوگوں کے ساتھ انصاف اور نیکی کرتا رہے۔ لیکن آخر میں اپنی وہ حکومت اُسے ایک شخص کو دے دی جو اُس کا اہل نہ تھا۔ آپ ایسے شخص کی نسبت کیا کہتے ہیں؟ اُسے خدا ترسی کا حق ادا کیا یا نہیں؟

عمرؓ ہرگز نہیں۔ ایسے شخص کی نسبت کون کہہ سکتا ہو کہ اُس نے خدا ترسی کا حق ادا کر دیا؟

یشکریؓ۔ ایسا ہو تو پھر آپ یہ خلافت یزید بن عبدالملک کو کیوں دیے جاتے ہیں جس کی نسبت آپ جانتے ہیں کہ حق پر نہ رہے گا؟

عمرؓ گرا سے میں نے اپنا ولی عہد نہیں قرار دیا ہے بلکہ اُس کے بارے میں عبدالملک و سلیمان مجھ سے پہلے وصیت کر گئے ہیں میں ہں بارے میں کچھ نہیں کہتا۔ جب اُس کا زمانہ آئیگا تو مسلمانوں کو اختیار ہوگا کہ اُس کی اطاعت کریں یا نہ کریں؟

یشکریؓ یہ میں نے مانا کہ آپ نے اُسے ولی عہد نہیں بنایا۔ مگر جس کسی نے بنایا اُس کے اس فعل کو آپ کیسا خیال کرتے ہیں جائز یا ناجائز؟

یہ الفاظ سن کے عمر بن عبدالعزیز کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ پھر ضبط کر کے کہا اس کے جواب کے لیے مجھے تین دن کی مہلت دو، بسطام کے دونوں سفیروں نے قبول کیا یہ صحبت اسی پر ختم ہو گئی۔ درودہ دونوں نصرت ہو کے اپنی فرو دگاہ کو گئے۔

عمرؓ آل مروان کا سب سے بڑا دست خلیفہ عبدالملک بن مروان وصیت کر گیا تھا کہ اُس کے بیٹے ولید سلیمان۔ آمد یزید ایک دوسرے کے بعد اور بنگ نشین خلافت ہوں۔ عمر بن عبدالعزیز عبدالملک کا بھتیجا تھا۔ سلیمان نے وصیت کر دی کہ اُس کے بعد اس کا ابن عمر اور پھر اُس کے بعد سکا بھائی یزید خلیفہ ہو۔

اس کے بعد جب وہ دونوں آکے عمر بن عبد العزیز سے ملے تو عاصم نے صورت دیکھتے ہی کہا۔ ”میں تو اعتراف کرتا ہوں کہ آپ بالکل برسرِ حق ہیں، عمر نے یشکری سے پوچھا اور تم کیا کہتے ہو؟“ بولا۔ ”آپ نے جو کچھ تعریف کی گئی تھیں، مگر میرا بھی اطمینان نہیں ہو رہا ہے جو کچھ کہا ہے اسے عام لوگوں کے سامنے پیش کیجئے اور دیکھیے کیا کہتے ہیں۔“

یہ کہہ کے وہ یشکری واپس گیا اور عاصم عمر ہی کے پاس رہ گیا۔ عمر نے اسے انعام دیا اور اچھی طرح رکھا مگر اس کی عمر نے وفات کی۔ آنے کے چند رھوین ہی دن مر گیا لیکن اس واقعہ کے بعد سے عمر بن عبد العزیز کی یہ حالت تھی کہ بار بار زبان سے نکل جاتا یزید بن عبد الملک کے معاملہ نے مجھے خاک میں ملا دیا۔“ یہ سن کے بنی امیہ کو اندیشہ ہوا کہ ایسا نہ ہو عمر بن عبد العزیز دینداری کے جوش میں آکے کسی خیر کو ولی عہد مقرر کر دے۔ یہ ہوا تو غضب ہی ہو جائیگا اور پھر خلافت بنی امیہ کے گھرانے میں نہ آئے گی۔ اسی خطرے سے بچنے کے لیے لوگوں نے سازش کر کے عمر بن عبد العزیز کو ایک شخص کے ہاتھ سے زہر دوا دیا۔ اور چند ہی روز میں اس کا خاتمہ ہو گیا۔ مگر اس کی وفات سے پہلے ہی اس کی باتوں سے متاثر ہو کے بسطام سرکشی سے باز آ گیا۔ اور جو خلافت کی فوج اس کی روک تھام کے لیے گئی تھی واپس آئی۔

سچی بے حاصل

کچھ کرو۔ اور کیے جاؤ۔ کیونکہ تم کرنے ہی کے لیے پیدا ہوئے ہو۔ تم اسی وقت تک زندہ ہو جب تک کچھ کرتے ہو۔ تمہارا کچھ کرنا رکھا اور سمجھ لو کہ تم نہیں ہو۔ ”کام“ تمہاری زندگی کا شعار۔ اور انسانی ہستی کے علم کا بار کہ ہے۔ کوئی مرقی کا آسمان کوئی بلند بہتی کا عرش اور دکھائی دے اور تم اس کی طرف اڑو۔ کوئی آواز العزیز کا نہ نشین۔ اور کوئی عالی حوصلگی کی مسند نظر آئے اور تم اس کی طرف دوڑو۔ کوئی ہزار روکے نہ روکو۔ ہزار منع کرے نہ مانو۔ دیر می و استغفار کے ساتھ بڑھتے ہی چلے جاؤ۔ کیونکہ نا کامیاء نہ چلنے ہی میں ہیں۔ چلے اور پہونچے تمہارا ہمت بندھ جائے والا کڑکیت کہہ رہا ہو۔ لیکن انسان الہا سچی آہی نعرہ لگاتے

ہوئے بڑھو اور منزل مقصود میں پہنچ جاؤ۔ اسی طلسمی عمل کو تعویذ کی طرح بازو پر باندھ کے ہاتھ بڑھاؤ۔ اور جو کچھ چاہتے ہو لو۔ مگر بان شرط یہ ہو کہ ہمت پوری اور تجویز سچی ہو۔ تمھارے کام میں بھی سعی کی شان پیدا ہوئی اور دشواریوں۔ نا کامیوں۔ مزا جھٹوں اور مصیبتوں کی یہ خطرناک گھاٹی سی جو سامنے نظر آرہی ہو اس سے من طلب وجہ کے موکل فرشتوں نے ایک تھیلے کے پردے کی طرح ہٹا کے تمھیں شاہد آرزو کا جلوہ دکھا دیا۔

جب کبھی ہم کسی دشوار اور اپنی حیثیت سے بڑھی ہوئی آرزو کے حصول کے لیے قدم مارتے ہیں۔ یا کسی ایسے کام کو شروع کرتے ہیں جس میں کامیابی مشکل نظر آتی ہو تو اکثر اجاب کی ناصحانہ زبان سے سنتے ہیں۔ ”بیکار محنت سے کیا حاصل؟“ اور ”اس سعی بے حاصل کا کیا نتیجہ؟“ مگر آہ اوہ یہ نہیں جانتے کہ حرکت ہی میں برکت ہو۔ اور ”الحاصل“ ”تجربہ“ ”دشوار“ ”مشکل“ ”بلکہ محال“ ”غیر ممکن“ اور اسی طرح کے تمام ہمت شکن الفاظ سب انھیں لوگوں کے لیے ہیں جو ان الفاظ کو ان کے متعارف معنوں میں لیتے ہیں۔ ساری مشکل تمھارے مشکل جاننے سے ہو۔ اور تم محال نہ جانو تو سچ اور حقیقت یہ ہو کہ کوئی چیز محال نہیں ہو۔ کیا تم نے نہیں سنا کہ بعض اعلیٰ درجہ کے الوائے ہونے محال کا لفظ اپنی لغت میں سے نکال ڈالتا تھا؟ اور اس کے سے تمام عالی ہمت لوگوں کے نزدیک محال وغیر ممکن کوئی چیز نہ تھی؟

اصل یہ ہو کہ فائدہ اور نتیجہ ہو یا نہ ہو کچھ کرتا رہنا ہماری فطرت ہو۔ اور بے کچھ کیے ہم رہ ہی نہیں سکتے۔ تم نے کسی صوفی کو کبھی حال آتے دیکھا ہو؟ مغنی کے ایک پڑا اثر شعر اور معنی نیز کلام پر دھس طرح بیخود ہو کے ناچنے لگتا ہو؟ اسی طرح ہمارے دل میں جس وقت کوئی جوش یا خیال پیدا ہوتا ہو ہم بھی غبور ہو جاتے ہیں کہ وہ جوش جس وضع سے کہے ہاتھ بلانے اور اسی کی گت پر ناچنے لگیں۔ لہذا ہمارا کام ہو کہ بلالجا تا اس کے کہ کامیابی ہوگی یا ناکامی ہاتھ پاؤں مار میں اور کوشش کا دامن پکڑ لین چاہے وہ پھٹ کے ہمارے ہاتھ ہی میں رہ جاے۔ فلسفۂ اسباب و علل کا گرویدہ ہمارے کاموں کا عا بہ کرتا اور ہمارے تمام افعال کی علت و غایت پر پوچھتا ہو۔ ہم اگر جواب میں یہ کہیں کہ کوئی غرض نہیں تو ہمیں

عہ : ہاتھ نیپولین بونا پارٹ کا ہو۔

جنون بتاتا ہے اور اگر یہ جواب دین کہ ہمارے تمام افعال کسی دوسری قوت کے تابع اور بجائے خود اضطرابی ہیں تو ہمیں "جبریت" کا لازم ٹھہرا کے وہ ہماری نسبت بے دینی و لاد مذہبی کا فتویٰ دیتا ہے۔ وہ چاہے ہمیں کچھ کے اور کیسے ہی الزام دے مگر ہم اپنی فطرت سے مجبور ہیں۔

اے پرستاران عقل! ہر شخص سے اُس کے حرکات و سکنات کا سبب نہ پوچھا کرو۔ کیونکہ چون و چرا کا میدان بہت تنگ ہے۔ اور علت و معلوم کا سلسلہ جگہ نہیں چلتا۔ دیکھو پہاڑ کی چوٹی پر سے اُس بد نصیب کے قدم کو لغزش ہو گئی۔ آہ وہ اگرا۔ اور لڑھکتا۔ قلاباز یاں کھاتا۔ چٹانوں سے ٹکراتا۔ اور سنگلاخ سلون کی رگڑ میں کھاتا ہوا نیچے چلا آتا ہے۔ اس قرفنا میں جاتے وقت اگرچہ اُسے یقین ہے کہ ساری کوششیں بے سود ہیں۔ مگر دل نہیں مانتا۔ کبھی کسی پتھر کو پکڑ لیتا ہے۔ اور کبھی کسی گھاس پر ہاتھ مارتا ہے۔ پتھر ہاتھ سے پھوٹ جاتا ہے۔ اور گھاس کی پتیان ٹوٹ کے مٹھی میں رہ جاتی ہیں۔ مگر وہ اپنی سعی لا حاصل سے باز نہیں آتا۔ اُس سے نہ پوچھو کہ یہ بے نتیجہ کوششیں کیوں کر رہے ہو؟

اُس شکستہ بخت کشتی شکستہ کو دیکھتے ہو جسے عدم آباد کے پُرخطر سفر میں سہارا دینے کے لیے کوئی ٹوٹا تختہ بھی نہیں نصیب ہوا؟ ناپید اکنار سمندر میں زور و شور سے ہاتھ پاؤں مارتا۔ اور اُس سیاہ چٹان کی طرف جا رہا ہے جو کوسوں کی مسافت پر ایک دیو زاد کی طرح سطح آب پر کھڑی ہوئی اُسے اپنی طرف بلارہی ہے۔ جانتا ہے کہ وہاں تک پہنچنا انسان کی امکانی کوشش سے باہر ہے۔ اور بغرض محال پہنچنے بھی تو وہاں کسی مسم کا سامان زندگی نہیں موجود ہے۔ مگر اُسے ان انجما مون کا مطلق خیال نہیں۔ زلیست کی کوئی امید نہیں ہے؟ مگر دیکھو اُس ٹہنی پر جو کہیں سے بہتی ہوئی آگئی ہے ہاتھ مارتا ہے کہ اُسے پکڑ کے ڈوبنے سے بچ جائے۔ اُس تنکے کا سہارا چاہتا ہے جسے موجیں خدا جانے کہاں سے بہا لائی ہیں۔ تم ہی نہیں کہتے خود اُسے بھی معلوم ہے کہ یہ سعی بے حاصل ہے مگر اپنی سعی کو گزر رہا ہے۔ اور بے کیے نہیں رہا جاتا۔

ان دونوں انتہا درجے کے مایوسان زیست کو تم نے دیکھ لیا کہ گو انھیں یقین
 واثق تھا کہ کوشش بے فائدہ اور ہاتھ پاؤں مارنا بے سود ہو مگر اپنی سی
 کیے گئے۔ اور مرتے دم تک کچھ کرتے ہی رہے۔ یونہیں تم بھی دم واپسین
 تک اپنا کام کرتے رہو۔ شہید اور پڑکے مرنے والے میں یہی فرق ہو کہ پہلا مرتے
 دم تک کوشش کا دامن نہیں چھوڑتا اور دوسرا ہاتھ پاؤں ڈال کے
 پڑ جاتا ہے۔ اگرچہ دوا درمن اور تدابیر صحت سے یہ بھی باز نہیں آتا مگر شہید کی
 کوشش زیادہ جان بازی کی ہو اور اسی لیے اُس کو ابدی زندگی نصیب ہو گئی۔
 اس سے تم اس نتیجہ کو بہ آسانی پہنچ سکتے ہو کہ جو آخر تک اپنا کام کرتا رہے
 اور کوشش کے جائے واصل مرنے ہی نہیں۔ اس کی موت صرف ظاہر
 میں نظر آتی ہو حقیقت میں اُسے ابدی زندگی حاصل ہو گئی۔ کیونکہ اُس کی
 سعی و کوشش ہی اُس کے حق میں آب حیات بن جاتی ہو۔

اسباب و علل کا سلسلہ کوششوں کے عالم میں چلتا بھی ہو تو اسی
 حد تک جہان تک کہ ہم پر یاس و ناامیدی کا غلبہ نہ ہو۔ مایوسی کے بعد ہم
 جو کچھ کرتے ہیں وہ ہمارا ایک اضطراری فعل ہوتا ہے جب چڑیا بلی کے منہ
 میں جا کے پھڑ پھڑاتی اور بکری شیر کے پنجے میں پھنس کے چلائی اور
 ہاتھ پاؤں مارتی ہو اُس وقت اُسے حس نہیں ہوتی کہ ہم یہ کیوں کر رہتے
 ہیں۔ اسی طرح ہمارے عالم یاس کے مضطربانہ حرکات کے متعلق اگر ہم سے سوال
 کیا جائے کہ ”یہ کیوں کیا؟“ اور ”یہ کیوں نہ کیا؟“ تو اول تو ہمیں جواب دینے کی
 فرصت ہی نہیں ہوتی۔ جو سراپا مصروف سعی لا حاصل ہو اُس کے کان ب
 طرف سے برے ہو جاتے ہیں۔ اور اگر توجہ کرنے کی فرصت مل بھی جائے تو
 اس وقت ہمارا دماغ چون و چرا کا بار اٹھا ہی نہیں سکتا۔ ہم خود ہی نہیں
 جانتے کہ یہ کیوں کر رہے ہیں۔ تمھیں کیا جواب دیتے؟ بس اتنا ہو کہ اپنے ان
 مضطربانہ افعال اور اپنی ان بے نتیجہ کوششوں سے ہم اپنے جوش کی
 آگ پر پانی ڈالنے اور اپنے بیتاب دل کو گونہ تسکین دیتے ہیں۔ ہم یہ ہرگز
 نہیں سمجھتے کہ اس ہاتھ پاؤں مارنے سے مطلب حاصل ہو جائیگا مگر ان یہ

بے بسی کی حرکتیں ہمارے دل کو ایک طرح کی تسکین دیتی اور اُس تسکین میں کچھ ایسی لذت ہو کہ تم ہزار رو کو لاکھ منع کرو۔ زبردستی کپڑو۔ اور ہمارے ہاتھ پاؤں باندھ تک دو مگر ہم نہ باز آئیں گے۔ خدا عزوجل رحمت کرے ہمارے فطرت شناس شاعر کو جو کہتا ہو۔

بس جہوم نا امید ہی خاک میں مل جائے گی وہ جو اک لذت ہماری سعی بے حاصل میں ہو غالب مرحوم سے پہلے سعی بے حاصل کی لذتوں سے کوئی شاعر نہیں آشنا تھا اور نہ کسی نے بتایا تھا کہ ان مضطربانہ حرکات یا س میں کیا مرزہ ہو؟ اور قہر بل کن جذبات کا نتیجہ ہو؟

لو لو لو

اسلام کے پوئلہ انگریزی زبان میں وہ ایمانہ رسالہ ہے جو اجماع کمال الدین نے تبلیغ اسلام کیلئے انگلستان کو آج بھائی کو ششون سے حقیقت اسلام کے جو معجزات ظاہر ہو رہے ہیں محتاج بیان نہیں ہیں۔ اُن کی جو انفرادی اور سچی محبت دین نے انگلستان میں۔ انگلستان ہی نہیں ساری مسیحی دنیا میں۔ بلکہ مسیحیت کے آغوش میں اسلام کی مینا دقام کر دی۔ جو کام لاکھوں کڑبڑوں روپیہ اور صد ہا علما کی کوشش سے نہ ہوتا اُسے خواجہ صاحب نے اپنے قناعت کے سرمایے اور اپنی تنہا کوشش سے کر دکھایا۔ اب وقت ہو کہ اُنکی مدد کی جائے اور اُن کا کام بڑے پیمانے پر جاری کیا جائے۔ اگر اب بھی مسلمان نہ چرئیں اور اُن کی احانت میں جوش نہ دکھائیں تو بھٹنا چاہیے کہ وہ کچھ نہ کر سکیں اور اُن سے کسی قسم کی امید نہیں۔ اُنکی فسوناک خیال پیدا کیا گیا تھا کہ خواجہ صاحب احمدی گروہ کے ایک رکن ہیں اور اُنکی کوششوں کا آل مرزا صاحب کی امامت و نبوت کا اثبات ہوگا۔ لیکن آجنگ خواجہ صاحب اپنی ساری تبلیغ میں کبھی کسی ایسے مسئلہ کو نہیں چھیڑا جو عام مسلمانوں میں اور احمدیوں میں مختلف فیہ ہو۔ قطع نظر اس کے اب کھل گیا کہ وہ احمدیوں کے اعتدال پسند گروہ میں ہیں جو عام اہل سنت سے زیادہ اختلاف نہیں رکھتا اور اُن کا دیانی اسٹریٹ لوگوں سے الگ ہیں جن کا خوفناک اصول یہ ہے کہ اپنی مسجد کے سوا ساری دنیا کی مسجدیں طوحا دو۔ اور اگر فرض کیجئے کہ خواجہ صاحب کی معتدل احمدیت بھی

مسلمانوں کے لیے ناقابل برداشت ہو تو ہم انہیں اتنا بے وقوف نہیں سمجھتے کہ اصلی اصول اسلام اور اس کی حقیقی خوبیوں کو چھوڑ کے وہ یورپ کے سامنے ہمارے فریقی اختلافات کو پیش کر کے دین اسلام کو بدنام۔ عام مسلمانوں کو ناراض۔ اور اپنی تبلیغ کی قوت کو خود ہی کمزور کر دیں گے۔ اور اتنے دنوں میں جو کچھ کیا ہو اسے اپنی بے عقلی پر قربان کر کے رکھ دیں گے۔

یہ تو ان مسلمانوں کے لحاظ سے تھا جو احمدیت سے تعصب رکھتے ہیں۔ رہا خود ہمارا خیال وہ تو یہ ہو کہ یورپ کے لوگوں میں خالص دین اسلام کی تبلیغ ہونی چاہیے بلا لحاظ اس کے کہ فرق اسلام کی باہمی جزئی بحثوں کا خیال کیا جاسے۔ اور اگر بالفرض خواجہ صاحب کی طرف سے اس کا اطمینان نہیں ہو تو بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ اس لیے کہ ہمارے نزدیک یورپ والوں کا احمدی مسلمان بن جانا لاکھ درجہ بہتر ہو بقا ملی اس کے کہ وہ تثلیث پرست رہیں۔

اس لیے اسلام کے امراء اور دولت مندوں کا تو یہ فرض ہو کہ خواجہ صاحب کے مشن کی کامیابی کے لیے دریا دلی سے چندہ اور بھاری رقمیں دین مگر عام تعلیم یافتہ مسلمانوں پر یہ واجب ہو کہ ہر شخص اپنا قومی و مذہبی فرض خیال کر کے ان کے اس انگریزی رسالے اسلامک ریویو کی خریداری کرے جو نہایت ہی عمدہ کاغذ پر چھپتا ہو اور تبلیغی مباحث و مضامین کے ساتھ خواجہ صاحب کی ماہانہ کارگزاریوں کے نتائج سے مطلع کر دیا کرتا ہو۔ قیمت سالانہ سات روپیہ ہو۔ اس لیے کہ جتنے رسالے فروخت ہوتے ہیں ان سے زیادہ یورپ کے عیسائیوں میں مفت تقسیم ہوتے ہیں۔ درخواستیں "ماسک (مسجد)۔ وکنگ۔ انگلینڈ" کے پتہ پر خواجہ کمال الدین صاحب بی۔ اے۔ ال۔ ال۔ بی۔ یا مولوی محمد صدر الدین صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی کی خدمت میں بھیجی جائیں۔





انگریزی حکومت سے پہلے جب دہلی کا دربار غلیظہ برقرار تھا۔ پھر اُس کے بعد لکھنؤ میں جب اودھ کی چند روزہ سلطنت قائم تھی، یہیں بانگون کا ایک عجیب و غریب گروہ نظر آتا ہے جن کا انجام یہ ہے کہ اب اُن کا کہیں پتہ نہیں اور آغاز یہ تھا کہ تاریخ سے کہیں سراغ نہیں لگتا کہ یہ گروہ کب پیدا ہوا۔ اور اس کی بنیاد کیوں مگر پڑی۔ ہمارے یہ قومی سپاہی جو ”بانگ“ کہلاتے تھے اپنی زندگی سپہگرمی کی نذر کر دیتے۔ سوتے جاگتے۔ اُٹھتے بیٹھتے۔ چلتے پھرتے۔ ہر وقت پورے اسلحہ جنگ سے آراستہ اور اذچی بنے رہتے سیکرنگی دیک و ضعی کو اپنا شعار جانتے۔ اور اس بات کی دُورن تھی کہ ہماری ہی بات سب پر بالا رہے۔ باوجودیکہ وہی مروج و متداول اسلحہ سب کے پاس ہوتے مگر ساتھ ہی ہر ایک اپنی کوئی خاص دھج اور اپنا کوئی مخصوص بانا رکھتا جس کو مرنے و دم تک نہ چھوڑتا۔ اور اس کی تاب نہ لاسکتا کہ اس دھج یا شعار کو کوئی اور بھی اختیار کرے۔

پہلے پہل ان بانگون کا نام محمد شاہ رنگیلے کے زمانے میں سنا جاتا ہے پرانے راوی اور یادگار زمانہ بڑے بیان کرتے ہیں کہ محمد شاہ کے پاس ایک لشکر بانگون کا تھا اور ایک دُناؤن کا۔ اور نادر شاہ کے مقابلے میں اگر کچھ لڑے تو یہی لوگ لڑے

بانکے جائین دینے پر کٹے ہوئے تھے۔ اور زمانے عورتوں کی طرح ”اوہی“ آگہ کے
 سکوار مارتے تھے۔ اُس زمانے کے بعد جب وہی اپنے باکمالوں اور ہرن کے استادوں
 کی قدر کرنے کے قابل نہ رہی تو اُن کا رخ اودھ کی طرف پھر گیا۔ اور قدر وانی کی
 امیدیں ہر ادنیٰ و اعلیٰ وہی پھوڑ پھوڑ کے یہاں آنے لگا۔ اب یہ لوگ فیض آباد
 اور گھنٹوں کی سڑکوں پر پہلے نظر آتے تھے۔ مگر یہاں زمانے سپہگروں کا تو پتہ نہ تھا
 بانکے تھے جن کی روز بروز کثرت ہوتی جاتی تھی۔

بادمی النظرین خیال ہوتا ہے کہ تمام بانگوں کی ایک سی وضہ ہوگی۔ مگر ایسا
 نہ تھا۔ ان میں سے ہر فرد اپنے بانگپن کو ایک نئے عنوان اور نئی شان سے ظاہر کرتا۔
 پہلے عام وضع یہ تھی کہ سر کو چند یا سے گدھی تک منڈاتے۔ اور دونوں طرف کے ٹیوں
 میں سے ایک تو کانوں تک رہتا۔ اور دوسرا شانوں تک لٹکتا۔ بلکہ کبھی اُس کی چوٹی
 گوندھ کے ایک طرف سینے پر ڈال لی جاتی۔ اس کے بعد جدتیں ہونا شروع ہوئیں
 اور ہر بانگ نے اپنے لیے کوئی نئی دج ایجاد کی۔ کسی صاحب نے ایک طرف کی موچ
 اس قدر بڑھائی کہ وہ بڑھتے بڑھتے چوٹی سے بوس دکنار کرنے لگی۔ کسی صاحب نے
 پگڑی کا ٹکڑا بچاے پیٹھ کے ایک طرف شانے پر ڈال لیا۔ کسی صاحب نے پانچا مہ کا ایک
 پانچا اس قدر بچا کر لیا کہ زمین بوسی ہو رہا ہو اور دوسرا پانچا اس قدر اٹکا رکھا کہ اوجی
 پنڈلی کھلی ہوئی ہو۔ کسی صاحب نے لوسے کی ایک بیڑی پاؤں میں ڈال کے
 اس کی زنجیر کر مین اٹکائی۔ اور اُسے کھڑکاتے ہوئے پھرنے لگے۔ کسی صاحب نے یہ
 جوتی کی کہ بہت سے روپیوں میں دونوں طرف کٹے لگا کے اور انھیں باہم جوڑ کے
 ایک نئی قطع کی نقرہ زنجیر بنائی پھر اُس کے دونوں سروں پر چاندی کے دو حلقے لگائے۔
 ایک حلقہ کو ایک طرف کے پاؤں میں ڈال لیا اور دوسرے کو اسی طرف کے بازو میں
 پن کے شانے پر اٹکا لیا۔ اور نہایت غرور و تکبر کے ساتھ زنجیر بجاتے ہوئے گھر سے
 نکل کھڑے ہوئے۔ غرض جتنے بانگے تھے اتنی ہی عجیب تھیں۔ اسی قسم کی جدت
 طرازیان اسلحہ کے متعلق تھیں۔ کوئی صاحب دو دھار تینا ہاتھ میں رکھتے جو ہر
 وقت برہنہ اور ہوا سے لڑتا رہتا۔ کوئی صاحب رستم زربان کے زمانے کا
 وزنی سلاح گرز لیے پھرتے۔ کوئی صاحب تبر کا ندھ پر رکھے نظر آتے۔ اور ساری

دنیا کو اپنی نظر میں پہنچ خیال کرتے۔

ان لوگوں کے باہر نکلنے کی یہ شان تھی کہ بتخت و تخت کے ٹھاٹھ سے اپنے اوپر ناز کرتے ہوئے چلتے۔ ہر ایک پر کڑوے تیور طوالتے۔ اور اگر کہیں کسی کو دیکھ لیتے کہ انہیں کا بانا اور شعار اس نے بھی اختیار کر لیا ہو تو بلاتال لوک بیٹھتے۔ اور کہتے آئیے ہم سے آپ سے دودھ ہاتھ ہو جائیں۔ یہ بانا تو ہمارا ہی ہو گا آپ ہی کا ہو گا؟ اس سے زیادہ قیامت یہ تھی کہ ان لوگوں کا تختہ ان کا فخر و ناز۔ ان کی جال و حال۔ ان کی وضع قطع۔ اور ان کے مخصوص شعار سب چیزوں کی یہ حالت تھی کہ دیکھتے ہی انسان کو بے اختیار ہنسی آجائے۔ مگر کس کی جال تھی کہ ان کی طرف دیکھ کے مسکرا بھی دے۔ انہوں نے کسی کو جھوٹون بھی مسکراتے دیکھا اور ستر اینچ پر ہاتھ جا پڑا۔ پھر اس وقت اگر کوئی ایسے ہی بڑو بار بانکے ہوئے تو اسے خوشامد در آمد کر کے عفو تقصیر کا موقع بھی ملا۔ ورنہ بلاتال تو اینچ جھونک دیا اور اپنی راہ لی۔

یہ جال نہ تھی کہ کوئی بانکے صاحب کسی صحبت میں ہوں اور کوئی ان کی بات دیکھے یا ان پر اعتراض کرے۔ نتیجہ یہ تھا کہ بڑھ بڑھ کے باتیں بناتے۔ لاف زنی کرتے۔ زبیدی اڑاتے۔ اور جھوٹ کے پل باندھتے مگر کسی کو جرأت نہ ہو سکتی کہ چون کرے یا مسکرائے۔ مشہور ہے کہ ایک بانکے صاحب چند مہذب لوگوں کی محفل میں کہنے لگے۔ ابھی فلاں راجہ کی گڑھی چرب ہم نے سو آدمیوں سے دھاوا کیا ہو تو ہر سپاہی کے گلے میں پانچ پانچ ڈھولین تھیں۔ اور ہمارے سو آدمی پان سے ڈھولین بجاتے ہوئے جا پڑے۔ اور تو کس کی جال تھی کہ ایک بانکے کی زبان کڑے سب خاموش بیٹھ رہے۔ مگر ایک نوجوان کی زبان سے نکل گیا ”خیر پانچ ڈھولین تو کتے میں ڈال کے ٹھاندا روں گے سبھی طرح چاروں طرف پھیلائی ہوں۔ مگر ہر آدمی پانچ پانچ ڈھولین کن ہاتھوں سے بجا رہا ہو گا؟ یہ سنتے ہی بانکے حضرت آگ گبولا ہو گئے۔ تلوار سپیدھی کی اور ڈانٹ کے کہا ”آئیں! یہ ہم پر اعتراض! تو ہم جھوٹے ہوئے؟“ سب نے کہا ”آپ کو جو جھوٹا کہے وہ خود جھوٹا۔ یہ لڑکا بزرگوں کی کیا قدر جانے؟ آپ اپنی طرف دیکھیں“

دھن کے اس قدر کہ تھے کہ کسی کا دباؤ ہی نہ مانتے۔ یہاں تک کہ بعض بعض بہت اعلیٰ درجے کے بانکے بادشاہوں اور حکام وقت کی بھی پروا نہ کرتے تھے۔

نواب سعادت علی خان کے زمانے میں دہلی کے آئے ہوئے مشہور بانکون میں ایک میرزا جانیگر بیگ تھے۔ اُن کا نوعمری کا زمانہ تھا۔ باپ نواب صاحب کے درباروں میں تھے۔ جانیگر بیگ کی شورہ نشینی کی خبر کئی بار اُس کے نواب سعادت علی خان میں ہو رہی تھی۔ مگر آخر کار ایک دن بہت برہم ہوئے۔ اور اُن کے والد سے کہا آپ کے صاحبزادے کی شورہ نشینیان حد سے گزرتی جاتی ہیں اور انھوں نے سارے شہر میں اُدھم مچا رکھا ہے۔ اُن سے کہہ دیجئے گا کہ اپنے اس بانکپن پر نہ بھولیں۔ ناک نہ کٹوائی ہو تو میں سعادت علی خان نہیں ۛ باپ خود ہی بیٹے کی حرکتوں سے عاجز تھے عرض کیا ”خداوند۔ اُس کی شرارتوں سے غلام کا ناک میں دم ہو۔ ہزار سمجھا تا ہوں نہیں ماننا۔ شاید حضور کی یہ دھمکی سن کے سیدھا ہو جائے“ یہ کہہ کے گھر آئے اور بی بی سے کہا ”تمہارے صاحبزادے کے ہاتھوں زندگی سے عاجز آ گیا ہوں۔ دیکھئے اس نالائقی کی حرکتوں سے ہماری کیا گت بنتی ہے؟ جی چاہتا ہوں کہ میری چھوڑ دوں۔ اور کسی طرف منہ چھپا کے نکل جاؤں“ بی بی نے کہا ”اُسے تو کچھ کہو گے بھی؟ آخر ہو کیا؟“ کہا ”ہوایہ کہ آج نواب صاحب بہت ہی برہم بیٹھے تھے میری صورت دیکھتے ہی کہنے لگے اپنے بیٹے سے کہہ دینا کہ میں سعادت علی خان نہیں جو ناک نہ کٹوائی ہو ۛ اتنے میں میرزا جانیگر بیگ جو کہیں باہر گئے ہوئے تھے گھر میں آ گئے۔ مان لے کہا ”بیٹا خدا کے لیے اپنی یہ حرکتیں چھوڑ دو۔ تمہارے آبا بہت ہی پریشان ہیں“ میرزا صاحب نے کہا ”میرا کچھ قصور بھی بتائیے گا یا خالی الزام ہی دیجئے گا؟“ باپ نے کہا ”گوئی ایک قصور ہو تو بتایا جائے؟“ کہنے وہ سر اٹھا رکھا ہو کہ سارے شہر میں آفت پھگئی۔ آج نواب صاحب کہتے تھے کہ اپنے صاحبزادے سے کہہ دینا میں سعادت علی خان نہیں جو ناک نہ کٹوائی ہو“ باپ کی زبان سے اتنا سنتے ہی میرزا صاحب کو جو طیش آیا تو کمر سے پیش قبض نکال لی۔ اور خود ہی اپنی ناک کاٹ کے باپ کی طرف پھینک دی۔ اور بولے ”بس؟ اسی ناک کاٹنے کی نواب صاحب دھمکی دیتے ہیں؟ لیجئے یہ ناک لیجا کے انھیں دے دیجئے“ یہ دیکھتے ہی مان باپ دونوں سناٹے میں آ گئے۔ اور جب باپ نے بیٹے کی ناک نذر کے طریقہ سے نواب صاحب کے سامنے پیش کی اور واقعہ بیان کیا تو وہ بھی دم بخود رہ گئے۔ اور معذرت کرنے لگے کہ

جہی میرا یہ منشا نہ تھا۔ میں تو سمجھا تھا کہ اس دھکی سے انھیں مبنیہ ہو جائے گی، باب نے کہا: ”خداوند ایسا نالائق اور اپنی دھن کا پکا ہی کہ کسی کا زور ہی نہیں چلتا۔ جسے نہ جان کا خیال نہ عزت آبرو کا اُس کے کون منہ لگے؟“

اس واقعہ کے بعد مرزا جہانگیر بیگ نیکے مشہور ہو گئے۔ اور اب اتنے بڑے زبردست اور سنیافتہ بانگے تھے کہ شہر کے سارے بانگے اُن سے دبتے تھے سیکڑوں بانگے اُن کے شاگرد اُن کے حکم کے تابع بے عذر فرمان بردار اور اُن کے جتنے میں بھی شریک تھے جن سے سارا شہر کانپتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک مشہور بھانڈے نواب سادات علی خان کے سامنے کوئی گستاخانہ نقل کی تو انھوں نے ہنس کے کہا: ”میرے سامنے تو جو چاہتا ہو کہہ جاتا ہو جب جالوں کہ تو میرزا جہانگیر بیگ نیکے ہی کوئی فقرہ سیز کرے؟“ اُس نے عرض کی: ”خداوند کہہ تو جاؤں گا مگر حضور بچا لینے کا اقرار فرمائیں؟“ نواب نے وعدہ کیا۔ اور اُس کے دو چار روز بعد ایک دن میرزا جہانگیر بیگ پورے اسلحہ لگائے دریا کنارے اپنی نشست میں موڑے پر بیٹھے تھے سپاس ساٹھ شاگردوں اور بانگوں کا گردِ مجمع تھا۔ کہ وہ بھانڈا ایک لنگ باندھے ہوئے دریائے نکل کے آیا۔ اس کی صورت دیکھتے ہی میرزا جہانگیر بیگ نے کہا: ”آخاہ تم ہو؟ اچھے تو رہے“

یہ سنتے ہی وہ آداب بجالایا۔ سامنے آ کے زمین پر بیٹھ گیا۔ اور اُن کے چہرے کی طرف ہاتھ اٹھا کے کہنے لگا: ”خداوند اتنی کٹ گئی۔ اور یہ جو رہی ہو یہ بھی کٹ جائیگی!“ ایک بھانڈے کی زبان سے یہ جملہ سنتے ہی میرزا جہانگیر بیگ کو ایسا طیش آیا کہ مارے غصہ کے اس قدر کانپنے کہ ہاتھ سے تلوار چھوٹ پڑی۔ اور وہ بے تحاشا بھاگ کے پانی میں کود پڑا۔ دو چار غوطے لگائے اور پانی ہی پانی کسی طرف نکل گیا۔ اب میرزا صاحب کے جتنے کے لوگ ڈھونڈتے پھرتے تھے کہ کہیں ملے تو حرام زادے کو مار ڈالیں۔ آخر ایک دن نواب سادات علی خان نے اُسے میرزا جہانگیر بیگ کے قدموں پر گروا کے کہا: ”بھئی اس کی بات کا بُرا ماننا ہی کیا؟ یہ تو مجھے بھی کہہ جاتا ہو؟“ اور اُس کا قصور معاف کر دیا۔ شاہی کے آخر زمانے تک ان لوگوں کا بڑا زور رہا۔ اور بانگین میں کچھ ایسی امتیاز کی صورتیں تھیں کہ اکثر شریف زادے خصوصاً وہ جنھیں سپہ گری کا شوق ہوتا بانگے بن جاتے۔ اور اپنی کوئی خاص دھج بنا لیتے۔ اگر قاعدے اور سلطنت کی

قوت کے ساتھ کوئی ایسا گروہ موجود ہوتا تو دراصل یہ لوگ سلطنت کے قوت بازو ثابت ہو گئے۔ اور اُن کی ذات سے قوم و ملک کو بڑا نفع پہنچتا۔ لیکن پرتیبہی سے جن دنوں بانکون کا گروہ پیدا ہوا اور دہلی و گھنوں کی دونوں سلطنتیں نہایت کمزور اور غریب غیر مستحکم حالت میں تھیں۔ اور یہی بانکے جو مایہ ناز اور ذریعہ عروج ہو سکتے تھے اُن کے لیے باعث زوال بن گئے۔ سلطنت اُن کو دبا نہ سکتی تھی۔ اور اُن کی خود سری و سرکشی سے آسے دن شہر کے گلی کو چون مین خانہ جنگیان ہو کر قریب تھیں جن لوگوں کو اُن کے ہاتھ سے آزاد ہوئے سلطنت اُن کی دادرسی نہ کر سکتی۔ اور انہوں نے اپنے لیے ایسے جتنے بنائے تھے کہ بڑے بڑے رسالہ اروں کو بھی اُن سے دب جانا پڑتا تھا۔

ان میں باوجود امتحانہ تجت و غرور کے یہ خاص بات تھی کہ ہندوستان کے بلکہ شاید ساری اگلی دنیا کے کچھ خلق پسگروں کے خلاف یہ نہایت ہی مذہب سپاہی تھے۔ اور اُن لوازم اخلاق کو جو دو مذہب و شائستہ دوستوں میں ہوا کرتے ہیں اپنے حریف کے ساتھ برتتے تھے۔ کسی ادنیٰ درجے کے سپاہی سے لڑنا اور مقابلہ کرنا اپنی شان و وضع کے خلاف اور موجب توہین تصور کرتے۔ شریف حریفی سے لڑتے اور پھر اُس کے ساتھ شرفا کا سا برتاؤ بھی کرتے۔ اکثر یہ ہوا کہ دو بانکون میں لڑائی ہوئی۔ اور لڑائی میں بھی دونوں کو اس کا لیا جا رہا کہ کوئی بات حریف کی عزت و حرمت یا مرضی و مشاں کے خلاف نہ ہونے پائے۔ ایک کہتا دو پہلے آپ دار کر میں، دو سرا کہتا وہ نہیں پہلے آپ۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ پھر جب حریف کو زبردست ہو جاتا تو فوراً لڑائی سے ہاتھ روک لیتے۔ اور پھر اس کے حق میں ان سے زیادہ کوئی مہربان نہ تھا۔ دیکھتے ہیں اس کے نہایت ہی پیچھے ہمدردی تھی۔ اگر وہ اپنے پاؤں سے جالے کے قابل ہوتا تو اُس کے گھڑ تک اُس کی شایعت کرتے۔ راستہ میں بیسیوں جگہ یہ واقعہ پیش آتا کہ یہ کہتے آپ آگے چلے اور وہ کہتا آپ آگے چلے۔ بعض بانکون کے واقعات میں شہرہ کہ لڑائی کے بعد زخمی حریف کو اس کے گھڑ تک پہنچانے گئے اور وہ ان سے چلے تو حریف دوست نے کہا تو کیا آپ تنہا جائیں گے؟ یہ نہیں ہو سکتا۔ وہ اہمیں ان کے گھڑ تک پہنچانے کو آتا۔ اور جب وہ پہنچا کے چلا تو اخلافتا

پھر اُسکے ساتھ ہوئے۔ اسی اخلاق میں صبح ہو گئی کہ جب اُس کے گھر پہنچے ہیں تو وہ ان کی مشایعت کے لیے ان کے ساتھ ہو لیتا ہوا اور جب وہ ان کے گھر پہنچتا ہے تو یہ اُس کی مشایعت کے لیے اُس کے ساتھ ہو لیتے ہیں۔ اکثر باکون کی یہ وضع تھی کہ شریقی کے باریک انگر کے کے سوا کوئی کپڑا نہ پہنتے اور لڑائی میں زہرہ پنہنایا ڈھال سے کام لینا بزدلی اور نامردی خیال کرتے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ حریف کا سامنا ہوتا تو اُس کی تلوار کو گویا شنگے سینے پر لیتے۔ چر کے پر چرکے کھاتے اور اُف نہ کرتے۔ اسی طرح چلون کا جاڑا اُسی شریقی کے انگر کے پر گزرتا اور جال کیا کہ کانپیں ٹھہر تھیں یا زبان سے ”سو اسوا“ کی آواز نکلتی۔ بعض اسپر بھی یہ قیام کرتے کہ اُس باریک لباس پر باسی بانی چھڑا کو اتے اور جو سردی معلوم ہوتی اور اکڑتے جاتے۔

ان کی آخر زمانے کی عام وضع قطع دکھانے کے لیے ہم ایک ہانکے صاحب کی صورت اپنے ناظرین کو دکھائے دیتے ہیں جنہیں خوش نصیبی سے ہم نے اپنے پچھن میں غدر کے تیرہ چودہ برس بعد ٹیٹا برج (کلکتہ) میں اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ یہ صاحب عہد شاہی کے باقیات الصالحات میں سے تھے۔ خدیوین جا بجا لڑے۔ جب انگریزوں کا تسلط ہو گیا تو ہتھیار چھینک کے بہت دنوں تک ادھر ادھر چھپتے پھرے۔ اور آخر جب پریشان ہوئے تو کلکتہ میں آئے کہ واجد علی شاہ کے ظل عاٹفت میں باقی ماندہ زندگی بسر کر دیں۔ ان سے اگرچہ ہتھیار چھین گئے تھے مگر وضع نہیں بدلی تھی۔ یہ ایک کشیدہ قامت دُبلے چھوٹے آدمی پشانی سے گدی تک بیچ میں سر منڈا ہوا تھا۔ ایک پٹا بڑا تھا اور ایک چھوٹا۔ اور دونوں دو ہلڑی ٹوپی اور ہلڑی کے نیچے مٹکے ہوئے تھے۔ ڈاڑھی چڑھی تھی۔ اور مونچھیں ہمیشہ کھڑی رہتیں۔ بدن میں کھنچا ہوا جست نیچے دامنوں کا انگر کھا تھا۔ ٹانگوں میں عورتوں کا سابلے پانچون کا کلیون دار پانچاس پٹیہ پر شلٹ وضع کار و مال اوڑھے رہتے۔ ہاتھ میں ہر وقت ایک ٹکھارہ تھا۔ امد لکھنؤ کا خورد نو کا جوتا پاؤں میں تھا۔ گریرنگی کا سب سے زیادہ نمایاں ثبوت یہ تھا کہ یہ سب کپڑے چھینٹ کے۔ اور ایک ہی قسم کی چھینٹ کے تھے جس چھینٹ کا انگر کھا تھا اُسی کی ٹوپی تھی اُسی کی گودی تھی۔ اُسی کا رومال پٹیہ پر تھا۔ اُسی کا پانچاس تھا

اُسی کا پنکھا تھا۔ اور وہی چھینٹ جوتے کے بیرونی رخ پر بھی منڈھی ہوئی تھی۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ سارے بانکوں کی یہی وضع تھی۔ ممکن ہے کہ انھیں بزرگ نے خاص اپنی یہ دھج رکھی ہو۔

ٹیٹا بارج میں چند روز یہ اسی وضع میں رہے۔ جدھر سے نکل جاتے اُنکلیان اٹھنے لگتیں۔ اور لوگ گھبرا گھبرا کے ان کی صورت دیکھتے۔ اور ہنستے۔ اب انگریزی میں یہ تو حال نہ تھی کہ کسی کو ہنسنے پر لڑکین۔ وہ جو مثل مشہور ہے کہ ”دبی بلی جوہن سے کان کٹاتی ہے“ یہ بچارے خود ہی نظر نیچی کر لیتے۔ اور کوئی چاہے کچھ کہے یا کچھ کرے یہ اپنی آنکھیں جھکائے چلے جاتے۔ مگر باوجود اس کے اگر اوڑھتوں کا وہی حال تھا۔ کسی محفل میں بیٹھ کے باتیں کرتے تو معلوم ہوتا کہ ساری صحبت پر حکومت کر رہے ہیں اور کسی کی اپنے سامنے کچھ ہستی نہیں سمجھتے۔ جب واجد علی شاہ کا سامنا ہوا تو بادشاہ نے کہا ”بھی چھوٹے خان (یہی ان کے صاحب کا نام تھا) اب زبانا بدل گیا دینا بدل گئی۔ نہ وہ ہم رہے۔ نہ وہ تم رہے۔ اس لیے جس طرح ہماری وضع بدل گئی“ ویسے ہی اب تم بھی اپنی وضع بدل دو“ عرض کیا ”خداوند! اب تھوڑی سی رہ گئی ہے“ اسی وضع میں گزر جانے دیجئے“ بادشاہ نے کہا ”نہیں تمہیں میرے سر کی قسم اب وضع بدل دو۔ اور سمجھو کہ جو کچھ ہونا تھا سو ہو چکا“ یہ کہہ کے بادشاہ نے ایک خواص کو اشارہ کیا جس نے ایک دو شالہ لاکے اڑھا دیا۔ جب دوسری وضع کا کپڑا اڑھا ہی دیا گیا تو مجبور ہو گئے۔ آداب بجا لاکے وہ دو شالہ لے لیا۔ اور گھر آئے۔ پھر اس کے بعد جو گھر سے نکلے تو سفید کپڑے پہنے ہوئے تھے۔

چند سال کے بعد انھوں نے ٹیٹا بارج ہی میں انتقال کیا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اُن کی موت پر ہمیں بلکہ اُن کے وضع بدلنے ہی پر پڑنے بانکوں کا خاتمہ ہو گیا۔

اس میں شک نہیں کہ جب شریف زادوں اور عام سپہ گردوں میں بانٹنے بننے کا شوق بڑھا۔ ادنیٰ و اعلیٰ ہر گروہ میں بانٹے پیدا ہونے لگے۔ اور شہر میں بانکوں کی کثرت ہوئی تو بہت سے ایسے بانٹے بھی نظر آنے لگے جن میں نہ ویسی شرافت تھی اور نہ ویسی شجاعت۔ اور جب موقع پڑتا اُن کی کمزوری کھل جاتی۔ لیکن اصلی بانکین ملک و قوم کا ایک بہت ہی اعلیٰ درجے کا شریفانہ جوہر تھا۔ جو مسلمانوں کے

سوا آخر ایام میں بہت سے ہندوؤں سے بھی ظاہر ہوا۔ اس اعلیٰ جوہر کا ہندوستان سے مٹ جانا اُس کی تاریخ کا ایک حسرتناک ورق ہے۔

ہمیں اس سے انکار نہیں ہے کہ بانکون کی کثرت اور ہتھیاروں کے بے روک اور بے ضرورت استعمال نے ملک کے امن و امان میں فرق ڈال دیا تھا۔ شہر میں روزِ خانہ جنگیاں ہوتیں۔ اور اکثر وہ گزروں پر لاشیں پھر کئی نظر آتیں۔ یہی نہیں بلکہ روزِ بروز ثابت ہوتا جاتا کہ بانکے سپہنگر خانہ جنگیوں اور باہمی جدال و قتال میں جس قدر زیادہ باکمال اور شجاع ہیں اُسی قدر فقیم کے محلے روکنے اور میدانِ جنگ میں انہما سے وطن کے ساتھ شریک ہو کے لڑنے میں ناقص و ناکارہ ہیں۔ لیکن اس کی بھی ہم کہتے ہیں کہ یہ گروہ منسنے کے قابل نہ تھا۔ اور مٹانے کی نہیں بلکہ اُس کے باضابطہ بنانے کی ضرورت تھی۔

یورپ میں بھی ہمیں قدیم الا یام میں بانکون کا ایک گروہ نظر آتا ہے جو بائٹ کھلاتے تھے۔ موجودہ یورپ کے اعلیٰ درباروں سے فی الحال مرز لوگوں کو جو بائٹ کا خطاب ملا کرتا ہے یہ اُسی پرانے فنا شدہ گروہ کی یادگار ہے۔ ہم ان مغرب کے بانکون کا حال آئندہ نمبر میں بیان کریں گے۔

ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ

واجد علی شاہ کی یہ بڑی خوش نصیبی تھی کہ تاج و تخت سے جدا ہوتے ہی آخر ستمبر ۱۸۵۷ء میں (۱۸۵۶ء) میں گھنچو چٹو کے کلکتہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ تاکہ اپنے معاملہ میں باضابطہ پیروی کریں۔ اور گورنر جنرل ہند کے دربار سے کامیابی نہ ہو تو لندن پہنچ کے مقعدہ کو پارلیمنٹ اور ملکہ انگلستان کے سامنے پیش کر دیں۔ چنانچہ جب کلکتہ میں کام نہ نکلا تو انگلستان کا قصہ کیا۔ مگر اطباء نے بھری سفر کو بادشاہ کے لیے مفید تجویز کیا۔ اور مشیرون نے روکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خود بادشاہ تو کلکتہ ہی میں ٹھہر گئے۔ مگر اپنی مان اور بھائی کے ساتھ ولی عہد کو انگلستان روانہ کیا۔ اس سفر

مین میرزا نانشی قمر الدین صاحب مرحوم بھی اس خانان برباد شاہی قافلہ کے ہمراہ تھے۔ بادشاہ کو سرکار انگریزی کی مجوزہ تنخواہ لینے سے انکار تھا۔ اور اڑے ہوئے تھے کہ ہم تو اپنا تخت و تاج ہی لین گے جو بے قصور چھینا گیا ہو۔

بادشاہ کلکتہ میں تھے۔ اُن کا خاندان لندن میں تھا۔ اور معاملہ زیر غور تھا کہ یکایک کار تو سون کے بھڑکے اور گورنمنٹ کی ضد نے ۱۸۵۶ء محمدی (۱۲۵۸ھ) میں قدر پیدا کر دیا۔ اور میرٹھ سے بنگالہ تک ایک ایسی آگ لگی کہ اپنے پرانے سب کے گھر جل اٹھے۔ اور ایسا فتنہ عظیم پیدا ہوا کہ ہندوستان میں برٹش گورنمنٹ کی بنیاد ہی متزلزل نظر آتی تھی۔ جس طرح میرٹھ وغیرہ کے باغی ہر طرف سے سمٹ کے دہلی میں جمع ہوئے تھے اور ظفر شاہ کو ہندوستان کا شہنشاہ بنایا تھا ویسے ہی الہ آباد و فیض آباد کے باغی سنی شہنشاہ میں جوش و خروش کے ساتھ لکھنؤ پہنچے اُن کے آتے ہی یہاں کے بھی بہت سے بیفکرے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور شاہی خاندان اودھ کا اور کوئی رکن نہ ملا تو واجد علی شاہ کے ایک دس برس کے نابالغ بچے مرزا جیس قدر کو تخت پر بٹھا دیا۔ اور اُن کی مان و اب حضرت محل سلطنت کی مختار کل بنیں۔ تھوڑی سی انگریزی فوج جو یہاں موجود تھی اور اُس کے ساتھ یہاں کے تمام یورپین عہدہ داران مملکت جو باغیوں کے ہاتھ سے جان برہو سکے جلی گار وین قلعہ بند ہو گئے۔ جس کے گرد باغیوں کے پہنچنے سے پہلے ہی دھس بنا لیے گئے تھے۔ اور حفاظت و سبر کا کافی بند و بست کر لیا گیا تھا۔ حینمت ہوا یا یہ کہیے قسمت ابھی تھی کہ واجد علی شاہ کچھ جاچکے تھے۔ ورنہ وہی خواہ مخواہ بادشاہ بنائے جاتے۔ اور اُن کا حشر ظفر شاہ سے بھی بدتر ہوتا اور اودھ پریشان بختوں کو ذرا اپنے کے لیے ٹیبا برج کے دربار کا جو ایک عاریتی سہارا مل گیا تھا یہ بھی نہ نصیب ہوتا۔

اب لکھنؤ میں انگریزوں کی باغی فوج کے علاوہ اودھ کے اکثر زمیندار و قلعہ دار اور عہد شاہی کے برطرف شدہ سپاہی کثرت سے جمع تھے۔ اور اُن میں شہر کے بہت سے اوباشوں اور ہر طبقہ کے لوگوں کا طوفان بے تمیزی بھی شریک ہو گیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ تھوڑے سے انگریزوں پر ایک خدائی کا نزعہ ہے۔ مگر فرق یہ تھا کہ محاصرہ کوئی دن نہ سوا اوباش اہل شہر اور بے اصول و خود سر مدعیان شجاعت کے

ایک بھی ایسا شخص نہ تھا جو اصول جنگ سے واقف ہو۔ اور تمام منتشر قوتوں کو یکجا کر کے ایک باضابطہ فوج بنا سکے۔ بخلاف اس کے انگریز اپنی جان پر کھیل کے اپنی حفاظت کرتے۔ اور سرترتھیلی پر لے کے حملہ آوروں کو روکتے تھے۔ اور جدید اصول جنگ سے بخوبی واقف تھے۔

اب لکھنؤ میں برجیس قدر کا زمانہ اور حضرت محل کی حکومت تھی۔ برجیس قدر کے نام کا سکہ جاری ہوا۔ عہدہ داران سلطنت مقرر ہوئے۔ ملک سے تحصیل موصول ہونے لگی۔ اور صرف تغلق طبع کے طور پر محاصرے کی کارروائی بھی جاری تھی۔ لوگ حضرت محل کی مستعدی و نیک نفسی کی تعریف کرتے ہیں۔ یہ سپاہیوں کی نہایت قدر کرتی اور ان کے کام اور حوصلے سے زیادہ انعام دیتی تھیں۔ مگر اس کا کیا علاج کہ یہ ممکن نہ تھا کہ وہ خود پردے سے نکل کے فوج کی سپہ سالاری کریں۔ مشیر اچھے نہ تھے اور سپاہی کام کے نہ تھے۔ ہر شخص غرض کا بندہ تھا۔ اور کوئی کسی کا کمانہ نہ مانتا تھا۔ انگریزی فوج کے باغی اس غور میں تھے کہ یہ فقط ہمارے دم کا طور ہے۔ اصلی حاکم ہیں۔ اور جس کے سر پر جوتا رکھ دیں وہی بادشاہ ہو جائے۔ احمد شاہ نام ایک شاہ صاحب جو فیض آباد کے باغیوں کے ساتھ آئے تھے۔ اور کئی محکومین میں لڑ چکے تھے وہ الگ اپنا رعب جما رہے تھے۔ بلکہ خود اپنی حکومت قائم کرنا چاہتی تھے۔ برجیس قدر کے مقابل لکھنؤ ہی میں ایک اُن کا دربار الگ قائم تھا اور دونوں درباروں میں پولیسکل اختلاف کے ساتھ شیعہ سنی کا جھگڑا اور تعصب بھی نمایاں ہونے لگا۔ غرض بادشاہ اور شاہ صاحب میں رقابت بڑھتی جاتی تھی۔ آخر اسی سال نومبر کے مہینے میں برجیس قدر کی تخت نشینی کو چھ ہی سات مہینہ ہوئے تھے کہ انگریزی فوج لکھنؤ پر تسلط حاصل کرنے کے لیے آگئی۔ جس کے ساتھ پنجاب کے سکھ اور بھوٹان کے پہاڑی بھی تھے۔ اور کہا جاتا ہے کہ اُنھیں لوگوں نے زیادہ سزا مل گئی۔ دو ہی تین دن کی گولہ باری میں نئی سلطنت کا نقش قائم ہوا تھا کرمی کے جانے کی طرح ٹوٹ کے رہ گیا۔ ہزار ہا مفورین کے ساتھ حضرت محل اور برجیس قدر نیپال کی طرف بھاگے۔ شاہ صاحب نے دو تین دن لڑائے اگرچہ برجیس قدر کے لیے آزادی سے بھاگنے کا موقع پیدا کر دیا مگر خود اپنی جان نہ بچا سکے

شکست کھا کے بھاگے۔ باری اور محمدی ہوتے ہوئے پوائین میں پہنچے۔ وہاں کسی نے گولی مار دی۔ پوائین کے راجہ نے سرکاٹ کے انگریزوں کے پاس بھیجا اور صلہ میں انعام و جاگیر پائی۔

آبادی کو باغیوں سے صاف کرنے کے لیے انگریزوں نے شہر میں سخت گولہ باری کی۔ ساری رعایا گھبرا اٹھی۔ زن و مرد گھر چھوڑ چھوڑ کے بھاگے۔ اور ایک ایسی قیامت پیا ہو گئی کہ جن لوگوں نے دیکھا ہے آج تک یاد کر کے کانپ اٹھتے ہیں۔ محلوں کی بیٹھنے والیاں جن کی صورت کبھی آفتاب تک نے نہ دیکھی تھی برہنہ پا جنگوں کی خاک چھانتی پھرتی تھیں۔ بیکسی میں ایک ایک کا دامن پکڑتی تھیں۔ اور جو ملتا تھا دشمن ہی ملتا تھا۔ اور سعدی کا یہ مصرع پوری طرح صادق آ رہا تھا کہ «یاران فراموش کردند عشق» اسی حالت میں فتح باب فوج نے شہر کو لوٹا۔ اور بعد خرابی بصرہ خدا خدا کر کے لوگوں کو پھر اپنے گھر وں میں آنے کی اجازت ملی۔ اب ایک تہلکہ کے بعد جو امن قائم ہوا تھا وہ بفضلہ تعالیٰ آج تک قائم اور روز بروز ترقی کرتا جاتا ہے۔ لیکن برٹانی دولت کے وابستگان دامن اور احوالے شاہی بونقلاب سلطنت کے بعد بالکل بیکار ہو گئے اور نئی سلطنت سے فائدہ اٹھانے کی لیاقت نہ رکھتے تھے مٹتے ہی چلے گئے۔ چنانچہ بڑے بڑے دولت مند اور معزز گھرانوں کے پامال و تباہ ہونے کا سلسلہ مدت تک برابر جاری رہا۔ محلہ کے محلہ اُجڑتے چلے جاتے تھے۔ اور خاندان کے بعد خاندان مٹ رہا تھا۔ اور اکثر کو یقین ہو گیا تھا کہ چند روز کے بعد لکھنؤ کا نام و نشان بھی نہ باقی رہے گا۔ لیکن انجام میں سرکار انگریز کی وہ تدبیریں جھنوں نے ساری دنیا میں انگریزوں کی نوآبادیان قائم کرا دی ہیں غالب آئین اور لکھنؤ عواذ زمانہ کی دست بڑ سے بیج کے پنبیا۔ جن کو مٹنا تھا مٹ گئے۔ اور جو باقی رہے سنہلنے کے قابل ہو گئے۔ اور اگر سربلر کے ایسے چند اور حاکم لکھنؤ کو مل گئے تو امید ہے کہ آئندہ بہت ترقی کرے گا۔

ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ اسی سلسلہ واقعات میں ہم واجدیشاہ کی باقی ماندہ زندگی اور اُن کے قیام کلکتہ کے حالات بھی اپنے ناظرین کے

سائنس پیش کرویں۔ کیونکہ بغیر اس کے اس تاریخ کا مکملہ نہیں ہو سکتا۔ کلکتہ میں خود ہمارا بچپن بادشاہ کے ظلِ حمایت میں بسر ہوا ہے۔ اور گزشتہ واقعات کے حالات اگر ہم نے لوگوں سے سُن کے اور اوراقِ تاریخ میں پڑھ کے بیان کیے ہیں تو آئندہ چشمِ دید حالات بیان کریں گے۔

کلکتہ سے تین چار میل کی مسافت پر جنوب کی طرف دریائے بھاگارتی (دھوگلی) کے کنارے گارڈن ریج نام ایک خاموش محلہ ہے اور چونکہ وہاں ایک سڑی کا تودہ سمیت اس لیے عام لوگ اُسے ٹیابرج کہتے تھے یہاں کئی عالیشان کوٹھیاں تعمیر جن کی زمین دریا کے کنارے تقریباً دو ڈھائی میل تک چلی گئی تھی جب بادشاہ کلکتہ میں پہنچے تو گورنمنٹ آف انڈیا نے یہ کوٹھیاں اُنھیں دے دیں۔ دو چھ بادشاہ کے رہنے کے لیے ایک نواب خاں محل کے واسطے اور ایک علی نقی خان کی سکونت کے لیے جو بادشاہ کے ساتھ تھے۔ اور اُن کے گرد زمین کا ایک بڑا قطعہ جو عرض میں دریا کنارے سے تقریباً میل ڈیڑھ میل تک چلا گیا تھا اور اُس کا حلقہ چھ سات میل سے کم نہ ہو گا بادشاہ کو اپنے اور اپنے ملازمین کے قیام کے لیے دیا گیا۔ میونسپلٹی کی شُرک اس رقبہ کو طویلًا قطع کرتی تھی۔ وہ دو کوٹھیاں بادشاہ کو دی گئی تھیں اُن کے نام بادشاہ نے سلطان خانہ اور آسٹمنزل قرار دیے۔ اور نواب خاں محل کی کوٹھی پر بھی جب بادشاہ نے قبضہ کر لیا تو اُس کا نام مریض منزل رکھا۔ اور علی نقی خان کی کوٹھی آخر تک اُنھیں کے قبضہ میں اور اُن کے بعد اُن کی اولاد خصوصاً نواب اختر محل کے قبضہ میں رہی جو علی نقی خان کی بیٹی اور بادشاہ کی ممتاز بی بی بلکہ اُن کے دوسرے ولی عہد مرزا خوش نخت بہادر کی ان تھیں۔

غدر کے زمانے میں انگریزی فوج کے بعض باغی افسروں نے ارادہ کیا کہ اگر بادشاہ اُن کے حکمران بنیں تو وہ کلکتہ میں بھی غدر کر دیں۔ مگر بادشاہ نے گورنمنٹ آف انڈیا کے معاملہ میں یہ روش نہ تخت و تاج سے جدا ہوتے وقت اختیار کی تھی اور نہ اب پسند کی۔ بلکہ لاٹ صاحب کو اُن لوگوں کے ارادے کی اطلاع کر دی۔ جس پر اُن کا شکریہ ادا کیا گیا۔ مگر وہی چار وزجد مناسب سمجھا گیا کہ بادشاہ کو قطعاً فوراً ولیم میں رکھا جائے تاکہ پھر کبھی باغیوں کی اُن تک

رسانی دہو سکے۔ لندن میں اُن کی جانب سے جو مقدمہ پیش تھا وہ اس بنا پر ملتوی کر دیا گیا کہ جس ملک کے لیے یہ دعویٰ ہے وہ اب ہمارے قبضہ ہی میں نہیں جب اُس پر پھر دولت برطانیہ کا قبضہ ہوئے گا تب دیکھا جائے گا۔

بادشاہ اس حراست ہی میں تھے کہ کھنوکا غدر فرد ہو گیا۔ اور مسیح الدین خان نے جو لندن میں بادشاہ کے مختار عام تھے پھر اپنا دعویٰ پیش کیا۔ اُنھیں بادی النظر میں کامیابی اور استرداد سلطنت کی پوری امید تھی۔ مگر بد قسمتی سے اُن لوگوں میں جو قلعہ میں بادشاہ کے مشیر اور مصاحب تھے خواہ کسی پیر و پیرونی تحریک سے یا خود اپنے نفع کے خیال سے ایک سازش ہوئی اُن لوگوں نے خیال کیا کہ اگر مسیح الدین خان مقدمہ جیت گئے تو ہمارا بازار سرد پڑ جائے گا اور وہی وہ رہ جائیں گے۔ لہذا اب نے بادشاہ کو سمجھانا شروع کیا کہ ”جہاں پناہ بھلا کبھی کسی ملک نے کے دیا ہے؟ مسیح الدین خان نے حضور کو دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔

ہونا ہوا کچھ نہیں ہے۔ اور جہاں پناہ مفت میں تکلیف اُٹھا رہے ہیں۔ ڈیرمہ دو سال سے تنخواہ نہیں لی ہے۔ ہر بات کی تنگی ہے۔ اور ہم ملازمان دولت بھی پیسہ پیسہ کو محتاج ہیں۔ مناسب یہ ہے کہ حضور گورنمنٹ انگریزی کی تجویزوں کو قبول کر لیں۔ اور تنخواہ وصول کر کے اطمینان و فارغ البالی سے اپنے محلات عالیات اور آستان بوسان دولت کے ساتھ بسر فرمائیں۔“ بادشاہ کو خراج کی تنگی تھی۔ اور بادشاہ سے زیادہ اُن کے رفقا پریشان تھے۔ مصاحبوں نے جب بار بار یہ تجویز پیش کی تو بلا تکلف حضور ویسراے کی خدمت میں لکھ بھیجا ”مجھے سرکار انگریزی کی تجویزہ ماہوار لینا منظور ہے۔ لہذا میری اس وقت تک کی تنخواہ دی جائے۔ اور مقدمہ جو لندن میں دائر ہے خارج کیا جائے۔“

جواب ملا۔ اب آپ کو اول تو گزشتہ ایام کی ماہوار نہ دی جائے گی صرف اسی وقت سے ماہوار جاری ہوگی۔ دوسرے فقط بارہ لاکھ روپیہ سالانہ دیے جائیں گے۔ اور جو تین لاکھ روپیہ سال آپ کے ملازمین کے لیے تجویز کیے گئے تھے اب اُن کے دینے کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔“

بظن غالب بادشاہ اس نقصان کو گوارا نہ کرتے مگر مصاحبوں نے

اس پر بھی رضی کر دیا۔ اور گورنمنٹ آف انڈیا نے انگلستان میں اطلاع دی کہ واجد علی شاہ نے گورنمنٹ کی تجویز کو منظور کر لیا۔ لہذا ان کا مقدمہ خارج کیا جائے۔ یہ واقعات میں نے خود اپنے نامانشی قمر الدین صاحب کی زبان سے سنے ہیں جو جناب عالیہ کے ہمراہی دفتر کے میسنجری اور مولوی مسیح الدین خان کے نائب خاص تھے۔ اور کل کارروائیاں انھیں کے ہاتھ سے عمل میں آتی تھیں۔ بادشاہ کے ماہوار پر راضی ہو جانے کی خبر جیسے ہی لندن میں پہنچی مسیح الدین خان کے حواس جاتے رہے۔ بادشاہ کی مان۔ ان کے بھائی اور دینی عہدے سر بیٹ لیا۔ اور حیران تھے کہ یہ کیا غضب ہو گیا۔ افسوس اس وقت تک کا سب کیا دھرا خاک میں ملا جاتا ہی۔ آخر مسیح الدین خان نے سوچتے سوچتے ایک بات پیدا کی۔ اور پارلیمنٹ میں یہ قانونی عذر پیش کیا کہ ”بادشاہ فی الحال گورنمنٹ آف انڈیا کی حراست میں ہیں اور ایسی حالت میں ان کی کوئی تحریر پالیہ اعتبار کو نہیں پہنچ سکتی“ عذر معقول تھا تسلیم کیا گیا۔ اور گورنمنٹ آف انڈیا کو بادشاہ کے مختار کی عذر داری سے مطلع کر دیا گیا۔ ساتھ میں مسیح الدین خان اور تمام ارکان خاندان شاہی نے بادشاہ کو لکھا کہ ”یہ آپ کیا غضب کر رہے ہیں۔ ہمیں ملک اودھ کے واپس ملنے کی پوری امید ہے“ اب قدر فرو ہو چکا تھا۔ گورنمنٹ نے بادشاہ کو چھوڑ دیا۔ اور خوشی خوشی قلعہ سے نکل کے ٹیٹا برج میں آئے۔ اور آزادی حاصل ہوئی ہی تھی کہ مصاحبون نے عرض کیا حضور مسیح الدین خان لندن میں کہہ رہے ہیں کہ جہان بناہ نے تنخواہ لینے کو صرف قید ہونے کی وجہ سے منظور کر لیا ہے“ یہ سنتے ہی بادشاہ نے برا فروختہ ہو کے اُسی وقت لکھ بھیجا کہ ”ہم نے آزادی سے بہ رضا و رغبت گورنمنٹ کی تجویز کو منظور کیا ہے۔ اور مسیح الدین خان کا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ ہم نے قید میں ہونے یا کسی جبر و اکراہ کی وجہ سے منظوری دی ہے۔ لہذا آئندہ کے لیے ہم اُس مختار نامے ہی کو منسوخ کیے دیتے ہیں جس کی رُو سے وہ ہمارے مختار عام بنائے گئے ہیں“

اب کیا تھا؟ ساری کارروائی ختم ہو گئی۔ بادشاہ ٹیٹا برج میں رنگ لیاں منانے لگے۔ مصاحبون کے گھر میں ہن برسنے لگا۔ اور شاہی خاندان کا شکستہ حال قافلہ جو

انگلستان میں پڑا ہوا تھا۔ قریب قریب وہیں تباہ ہو گیا۔ اکثر ہمارے ہونے کے ساتھ چھوڑ دیا۔ بادشاہ کی ماں جناب عالیہ اس صدمے سے بیمار ہو گئیں۔ اور اسی بیماری میں چلین کہ ملک فرانس سے ہوتی ہوئی مقامات متبرکہ میں جائیں۔ اور ان کی زیارت سے شرفیاب ہو کے کلکتہ پہنچیں۔ مگر موت نے پیرس آگے قدم نہ بڑھانے دیا۔ وہیں انتقال کیا۔ اور عثمانی سفارت خانہ فرانس کی مسجد کے متصل مسلمانوں کا ایک قبرستان ہو اسی میں دفن ہوئیں۔ مرزا سکندر حسنت کو ماں کے مرنے کا اس قدر صدمہ ہوا کہ ماں کے مرنے ہی خود بھی بیمار پڑ گئے۔ اور ماں کے چودہ پندرہ روز بعد وہ بھی ماں کے برابر یوم حیا کا انتظار کرنے کے لیے لٹا دیے گئے۔ اکیلے مرزا دلی عہد بہادر کلکتہ واپس آئے۔ ماں باپ سے ملے۔

کہتے ہیں کہ ابتدا میں برج میں بھی بادشاہ کی زندگی نہایت ہی بیدار مغزی اور ہوشیاری کی تھی۔ یہ حالت دیکھ کے گردو پیش کے لوگوں نے چند آلات موسیقی فراہم کر دیے۔ اور سرود بہستان بادشاہ کا پورا پورا مضمون صادق آگیا۔ اور ارباب نشاط کا گروہ وہاں بھی جمع ہونے لگا۔ ہندوستان کے اچھے اچھے گوتے آئے ملازم ہوئے۔ اور مٹیہا برج میں موسیقی دانوں کا ایسا مجمع ہو گیا تھا کہ اگر کسی جگہ نہ تھا۔ خوبصورت عورتوں کے جمع کرنے اور حسن و عشق کے کرشموں میں پھنس رہے تھے۔ وہاں بھی ویسا ہی شوق تھا جیسا کہ کھنؤ میں سنا جاتا ہے۔ مگر مٹیہا برج میں اس شوق میں مذہبی احتیاط کا پورا لحاظ رہتا۔ بادشاہ شیعہ تھے۔ اور شیعوں کی شرع میں متعہ بغیر کسی تحدید اور روک کے جائز ہے۔ اس مذہبی آزادی سے فائدہ اٹھا کے بادشاہ جی بھر کے اپنا شوق پورا کر لیتے اور قاعدہ تھا کہ غیر متعہ عورت کی صورت تک دیکھنا گوارا نہ کرتے۔ یہ احتیاط اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ ایک جوان بھشتن جو بادشاہ کے سامنے زمانے میں پائی لاتی اُس سے بھی متعہ کر کے اُسے تو اب آبرو سان بیگم کا خطاب دے دیا۔ ایک جوان خاک رو بن جس کی حضوری میں آمد و رفت رہتی وہ بھی امتوعات میں داخل ہو کے تو اب مصفا بیگم کے خطاب سے سرفراز ہوئی۔ اسی طرح موسیقی کا شوق بھی امتوعات ہی تک محدود رہتا۔ شاید شاذ و نادر ہی اس کا اتفاق ہوا ہو گا کہ بادشاہ نے کبھی کسی بازاری طوائف کا مجری دیکھا ہو۔ خود امتوعات کی مختلف

پارٹیاں بنا دی گئی تھیں جن کو مختلف طرز پر رقص و سرود کی تعلیم دی جائیں۔ ایک رادھا منزل والیان۔ ایک ساروہا منزل والیان۔ ایک جھومر والیان۔ ایک لکھن والیان۔ ایک تھو والیان۔ ایک گھوگھٹ والیان۔ ایک رہس والیان۔ ایک نقل والیان۔ اور اسی طرح کے بیسیوں گروہ تھے جن کو رقص و سرود کی اعلیٰ تعلیم دی گئی تھی۔ اور انھیں کے مانج گانے میں اُن کا دل بہلتا ان سب سے متعہ ہو گیا تھا۔ بیگمیں کہلاتی تھیں اور دو ایک گروہوں میں اگر چند کم سن و نابالغ لڑکیاں غیر متوجہ تھیں تو اس لیے تھیں کہ بعد بلوغ داخل ممتوعات کرنی جائیں گی۔ ان میں سے اکثر خود بادشاہ کے قریب خاص سلطان خانہ میں رہتیں۔ اور بعض کو دوسری کو ٹھیکوں میں جدا مجلسِ اہلین ملی تھیں۔ ان ممتوعات میں سے جو صاحب اولاد ہو جاتیں اُن کو محل کا خطاب دیا جاتا۔ رہنے کو جدا گانہ مجلسِ اہلنتی۔ اور اُن کی تنخواہ اور عزت بڑھ جاتی۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ موسیقی کے سوا اور تمام حیثیتوں سے بادشاہ بڑے متقی و پرہیزگار اور پابندِ شرع تھے۔ نازکبھی قضا نہ ہوتی تھی۔ تیسوں روزے رکھتے تھے۔ افیون۔ شراب۔ فلک سیر۔ یا اور کسی قسم کے نشہ سے زندگی بھر احتراز رہا۔ اور محرم کی عداوری نہایت ہی خلوص عقیدت سے بچا لاتے تھے۔

تیسرا شوق انھیں عمارت کا تھا۔ سلطانی کے گرد بیسیوں مجلسِ اہلین تعمیر ہو گئیں اور بہت سی نئی کوٹھیاں اور اُن میں مجلسِ اہلین بنیں۔ گورنمنٹ سے صرف سلطانی اسد منزل اور مرصع منزل ملی تھیں۔ مگر بادشاہ کے شوق نے چند ہی روز میں بیسیوں کوٹھیاں تعمیر کرا دیں جن کے گرد نہایت ہی پُر فضا باغ اور فرحت بخش جمن تھے۔ جس وقت میں نے دیکھا ہی بادشاہ کے قبضہ میں مندرجہ ذیل عالیشان کوٹھیاں تھیں جو جنوب سے شمال تک ترتیب وار چلی گئی تھیں۔ سلطان خانہ۔ قیصر بیضا۔ گوشتہ سلطانی۔ شہنشاہ منزل۔ مرصع منزل۔ اسد منزل۔ شاہ منزل۔ نور منہ منزل۔ تفریح بخش۔ بادامی۔ آسمانی۔ تنہیت منزل۔ حد سلطانی۔ سد سلطانی۔ عدالت منزل۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی کوٹھیاں تھیں جن کے مجھے نام نہیں یاد رہے۔

ان کے ماسوا باغوں کے اندر اور تالابوں کے کنارے بہت سے مکرمے بچکے

اور چھوٹی چھوٹی کوشکیں تھیں ان تمام کو ٹھیون۔ متفرق مکروں بنگلون اور کوشکون
میں صاف ستھرا بڑا کھٹ فرش بچھا رہتا۔ چاندی کے پتنگ بچھوٹوں اور ٹکیوں
سے مکمل لگے رہتے۔ تصویریں اور طرح طرح کا فرنیچر آراستہ ہوتا اور محض کدو
کے خیال سے ضرورت سے زیادہ مکاندار مقرر تھے جو روز بھر اترتے اور
ہر چیز کو صفائی اور قرینے سے آراستہ رکھتے۔ غرض ہر کوٹھی بجائے خود
اس قدر آراستہ و پیراستہ نظر آتی کہ انسان عیش عیش کر جاتا۔ کوٹھیوں کے
گرد کے باغ اور چمن ایسی ہندسی ترتیبوں اور اقلیدس کی شکلوں کے مطابق
بنائے گئے تھے کہ دیکھنے والوں کو بادشاہ کی مناسبت طبعی پر تعجب ہوتا۔
لکھنؤ میں تو بادشاہ نے صرف قیصر باغ اور اُس کے پاس کی چند
عمارتیں یا اپنے والد مرحوم کا امام باڑہ اور مقبرہ ہی تعمیر کیا تھا مگر یہاں
میں نفیس اور اعلیٰ عمارتوں کا ایک خوبصورت شہر بسا دیا تھا۔ دریا کے
اُس پار مٹیابرج کے عین مقابل کلکتہ کا مشہور بوٹیکل گارڈن ہے۔ مگر وہ
مٹیابرج کی دنیوی جنت اور اُس کے دلکش عجائبات کے سامنے مٹ گیا
تھا۔ ان تمام عمارتوں۔ چمنوں۔ کٹھنوں۔ اور وسیع و نہایت بخش مرغزاروں کے
گرد بلند دیواروں کا احاطہ تھا۔ مگر میونسپلٹی کی شاہراہ عام کے کنارے
کنارے تقریباً ایک میل تک شاندار کائینٹیینی چلی گئی تھیں۔ اور اُن سے ایک بہت ہی
باردوق بازار قائم ہو گیا تھا۔ اُن کی پشت پر اندر بھی دکانیں تھیں مگر اُن میں
وہی ادنیٰ درجے کے ملازمین رہنے پاتے تھے جن کو اپنے فرائض کے لحاظ
سے وہاں رہنے کی ضرورت تھی۔ مگر اندر جانے کا راستہ سوا چھالکوں کے
جن پر پہرہ ہتا کسی دکان میں سے نہیں رکھا گیا تھا۔ خاص سلطان خانے کے
چھالک پر نہایت عالیشان نوبت خانہ تھا۔ نقارچی نوبت بجاتے۔ اور پرانے
پہروں اور گھڑیوں ہی کے حساب سے شب و روز گھڑیاں بجا کرتا۔

دنیا میں عمارت کے شوقین ہزاروں بادشاہ گزرے ہیں۔ مگر
غالباً اپنی ذات سے کسی تاجدار نے اتنی عمارتیں اور اتنے باغ نہ بنوائے
ہوں گے جتنے کہ واجد علی شاہ نے اپنی ناکام زندگی اور برائے نام شاہی

کے مختصر زمانے میں بنائے۔ شاہجہان کے بعد اس بارہ خاص میں اگر کسی کا نام لیا جاسکتا ہو تو وہ اسی ستم زدہ شاہ اودھ کا نام ہے۔ یہ اور بات ہو کہ کسی کی کوئی خاص عمارت سیکڑوں ہزاروں سال تک باقی رہی اور کسی کی صدیوں عمارتیں زمانے نے چند ہی روز میں مٹا کے رکھ دیں۔

عمار کے علاوہ بادشاہ کو جانوروں کا شوق تھا۔ اور اس شوق کو بھی انھوں نے اس درجہ تک پہنچا دیا کہ دنیا اُس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔ اور شاید کوئی شخصی کوشش آج تک اُس کے نصف درجے کو بھی نہ پہنچ سکی ہوگی۔

نور منزل کے سامنے خوشنما آہنی کھڑے سے گھیر کے ایک وسیع رمنہ بنایا گیا تھا جس میں صد باجیتل۔ ہرن۔ اور وحشی چوپائے چھوٹے پھرتے تھے۔ اسی کے درمیان سنگ مرمر کا ایک بختہ تالاب تھا جو ہر وقت طُوب ر ہتا۔ اور اُس میں۔ شتر مرغ۔ کشوری۔ فیل مرغ۔ سارس۔ قازین۔ بٹلے۔ قرقرے۔ ہنس۔ مور۔ چکور۔ اور صد ہا قسم کے طیور اور کچھ بے چھوڑ دئے گئے تھے۔ صفائی کا اس قدر اہتمام تھا کہ مجال کیا جو کہیں یہ کیسی جانور کا پر بھی نظر آجائے۔ ایک طرف تالاب کے کنارے کھڑوں میں شیر تھے۔ اور اس رمنہ کے پاس ہی سی لکڑی کے سلاخوں دار بڑے بڑے خانوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا تھا جس میں بیسیوں طرح کے اور خدا جانے کمان کمان بئدر لاکے جمع کیے گئے تھے عجیب عجیب حرکتیں کرتے اور انسان کو بغیر اپنا تا شا دکھائے آگے نہ بڑھنے دیتے۔

مختلف جگہ حوضوں میں مچھلیاں پائی گئی تھیں جو اشارے پر جمع ہو جاتیں۔ اور کوئی کھانے کی چیز ڈالیے تو اپنی اچھل کود سے خوب بہار دکھاتیں۔ سب پر طرہ یہ کہ شہنشاہ منزل کے سامنے ایک بڑا سا لمبا اور گھرا حوض قائم کر کے اور اُس کے کناروں کو چاروں طرف سے خوب چکنا کر کے اور آگے کی طرف جھکا کے اُس کے بیچ میں ایک مصنوعی پہاڑ بنایا گیا تھا جس کے اندر سیکڑوں نالیان ڈرائی گئی تھیں۔ اور اوپر سے دو ایک جگہ کاٹ کے پانی کا چشمہ بھی بہا دیا گیا تھا۔ اس پہاڑ میں ہزاروں بڑے بڑے دو دو تین تین گز کے سانپ چھوڑ دیئے گئے تھے۔

جو برابر دوڑتے اور ریگتے پھرتے۔ پہاڑ کی چوٹی تک چڑھ جاتے۔ اور پھر نیچے اتر آتے۔
مینڈکین پھوڑی جاتیں۔ انھیں دوڑ دوڑ کے پکڑتے۔ پہاڑ کے گردا گرد ہنر کی شان
سے ایک نالی تھی۔ اُس میں سانپ لہرا لہرا کے دوڑتے اور مینڈکوں کا تعاقب کرتے۔
اور لوگ بغیر کسی خوف کے پاس کھڑے سیر دیکھا کرتے۔ اس پہاڑ کے نیچے بھی دو کھڑے
تھے جن میں دو بڑی بڑی چیتیں رکھی گئی تھیں۔ یوں تو خاموش پڑی رہتیں۔ لیکن
جس وقت مرغ لا کے چھوڑا جاتا اُسے جھپٹ کے پکڑتیں اور مسلم نکل جاتیں۔ سانپوں
کے رکھنے کا انتظام اس سے پہلے شاید کین نہ کیا گیا ہو گا۔ اور یہ خاص واجد علی شاہ
کی ایجاد تھی۔ جس کو یورپ کے سیاح حیرت سے دیکھتے اور اس کی تصویریں اور
شرح کیفیت قلم بند کرنے جاتے تھے۔

مذکورہ جانوروں کے علاوہ ہزار ہا طیور کے چمکتے ہوئے برہنجی بچھرے تھے
سلطان خانے کے اندر تھے۔ بیسیوں بڑے بڑے ہال تھے جو لوہے کے جال سے
محفوظ کر دیے گئے تھے۔ اور گنج کھلاتے تھے اُن میں قسم قسم کے طیور کثرت سے لاکھ
چھوڑ دیے گئے تھے۔ اور اُن کے رہنے اور نشوونما پانے کا پورا سامان فراہم کیا گیا
تھا۔ بادشاہ کی کوشش تھی کہ چرند و پرند میں سے جتنے قسم کے جانور دستیاب
ہو سکیں سب جمع کر لیے جائیں۔ اور واقعی ایسا مکمل زندہ عجائب خانہ شاید روئے
زمین پر کین موجود نہ ہو گا۔ ان جانوروں کی فراہمی میں بے روک روپیہ صرف
کیا جاتا۔ اور کوئی شخص کوئی نیا جانور لائے تو منہ مانگے دام پاتا۔ کہتے ہیں کہ
بادشاہ نے ریشم پرے کمبوترون کا جوڑا چوبیس ہزار روپیہ کو اور سفید مور کا جوڑا
گیارہ ہزار روپیہ کو لیا تھا۔ زرافہ جو افریقہ کا بہت بڑا اور نہایت عجیب جانور
ہو اُس کا ایک جوڑا بھی موجود تھا۔ دو کوہان کے بغدادی اونٹ ہندوستان
میں کین بنیں نظر آتے۔ اور بادشاہ کے وہاں تھے۔ کلکتہ میں ہاتھی مطلق نہیں ہیں۔
مگر بادشاہ کے اس زندہ بچرل ہٹری میوزیم میں ایک ہاتھی بھی تھا محض اس خیال سے کہ کوئی جانور
رہ نہ جائے دو گدھے بھی رمنہ میں لاکے چھوڑ دیے گئے تھے۔ درندوں میں سے
شیر بہر۔ دیسی شیر۔ چیتے۔ تیندوے۔ رچھ۔ سیاہ گوش۔ چرخ۔ بھڑیے۔ سب
کھڑوں میں بند تھے۔ اور بڑی خاطر داشت سے رکھے جاتے۔

کبوتروں کا انتظام دیگر جانوروں سے الگ تھا۔ بادشاہ کی مختلف کوٹھیوں میں سب ملاکے چوبیس بچیں ہزار کبوتر تھے۔ جن کے اڑانے میں کبوتر بازوں نے بڑے بڑے کمالات دکھائے تھے۔

جانوروں پر جو صرف ہو رہا تھا اُس کا ناقص اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ آٹھ سو سے زیادہ جانور باز تھے۔ تین سو کے قریب کبوتر باز تھے۔ اُتھتی کے قریب ماہی پرور تھے۔ اور تیس چالیس مار پرور تھے۔ جن کو دس روپیہ ماہوار سے لے کے چھ روپیہ ماہوار تک تنخواہیں ملتی تھیں۔ امیروں کی تنخواہیں تیس سے بیس روپیہ تک تھیں۔ اور کبوتروں سانپوں اور مچھلیوں کے علاوہ دیگر جانوروں کی خوراک میں کچھ کم نو ہزار روپیہ ماہوار صرف ہوتے تھے۔

عمارت کا کام زیادہ تر مونس الدولہ اور ریحان الدولہ کے سپرد رہا جن کو عمارت کی مدین تقریباً پچیس ہزار ماہوار ملا کرتے تھے۔

ہزار کے قریب پرے کے سپاہی تھے جن کی تنخواہیں عموماً چھ روپیہ ماہوار تھیں۔ بعض بعض آٹھ یا دس روپیہ بھی پاتی ہیں تنخواہ سکا ندروں کی تھی جن کا شمار پانچ سو سے زیادہ تھا۔ مایوں کی بھی یہی تنخواہ تھی اور اُن کا شمار بھی پانچ سو سے زیادہ تھا۔ تقریباً اسی اہل قلم یعنی محرر تھے جو تیس سے دس روپیہ ماہوار تک تنخواہ پاتے تھے۔ معزز مصاحبوں اور اعلیٰ عہدہ داروں کا شمار چالیس پچاس سے کم نہ ہو گا جو اٹھاسی روپیہ ماہوار پاتے تھے۔ سو سے زیادہ کھاتے تھے۔ ان کے علاوہ بیسیوں چھوٹے چھوٹے محکمہ تھے۔ باورچی خانہ آبدار خانہ۔ بھنڈی خانہ۔ خس خانہ۔ اور خدا جانے کیا کیا تھا۔ پھر ایک مدلو احتیجیات یعنی ممتوعات کے رشتہ داروں اور بھائی بندوں کی تھی جنہیں حسب حیثیت تنخواہیں ملتی تھیں۔

ان سب لوگوں نے کوٹھیوں کے رقبہ سے باہر زیادہ تر اسی زمین پر جو بادشاہ کو دی گئی تھی اور بہتوں نے پاس کی دوسری زمینوں پر مکان بنالیے تھے۔ اور ایک شہر بس گیا تھا جس کی مردم شماری چالیس ہزار سے زیادہ تھی۔ ان سب کی زندگی بادشاہ کی تنخواہ کے ایک لاکھ روپیہ ماہوار سے

دباستہ تھی۔ اور کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اتنی خلقت عظیم اس تھوڑی سی رقم میں کیونکر زندگی بسر کر لیتی تھی۔ بنگالہ کے عوام میں مشہور تھا کہ بادشاہ کے پاس پارس پتھر ہے۔ جب ضرورت ہوتی ہے لوہے یا تانبے کو اُس میں رگڑ کے سونا بنا لیا کرتے ہیں۔

حقیقت حال یہ کہ بادشاہ کے قیام سے کلکتہ کے پڑوس میں ایک بڑا سا لکھنؤ آباد ہو گیا تھا۔ اصلی لکھنؤ مٹ گیا تھا۔ اور اُس کی منتخب صحبت مٹیابرج میں چلی گئی تھی۔ بلکہ بیچ تو یہ ہے کہ اُن دنوں لکھنؤ، لکھنؤ نہیں رہا تھا مٹیابرج لکھنؤ تھا۔ یہی چہل پہل تھی۔ یہی زبان تھی۔ یہی شاعری تھی۔ یہی صحبتیں اور بذلہ بنجیان تھیں۔ یہیں کے علما و اقیما تھے۔ یہیں کے امرا و رؤسا تھے۔ اور یہیں کے عوام تھے۔ کسی کو نظر ہی نہ آتا تھا کہ ہم بنگالے میں ہیں۔ یہی پتنگ بازیان تھیں۔ یہی مرغ بازیان تھیں۔ یہی ڈیر بازیان تھیں۔ یہی ایفونی تھے۔ یہی داستان گوئی تھی۔ یہی تعزیه داری تھی۔ یہی مرثیہ خوانی و نوحہ خوانی تھی۔ یہی امام بارے تھے۔ اور یہی کربلا تھی۔ بلکہ جس جلوس اور شان و شوکت سے بادشاہ کی منہ رنج اُٹھتی تھی لکھنؤ میں عہد شاہی میں شاید اُٹھ سکی ہو قدر کے بعد تو کبھی کوئی تعزیه نہیں اُٹھ سکا۔ کلکتہ کی ہزار ہا خلقت اور انگریز تک زیارت کو مٹیابرج میں آجاتے تھے۔

بادشاہ اگرچہ شیعہ تھے مگر مزاج میں تعصب مطلق نہ تھا۔ اُن کا پرانا مقولہ تھا کہ ”میری دو آنکھوں میں سے ایک شیعہ اور ایک سنی سی“ ایک بار دو شخصوں میں مذہبی اختلاف پر مار پیٹ ہو گئی۔ بادشاہ نے دونوں کی معذرت کا حکم دیا۔ بلکہ اپنے وہاں ممنوع الملازمتہ کر دیا اور فرمایا ”ایسے لوگوں کا میرے بیان گذر نہیں ہو سکتا“۔ آخر آخر میں بادشاہ کی ایک کتاب میں بعض ایسے ناگوار الفاظ چھپ گئے تھے جن پر کلکتہ کے سینوں میں بڑی شورش ہوئی۔ مگر اس سے لوگ واقف نہیں ہیں کہ وہ الفاظ اصل کتاب میں نہیں بلکہ دوسروں کی تاریخ یا تقریر میں تھے۔ اور بادشاہ کو جیسے ہی اطلاع ہوئی بغیر کسی تحریک کے معافی مانگنے کو تیار ہو گئے۔ بے تعصبی کا اس زیادہ ثبوت کیا ہوگا

کہ سائدہ تنظیمی کاروبار سینوں ہی کے ہاتھ میں تھا۔ وزیر اعظم منصرم الدولہ بہادر سنی تھے۔ منشی السلطان جو ایک زمانے میں سب سے زیادہ مقرب اور سارے جانور خانے کی اہل قلم اور کئی اور محکموں کے انصرام علی تھے سنی تھے۔ بخشی امانت الدولہ بہادر جن کے ہاتھ سے کل ملازموں حتی کہ محکموں اور شاہزادوں تک کو تنخواہ ملتی تھی سنی تھے۔ عطار الدولہ اور داروغہ مستبر علی خان جو آخرین سب سے بڑے عمدہ دار اور کل کاروبار کے مالک تھے دونوں سنی تھے۔ اس سے بڑھ کے کیا ہو گا کہ امام بارگاہ بطن آباد کا اور محل کے خاص امام بارگاہ بیت البکا کا انتظام اور محاسن اور مذہبی تقریبات کے بحال لانے کا انصرام بھی سینوں ہی کے ہاتھ میں تھا۔ وہاں کبھی کسی نے اس کو محسوس ہی نہیں کیا کہ کون سنی ہو اور کون شیعہ ہے۔

مٹیابرج کے دکاندار اور مہاجن تک لکھنؤ کے تھے۔ اور لکھنؤ کی کوئی چیز نہ تھی جو مکمل ترین صورت میں وہاں موجود نہ ہو۔ جدھر گزر جائے ایک عجیب رونق اور چہل پہل نظر آتی۔ اور اس لطف میں لوگ اس قدر محو اور مست و از خود رفتہ ہو رہے تھے کہ کسی کو انجام کی خبر ہی نہ تھی۔ عمارات شاہی اور رمنہ وغیرہ کے اندر جانے کی اہل لکھنؤ جملہ ملازمین بلکہ سائین مٹیابرج کو عام آزادی حاصل تھی۔ باغون میں پھریں تو اس سے زیادہ پر فضا مقام کہیں نصیب نہ ہو سکتا۔ دریا کے کنارے کھڑے ہو جائے تو عجب لطف نظر آتا۔ گلکتہ کو آنے جانے والے جہاز سامنے سے ہو کے گزرتے۔ جو فورٹ ولیم کی سلامی کے لیے مین سے اپنی جھنڈیاں اتارنا شروع کر دیتے۔ اور لوگ سمجھتے کہ بادشاہ کی سلامی لے رہے ہیں۔ محلات کی دیوڑھیوں اور مجلسوں کے دروازوں پر کھڑے ہو جائے تو عجب لطف کی دھوم دھام میں کبھی کبھی ایسی صورتیں نظر آ جاتیں اور ایسی فصیح و فہم زبان اور ایسی مزے مزے کی پیاری باتیں سننے میں آ جاتیں کہ انسان بد توں بلکہ زندگی بھر مزہ لیا کرتا۔

آہ! یہ خوبصورت اور دل فریب نقش تو سننے کے قابل نہ تھا! مگر ہائے

زمانے نے مٹا ہی دیا۔ اور ایسا مٹا پاک گویا تھا ہی نہیں۔ ۱۳۱۶ء محمدی
(۱۸۸۵ء) میں یکا یک بادشاہ کی آنکھ بند ہوئی اور معلوم ہوا کہ خواب تھا جو کچھ
کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا۔ سب باتیں خواب و خیال تھیں۔ ایک طلسم تھا کہ یکا یک
ٹوٹ گیا۔ اور وہ خوبصورت بقعہ جس کی زیارت کی تمنا یورپ کے سلاطین
اور ہندوستان کے والیان ملک تک کور ہا کرتی تھی آج ایک وحشتستان
فنا اور عبرت کدہ ہے۔ جہاں کچھ بھی نہیں۔ جس نے اس اگلے رنگ کو کبھی دیکھا
تھا اب وہاں کے ستارے تو دیکھ کے سو اس کے کہ کمال حسرت و اندوہ
کے ساتھ ایک ٹھنڈی سانس بھر کے کہے ”رہے نام اشد کا!“ اور کیا کر سکتا ہے؟

قدر و انان و گلڈاز

دگلڈاز کی اشاعت میں اب کی سال بھی بد نظمی رہی۔ لیکن الحمد للہ کہ سب پرچے
تیار ہو گئے۔ اور اپنے قدر دانوں کے پُرشوق ہاتھوں میں پہنچے جاتے ہیں۔ لیکن
اس امر کو غالباً ہمارے اجاب قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے کہ اگر اشاعت میں پابندی وقت
کی کمی تھی تو چھپائی اور کاغذ میں نمایان ترقی ہو گئی ہے۔

ہم اس زمانہ میں قدر دانوں کی نذر کرنے کے لیے بنی تاریخی ناول بھی تیار کر لیا ہے جو
ڈیڑھ سو صفحوں سے زیادہ کی ضخامت پر تکمیل کو پہنچا ہے اس ناول کا نام ”مفتوح فاتح“ ہے
قیمت غیرون سے ایک روپیہ مگر ایون یعنی ۱۹۱۴ء کے خریداران دگلڈاز کو مفت۔ اس میں
اسپین پر عربوں کے قبضہ کر لینے کے بعد ہمارے پیرس سے نکل کے فرانس پر حملہ آور ہونے
کے واقعات دکھائے گئے ہیں۔ یہ سب واقعات اُسی عہد کے ایک سچے تاریخی قصہ میں
منسلک کر دیے گئے ہیں جن کا خاتمہ عربوں کی اُس شکست پر ہوا ہے جو مسلمانان اندلس
کو چارلس مارٹل کے مقابلہ میں ہوئی تھی پیرس سے نکل کے فرانس اور فرانس اور
اسپین کی اُس وقت کی حالت اتنی تاریخ سے نہ معلوم ہوگی جتنی کہ اس ناول کے پڑھنے
سے نظر کے سامنے ہو جاتی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اس سال ہم جنوری ۱۹۱۴ء میں اس ناول
کے وی بی جن میں سے ہر ایک ایک روپیہ دس آنہ کا ہوگا روانہ کر سکیں گے۔ مینجر دگلڈاز



ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ

اس دربار کے فرمان رواؤں کی تاریخ میں سے اب صرف اس قدر بتانا باقی ہے کہ مرزا برجیس قدر بہادر لکھنؤ سے بھاگے تو سرحد نیپال پر مل گیا۔ ہمراہ رکاب تقریباً ایک لاکھ آدمیوں کا مجمع تھا۔ ان لوگوں نے ارادہ کیا کہ ہمالیہ کی گھاٹیوں میں پناہ گزین ہو جائیں۔ اور جب قلعے مکمل کے انگریزوں پر حملہ کریں۔ فتح ہو تو اپنے وطن پہنچیں۔ شکست ہو تو پھر بھاگ کے پہاڑوں میں ہو رہیں۔ مگر یہ بھنے والی صورت نہ تھی۔ ریاست نیپال نے اتنے آدمیوں کو اپنے وہاں پناہ دے سکتی تھی اور نہ ان کے لیے انگریزوں سے لڑ سکتی تھی۔ اُس میں اتنی قوت ہی نہ تھی کہ انگریزوں کا مقابلہ کرتی۔ لہذا حکومت نیپال نے صرف مرزا برجیس قدر اور ان کی ماں کو تو پناہ دے دی۔ مگر ان کے ہمراہی طوفان بے تیزی کو قطعی حکم دے دیا کہ فوراً واپس جائیں۔ اور نہ جائیں تو مار کے نکال دیے جائیں۔ نیپال کی فوج فوراً ان سے خالی کرالی جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سب سب وہاں سے نکل نکل کے بھاگے۔ بہت سے مارے گئے۔ بہت سے بھیس بدل بدل کے کسی طرف نکل گئے۔ اور مرزا برجیس قدر مع اپنی والدہ کے خاص نیپال میں جا کے سکونت پذیر ہو گئے۔ دربار نیپال سے

اُن کے لیے کچھ معمولی وظیفہ مقرر ہو گیا۔ اور کہتے ہیں اُن کے ساتھ جس قدر جواہرات تھیں وہاں کی نذر ہوا۔ آخر حضرت محل و ہین پیوند زمین ہوئیں۔ اور اُن کی بعد ملکہ و کٹوریہ کی جو بی بی کے موقع پر دولت برطانیہ نے مرزا برجیس قدر کا قصور معاف کر دیا۔ اُنھیں واپس آنے کی اجازت ملی تو بغیر کسی کو اطلاع دیے نیپال سے بھاگ کے کلکتہ آ پہنچے۔ یہاں واجد علی شاہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ اور بہ حیثیت اولاد اکبر مرزا قمر قدر سب سے زیادہ تنخواہ پارہے تھے۔ برجیس قدر نے دعویٰ کیا کہ بادشاہ کے تمام بیٹوں سے زیادہ معزز و مستحق ہیں ہوں۔ از روئے قانون بیٹن بادشاہ کی بیٹن میں سے ایک ثلث گھٹا کے باقی تنخواہ مجھ پر جاری کی جائے۔ اور اُن کے تمام ورثہ اور وابستگان دامن کی خبر گیری میرے ذمے کی جائے۔ اس کی پیروی میں وہ انگلستان جانے کی تیاریاں کر ہی رہے تھے کہ اُن کے خاندان والوں ہی میں سے کسی نے دعوت کی۔ دعوت سے واپس آئے تو قے و دست جاری ہو گئے۔ آٹا فاما حالت خراب ہو گئی اور ایک ہی دن میں وہ اُن کی بی بی اور اُن کے کسی فرزند سب کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا اور دنیا اس خاندان کی اُن تمام یادگاروں سے خالی ہو گئی جنھوں نے کبھی تخت و تاج کی صورت دیکھی تھی۔

تاہم شہنشاہِ راج کی چہل پل اور اُس نئی بستی کی رونق و آبادی نے ایسی صورت پیدا کر لی تھی کہ اگرچہ زخمِ حوادث سے بچ جاتا تو مدتوں تک یاد دلاتارہتا کہ اس بخت برگشتہ بادشاہ کے دربار اور اس کے وابستگان دامن کی کیا وضع قطع تھی۔ اور اُن کا کیا مذاق تھا۔ مگر برٹش گورنمنٹ کی عدالت گسٹری نے واجد علی شاہ کا ترکہ تقسیم کرنے اور اُن کے ورثہ کی داد رسی میں یہ شانِ عدالت دکھائی کہ ساری جائداد اور سارا گھر بار بیچ کے حصہ سدی سب میں تقسیم کر دیا جائے اور جو کچھ ہے نقد روپیہ کی صورت میں کر لیا جائے۔ اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ شہنشاہِ راج کی اینٹ سے اینٹ بچ گئی۔ لاکھوں کا سامان کوڑیوں کو بک گیا۔ اور وہی بقیہ جو چند روز میں باغ ارم بن

گیا تھا حسیض ادا بار کا جنم ہو کے رہ گیا۔ اب تم وہاں جا کے خاک اڑاؤ کچھ نہیں نظر آئے گا۔ اگر آنکھیں اگلی روئی اور چل پھل کو ڈھونڈتی ہوں تو کسی امر یا عینس کی بلاؤ جو آنسو بہاتا جائے اور تھیں بتانا جائے کہ یہاں مرصع منزل تھی۔ یہاں نور منزل تھی۔ یہاں سلطان خانہ تھا۔ اور یہاں اسد منزل تھی۔ وہاں شاعرے ہوتے تھے۔ وہاں علمائے باکمال کی مجلس تھی۔ وہاں یاران باصفا کی بذلہ سنجان تھیں۔ اور وہاں نصحائے جادو بیان کی سحر طریاں تھیں۔ اس مقام پر منتخب حسنان جہان کا جھڑٹ تھا۔ اس مقام پر رقص و سرود کی محفل گرم تھی۔ اس مقام پر جوش و شہ جینوں کو گانے ناچنے کی تعلیم ہوتی تھی۔ اور اس مقام پر جہان پناہ ناز آفرین ممتوعات کے بیچ میں بیٹھ کے جشن منایا کرتے تھے۔ اس جگہ فیونیون کے مجمع میں داستان ہوتی تھی۔ اس جگہ بیرون کی پالیان ہوتی تھیں۔ اس جگہ کھوڑاڑتے تھے۔ اور اس جگہ کنکوں کے میدان بے جاتے تھے۔ اس ڈیوڑھی پر ماہ و شہ جادو نگاہیں پردے سے منظر کالے جہانکتی نظر آتی تھیں۔ اس ڈیوڑھی پر ماما اسیلون کی آمد و رفت سے ہر وقت ایک عجیب جوش و خروش نمایاں رہتا تھا۔ اس ڈیوڑھی پر خاص خاص شعرا حاضر رہتے اس لیے کہ محل براداری کو فن شعر سے دلچسپی تھی۔ اور اس ڈیوڑھی پر روز نگین عبارت لکھنے والے جوان مزاج آدیوں کی تلاش رہتی تھی۔ اس لیے کہ دوسرے تیسرے یہاں ایک نئے رنگ کا ٹود و نامہ جا کے بادشاہ کے ملاحظہ میں پیش ہوتا۔

لیکن مٹیابرج کے مٹ جانے پر بھی اس مرحوم دربار کی ہزاروں یادگاریں باقی ہیں۔ خود شہر لکھنؤ اور اس کی سوسائٹی اس دربار دربار کو یاد دلار ہی ہے اور اودھ کی سرزمین کا چہ چہ اس کی عظمت کی یادگار ہے۔ اس لیے کہ اس پر جابجا سلطنت ماضیہ کے مار کہ بنے ہوئے ہیں۔ اہل لکھنؤ کی ہر حرکت اور ادا اگلے ارکان دربار کی زندہ تاریخ ہے۔ اور ان کی چال ڈھال دیکھ کے بے اختیار زبان سے نکل جاتا ہے "اے گل بتو خرمدم تو بوسے کسے داری" لہذا ان دیر پا آثار سلف کی یاد تازہ

یہاں
میں
اور
کہ
کی
ہی
کے
دکھا
میں
ان
کے
دکھات
جہان
خدمت
وہ
رجب

کرنے کی غرض سے اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس دربار کے قائم ہونے سے کھنویں جو سوسائٹی پیدا ہو گئی تھی وہ کیا تھی۔ کیسی تھی۔ اور اس نے کس کس عنوان سے ہندوستان کی معاشرت پر اثر ڈال رکھا تھا۔

ہندوستان میں اُن دنوں فارسی زبان کو رٹ لینگو (درباری زبان) تھی۔ اور اہل ہندوستان کی بہترین معاشرت ایرانی تہذیب سے ماخوذ تھی۔ دولت صفویہ کی عہد میں ایرانیوں کا عام مذہب شیعہ اثنا عشری ہو گیا تھا۔ اور ہندوستان کا حکمران خاندان مغلیہ چغتائیہ مذہب اہل سنت کا پیرو تھا۔ مگر معاشرت پر فارسیت کا سکہ جاری ہونے کا یہ اثر تھا کہ باوجود اختلاف مذہب کے جو عجیبیہاں آجاتے ادب کے ہاتھوں سے لیے جاتے تھے۔ اسی اخلاقی رجحان نے نور جہاں بیگم کو جہانگیر کے تاج و تخت کا مالک بنادیا۔ اسی کی بدولت دہلی کے اکثر مشرک عہدہ دار آخر عہد میں شیعہ تھے۔ اور اسی کی وجہ سے امین الدین خان نیشاپوری یہاں پہنچتے ہی نواب برہان الملک بن کے وادی گنگا کے ساری وسیع علاقے کے مالک ہو گئے۔ برہان الملک کا اثر اور اقتدار جس قدر بڑھتا اور ترقی کرتا گیا اسی قدر زیادہ وہ بالکمالان دہلی کے مرجع و ماویٰ بنتے گئے۔ باوجود اس کے اُن کی اور نواب صفدر جنگ کی زندگی جو نکالیک نئی سلطنت کی داغ بیل ڈالنے میں صرف ہوئی اس وجہ سے سواہدار سپہ گروں کی قدر دانی کے اُنھیں قومی تمدن اور معاشرتی امور کی طرف متوجہ ہونے کی بہت ہی کم مہلت ملی۔ کیونکہ ان باتوں کو بمقابل فوج کشی و فتح مندی کے امن و امان کے پریشانش زمانے سے زیادہ تعلق ہو کر آتا ہے۔ لیکن جب شجاع الدولہ نے بکسر کی لڑائی میں ہمت ہارنے کے بعد انگریزوں سے نیا معاہدہ کیا۔ اور مجبور ہو کے فیض آباد میں خاموش بیٹھے تو سرزمین اودھ میں ایک نئے تمدن کی بنیاد پڑ گئی۔ اس مصنوں کے آغاز میں ہم بتا چکے ہیں کہ شجاع الدولہ کے زمانے میں کس کثرت

سے بالکمالان دہلی وطن چھوڑ چھوڑ کے یہاں آنے لگے تھے۔ دہلی سے فیض آباد تک ہر پیشہ اور ہر طبقے کے لوگوں نے آنے کا کیسا تاننا بندھ گیا تھا۔ اور صرف نو سال کی مدت میں فیض آباد کیا سے کیا ہو گیا تھا؟ شجاع الدولہ کے بعد نواب آصف الدولہ نے جب لکھنؤ میں قیام کیا تو فیض آباد کا جاجایا اکھاڑہ کیا رہ گئی فیض آباد سے اکھڑ کے لکھنؤ میں آگیا۔ اور دہلی کے اعلیٰ خاندانوں اور بالکالوں کا جو سیلاب فیض آباد کو جارہا تھا لکھنؤ ہی میں روک لیا گیا جو کہیں سربراہ واقع ہوا تھا۔ اور آخرین چند شرفا و صاحب ہنر جو فیض آباد میں بیگم کی سرکاروں میں الجھے رہ گئے تھے رفتہ رفتہ وہ بھی لکھنؤ میں آگئے۔ اس لیے کہ آصف الدولہ نے یہاں دولت کی ایسی گنگا بنیں بہا رکھی تھی کہ کوئی سنتا اور سیراب ہونے کے شوق میں بے اختیار نہ دوڑ پڑتا۔

ان دنوں یوں تو بہت سی ہندو دریا ستین موجود تھیں مگر مہذب اور شائستہ دربار مسلمان حکمرانوں ہی کے سمجھے جاتے تھے۔ اور ہندو راجہ خود معروف تھے کہ تمدن اور معاشرت میں ہم مسلمان درباروں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اپنی قدیم تہذیب کو زخمہ کر کے اپنے لیے نیا تمدن اور نیا لٹریچر پیدا کرنے کا خیال ابھی ان میں انگریزی تعلیم نے نہیں پیدا کیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اگر کوئی بالکمال عالم۔ شاعر۔ یا سپاہی مسلمان امرائے برخاستہ خاطر ہو کے ہندو امرا کے علاقہ میں ہوجاتا تو ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا اور دیوتاؤں کی طرح اُس کی قدر و منزلت کی جاتی۔

مسلمان درباران دنوں چند گنتی کے تھے۔ سب سے پہلے تو دہلی کا دربار مغلیہ تھا۔ اور اس کی قدامت اور گزشتہ شوکت کی وجہ سے ہر قسم کے بالکالوں اور مستند خاندانی شرفا کی کان دہلی بنی ہوئی تھی۔ اور اسی سرزمین کے منتشر روڑے تھے جنھوں نے دور و دراز صوبوں میں جا کے نئے نئے دربار قائم کیے تھے۔ جن میں سے دکن میں آصف جاہ کا دربار تھا۔ وہاں سے آگے بڑھ کے ٹیپو سلطان اور نواب ارکاٹ کے دربار تھے۔ شمال میں دہلی سے چلے تو پہلے روہیلکھنڈ کے بہادر خواہن کی قلمرو تھی۔ اس کے

بعد یہ اودھ کا دربار تھا۔ پھر اُس سے آگے مرشد آباد میں نواب ناظم بنگالہ کا دربار تھا۔ مذکورہ اسلامی درباروں سے دکن کے دربار نہایت ہی دُور تھے۔ اُن کا راستہ اول تو جنگلون اور پہاڑوں کی وجہ سے نہایت ہی دشوار گزار تھا۔ اور اِس پر بھی جرات کر کے کوئی چل کھڑا ہوتا تو ٹھگ اور ڈاکو جو سارے ملک میں پھیلے ہوئے تھے راستہ ہی میں اُس کی زندگی کا خاتمہ کر دیتے۔ ٹیپو سلطان اور نواب کرناٹک کی قلمرو تک جانا درکنار کسی کو نظام حیدر آباد کی مملکت تک پہنچنا بھی مشکل سے نصیب ہوتا۔ اسیلے جب دہلی گردنا شروع ہوئی اور تاجداران مغلیہ کی حالت خراب ہونے سے قدر دانی کا بازار دہان سرد پڑا تو لوگوں نے عموماً شمالی ہندوستان کے درباروں کا رخ کیا۔ اِس میں شک نہیں کہ روہیلکھنڈ بہت قریب تھا۔ یہاں کے خوانین اگر قدر دانی کرتے تو اُن سے زیادہ موقع کسی کو نہیں حاصل تھا۔ مگر اُن میں دینداری تھی شجاعت تھی اور بہت سی خوبیاں تھیں مگر علمی مذاق اور معاشرتی رنگینیوں سے وہ لوگ بالکل معرا تھے۔ ان کی حالت کا اندازہ کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ خالص فوجی مذاق کے لوگ تھے جنھیں اپنے ہم وطنوں کے جمع کرنے اور اپنے جروگن کی تعداد بڑھا کے اپنی جنگی قوت کو ترقی دینے کے سوا اور کسی بات کا شوق نہ تھا۔ معاشرت کے رسیلے بن اور تمدنی زندگی کے آداب و اخلاق کے لحاظ سے دیکھیے تو ان کی حالت بالکل وحشی گنواروں کی سی تھی۔ ایسے لوگ بھلا شاعروں ادیبوں اور دیگر قسم کے بالکالوں کی کیا قدر کر سکتے تھے؟ لہذا اُن کی سرزمین میں جو داخل ہوا قدم بڑھاتا ہوا آگے نکل گیا۔ چار پانچ منزلیں طے کر کے لکھنؤ میں پہنچا تو دیکھا کہ رئیس سے لے کے ادب نے طبقہ والے تک استقبال میں اُنھیں بچھا رہے ہیں۔ اور ہر طرح خدمتگزاری کو طیار ہیں۔ اسی جگہ پہنچ کے پھر بھلا کون واپس جاسکتا ہے؟ جو گیا وہیں کا ہو گیا۔ اور دہلی کا ہر خانہ بان برباد بیان آتے ہی پاؤں توڑ کے بیٹھ گیا۔ نہ وطن ہی یاد رہا اور نہ کسی اور دربار کے دیکھنے کی ہوس ہی دل میں باقی رہی۔ چند لوگ یہاں سے آگے بڑھ کے نواب ناظم بنگالہ تک بھی پہنچ گئے

مگر وہ وہی تھے جن کی لکھنؤ قدر نہ کر سکا۔ مگر ایسے چند گنتی ہی کے لوگ تھے
ورنہ دہلی سے جتنے باکمال آئے سب لکھنؤ ہی میں کھیتے چلے گئے۔ تھوڑے
ہی زمانہ کے اندر یہ حالت ہو گئی کہ اُس دور کی مہذب ترین سوسائٹی
کے جتنے مشہور اور نامور بزرگ تھے سب لکھنؤ کے اندر جمع تھے۔

فقط ایک چیز لکھنؤ میں اس دربار کو قائم ہونے سے پہلے موجود تھی۔
اور وہ عربی کا علم و فضل تھا جس کی بنیاد اُس وقت پڑ گئی تھی جب شہنشاہ
اورنگ زیب نے فرنگی محل کے مکانات ملا نظام الدین سہالوی کو عطا
کیے تھے۔ ملا صاحب مدوح اور اُن کے خاندان کے قیام نے چند ہی
روز میں فرنگی محل کو ہندوستان کی ایک ایسی اعلیٰ ترین یونیورسٹی
بنادیا کہ سارے ہندوستان کے علماء و فضلاء کا مرکز لکھنؤ کا ہی چھوٹا
سامحلہ قرار پایا۔ شیخ عبدالحق دہلوی کے بعد دہلی میں بھی کوئی نمود کا عالم نہیں
پیدا ہو سکا تھا۔ آخر میں شاہ ولی اللہ صاحب کے خاندان نے البتہ بیٹا بڑا عروج
حاصل کیا مگر اُن کی شہرت علم حدیث تک محدود تھی۔ مگر حدیث کے علاوہ اور
جتنے علوم میں ان سب کی یونیورسٹی لکھنؤ ہی تھا۔ اُن دنوں لکھنؤ ایک
گننام شہر تھا۔ مگر ایسے ایک گننام مقام کا اتنی بڑی یونیورسٹی بن جانا
کہ ہندوستان درکنار بخارا، خوارزم اور ہرات و کابل اس کے آگے
سر جھکا دین بہت ہی حیرت کے قابل ہے۔ ساری اسلامی دنیا میں کی شاگردی
پر فخر کر رہی تھی اور ہین کے منتخب کیے ہوئے نصاب تعلیم یعنی سلسلہ
نظامیہ کی پیرو تھی۔ غرض علمائے فرنگی محل کی بدولت اس نئے دربار کے قائم
ہونے سے پہلے ہی لکھنؤ حکمت و فلسفہ منطق و کلام فقہ و اصول فقہ اور دیگر
مختلف علوم کا معدن و مرجع بن چکا تھا۔ غرض ایک اس چیز میں تو لکھنؤ
اس نئے دربار کا زیر بار احسان نہیں ہی باقی اور تمام تر قیام اس سلطنت
کے قائم ہونے ہی سے پیدا ہوئیں۔

اب ہم جدا جدا بیان کرنا چاہتے ہیں کہ دہلی سے لکھنؤ میں کون کون سی
چیزیں آئیں۔ اور بیان آکے اُنھوں نے کیا رنگ پکڑا۔ سب سے مقدم اردو

زبان ہی جو دہلی کے اُن شرفا اور سردارانِ فوج کی زبان تھی جو آبِ برہان
الملک بہادر کے ساتھ لکھنؤ میں آئے تھے۔ یہ زبان دہلی میں پیدا ہوئی۔ اور
اُس کی شاعری کا آغاز دکن سے ہوا۔ ولی گجراتی نے دہلی میں آکے اپنا دیوان
پیش کیا۔ اور اپنے نغمہ دگلش سے اہل زبان کو خوابِ غفلت سے جگایا۔ اس
نغمہ میں کچھ ایسا جادو تھا کہ سنتے ہی سب کی زبان پر یہی نغمہ جاری ہو گیا۔
اور دہلی میں اردو شاعری شروع ہوئی۔

ابتداءً چند ہی بزرگ تھے جنہوں نے اُستادی کی شان سے دہلی
میں دادِ سخن دینا شروع کی مگر اس زمانہ کو اگر اردو زبان کی طفلی نہیں
تو اردو شاعری کا بچپن کہنا چاہیے۔ دینا سے اردو کے ان سابقین اولین
میں سب سے زیادہ صاحبِ علم و فضل اور سب سے بڑے باکمال خان آزد
تھے۔ جنہیں مولانا آزاد مرحوم نے دوسرے دور شاعری میں رکھا ہے۔
زمانہ مابعد کے بڑے بڑے باکمال جن میں سودا، میرزا مظہر جان جاناں
اور خواجہ میر درد شامل ہیں سب ان کے شاگرد تھے۔ شاعری اور کمال
زبان دانی کے لکھنؤ میں آنے کی بنیاد انہیں اُستادِ اول خان آزد سے
پڑی۔ نواب شجاع الدولہ کے مامون سالار جنگ نے کمالِ قدردانی سے
انہیں لکھنؤ میں بلوایا اور ایک زمانے تک اودھ میں اقامت گزین رہے کہ
وہ شجاع الدولہ کی مسند نشینی کے دو برس بعد ۱۲۹۹ھ (۱۸۸۲ء) میں بمبئی مطابق
۱۲۹۵ھ (۱۸۷۸ء) میں خاص لکھنؤ کے اندر رہ کر اسے آخرت ہوئے۔ وہی پہلے اُستاد
اردو شاعری تھے۔ اور انہیں سے اردو شعر و سخن کے لکھنؤ میں آنے کی
بنیاد پڑی۔ مگر افسوس کہ اُن کی ہڈیاں سرزمینِ لکھنؤ کے دامنِ شوق سے
چھین کے خاکِ دہلی کو سونپی گئیں۔

اس کے بعد اسی دور کے دوسرے نامی اُستادِ سخن اثرِ علی
خان قغان نے جو احمد شاہ بادشاہ کے کوکہ تھے قدردانی کی تلاش میں لکھنؤ
کی راہ لی۔ شجاع الدولہ نے نہایت ہی تعظیم و تکریم کی۔ ہاتھوں ہاتھ لیا
اور ایک زمانے تک اپنے دربار میں رکھا۔ مگر شعرا نامزک خیال سے زیادہ

نازک دماغ ہوا کرتے ہیں۔ کسی خفیف سی بات پر اٹھ کے عظیم آباد چلے گئے اور شجاع الدولہ کی وفات سے دو برس پہلے وہیں پوند زمین ہو گئے۔

اب مولانا آزاد کا مقرر کیا ہوا تیسرا دور شاعری شروع ہوا۔ جب کہ خان آرزو کے شاگرد نظم اردو پر حکومت کر رہے تھے۔ اس زمانے کی حالت دیکھنے سے نظر آتا ہے کہ دہلی اپنی بالکالوں کو اپنے آغوش میں سنبھال نہیں سکتی۔ ہر طرح کے صاحبان کمال اُس کی سواد سے نکلتے چلے جاتے ہیں اور جو جاتا ہے پھر نہیں آتا۔ اس کے مقابل لکھنؤ کی یہ حالت ہے کہ جو صاحبان آتا ہے چاہے کین کا ہو یہیں کا ہو جاتا ہے۔ مرزا رفیع سودا۔ میر تقی میر سید محمد میر تنویر جو اس تیسرے دور کے پیمبران تھے ان سب دہلی چھوڑ چھوڑ کے لکھنؤ میں آئے اور یہیں پوند زمین ہوئے۔

ان کے علاوہ جو بالکالان سخن اس زمانے میں دار و لکھنؤ ہوئے اور یہیں کے ہو گئے۔ میرزا جعفر علی حسرت۔ میر حیدر علی حیران۔ خواجہ حسن حسرت۔ مرزا فخر کین۔ میر ضاحک۔ بقاد اللہ خان بقا۔ میر حسن دہلوی میر ضاحک کے فرزند (صاحب مثنوی) اور انھیں کے ایسے بیسیوں شعرا ہیں۔ میر فخر الدین مسرت۔ میر ضیاء الدین ضیا۔ اشرف علی خان قغان۔ دہلی سے لکھنؤ میں آئے ایک مدت تک رہے اور یہیں چلے کر آخر میں بیرونی قدر دانوں کی کشش سے کلکتہ اور عظیم آباد میں جا کے نذر اجل ہو گئے۔ شیخ محمد قائم قائم کا انتقال اگرچہ ان کے وطن ٹیکنہ میں ہوا مگر وہ بھی ایک مدت تک اسی لکھنؤ کی بھٹاکے ایک ایک سر تھے۔

صرف میرزا مظہر جان جاناں اور خواجہ میر درد کے ایسے چند بزرگ دہلی میں رہے کہ جن کو فقرا نہ قناعت اور مرجعیت کی وجہ سے دہلی میں قدم جانے کا موقع مل گیا تھا۔ اور سجادہ نشینی کی وجہ سے اپنی مسند درویشی کو نہ چھوڑ سکتے تھے۔ غرض شاعری کا یہ تیسرا دور وہ زمانہ ہے جب کہ دہلی کی بھٹا وہاں سے اکھڑ کے لکھنؤ میں جم رہی تھی۔ اور لکھنؤ میں ایک جوش قدر وانی تھا جس سے ہندوستان کی تاریخ خالی ہے۔

اب جو تھا دور شروع ہوا۔ اس کے ارکان بھی اگرچہ دہلی
 واکبر آباد وغیرہ کی خاک سے پیدا ہوئے تھے مگر سب کی شاعری لکھنؤ ہی میں
 چکی۔ یہیں سے ان کا نام مشہور ہوا۔ یہیں کے مشاعروں کے میر مجلس
 تھے۔ یہ لوگ علی العموم یہیں سے نکلے۔ یہیں رہے۔ یہیں عروج پایا۔
 اور یہیں مر کھ گئے۔ اس دور کے رکن رکنِ جرات۔ سیدانشا۔
 مقحفی۔ قاتل اور رنگین وغیرہ تھے۔ یہ لوگ اپنے عہد میں زبان پر
 حکومت کر رہے تھے۔ اور ان کی شاعری کا غلغلہ اس قدر بلند تھا
 کہ ان کے سامنے کسی اردو شاعر کا نام چک ہی نہ سکا۔ ان سب کی
 ہڈیاں کہاں ہیں؟ لکھنؤ کی خاک میں۔

اس زمانے میں دہلی کے صاحبان مذاق جس کثرت سے لکھنؤ میں
 آ رہے تھے اُس کا اندازہ سیدانشا کی ایک روایت سے ہو سکتا ہے جس میں
 اُنھوں نے اُس عہد کے ایک شریف و ضعیف بڑھے اور نور انام ایک کسبی
 کی گفتگو نقل کی ہے وہ بزرگ اور کسبی دونوں دہلی کے ہیں مگر دونوں لکھنؤ
 میں باقین کر رہے ہیں۔ بی نور اکتی ہیں۔ ”اجی آو میر صاحب! تم تو عید کا چاند
 ہو گئے۔ دہلی میں آتے تھے دو دو ہر رات تک بیٹھتے تھے۔ لکھنؤ میں تھیں
 کیا ہو گیا کہ کبھی صورت بھی نہیں دکھاتے۔ اب کی کر ملا میں کتنا میں نے
 ڈھونڈھا کہیں تمہارا اثر اتنا معلوم نہ ہوا۔ ایسا نہ کیجیو کہ آٹھوں میں بھی
 نہ چلو۔ تمہیں علی کی قسم آٹھوں میں مقرر چلیو۔“ اس کا جواب جو میر صاحب نے
 دیا ہے وہ اگرچہ نہایت ہی دلچسپ ہے مگر ہم تقوّل سے بچنے کے خیال سے
 اُسے چھوڑنے دیتے ہیں۔ آٹھوں نے دہلی و لکھنؤ کے موجودہ رنگ پر
 اعتراضات کیے ہیں۔ اور معاصر شعرا بڑھکتے چینیان کی ہیں جس سے ہمیں
 بحث نہیں۔ ہمیں صرف یہ بتانا ہے کہ اس زمانے میں شرفا و کملا درکنار
 رندیاں تک لکھنؤ میں آ آ کے بستی جاتی تھیں۔ اور جو لوگ دہلی میں پھول
 والوں کی سیر کے رسیا تھے اب کر بلا اور آٹھوں کے میلے میں اپنا
 دل بہلاتے تھے۔

شمس العلماء مولانا آزاد مرحوم نے بعد کے تمام شعرا کی دیکھو کو بلا لحاظ امتیاز و عہد ایک جگہ جمع کر کے اور زمانے کی طنائیں کھینچ کے پانچواں دور بنا دیا ہے۔ لیکن یہ نا انصافی ہے۔ اصلی پانچواں دور صرف تاسخ و آتش کا تھا۔ جس میں زبان نے نئی وضع اختیار کی۔ بہت سے پرانے محاورات ترک ہو گئے۔ نئی بندشیں پیدا ہوئیں۔ اور اس زبان کی بنیاد ری جو بعد کے شعراے دہلی دیکھو میں یکساں طور پر مقبول ہوئی۔ اور قریب قریب وہ زبان بن گئی جو اب ہندوستان میں مستند ہے۔ اور یہی وہ زمانہ تھا جب شاعری کی قلمرو میں پہلے پہل کھنوا کا سکہ جاری ہوا۔

اس کے بعد چھٹا دور وہ تھا جب لکھنؤ میں وزیر۔ صبا۔ رند۔ گویا۔ رشک۔ نسیم دہلوی۔ اسیر۔ نواب مرزا شوق اور پنڈت دیانند شکر۔ نسیم صاحبان شنوی کی شاعری کا غغلہ بلند تھا۔ اور دہلی میں مومن۔ ذوق۔ اور غالب نعمت شاعرانہ سنار ہے تھے۔ اس دور نے سچ یہ ہے کہ زبان کو بہ لحاظ خیالات سب سے زیادہ ترقی کے درجہ پر پہنچا دیا۔

اس کے بعد ساتواں دور امیر۔ داغ۔ تنیر۔ تسلیم۔ مجروح۔ جلال۔ لطافت۔ افضل۔ اور حکیم وغیرہ کا تھا۔

ان آخری دوروں پر غائر نظر ڈالنے سے صاف نظر آ جاتا ہے کہ فصاحت زبان اور شاعری نے لکھنؤ میں کیسی مضبوط جگہ پکڑ لی تھی۔ چند ہی روز میں شعر کہنا لکھنؤ میں ایک وضع داری بن گیا۔ اور شعرا کی یہاں اس قدر کثرت ہو گئی کہ شاید کہیں کسی زبان میں نہ ہوئی ہوگی۔ عورتوں تک میں شعر و سخن کا رچا ہوا۔ اور جہلا کے کلام میں بھی شاعرانہ خیال آفرینیوں تشبیہوں اور استعاروں کی جھلک نظر آنے لگی۔

یورپ کے بانٹ ٹمپلز

ہم ہندوستان کے بانٹوں کا حال ناظرین دگلدار کے سامنے پیش

کر چکے ہیں۔ اب اُن کے بڑے بھائی یورپ کے قدیم باتکون کا حال بھی سُن لیجئے۔ یورپ کے اِن انوکھے سپاہیوں نے جو سپہر ہونے کے ساتھ بانکے رسیلے پھیلا بھی جوتے تھے اپنے لیے ٹائٹ، کالقب اختیار کیا تھا۔ محققین یورپ کا بیان ہی کہ وہ اِن سپہر کی کے پیشہ کو خاص معاہدہ اور کسی خاص طرز سے اختیار کرنا اہل جرمنی سے شروع ہوا جو رومیوں کی عروج کے زمانے میں وحشی و جاہل مگر اس کے ساتھ بڑے جنگجو اور نہایت ہی شجاع خیال کیے جاتے تھے۔ کہتے ہیں کہ اُنھیں دنوں جرمانیا کے جنگجو اور پہاڑوں میں بانکے سپاہی بننے کا یہ سادہ اور بھونڈا طریقہ مروج تھا کہ جو نوجوان اس گروہ میں شامل ہونا چاہتا کسی میدان جنگ میں بہادری دکھا چکنے کے بعد اُس کے قبیلہ کے تمام لوگ ایک میدان میں جمع ہوتے۔ بہادران قوم اُن لوگوں سے اس نوجوان کی بہادری اور اخلاقی حالت دریا کرتے۔ اور جب وہ سب مذکورہ صفات کو اُس میں تسلیم کرتے اور ہر طرح کا اطمینان ہو جاتا تو بزرگوں میں سے کوئی شخص اُس کے گال یا شانے پر ایک تھپڑ مارتا۔ جس کے یہ معنی تھے کہ اس ضرب کے بعد وہ پھر کبھی چوٹ نہ کھائے گا۔ وہی بزرگ قوم اُسے ایک ڈھال اور ایک برچھا دیتا۔ اور اُسے اجازت ہوتی کہ اُن اسلحہ کو لے کے میدان جنگ میں جایا کرے۔ جن نوجوان کو یہ عزت دی جاتی وہ ”نیخت“ کہلاتے اسی نیخت سے بگڑکے ”ٹائٹ“ کا لفظ نکلا ہو جس کی اگلی شان تو بالکل مفقود ہو گئی مگر نام یورپ کے خطابوں میں داخل ہونے کی وجہ سے اس وسعت کے ساتھ دنیا میں پھیلا کہ آج ہمارے راجہ صاحبان جاگیر آباد و محمود آباد ہی نہیں ہندوستان کے اکثر والیان ملک اور مہاراجہ مقدس ارض عرب تک کے بعض فرمان روائے ہیں۔

رومیوں میں اس کے ہم وزن ”میس“ کا لفظ تھا۔ اِن مہذب لوگوں میں اگرچہ اصلی قوت غریبوں ہی کی تھی جو ”پلے بین“ کہلاتے۔ مگر ارام و ملوک گھوڑوں پر سوار ہو کے راتے اور ”بطرینی“ کہلاتے۔ اور وہ بطارقہ ہی اکثر ”میس“ کے لقب سے یاد کیے جاتے۔

یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب جرمنی اور رومی دونوں قومن بہت پرست تھیں۔ اور دین مسیحی ابھی دنیا میں نہیں آیا تھا۔ حضرت مسیح کا دین ابتداءً صرف واعظوں سے شروع ہوا تھا اور پہگری کے بالکل مخالف تھا۔ مگر مدتوں مظلوم رہنے کی وجہ سے مسیحیوں کے سینوں میں ایک انتقام کی آگ مدت سے دبی چلی آتی تھی جسے تسطنطین عظم نے اپنی پولیسکل مصلحتوں سے بھڑکا دیا۔ حضرت مسیح کی مصلوبیت کی بنا پر اس نے صلیب کو مسیحیوں کا شعار قرار دیا۔ یہ صلیبی علم ہاتھ میں لیا۔ اور جوش انتقام میں دوبلے ہوئے مسیحی دور و دراز کے اُسکے جھنڈے کو پیچھے جمع ہو گئے۔ اس پر جوش قوت سے اپنے بہت پرست حریف کو شکست دے کے وہ پوری قلمروم پر قابض ہو گیا۔ لیکن یہ ایک وقتی اُبال تھا۔ جب مسیحیت دولت روم کا مذہب بن گئی تو پھر اُسے پہگری سے کوئی ٹھکار نہ رہا۔ اس لیے مسیحیت خونریزی کے مخالف اور لڑنے بھڑنے سے متفرق تھی۔ چنانچہ رومی سلطنت ایک مسیحی دولت بنتے ہی ایسی کمزور ہو گئی کہ گوتم اور بہن تو مون نے اُسے خوب خوب پامال کیا۔ اور آخر عرب لوگ اُسے چھوٹے چھوٹے مشرق میں ایشیا سے کوچک و شام کو اور افریقہ میں تمام شمالی ممالک کو رومیوں سے چھین لیا۔ جزیرہ صقلیہ اور خود اٹلی کا کسی قدر جنوبی حصہ بون کے قبضہ میں چلا آیا۔ اور آبنائے جبل طرہ سے اتر کے اُنھوں نے پورا ملک اسپین بھی اپنے قبضہ میں کر لیا۔

ان دنوں یورپ میں فیوڈل سسٹم (حکومت امرا) کا طریقہ جاری تھا۔ ساری ملک کی یہ حالت تھی کہ ہر زمیندار اپنے علاقے اور اپنے گھاؤں یا شہر کا خود سر حاکم اور بادشاہ بنا ہوا تھا۔ اُس کے زیرِ علم حسب حیثیت سپاہی ہوتے۔ اور اُنھیں کے انداز سے اُس کی قوت ہوتی۔ متعدد زمینداروں کے باہم ملنے اور حلیف ہو جانے سے ایک بڑی قوت بن جاتی۔ اور زبردست دشمنوں کے مقابلے میں اکثر بھی ہو ا کرتا۔

اصلی قوت ان دنوں بھی پیدل سپاہیوں ہی کی تھی مگر چونکہ وہ ادنیٰ طبقے کے لوگ ہوتے اس لیے اُن کی قدر نہ ہوتی۔ قدر سواروں کی تھی جو غوثا امیرون اور رئیسوں کے اعدا و اقارب اور شرفاء قوم ہوتے۔ اور وہ جیسا کہ ہم نے بیان کیا میلس کہلاتے تھے۔ جن کو کون (شہزادوں) اور کاؤنٹوں (وزیران) نے شاہی سطوت حاصل کرنی ہوتی وہ اپنی قلمرو کے صوبوں کو جن لوگوں کے ہاتھ میں

دیتے وہ بائرن کھلاتے۔ اور بائرن اپنے صوبے کو جن عمدہ دارون میں تقسیم کرتے وہ "فائلٹ" کے لقب سے یاد کیے جاتے۔ اور یہ فائلٹ عموماً پیر، کھلاتے تھے۔ اس تفصیل کے ملاحظہ سے ہمارے دوستوں کو یورپ کے موجودہ خطابوں اور انگریز معززین کے بقون کی اصلیت بخوبی معلوم ہو جائے گی۔

پیرے نے کے اور ترک کے جتنے معززین تھے گھوڑوں پر سوار ہو کے لڑتے۔ اور کسی ادنیٰ شخص کو یہ حق نہ تھا کہ بجز یا پیادہ لڑنے کے گھوڑوں کی پیٹھ پر سوار ہو کے میدان جنگ میں آئے۔ اور یہی لوگ میلس خیال کیے جاتے تھے۔ جب عربوں نے اسپین کو لے لیا۔ پھر کو ہسار پیرے نیز سے نکل کے فرانس پر حملہ آور ہوئے۔ اور اندیشہ ہوا کہ ایسا نہ ہو یہ لوگ ساری مغربی مسیحی دنیا کو فتح کر لیں تو نظر آیا کہ بغیر سپہ گری کو زندہ کیے اور اُسے مذہب کا مقدس لباس چھٹا اپنی وطنی اور قومی عزت کا بچا نادشوار ہی۔ ابتداء تو کلیسیا نے اس ضرورت کو محسوس کر کے خاموشی نیم رخصتا، کا اصول اختیار کیا۔ یعنی اس کا یہ طرز عمل کہ زبان سے تو کچھ نہ کہا جائے مگر سپہ گری کی ترقی کو بہ ظاہر استحسان کی نظر سے دیکھا جائے۔ لیکن رومی سپہ گری بوسیدہ وادکار رفتہ ہو چکی تھی اسلئے جرمنی کا نکپن اختیار کر لیا گیا۔ وہ اپنے ساتھ اپنے لقب نیخت کو بھی لایا۔ جو انگریزی میں آنگے ٹائٹ بن گیا۔ یہ نظائر ہی لفظ میں تو ناٹھ لیکن اُس کا املا آج تک ایسا واقع ہوا ہے کہ اگر بولنے میں اُس کی پابندی کی جائے تو تلفظ ٹائٹ ہی ہو گا بلکہ "کیفت" ہو گا۔ غرض اب جو بہادر میدان جنگ میں کوئی کار نمایاں کرتے اور شجاعت ظاہر کرتے ٹائٹ مشہور ہو کے ہم وطنوں میں معزز و ممتاز ہو جاتے۔ حصول عزت نے لوگوں کو زیادہ شوق دلایا۔ اور ٹائٹوں کی تعداد بڑھنا شروع ہوئی۔ اور چند ہی روز میں یہ حالت ہو گئی کہ عوام ٹائٹوں کی عجیب تعظیم و تکریم کرتے اور سلاطین حامی ملک و ملت خیال کر کے انھیں اپنا سرمایہ ناز بتاتے۔

اب یورپ میں یہ طریقہ تھا کہ صرف "فائلٹ" اور اُن سے مافوق مرتبوں کے لوگ ٹائٹ بن سکتے کسی عامی کی مجال نہ تھی کہ ٹائٹ ہونے کا دعویٰ کرے۔ جو فائلٹ اپنے خاندان کو بے داغ و بے عیب ثابت کر سکتا اور چارہم مرتبہ

فانٹون سے قربت رکھنے کا مدعی ہو سکتا اُس کے نوجوان لڑکے خاص طریقہ اور خاص رسوم کے ساتھ ٹائٹ بنائے جاسکتے۔ کبھی کبھی یہ بھی ہوتا کہ کوئی اُدنی طبقہ کا آدمی پہلری کا کمال دکھا کے اور بڑے بڑے سیدانوں میں ناموری حاصل کر کے ٹائٹ کا درجہ حاصل کر لیتا۔ اور ایک نیا پیر پیدا ہو جاتا۔

فرانس کے بادشاہ شارلمین کے عہد سے جو ۸۲۳ء محمدی (۱۳۱۳ء) میں دنیا سے رخصت ہوا حروب صلیبیہ کے چھڑنے کے فی مابین جو زمانہ گزرا اُس میں ہل اسپین فرانس۔ اور نارمن لوگوں کے اوصناع و اطوار میں ایک انقلاب عظیم ہو گیا تھا جو چند روز کے اندر سارے یورپ میں پھیل گیا۔ اسی انقلاب کا ایک نمونہ یہ بھی تھا کہ سپاہی مجلس سے ٹائٹ بن گئے۔ ابتدا ہی سے ٹائٹ ہونے والوں کو سلاح جنگ کے ساتھ و دوزمہ داریان اپنے سر لینی پڑتین۔ ایک تو یہ کہ سپہ گری کو اپنا پیشہ سمجھیں گے اور دوسری یہ کہ حسین عورتوں کی خاطر داشت اور خدمت گزاری کریں گے۔ اس کا پتہ نہیں چلتا کہ ٹائٹوں کو عورتوں کے ساتھ کیوں زیادہ خصوصیت تھی؟ اور از نفعان ملک سے خاص تعلقات رکھنا ٹائٹ ہونے کی ذمہ داریوں میں کب اور کیونکر داخل ہوا؟ مگر اس سے یورپ کی اُس وقت کی اخلاقی حالت عالم آشکارا ہو جاتی ہے۔ یہ نوجوان ٹائٹ ہوتے ہی کسی نہ کسی حسد کے عاشقوں میں شامل ہو جاتا بلحاظ اس کے کہ وہ کس کی بیٹی کس کی بہن اور کس کی جو روہی۔ اُس خاتون کو وہ اپنی خاتون کہتے۔ اور اُس کے لیے لڑنے بھرنے۔ اور کٹنے مرنے پر ہر وقت تیار رہتے۔ اس قسم کے بہت سے ٹائٹ اُن دنوں ہسپانیہ اور فرانس میں پھیلے ہوئے تھے۔ جو مسلمانوں سے لڑتے۔ اور اکثر ناکام و نامراد میدان جنگ سے واپس جاتے اور یہی تھے جنھوں نے ہسپانیہ کے علاقہ قسطلہ اور مملکت فرانس کو عربوں کے ہاتھ سے بچا لیا۔

ٹائٹوں کی یہی حالت چلی آتی تھی کہ حروب صلیبیہ کا زمانہ شروع ہوا۔ اور

راہبوں کے شور و غوغا اور پوپ کے فتوے سے مذہب عیسوی کو سپاہیوں کی ضرورت پیش آئی جو چھترس وقت تک از رو سے دین ناجائز تصور کی جاتی تھی یعنی سپہ گری اب وہ عبادت میں داخل ہو گئی۔ اور ٹائٹ ہونے میں ایک دینی

قدس پیدا ہو گیا۔ لہذا اب بجائے اسکے کہ خود ٹائٹ کسی کو اپنے زمرے میں شامل کرین مقتدایان ملت ملک کے ہانکے ترچھے فوجیوں کو ٹائٹ بنانے لگے۔ اور پوریون اور اسقفون نے ان مقدس زن پرستوں کے زمرے میں شامل کرنے کا یہ طریقہ جاری کیا کہ جسے شوق ہو پہلے چند روز تک روزے رکھے۔ شب زندہ داری و ریاضت کرے۔ پھر غسل کر کے سفید کپڑے پہنے (جس میں بیتما کا اشارہ تھا) اور سب سے بڑے محترم مقدسے دین کے ہاتھ سے تلوار لے جس میں بزرگان دین کی برکت شامل بتائی جاتی۔ اس رسم کے ادا ہونے کے بعد وہ خدا کا سیلٹ جارج کا۔ اور سیلٹ میکائیل کا ہانکا، کہا جاتا۔ اُس سے حلف لی جاتی کہ اپنے باپکین کے فرائض کو سرگرمی سے ادا کرے گا۔ اپنے آپ کو خدا کا اور حسین خاتون کا سپاہی تصور کرے گا۔ بیچ بولے گا۔ حق کا ساتھ دے گا۔ مصیبت زدہ کی مدد کرے گا۔ ہر ایک کے ساتھ خلق و مروت سے پیش آئے گا۔ دشمنان دین سے لڑے گا۔ سہل انکاری۔ غفلت اور اپنی جان بچانے کے جذبات کو حقیر بھیجے گا۔ دل سے نکال ڈالے گا۔ اور اپنی عزت برقرار رکھنے کے لیے سخت سے سخت خطر ان کو برداشت کرے گا۔

پسپری کے کاموں اور عشق بازی میں ان لوگوں کا انہماک اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ بعض بعض جہلمین خیال پیدا ہو گیا کہ سوا سپہگرمی کے اور کوئی پیشہ اختیار کرنا نامائون کے لیے حرام ہے۔ اور نامائون کو دین کی برکتوں اور فیاضیوں سے یہ حق مل گیا ہے کہ مضرت سے بچنے کے لیے جس کسی سے جب اقامت چاہیں لیں۔ یہاں تک کہ قوانین تمدن اور فوجی باضابطگی کے قیود سے وہ آزاد ہیں۔ چنانچہ کسی قانون کا پابند ہونا وہ اپنی ذلت تصور کرتے۔

برجھانٹ کا خاص سلاح تھا۔ اس کا گھوڑا اور ون کے جانوروں سے قدر اور بھاری بھر کم اور طاقت ور ہوتا۔ ایک خاص ملازم گھوڑے کا دہانہ کھڑے ہوئے ہمیشہ اسکے ساتھ ساتھ رہتا۔ اور جب تک لڑنے کا وقت نہ آجاتا ٹائٹ صاحب اُس پر سوار نہ ہوتے۔ وہ کسی اور تیز قدم یا بویا معمولی گھوڑے پر سوار رہتے۔ ٹائٹ کا خود۔ زرہ ہوزے اور تلوار خاص شان اور آن بان

کے ہوتے۔ میدان جنگ میں اُن کا قاعدہ تھا کہ برہمچے کو دشمن کی طرف جھکا سکے
اُڑا کر لیتے۔ اور گھوڑے کو ایڑ بتاکے آگے ریل دیتے۔ میدان جنگ میں نائٹ
کے ساتھ اُس کا ایک وفادار رفیق رہتا جو ”اسکوائر“ کہلاتا۔ اسکوائر سمیت
اپنے نائٹ کا ہم سن اور شریف النسل ہوا کرتا۔ اور دراصل وہ نائٹ ہونے کا
امیدوار ہوتا۔ تیرکیان۔ شمیر و خنجر با اور حربے جن سے نائٹ صاحبِ کمر
ساتھ ساتھ رہتے۔ اور صرف نیزے ہی کا اتنا سامان ہوتا جو پانچ پانچ چھ
چھ آدمیوں پر لدا ہوتا۔ اور وہ سب لڑائی میں سایے کی طرح اس کے ساتھ
رہتے۔ عرصہ جنگ میں اُن کا بانا اور اُن کا شمار ہر ایک میں کوئی جدت اور
خصوصیت ہوتی۔

اس گروہ کے پیدا ہو جانے سے یورپ کے زمینداروں اور سربراہوں
لوگوں کو یہ آسانی ہو گئی تھی کہ اپنے ذاتی جھگڑوں میں اُن سے مدد لیتے۔ اور
اُن کی کارگزاروں کا میا و منہ کرتے گویا خدائی فوجداروں کا ایک گروہ پیدا
ہو گیا تھا جن کو معتد بہ رقم دے کے جو چاہتا بلا لیتا۔ اور اپنے جھنڈے کے
نیچے آسانی سے ایک زبردست شکر جمع کر لیتا۔ باقی آئندہ

لطیفہٴ حدائے

ہم حسن کی کرشمہ ساز یوں کے بہت سے نمونے ناظرینِ دکندار
کی پرشوق نگاہوں کے سامنے پیش کر چکے ہیں۔ لیکن عفت و محبت کا ایک کرشمہ
بھی دیکھنے کے قابل ہے۔ ہارون رشید کے زمانے میں قبیلۂ حدان کا ایک
شریف عرب اپنی ایک بری دش اکوئی بیٹی کو بچپن ہی میں یتیم چھوڑ کے
مر گیا۔ یہ معصوم اور اظہار کی حسن و جمال میں جواب نہ رکھتی تھی اور ”لطیفہ“
اس کا نام تھا۔ بچانے اپنے گھر میں رکھ کے ناز و نعم سے پالا۔
اس کے بچا کا واضح نام ایک خوش رو و گل اندام فرزندِ لطیفہ کا

ہم سن اور ہم کتب تھا۔ دونوں ایک ساتھ رہتے اور ایک ساتھ پرورش پاتے تھے۔ بچپن سے دونوں موسم بہار کے نوشگفتہ پھول بنے ہوئے تھے۔ اور جو جوڑے ہوئے شگفتگی اور خوبصورتی بھی ترقی کرتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ دونوں کے عقیدان شباب کا زمانہ آگیا۔

اس بڑے خطرہ زندگی کے شروع ہوتے ہی یکایک لطیفہ کی زندگی میں ایک تغیر شروع ہوا۔ چہرے کی بے لاشی اور شگفتگی رخصت ہو گئی۔ لالہ نوشگفتہ کے سے گال مر جھانکے۔ آنکھوں سے حسرت ٹپکنے لگی۔ چہرہ اُداس ہو گیا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے چمن حسن کے پھولوں پر اُداس پڑ گئی۔ چچا جو اسے پھول کی طرح رکھتا تھا نہایت متروک ہوا۔ اس انقلاب کا سبب پوچھا مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ دل کا حال کھلتا ہی نہ تھا۔ آخر سب نے بیاری تجویز کی اور علاج کے لیے اطباء کی طرف رجوع کی گئی۔ مگر چند روز میں تجربہ ہو گیا کہ مرض پر حکیموں کا بھی کچھ زور نہیں چلتا۔

بچی ایک زیرک اور ہوشیار زمانہ شناس خاتون تھی اُس نے کئی دفعہ دیکھا کہ دھبے کے حرکات و سکنات کو لطیفہ حسرت کی آنکھوں سے دیکھتی ہے۔ اور بار بار اُس کی صورت دیکھ کے اندر ہی اندر ایک ٹھنڈی سانس بھر کے رہ جاتی ہے۔ یہ دیکھ اُس نے دل میں کہا اس لڑکی کی یہ ساری بیماری اس وجہ سے تو نہیں ہے؟ اور کوشش کی کہ زیادہ آزمائے تو اس مرض کے وسیعہ کی کوئی تدبیر نکالے۔ اُس نے یہ بھی دیکھا کہ لڑکی کو بار بار غش سا آ جاتا ہے۔ اور بے اختیار بیہوش شے گر پڑتی ہے۔ چچی اس غش کے اوقات پر غور کرنا شروع کیا تو یہ کھلا کہ جب دھبے گہر میں اور لطیفہ کی آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے تو وہ ہوش میں رہتی ہے اور حسرت و اندوہ کے ساتھ اُسکی طرف نگراں پائی جاتی ہے۔ مگر جب دھبے کہیں باہر چلا جاتا ہے تو بیہوش اور آپ سے باہر ہو جاتی ہے۔ یہ حالات دیکھ کے اُسے یقین آ گیا کہ لطیفہ کا مرض یقیناً مرض عشق ہے۔ شرافت اور عصمت کے جوش سے دل میں باقی ہے۔ جس سے پُر آتش تنور سینہ

میں اس بلا کی اُس پیدا ہوتی ہے کہ ہوش و حواس نہیں بجا رہتے۔
 اس امر کا پورا پورا یقین کر لینے کے بعد اُس خاتون نے اپنی شوہر
 سے ذکر کیا۔ اس نے کہا کہ اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے؟ قیمت سمجھو کہ اور کسی کو
 ابھی خبر نہیں ہے۔ ورنہ یہ کہنے کو ہوتا کہ بیٹی کی شادی اُس نوجوان سے کر دی
 ہو پہلے۔ سے اُس پر عاشق تھا۔ اور ہم قبیلہ میں کسی سے چار آنکھیں کرنے کے
 قابل نہ رہتے۔ اور میرا تو پہلے سے یہی ارادہ تھا۔ خیر خدا مبارک کرے
 اور وہی چار روز کے اندر قاضی صاحب کو ملوا کے دونوں کا نکاح
 پڑھوا دو۔ غرض ہنسی خوشی دونوں کی شادی ہو گئی۔ اور لطیفہ کا مرعہ
 دور ہو گیا۔ اُس کے گل رخسار اب پہلے سے زیادہ شکفتہ تھے۔ نرگسین
 آنکھوں میں بے نظیر سیلاب پیدا ہو گیا۔ اور دونوں طالبان وصال
 عیش و کامرانی کی زندگی بسر کرنے لگے۔ جو سچے عاشقوں کو بہت کم نصیب
 ہوا کرتی ہے۔ واقعہ بھی طبعیت کا شوقین واقع ہوا تھا۔ پری جال و ناز
 آفرین در لہن کو تاکید کر دی کہ ہمیشہ آراستہ و پیراستہ رہا کر دو۔
 بنا و سنگھار کبھی نہ ہو۔ اور اچھا لہجہ عطر لگائی رہا کر دو۔ لطیفہ نے
 شوق شوہر کا یہ مذاق دیکھ کے ایسا بننا سنورا اور نغمہ ناز شروع کیا
 کہ جنت کی حور اور کوہ قاف کی پری معلوم ہوتی۔ جس نے معشوق شوہر کو
 عاشق صادق بنادیا۔

گرا فوس عشق دنیا میں ناکامی و نامرادی ہی کے لیے پیدا کیا گیا
 ہے۔ اگر مان باپ اعزہ و اقارب و دوست احباب سب موافق ہوں تو
 قدرے آپ ہی سامان حسرت و ناکامی پیدا کر دیا کرتی ہے۔ اس مقصد
 وری و آرزو مند کی زندگی کو چند ہی برس گزرے تھے کہ واقعہ
 بیمار پڑا۔ چند روز میں ٹوکہ کے کاٹھا ہو گیا۔ اور تھوڑے دنوں بعد میں
 عالم شباب میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس جوان مرگ کا صدمہ مان
 باپ کو اور قبیلہ کے ارے و اعلیٰ کو ہوا مگر اُس مایوس تمنا لطیفہ کے دل
 پر جو کچھ گزری بیان سے باہر ہے۔ عاشق شوہر کی یاد تو اس کو کسی

طرح بھولتی ہی تھی۔ مگر غمیتال حسن پر خاک ڈالنا دیکھا اس نے اپنی حد وسطے زیب
وزنیت کو ہمیشہ کے لیے لائن ہی کر لیا۔ صبح و شام شوہر کی یاد میں ماتم کرتی۔
دن بھر آہ جگر دوز کھینچتی۔ اور روز بن ہن کر و اصف کی قبر پر جا کے گھٹون آنسو
بہاتی۔ رخسار کے پھولوں کو آنسوؤں کے گرم پانی سے دھو دھو کے روز کھلاتی۔
اور جب دیکھتی کہ رات زیادہ گئی ہے تو خاک اڑاتی ہوئی گھر واپس آتی۔ غرض اس کا
یہ معمول تھا کہ بھاری جوڑے پہن کے۔ سارے زیور سے سچ کے۔ خوب بن
ٹھن کے اور عطر لگا کے قبر پر آیا کرتی۔

اسی معمول کے مطابق ایک دن وہ بنا دیکر کے تربت جانان پر بیٹھی۔
اشک خونین کے پھول چڑھا رہی تھی کہ عوب کے مشہور شاعر اور امام عوب کے نامی
مورخ اصمعی کا ادھر سے گزر ہوا۔ ایک خوش فکر شاعر اس کے ساتھ تھا۔ دونوں
نے دُور سے جو ایک نئی سنوری نازنین کو ایک قبر پر خاموش بیٹھے دیکھا تو متحیر ہو کے
قریب گئے کہ اسکی عجیب و غریب سوگوار کی داستان سنیں۔ لطف نے جو دو
محرم کو قریب آنے دیکھا چادر اُدھر کے گھونگٹ نکال لیا۔ سارا پنڈا سمیٹ
کے چادر میں ڈھانک لیا۔ اور چہرہ سرنگون کر لیا۔

اصمعی نے جب دیکھا کہ وہ متوجہ ہی نہیں ہوتی تو پوچھا: آخر اس رنج
والم کا کوئی سبب ہے؟ اور گو ہم اجنبی ہیں مگر درد دل کا ظہار خوبصورت چہرے
کا دکھانا نہیں ہے کہ آپ کو اس میں تامل ہو۔ جواب میں بجائے اس کے کہ بات
کرے اس نے یہ دو شعر بڑھ دیے۔

فَانْ تَسْلَمَانِي فِيمَ حَزْنِي فَانْتَبِي رَهْنَيْتُ هَذَا الْقَبْرَ يَا قَتِيَانِ

اگر تم دونوں یہ پوچھتے ہو کہ میرا غم کیوں ہے تو اسے نوجوانوں میں اس قبر کے آئینہ گروہوں

وَالِي لَا سَجِيهَ وَالْتَرَبَابِ نَيْسَا لَمَّا كُنْتُ اسْتَحْيِيهَ حِينْ بَرَّانِي

گو کہ ہمارے اُسکے درمیان مٹی کا ڈھیر حاجب ہے مگر میں اس سے اب بھی ویسی
ہی شرماتی ہوں جس طرح کہ اُس کی آنکھوں کے سامنے شرمایا کرتی تھی۔

اصمعی کتنا ہی اس نازنین کا یہ برجستہ جواب سُن کے ہم دونوں بہت
دشمن در رہ گئے۔ گروہان زیادہ ٹھنڈا مناسب نہیں معلوم ہوا۔ پاس سے

ہٹ آئے اور اُس کی نظر بچا کے قریب ہی درختوں کی آڑ میں چھپ رہے تاکہ دیکھیں یہ نازنین یہاں کیلنی بیٹھ کے کیا کرتی ہی۔ مگر اتنے قریب چھپے تھے کہ اُس کی آواز بخوبی ہمارے کانوں میں آسکتی تھی۔ اب میدان خالی دیکھ کے اُس نے یہ اشعار سوز و گداز کے لہجے میں گانا شروع کیے۔

یا صاحب القبر یا من کان یونسینی وکان یغیر فی الدنیا موالا قی
اے قبر والے! اے وہ جو میرا ایس تھا اور میرے لیے سامان محبت بڑھاتا
ہی جاتا ہے۔

قَدْ زُرْتُ قَبْرَکَ فِی حُلٰی وَفِی حُلٰکَ کَاثِنِی لَسْتُ مِنْ اَهْلِ الْمُصِیْبَاتِ
میں نے بھاری بھاری جوڑے پہن کے اور گنتے سے آراستہ ہو کے تیری
قبر کی زیارت کی جیسے مجھ پر کوئی مصیبت پڑی ہی نہیں۔

کَزِمْتُ مَا کُنْتُ تَهْوٰی اَنْ تَرَاهُ وَاَنَا قَدْ کُنْتُ نَالِفًا مِنْ کُلِّ تِلْکَ اَنْبِیَاتِ
میں نے تو اپنے اوپر فرض کر لیا ہے کہ جیسا تم مجھے دیکھنا چاہتے تھے ویسا ہی دکھاؤں اور
جتنی دھجیں تھیں پسند تھیں تمہارے سامنے رہیں۔

یہ اشعار سن کے اجمعی پر بے انتہا اثر پڑا۔ وہ اور اس کا رفیق شام تک
بہیں چھپے رہے۔ یہاں تک کہ رات ہوئی اور حسرت نصیب لطیفہ قبر سے اظہار
کے اپنے گھر کی طرف روانہ ہوئی۔ جذبات انسانی کے یہ دونوں جاسوس
بھی اندھیرے میں اُس کے پیچھے ہو لیے۔ اور جب وہ اپنے گھر میں داخل
ہوئی تو اُنھوں نے اُس کا چچا چھوڑا اور واپس آ کے یہ سرگزشت ہارون
رشید سے بیان کی۔

رشید نے سنتے ہی ایک آہ کھینچی اور کہا: وہ ادا دنیا میں سب نعمتیں
مل جاتی ہیں مگر ایسی وفادار بی بی نہیں نصیب ہو سکتی۔ کاش وہ میری بی بی ہوتی
مگر جو کچھ ہو کو شش ضرور کروں گا۔ اور فوراً اپنے حامل حیرہ کو فرمان بھیجا
کہ فلاں مقام اور فلاں بستی میں فلاں مکان میں ایک کسین بیوہ ہے۔ اس کے
دلیون کو دس ہزار درہم میری طرف سے بطریق ہر دو اور اُس حسین لڑکی کو
نہایت ہی عزت و آبرو سے میرے پاس بھیجو۔

افسوس رشید نے اس نازنین کی قدردانی تو کی مگر اس کا خیال نہ کیا کہ ایسی محبت و عصمت والی بی بی جس کی ہوئی اُسکی ہوئی۔ پھر اُسکے بعد کسی دوسرے کی نہیں ہو سکتی۔ اور اگر دوسرے کی ہو جائے تو پھر محبت ہی کیا ہو؟ والی بھرہ نے لطیفہ کے چچا کو روپیہ دیا۔ اور بلا لحاظ ضماندہی حاکمانہ انداز سے لڑکی کو رخصت کرانے کے بڑے کرت و فرور نہایت ہی اہتمام کے ساتھ بغداد کی طرف روانہ کیا۔ اور حسرت نصیب لطیفہ سے وہ پیار ہی قبر بھی چھڑادی جو اُس کے جینے کا۔ ہمارا تھی۔ جس کے سامنے بن ہون کو اور سیکڑوں طرح کے بناؤ کر کے وہ اپنے دل کی بھر اس نکالتی اور دنیا کو اپنے حسن کی ہمار دکھا دیا کرتی تھی۔ اب شاہی جلوس اُسے بلکہ عالم بنا کے بغداد کی طرف لے جاتا تھا۔ مگر اُس کا دل مرحوم محبوب کی قبر ہی سے لپٹا ہوا تھا۔ آئی شکش میں مائیں کے گھنڈہ دن تک پہنچی تھی کہ فراق تربت دلدار کے صد سزاگماں روح پرور از کر گئی سب اسے کرتے رہ گئے۔ اور اضمعی اور رشید دونوں اپنی اس چیرہ کار والی پر کف افسوس مٹنے لگے۔ اُس کے اس جان دیدار کو رشید کے دل پر اس قدر اثر پڑ گیا تھا کہ اضمعی کہتا ہے اُس کی یاد نہ گئی بھر نہ بھوئی۔ اور جب یاد آجاتی اُس درد مند خلیفہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

لہجہ

مقالات سرسید۔ شیخ ضیاء الحق صاحب نے یہ بہت ہی اعلیٰ درجہ کا کام کیا ہے۔ سرسید مرحوم کے تمام اقوال اُسیں قسموں میں تقسیم کر دیے گئے ہیں۔ جن سے دینی و دنیوی ہر قسم کی باتیں بہ آسانی حاصل کی جا سکتی ہیں۔ اور ہر ایک کے بعد اُس کے ماخذ اور ماخذ کے صفحہ کا حوالہ دیا ہے۔ سید صاحب مرحوم کے ہر متفقہ کو اس کتاب کا ایک نسخہ لازمی طور پر اپنے پاس رکھنا چاہیے۔ پوری کتاب ۱۶ پیاجے کے ۴۴ صفحوں پر ختم ہوئی ہے۔ کاغذ اچھا ہے۔ چھپائی

بھی بُری نہیں۔ اور قیمت فی جلد ایک روپیہ ہے۔ ہین یقین ہے کہ یہ صاحب کے دلدادہ اُن جواہر بے بہا کی خریداری میں جو اس دُرج میں جمع کر دیے گئے ہیں نقد جان نذر کرنے میں تامل نہ کریں گے۔

درخواستیں شیخ ضیاء الحق صاحب سابق ایڈیٹر پیشوا کے پاس لاہور۔ چوک متی، کے پتہ بھیجی جائیں۔

قواعد اردو۔ مولوی محمد عبدالحق صاحب بی۔ اسے بہتم تعلیمات اور نگاہ آباد ریاست نظام، اور سرکریٹری انجمن ترقی اردو کی وہ بے مثل تصنیف جس کا مدت سے انتظار تھا آخر شائع ہو گئی۔ ہماری امید کے مطابق مولانا نے اردو زبان کی نحو و صرف کو نہایت ہی صحیح اصول پر مرتب و مدون کر کے تمام مروجہ قواعد کو منسوخ کر دیا ہے۔ گو کہ ہمیں اس سے بعض مقامات میں جزئی اختلاف ہے مگر کلیۃً اس کو اپنی زبان کی قابلِ فخر تصنیف تسلیم کرتے ہیں۔ اب اُن اصولِ کیش نظر رکھ کے جو کتاب میں لکھی جائیں گی نہ ان کی بیکار اصلاح کریں گی۔ نظام گوہر نمٹ اور نیز برٹش گوہر نمٹ کے خاکہ نامی تعلیم کو بلا تامل اسے نقاب تعلیم میں داخل کرنا چاہیے۔ پنجاب اور سندھ اس کو فرشتوں کو ایسی تصنیف کی بیکار ضرورت تھی۔ اب اگر وہ قدر دانی نہ کریں تو ہمیں چاہیے کہ زبان اردو کے متعلق وہ اپنے فرائض کو کبھی ادا نہ کر سکیں گی۔ دیت صرف ایک روپیہ ہے "الناظر پریس" لکھنؤ فلاورل سے یا خود سرکریٹری صاحب انجمن اردو سے "اورنگ آباد۔ ریاست نظام" کے پتہ پر درخواستیں بھیج کے طلب کی جائیں۔

اطلاع

جملہ خریداران دگلدار کی خدمت میں التماس ہے کہ وہ خط و کتابت میں اپنا خریداری کا نمبر لازمی طور پر بتا دیا کریں جو اُن کے پتہ کے ساتھ لکھا ہوتا ہے۔ رجسٹرڈ نمبر اسے ادا کھانا کا نمبر جو اس کے حوالہ کی ضرورت نہیں۔ "میفرد دگلدار"۔

نرخ نامہ اجرت اشتہار

آپ کو غالباً معلوم ہو گا کہ دگلڈاز کی اشاعت دو ہزار سے زیادہ ہر اور ایک مشہور اور مستند رسالہ ہونے کی وجہ سے تمام خریدار اسے پرچون اور اس کی جلد کو محفوظ رکھتے ہیں۔ اور اشتہارات کے لیے اشاعت کا اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ عام اجنرات پر صرف ایک نفاذ اشاعت کے وقت کو کوئی نظر پڑتی ہے اور دگلڈاز کے اشتہاروں پر سالہا سال تک ہمیشہ نظر پڑتی رہتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ دگلڈاز میں اشتہارات کو شائع کرا کے آپ جو فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور کسی طرح ممکن نہیں۔ اس سے پہلے دگلڈاز میں اشاعت اشتہارات کی طرف بہت کم توجہ کی گئی۔ لیکن اب خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ دگلڈاز کی قیمت اس قدر کم ہے کہ قطعی امید ہے کہ سال کے اندر اندر اس کی اشاعت چار پانچ ہزار ہو جائیگی۔ ڈیڑھ روپیہ سالانہ چندہ مع معمول ڈاک اور پھر ختم سال پر ایک نیا ناول مفت۔ اس صورت میں کون خریداری نہ کرے گا۔

نرخ نامہ حسب ذیل ہے

قسم کاغذ	دراشتہار	ایک صفحہ	نصف صفحہ	ربع صفحہ
معمولی کاغذ	سالانہ	۵۰	۲۵	۱۵
"	چھ ماہ	۳۰	۱۵	۱۰
"	تین ماہ	۲۰	۱۰	۷
"	ایک مرتبہ	۱۰	۵	۳

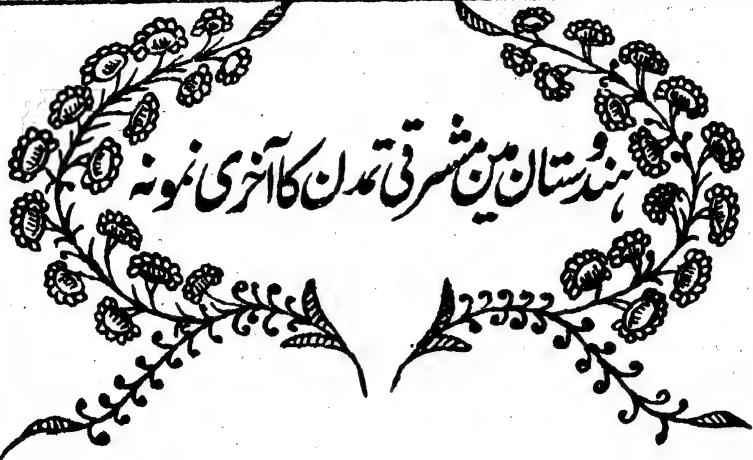
مائیل پیج پورے صفحہ اور سال بھر سے کم کیلئے اشتہار نہ لیا جائیگا۔ اجرت فی صفحہ سالانہ - ۲۵

المشتر منہج دگلڈاز کٹرہ بزن بیگ خان لکھنؤ

دگلڈاز پریس

عمداً اور اعلیٰ درجہ کی چھپائی اور پھر اس کا وقت پر بچانا غیر ممکنات میں سے ہے۔ تصویق کیا گیا ہے۔ اس کی کوئی دگلڈاز پریس نے چھپائی کا نہایت اعلیٰ درجہ کا انتظام کیا ہے۔ اور اس اہتمام کے ساتھ کہ جس تاریخ کے کمال چھاپنے کا وعدہ کیا جائے اسی تاریخ درجی جاس مطبع کو خاص وقت پر بھیجی جائے گی کہ ہر دن اس کے مطابق اصلاح و ترمیم اور تصحیح و ترمیم میں مدد ملے گی۔ جن صاحبوں کو اپنی کتابیں عمدہ اور جلد چھپوانا ہوں فوراً اطلاع دیں۔ مگر خیال رہے کہ صرف اعلیٰ درجہ کی چھپائی ہوتی ہے چھپائی کا نرخ مراعت سے طے ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس کا دار و مدار زیادہ تر کاغذ اور لکھائی کی قیمت پر ہے۔

المشتر منہج دگلڈاز پریس لکھنؤ



ہندستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ

فارسی شاعری کا اصلی اُٹھان مثنوی سے ہوا ہے۔ اور یہ صنف شاعری ہمیشہ سب سے زیادہ اہم اور بادقت سمجھی گئی۔ ابتدا فردوسی کی رزمیہ مثنوی شاہنامے سے بڑی۔ پھر نظامی۔ سعدی۔ مولانا سے روم۔ خسرو۔ جامی۔ اور تاقی وغیرہ نے اس میں اعلیٰ ترین شہرت و ناموری حاصل کی۔ اردو میں میر تقی میر نے چھوٹی چھوٹی بہت سی مثنویاں دہلی و لکھنؤ کے قیام کے زمانے میں لکھی تھیں مگر وہ اس قدر مختصر اور معمولی ہیں کہ مثنویوں کے تذکرے میں ان کا ذکر بھی بے محل سا معلوم ہوتا ہے۔

مثنوی لکھنے کا آغاز اردو میں میر ضاحک کے بیٹے میر غلام حسن سے ہوا۔ جو بچپن ہی میں اپنے پدر بزرگوار کے ساتھ لکھنؤ چلے آئے تھے۔ یہیں کی صحبت میں ان کا نشوونما ہوا تھا۔ یہیں پرورش پائی تھی۔ اور یہیں کی آب و ہوا کے آغوش میں ان کی شاعری پلّی تھی۔ کیونکہ جس تعلیم اور جس سوسائٹی نے ان سے مثنوی ”بے نظیر و بدستیز“ لکھوائی وہ خالص لکھنؤ کی تھی۔ اسی زمانہ میں نواب مرزا محمد تقی خان ہوس نے مثنوی لیلیٰ مجنون لکھی۔ اور لکھنؤ میں مثنویت کا مذاق بڑھنا شروع ہوا۔ آتش اور ناسخ کے زمانے میں تو ذرا خاموشی رہی۔ مگر پھر جو یہ مذاق اُبھرا تو پُختہ دیا شکر نسیم نے گلزار نسیم۔ آفتاب الدولہ قلی نے طلسم الفت۔ اور نواب مرزا اشوق نے بہار عشق زہر عشق اور فریب عشق لکھیں۔ اور انہیں اس قدر عام نمود و شہرت اور عالمگیر مقبولیت حاصل ہوئی کہ ہر ادنیٰ و اعلیٰ کی زبان پان مثنویوں کے اشعار چڑھ گئے۔ اس سے پیشتر کے زمانے میں کسی صاحب نے مثنوی میر حسن کے جواب میں لذت

نام ایک مثنوی لکھی تھی وہ نواب مرزا شوق کی مثنویوں کے ساتھ شائع ہونے کی وجہ سے انھیں کی جانب منسوب ہو گئی۔ لیکن حقیقت میں نہ وہ ان کی ہی اور نہ ان کے زمانے کی ہو۔

ان سب مثنویوں کے دیکھتے مثنوی گلزار نسیم باوجود عام مقبولیت کے صدرا غلیطوں سے مملو ہے۔ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک نازک خیال نو مشق ہے جو ہر قسم کی شاعرانہ خوبیاں اپنے کلام میں پیدا کرنا چاہتا ہے مگر قادر الکلامی کے نہ ہونے سے قدم قدم پر ٹھوکرین کھاتا ہے۔ اور کسی جگہ اپنے مقصد کو نہیں حاصل کر سکتا۔ اس کے جواب میں آغا علی شمس نے جو ایک بہت ہی کمند مشق شاعر تھے اسی بحر میں ایک مثنوی لکھی تھی۔ جس میں غلیطوں سے پاک رہ کے تشبیہات استعارات اور رعایا لفظی کے کمالات دکھائے تھے۔ مگر افسوس وہ مثنوی مٹ گئی۔ اور گلزار نسیم کو جو شہرت حاصل ہو چکی تھی اس پر غالب نہ آ سکی۔ دہلی میں ان دنوں مومن خان نے چند چھوٹی چھوٹی بے مثل مثنویاں لکھیں جو بہت ہی مقبول اور مشہور ہوئیں۔

مومن خان کے مذاق شاعری میں نازک خیالی بڑھی ہوئی تھی۔ خیالی تشبیہوں اور استعاروں پر وہ اپنی سخن آفرینی کی عمارت قائم کرتے تھے۔ مثنویوں میں وہ زیادہ تر خیالی جذبات و صفات کو مشخص کر کے اپنے کلام میں ایک خاص لطف پیدا کیا کرتے تھے۔ مومن خان کے ایک شاگرد نسیم دہلوی لکھنؤ میں آئے۔ اور یہاں کے مشاعروں میں اپنا رنگ ایسا جمایا کہ بہت سے لوگ ان کے شاگرد ہو گئے۔ نسیم دہلوی نے لکھنؤ میں اپنے استاد کے رنگ کو خوب چمکایا۔ اور ان کے شاگرد تسلیم لکھنوی نے اردو مثنویوں میں نظیری و عرفی و صائب کی خیالی آرا بیان دکھا دیں۔ اور نظم اردو میں جیتے جاگتے فیضی غنیمت لاکے کھڑے کر دیے۔ اور آخر زمانے میں مولوی میر علی حیدر طباطبائی نظم لکھنوی نے شراب کی مذمت میں ساقی نامہ شمشقیہ کے نام سے ایک ایسی بے نظیر اخلاقی نظم اردو پبلک کے سامنے پیش کر دی کہ اس کا جواب نہیں ہو سکتا۔ غرض کہ مومن خان کی چند مختصر مثنویوں سے اگر قطع نظر کریں جاے تو اردو مثنوی گوئی کا آغاز بھی لکھنؤ میں ہوا۔ اور ترقی بھی یہیں ہوئی۔

بعض حضرات مثنوی میر حسن اور گلزار نسیم کے ذریعہ سے دہلی اور لکھنؤ کی زبان کا مقابلہ موازنہ کیا کرتے ہیں۔ جس خیال کو مولوی محمد حسین صاحب آزاد نے اور زیادہ قوت دیدی۔ لیکن اول تو گلزار نسیم کو نظیر اکبر آبادی کے بنجاری نامے کی طرح اگر شہرت ہو بھی گئی تو اسے مثنوی میر حسن کے مقابلہ میں رکھنا اردو شاعری کی سخت تذلیل و توہین ہے۔ صحیح مقابلہ ہو سکتا ہے تو مثنوی میر حسن اور مثنوی طلسم الفت کا۔ اور اگر گلزار نسیم کی زبان زبردستی لکھنؤ کی زبان مان بھی لی جائے تو مثنوی میر حسن اور گلزار نسیم کا مقابلہ دہلی اور لکھنؤ کی شاعری کا نہیں بلکہ خود لکھنؤ کی اگلی پچھلی زبانوں کا مقابلہ ہے۔ اس لیے کہ مثنوی میر حسن لکھنؤ کی پہلی زبان کا نمونہ ہے اور یہ آخری زبان کا۔

شاعری کی ایک اہم اور قدیم ترین صنف مرثیہ خوانی ہے۔ قدیم عربی شاعری میں زیادہ تر مرثیے اور رجز ہی شعرو سخن میں اظہار کمال کا ذریعہ تھے۔ فارسی میں مرثیہ خوانی کمزور پڑ گئی تھی۔ لیکن جب بعد سلاطین صفویہ ایران میں مذہب شیعہ کو فروغ حاصل ہوا تو مصائب اہل بیت رسالت کی یاد تازہ کرنے کے لیے شعر کو مرثیہ خوانی کی طرٹ توجہ ہوئی۔ مولانا محتشم کاشانی نے چند بندوں کا ایک بے مثل مرثیہ لکھا تھا جو عموماً مقبول ہوا۔ اس کے بعد سے رواج تھا کہ شعرا کبھی کبھی ماتم حسین میں دو ایک مرثیہ بھی موزون کر دیا کرتے۔ لیکن شعرو سخن کی دنیا میں مرثیہ گوئی کی وقعت اس قدر کم تھی کہ مشہور تھا، بگڑا شاعر مرثیہ گو یا پھر جب مذہبی اعتبار سے دولت صفویہ عوام کی جانشین اودھ کی سلطنت قرار پائی تو لکھنؤ میں مجالس کی ترقی و عوامداری کے جوش و خروش نے مرثیہ گوئی کی ایسی قدر دانی کی کہ اس فن کو غیر معمولی عروج حاصل ہونا شروع ہوا۔ اور دراصل لکھنؤ کے عروج کا سارا راز اسی تاریخی واقعہ میں مستتر ہے۔ ہندوستان میں مغلوں کی سلطنت تھی جنھوں نے فارسی زبان کو درباری زبان قرار دیا۔ اور فارسی معاشرت ان کی امیرانہ زندگی اور ان کے تمام کمالات کا مرکز تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ ہر ایرانی ہندوستان میں آتے ہی آنکھوں پر بٹھایا جاتا۔ اور اس کی ہر حرکت اور ہر وضع مقبولیت کی نگاہوں سے دیکھی جاتی۔ دہلی کی سلطنت میں بادشاہوں کا مذہب سُنی ہونے کی وجہ سے ایرانی اپنی بہت سی باتوں کو

چھاتے۔ اور وہاں کی محفلوں میں اس قدر شگفتہ نہ ہونے پاتے جس قدر کہ وہ اصل میں تھے۔ اودھ کا دربار شیعہ تھا۔ اور یہاں کا خاندان حکمرانی خاص خواسان سے آیا تھا۔ اسلئے یہاں ایرانی بالکل کھل گئے۔ اور اپنے اصلی رنگ میں نمایاں ہونے کی وجہ سے وہ جس قدر شگفتہ ہوئے اُسی قدر زیادہ ہم مذہبی کے باعث یہاں کے اہل دربار نے اُن کے اوضاع و اطوار کو حاصل کرنا پیشرو کر لیا۔ اور ایرانیات جو دراصل ساسانی اور عباسی شان و شوکت کے آغوش میں پلٹی ہوئی تھی چند ہی روز کے اندر کھنڈ کی معاشرت میں سرایت کر گئی۔

غرض سودا و تیر کے زمانے میں میان سکندر۔ گدا۔ مسکین اور افسرہ مرثیہ گوئی۔ جو چھوٹی چھوٹی نظمیں شہادت امام حسین کے بیان میں تصنیف کر کے مجلسوں میں سنایا کرتے۔ اُن کے بعد میرخلیق اور میرضحیم نے مرثیہ گوئی کو بہت ترقی دی۔ اور مرثیوں کی موجودہ وضع انھیں کے زمانے میں ایجاد ہوئی۔ یہاں تک کہ زمانہ میرضحیم کے شاگرد مرزا دبیر اور میرخلیق کے صاحبزادے میرانیس کو ناموری کے شہ نشین پر لایا اور ان دونوں بزرگوں نے مرثیہ خوانی میں ایسے ایسے کمالات شاعری دکھائے کہ شعر و سخن کے آسمان پر آفتاب و ماہتاب بن کے چلے۔ وہی مقابلہ جو میر و سودا اور آتش و ناسخ میں رہا تھا اب تیرانیس اور مرزا دبیر میں قائم ہوا۔ مرزا دبیر میں شوکت الفاظ تھی۔ بلند خیالی تھی۔ اور علم و فضل کا زور تھا۔ میرانیس میں سادگی بے تکلف اور جذبات انسانی پر حکومت کرنے والی زبان کی وہ خوبیاں تھیں جو سوا مبداء فیاض کی عنایت کے سیکھنے سے نہیں آسکتیں۔ ان دونوں بزرگوں نے فن مرثیہ گوئی کو اور شاعری کی تمام اصناف سے بڑھا دیا۔ اور ادب اردو میں وہ نئی چیزیں پیدا کر دیں جن کو انگریزی تعلیم کے اثر سے طبعیت میں ڈھونڈنے لگی تھیں۔

انیس و دبیر نے مرثیہ گوئی کو اس درجہ کمال پر پہنچا دیا تھا کہ اب مرثیہ گوئی بجائے معیوب ہونے کے سب سے بڑا شاعرانہ ہنر بن گئی تھی۔ تمام اہل کھنڈ ان دونوں بزرگوں کے اس قدر معرف و مداح ہوئے کہ سارا شہر دو گروہوں پر بٹا ہوا تھا۔ اور ہر سخن سنج یا انیس یا دبیر یا۔ اور ان دونوں گروہوں میں

ہمیشہ باہمی مخالفت رہتی۔

میر انیس نے مرثیہ گوئی کے ساتھ مرثیہ خوانی کو بھی ایک فن بنا دیا۔ یونانیوں کے بعض مقرر و ن اور خطیبوں کی نسبت سنا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی تقریر و ن میں اثر پیدا کرنے کے لیے خاص خاص کوششیں کی تھیں۔ اور آواز کے نشیب و فراز اور ادضاع و اطوار کے تغیرات سے گفتگو میں اثر پیدا کرتے تھے۔ اسلام کی اس طولانی عمر میں اس نہایت ضروری فن کو اصول کے ساتھ خاص میر انیس نے زندہ کیا۔ الفاظ کے مناسب آواز کے تغیرات اور مضامین کے موافق چہرہ بنا لینے۔ کلام کو اعضا و جوارح کے متناسب حرکات اور خط و خال کے اشارات سے قوت دینے کا فن خاص لکھنؤ کی اور وہ بھی میر انیس کے گھرانے کی ایجاد ہے۔ جس کی ترقی میں اب تک کوششیں جاری ہیں۔ اور ہمارے اسپیکر اپنی فصیح البیانی میں اثر پیدا کرنے کے لیے اگر ان باتوں کی شاگردی کریں تو نہایت ہی کامیاب اسپیکر ثابت ہوں۔

ڈراما کا فن سخن جو مغربی شاعری کی جان ہے اس سے عربی و فارسی کا ادب مطلقاً خالی تھا۔ اور فارسی کی شاگردی کی وجہ سے اردو میں بھی اس کی طرف کبھی توجہ نہیں کی گئی۔ سنسکرت میں اعلیٰ درجہ کے ڈراما تھے۔ مگر ان سے ہندوستان کی آخری سوسائٹی بالکل نا آشنا ہو چکی تھی۔ رام چند راجی اور سری کرشن جی کے کارنامے البتہ ہندوؤں میں مذہبی آداب کے ساتھ دکھائے جاتے تھے مگر اردو شاعری کو ان سے کسی قسم کا تعلق نہ تھا۔ رام چند راجی کے حالات انگلستان کے اُلمپیا کی طرح کھلمیڈانوں میں رزمیہ نقالیوں کی شان سے دکھائے جاتے۔ اور سری کرشن جی کے حالات رقص و سرود اور موسیقی کے پیرایے میں مذہبی ایجنوں پر بعینہ اُپیرا کے طریقے سے نظر آتے "جو رہس" کہلاتے۔ واجد علی شاہ کو رہس سے خاص دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اور رہس ہی کے پلاٹ سے ماخوذ کر کے انھوں نے اپنا ایک ڈراما تیار کیا جس میں دو کھیاچی بننے یا عشق کے ستارے ہوئے جو گئی بن کے دھوئی رہاتے۔ اور بہت سی عورتیں پران اور عاشق مزاج گو بیان بن کے انھیں ڈھونڈتی پھرتیں۔

پھر جب قیصر باغ کے میلون کا دروازہ عوام الناس کے لیے بھی کھل گیا تو سارے شہر کے شوقینوں میں ڈراما کا مذاق پیدا ہو کے خود بخود ترقی کرنے لگا۔ اور چند ہی روز میں اس شوق کو اس قدر ترقی ہوئی کہ بعض مشہور شعرا بھی اُس زمانے کے مذاق کے موافق طبع آزمایاں کرنے اور ڈراما لکھنے لگے۔ چنانچہ واجد علی شاہ کے شوق کے ساتھ ہی میان امانت نے جو ایک مشاق شاعر تھے اندر سبھا لکھی اور موجودہ عہد کی کمپنیوں کی طرح شہر میں جا بجا مختلف جماعتیں اُن کی ”اندر سبھا“ کو اسٹیج پر کھینچنے لگیں۔ جن میں کئیں عورتیں اور کئیں کسں لڑکے ایکٹ کرتے۔ اس اندر سبھا میں اصول موسیقی کے مطابق دلکش مضمین قائم کی گئیں۔ اور سارا شہر اندر سبھا کے جلسہ دیکھنے کا مشتاق تھا۔ میان امانت کی اندر سبھا کی کامیابیاں دیکھ کے اور لوگوں کو بھی شوق ہوا۔ اور اس قسم کے بہت سے ڈرامے ایجاد ہو گئے۔ اور سب کا نام ”سبھا“ قرار پا گیا۔ چنانچہ شہر میں مداری لال وغیرہ کی بہت سی سبھائیں قائم ہو گئیں جن کے پلاٹ بدلے ہوئے تھے۔

سبھا کے نئے رنگ نے شہر میں ایسی لڑندہ دلی پیدا کر دی کہ سوا اندر سبھا کے لوگ کسی اور قسم کا ناچ گانا پسند ہی نہ کرتے تھے۔ ہر طرف سبھائوں کی دھوم تھی۔ اور اس کی بنیاد پڑ گئی کہ سوسائٹی کے مذاق کے مطابق اگلے عاشقانہ قصے نقل کے طور پر اچھی نظموں میں اور دلکش مضمون کے ساتھ پبلک کے سامنے پیش کیے جائیں۔ اس میں شک نہیں کہ پارسی تھیٹرون نے اپنی انتظامی خوبیوں اور نمائشی دلفریبیوں کی وجہ سے سبھائوں کا رنگ پھیکا کر دیا۔ لیکن یہ نہ سمجھو کہ ڈراما کا وہ بُرا نام مذاق جو لکھنؤ میں ایجاد ہو کے مروج ہوا تھا مٹ گیا۔ اول تو پارسیوں نے بھی اس چیز کو لکھنؤ سے لیا ہے۔ اُن کا پہلا عام کھیل امانت کی اندر سبھا تھا۔ اور باوجود اس کے لکھنؤ کے تمام قومی جلسوں میں آج تک پتیرے۔ ہرکیش چندر۔ وغیرہ کے ایسے بیسیوں پر فارنس ہو رہے ہیں اور اس مذاق کے اکثرون کا ایک مستقل گروہ پیدا ہو گیا ہے جو شرفا میں سے قومی ڈراما کا مذاق اُٹھ جانے پر بھی عوام کو محظوظ کرتا ہے۔ ہر تقدیر اس میں شک نہیں کیا جاسکتا کہ اردو

درا ماکے بنیاد خاص لکھنؤ ہی میں پڑی۔ اور یہیں سے سارے ہندوستان میں اپکا
رواج ہوا۔

اردو شاعری کی ایک قسم واسوخت ہیں۔ یہ خاص قسم کے عاشقانہ مسدس
ہوتے ہیں۔ اور ان کا مضمون جمونا یہ ہوتا ہے کہ پہلے اپنے عشق کا اظہار اس کے بعد
معشوق کا سراپا۔ اُس کی بے وفائیاں۔ پھر اُس سے روتھ کے اُسے یہ باور کرانا کہ
ہم کسی اور معشوق پر عاشق ہو گئے۔ اُس فرضی معشوق کے حسن و جمال کی تعریف
کر کے معشوق کو جلانا چھیڑنا۔ جلی کٹی سناٹا اور یوں اُس کا غور توڑ کے پھر ملاپ
کر لینا۔ نظم اردو کی یہ قسم لکھنؤ ہی سے شروع ہوئی۔ اور زمانہ وسط کے قریب قریب
تمام شاعروں نے واسوخت لکھے ہیں۔ اور ان میں بڑے بڑے لطف پیدا کیے ہیں۔
دہلی میں بھی بعد کے زمانے میں مختلف واسوخت لکھے گئے۔ خصوصاً مومن خان نے کئی
بہت اچھے واسوخت لکھے۔ مگر آغاز لکھنؤ ہی سے ہوا۔

اُمرا کی عیاشانہ طبیعتوں نے شاعری کی کئی اور صنفوں کو بھی پیدا کر دیا
جن کا آغاز دہلی ہی سے ہوا تھا۔ ان میں سب سے زیادہ مہل ہزل گوئی ہے
اور کسی قدر پر لطف رنجش بھی ہے۔ ہزل گوئی کا آغاز دہلی میں جعفر زبلی سے ہوا۔
جو غالباً محمد شاہ کے زمانے میں تھے۔ اُن کے کلام کو میں نے ادل سے آخر تک
دیکھا ہے۔ سوا فحش گوئی اور حد سے گزری ہوئی بیجیائی کے نہ کوئی شاعرانہ خوبی نظر
آتی ہے اور نہ زبان کا کوئی لطف ہے۔ اس کے بعد دہلی ہی کی خاک نے صاحبقران کو
پیدا کیا جن کا عروج غالباً لکھنؤ میں اور لکھنؤ کے درمیانی دور میں ہوا۔ اگرچہ ان کے
حالات اور ان کا زمانہ مجھے کسی معتبر ذریعہ سے نہیں معلوم ہو سکا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے
کہ لکھنؤ ہی کے معتدل ذائقہ والے رئیس زادوں میں اُن کا نشوونما ہوا۔ اُن کا
دیوان ملتا ہے۔ اور گو کہ کلام فحش اور تہذیب سے کوسوں دور ہے مگر پھر بھی
اُس میں ایک بات ہے۔ شاعرانہ خوبیوں کے ساتھ زبان اور محاوروں کا پورا
لطف ہے۔ لیکن اس فن کو لکھنؤ کے آخری دور میں میان مشیر نے جو مرزا دبیر کے
شاگرد تھے کمال کے درجے کو پہنچا دیا۔

مجھے اس موقع پر بلا لحاظ اس کے کہ شیعوں اور سنٹیوں کے متعصبانہ

جذبات کا لحاظ کروں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ لکھنؤ میں جب شیعہ سلطنت قائم ہوئی شیعیت نے اپنے اصلی رنگ کو قائم رکھ کے کمال آزادی کے ساتھ اپنے ہر اصول میں ترقی شروع کی۔ مذہب شیعہ کی بنیاد دو چیزوں پر ہے۔ ایک تو لا۔ یعنی اہلبیت کرام اور خاندان نبوت کے ساتھ اظہار محبت۔ اور دوسرا تبرّا یعنی اُس محترم خاندان کے دشمنوں سے اپنی برائت ظاہر کرنا۔ جس نے باہمی رقابت و تعصب کے بڑھنے سے سب دشمن کی صورت اختیار کر لی۔ اصولاً اس عقیدے میں سنی بھی اُن کے ساتھ شریک ہیں مگر فرق یہ آپڑا کہ پہلے تینوں جانشینان رسالت کو اہل سنت افضل الناس بعد انبیاء و رسل اور سچے جانشینان رسالت مانتے ہیں۔ اور شیعہ اُن کو غاصب و ظالم بتاتے ہیں۔ اور جب یہ بزرگ بھی اُن کے عقائد میں خاندان رسالت کے دشمن قرار پائے تو اُن سے بھی تبرّا واجب ہو گیا۔ جس کو مذہب اور صاحب علم لوگوں نے اگر حرف برائت کے صحیح معنوں کی حد تک رکھا تو عوام شیعہ اپنے مذاق کے مطابق اُن پر زبان سب دشمن دراز کرنے لگے۔ اور یہی چیز سنی شیعوں کی باہمی تعصب کی بنا قرار پا گئی۔

ان دونوں مذہبی چیزوں نے لکھنؤ کی شاعری پر نہایت ہی عمدہ اور مناسب اثر ڈالا۔ تو لا نے مرثیہ گوئی کے فن کو اپنے آغوش میں لے کے جلا اصفان شاعری سے بڑھا دیا تو دشمنان خاندان نبوت سے تبرّا کرنے کے جوش نے پرانی ہجو گوئی کو اختیار کر کے اُسے ہرزیہ گوئی کے نام سے ترقی دی۔ اس فن کے متعدد دبا کمال لکھنؤ میں مشہور ہوئے مگر افسوس کہ یہ چیز بالخصوص اہل سنت کو ناگوار گزرنے والی تھی عہد شاہی میں اس پر تلواریں نکل پڑا کرتی تھیں۔ اور انگریزی میں بھی آج تک کبھی کبھی فوجداریاں اور مقدمہ بازیان ہو جایا کرتی ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہرزیہ گوئی و ہرزیہ خوانی کو مکانون کی چار دیواری سے باہر نکلنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ اگر ہرزیہ گوئی کا عام سبکٹ ایسا محدود اور مابہ النزاع نہ ہوتا تو زمانہ دیکھتا کہ لکھنؤ کے ہرزیہ گوئیوں نے اپنی ہیود گوئیوں اور فحاشیوں میں بھی کیسے کیسے کمال دکھائے ہیں۔

اس فن میں سب سے زیادہ شہرت مرزا دبیر کے شاگرد میان مشیر کو حاصل ہوئی۔ جو گوئی اور فحاشی پہلے بھی تھی مگر ”مشیر نے جس قسم کے محاورات سے کام لیا۔ بتدیکہ الفاظ۔ طرزاوا۔ اور استعمال تشبیہات میں جیسی مضحکہ خیزی پیدا کی۔ اور صحبت کو مارے ہنسی کے لٹا دینے۔ اور سامعین کے پیٹ میں بل ڈال دینے کے لیے جو زبان اور جیسا اسلوب سخن اختیار کیا اُس کی خوبیاں اور جدتیں بیان سے باہر ہیں۔ ابتداء میں بھی لطف پیدا کر کے اُسے شائستہ لوگوں کے سامنے پیش کرنے کے قابل بنادیتا اُن کا خاص جوہر تھا جو اُن سے پہلے اور بعد کسی کو نہیں نصیب ہوا۔

ہزل گوئی کے سلسلہ میں میان چرکین کا نام بھی لینا چاہیے۔ کھٹو کے زمانہ وسطی میں عاشور علی خان نام ایک زندہ دل اور نہایت ہی قابل و با مذاق رئیس تھے۔ اُن کے وہاں کی صحبت اس وقت کی سوسائٹی کا ایک اکمل ترین نمونہ تھی۔ انھیں نے جان صاحب اور چرکین کو پیدا کیا۔ اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ انھیں کی صحبت میں صاحب چرا کا بھی نشوونما ہوا تھا۔ چرکین اپنے ہر شعر میں پشیا ب پچا مانے کی رعایت رکھتے۔ اور اُن کے اشعار سے ایسی تحفیں آتی ہو کہ نام سنتے ہی ہمارے ناظرین کے دماغ مڑ گئے ہوں گی۔ مگر چونکہ ان کو ایک قسم کی خصوصیت تھی ہم نے اُن کا ذکر کر دیا۔ اُن کے کلام میں بعض شاعرانہ خوبیاں اور اچھی تشبیہیں بھی ہیں مگر اُن کے مذاق نے اُن کو خوب کو بھی گندہ اور لمیدہ کر دیا ہے۔

لیکن ریختی کافن باوجود غیر مہذب ہونے کے دلچسپ ہے اور چرکین کی شاعری کی طرح اذیت رساں نہیں۔ مردوں اور عورتوں کے محاوروں اور لہجے میں تھوڑا بہت فرق ہر زبان میں ہوا کرتا ہے۔ مگر اتنا نہیں جتنا کہ اردو میں ہے۔ یا شاید ہمیں دوسری زبانوں پر اتنی قدرت نہ ہو کہ مردوں اور عورتوں کی زبان کا جتنا فرق اپنی زبان میں نظر آتا ہے اُن میں نہ نظر آتا ہو بہر حال ہمارے علم کی حد تک اردو اس خصوصیت میں بڑھی ہوئی ہے۔ فارسی اور عربی کا برا مذاق تھا کہ عورتیں شعر کہتیں تو اپنی زبان میں کہتیں۔ اور مرد کبھی عورتوں کی زبان سے کوئی خیال کراتے تو زبان میں لطف پیدا کرنے کے لیے اُن کی زبان اختیار کر لیتے۔ یہی حال انگریزی کا ہے اردو شاعری ہمیشہ سے صرف مردوں کی زبان میں رہی۔ یہاں تک کہ اس میں عورتیں کہتی بھی ہیں تو مردوں کے کہتی ہیں۔ مردوں ہی کی زبان اختیار

کرتی ہیں اور اپنے لیے ضمیر میں تک مذکر استعمال کرتی ہیں۔ اگر شاعر کا نام نہ معلوم ہو تو کوئی نہیں پہچان سکتا کہ یہ کسی عورت کا کلام ہی یا مرد کا۔

اردو شاعری کا تیسرا باجو تھا ہی دور تھا کہ شوخ طبع جوانوں میں خیال پیدا ہوا کہ ریختہ کی طرح ایک ریختی ایجاد کی جائے۔ میر حسن نے اپنی مثنوی میں ضرورت تگے سو قون پر یہ زبان موزون کی تھی۔ مگر وہاں تک مضائقہ نہ تھا۔ میان رنگین نے اس رنگ کو مستقل طور پر اختیار کیا۔ جو دہلی کے رہنے والے تھے۔ اور لکھنؤ کی محبتوں میں شریک رہا کرتے تھے۔ ابتداً مہذب لوگوں کی صحبت نے اس رنگ کو بے شرمی اور خلاف تہذیب جانا۔ چنانچہ سید انشا کی زبانی ہم نے لکھنؤ میں دہلی کے جن مہذبین رسیدہ بزرگ اور وہیں کی ایک زندی نور کی گفتگو لکھی ہے اس میں وہ بزرگ فرماتے ہیں: اور سب سے زیادہ ایک اور سینے کہ سعادت یار طہاسب کا بیٹا انوری ریختہ اپنے کو جانتا ہے۔ ریختن تخلص ہے۔ ایک قصہ کہا ہے۔ اس مثنوی کا نام دلپذیر رکھا ہے۔ زندیون کی بولی اُس میں باندھی ہے میر حسن پر زہر کہا ہے۔ ہر چند اُس مرحوم کو بھی کچھ شعور نہ تھا۔ بدرمیر کی مثنوی نہیں کہی گویا سانڈے کا تیل بیچتے ہیں۔ بھلا اس کو شعور کیونکر کیے؟ سارے لوگ دلی کے لکھنؤ کے زندی سے لے کے مرد تک پڑھتے ہیں۔

چلی وہاں سے دامن اٹھاتی ہوئی کرٹے کو کرٹے سے بجاتی ہوئی سو اُس بچارے رنگین نے بھی اسی طور پر قصہ کہا ہے۔ کوئی پوچھے کہ بھائی تیرا باپ رسالدار مسلم لیکن بچارا برچھی بھالے کا ہلانے والا۔ تیغ کا چلانے والا تھا۔ تو ایسا قابل کمان سے ہوا؟ اور شہدین بہت مزاج میں زندی بازی سے آگیا ہے تو ریختہ کے تین چھوڑ کر ایک ریختی ایجاد کی ہے۔ اس واسطے کہ بھلے آدمیوں کی بہو بیٹیاں پڑھکر مشتاق ہوں۔ اور اُن کے ساتھ اپنا منہ کالا کرے۔ بھلا یہ کلام کیا ہے۔

ذرا گھر کو رنگین کے تحقیق کر لو یہاں سے ہی کے پیسے ڈوٹی کمارو مرد ہو کر کتا ہے؟ کہیں ایسا نہ ہو بخت میں ماری جاؤں۔ اور ایک کتاب بنائی ہے اُس میں زندیون کی بولی لکھی ہے۔ جس میں اوپر والیان چلیں۔ اوپر والا چاند۔

اُجلی دھوبن - وغیرہ وغیرہ۔

مگر مہذب بڑے شکایت کرتے کرتے مر گئے۔ نوجوانوں کی رنگینی نے رنگین کے ذائقہ کو ترقی دے ہی کے چھوڑا۔ اور ریختی اودھ کا ایک فن ہو گیا جس کی ایجاد گو ایک دہلی ہی کے شاعر سے ہوئی تھی مگر گھنٹو میں ہوئی۔ اور یہیں اسے فروغ ہوا۔ قصے کے سلسلہ میں اس زبان کو میر حسن کے بعد نواب مرزا شوق نے جس اعلیٰ درجہ کمال کو پہنچا دیا تعریف نہیں ہو سکتی۔ صفحہ کے صفحہ پڑھتے چلے جائے یہی نہیں پتہ چلتا کہ موزون کرنے میں شاعرانہ ضرورتوں نے زمانی زبان پر کین کچھ تصرف بھی کیا ہی یا نہیں؟ لیکن غزل گوئی میں رنگین کی جانشینی جان صاحب نے کی جو گھنٹو کے ایک معمولی شخص تھے اور عاشور علی خان کی خرد پر چڑھ کے تیار ہوئے تھے۔ گو کہ جان صاحب کے بعد اور ریختی گو بھی گھنٹو میں پیدا ہوئے۔ مگر جان صاحب پر کمال اور شہرت کا خاتمہ ہو گیا۔ انھوں نے غزلین کہیں۔ داسوختی کہی اور ادب بھی کئی نظمیں کہیں۔

ریختی میں اگر فحش اور بدکاری کے ذائقہ سے پرہیز کر کے پاکدامنی کے جذبات اختیار کیے جاتے تو یہ فن ایک حد تک قابل ترقی ہوتا۔ مگر خرابی یہ ہوئی کہ اس کی بنیاد ہی بدکاری کے جذبات اور بے عصمتی کے خیالات پر تھی اس لیے ریختی گو یوں کا قدم ہمیشہ جادۂ تہذیب و اعتدال سے باہر ہو گیا۔ اور اس سے زبان کو چاہے کسی حد تک فائدہ ہوا ہو۔ مگر اخلاق کو نقصان پہنچا۔

اگر مَواعِزِ قَوْمِ ذَلَّ

یہ ایک فرمان رسالت ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی معزز شخص ذلیل ہو جائے تو اس کی عزت کرو، انقلابات عالم نے صد ہا ایسے واقعات پیش کیے ہیں جو ما پے عبرت ہیں۔ اور جن کو دیکھ کے بڑے بڑے سنگدل لوگوں کے دل تھرا اُٹھے ہیں۔ مگر افسوس ہمارے دل ایسے سخت ہو گئے ہیں کہ ہمیں کسی چیز سے عبرت نہیں ہوتی۔ ہم خاندان تیمور یا دیسیوں یا دیگر دن اور

اگلے دولت مند گھرانوں کے بہت سے باقیات الصالحات کو حد سے زیادہ تباہی و مفلوک
الحالی اور انتہا سے گزری ذلت و مسکنت میں دیکھتے ہیں اور دل نہیں پسیتا۔

اگر سلطنت اُن کے ہاتھ سے نکل گئی اور سلطوت مجبوت نے اُن کا ساتھ چھوڑ
تو کیا قوم میں بھی اتنی قوت نہیں ہے کہ اپنی تاریخ کے ان بوسیدہ و کرم خوردہ
تبرکات کو عورت سے نہیں تو حفاظت ہی سے رکھے؟ موجودہ گورنمنٹ کو الزام
دینا یا ایسے ستم کشوں کا بار برٹش گورنمنٹ کے سر ڈالنا حماقت ہی کیونکہ سلطنت
پر اُن کی کوئی حقوق نہیں۔ مگر ہم یہ اُن کے حقوق ہیں۔ دراصل یہ ہماری قومی
زندگی کی صورتیں ہیں۔ اور ہماری قومی زندگی ہی فیصلہ کر سکتی ہے کہ ان یا دگار
مورتوں کو اچھی طرح رکھیں یا بُری طرح۔ سچ یہ ہے کہ ہم میں ایسی نفسی نفسی پڑ گئی ہے
کہ قومی زندگی باقی ہی نہیں رہی۔ ورنہ کیا ممکن تھا کہ ہمارے تاجدار ان سلف کی
نسل یون غارت ہو؟ اور آغوش سلطنت میں پلے ہوؤں کی اولاد در در پرور
گری کرے؟ ہرگز نہیں۔ ہم بدظمی اور بے اصولی کے ساتھ صد ہا فیاضیان کر رہے
ہیں۔ اور کسی ایسے قومی فنڈ کا قائم ہو جا یا دشوار نہ تھا کہ لوگ سلف کی نسل
عزت سے رکھی جائے۔ اور اس کی اولاد کو اچھی تعلیم و تربیت دے کے سنبھالا جائے
گرا اپنے ذاتی اغراض پر قومی مقاصد کو قربان کر دیا ہے۔ اور اپنی نفس پروری کے
آگے اُس کی مطلق پروا نہیں کرتے کہ ہماری قومی عزت کس طرح خاک میں مل رہی
ہے۔ اور ہمارے ناموران سلف کی نسل کا کیا حال ہے۔

مگر ہم ہمیشہ ایسے بے جس نہ تھے۔ عبرت ناک واقعات کا ہم پر اثر ہوتا تھا۔
اور نوعی فلاح اور قومی وقار کو شخصی جذبات پر قربان نہیں کیا کرتے تھے۔

جب بنی امیہ کی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا اُس بد نصیب خاندان کے تمام لوگ
چُن چُن کے ماڈالے گئے۔ نئی خلافت عباسیہ کے دو تاجدار کامرانی و اطمینان سے
حکومت کر کے دنیا سے رخصت بھی ہو گئے۔ اور بنی امیہ کا مشرق میں کمین نام
و نشان نہ تھا تو تیسرے عباسی خلیفہ ہمدی کے زمانے کا واقعہ ہے کہ اُس کی
نوندی خیزران (جسے خاص محل کا رتبہ حاصل تھا سارے حرم کی مالک اور
ولی عہد سلطنت کی مان تھی) ایک دن محل میں شہلین و شوکت سے بیٹھی حکومت

کر رہی تھی کہ ایک لونڈی نے آکے ادب سے عرض کیا، خدا ملکہ عالم کو سلامت رکھے ڈیوڑھی پر ایک حسین عورت کھڑی ہو اور باریابی کی امیدوار رہی۔ ہزار پوچھا نہ اپنا نام و نشان بتاتی ہو نہ نسب و خاندان کا پتہ دیتی ہے۔ اور نہ یہ کہتی ہو کہ غرض کیا ہو؟

عبداللہ بن عباس کی پرپوتی زینب بنت سلیمان جو خاتون بنی عباس میں صاحب ذہن و سامانی جاتی تھیں پاس بھی تھیں۔ خیزران نے اُن سے کہا، تم اس عورت کے بارے میں کیا کہتی ہو؟ اُن نے ان کے آنے کے بارے میں نہ کہا بلوایے۔ کوئی مفید ہی بات ہوگی، اس شور سے کے مطابق لونڈی کو حکم دیا گیا کہ، جاؤ بلا لاؤ۔

چند منٹ گزرے ہوں گے کہ اُس لونڈی کے ساتھ ایک نہایت ہی حسین و صاحب جمال مگر فلاکت زدہ اور شکستہ حال عورت شریف زاد یون کے انداز سے آئی۔ مگر خیزران کا سامنا ہوتے ہی دروازے کے دونوں طرف کے درمیان ہی ٹھٹھک کے کھڑی ہو گئی۔ اور وہیں سے کہا، اے ملکہ عالم آپ کی خدمت میں ادب عرض کر کے التماس ہے کہ میں آخری تاجدار بنی امیہ مروان بن محمد کی بیٹی مزینہ ہوں، یہ نام سنتے ہی جیسے خیزران کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اور جھنجھلا کے کہا تیرے لیے نہ مرجھا ہے اور نہ سلام کا جواب۔ خدا تجھے غارت کرے۔ وہ گڑھی بھی تجھے یاد ہو جب ابراہیم بن محمد عباسی لیٹش بے گور و کفن پڑی تھی۔ اور بنی عباس کی بوڑھی عورتوں نے تیری خدمت میں حاضر ہو کے اتنی التجا کی تھی کہ اپنے باپ سے سفارش کر کے اُن کے دفن کی اجازت دلوا دے۔ لیکن بجائے ترس کھانے کے تو غصے سے اُنھیں مارنے کو دوڑی۔ اُنھیں گالیوں دیں۔ اور اپنے محل سے نکلوا دیا، خدا کا لاکھ لاکھ شکر کہ اُس نے اپنی نعمت تجھ سے چھین لی۔ اور تجھے ذلیل و خوار کر کے اس دہائے کو پہنچا دیا۔ خیزران کی زبان سے یہ طیش کا جواب اور یہ کلمات غیظ و غضب سن کے مزینہ نے بجائے اس کے ڈرے یا کچھ مرعوب ہو زور سے ایک تھقہ لگایا۔ اور بولی، ”ہن۔ آپ نے سے باہر نہ ہو۔“

اچھا یہ تو بتاؤ کہ میری اس بدسلوکی پر خدا نے مجھے جو جزا عطا دی ہیں اُن میں سے کون کون سی سزا پسند ہو جو میرا ہی سائلو کہ تم بھی میرے ساتھ کر رہی ہو؟ تم جو کچھ کہتی ہو سچ ہی۔ خدا کی قسم میں نے یہی کیا تھا۔ اور اُس کی سزا یہ ملی کہ خدا

مجھے ذلیل و خوار۔۔۔ رنگا بھوکا کر کے تمہارے سامنے لایا ہے کہ جو سلوک چاہو کرو
 اُس وقت تم نے میرے اُس سلوک پر جو صبر و شکر کیا تھا اُس کا انعام تمہیں یہ ملا
 کہ مکہ عالم ہو اور میں تمہارے سامنے عاجز و خوار بنی کھڑی ہوں۔ اتنا کہتے ہی مرنے
 نے کہا۔۔۔ لو بہن خدا حافظ۔ جاتے ہیں۔ اور پیٹھ پھیر کے چلی کہ جھپٹ کے محل سے نکل جائے
 اُس کی ان باتوں کا خیزران کے دل پر کچھ ایسا اثر پڑا تھا کہ بے تحاشا
 دوڑی۔ ایک کے روکا اور چاہا کہ گلے لگائے۔ مگر مرنے نے دو ٹون ہاتھوں سے
 لگ کر کے کہا۔۔۔ میں اس قابل ہی نہیں ہوں کہ تم سی مکہ مجھے گلے لگائے۔
 پیٹھ پھیرے لگائے ہوں۔ اور ان کپڑوں میں ایسی تعفن آرہی ہے کہ آپ کا
 دماغ خراب ہو جائے گا۔ یہ سن کے خیزران نے نوٹڈیوں کو حکم دیا کہ فوراً
 انھیں حمام میں لیجا کے غسل کراؤ اسکے بعد پُر تکلف جوڑا بٹھا کے اور عطر میں
 بسا کے لے آؤ۔

یہ کہہ کے خیزران چلی آئی۔ اور محل کی نوٹڈیوں نے نہایت ہی تعظیم و احترام
 سے مرنے کو نہلایا۔ کپڑے بٹھائے غطر لگایا۔ اور خوب بنا چنا کے۔ نے آئین۔ صورت
 دیکھتے ہی خیزران اس کے سینے سے لپٹ گئی۔ پھر اپنے برابر مسند پر جہاں
 خود خلیفہ ہمدی آ کے بیٹھا کرتا تھا بٹھایا اور پوچھا۔۔۔ دسترخوان بچھاؤں؟
 مرنے نے صاف صاف کہا۔۔۔ آپ پوچھتی کیا ہیں؟۔۔۔ شاید مجھ سے زیادہ بھوکا
 سارے اس محل میں کوئی نہ ہوگا۔ فوراً دسترخوان بچھا۔ شہم قسم کے کھانے لاکے
 چن دیے گئے۔ اور مرنے نے خوب سیر ہو کے کھایا۔ خواصیوں نے ہاتھ دھوائے۔
 اور جب ہر طرح کی خاطر داریوں سے فراغت ہوئی تو خیزران نے کہا۔۔۔ اب
 بہن بتاؤ تمہارا خبر گیران کون ہے؟۔۔۔ بولی۔۔۔ خبر گیران!۔۔۔ جو کچھ قرابت ہی
 اسی گھر سے ہے۔ اس کے سوا میں ساری دنیا میں کوئی عزیز قریب نہیں رکھتی
 یہ جواب سن کے خیزران بولی۔۔۔ تو پھر تم یمن میں رہو۔ چلو میں اپنے محل ٹھہرنے کھاتی
 ہوں۔ اُن میں سے جو محل پسند آئے لے لو اور اُس میں رہو۔

اس تجویز کے مطابق خیزران نے اُسے اپنے سارے محل دکھائے۔
 جن میں سے ایک خوبصورت وسیع اور پُر فضا قصر اُس نے پسند کیا۔ خیزران

نے وہیں کھڑے کھڑے فرخیر سے اُسے خوب آراستہ کرایا۔ اور ہر طرح کا سامان زندگی فراہم کر کے کہا کہ لو بی تم یہاں آرام سے رہو سوہو۔ اور آج ہی مجھ میں تم میں بہنا پا ہو گیا۔ جب تک جیتے ہیں ساتھ نہ چھوڑیں گے۔ مزہ نہ شکر یہ ادا کیا۔ اور خیزران اُسے وہاں چھوڑ کے اپنے محل میں آئی۔ پھر دل میں کہنے لگی کہ کبھی اس عورت کی جو کچھ شان و شوکت تھی تھی۔ لیکن زمانے نے سرد مہری کی۔ اور دل شکستہ ہو گئی۔ اب اس کے دل کی کلفت صرف دولت سے دور ہو سکتی ہو۔ یہ خیال کرتے ہی پانچ لاکھ درہم اُس کے پاس بھجوا دیے۔

خیزران ان کاموں سے فارغ ہو کے بیٹھی ہی تھی کہ اُس کا صاحب تاج و تخت شوہر خلیفہ مہدی آگیا۔ اور حالات پوچھنے لگا۔ خیزران نے مسکرا کے کہا کہ آج عجیب واقعہ پیش آیا۔ ایک نوٹھی دوڑتی ہوئی آئی۔ اور کہا کہ کوئی عورت اندر آنا چاہتی ہو۔ میں نے بلوایا۔ کیا دیکھتی ہو ایک جوان اور خوبو مگر نہایت ہی شکستہ حال عورت ہے۔ آتے ہی اُس نے مجھے ملکہ ہاؤم بک لقب سے خطاب کر کے سلام کیا اور بتایا کہ مردان بن محمد کی بیٹی مزہ ہے۔ نام سننے ہی میں مارے غصہ کے آبلے سے باہر ہو گئی۔ خوب گالیاں دین اور کہا کہ وہ وقت یاد کر دو کہ ابراہیم بن محمد کی لاش پڑی تھی۔ اور عباسی گھرانے کی بڑھپوں نے تجھ سے تجھیز و تکفین کی اجازت دلواسنے کی درخواست کی تو تو انھیں مارنے کو دوڑی۔ خوب ہوا جو خدا نے تجھے اس دھارے کو پہنچا دیا۔ یہ سن کے وہ قہقہہ مار کے ہنسی اور کہا کہ میں نے بے شک ہی کیا تھا اور خدا سے اس کا بدلہ بھی پایا۔ اب کیا تم بھی خدا سے ایسا ہی بدلہ لینا چاہتی ہو جو میرے ساتھ یہ سلوک کر رہی ہو؟ یہ کہہ کے وہ واپس چلی۔

خیزران یہ سن کر کہنے پائی تھی کہ مہدی کو زیادہ سننے کی تاب نہ رہی بات کاٹ کے لولہ افسوس۔ خدا نے تمہیں ان نعمتوں پر شکر گزار ہونے کا موقع دیا تھا مگر تم نے وہ موقع ہاتھ سے کھو دیا۔ میرے دل میں تمہاری اس قدر جگہ نہ ہوئی تو قسم کھا کے کہتا ہوں کہ تمہاری اس حرکت پر پھر کبھی زندگی

پھر تم سے بات نہ کرنا۔

خیزران نے کہا "امیر المومنین۔ آپ سنیں تو سہی۔ میں نے یہ سن کے اُس سے بے انتہا معذرت کی۔ روک کے اُسے حمام میں نہلوا یا۔ چھ کپڑے پنھائے عطر لگا کر کھلایا بلایا۔ پھر راضی کر کے اس سے بہنا پا کر لیا۔ اور اپنے سارے محل دکھا کے جس محل کو اُس نے پسند کیا اُس کے حوالہ کیا۔ اُسکو آراستہ اور ضروری سامان سے مرتب کر دیا۔ یہ وعدہ کر کے آئی کہ اب زندگی بھر تمہارا ساتھ نہ چھوڑوں گی۔ اور یہاں آتے ہی خرچ کے لیے اُس کے پاس پانچ لاکھ درہم بھیج دیے۔"

یہ سن کے ہمدی بہت خوش ہوا۔ خیزران کے حسن سلوک کی تعریف کی۔ اور اپنے ایک خادم کو بلا کے حکم دیا کہ "اسی وقت جا کے اشرفیوں کے سو توڑے میری طرف سے بھی اُسے دے آؤ۔ میرا سلام کہو۔ اور کہو کہ تمہاری خدمت کرنے کی وجہ سے جس قدر خوش بین آج ہوا ہوں کبھی زندگی بھر نہ ہوا تھا۔ کتنا تمہاری قدر و منزلت کرنا امیر المومنین پر واجب ہو گیا ہے۔ اور اگر تمہارے ناراض ہونے کا اندیشہ نہ ہوتا تو وہ خود تمہارے سلام حاضر ہوتے۔ یہ پیام سننے ہی مزہ خود چلی آئی۔ ادب سے سلام کیا۔ خیزران کے احسانات بیان کر کے اُس کی محبت و شرافت کی تعریف کی۔ اور بولی "میں بھلا حضور سے کیسا ناراض ہوں گی؟ میری حیثیت ہی کیا ہے؟ محل کی لونڈیوں میں سے ایک میں بھی ہوں؟ ہمدی اس پر بہت خوش ہوا۔ اور مزہ اپنے نئے قصر میں والیں گئی۔ اس کے بعد مزہ ہمیشہ خیزران ہی کے ساتھ رہی۔ یہاں تک کہ ہمدی کے سفر آخرت کے بعد اُس کے پہلے بیٹے ہادی کے عہد خلافت میں بھی اُسی سے وابستہ تھی۔ پھر جب خیزران کے دوسرے اقبال مند فرزند ہارون رشید کا عہد شروع ہوا۔ تو رشید بھی مزہ کی بڑی خاطر داشت کرتا تھا۔ جو باس خاطر تہام عباسیہ اور اشیمہ خاتون کا تھا وہی اُس کا بھی تھا۔ اور خلافت رشید کے اوائل میں جب مزہ کا انتقال ہوا تو رشید اُس کے جنازے پر نارد قطار روایا۔ اور شاہان کو رو فر سے جنازے کو قبرستان میں لے گیا۔

آہ ! خدا کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے میں کبھی ہمارا یہ سلوک دشمنوں کے ساتھ تھا۔ کاش اب اتنا نہیں تو اُسکا عشر عشر دستان ہی کے ساتھ ہوتا۔ مگر نہیں۔ اب ہم نفس کے بند ہیں۔ صرف اپنے نفس کو دیکھتے ہیں اور نہیں تہ نگتا کہ ہم میں اور باہم میں کیا فرق رہ گیا ہے ؟

یورپ کے بانکے ٹائٹل ہولڈرز

مگر یورپ کے ان بانکے ٹائٹل ہولڈرز میں اُس وقت اور زیادہ اہمیت پیدا ہو گئی جب صلیبی مجاہدون کا لشکر بیت المقدس کے فتح کرنے کے لیے یورپ سے چلا۔ کلیسیا نے مسیحی نے اپنے برکت کے آغوش میں لے کے اُنھیں مذہبی وقت پہلے ہی دے دی تھی۔ لیکن جب وہ اپنے جان و مال کو دین کی نذر کر کے جان دینے کے لیے گھر سے نکلے اور سینہ اور پیٹھ پر صلیبیں بنائے مشرق کی جانب روانہ ہوئے تو اُن میں بالکل ایک نئی شان پیدا ہو گئی۔ اور یہ اعتبار ذمہ دار یون اور خدمتوں کے اُن میں دو تفریق ہو گئیں۔

بیت المقدس میں پہنچے اور اُس پر قابض ہو جانے کے بعد ان لوگوں کو اصلی سروکار تو ہولی سپلر (کنسٹنٹن مقدس) سے تھا۔ مگر حضرت سلیمان کا بنایا ہوا خانہ خدا جو اب مسلمانوں کی مسجد بنا ہوا تھا۔ جسے مسلمان مسجد اقصیٰ اور مسیحی مسجد عمر کہتے تھے دنیا کی ایک قدیم یادگار تھا۔ اور عیسائی بھی تسلیم کرتے تھے کہ یہی وہ مبارک بقعہ تھا جس پر اس سرزمین میں ہمارا معبود الہی قائم ہوا۔ اس میں حق مسلمانیہ گزین ہوئے تھے وہ تو کمال بے رحمی سے تہہ کیے گئے۔ اور ان حاسیان تو حید سے خالی کرانے کے بعد ضرورت تھی کہ اُس یادگار زمانہ عمارت سے بھی کوئی کام لیا جائے جسکی تعمیر میں خلفاء بنی امیہ نے لاکھوں روپیہ صرف کر دیے تھے۔

چنانچہ صلیبی فاتحین میں سے چند شریف النسل اشخاص مسجد اقصیٰ میں

جمع ہوئے۔ اور باہم حلف اٹھا لی کہ جو اُس رین بیان آئین گئے ہم اُن کی حمایت و خبر گیری کریں گے۔ یہ جماعت ٹائٹل ہڈیز (ہیکل سلیمانی والے بانکے) کے نام سے مشہور ہوئی۔ اور اپنے گروہ کو ان لوگوں نے حصول برکت کے لیے دلی رنارڈ کے نام سے وابستہ کر دیا۔ حرم سلیمانی بن میٹھ کے انھوں نے جو حلف اٹھائی تھی اُس کی رو سے یہ لوگ صرف دین کے سپاہی بن گئے تھے۔ انھوں نے دنیا چھوڑ دی تھی۔ وطن بھلا دیے تھے۔ بیت المقدس کے سوا کسی شہر کو اپنا وطن اور شہر نہ سمجھتے۔ گھر بار سے دست بردار ہو گئے تھے۔ اور سوا مسیح کے خاندان کے کسی کو اپنا گھرانہ بتاتے۔ جائیداد سب کی مشترک رہتی۔ اور مشترک زندگی بسر کرتے۔ ایک ہی سرمایہ سب کی دولت تھا۔ خطرون اور مصیبتوں میں ایک دوسرے کے جان نثار تھے۔ گویا ایک قوت اور ایک ہی روح سب کے افعال و اعمال۔ حرکات و خیالات۔ اور کاموں اور ارادوں پر حکومت کر رہی تھی۔ ان کا سامان زینت صرف ہتھیار تھے۔ ان کے گھروں میں جو عبادت خانوں کا حکم رکھتے نہ روپیہ پیسہ ہوتا نہ سامان دولت و حشمت۔ زینت و نمائش کی چیزوں سے اُنھیں نفرت تھی۔ بہت ہی سادی اور بھدی چیزوں سے اپنے ضروریات زندگی کو پورا کرتے۔ نمائش کے لیے وہاں صرف ڈھالین تلواریں۔ نیزے۔ اور مسلمانوں سے چھینے ہوئے علم نظر آتے۔ لڑائی کا نام سنتے ہی اپنے فولادی اسلحہ لے کے دوڑتے۔ پھر نہ حریف کی کثرت سے ڈرتے اور نہ دشمنوں کے جوش و خروش کی پروا کرتے۔ فتحیں اُن کا سرمایہ نہ تھیں۔ سیح کے نام سر جان دینا اُن کی اعلیٰ ترین کامیابی تھا۔ اُنھیں یقین تھا کہ فتح صرف خدا کی عنایت سے حاصل ہوتی ہے۔ مگر کوشش میں جان دے دینا اپنا فرض ہے۔ غرض ان ہائٹوں کا پہلا گروہ یہ تھا۔

دوسرے گروہ کی بنیاد یون پڑی کہ صلیبی مجاہدین جب یورپ سے چلے تو اُن کے ہمراہ وہاں سے ایک اسپتال بھی آیا تھا جو خلاکت زدہ زائرین اور بیت المقدس کے مفلس و شکستہ حال نزاریوں کی خبر گیری کے لیے تھا۔ خصوصاً ان بہادر و ن کی تیمارداری کے لیے جو مسلمانوں سے لڑتے۔ اس خدمت کو

جن لوگوں نے اپنے ذمہ لیا وہ بھی ایک قسم کے بانکے تسلیم کیے گئے۔ بانٹس ہائیڈرو
 کے لقب سے مشہور ہوئے۔ اور انہوں نے اپنے کو وینی یو خان کی طرف منسوب کر کے
 اپنا خطاب ”مانٹس آف سینٹ جان“ یعنی ”وینی یو خان کے بانکے“ قرار دیا۔
 یہ دونوں قسم کے مانٹ فلا دی خود اور چار آئینے اپنے مانٹس آف ہونی پیکر
 مرقہ مسیح کے بانکے ”کہلائے کے باعث سب سے زیادہ معزز خیال کیے جاتے
 اور چونکہ لاطینی سلطنت ارض مقدس“ کو (جو لاکھوں کرڈشوں بندگان خدا کے خون
 کا سیلاب بہا کے عین مسلمانوں کے بیچ میں قائم کی گئی تھی) ان لوگوں سے
 مدد ملتی وہ ان کی بے انتہا قدر کرتی۔ اور اپنی زندگی کو انھیں کے اسلحہ پر
 منحصر تصور کرتی۔ زائرین یہاں واپس جا کے ساری سچی دنیا میں ان کی جان بازی
 اور بہادری کے قصہ بیان کرتے۔ چند ہی روز میں ان کی اس قدر شہرت ہوئی
 کہ ہر حصہ ملک کے اُمرا اور دولت مند خصوصاً وہاں کے نرسانے بانکے آ آ کے
 ان کے گروہ میں شامل ہونے لگے۔ اور تھوڑے دنوں بعد یورپ کا کوئی
 نامور اور دولت مند خاندان نہ تھا جس کا کوئی نہ کوئی گروہ ان مذہبی بانکوں
 اور دضعدار مجاہدون کی جماعت میں نہ شریک ہو گیا ہو۔ ایک تیسرا گروہ
 ٹیوٹانک ناموں کا بھی قائم ہو گیا جو مانٹ پیکرز کا ہم مذاق تھا۔ تینوں گروہوں
 میں فرق اور امتیاز یہ تھا کہ ٹیوٹانک سفید چوہہ پہنتے جس پر صلیب بنی ہوئی ہائیڈرو
 والے سیاہ چوہہ پہنتے اور اُس پر سفید صلیب ہوتی۔ اور ٹیوٹانک مانٹ
 سفید چوہہ پہنتے جس پر سیاہ صلیب ہوتی۔ مانٹ پیکرز کو جن کے حالات
 ہم بیان کرنا چاہتے ہیں خاص مسجد اقصیٰ میں جگہ دی گئی تھی۔
 مسجد اقصیٰ کو مسیحی لوگ متبرک نہ سمجھتے تھے کیونکہ اُن کے اعتقاد میں
 اُس کا سارا تقدس حضرت مسیح کے بعد جاتا رہا تھا اور خدا نے اُس پر اپنے
 عبادت خانے کو چھوڑ دیا تھا۔ انھیں تو صرف حضرت مسیح کے مولود و مرقہ
 یا ارض مقدس کے پرانے کنسیوں سے کام تھا۔ ایسے عیسائیوں کا قبضہ ہوا ہی
 وہ عبد الملک بن مروان کی بنائی ہوئی عالیشان مسجد جو ہیکل سلیمانی کے اصلی آثار
 پر قائم تھی مسلمانوں کا قتل و قمع کر کے قصر شاہی قرار دی گئی۔

ان جنگجو بانکون اور مذہبی قادیون کے گروہ کی بنیادیوں پڑی کہ فرانس کے علاقہ برگنڈی کے ایک ٹاؤن "ہیوڈ پکائیس" نے مع اپنے آٹھ رفقا کے (۱۱۸۰ء) میں بیت المقدس کی اسقف اعظم کے سامنے جا کے حلف اٹھائی کہ "ہم اپنی زندگی بیت المقدس کے راستوں کی نگہبانی اور زائرین کے بھلائی کے لئے آنے کے نذر کر دیں گے۔ باضابطہ طور پر قانون ملت کی پابندی کریں گے۔ اور بے انتہا اطاعت کیشی۔ اور خود فراموشی کے ساتھ آسمان کے بادشاہ کی طرف سے جلال و قتال کریں گے۔" یہ پہلا عہدہ جس نے ان مذہبی بانکوں کے پیدا ہونے کی بنیاد قائم کی۔ اور جب شاہ بیت المقدس بلدون ثانی نے خاص مسجد اقصیٰ کے اندر اپنا کلب قائم کرنے کے لیے جگہ دے دی تو اس نئے گروہ کو اور مضبوطی حاصل ہو گئی۔

دس برس بعد شہر ٹراے میں منظور ری پوپ ہو نور یوس ثانی ایک کونسل ہوئی جس میں دینی بانکوں کے اس گروہ کے لیے ایک دستور عمل عدون ہو گیا۔ اس میں ۷۰ قاعدے تھے جو پوپ اور اسقف بیت المقدس کی منظوری سے رائج ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی ان لوگوں کی دینی جان نثاری اور فلاح جان بازی کی اس قدر شہرت ہوئی کہ ساری مسیحی دنیا گردیدہ ہو گئی۔ اور ہر جگہ اور ہر سرزمین میں ان کے لیے سرمایہ فراہم ہونے لگا۔ جس میں قوم نے اس قدر مستعدی دکھائی کہ لوگ و امرا اپنی سلطنتیں اور ریاستیں ان کی تدریکے دیتے تھے اور ایتالیا سے لے کے اسپین تک ہر چھوٹے بڑے حکمران نے بڑی بڑی جائیدادیں ان لوگوں کی نذر کر دیں۔ اور یہ گروہ باوجود سلاہگی اور مشقت و تنگی کی زندگی بسر کرنے کے دنیا کے تمام تاجداروں سے زیادہ دولت مند ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی ہزار ہا خلعت گھر بار چھوڑ چھوڑ کے ان کے جتنے میں ملنے لگی۔

ان کا پہلا سرغنہ جو "ماسٹر ٹمپلر" کہلاتا وہی "ہیو" قرار پایا۔ دوسرا ماسٹر اُس کے بعد رابرٹ ڈکراؤن ہوا۔ اُس کا جانشین "ڈیور آرڈ" قرار پایا۔ اور یونین ماسٹروں کے انتخاب کا سلسلہ جاری رہا۔ ڈیور آرڈ کے عہد میں ان لوگوں کی پہنچری اس قدر کامیاب اور باقاعدہ تھی کہ اکثر سلطنتیں اپنی فوجیں انھیں

کے قواعد کے مطابق مرتب کرنے لگیں۔ اور اب اس وقت سے ان کی تاریخ دیکھنے کا شوق ہو تو حروب صلیبیہ کی تاریخ پڑھنی چاہی۔ اس لیے کہ صلیبی لڑائی میں اہم فوجی خدمات یہی لوگ انجام دیتے تھے۔

مگر دولت مندی نے چند ہی روز میں ان کی حالت میں تغیر پیدا کرنا شروع کیا۔ اور ناکامیوں میں ان کے طرز عمل پر بدگمانی کی جاتی تھی۔ لیکن جب ۱۱۷۷ء (۵۷۴ھ) میں جرمن فرمان روا کو زارڈین المقدس میں پہنچا ان لوگوں نے اپنے کلب میں اسکی دعوت کی۔ اور اُسے اپنا گویہ بنالیا۔ مگر اسی سال جب دمشق کے محاصرے میں مسلمانوں نے صلیبوں کو فاش شکست دی اور انھیں محاصرہ چھوڑ کے بدحواس بھاگنا پڑا تو اُس شکست کا الزام انھیں بانکون کے سرہتو پا گیا۔ اور کہا جانے لگا کہ صرف نامی ٹمپلرز کی دغا بازی سے شکست ہوئی۔ اس کے دوسرے برس شہر غزہ کا قلعہ ان لوگوں کے حوالے کیا گیا جسے انھوں نے خوب مضبوط کیا۔ اس کے چار سال بعد ان کا ماسٹر ٹمپلر برنارڈ چالیس ناٹون کو ہمراہ رکاب لے کے بڑی بہادری سے شہر عسقلان میں ٹکس پڑا۔ مگر مسلمانوں نے گھیر کے اس طرح مارا کہ ان میں سے ایک کو بھی زندہ واپس آمانہ نصیب ہوا۔ سب مارے گئے۔ اور ہم مذہبوں سے یہ داد ملی کہ یہ لوگ خود اپنی حماقت کی نذر ہوئے۔ اور طمع نے انکو فدا کر دیا۔ چند روز بعد مشہور ہوا کہ ایک مصری شاہزادہ جو عیسائیوں کے ہاتھ میں گرفتار ہو گیا تھا اور دین مسیحی قبول کرنے پر نیم راضی تھا اُسے ان ناٹون نے روپیہ لے کے اہل مصر کے حوالہ کر دیا۔ اور اسی طمع میں ان کی وجہ سے اور بھی کئی خون ہوئے۔

۱۱۹۵ء (۵۹۲ھ) میں ان ناٹون کو یہ الزام دیا گیا کہ یرون کے پار کا ایک مضبوط قلعہ انھوں نے روپیہ لے کے نور الدین زنکی کے کسی سردار کے حوالے کر دیا۔ چنانچہ اس جرم کی پاداش میں خود مسیحی بادشاہ بیت المقدس اہل ریت نے بارہ ٹمپلروں کو پھانسی پھانکا دیا۔

یہی واقعات پیش آرہے تھے کہ سلطان صلاح الدین اعظم شکرے کے
مقرر ہوئے۔ ہزاروں ٹائٹ مختلف میدانوں میں قہر ننگ آتشیں ہوئے
اور بیت المقدس اور شام کے تمام شہروں پر اُس نے قبضہ کر کے مسیحی
سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔ اُس وقت پبلر مسجد اقصیٰ اور بیت المقدس کو چھوڑ
کے ساحلی شہر تکہ میں پہنچے۔ اور جب ایک زمانہ کے بعد مکہ بھی مسیحیوں کے
ہاتھ سے کل گیا تو طرابلس الشام میں جا کے پناہ گزین ہوئے۔

آہ شبلی آہ!

عالم اسلامی میں یہ کس قدر جگر خراش واقعہ ہے کہ شمس العلماء مولانا
شبلی نعمانی ہم سیاہ کاروں کا ساتھ چھوڑ کے خلد برین کو سدھار گئے
اور ہر مسلمان کی زبان پر ہے "انا للہ وانا الیہ راجعون" ہم بھی یہی آئیہ کریمہ
پر ہرے ہن گرہنیں معلوم ہیں یہ سفر کب پیش آئی گا؟ اور کب اس عالم بڑی
میں پونج کے اپنے قدیم دوست اور پرانے رفیق زندگی شبلی نعمانی
سے معافہ کریں گے۔ مولانا شبلی کے حالات زندگی ہم آئندہ نمبر میں
لیکھیں گے۔ اور چونکہ ہماری اور اُن کی سبک زندگی کا آغاز قریب قریب
ایک ہی زمانے سے شروع ہوا اسلئے شاید ہم اور وہ سے زیادہ
کامیاب رہیں۔ پنجاب کے اخباروں میں یہ بالکل غلط چھپ رہا ہے کہ مولانا
شبلی پنجاب یونیورسٹی کے مولوی فاضل تھے۔ اُنھوں نے مولوی فیض الرحمن
صاحب مرحوم سے پراؤٹ طور پر ادب عربی کی کتابیں ضرور پڑھی تھیں مگر
پنجاب یونیورسٹی کو ابھی یہ شرف نہیں حاصل ہوا ہے کہ وہ اس پائے کا محقق
گراں مایہ اور فاضل بلند پایہ پیدا کرے۔ مولانا شبلی اُن لوگوں میں تھے
جو دنیا میں اپنی جگہ خالی چھوڑ گئے۔ اور اُن کا کمال اُنھیں کے ساتھ گیا۔ تاریخ
اسلام میں جلب روایت اور تحقیق و تنقید کی جوشان اُنھوں نے دکھائی
ساری دنیا کے موجودہ علماء اسلام میں سے کوئی نہ دکھا سکا۔ اور ہم

آئندہ نمبر میں بتائیں گے کہ ان کے علمی کمالات نے دنیا پر کیا اثر ڈالا۔ اور ان کے تصانیف قومی لڑائیوں میں کیا اثر رکھتے ہیں۔

حیدرآباد کی تاریخ میں شاید یہ پہلا موقع ہوگا کہ نواب سارنگبگ بہادر مدارلہام ریاست کو چھ مہینہ کی رخصت بیماری عطا ہوئی اور ان کی جگہ برکوٹی قائم مقام نہیں مقرر ہوا۔ دولت اصفیہ نظام میں مدارلہامی ایک ایسی خدمت ہو جس کے بغیر اکیڈن گزرنابھی دشوار ہوتا ہے۔ مگر سربراہ اصفیہ برکوٹی الحال ایک ایسا جوان نخت و جوان سال اور مدبر بہ مثال جلوہ افروز ہے کہ مدارلہام کی ضرورت نہیں سمجھ گئی اور صاحب اقبال مالک تاج و دبیم نے کمال اطمینان کے ساتھ وعدہ کر لیا کہ ہم بغیر کسی مدارلہام کے کاروبار سلطنت چلا لیں گے۔ اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خان بہادر کے آغاز سربراہی سے ہم مدد و روح کی بیدار مغزی و کارگزاری اور رعایا پروری و خوش تدبیری کی تعریف سن رہے ہیں۔ بارہا سنا گیا کہ جس مستعدی و توانائی سے اعلیٰ حضرت کام کر رہے ہیں کوئی وعدہ دار سلطنت بھی نہیں کر سکتا۔ آج ان سب باتوں کی تصدیق ہو گئی۔ اور زمانہ برنجی نے روشن ہو گیا کہ جنھوں نے بندگان عالی بغیر کسی مددگار کے محلات سلطنت کو بخوبی انجام دے سکتے ہیں۔

ریویو

الخط العثماني - راجہ راجیشور او بہادر آخوند دولت اصفیہ کن کے ایک لابی مذاق رکھنے والے جاگیردار نے ادب اردو کی بہت سی قابل قدر خدمتیں کی ہیں۔ فی الحال انھوں نے مذکورہ بالا رسالہ کے ذریعہ سے اپنا خط اردو پبلک کے سامنے پیش کیا ہے جسے انھوں نے حصہ نظام خلد اللہ ملکہ کی جانب منسوب کر کے الخط العثماني کے نام سے نامزد فرمایا ہے۔ اس میں حرفت کی نیکیں موجودہ اردو خط سے ملتی ہوئی ایسی بنائی گئی ہیں کہ جدا جدا ہیں۔ اور ٹاپ کی دشواریاں خط اردو سے دور ہو جائیں۔ ہمارے نزدیک خط کا ایجاد کرنا کوئی دشوار کام نہیں دشواری ترویج میں ہے۔ اگر حصہ نظام اور برٹش گورنمنٹ متحد ہو کے اپنے فرائد اور سرشتہ تعلیم میں کسی خط کو جاری کرنا منظور فرمائیں تو پھر کالین ملک آسانی کوئی مناسب خط ایجاد کر دیں گے۔ اور یوں خالی ایجاد کرنا ایک بے نتیجہ درمحل کوشش ہے۔ سر جان مکمل نے اپنا خط ایجاد کر کے کیا کر لیا جو کوئی اور کچھ کرے گا؟

نامی جنتری ۱۹۱۲ء - ہرگز میں جنتری کا رہنا لازمی ہے۔ نیکین ہمارا مشورہ ہے کہ جنتریوں میں سے صرف نامی جنتری کو اپنے پاس رکھیے جو مولانا رحمت اللہ رحمہ اللہ کی یادگار زمانہ کامیابی طبع کا مکمل ترین نمونہ ہے۔ ۱۹۱۲ء کی جنتری مولانا نے شائع کر دی جس میں افغانستان کی آخری تاریخ کے ساتھ بہت سی بگارا مد اور ضروری چیزیں ہیں۔ امر کا فرض ہے کہ اس کے اعلیٰ رئیس ایڈیشن کی کا بیان منگو کے زیر فائز تھیں بتائیں۔ ہر جگہ کتب فروشوں سے دستیاب ہوتی ہے وہ تھیں ایڈیشن کے عمدہ نسخے خود مولانا سے کانپور میں خط بھیج کے منگو لیے جائیں۔

دگلدارین آغاز ۱۹۱۷ء سے مضمون "ہندوستان میں
 مشرقی تمدن کا آخری نمونہ" شائع ہو رہا ہے۔ لیکن یہ ایسا مضمون ہے کہ
 اس کا سلسلہ آخر ۱۹۱۵ء تک جاری رہے گا۔ اور کیا عجب کہ ۱۹۱۶ء میں
 بھی چلتا رہے۔ ابھی تک ہم نے فرمان رواں اودھ کی تاریخ کو ختم کر کے صرف
 زبان اردو پر بحث کی ہے۔ کہ دہلی سے لکھنؤ کو کب اور کون کون سی - اور لکھنؤ نے اس
 میں کیسی اور کس قدر ترقی کی۔ مگر ہم لکھنؤ کے دربار کا تمدن بنانا چاہتے ہیں جو صرف
 زبان ہی کیلئے مخصوص نہیں ہے۔ سیکڑوں چیزیں ہیں جن کا بیان نشوونما ہوا۔ اور
 وہ سب بجائے خود خصوصیات رکھتی ہیں۔ ہم علم و فضل فنون جنگ دیگر فنون ہستی
 کھانے پینے۔ لباس و معاشرت۔ اشیاء و سائنس۔ اور بیان کے مختلف گروہوں اور
 حرفوں پر بحث کریں گے۔ اور بیان کی ایجادوں اور جدتوں کو حتی الامکان تحقیق کر کے
 ناظرین دگلدار کے ملاحظہ میں پیش کریں گے۔ امید ہے کہ تمدن اودھ کی یہ تاریخ ایسی
 مکمل ہوگی کہ تکمیل کے بعد اسے ایک جلد میں علیحدہ شائع کرنا ضروری خیال
 کیا جائے گا۔ افسوس پرانی یادگار زمانہ بڑھے دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اور جو ہیں
 آفتاب لب بام ہیں۔ گو کہ وقت تنگ ہو گیا مگر ابھی باقی ہے۔ اور اگر جستجو و کوشش
 سے کام لیا گیا تو لکھنؤ کے حالات پاکستان کا بہت کچھ حصہ محفوظ رہ جائے گا۔
 ورنہ لکھنؤ چاہے ہزاروں سال تک برٹش گورنمنٹ کے سایہ میں پھلے پھوٹے
 احمد ماضیہ کے دلچسپ حالات بالکل فنا ہو جائیں گے۔ اور وہ لکھنؤ کسی کو
 یاد نہ رہے گا جس نے سارے ہندوستان میں اپنی معاشرت کا
 سکہ بٹھا دیا تھا۔ اور جس کی بنا پر لکھنؤ کو ہندوستان کا پیرس کہا
 جاتا تھا۔



ناظرین متحیر ہوں گے کہ یہ پارسا ئیل کون بزرگ ہیں ؟ جی یہ بہت بڑے بزرگ اور بڑے ذات شریف ہیں۔ نام تو پارساؤن کا سا ہی مگر مزاج ایسا فتنہ پایا ہی کہ خدا بچائے۔ یہ بروایت نامی جنتری ۱۹۱۴ء ہمارے رخصت ہونے والے مہربان میان ۱۹۱۴ء ہیں۔ آپ کی مہذب آمد اور آپ کے پارسا یا نہ نام سے ہمیں بھی دھوکا ہوا۔ اور ایسا دھوکا کہ آپ کی آمد کے وقت ہم نے جنوری ۱۹۱۴ء کے دگلدار میں آپ کی نسبت لکھا تھا کہ ۱۹۱۴ء کا آغاز لطف و مسرت سے ہوا ہی تو بار ہوں مہینہ انشاء اللہ شاد کامی و لطف میں گزرین گے۔ نیک خالی کے اس سے زیادہ نمایاں کیا آثار ہوں گے کہ پائلکس کے اُفتی سے قتل و خونریزی اور تاخت و تاراج کا ابر چھٹ گیا۔ اور مطلع صاف نظر آرہا ہے۔ جتنے فساد تھے اور جو کچھ شور و شر تھا سنہ گذشتہ کے ساتھ گیا اور سنہ حال کی پہلی صبح صبح قبائل اور آسین و امان کی سحر بن کے نمودار ہوئی ہی۔ اور دھوکا کیون نہ ہوتا ؟ آل اندیش سلف سعدی شیرازی نے ہمیں یہ سبق پڑھا رکھا تھا کہ

ہر کرا جامہ پارسا بنی پارسا دان و نیک مرد انکار

یہ کیا خبر تھی کہ حضرت پارسا ئیل کی فقط صورت پارساؤن کی سی ہو۔

آپ ابتداء میں نہایت خاموشی کے ساتھ تشریف لائے۔ چونکہ ہر جگہ غلغلو و فساد

کا بازار سرد پڑ گیا تھا اسلئے گمان ہوا کہ یہ آپ ہی کی نیک نفسی کی برکت ہی۔ جس کا گہرا نقش ہمارے دلوں پر بٹھانے کے لیے اول شش ماہی بھر آپ خاموش رہے اور ہر طرف آپ کی داہ داہ ہو رہی تھی کہ بھی کیسے پاک طینت و نیک نفس بزرگ ہیں کہ جھگڑے فساد کو جانتی ہی نہیں۔ مگر دوسری شش ماہی شروع ہوتے ہی آپ نے پیٹ سے پاؤں نکالنا شروع کیے۔ چپکے سے اور بہت ہی چپکا کے ایک ہلکی سی جنگی مملکت آسٹریا میں ڈالی۔ اور آسٹریا دسویں تین تین ہونے لگی جس کو دنیا ایک معمولی بات سمجھی اور کسی نے ادھر کا خیال بھی نہ کیا۔ مگر وہ جنگی ایک بیک بھڑکی۔ آگ چاروں طرف پھیلنا شروع ہوئی۔ اور آپ نے دھونک دھونک کے اُسے شمال و مغرب کی طرف بڑھایا جہاں بڑے بڑے دم و خم کے لوگ رہتے ہیں اور قوت و شوکت کے ساتھ امن پسندی کے مدعی ہیں۔ اور پھر ایسے روشن خیال اور دہائی و فطرت میں حدیم المثال واقع ہوئے ہیں کہ ساری دنیا کو یقین تھا کہ وہ اپنے ہی گھر میں آگ لگنے دین گے اور نہ دنیا میں کہیں اور۔ لوگ کہتے تھے کہ جہنم سے بھی آگ لا کے ڈالی جائے تو ان حلیم الطبع بزرگان مغرب کی متانت و سلامت رومی کا پانی اور ان کی امن پسندی کی پالیسی کی برف باری اُسے بجا ہی لے سہے گی۔

کیونکہ ان کو بے لڑے بڑے کامیابی حاصل کر لینے کے ایسے اچھے اچھے مجرب و آزمودہ تیر بہ ہدف نسخے معلوم تھے کہ اگر کوئی وحشی قوم لڑنے کا ارادہ بھی کرتی تو اُس پر بجائے آگ برسانے کے یہ ایسی خوبی سے صلح جوئی کی برف باری شروع کر دیتے کہ دم بھر میں اُس کے ہاتھ پاؤں ٹھہرنے رہ جاتے اور یہ کمال آسانی کے ساتھ اُسے رسیوں میں جکڑ کے بٹھا دیتے اور وہ ایسا مفلوج و اڑکا رفتہ ہو جاتا کہ زندگی بھر سر اٹھانے کی جرات نہ ہوتی۔

مگر ہمارے کرم فرما حضرت پارسائیل کی گرجیوں نے اُس مغربی برف کو گھلا کے پانی کر دیا آپ کے بہت سے اخوان الشیاطین اس سے پھلے بھی بارہا دنیا میں آگ لگانے کی کوشش کر چکے تھے۔ مگر کسی کی نہ چلی تھی۔ اور سب ہمت ہار کے ناکام واپس گئے تھے۔ مگر آپ نے چند روز کی خاموشی کے بعد اس قیامت کی آگ لگائی کہ کسی نے نہ بچھا لے نہ بھی۔ آٹا فانا میں ایک معمولی جنگی سے انکارا۔ انکارا

سے شعلہ ہو گئی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اس قدر بھڑکی اور پھیلی کہ بلقان سے آسٹریا
 آسٹریا سے روس۔ روس سے جرمنی۔ جرمنی سے فرانس میں جا پہنچی۔ اور ساری
 مغربی دنیا میں جان دیکھیے شعلہ بلند تھے۔ اسی اثنا میں دو شیرون کی لڑائی میں جس
 طرح ایک لومڑی کا بھگس نکل گیا تھا ویسے ہی بلجیم جرمنی و فرانس کے بیچ میں پڑ کے
 بے موت مارا گیا۔ دنیا کے انتہائی مغربی بھانگ پر اصل جگہ انگلستان پمپ کا دہانہ اتر
 میں لیے کھڑا تھا۔ کہ دنیا بھر میں کہیں آگ لگے اور وہ اپنے سمندر کا سیلاب بہا کر بھاوے
 اور گویا دنیا میں اسی لیے ہے کہ ہر جگہ سکون و اعتدال کو قائم رکھے۔ اور کسی کسی
 کے گھر میں آگ نہ لگانے دے۔ سمندر کے بیچ میں ہونے کی وجہ سے پانی کی کمی تھی
 نہیں۔ اُس نے جو بلجیم میں یہ آگ لگتے دیکھی تو پمپ کا رخ اسی طرف کر دیا مگر ہمارے
 مہربان بزرگ حضرت پارسائیل کی عنایت سے وہ پانی بھی شعلہ بن گیا۔ اور بلجیم میں بجائے
 آگ کے بجھنے کے اور زیادہ شعلہ بلند ہوئے۔ ان شعلوں نے بڑھ کے اپنی مثل انگلیوں سے
 خود سمندر میں آگ لگا دی۔ اور مغربی سمندر کی لہروں سے چنگاریاں اُڑا کر کے جہاں انگلستان
 میں بھی گزرا شروع ہوئیں۔

گروہ جو مثل مشہور ہو کہ اعوذ باللہ من غضب اللہ (مربار کے غصہ سے
 پناہ) انگلستان نے اپنے حرم کہہ اس میں آگ برستے دیکھی تو پھر اُسے کہاں
 تاب تھی؟ اُس کی شعلہ بار آنکھوں سے بھی چنگاریاں نکلتے لیکن جنھوں نے ہفت قلم
 اور ساتوں سمندروں میں آگ لگا دی۔ اور سارا کرہ ارض کرہ نار بن گیا۔ آخر کا اس
 عالمگیر آگ کے شعلے ساری دنیا کو شعلے کرتے ہوئے ترکی تک پہنچے اور آخر میں
 وہاں بھی شعلہ بڑھنے لگے۔ غرض حضرت پارسائیل کی لگائی ہوئی آگ نے جو جزیرہ نما
 بلقان سے شروع ہوئی تھی ساری دنیا میں آگ لگا کے پھر بلقان ہی میں آگے دم لیا۔
 اور اب ختم سال پر جبکہ حضرت پارسائیل ہم سے رخصت ہو رہے ہیں آپ
 کی گرمی محبت سے سارا صفحہ زمین مشتعل ہے۔ اور چہرہ دیکھیے باز ارقطہ گرم ہے۔
 عمرون کے سلسلے منقطع ہو رہے ہیں۔ اور دنیا کی آبادی گھٹتی جاتی ہے۔ کاش آپ کو
 اتنا ہی ترس آتا کہ جو آگ لگائی ہو اُسے بجھا کے جاتے۔ مگر نہیں اس کا خیر کو اپنے
 سر سے ڈال کے آپ اپنے قائم مقام سال آئندہ پر چھوڑے جاتے ہیں۔ دیکھیے اُس

مہمان کا جس نے دنیا میں آتے ہی جلتے تو بے پر قدم رکھا ہی کچھ زور بھی چلتا ہی یا نہیں۔ اس بارے میں بہت غور ہو رہا ہے کہ یہ آگ کب تک لگی رہے گی۔ کوئی کہتا ہے ایک سال۔ کوئی دو سال بتاتا ہے۔ کسی کی رائے میں یہ فتنہ تین سال میں بھی ختم ہو تو جانے کہ آج ختم ہوا۔ سچ یہ ہی کہ آگ لگانے اور بجھانے والوں کی دونوں قوتیں اتنی زبردست ہیں کہ کوئی شخص کوئی قطعی رائے نہیں قائم کر سکتا۔ آتش حرب جس شدت اور جیسے زور و شور سے بھڑک رہی ہی اُس کے لحاظ سے ایسی آگ کا چند مہینے بھی قائم رہنا دنیا کی آبادی کو ادھیادے گا۔ مگر جن زبردست پہاڑوں کی ٹکڑیوں سے آگ کے شعلے نکل رہے ہیں وہ بھی ایسے سخت اور مہبت آگ ہیں کہ اُن کی نسبت کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اُن میں سے کوئی اتنی جلد یا تھوڑے زمانے میں ٹوٹ کے ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔ آتش حرب کی شدت اس آگ کے جلد بجھنے کا یقین دلاتی ہے۔ اور آگ برسانے والوں کی عظمت کہہ رہی کہ یہ شعلہ باریان مدت تک قائم رہیں گی۔ ان دونوں پہلوؤں کو نظر کے سامنے رکھ کے غالباً یہ رائے دی جاسکے کہ لڑائی کا زور تو جلد ہی ٹوٹ جائے گا۔ مگر لڑنے والے برسوں تک لڑتے اور حضرت پارسائیل کی خوفناک پارسائی کو یاد کرتے رہیں گے۔

اسی لیے اپنے سال بھر کے فتنہ مجھ مہمان پارسائیل کے جاتے وقت کہنے کو تو ہم کہہ رہے ہیں کہ خدا تمہیں لیجائے اور پھر کبھی ایسی ذات بابرکات سے سابقہ نہ پڑے مگر دل کو اطمینان نہیں ہوتا۔ کیونکہ اطمینان تو جب ہو تا جب آپ کے جانے سے امن و امان قائم ہونے کی امید ہوتی۔

عربی رسم خط

۴ نومبر ۱۹۱۲ء کے ہمدردین بیت المقدس سے خواجہ کمال الدین صاحب کا ایک خط شائع ہوا ہے جس میں جناب موصوف خط نسخ کی تاریخ کے متعلق مسلمانوں کی تحقیق معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے اس مسئلہ پر کسی حد تک غور کیا ہے۔ اور جا بجا کچھ لکھا بھی ہے۔ اگرچہ اس وقت میرے پاس کافی کتب خانہ نہیں موجود ہے

تاہم جس نتیجہ کو میں پہونچا ہوں اُسے کمال ادب خواجہ صاحب کی خدمت میں عرض کیے دیتا ہوں۔

ہمارے پیغمبر علیہ السلام ہی اُمّی نہ تھے بلکہ ساری قوم عرب اُمّی تھی جیسا کہ قرآن مجید میں مذکور ہے ”بَعَثْنَا فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا“ قدیم الایام میں ارض میں ایک خط مروج تھا جو جدا جدا حرفوں میں لکھا جاتا۔ اور سوائے امرا و شرفاء قوم کے کسی عامی کو نہ بتایا جاتا۔ اس علی بخل کا یہ نتیجہ ہوا کہ جب نیز اسلام چمکا ہی اُس خط کا جاننے والا دنیا میں کوئی نہ تھا۔

ولادت سرور کائنات علیہ السلام کے قریب ہی ابوسفیان کے والد حرب بن امیہ ارض حیرہ سے ایک خط سیکھ آئے اور دو چار دوستوں اور عزیزوں کو بھی سکھایا۔ خود حرب کا بیان تھا کہ میں نے اس خط کو حیرہ کے ایک شخص اسلم بن سدرہ سے سیکھا۔ اور وہ علاقہ انبار کا ایک شخص مرام بن مرہ کا شاگرد تھا اور چونکہ مرام کا کوئی استاد نہیں معلوم تھا اسلئے قریش میں یہ خیال پھیل گیا کہ اس خط کا پہلا موجد مرام ہی۔ اور ارض انبار اُس کا مولد ہی۔ (ملاحظہ ہوا بن حنکاح - حالات علی بن ہلالی المعروف بہ ابن بواب کا تب)

غرض یہی عربی کی پہلی تحریر اور ہمارے موجودہ خط نسخ کا نقش اولین ہے۔ اسی میں قرآن مجید لکھا گیا۔ اسی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خطوط و معاہدات لکھے گئے۔ اور اسی میں صحابہ مرامت کرتے تھے۔ مگر اپنی ابتدائی حالت میں یہ خط اس قدر ناقص تھا کہ جس قدر رواج پاتا تھا اُسی قدر زیادہ اُس میں اصلاحوں اور ترمیموں کی ضرورت محسوس ہوتی جاتی تھی۔ اور یقیناً بہت سی اصلاحیں ہونی ہوں گی جن کی ہمیں خبر نہیں ہے۔

اس عہد کے نمونے ہمارے ہاتھ میں بہت ہی کم ہیں جن سے کچھ اندازہ کیا جائے۔ آنحضرت نے جو خطوط لکھوائے بھجوائے تھے اُن میں سے دو خط اہل یورپ نے خدا جانے کیونکر اور کہاں سے برآمد کر کے پیش کیے ہیں اور دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ اصلی خط ہیں۔ ان دونوں کے فوٹو میں نے دیکھے ہیں۔ ایک مسیلمہ کہ اب کے نام ہی ۱۹۰۶ء میں لندن کے کچر میگزین نام ایک رسالہ میں چھپا تھا میں نے اُس کا

درق نکال کے انگلی پلٹ بنوائی ہے جو میرے پاس احتیاط سے رکھی ہے گواہی
 ایک چھپوانے کی نوبت نہیں آئی۔ دوسرا خط فرمان رواے مصر مقوقس کے نام
 ہے جس کا فوٹو ہیرودز آف دی نیشین سیریز کی کتاب ”محمد“ مصنف ڈی۔ اس
 مارگو لیو تھ مین مصر کے رسالہ الملل سے لے کے درج کیا گیا ہے۔

ان دونوں خطوں کی تحریر ایک ہی زمانے۔ ایک ہی وضع۔ اور ایک
 ہی شان کی ہے۔ اور دونوں کے بیچ آپ کی مہر ہے خطوط کی عبارت کے الفاظ
 بھی وہی ہیں جو احادیث میں صحیح روایات سے مروی ہیں۔ بہر حال ان کو دیکھ سکے
 یقین ہوتا ہے کہ اصلی تحریریں ہیں۔ اور یہی میر خیال ہے۔ چنانچہ میں ان خطوں کے
 فوٹوں کو تمام اگلے تبرکات سے زیادہ واجب التعظیم اور حرز جان بنانے کے قابل
 خیال کرتا ہوں۔ اور بے اختیار جی چاہتا ہے کہ ان مبارک نامہ اے رسالت پر
 جان فدا کر دیجیے۔ افسوس مسلمانوں کو توفیق نہیں ہوتی وہ نہ اُن کا فرض تھا کہ یہ
 دونوں اصلی خطوط رسالت جن پر آپ کی مہر مبارک ثبت ہو اُن کی تاریخ کا پتہ
 لگاتے کہ کیونکر محفوظ رہے۔ کہاں سے کہاں پہونچے۔ کس سے کس کو ملے۔ اور
 آخر میں کیونکر اہل یورپ کے ہاتھ آئے۔

ان خطوط کے بعد کی تحریر کا نمونہ حضرت عثمان ذی النورین عہد کے
 قرآن پاک ہو سکتے ہیں۔ جن کا کوئی نسخہ اس وقت تک کسی ہندوستانی مسلمان کی
 نظر سے نہیں گزرا۔ کہا جاتا ہے کہ اُن میں کایقہ آن قسطنطنیہ میں موجود ہے۔ اگر خواجہ صاحب
 کسی تبریر سے اُس کی زیارت سے شرفیاب ہو کے اُس کے کسی صفحہ کا فوٹو حاصل
 کریں اور اسے شائع کر دیں تو مسلمانوں پر بڑا احسان کریں۔

مذکورہ بالا دونوں خطوط رسالت کی تحریر کی شان یہ ہے کہ نہ نقطہ ہیں
 نہ اعراب ہیں نہ علامات اوقاف ہیں۔ الف سیدھی کھڑی لکیر نہیں بلکہ بیچے کا میرا
 بیچے مُڑا ہوا ہے جس سے اُس کی قطع ”ما“ کی سی ہے عظیم کا لفظ یوں لکھا ہے۔
 ”عظیم“۔ القبط کی صورت یہ ہے ”مالقط“۔ سلام کی وضع تحریر یہ ہے
 ”سلام“۔ الہدی کی صورت یہ ہے ”مالہدی“۔ من کی صورت ”م“
 اور بعضاً بعضاً ”و“ بعضاً ”ص“ معلوم ہوتا ہے کہ نصب کے ساتھ تنوین میں

ایک الف جو موجودہ رسم خط میں بڑھا دیا جاتا ہے یہ اُسی زمانے کا ہے۔ اَشْهَدُ اُ
کی صورت ”اَسْهَدُ وَا“ ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ جمع کے آخر کا الف بھی اُسی زمانے
کا ہے۔ اس کی پابندی نہیں ہے کہ لفظ سطریں ختم ہی ہو جائے۔ ”وَرَسُو لَہ“
میں سے ”وَر“ ایک سطر کے آخر میں ہی۔ اور ”لَہ“ دوسری سطر کے شروع
میں ”قُلْ اَ“ میں سے ”قُ“ ایک سطر میں ہے اور ”لَہ“ دوسری سطر میں
”مَسْلُومَ“ میں سے ”مَسْ“ ایک سطر کے آخر میں ہے اور ”لَہ“ دوسری
سطر کے شروع میں۔

خلفاء راشدین کے عہد میں اس خط میں کسی نمایاں تغیر کا پتہ نہیں چلتا۔
سب سے پہلے اس تحریر کے نقصان پر ابوالاسود دؤلی کی نظر پڑی جن کا حال میں نے
سنی اور جون ۱۹۱۲ء کے دولگداز میں لکھا ہے۔ انھیں نے رسم خط کی اصلاح کی اور
انھیں نے ابتدائی قواعد نحو عرب کو بھی مدون کیا۔

زیاد نے حکومت بصرہ کے زمانے میں اُن سے خواہش کی تھی کہ قرآن کے
رسم خط کی اصلاح کیجیے مگر انھوں نے غالباً قرآن کے متعلق سنت قدیم میں دخل
دینا بدعت خیال کر کے انکار کر دیا۔ لیکن ایک دن ایک قاری قرآن کو اِنَّ اللّٰہَ
بَرِّیُّ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ وَرَسُوْلُہُ، میں ”رَسُوْلُہُ“ کو ”رَسُوْلُہِ“ پڑھتے سُن کے ایسے
گھبرائے کہ زیاد کے پاس دوڑے گئے۔ اور کہا ”میں اب آپ کی خواہش پوری
کرنے کو موجود ہوں“ پھر اُس سے ایک کاتب لیا۔ اور اُسے پاس بٹھا کے ہدایت
کی کہ میں قرآن کو لکھواتا ہوں۔ جس حرف کے ادا کرنے میں میں اپنا مُنہ کھول دیا
کروں اُس کے اوپر تم ایک نقطہ لگا دیا کرو۔ جس حرف کو میں مُنہ کو گول کر کے ادا کیا کروں
تم اُس کے آگے ایک نقطہ لگا دیا کرو۔ اور جس حرف کے ادا کرنے میں آواز کا رخ
نیچے کی طرف ہو تم اُس کے نیچے نقطہ لگا دیا کرو۔ غرض قرآن میں پہلے پہل یہ اعراب لگا
گئے۔ جن کی صورت ابتدائی ایجاد میں بجائے ترچھی لکیروں کے نقطوں کی سی تھی اور
پیش بجائے حرف کے اوپر کے سامنے لگایا جاتا تھا۔ آج کل جو نقطے اب تباہ اور ہٹ
میں یا ج۔ ح۔ خ کا امتیاز بتایا کرتے ہیں اُن کا اُس وقت تک مطلقاً پتہ نہ تھا۔ اور
نہ شاید اُن کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔

ابوالاسود دؤلی نے ۱۹۱۲ء میں انتقال کیا۔ اُن کے بعد کتے ہیں کہ میمون بن اقرن نے۔ پھر عنبسہ بن معدان فہری نے پھر عبدالسد بن ابی اسحق حضری نے۔ پھر ابو عمرو بن علاء المتوفی ۱۹۱۲ء نے اس خط میں اور اصلا حین کین۔ مگر ہم نہیں جانتے کہ وہ کیا اصلا حین تھیں۔ یہاں تک کہ خلیل ابن احمد از دی المتوفی ۱۹۱۲ء اور علی بن حمزہ کسائی المتوفی ۱۹۱۲ء کا زمانہ آیا۔ جبکہ کوفہ اور بصرہ میں نحو و صرف اور علم زبان کا شباب تھا۔ کتے ہیں کہ خلیل نے ترقی خط کی طرف بہت توجہ کی۔ اور اس درجہ کو پہونچا دیا کہ کسائی نے جو مامون رشید کا استاد اور علمی ترقیوں کا بچہ شائق تھا خط عربی میں ایک نئی شان پیدا کی جس کو اہل کوفہ نے بے انتہا پسند کیا۔ اور وہی خط خط کوفی کے نام سے مشہور ہوا (ملاحظہ ہوں کتاب الفہرست ابن النديم۔ ابن خلکان حالات ابن مقلدہ کا تب و ابن البواب کا تب۔ اور آغانی جلد ۱۱ صفحہ ۱۰۶ حالات ابوالاسود دؤلی) اس میں نہ مامون کا کہ کسائی نے ایک بیک پرانے خط کو بدل کے خط کوفی کر دیا۔ اصل مسلسل تغیروں اور ترمیموں نے رفتہ رفتہ وہی اس خط کی صورت بنا دی تھی کسائی نے قواعد نقاشی و خوشنویسی کو کام میں لا کے قوم کی تحریر کی ایک خاص شان پیدا کر دی۔ جسے لوگوں نے عموماً پسند کیا اور اُسی کی پیروی کرنے لگے۔ تاہم اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ خط کوفی کی ایجاد ۱۹۱۲ء کے قریب ہوئی ہے۔ اس سے پہلے جو خط مروج تھا کوفی نہ تھا۔ حضرت عثمانؓ کے زمانے تک کوفہ کو کوئی علمی حیثیت ہی نہیں حاصل ہوئی تھی۔ حضرت علیؓ نے کوفہ کی سکونت اختیار کی۔ اور اسی وجہ سے اکثر عوام میں مشہور ہے کہ حضرت علیؓ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے قرآن خط کوفی میں تھے۔ مگر انھیں اس کی خبر نہیں کہ اُن دنوں کوفہ تو بے شک تھا۔ اور کوفہ میں حضرت علیؓ بھی تھے۔ مگر خط کوفی نہ تھا جس کا کتابت حضرت علیؓ کو فرض کر لیا گیا ہے۔ خط کوفی کا دور دوسری صدی ہجری کے آخر سے شروع ہوا ہے۔ جبکہ ہارون رشید کا زمانہ تھا۔

مامون کے زمانے کی ایک فرد حساب کا فوٹو میں نے مدت ہوئی مولانا شبلی کے پاس دیکھا تھا۔ جس کی اصل یورپ کے کسی کتب خانہ میں موجود ہے۔ گو وقت

پوری تفصیل سے اُس کے حروف کی شکلیں یاد نہیں ہیں۔ مگر اجمالی نظر ہی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ نہایت ہی پختہ اور پاکیزہ خط ہے۔ اور خط کو فی کی گھسیٹ ہے۔

اب مجھے یہ بتانا ہے کہ خط کو فی میں اور پرانے خط میں کیا فرق تھا۔ میں نے خط کو فی کا کوئی مکمل قرآن نہیں دیکھا ہے۔ لیکن ہیروز آت دی نیشن سیریز کی کتاب ”محمد“ مصنفہ ڈی۔ اس۔ مارگولیو تھ میں خط کو فی کے ایک قرآن کے ایک صفحہ کا فوٹو موجود ہے۔ اصل نسخہ بوڈلین لائبریری کا ہے۔ اور معلوم نہیں کہ کس کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں الف کی قطع ”ا“ د کی قطع ”د“ ن کی قطع ”ن“ ہی۔ اس میں شک نہیں کہ خط خوبصورت اور زیادہ واضح و روشن ہو گیا ہے مگر اُسی پرانے خط سے ملتا ہوا ہے۔ صرف بچنگی اور ایک مصورا نہ مناسبت و ہم وضعی پیدا ہو گئی ہے۔ مگر تعجب یہ کہ اس کو فی خط قرآن میں اعراب کا کین تیر نہیں۔ نہ نقطہ ہی ہیں اور نہ ترچھی لکیریں ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابوالاسود کی ایجاد کا عام طور پر رواج نہیں ہوا تھا۔ خاص ہی خاص نسخہ قرآن میں اُن کے رسم خط کی پابندی کی جاتی ہوگی۔ مگر عام کاتب اُن کا لحاظ نہ کرتے تھے۔

اس خط کو فی میں سب سے بڑی مفید ترقی یہ ہوئی ہے کہ موجودہ نقطون کی بنا ٹر گئی۔ جن سے اُن تمام مختلف اصوات حروف میں امتیاز کر لیا جاسکتا ہے جو ہم شکل ہیں۔ مگر خط کو فی کے نقط ہمارے موجودہ خط نسخ کے نقطے نہیں ہیں۔ بلکہ انہی جگہ نیچے اوپر باریک باریک ترچھی لکیریں زیر زبر کی سی اختیار کی گئی ہیں۔ مثلاً ”یا ایہا المرسل قم الدیل“ کو بالعمامہ ”یا ایہا المرسل قم الدیل“ کی وضع میں لکھا ہے۔ اس سے بے شک یہ ثابت ہوتا ہے کہ جب بات ت اور اسی طرح کے دیگر حروف میں امتیاز کی ضرورت محسوس ہوئی تو بجائے نقطون کے ترچھی باریک لکیریں اختیار کی گئیں۔ اور نقطون سے جو ابوالاسود نے ابتداء اعراب و حرکات بنانے کا کام لیا تھا۔ وہ خاص خاص قرآنوں میں تھے۔ عام تحریر و ن میں اور کتابوں میں ان کی ضرورت

نہیں سمجھی جاتی تھی۔

اب اس وقت سے کچھ کم ڈیڑھ سو برس تک خط کو فی کا زمانہ رہا۔
 گزرا زمانہ جو گزرتا جاتا تھا اس خط میں بھی کچھ نہ کچھ تغیر اور رد و بدل کرتا جاتا
 تھا۔ خط کو فی جب کہ ہمیں نظر آتا ہے زود نویسی کے لیے موزون نہ تھا۔ چنانچہ
 ۲۷۲ھ میں زمانے نے ابو علی محمد بن علی بن حسین کا تب کو "جو ابن مقلہ" کے
 لقب سے مشہور ہو پیدا کیا۔ یہ بہت بڑا شخص تھا۔ اور اگرچہ اُس کی زندگی اس قدر
 پُر آشوب تھی کہ ترقی کی تو خلافت بغداد کا وزیر اعظم بن گیا اور اقبال نے ساتھ
 چھوڑا تو ہاتھ کاٹا گیا۔ زبان کاٹی گئی۔ قید ہوا۔ اور خدا جانے کیسی کیسی مصیبتیں
 جھیل کے ۳۲۸ھ میں چھپن برس کی عمر میں قید خانے ہی کے اندر مرا۔ لیکن
 باقردان دشمن اُس کی جان لے سکتے تھے اُس کے کمالات کا بیٹا ناغیر نہ تھا۔
 دیگر کمالات کے علاوہ ابن مقلہ خوشنویسی اور خط نسخ کی اصلاح میں
 بھی کمال رکھتا تھا۔ چنانچہ اُس نے مروجہ خط کو فی کو تقویم پارینہ کر کے موجودہ
 خط نسخ ایجاد کیا۔ (ملاحظہ ہوا بن خلکان حالات ابن مقلہ کا تب) اس نئے خط
 میں اعراب و حرکات کے اظہار کے واسطے ابوالاسود دؤلی کے نقطون کو موقوف
 کر کے زیر۔ زبر کے لیے حرف کے اوپر اور نیچے ترچھی لکیر بن اوپریش۔ جنم
 تشدید۔ دوزبر اور دوزیر کی موجودہ شکلین اختیار کی گئیں۔ اور متشابہ
 حرفون کے باہمی امتیاز کے لیے خط کو فی کی باریک ترچھی لکیرون کو چھوڑ کے
 نقطے قائم کیے گئے۔ اور تمام حرفون کی صورتون میں ایک مقبول عام خوشنما
 سادگی اور آسانی پیدا ہو گئی۔ خلاصہ یہ کہ ہمارے موجودہ خط نسخ ابن مقلہ کا ایجاد
 ابن مقلہ کے خط کی یہ شان اس قدر پسندیدہ ثابت ہوئی کہ ساری کتابت
 اسی میں ہونے لگی۔ اور یکایک خط کو فی ایسا مٹا کہ آج اُس کا لکھنا درکنار دنیا
 اسلام میں اُس کا کوئی بڑھنے والا بھی نہیں ہے۔

ابن مقلہ کے کچھ کم ایک صدی بعد ابن بواب کا تب پیدا ہوا جس نے
 اپنی مشہور عام خوش نویسی سے خط نسخ کو اتنا سہ کمال کے درجے کو پہنچا دیا۔
 ابن بواب کا نام ابو الحسن علی بن ہلال تھا۔ مگر چونکہ ایک دربان کا بیٹا تھا اس لیے

”ابن التواب“ کے لقب سے مشہور ہوا۔ علامہ ابن خلکان اُس کی نسبت لکھتے ہیں ”اگلون پھلون میں سے کوئی شخص اُس کے مثل کتابت نہیں کر سکا۔ خطا کو فی سے بدل کے موجودہ خطا کو ایجاد تو ابو علی بن مقلہ نے کیا تھا۔ لیکن ابن تواب نے اس کی شان کتابت شایستہ مہذب اور خوشنما بنا دی۔ اور تمام لوگوں کو اتفاق ہو کہ اس بارِ خاص میں وہ منفرد اور بے نظیر تھا۔“ ابن تواب نے ۱۳۳ھ یا ۱۳۴ھ میں انتقال کیا۔ اور خط نسخ میں اسی شان پیدا کر کے چھوڑ گیا جس کی لوگ آج تک پیروی کر رہے ہیں۔

اس مسئلہ پر اس قدر تحقیق کرنے کے بعد میں خواجہ صاحب کے سوالات

کا جواب دیتا ہوں۔

(۱) ۸ نومبر کے زمیندار میں ایک واقعہ کا صاحب نے بتا دیا ہے کہ مولوی خدائش خان کے کتب خانہ بانکی پور میں حضرت عثمان اور حضرت علی کے ہاتھ کے کچے ہوئے قرآن مجید موجود ہیں۔ مجھے دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ وہاں حضرت عثمان کے ہاتھ کا تو کوئی قرآن نہیں ہے ہاں حضرت علی کے ہاتھ کے چند پارے بتاؤ جاتے ہیں۔ مگر جب تک کوئی خط عرب کی تاریخ جاننے والا اُن پر تنقیدی نظر ڈال کے نہ بتائے اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم اس عہد کا کوئی قرآن مل جائے تو ہم کو اس مسئلہ میں صحیح نتیجہ تک پہنچنے میں بہت کامیابی ہو سکتی ہے۔

(۲) آپ کی تحقیق کے اس حصہ سے مجھے اتفاق نہیں کہ سیدنا عثمان کا مصحف خطا کوئی میں تھا۔ اس لیے کہ خطا کوئی اُس زمانے کے تقریباً ڈیڑھ صدی بعد ایجاد ہوا ہے۔ لیکن بالکل صحیح ہے کہ اُس میں نقطہ اور حركات و سکونات تھے۔

(۳) اس دفعہ کے مضمون (الف) کے متعلق عرض ہی کہ خط نسخ کی تاریخ میں نے اوپر تفصیل سے بتا دی ہے جس سے تمام استفسارات کا جواب مل سکتا ہے۔ تراشنا اور عرض کرنا ہے کہ میں نے کبھی کوئی قرآن خط نسخ اور خطا کوئی میں بلا جُلانین دیکھا۔ لیکن ابن مقلہ کے ظہور سے چند روز پیشتر جو قرآن لکھے گئے ہوں گے وہ یقیناً ایسے ہی خط میں ہوں گے جن کی شان خطا کوئی اور موجودہ نسخ سے علی جلی ہو گی۔

ضمن (ب) کے متعلق عرض ہے کہ نقطون کا آغاز خط کو فی مین باریک تر چھ خطوط کی وضع میں ہوا جو خطوط ابن مقلہ کے زمانے میں فیقین بن گئے۔ اُن سے پیشتر بادی النظر میں حروف منقوط و غیر منقوط یا ایک اور دو اور تین نقطون والے حروف میں ماہ الامتیاز کوئی علامت نہ تھی۔ اور صرف قیاس اور معانی کی مناسبت سے اُن کا امتیاز کیا جاتا تھا۔ جس طرح کہ اردو میں ہم حرکات کا امتیاز بغیر کسی علامت کے کر لیا کرتے ہیں۔ ”ب“ اور ”ت“ کا امتیاز خط کو فی سے پہلے کے پرانے خط میں نہ مفرد میں تھا نہ مرکب میں۔ مگر کو فی میں جیسا کہ میں اوپر بیان کر آیا ہوں نیچے اوپر باریک خطوط کا امتیاز پیدا ہو گیا تھا۔ ت کی شکل ”ف“ اور ”ب“ کی ”ج“ تھی۔

ضمن (ج) بعض کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ نقطون سے پہلے حرکات و سکنات کا استعمال شروع ہوا۔ اور وہ بذریعہ نقطہ تھا اور نقطے اولاً حرکات و سکنات کے لیے استعمال ہوئے۔ موجود حرکات ابوالاسود دہلوی نے زیر زبر پیش کے اظہار کے لیے اپنے کاتب کو اوپر نیچے اور سامنے نقطہ ہی لگانے کی ہدایت کی تھی۔ جو باعتبار روایت ہر طرح قابل تسلیم ہے۔ امتیاز حروف کے لیے نقطون سے اور حرکات کے سمجھنے کے لیے ترچھے خطون وغیرہ سے کام لینے کا آغاز ابن مقلہ کے زمانے سے ثابت ہوتا ہے۔ مگر میں خیال کرتا ہوں کہ اس سے پیشتر ہی کاتبون کا زحمان اس ترمیم و تہذیب کی طرف ہونے لگا ہو گا۔ ابن مقلہ نے اُسے اختیار کر کے اس قدر رواج دیا کہ سب نے یہی طرز تحریر اختیار کر لیا۔

ضمن (د) بے شک قدیم کتابت میں ”ذ لک“ اور ”جنت“ کے ایسے نقطون میں الف ہین لکھا جاتا تھا۔ اور نہ اُس کے امتیاز کے لیے کوئی علامت تھی۔ مذکور صحیف رسالت میں الفاظ ”رحمان“ اور ”یا اہل“ بغیر الف کے صرف کھڑے زبر سے یعنی ”رحمن“ اور ”یا اہل“ کی صورت میں لکھے گئے ہیں۔ اُن دونوں ”حرث“ اور ”حارث“ کے ناموں میں امتیاز و شواہد تھا۔ اس لیے کہ دونوں مذکورہ نام ”حرث“ کی صورت میں لکھے جاتے تھے۔ اب بھی اکثر حارث کا لفظ ”حرث“ لکھا جاتا ہے۔

اسی طرح دیگر سوالات کا جواب بھی اس مضمون کے ابتدائی مباحث سے حاصل کر لیا جاسکتا ہے۔

موجودہ نعمتوں کی بے قدری

حضرت رسالت (روحی فداک یا رسول اللہ) نے بعض روز روزِ حاضر ہونے والوں سے فرمایا: **لَا تَذُفُ خُبْرًا**، (مجھ سے ایک دن چھوڑ کے ملا کر اس سے تمہارے دل میں میری محبت زیادہ ہو گئی) اس ارشاد نبوت کے فلسفہ پر بھی کبھی تم نے غور کیا ہے؟

انسان کی فطرت ہی کچھ ایسی احمقانہ واقع ہوئی ہے کہ جو نعمتیں اُس کو مل چکی ہیں اُن کی قدر نہیں کرتا۔ اور جو اُسے نصیب نہیں اُنکی ہوس میں مرا جاتا ہے۔ مینو اپنے شہر کے باغوں اور سبزہ زاروں کی سیر نہیں کرتے مگر اسے بحالیہ کی گھاٹیوں اور اُس کی وادیوں کے مرغزار و جوںظر سے غائب اور خیال کے مایہ میں ہوتا ہے۔ ہمارے دل کو اپنی طرف کھینچ رہی ہو۔ ہماری گزر گاہوں میں مینو سچلٹی نے ہزاروں نشیمن روشن کر رکھی ہیں جنہیں کبھی شاذ و نادر ہی ہم نگاہ اٹھا کے دیکھتے بھی ہیں مگر اسے سقعت فلک کے غیر مرتب تار و تھیں بار بار دیکھتے ہیں اور جی نہیں بھرتا۔ شب و روز اسی فکر میں ہیں کہ کسی طرح اُس کے تم تک پہنچیں۔ یہ کیوں؟ صرف اس لیے کہ تم دونوں دور ہو اور تم تک رسائی نہیں ہو سکتی۔

ریل میں سفر کرتے وقت بار بار بھر بہ ہوا ہو گا کہ پاس کھیتوں اور درختوں میں خوبصورتی نہیں ہے جو دور کے ملے ہوئے درختوں اور وادیوں کی سوا دیں ہم کو نظر آتی ہے۔ جانتے ہیں کہ اُن کے قریب پہنچیں گے تو وہ بھی ایسے ہی ثابت ہوں گے جیسے یہ پاس والے کھیت اور درخت ہیں۔ مگر دل مانتا۔ اُنہیں چیزوں کا والد و شہیدا ہے جو دور ہیں۔ اسی مسئلہ میں اس بات کا بھی راز ہے کہ جس قدر دیہات والوں کو شہروں کی رونق و آبادی و چہل پل۔ مکانوں کی رفعت و شوکت اور سڑکوں کی بھیڑ بھاڑ دیکھنے کا شوق ہے اُس سے زیادہ مشتاق اہل شہر دیہات کی خاموشی

وسادگی۔ نزہت و شادابی۔ دہان کے وسیع میدانوں۔ اور لہلہاتے ہوئے
کھیتوں کے ہیں۔

ہم بالطبع جدت پسند اور خواب پرست واقع ہوئے ہیں۔ ہمیشہ دل پر یہ
ہوس قابض رہتی ہے کہ روز کوئی نئی چیز ملے۔ اور اُن چیزوں کو دیکھیں جو نظر
سے دور ہیں۔

اردو کی بھد سیل شل "گھر کی مرغی دال برابر" اسی رمز فطرت اور ہماری
احمقانہ ہوس پرستیوں کا شعار ہے۔ اچھی سے اچھی نعمت اور مفید سے مفید دولت
دستیاب اور سہل الحصول ہونے کے باعث ہماری نظریں بے قدر ہو جاتی
ہیں۔ اور جن چیزوں کا حاصل مونا دشوار ہی اُن میں سے اکثر مضر اور خوفناک چیزیں
بھی دور سے ایسی بھلی معلوم ہوتی ہیں کہ اُن کے شوق میں دل ضروری نعمتوں کی
قدر کرنا دکنار اُن سے نفع اٹھانا بھی بھول جاتا ہے۔

لوگ شاہان سلف کی اس وضع پر آج اعتراض کرتے ہیں کہ لوگوں کی
اُن تک رسائی نہ ہوتی تھی۔ دروازوں پر پرہ تھا۔ باہر اس قدر کم تکلف لاکڑیاں
ملک دل میں اُن کی ایک جھلک دیکھ پانے کی تمنا ہی لیے مر جاتے۔

ایک سطحی خیال والا کہتے ہیں کہ دے گا کہ یہ اُن کے غرور و نخوت کی
وجہ سے تھا یا شب و روز میں عورتوں کی صحبت میں پڑے رہنے کے باعث
مگر نہیں۔ اُن کی یہ وضع صرف اس لیے تھی کہ عام نگاہوں سے دور رہنے کی وجہ
سے اُن کی قدر بڑھے۔ دوستوں کے دلوں میں محبت زیادہ ہو۔ اور دشمنوں
پر پورا رعب قائم رہے۔ زیادہ میل جول سے بے قدری ہی نہیں ہوتی بلکہ رعب بھی
اٹھ جاتا ہوا ہر شاہی شان شوکت معمولی چیزیں نظر آنے لگتی ہیں۔ حضرت عمرؓ کے وڑے
سے کسری و قیصر کے جسم میں لرزہ پڑ جاتا تھا مگر مغیرہ بن شعبہ کے ایک ذلیل غلام
نے شہید کر ڈالا۔ حضرت علیؓ کی ذوالفقار نے بڑے بڑے ہلو انوں اور سپہ سالاروں
کے غرور توڑ دیے تھے مگر اپنے ہی گروہ کے ایک حقیر دغا باز کے ہاتھ سے شہید
ہوئے۔ جو قیصر کی تلوار نے ساری دنیا میں لرزہ ڈال دیا تھا۔ مگر اپنے گرد
کے چند بے وفادار دوستوں کے ہاتھ کا شکار ہوا۔ اور نادر جس نے آل عثمان

اور روسیوں کی فوجوں کو شکستیں دیدی تھیں اور اُس کی تلوار کے ایک اشارے نے دہلی میں خون کی ندیاں بہادی تھیں اپنی پاس کی فوج کے چند بے وفاؤں کے ہاتھ سے مارا گیا۔

ہم سلاطین کے سامان آرائش و آسائش کو حسد کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ہمیں نظر آتا ہے کہ دنیا بھر کے عیش و تاجداروں کو حاصل ہیں۔ اور خدا کی ساری نعمتیں اُن کے عیش و لذت میں جمع ہو گئی ہیں۔ یہ سچ ہے اُن کا کھانا انصیبی نہ کھاسا پینا نہ اُن کے ہاتھ پاؤں پر خدمت و اہل دربار مل سکتے ہیں اور نہ اُن کی صحبت عیش کے سے معشوقان طر حدار نہ ویسے خزانے ہمارے قبضے میں ہیں اور نہ ویسے ممالک و اقوام۔ لیکن غور کرو تو اسی عیش پرستی کے لحاظ سے جس قدر حسد پادشاہوں کو تم پر آتا ہے اُس قدر تمہیں اُن پر نہیں ہو سکتا۔ بلکہ سچ پوچھو تو اُن کا حدیج اور باطنی ہوا اور تمہارا بے اصل اور لغو۔ اُن کو جو نعمتیں حاصل ہیں وہ حقیقت میں نعمتیں اور بہت بڑی اعلیٰ درجہ کی نعمتیں ہیں مگر کثرت ہر وقت موجود رہنے۔ اور سہولت حاصل ہونے کے باعث اُن کی نظر میں وہ نعمتیں ہی نہیں باقی رہیں۔ یہ خلاف اُن کے جو چھوٹی چھوٹی نعمتیں کو عطا ہوئی ہیں وہ ایسی مشقت اور دشواری سے حاصل ہوتی ہیں کہ تم اُن میں بڑی سے بڑی نعمتوں سے زیادہ لطف اٹھا لیتے ہو۔ اور اس سے صاف ظاہر ہے کہ تمہاری حالت پر اُن کا حسد کرتا تو بیجا نہیں۔ مگر تم جو اُن کی حالت پر حسد کرتے ہو یہ بالکل بے موقع اور بے حقیقت ہے۔

مگر دنیا کی عام حالت یہ ہو رہی ہے کہ جس لالچ کی نگاہ سے تم اُن کے عالیشان محل کو دیکھتے ہو اسی لالچ سے وہ تمہارے بڑے چھوٹے کو دیکھتے ہیں۔ جس شوق سے تم اُن کے پلاؤ و قورمے اور الوان نعمت کو دیکھتے ہو اسی شوق سے وہ تمہاری روکھی روٹی اور بن بھاری دال کو دیکھتے ہیں۔ جس طرح تمہیں اپنی سادی اور کم قیمت غذا بے لطف اور بے مزہ معلوم ہوتی ہے اسی طرح اُنہیں اپنی پُر تکلف اور قیمتی غذاؤں میں مزہ نہیں آتا۔ اور جس طرح تم اُن کی ہزاروں نوڈیوں کو کھاؤ بی بیوں پر حسد کرتے ہو ویسے ہی وہ تمہاری ایک پاک دامن عقیقت اور حیا کش بی بی پر حسد کرتے ہیں۔

یہ باہمی حسد اور ایک دوسرے کی حالت کو لالچ سے دیکھنا کیون ہے؟
اس لیے کہ جس طرح تم کو اپنا غربت کا سامان معمولی اور تمہارے پاس ہونے
کی وجہ سے بے مزہ اور بے لذت نظر آنے لگا ہو ویسے ہی اُن کے لیے
اپنا اعلیٰ درجہ کا سامان عیش پھیکا اور بے مزہ ہو گیا ہے۔ اہلین باتوں اور
انسان کے اُن تلون کو دیکھ کے فلسفی اس نتیجہ کو پہنچ گئے ہیں کہ لذت اور
عیش صرف تغیر اور ایک حالت سے بدل کے دوسری حالت پیدا ہونے کا
نام ہے۔ وہ سمجھتے ہیں اور بہت صحیح سمجھتے ہیں کہ دشواری سے حاصل ہونے
اور تاخیر و انتظار کے بعد دستیاب ہونے کی برکتیں دنیا کی ہر چیز کو لازماً
بنادیا کرتی ہیں۔

اس کا ایک کرشمہ یہ ہے کہ ہم اپنی زبان و میاستی میں موجودہ حالت
اس قدر بے لطف و بے مزہ نظر آتی ہے کہ اُس کی طرف توجہ کرنے کی بہت
کم لوگوں کو ذہن آتی ہے مگر گزشتہ اور آئندہ حالت کے خیال میں جسے
دیکھتے مصروف ہو۔ اگلی چیزوں میں باقی کوئی نہیں ہے۔ سب گزر گئیں اور
صرف اُن کی یاد دلوں میں ہے۔ اس یاد میں بھی اس قدر مزہ ہے کہ گو اُس سے
کوئی نتیجہ نہیں حاصل ہو سکتا لیکن سب کی زبان پر اگلوں کی داستانیں ہیں۔
کس کس طرح مزہ لے کے کہہ رہے ہیں کہ فلاں صحبت کیسی دلچسپ تھی؟ اور
فلاں اجاب مرحومین کس قدر سچے تھے؟ اور اب ویسی صحبتیں دیکھنے میں
آئیں گی۔ اور نہ ویسے دوست نصیب ہوں گے۔

اب گزرے انسانوں کو چھوڑ کے آئندہ کی طرف رخ کرو اور ہر تم کو
آغوشِ فردا میں عجیب عجیب قسم کی دلکش و دلغیب تمنائیں نازوں کے بے لادوں
بچوں کی طرح کھلتی اور کھل کھلاتی نظر آئیں گی۔ اور تمہارا جی چاہے گا کہ اُن
خوبصورت بچوں کو بے اختیار گود میں اٹھا کے کھینچے سے لگا لو۔ اور یہ نہیں
ہو سکتا تو ان پیاری صورتوں کو دیکھتے ہی رہو۔ استقبال کے گلشنِ اقبال
میں ہر قسم کی لذتیں اور ہر جہ کے مزے نظر آئیں گے مگر انوس کو وہ نہیں
اپنی ہی طرف آتے نظر آتے ہیں لیکن اتنی طرف دور ہیں کہ تمہارا ہاتھ اُن تک

نہیں پہنچ سکتا۔ اور انتظار کی شکل برداشت کرنے کی تم اپنے مین طاقت
نہیں پاتے۔

مخلاف گزشتہ و آئندہ کے حال کی وہ قیامت زار اور امید کش سا
ہے کہ اُس کی سواد مین پہنچتے ہی ہر چیز معمولی اور بے مزہ ہو کے رہ جاتی
ہی۔ وہی دلچسپیان جو آغوشِ فردا مین حد سے زیادہ دلکش نظر آتی تھیں
آج کی قلم و مین آتے ہی کچھ ایسی بے لطف ہو گئیں کہ قدر کے قابل ہی نہ معلوم
ہوئیں۔ نہ اُن سے لطف اٹھایا۔ اور نہ سمجھیں یہی محسوس ہو سکا کہ اُن مین کوئی
لذت ہی۔ لیکن حال کے نہایت ہی محدود اور تنگ دائرے سے نکل کے جیسے ہی
گزشتہ کے عشرت آباد مین پہنچ گئیں تم ہاتھ ملنے لگے کہ افسوس کیسی نعمت
اور کیسی راحت کی چیز ہاتھ سے نکل گئی۔ اور ہم قدر نہ کر سکے۔

موجودہ حالت اور آج کی گھڑی محض اسی وجہ سے بے لطف ہی کہ ہم
سے قریب اور ہماری دسترس کے اندر ہی۔ اور گزشتہ و آئندہ کی دلکش
اور لذت آلود نیرنگیان اسی لیے پُر بھار و پُر لطف ہیں کہ ہم سے دور ہیں۔
اور ہمارے بس مین نہیں۔

شعرا کی زبان سے ہم معشوق کی بے وفائی کی شکایت سنتے سنتے عاجز
آگئے ہیں۔ بار بار دل مین خیال گذرا کہ کیا ہمارے شاعر دن اور عاشق کو
کوئی با وفا معشوقہ نہیں ملتی جو ایک یوفا۔ بدعہد۔ جھوٹے۔ اور وعدہ فراموش
معشوق پر مٹے ہوئے ہیں ہا رات دن اُسی کی بے وفائی کے ظلم و ستم کا
دکھ اُرتتے ہیں۔ مگر اُس کہ ہاتھ سے جان نہیں چھڑا سکتے۔ آخر غور کرنے
سے کھلا۔ کہ بیان بھی وہی ”موجودہ نعمتوں کی بے قدری“ کا مسئلہ پیش ہے
انسان کی احسان فراموش اور ناقدر دان فطرت ہی اسے معشوق کو تیار ہی
ہو جو اُس پر ظلم کرے۔ عاشق لواز معشوق اِن بے وقوفوں کی نظر مین معشوق
ہی نہیں ہے۔ جو اُن کے بلانے سے چلا آیا۔ اِن کی ولاری کرتا رہا۔ اور
اِن کی خواہشوں کا مطیع ہو گیا۔ اُس مین کسی قسم کی لذت نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ
اُس کا حسن و جمال سہل الحصولی کی نذر ہو گیا۔ اور اُس کی رعنائی و زیبائی

پاس آجانے کی وجہ سے خاک میں مل گئی۔ ان کے نزدیک لذت اُسی معشوق میں
 ہو۔ جو ہر بات میں ان کی حذر کرے۔ یہ صورت دکھانے کو کہیں تو وہ منہ چھپا
 آنے کو کہیں تو چلا جائے۔ پاس بلائیں تو دور بھاگے۔ یہ خوشامد کریں تو گالیوں
 دے۔ اُس کے قدموں پر سر رکھیں تو وہ ٹھوکر مارے۔ غرض اپنی ہر ادا۔
 ہر آن۔ اور ہر انداز سے اسی بات کو ظاہر کرے کہ اُس کا ملنا غیر ممکن ہے۔
 لہذا ادبے وقوف انسان اپنی انہیں حماقتوں کی وجہ سے تو خراب
 ہو رہا ہے۔ کاش اپنے پاس کی نعمتوں کی قدر کرتا۔ اور اپنی دنیوی زندگی
 کو جنت بنا لیتا۔ اور جن لوگوں نے موجودہ گھڑی اور محال شدہ برکتوں
 کی قدر کی اُنھوں نے اپنی اس فانی زندگی کو جنت کی زندگی بنا لیا۔ مگر جنہوں
 مسلمانوں میں عجیب انقلاب ہو گیا ہے۔ ان کے انکھوں نے تو موجودہ نعمتوں
 کی قدر کر کے اپنی دنیوی زندگی فرودس بریں کی زندگی بنا لی تھی مگر فی الحال
 اس کلیہ سے مستثنیٰ ہونے کی کوئی صورت نہیں نظر آتی کہ اللہ دنیا سبھی اہل
 وجنت کا کافرو۔

شبلی نعمانی

مولانا شبلی کی وفات سے مسلمانوں میں جو کمی ہو گئی ہو اُس کا پورا ہونا بہت دشوار ہے۔ ہندوستان
 میں بہتے علما و فضلاء پیدا ہوں گے۔ بہتے شعرا پیدا ہوں گے۔ بہتے مصنف پیدا ہوں گے۔ بہتے اُگر نیزہ کی قابل
 و متحر پیدا ہوں گے۔ مگر شبلی پھر پیدا ہوں مکن نہیں۔ وہ اُس عالم سردی میں گئے۔ اور جنت میں جہان سے کوئی واپس نہیں
 آتا۔ کسی کی یاد میں تو محض بکرا اُسے سنا ہو۔ لہذا ہم اپنی آہ و ناری سے اُن کی وہاں کی ابدی مشرف و فارغ الہامی میں
 فرق نہ ڈالتے اور انہیں نہ ستاتے۔ مگر کیا کریں کہ شبلی مینوشین نہ دنیا میں کوئی اپنا نظیر چھوڑ گئے ہیں اور نہ اُن کے محقق
 گراں پایہ کے پیدا ہونے کی امید ہو۔ اور یہ ایسا غم جاکاہ جو کہ ہمیں آج ہی یہ چین سے بیٹھنے دے گا اور نکبھی باندھ
 مولانا کے علمی کارناموں کا آغاز جاری آنکھوں کے سامنے ہوا۔ ہمارے سامنے بھی اُنھوں نے ترقی کی
 شہت حاصل کی۔ اور ہماری ہی آنکھوں کے سامنے دنیا سے سدھار گئے۔ ہم سے اُن سے طالب علمی کے زمانے سے
 ملاقات تھی۔ اُن کا سند و لاوت تو ہمیں یاد نہیں مگر اتنا جانتے ہیں کہ ہم وہ قریب العمر ہیں۔ مولانا کو ہجوم امراض
 قبض ہوا میرے کالیف۔ اور معدے کی کڑوری نے بہت ہی ضعیف و ناتوان بنا دیا تھا۔ جسکی وجہ سے

اُن کی عمر اصل سے زیادہ معلوم ہوتی تھی۔ اُن کے بیان کے مطابق اُن کی بچپن چھپن سال سے زیادہ تھی۔
ابتداء میں درستی اور کتب معقول اُنھوں نے اپنے وطن میں مولوی محمد فاروق صاحب چراگیا کو ہی چھپنا
چند روز حیثیت طالع علم جو پورہ مدرسہ حقیقہ میں رہے۔ اور غالباً مولوی ہدایت اللہ خان صاحب حوم سے تحصیل کی۔ آخر
میں ادب عربی کے شائق بن کے لاہور پہنچے اور مولانا فیض الحسن صاحب پرائیوٹ طور پر ادب کی کتابیں پڑھیں۔ شاید
اسی وجہ سے پنجاب کے اخبارات میں شائع ہوا ہے کہ اُنھوں نے پنجاب یونیورسٹی کی دیگر ان مولوی عالم اور مولوی فاضل
حاصل کیں۔ مگر یہ بالکل بے اصل و بے بنیاد ہے۔ یہ ہمیں ہمیں معلوم کہ مولانا نے حدیث کی کتابیں پڑھیں یا نہیں اور
پڑھیں تو کہاں اور کس سے پڑھیں۔

تحصیل علم کے بعد مولانا نے ارادہ کیا کہ قانونی پیشہ اختیار کر کے فخری و دکالت کی سندیں حاصل کریں۔
جس غرض کے لیے چند روز تک ضلع بستی میں قیام کیا۔ مگر حالت اور رجحان طبیعت سے آنکارا ہو رہا تھا کہ جس میں
میں فروغ دینے کے لیے وہ پیدا کیے گئے تھے وہ میدان نہیں ہے۔ چنانچہ اُن دنوں اگرچہ مقدمہ فقی اور عدالتی
کارروائیوں سے کام رہتا تھا۔ مگر اُن کا مسئلہ علمی مباحث اور عالمانہ تصانیف ہی تھے۔

مولانا نے جن درس گاہوں میں تعلیم پائی اور جن اساتذہ سے پڑھا اُن کی صحبت نے ابتداء ہی میں اُنھیں سخت
حنفی بنا دیا تھا۔ اسی شوق میں اُنھوں نے اپنے نام کے ساتھ ”نعمانی“ کا لقب لکھنا شروع کیا۔ جسکی وجہ سے
بعض واقف لوگوں نے اُنھیں غلطی میں پڑنے کے ذریعہ نعمانی یعنی امام اعظم ابو حنیفہ کو فی نسل میں خیال کر لیا
مگر کسی کوئی اصلیت و حقیقت نہیں ہے۔ وہ شدید حنفی تھے۔ اور شخصیت میں اپنے آپ کو اور و ن سے
متمایز ثابت کرنا چاہتے تھے۔ اسی غش کا تقاضا یہ بھی تھا کہ امام صاحب کے سوانح عمری میں اُنھوں نے
”سیرۃ النعمان“ لکھی تو امام المحدثین رحمہ اللہ نے بجا بجا حمله کیے۔ اور علی العموم گروہ محدثین کے
اصول سے اختلاف کیا کرتے۔ یہاں تک کہ امام ابو الحسن اشوری بھی محض اتباع حدیث کے باعث اُن کے
سورہ و سهام بن گئے۔

اُن دنوں مولوی ابوالحسنات محمد عبداللہ فرنگی محلی کی درس گاہ کی شہرت تھی۔ جن کی فیض علی
سارا ہندوستان بلکہ مالکہ دور و دراز کے لوگ بھی بہرہ یاب ہو رہے تھے۔ مولانا علی محمد صاحب
یہ شان تھی کہ بخلاف تمام موجودہ علمائے حقیقہ کے ائمہ حقیقہ سلف میں سے جس کے قول کو اہل حدیث
کے مذہب سے قریب تر پائے اختیار کر لیتے۔ اور بہت سے مسائل میں اہل حدیث کے ہم خیال تھے۔ چنانچہ مازہ میں
امام کے پیچھے سورہہ فی فتح پڑھنے کے بارے میں اُنھوں نے امام محمد کا مذہب اختیار کر لیا تھا۔ اور سورہہ
تجہ پڑھنا منتخب بتاتے تھے۔ یہ امر مولانا شبلی کو سخت ناگوار ہوا۔ چنانچہ اُنکی تردید میں ایک عربی رسالہ

لکھ کے شائع کر دیا۔ جسکا نام ”اسکات المعدی“ تھا اور جیسے ہی اسکی اشاعت ہوئی اسکی تردید میں مولوی عبدالحی صاحب مرحوم کے قابل شاگردوں سے مولوی نور محمد صاحب متانی مرحوم اور تاشیغی اینچانچور سائے شائع کیے جن میں علاوہ نفس مسئلہ کے ادبی غلطیاں بھی نکالی تھیں۔

مولانا انھیں بختون میں پڑے ہوئے تھے کہ علیگڑھ کالج کو عربی کے ایک چھے ادیب اور فاضل مدرس کی ضرورت ہوئی۔ انھوں نے مولوی فیض الحسن صاحب کی تصدیق و سفارش سے درخواست بھیجی۔ صاحب نے مولانا کی درخواست کو قبول کر لیا چنانچہ مولانا بستی اور وہاں کے قانونی مشاغل کو چھوڑ کے لکھنؤ ہوتے ہوئے علیگڑھ گئے۔ میں اسوقت دار و فہ جید بخش کی مسجد میں ان سے ملا تھا۔ اور ان کے چہرہ سے محسوس کر رہا تھا کہ یہاں طلبہ میں سے ہر ایک کو وحشت و بدگمانی کی نظر سے دیکھتے تھے مگر باوجود اس وحشت کے طلبہ ہی میں تھے۔ اسلئے کہ اسوقت تک پبلک سے ان کو سرور کار نہ تھا۔ علیگڑھ میں سید صاحب نے انھیں اپنی کوٹھی کے احاطہ کا اندر ایک چھوٹے سے مکان میں جگہ دی جو ایک بالکل باہمہ اور بے پتہ تھا۔ اور ایک شاموش مقام تھا ان میں جستجو و تحقیق کا سما مذاق دیکھ کے سید صاحب نے ان سے ربط و ضبط پڑھایا۔ اکثر کھانا ایک ساتھ کھاتے۔ اور روز گھنٹوں صحبت رہتی۔

سید صاحب ہمیشہ اعتقادی و کلامی مسائل اور مورخانہ تحقیق کے غور و غوض میں رہتے اور تحقیق و تدقیق کی غرض سے انھیں اکثر حدیث و فقہ و تاریخ و سیر کی کتابوں کے مطالعہ کی ضرورت پڑتی۔ اس کام کو انھوں نے مولانا شبلی سے لینا شروع کیا۔ اور مولوی شبلی نے اس خدمت کو اپنی جانی اور قابیل سے انجام دیا کہ جس قدر سید صاحب کی دقیقہ رسی و وسعت نظر کے مولانا شبلی قائل ہوتے جاتے تو اس سے زیادہ سید صاحب ان کی تلاش جستجو اور طلب روایات کے معقد و معترف ہو گئے تھے۔ اس زمانے میں مجھے بارہا مولانا شبلی کے پاس جا کے ٹھہرنے اور ان کے ذریعہ سے خود سید صاحب کا معائنہ بن جانے اور دونوں کے ساتھ ہفتوں کھانا کھانے اور شریک محبت رہنے کا موقع ملا۔ مولانا سے مجھ سے حد درجہ کی بے تکلفی تھی۔ اور میں اس بات کو ہر صحبت میں محسوس کرتا تھا کہ وہ اور سید صاحب دونوں کس قدر ایک دوسرے کے علمی کمالات کے معترف ہوتے جاتے ہیں۔ سید صاحب کے اعتراف کی تو یہ حالت تھی کہ کوئی کام بغیر ان سے مشورہ کیے نہ کرتے۔ اور مولانا شبلی کے اعتراف کیا یہ ثبوت ہی کہ میرے علم میں ان کی سب سے پہلی نظم جو ان دنوں شائع ہوئی ”صبح امید“ ہے جس میں انھوں نے مسلمانوں کی غفلت اور سید صاحب کی برکت سے ان کے بیدار ہونے کو نہایت ہی پُر لطف اور مؤثر الفاظ میں ظاہر کیا ہے۔ اور اسی زمانہ میں علیگڑھ کا ایک طالب علمانہ

مختصر میں انھوں نے اپنی ایک قومی نظم سنائی تھی۔

ان چیزوں نے انھیں فارسی اور اردو کا ایک مقبول عام شاعر ثابت کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور اس میں شک بھی نہیں کہ وہ ایک قہر رس شاعر تھے اور اپنی نظموں کو ایسی نغمہ خیز دھن میں سنایا کرتے تھے کہ پبلک نے بہت پسند کیا اور طلبہ نے اسے اختیار کر کے قومی نغمہ خوانی کی ایک مقبول عام دھن بنا کے سارے ہندوستان میں پھیلا دیا مگر پھر بھی میں کہوں گا کہ وہ شاعر نہ تھے اور نہ شاعری کے لیے پیدا ہوئے تھے۔ بلکہ ملہ کے عالم میں ان کی شان ایک شاعر کے درجے سے بہت ہی ارفع و اعلیٰ تھی۔

اب سید صاحب کو توجہ دلانے سے وہ تاریخی تنقید و تحقیق میں مصروف تھے جس کا سب سے پہلا نمونہ، مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم پر ان کا کچھ تھا جسے انھوں نے چون ایکوشل کافر نس کے دوسرے یا تیسرے اجلاس میں پیش کیا تھا۔ یہ کچھ مسلمانوں کی نظر بالکل ایک نئی دہشت ہی دلچسپ چیز تھا۔ چنانچہ جب اس پر دگلڈاز میں ریویو ہوا تو کوئی نہ تھا جو اس کے دیکھنے کا مشتاق نہ ہو گیا ہو۔ اسی نوعیت کی ان کی دوسری کتاب ”المامون“، اسی جوشی بہت پسند کی گئی۔ اور اسی کتاب نے پہلے پہل پبلک کو بتایا کہ مولانا شبلی کس قسم کے مصنف ہیں۔ اور آئندہ کیسے ثابت ہونے والے ہیں۔ اب سید صاحب کی صحبت اور پبلک کی حوصلہ افزائی نے مولانا کو اسی کوچے میں آگے بڑھانا شروع کیا۔ سیرۃ النعمان لکھی۔ سیرۃ الفاروق لکھی۔ اور تاریخی جستجو کا شوق اس قدر بڑھ گیا تھا کہ کتابوں کی تلاش میں منقطع ہو چکے۔ اور واپس آ کے اپنا سفر نامہ شائع کیا۔ جسکے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت میں وہاں گئے تھے وہ پورا نہ ہوا اور اسی وجہ سے ان کی یہ تصنیف بھی ایک ناکام تصنیف ہے۔

اس موقع پر ان کے خیالات کے متعلق اس نازک انقلاب کا بیان کر دینا بھی لطف سے خالی نہ ہو گا۔ کہ سر سید اصل غیر مقلد اور اہل حدیث کے گروہ میں تھے۔ لیکن مسائل کلامی اور انگریزی اثر نے غیر مقلد سے ایک بڑی حد تک انھیں معترزی بنا دیا تھا۔ سید صاحب کی صحبت کا مولانا شبلی پر کوئی اثر نہ ہوتا غیر ممکن تھا۔ مگر اہل حدیث کی طرف سے ان کے دل میں جو بھرک بقی دھبی ممکن نہ تھا کہ انھیں بغاوت اور حقیقت کے دائرے سے باہر نکلنے دیتی۔ لہذا بغیر اس کے کہ غیر مقلدی کا کچھ بھی بڑھنے پالنے وہ بلا واسطہ نعمانی سے معترزی بننے لگے۔ اور آخر میں اس بات کی

کوشش شروع کی کہ خود حقیقت کو اصلی اعتزال ثابت کریں۔ اور بخلاف متاخرین حنفیہ کے جو حنفیت کو اشعریت کی طرف کھینچنا چاہتے ہیں انھوں نے اپنی حنفیت کو اشعریت کا سخت دشمن اور فقہ کے پردے میں چھپی ہوئی معتزلت ثابت کرنا چاہا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ اگر بڑی کے طلبہ تو ان کی باتوں سے خوشش ہو ہو کے دینداری و خوش اعتقاد دی کے دھوکے میں مغرور ہونے لگے۔ اور موجودہ علمائے حنفیہ کو ان سے سخت عناد ہو گیا۔

اب اس کے ساتھ ہی ان میں ایک دوسرا تغیر شروع ہوا۔ ان کی طبیعت میں باوجود اہتمام درجے کے اخلاق کے خود داری کا خیال بہت بڑھا ہوا تھا۔ سید صاحب کی صحبت علیگڑھ کالج کی مرجعیت۔ اور ان کی ذاتی قابلیت نے انھیں ابتداءً اس حیثیت سے پبلک مین انٹر ڈیوٹس کر ایا کہ سید صاحب کے گروہ کے ایک نامور بزرگ اور ان کی فوج کے ایک نامی پہلوان ہیں۔ خصوصاً جب وہ سید صاحب کے ہمراہ رکاب حیدر آباد گئے تو مسلمانوں میں اس خیال کو اور پختگی حاصل ہو گئی۔ مگر خود مولانا شبلی کی خود داری اس حیثیت کو اپنی شان سے بہت کم بلکہ اپنی ذلت اور سبکی تصور کرتی تھی۔ اپنی ان تصنیفوں اور نظموں کو تو وہ مٹا نہ سکتے تھے جن میں خود ہی اپنی اس حیثیت کو آشکارا کر چکے تھے۔ لیکن اب اس بات کو ناقابل برداشت دیکھ کے علیگڑھ کالج سے علیحدگی اختیار کر کے مذہب و علماء میں شرکت کی اور سمجھے کہ اس ذریعہ سے میں علماء کا مرتاج اور شیخ الملک بن کے اس درجے پر پہنچ جاؤں گا جو سید صاحب کے درجے سے بھی مافوق ہیں۔ میں نے ان کو بارہا اس خیال سے روکا۔ اور اسی زمانے میں کہہ دیا تھا کہ علماء میں آنے والا۔ بہ نہیں ہیں۔ ان مرحومین امت میں سے ہر ایک پریسیڈنٹ کی حیثیت رکھتا ہے اور جس جماعت میں فقط پریسیڈنٹ ہی پریسیڈنٹ ہوں اس پر آیا کریمہ دکن کا متافیکھا الہمتان الا اللہ نفسد تا، پوری پوری صادق آتی ہے۔ ان کے بہت سے دوستوں نے بھی روکا اور کہا کہ آپ کی ترقی کا میدان علیگڑھ کالج ہی ہے۔ مگر انھوں نے نہ مانا۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ گو انھوں نے مذہب کو بچھ فائدہ ہو بچایا اور مذہب کو مذہب بنا دیا مگر آخر میں مذہب والے مرحومین امت ہی کے ہاتھ سے مار کھائے۔ جس کا ان کے دوستوں کو بچھ ملال ہوا۔ اور خود بھی اپنی اس محنت کے اکارت جانے پر کھٹ افسوس ملتے ہوئے مرے۔

دوسری طرف علیگڑھ پارٹی سے علیحدہ ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ نئے تعلیم یافتہ

گروہ میں سے بہت سے قابل لوگ اُن کے خلاف ہو گئے۔ جو ظاہر میں تو اُن سے موافق تھے مگر موقع پاتے ہی اُن پر اعتراض کر جاتے۔ اُدھر مولانا کے دل میں کچھ ایسی ضد پیدا ہو گئی کہ سید صاحب کا جو درجہ اُن کے قدر شناسوں کے دل میں تھا اُس سے انھیں گرا کر آنا چاہتے۔ اور بعض صحبتوں میں ایسی باتیں کہ جاتے جو لوگوں کو اور زیادہ ناگوار کرتیں۔ ندوہ کا انتظام ہاتھ میں لینے کے زمانے میں اُن کی یہ حالت تھی کہ کالج میں اور مسلمانوں کے ساتھ سید صاحب کا جو طرز عمل دیکھ چکے تھے اُسی کو اپنا دستور العمل قرار دے لیا تھا۔ اور ساتھ ہی سید صاحب سے اپنی علیحدگی اور برأت ثابت کرنے کی کوشش کرتے۔ مگر دراصل یہ وہ باتیں تھیں جو اُن سے کبھی بنائے نہ بنیں۔

اسی دوران میں انھوں نے اور کئی کتابیں لکھیں۔ ان کی سب سے زیادہ مقبول کتاب "تفسیر فرق علیکذا" ہے جس میں شائع ہو چکی تھی۔ علم الکلام۔ الکلام۔ سوانح مولانا روم وہ کتابیں ہیں جو مسلمانوں کے سامنے اعتراضات کو ٹھانڈا کرنے کا لباس نبھانے کے پیش کرتی ہیں۔ شاعرانہ مذاق میں تاریخی جستجو کے امتزاج سے اُن سے موازنہ و بیروانیوں اور شعرا لعمم، کو تصنیف کرایا۔ مگر سب اہم تصنیف سیرۃ رسول صلعم ہے جس کو نام تمام چھپڑے کے دنیا سے گئے ہیں اُن کی وصیت کے مطابق مولانا حمید الدین صاحب اور مولوی سلیمان صاحب ندوی نے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا ہے۔ اور علیا حضرت بیگم صاحبہ بھوپال نے آخر تک مری گری کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ کوشش ہو رہی ہے کہ یہ کام بہت جلد پورا ہو اور ہمیں امید ہے کہ یہ مولانا کی اعلیٰ ترین اور مفید ترین تصنیف ثابت ہوگی۔

مولانا کا اہم کام رسالہ "الندوہ" تھا جس نے مسلمانوں کے لیے بہت سے حقائق تاریخی سامان فراہم کر دیا۔ اور اس کے سلسلہ میں مولانا نے بڑے بڑے اہم مسائل میں تحقیق و تدقیق سے کام لیا ہے۔ قیام قسطنطنیہ کے زمانے میں انھیں عثمان یا شام مرحوم کی سفارش سے سلطان العظم نے تمغہ عجمیہ عطا کیا۔ اور گورنمنٹ سے اُن کو تمثالِ اعلا کا خطاب عطا ہوا جو چیزیں خان بہادر ون کے نزدیک چاہے کیسی ہی اہمیت رکھتی ہوں ہمارے نزدیک چند ان قابل لحاظ نہیں۔

نرخ نامہ اجرت اشتہار

آپ کو غالباً معلوم ہو گا کہ دگلڈاز کی اشاعت دو ہزار سے زیادہ ہوا اور ایک شہور اور مستند رسالہ ہونے کی وجہ سے تمام خریدار اس کے بچوں اور اس کی جلد کو محفوظ رکھتے ہیں۔ اور اشتہارات کے لیے اشاعت کا اس بہتر کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ عام اخبارات پر صرف ایک دفعہ اشاعت کے وقت لوگوں کی نظر پڑتی ہوا اور دگلڈاز کے اشتہاروں پر سالہا سال تک ہمیشہ نظر پڑتی رہتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ دگلڈاز میں اشتہارات کو شائع کر کے آپ جو فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور کی طرح ممکن نہیں۔ اس سے پہلے دگلڈاز میں اشاعت اشتہارات کی طرف بہت کم توجہ کی گئی۔ لیکن اب جاں بہام کیا گیا ہے۔ دگلڈاز کی قیمت اس قدر کم ہو کہ قطعی امید ہے کہ سال کے اندر اس کی اشاعت چار پانچ ہزار ہو جائیگی۔ ڈیڑھ روپیہ لالہ چندہ مع محصولہ ایک اور پھر ختم سال پر ایک نیا ناول مفت اس صورت میں کون خریداری نہ کرے گا۔



نرخ نامہ حسب ذیل ہے

مقام کا غلڈ معمولی اشتہار	دست اشتہار سالانہ	ایک صفحہ ۲۵	نصف صفحہ ۱۲.۵	ربع صفحہ ۷.۵
"	چھ ماہ	۱۳	۷	۴
"	تین ماہ	۷	۳.۵	۲
"	ایک مرتبہ	۷	۳.۵	۲

دگلڈاز پریس

عمدہ اور علی درجہ کی چھپائی اور پھر اس کا وقت پر لگانا غیر ممکنات میں سے تصور کیا گیا ہے اس کی کو دیکھ کر دگلڈاز نے چھپائی کا نہایت اعلیٰ درجہ کا انتظام کیا ہے اور اس تمام کیساتھ کہ جتنا رائج کتاب کے مکمل چھاپے ہو گا وہ کیا جائے اسی تاریخ دیدی جائے اس مطبع کو جس وقت یہی حاصل ہو کہ ہولنا عہد عبدالمجید صفا سے اصلاح ہو کر اور پھر ترمیم میں مدد مل سکتی ہے جن صاحبوں کو اپنی کتابیں عہد اور جلد چھپوانا ہوں فوراً اطلاع دیں۔ گرنیال ہو کہ ضرر اعلیٰ درجہ کی چھپائی ہوتی ہے چھپائی کا نرخ مرامت سے طے ہو سکتا ہے کیونکہ اس کا دار و مدار زیادہ تر کاغذ اور لکھائی کی قیمت ہے۔

المشتہر منیجر دگلڈاز - کٹرہ زن بیگ خان
(کھنڈا)

